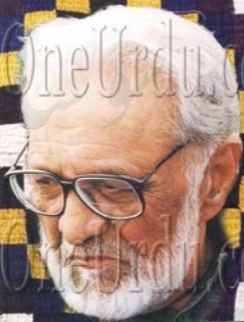


راہِ رواں



پاکستان



مکتبہ اہل سنت لاہور
پبلشرز

راہِ رواں

راہِ رواں

بِانوقدسیہ

سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور

923.5 Bano Qudsia
Raah-e-Rawaan / Bano Qudsia.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications,
2011.
636 + 55pp. : with pictures.
I. Urdu Literature - Biography.
I. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورت حال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2011

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2315-6

ISBN-13: 978-969-35-2315-7

Sang-e-Meel Publications

25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax: 92-423-724-5101
<http://www.sang-e-meel.com> e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

اینق۔ انیس۔ اشیر احمد کے نام

خوبصورت لوگوں کی سرگرمی

گھر سے گھر تک (آغازِ کتاب)

آج کل کے بچے جگ سوپزل کا مشغلہ بڑی دلچسپی، انہماک، جوش و خروش اور خوش اوقاتی سے اپناتے ہیں۔ اُن کے سامنے کسی تصویر کا ماسٹر پلان موجود ہوتا ہے۔ پھر اس منظر کو دیکھ دیکھ کر وہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں کو اس سلیقے سے جوڑتے چلے جاتے ہیں کہ ہو بہو مین مین ٹکڑیوں کا منظر ماسٹر پلان کا منظر بن جاتا ہے اور وہ اس طرح کی کامیابی پر اپنے آپ کو پروہم حل کرنے والی کسی بڑی شخصیت جیسا اہم محسوس کرنے لگتے ہیں۔

لیکن جب بھی کوئی سوانح نگار بائیوگرافی لکھتا ہے یا کسی شخص کی زندگی کی جگ سوپزل تیار کرتا ہے تو اُسے بہت سی ٹکڑیاں غائب ملتی ہیں۔ پورا ڈیٹا نہ ہونے کے باعث نہ کوئی تیار شدہ ماسٹر پلان ہوتا ہے نہ کوئی روڈ میپ ہی جس پر چل کر ہم اُس کی بلادنگاری کر سکیں۔ تاریخ اور سوانح نگاری کے لیے عموماً ڈائریاں تلاش کی جاتی ہیں۔

لوگوں کے انٹرویو صاحب ذکر کی کتابیں، موصوف کے خاندان کے لوگوں سے ”سی آئی اے“ قسم کی چھان بین ملازموں کی جانچ پڑتال کام آتی ہیں، لیکن بائیوگرافی پھر بھی نامکمل، حواشی کی محتاج اور صورت گری کے دھندلے پن میں سچ ہوتی ہے۔ پورا انسان اپنی قلبی، روحانی، نفسیاتی، ذہنی زندگی کو اپنے ساتھ ہی لے کر رخصت ہو جاتا ہے... اُس کی پھیلی کارازاب صرف روز قیامت ہی کھل سکتا ہے۔

میں نے بھی ایک معمولی سی کوشش خاں صاحب کو آپ سے روشناس کرانے کی خاطر کی ہے۔ ساتھ رہتے ہوئے بھی خاں صاحب ہر انسان کی طرح میرے لیے مانوس اجنبی تھے۔ میں انہیں کالج میں ملی۔ پھر ہم نے گھر بسایا۔ کرائے کے مکان بدلے اور آخری مرحلے میں اپنا گھر 121- سی ماڈل ٹاؤن میں بنا لیا۔ جہاں سے وہ اپنے اصلی گھر کو روانہ ہو گئے۔ یہ گھر اُن کی رخصتی کے بعد گھر نہ رہا، شہرت مابعد کا خزینہ بن گیا۔

میں بھی اپنے طور پر اُن کی مہربانیوں، شفقت اور شاگردی کا حق ادا کرنا چاہتی ہوں لیکن میں تحقیقی مجتہد میں میخ نکالنے والی نہیں ہوں۔ میں عموماً سنی سنائی پر ایمان لے آتی ہوں۔ میں سرہنگ زادوں کی طرح حکم مان کر اُٹھ نکلتی ہوں،

لیکن کسی جہادی کی طرح ایمان کی قوت میرے ہمراہ نہیں ہوتی بلکہ صرف کرگزر نے کا جذبہ ساتھ رہتا ہے۔ ایسی مہم پر ماسٹر پلان کے بغیر نکلنا عموماً فیروز مندی کا موجب نہیں ہوتا۔

پھر بھی ”ہر کسے را بہ ہمت اوست“ کو مد نظر رکھتے ہوئے میں نے قلم اٹھایا ہے۔ منظر کشی کے لیے میرے پاس خاں صاحب تک ترسیل کے کئی ذرائع تھے۔

ایک ذریعہ گھر تھا جہاں ہم دونوں نے بسیرا کیا۔ اسے خاں صاحب نے ہمیشہ کبوتری کا بک سمجھا کہ اڑتے اور ہر اڑان کے بعد اپنی اپنی کا بک ہی راس آتی۔ دوسرے میرے پاس حسن اتفاق سے وہ یوڈا ایشیں جو ساتھ رہنے کے باعث میسر آئیں موجود ہیں۔

اُن کے اندر کے موسم کے ساتھ ساتھ بیرونی اطلاعات بھی تھیں۔ شہروں کی نقشہ نویسی اپنی نقل و حرکت کا کام کی وابستگی ذمہ داری کی تفصیلات بھی میسر آتی رہتی تھیں۔ میں نے پورا سال یہ سوچنے میں بسر کیا کہ کیا مجھے خاں صاحب کو بے نقاب کرنے کا حق ہے؟ کیا خاں صاحب اس بے تکلفی اور نقاب کشائی پر برا فروختہ نہ ہوں گے؟ کیا ان کو آپ کے سپرد کرنے کی اصل وجہ خود ستائی تو نہیں؟ کیا میں اس غلطی کی سر تکب تو نہیں کہ یہ قدم میں نے اپنی شخصیت کا تاج محل بنانے کی خاطر اٹھایا ہے؟

سال بھر سوچنے کے بعد میں نے بڑی مشکل سے اس بات پر اپنے آپ کو راضی کیا ہے کہ آپ کے ساتھ اپنے ہم سفر کو کسی باغ کی اکیلی بیٹیچ پر بیٹھ کر یاد کروں۔ اوپر سے خزاں دیدہ پتے درخت سے گرین ہو جائیں تو مہر کے مہینے کی خشکی ہو..... ڈور لان میں میرے بچوں کا بچپن آپ کو نظر آئے آخری فوارے کے کنارے بیٹھے آپ کو خاں صاحب کے دوستوں کا جھرمٹ دکھائی دے..... ہولے ہولے شام کی سرخی غائب ہو جائے پرندے گھروں کو لوٹ جائیں اور اندھیرے میں کسی گوشے سے خاں صاحب آگے بڑھیں اور مجھے میری غلطیوں سمیت اپنے گھر اپنی کا بک میں واپس لے جائیں۔

یہاں ایک اندیشہ اور بھی ابھرتا ہے جو مجھے ان یادداشتوں کو پبلک کی پر اپنی بنانے سے روکتا رہا۔ وہ کھٹکا یہ ہے کہ لوگ عموماً مین میخ نکالنے والے ہوا کرتے ہیں۔ کسی کی نیت سے نا آشنا ہونے کے باعث وہ کچھ سے کچھ اور ہی مطالب اخذ کر لیتے ہیں۔ اُن کی وابستگی چونکہ معروضی اور مزاجی ہوا کرتی ہے بسا اوقات وہ ایسے ایسے کیڑے نکال کر ہتھیلی پر دھردیتے ہیں جن کا وہ ہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔

بدیر سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی کہ ایک طور سے تو یہ اور بڑی نقاب کشائی کا عمل ہوگا۔ میں عرفان ذات کے مرحلوں سے نہیں گزری اسی لیے مجھ پر اپنی اور خاں صاحب کی اندرونی جبلت، فطرت، طبیعت، کردار کے اصل بھید نہیں کھلے۔ خاں صاحب کہا کرتے تھے کہ عصر اور مغرب کے درمیان کسی ستون کے ساتھ سر لگا کر آنکھیں موند آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاؤ اور صرف اپنے متعلق سوچو..... اپنے ارادے، خواہشات، دوسروں کے ساتھ تعلقات کے الجھے دھاگے، عمل اور علم کی دُوری، ماضی کے پچھتاوے، مستقبل سے وابستہ اُمیدیں، ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت اور ان سے بگٹ بھاگ کر آزادی پالینے کی حسرت، کردہ اور نا کردہ گناہوں کی ورق گردانی، اندر کے موسموں کی چھان بین..... غرض

یہ کہہ لے ہو لے پرت در پرت حقیقت اور خواب کے درمیان کا فاصلہ کم ہوتا جائے گا اور تمہیں اصلی شخص سے متعارف ہونے کا موقع ملے گا جو تمہارے اندر جمناسٹک کرتا رہتا ہے۔

میں سماجی نہ لگا سکتی ہوں نہ عرفانِ ذات کے جھنجھٹ میں پڑ سکتی ہوں کیونکہ عرفانِ ذات کے لمبے داؤ سے گزر کر اپنے حواسی کو جاننا ایک لمبا پُر خطر راستہ ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھی سمت معلوم کرنے کے لیے کسی اجنبی شہر میں کسی نامانوس جگہ سے رابطہ قائم کر لینا آسان ہے بہ نسبت لندن میں نقشہ نکال کر کسی سڑک پر اپنے دوست کا گھر معلوم کرنے کا شغل۔ میں نے ہر پڑھنے والے کے سامنے خاں صاحب سے وابستہ کچھ یادیں رکھ دی ہیں۔ اب آپ لوگ ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ میری لن ترانیوں کی اصل حقیقت کیا تھی؟ ہم کس قدر گنجے فرشتے تھے اور کس حد تک سفید پتروں میں عین نعریں جھکائے خوشامدی شیخی خورے، متکبر، خود غرض، کسی شیطانی ٹولے کے رفیق تھے۔

ہر انسان اول و آخر کھنکھاتی مٹی سے بنا ہے اور ٹوٹ کر پھر مٹی ہی کا حصہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ یہ دعویٰ کرے کہ اس میں بشریت کے جملہ خصائص نہیں ہیں تو حتمی طور پر یہ دعویٰ غلط ہوگا۔ میں بھی اُن لوگوں کی احسان مند رہوں گی جو اس کتاب سے معروضی انداز کے تخمینے لگائیں گے۔ اگر اُن کی آواز مجھ تک جیتے جی پہنچ گئی تو میں اُن کی شکر گزار رہوں گی۔ اگر میرے بعد اُن کی رائے دوسروں تک پہنچ پائی تو بھی گھائے کا سودا نہیں کیونکہ وہ ہمت شکنی کر کے بت پرستی کے شغل سے بچ رہیں گے اور خاں صاحب جن کے چاہنے والے ان گنت ہیں اپنی رائے میں تھوڑے سے محتاط ضرور ہو جائیں گے۔

ایک سب سے بڑی وجہ آپ تک یہ مواد پہنچانے کی یہ بھی ہے کہ آج کے نوجوان آزادی کے مفہوم کو نہ سمجھتے ہوئے آزادی کے درپے ہیں۔ جب کبھی آزادی ملتی ہے اسی تناسب سے آزادی دینا بھی پڑتی ہے۔ اگر حقوق کے لیے سینہ سپر ہو جائیں تو حقوق ادا کر کے ہی جان چھوڑتی ہے۔ لکھنے کی آزادی ہم دونوں نے بغیر کسی سے اجازت لیے ہتھیالی تھی۔ اس کتاب سے اب ہم دونوں Commitment کے بند دائرے میں اتر گئے ہیں۔ مسلسل اتنے سال اشارے کنائے اعتراف و ارتکاب کی فضا میں رہتے ہوئے ہم نے خود فرار کی راہیں، فیصلے کی آزادی اور ایک دوسرے سے عذر خواہی کا حق چھین لیا تھا۔

ہمارے باہمی نور والے کہا کرتے تھے کہ جس درجے کی توفیق نہ ہو اُس کا اعلان نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بات تو عمر کے آخری حصے میں سمجھ میں آئی لیکن اُس وقت خاں صاحب کو خط لکھ کر خط پا کر کچھ ایسا سرور ملتا تھا کہ اس شغل سے چھٹکارا ممکن نہ تھا۔ محبت کا دماغ میں وہیں وقوف ہے جہاں عادت، نشہ، اُکھا جٹ اور لذت کا مقام ہے۔ سگریٹ، ہیروئن، چرس، بھنگ، ایون یہ سارے شوق ہل من مزید کا نعرہ لگاتے ہیں۔ کچھ ایسی کیفیت محبت کی بھی ہے..... یہ آخری بار مل لوں..... آخری بار دیکھ لوں..... بس یہی آخری لمس ہوگا۔ غالباً جنس اور محبت دو علیحدہ دماغی حصوں میں بسرام کرتے ہیں۔ محبت تسلسل کی آرزو مند ہے جبکہ Sex اُبال کی شکل میں گھیرا ذاتی ہے..... محبت کا متلاشی کبھی کبھی جان سے گزر جانے کو بھی کھیل سمجھتا ہے۔ مشکل تب پیش آتی ہے جب محبت میں اعتراف کی گانٹھ دونوں رسیوں میں مضبوط ہو جاتی ہے.....

اب اس محبت کو دائمی بنانے کی اُلجھن شادی کا کہا اور اُن کہا وعدہ بن جاتی ہے..... روزِ ازل سے مرد اور عورت جب کبھی محبت کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں اُنہیں معلوم نہیں ہوتا کہ یہ سفر جو انہیں ایک دوسرے سے commit کر رہا ہے لمبا

بھی ہے اور پُر خطر بھی۔ اس میں وعدے کا پاس بسا اوقات گلے کا پھندا بن جاتا ہے۔ جس طرح کبھی کبھی منشیات بڑی قیمت وصول کرتی ہیں ایسے ہی محبت اور شادی پر منج ہونے والی محبت ایک بہت بڑا چیلنج بن کر زندگی میں داخل ہوتی ہے۔۔۔۔۔

جس درجے کی توفیق نہ ہو اس کا اعلان کر چکنے کے بعد آدمی کو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ روزمرہ کی زندگی میں نشہ آور سرور کہاں گم ہو گیا؟ وہ ربط باہمی کس مقام پر کیوں اور کیسے Clash میں بدل گیا۔۔۔۔۔ انسان چونکہ فطرتاً آزاد ہے۔ اس شادی کے بندھن میں جو سب سے بڑا چیلنج اُسے پیش آتا ہے وہ یہی Free Will کی آزادی ہے۔

شادی کے بعد اپنا ارادہ ذات اور فیصلے کسی کی خاطر اپن کر کے مسرت محسوس کرنا ہر ایک آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اللہ بھی کسی شخص کو اُس وقت تک ہدایت نہیں دیتا جب تک انسان اپنی خوشی یا فیصلے سے اللہ سے ہدایت طلب نہ کرے۔ شادی میں بھی مکمل سرور اسی وقت ملتا ہے جب اپنے فیصلے سے اپنی قوت ارادی کو ساتھی کی خواہش پر قربان کرنے کا شوق، ولولہ اور جوش نہ ہو۔ اس سلسلے میں آج کل کے نوجوانوں کے لیے یہ کتاب رہنمائی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔

جس قدر بڑی Commitment ہو اگر اعلان بھی اتنا ہی بلند بانگ ہو جائے گا تو اسی تناسب سے اپنی Free Will بھی چھوڑنا ہوگی۔ پھر رشتہ محمود وایاز کا بن جائے گا عاشق و معشوق کا نہ رہے گا۔ پھر نمرود کی آگ میں کود بھی جائیں تو آگ جلانہ سکے گی، لیکن عام طور پر محبت اور نشے کی اولین حالت میں انسان مذہب سے داری کو سمجھتا ہے نہ دوراندریشی ہی سے اُس کا تعلق ہوتا ہے۔

اسی لیے محبت کی شادیاں عموماً Disillusionment پر ختم ہوتی ہیں اور ساتھی تو تعاقب لگانے کے بعد اپنا اپنا خیمہ اکھاڑ کر یا تو طلاق کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں یا پھر Extra-marital تعلقات میں پناہ لیتے ہیں۔ یہ تعلقات خلع یا طلاق کسی طور بھی مسئلے کا حل نہیں ہوتے کہ غلطی تو انسان کی اپنی شخصیت اُس کے اپنے مرکز میں ہوتی ہے۔ وہ کسی صورت بھی اپنا ارادہ فیصلہ تجویز چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔۔۔۔۔

دوئی ہوتے ہوئے کیجائی پر اصرار کیوں؟ یہ کتاب اس اُمید پر چھاپ رہی ہوں کہ آج کل کے تیز رفتار جلد اکتا جانے والے ہمہ وقت تبدیلی کے آرزو مند سوچ سمجھ کر اس دریا میں قدم ڈالیں۔ ہو سکتا ہے کہیں کہیں پانی گہرا ہو اور آپ کو تیرنا بھی نہ آتا ہو۔

میری شادی ہمارے دونوں گھر والوں کے لیے ایک لائٹل مسئلہ تھا۔ خاں صاحب کے خاندان والے روایات کے پابند سکندری طبیعتوں کے مالک خود اعتماد لوگ تھے۔ اُن کے خاندان میں کبھی کسی نے روایات توڑ کر باہر کی کسی لڑکی سے شادی کا سوچا بھی نہ تھا۔

جب خاں صاحب کی آوی جاوی کالج کے بعد 24- کینال پارک تک بڑھی تو گھر والے بے طور متوجہ ہوئے۔ اُن کے گھر میں ریڈارٹ جاری ہو گیا۔ گھر والے منہ سے تو کم بولے لیکن تیل اور تیل کی دھار دیکھتے رہے۔ اُن کا خیال تھا کہ اونٹ چاہے کسی کروٹ بیٹھے اُن کی روایات کو پامال کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

ادھر جب میری والدہ نے اپنی معاملہ فہمی سے معاملے کا پڑتا لگایا تو ایک روز وہ چرخہ خرید لائیں۔ اسے

تہذیب میں لگایا۔ ساتھ روئی کی پونیاں ایک ٹوکری میں رکھیں اور کہنے لگی ”کاکی..... میں بی بی اے بی ٹی ہوں..... انسپکٹرس آف سکولز ہوں، لیکن میں سمجھتی ہوں مسائل کے سوچنے اُن کی کیریئر کے لیے چرنے سے اچھا کوئی مشغلہ نہیں۔ اتنی بی بی کات لو کہ تمہارے کھیس تیار ہو جائیں اور تم اپنے شوہر کو دکھا سکو کہ تم سلیقہ شعرا بھی ہو اور پڑھی لکھی بھی.....“

پھر میری امی نے مجھے چرنے کی ہتھی پکڑا پونی اٹھا کر دھاگے کو نہ ٹوٹنے دینے کا فن، مال پر نظر رکھنے کے گر سکھائے۔ میں جلد ہی چرخہ کاتنے کا ہنر سیکھ گئی۔ کروڑیے پر تو عبور حاصل نہ کر سکی جس میں میری والدہ ماہر تھیں اور اپنے ہاتھ سے انہوں نے بہت سی جالیاں، ٹوپیاں، میز پوش بنا رکھے تھے، لیکن مجھے ٹیٹو کا شوق پیدا ہو گیا اور میں گرہیں ڈالنے اور ان سے دوپٹے کی لیس بنانے میں ماہر ہو گئی۔ مجھے سلیقہ شعرا بنانے کے دوران ایک روز انہوں نے کہا..... ”میرے پاس اس وقت دورشتے ہیں۔ بسوں کا سرکاری نیٹ ورک نیا نیا کھلا ہے وہ اس کا کرتا دھرتا ہے..... دوسرے ایک کنٹرل صاحب ہیں۔ یہ رشتہ تمہاری سہیلی محمودہ منظور لائی ہے۔ فیصلہ کر لو۔ زبانی نہ بتا سکو تو محمودہ کے ذریعے بتا دینا.....“

میں نے خرات کر کے کہا..... ”مجھے اگر شادی کرنا ہے تو اپنی مرضی کی کرنا ہوگی۔ اگر بوجہ وہاں میری شادی نہ ہو سکی تو میں ساری عمر نوکری کروں گی..... لاہور کالج فار ویمن میں اردو کی لکچرار بن جاؤں گی۔ کنیئر ڈ میں پڑھا لوں گی۔“ انہوں نے میری مرضی نہ پوچھی اور رساں سے بولیں ”دیکھو کاکی! جب بھی آدمی اپنی مرضی کرتا ہے اُسے کچھ قیمت بھی ادا کرنا پڑتی ہے..... اچھی طرح کاتتے وقت سوچ لو..... بھاری قیمت ادا کر لوگی؟“

تو قارئین! یہ کتاب وہ خام مواد ہے جس کو کوئی ثقہ، مشرق، گہرائی سے موتی نکالنے والا تحقیق نگار جناب اشفاق احمد پر ایک جامع کتاب لکھتے وقت کچھ کچھ استعمال کر سکتا ہے۔

کبھی کبھی وقت کی گرد خود شخصیت کی تصویر پر اس طرح پڑ جاتی ہے کہ اُس پر نہ تو کسی کو مزید کام کرنے کی سوجھتی ہے نہ نئی پود کو اپنے مشاہیر ہی کو سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بہر کیف میں نے یہ ساری یادداشتیں بہت سینت سینت کر امانت رکھی ہیں کیونکہ میرا خیال ہے کہ یادوں میں قلبی ذہنی، نفسیاتی کیفیات بڑی واضح ہو جاتی ہیں۔ انسان قلم اور کاغذ سے آگے اظہار کی ایک اور سرحد چھونے لگتا ہے جو گفتگو میں فروغی حد سے آگے نہیں بڑھتی۔

انسان نے اظہار کے لیے ہمیشہ خطوط، پھول، مٹھائی، کپڑے، زیورات استعمال کیے ہیں۔ مشرق میں گجرے، موتیے، چنبیلی کے گتھے ہوئے اور گونے کناری سے سجے زیبا نشی بارہم سب کی یادوں میں پنہاں ہیں۔ مغرب کے لوگ گلدستے دینے کے عادی بن گئے ہیں۔ کارڈ بھیجنے اور اس پر خوبصورت عبارتیں لکھنے کے شوقین ہیں۔ اب تو ہم لوگ بھی گلدستے اور کارڈ بھیجنے کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن ارتکا زرار اور دولت کے شیدائی ہونے سے پہلے مشرق میں اپنا آپ اپن کرنے کا رواج تھا۔ جس قدر تعلق خاطر ہوتا اسی تناسب سے اپنا وجود ہاتھ جوڑ کر پیش کر دیا جاتا اور آرتی اُتارنے کے لیے یاد سے بہتر کوئی تھا ہی نہ تھی۔

عجیب سی بات ہے کہ سارے بہن بھائیوں کی لکھائی اور گفتگو ایک سی ہے۔ اس سے بھی عجیب تر بات یہ ہے کہ خاں صاحب کے والد ڈاکٹر بابا محمد کے آٹھوں بچے ایک ہی طرح سوچتے تھے۔ ایک ساڑھے پتے اور ایک سے الجھاؤ کا شکار تھے۔ ویسے تو زندگی گزارنے کا کوئی حتمی نسخہ ابھی ایجاد نہیں ہوا، لیکن ہر فرد اپنی Genetics اور ماحولیات سے جو کچھ

اخذ کرتا ہے وہی اُس کا خام مواد ہے۔

پھر اس مواد سے وہ کوزہ بنائے یا لوٹا، صراحی، طبلے یا سوہنی کا کچا گھڑا۔ بہر کیف اُسے راستہ خود ہی بنانا پڑتا ہے۔ ان بہن بھائیوں نے بھی اپنے اپنے جینے کا ڈھنگ علیحدہ علیحدہ بنایا لیکن اس علیحدگی کے باوجود ان میں ایک مشابہت ہے جو نئے ملاقاتی کو بہت متاثر کرتی ہے..... یہ جادو گر قسم کے لوگ ہیں جو نظر بندی کا فن جانتے ہیں، لیکن کسی کو اندر کے انتشار کی خبر نہیں ہونے دیتے.....

ان یادوں سے یہ بھی واضح ہو جائے گا کہ ان کے اندر متضاد جذبات کی جنگ ہمیشہ جاری رہی۔ ان ہی جذبات کے باعث خاں صاحب کٹکٹش، اداسی، منزل پر پہنچ کر بھی منزل سے مایوسی کا چسکا پالتے رہے۔ انہیں منیر نیازی کی طرح کوئی موسم، کوئی جگہ، کوئی شہر مکمل طور پر اس نہیں آیا۔ یہ موسم جناب اشفاق احمد پر تو اُس وقت تک طاری رہا جب تک وہ جناب حنیف رامے کے بڑے بھائی رشید احمد چودھری کی وساطت سے باباجی فضل شاہ نور والے کے پاس نہ پہنچے۔

اپنے کسی خط میں انہوں نے اپنے والد بابا محمد خاں کو تحریر کیا ہوگا کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہیں۔ یہ خط چونکہ باباجی کو لکھا گیا مجھے معلوم نہیں انہوں نے اسے محفوظ رکھا یا تلف کر دیا، لیکن اشفاق صاحب نے ایک بار مجھے اس خط کا متن بتایا تھا۔ باباجی کا خط اُس باپ کی رائیگاں کوششوں کا بیانیہ ہیں جس نے ہر طرح سے بچوں میں خود اعتمادی، زندگی سے دست چھین کرنے کی صلاحیت اور تعلیم کو تھیا رہنا کراستعمال کرنے کی کوشش میں دن رات ایک کر دیا تھا، لیکن کیا کیا جائے یہی تو زندگی ہے۔ سائنس اصول بناتی ہے اور اُس پر کار بند رہتی ہے، لیکن زندگی کوئی اصول نہ گھڑتی ہے نہ تجویز کرتی ہے..... کسی نتیجہ پر قابض نہیں۔ یہاں مثبت سے منفی اور منفی سے مثبت نتائج نکلتے رہتے ہیں۔ زندگی بہر حال اصول کے ساتھ نہیں، اوپر والے اصول ساز کے ساتھ چلتی ہے۔

خاں صاحب کی Genetics کو سمجھنے کے لیے اُن کی فیملی بیک گراؤنڈ کو سمجھنا مفید رہے گا۔ میں جو کچھ سنی سنائی جانتی ہوں وہی گوش گزار کر سکتی ہوں۔ لمبے ساتھ کی وجہ سے بہت کچھ جان گئی ہوں، لیکن مجھے بخوبی علم ہے کہ ہر انسان سر بستہ راز ہے حتیٰ کہ وہ خود بھی اپنے وجود سے کئی طور پر آگاہ نہیں ہوتا۔ صرف عرفان ذات کے ماہر صوفی واقعی بڑی سہولت سے اپنے آپ کو جان کر اپنے رب کو پہچان لیتے ہیں، لیکن یہ کسی نصیب والے کو آگاہی ملتی ہے کہ عرفان ذات ہی عرفان حق ہے۔

دراصل میں جب گورنمنٹ کالج میں تھی تو میں 1- مزنگ روڈ سے واقف نہ تھی، لیکن جب ہماری رہائش 24- ایس کینال پارک میں ہوئی اور خاں صاحب میرے بڑے بھائی پرویز سے سرورق بنوانے کے سلسلے میں آنے جانے لگے تو 1- مزنگ روڈ میری زندگی میں کسی انجانی سلطنت کے دارالحکومت کی سی کشش اختیار کر گیا۔

بہار کا موسم ہو یا خزاں کی رُت، کچھ پودے اور درخت اپنے اپنے مقررہ وقت پر پتے ہوا کے دوش پر اُچھالنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اسی طرح درختوں، پھولوں سے بھی پولن جھڑ کر ہوا میں اُڑا کرتا ہے۔ سنبل کے پھوئے، روٹی کا پولن، چیز کے درخت سے جھڑنے والے جنگلی چلغوزے..... اور اسی طرح کینچلی اُتار چھینکے والے سانپ، جھیرے بالوں والے

جانوروں کے بال، مرغابیاں اور کچھ مختلف قسم کی بطخیں اور migrate کرنے والے پرندوں کی سرشت میں موسم کی تبدیلی کے ساتھ ہجرت آتی ہے۔ وہ ڈاروں کی شکل میں پڑاؤ ڈالتے، سستاتے، نئے چشموں، سرد ہواؤں سے بچتے غیر شعوری طور پر تختوں، نوں، باغوں اور ریتیلے ساحلوں (Beaches) پر اترتے ہیں۔

ایک مدت انسان صحرا، نورڈ خانہ بدوش گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والا رہا ہے۔ پہلے یہ ہجرت کا سلسلہ گروہ کی شکل میں ہوا کرتا تھا اور جب ڈنڈا ڈولی کر کے خانہ بدوش ساتھ ساتھ چلتے تو خوف، خوشی اور Excitement میں اُس کا موڈ بدل جاتا..... ہجرت کی روایت بہت پرانی اور انسان کے ہوں ارتعاش اور تبدیلی پیدا کرنے والی رہی ہے.....

لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب ہجرت کرنے والا عموماً اکیلا وطن چھوڑتا ہے۔ پردیس کی صعوبتیں سہتا، سنے، ماحول اور موسم کے تھپڑے کھاتا ہے۔ عموماً تحریک تلاشِ معاش ہوتی۔ اب نگری نگری گھومنے والے کو بنیادی طور پر فیصلہ خود کرنا پڑتا ہے۔ گروہی ہجرت یا Migration میں فیصلہ عموماً پورا قبیلہ یا گروہ کے سربراہ کیا کرتے تھے لیکن اب ہجرت ایک فرد کا نصیب ہے۔

خال صاحب کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اُس تضاد کو زیرِ غور رکھنا بے حد ضروری ہے جو ہر اقلیت کو درپیش رہتا ہے۔ ہر اقلیت جب ہجرت کر کے کسی نئے دیس میں بسرام کر لیتی ہے تو وہ اپنے رسم و رواج، بولی، اندازِ زیست و اقدار ساتھ لاتی ہے۔ نئے ماحول میں اُسے عجیب قسم کی Insecurity کا سامنا رہتا ہے۔ وہ خوف اور احساسِ کمتری کا اس لیے شکار ہوتی ہے کہ کہیں اکثریت میں اُس کی شناخت گم نہ ہو جائے۔ ساتھ ہی ساتھ لاشعوری طور پر اُسے ہموار اور متوازن زندگی کے لیے وہ سہولیات، مراعات اور رعایتیں بھی درکار ہوتی ہیں، جو کسی اکثریت کو اس طرح پیدا کئی طور پر ملتی ہیں، جس طرح دریا میں بسنے والی مچھلی کو پانی۔ اکثریت کو کبھی اپنی خوش نصیبی کا شعوری احساس پیدا نہیں ہوتا۔

اشفاق احمد کے بڑے بچوں نے فیصلہ کیا کہ وہ افغانستان چھوڑ کر ترائی کی جانب پنجاب کی طرف جا سیں۔ خدا جانے مہمند قبیلہ جتوں کی شکل میں عازم سفر ہوا کہ چھوٹے چھوٹے خاندان اپنا اثاثہ بار بردار جانوروں پر لاڈ و مشکل راستوں سے ہو کر مختلف جغرافیائی حدود میں ہونٹ سکیڑے کچھ اداس، کچھ پُر امید، کچھ ہراساں چلتے چلتے پنجاب میں آئے۔ ہوشیار پور کے مقام پر انہوں نے جو توں کے تے کھول دیئے اور اپنی کاشتکاری کی روایت کو قائم رکھا۔ مہمند قبیلہ موروثی طور پر کھیتی باڑی کے پیشے سے منسلک تھا، لیکن چونکہ یہاں زمین دستیاب نہ تھی، محمد مستقیم خاں اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مقامی بار اتوں کے ساتھ حفاظتی جتہ بنا کر چلا کرتے۔ رفتہ رفتہ وہ تجارتی قافلوں کے ہمراہ اسلحہ سجا کر حفاظتی گروہ بنا کر سفر کرنے لگے۔ دو تین بیڑھیوں کے بعد اسی خاندان میں محمد معظم خاں نے جنم لیا، جو اشفاق صاحب کے دادا کے والد تھے۔

جناب اشفاق احمد مہمند پٹھان تھے۔ وہ اپنی اس شناخت کو چھپاتے تھے۔ پاکستان بننے سے بہت پہلے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ خاں لکھنا چھوڑ دیا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ پاکستان مسلمانوں کا دیس ہوگا۔ وہاں نہ نسبی، نہ علاقائی زبانوں ہی کا تفاخر ہوگا۔ یہ دھرتی مہاجر اور انصار کی سانجھی ہوگی اور انصاف کے تحت چلنے والا نظام رائج ہوگا۔ اسی خواب میں گم انہوں نے 39 برس تلقین شاہ لکھا، لیکن اصل تضاد یہی تھا کہ انہیں اپنے مہمند قبیلے سے بھی عشق تھا۔ وہ اپنی روایات سے بھی محبت

کرتے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ ذات برادری سے باہر شادی کر کے ان روایات کو توڑنا بھی نہ چاہتے تھے۔

ان کے پُرکھ جب ہجرت کر کے پنجاب میں پہنچے تو تمام اقلیتوں کی طرح انہوں نے اپنی شناخت قائم کرنے کے لیے مٹھی بند معاشرہ قائم کیا۔ یہ لوگ نہ مداخلت کرتے تھے نہ مداخلت برداشت کرتے تھے۔ انہما کے مہمان نواز لیکن دوستی کو دسترخوان سے آگے نہ بڑھنے دیتے۔ میل جول میں اس درجہ محتاط کہ ذات برادری سے باہر شادی کا تصور ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ یہی تضاد اندر ہی اندر خاں صاحب کو دیمک کی طرح چاٹنے لگا۔

جب انہوں نے مجھ سے شادی کا ارادہ کیا تو یہی تضاد آری کی طرح اُن کے اندر چلنے لگا۔ اسی سے فرار حاصل کرنے کے لیے انہوں نے کئی راستے اختیار کیے۔ کبھی مری، کبھی جہلم، کبھی کراچی اور آخر میں اٹلی ٹھکانا بنا کر ایک اور ہجرت کر لی۔

خاں صاحب کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ خاں صاحب کے دادا دوست محمد خاں خاندان کی آبرو اور پہلے قابل ذکر آدمی تھے۔ بے انتہا خوبصورت ذہین اور دُھن کے پکے تھے۔ بد قسمتی سے ان کی شادی ایک کرہیہ صورت سانولی بد ہیئت پٹھان لڑکی سے کر دی گئی۔ نہ انہیں شادی سے پہلے دلہن دکھائی گئی نہ کسی نے آمادگی ہی پوچھی۔ دوست محمد خاں صاحب کے دادا جمال پرست تھے۔ بیوی کو دیکھ کر دل ٹوٹ گیا۔ یہ پٹھان بچہ حسن میں بے مثال و جاہت میں لاٹھانی تھا۔

ویسے تو شکل و صورت اُوپر والے کی دین ہے۔ انسان اپنے آپ کو اس سلسلے میں تبدیل کرنے سے قاصر ہے لیکن کیا کیا جائے سفید تو میں سیاہ اور براؤن جلد کو بھی معاف نہیں کرتیں اور عموماً اس درجہ خود پرست ہوتی ہیں کہ وہ سیاہ شکل و صورت والے فرد کو مکمل طور پر ہی رد کر دیتی ہیں۔ یہی مسئلہ دوست محمد خاں کو درپیش ہوا۔ بیوی کا گھونگھٹ اٹھاتے ہی انہیں ابکائی آئی۔ بیوی کو پٹھانی تھی لیکن سانولی بھی تھی اور بد شکل بھی۔ اُدھر دوست محمد خاں کا حسن گریک مجسمے کا سا تھا۔

دوست محمد خاں نے دل میں ہجرت کی تھانی۔ چپ چاپ حیدرآباد کا قصد کیا لیکن روہیں تو اُوپر والے کے حکم سے رحم میں اترتی ہیں۔ باباجی محمد خاں کو اس دنیا میں دوست محمد خاں جیسا پڑھا لکھا خوبصورت باپ ملنا تھا سو وہ اپنی بد صورت ماں کی گود میں پروان چڑھنے لگا۔ دوست محمد خاں کے بیٹے اور خاں صاحب کے والد اپنی ماں سے مشابہ تھے۔ باباجی محمد خاں کا قد چھوٹا، رنگ گہرا سانولا، چہرے پر چیچک کے داغ، ناک نقشہ بھدا تھا۔ وہ اپنے نستعلیق باپ دوست محمد خاں سے ہر طور مختلف تھے۔

باباجی دوست محمد خاں کی پذیرائی حیدرآباد دکن میں سرخ قالین پر ہوئی۔ وہ دربار میں اپنی فضیلت، فارسی دانی اور علم دوستی کے باعث جلد اتالیق کے عہدے پر پہنچ گئے اور نواب زادوں کی تربیت خوب نبھانے لگے۔ گو اُن کا تعلق اپنی بیوی کے ساتھ نہ تھا لیکن دوست محمد خاں باقاعدگی سے اپنی بیوی اور بچے کی کفالت کرتے تھے اور بیٹا گورنمنٹ کالج سے ملحق Montmorancy College میں جسے عوام ڈگر ہسپتال کہتے تھے، تعلیم پانے لگے۔ باباجی محمد خاں شکل و صورت میں والدہ کی طرح تھے اور ذہانت، علم دوستی اور استقامت میں اپنے علم دوست باپ پر گئے تھے۔

میں یہ باتیں آپ کو کسی طور پر کسی دعویٰ کے ساتھ پیش نہیں کر رہی۔ یہ ساری سنی سنائی، منہ در منہ کی کہانیاں ہیں۔ سارے بہن بھائی ایک ہی کہانی مختلف انداز لب و لہجہ اور بناوٹ میں سناتے تھے لیکن ہر ایک کے لہجے میں وہی تقاضا

یہی اور تازگی ہے۔ اس سارے خاندان کو اپنے دادا دوست محمد خاں کے حسن پرناز اور اپنے پیرزاوے ہونے پر فخر ہے۔ پردیس بسنے والے والد کی ساری توجہ کا نتیجہ تھا کہ خاں صاحب کے والد محمد خاں پڑھتے چلے گئے اور Montmorancy College سے ڈگری ڈاکٹر بن کر نکلے۔ اب انہیں اپنی کلاجانے کے لیے دو چیزیں درکار تھیں۔ ایک تو اپنی بد صورتی چھپانے کے لیے خوبصورت بیوی، دوسرے اپنے پروفیشن میں نام پیدا کرنے کے لیے مناسب مقام۔ باباجی محمد خاں نے خاں صاحب کی والدہ بی بی سردار بیگم سے شادی کی جو اس درجہ خوبصورت تھیں کہ ابھی تک ان کے سارے خاندان میں ان کے مد مقابل کوئی صورت نہیں آسکی۔

قدرت ہر انسان کو اُس کے عمل کی کچھ جزایا سزا تو نہیں عطا کر دیتی ہے، کچھ حساب کتاب کے لیے اُس نے عذرت کی شرط لگا رکھی ہے۔ جس طرح آواگان کا فلسفہ بہتر عمل کی طرف راغب کرنے کا ایک نسخہ ہے۔ ایسے ہی قیمت کا اندیشہ بھی انسان کو نیک عمل کرنے پر اکساتا ہے اور اللہ کو قرضِ حسد دے کر اپنا اعمال نامہ دائیں ہاتھ میں لے کر نشتے کی خواہش ہر مسلمان کے دل میں دھڑکنے لگتی ہے۔

باپ کے رویے کی وجہ سے ڈاکٹر محمد خاں میں بھی ایک گہرے تضاد نے ہولے ہولے جڑیں پکڑ لیں۔ انہوں نے کبوتر پالنے اور پتنگ بازی کا مشغلہ جو انہیں دل سے پسند تھا چھوڑ دیا۔ ذمہ داری کو اڑھنا بچھونا بنالیا، لیکن جس باپ کے احسان تلے وہ پس رہے تھے اُس کے شکر گزار ہونے کے ساتھ ساتھ اُس کی عدم موجودگی کے باعث وہ اُسی سے شدید عزت بھی کرتے تھے۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ وہ زندگی میں باپ سے بڑھ کر کچھ کر دکھائیں گے۔ ایک طرف تو وہ شادی کے بعد صحت سے نفرت کرتے تھے اور دوسری طرف انہوں نے خاندان کی سب سے خوبصورت لڑکی سے شادی بھی کر لی تھی۔

کسی وقت کسی مقام اور لمحے نے فیصلہ کیا اور باباجی نے منفی جذبات کو نیام میں بند کیا اور فیسرین کے موجد بن گئے۔ مکتسر میں ایسے مشہور ڈگری ڈاکٹر ہوئے جو گھوڑے کو نیکہ لگا کر اکیلا ہی ڈھا سکتا تھا۔ بڑے بڑے سکھ سرداران کے مرید ہو گئے۔ اُن کی خوبصورت بی بی سردار بیگم اُن کی کارکردگی کے باعث اُن کی مطیع ہو گئیں۔ ہولے ہولے انہوں نے جانور چھوڑا انسانوں کا علاج شروع کر دیا۔ شفا شامل حال رہی اور اُن کے مریض زور زور سے آنے لگے۔

باباجی محمد خاں بھی ایک بڑی تو موتمند شخصیت تھے۔ وہ ہر کام کرنے سے پہلے اپنی دور رس دانش سے اُس سے پیدا ہونے والے اثرات کے نتائج اخذ کر لیتے۔ تجویز اُن کی بیساکھی لائٹھی، چوب، ہناؤ پچاؤ تھی۔ شاید ڈاکٹر محمد خاں کو علم نہ تھا کہ بول تو انسان کا علم قلیل ہے۔ پھر اس کی تجویز پانی دینے پر مامور ہے، لیکن پھل پھول لانے پر قادر نہیں۔ انسان کو رزقِ حلال کمانے کا حکم ضرور ملا ہے، لیکن وہ کس قدر رزق کما سکے گا اس کا کسی شخص کو علم نہیں۔ باباجی محمد خاں بھی ہر محنتی، ترقی پسند، ناک کی سیدھ چلنے والے آدمی کی طرح اپنی محنت کو حرفِ آخر سمجھتے تھے۔ انہیں Genetics کی کھیل کا علم نہ تھا نہ ماحول میں چھپے ہوئے شگست دینے والے عناصر ہی کا کوئی بھجاؤ تھا۔

شاید ڈاکٹر صاحب کو علم نہ تھا کہ کئی بار بغیر ڈگریاں حاصل کیے انسان اللہ کی مہربانی سے فلسفی، شاعر، مجتہد، عالم بن کر وقت پر اثر انداز ہو جاتا ہے، لیکن اُسے علم نہیں ہوتا کہ یہ طاقت غیب سے کیونکر آئی۔ کیا اس کی تحریک کوئی دُعائی یا وہ دفنِ آرزو و شوق اور خواہش تھی جو آسمان چیرتی اللہ کے حضور پہنچتی رہی۔

بہر کیف اپنا پیشہ چکانے کی خاطر انہوں نے ملکشر مشرقی پنجاب کا قصباتی گاؤں چنا۔ یہاں سکھ سرداروں کی لہہاتی زمینوں پر گھوڑے، بھینسیں، بکریاں، ٹٹو ہر قسم کے جانور تھے۔ ڈنگر ڈاکڑ کی لحاظ بہ لحاظ احتیاج رہتی تھی۔ ہوتے ہوتے وہ خلیق خدا کی بنصیں بھی دیکھنے لگے۔ عورتوں کے امراض پر بھی حاوی ہوتے چلے گئے۔ آہستہ آہستہ انہوں نے ایک حویلی نما گھر بھی بنا لیا، جس میں باہر ایک باغ تھا جس کو باباجی پائیں باغ کہتے تھے۔ اب گھوڑوں کا اصطبل بھی وجود میں آ گیا۔ بھانت بھانت کے اعلیٰ نسلی گھوڑے بندھے نظر آنے لگے۔

باباجی کو گھڑ سواری کا بے حد شوق تھا۔ اُن کا خیال تھا اعلیٰ نسل کی بیوی، اعلیٰ نسل کا کتا، اعلیٰ Pedigree کا گھوڑا، اعلیٰ نسل کے اشراف کی نشانی ہے۔ دراصل مرد کو ازل سے سواری کا شوق رہا ہے۔ آج کل کے زمانے میں گھوڑے نہیں چرائے جاتے، اب کاریں اس شوق کے زیرِ عتاب آچکی ہیں۔ بڑی گاڑیاں Status سمبل بن چکی ہیں اور ان کے بغیر مرد اپنے آپ کو نامرد سمجھنے لگتا ہے۔ ہر بینک رہن پر گاڑی فروخت کر کے خلیق کی گھڑ سواری کا شوق exploit کر رہا ہے۔

ڈاکٹر محمد خاں نے اپنے آٹھ بچوں کو گھڑ سواری سکھائی۔ آپا فرخندہ اور آپا فرحت تک یہ فن جانتی تھیں۔ حالانکہ مسلمان گھرانوں میں تب پردہ سخت تھا۔ آفتاب بھائی اور خاں صاحب پڑھنے لکھنے والی شخصیتیں تھیں۔ انہیں اس لبو و لعب کا کوئی شوق نہ تھا لیکن ان کو بھی بابا محمد خاں نے بدو بدی گھڑ سواری سکھائی۔ مارے باندھے یہ بھی باپ کے شوق میں شامل ہوتے رہے، لیکن گھڑ سواری نہ بن سکے نہ پولو جیسی کھیل ہی میں دلچسپی لے سکے۔ حالانکہ اسٹیج بھائی نے دیہاتی بچوں کی پولو ٹیم بنا رکھی تھی اور رات کو پولو کی گینت کوشی کا تیل لگا کر جلاتے اور دیہاتی لونڈوں کو پولو کھیلنا سکھاتے۔

دوسری تجویز باباجی نے علم کے پیچھے سردھڑ کی بازی لگانے میں صرف کی۔ وہ سمجھتے تھے کہ پڑھ لکھ کر ہی انسان دوست محمد خاں بن سکتا ہے۔ باباجی محمد خاں اپنے تعلقات میں ہر بڑے آدمی کی طرح تضاد کا شکار رہتے تھے۔ جس والد سے احساسِ محرومی کے تحت انہوں نے نفرت پال رکھی تھی، وہی والد کہیں اُن کا رول ماڈل بھی بن گیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ بغیر تعلیم کے کوئی شخص نہ مکمل ہو سکتا ہے نہ اسے خاندان یا معاشرے میں کوئی مقام ہی حاصل ہونے کے امکانات تھے۔

اسی تجویز کے تحت انہوں نے گھر پر ریویشن سنٹر کھول لیا۔ صبح سویرے چار بجے ہسپتال جانے سے پہلے اپنے بیٹوں کو اٹھانے کا حکم تھا۔ ماسٹر جی آجاتے۔ وہی ماسٹر جی جو خاں صاحب کو ”گولومولو“ کہتے تھے اور دسویں میں پہلی بار فیل ہو جانے کے بعد ان ہی داؤ جی کے گھر جناب اشفاق احمد خاں صاحب کو منتقل کر دیا گیا اور یہیں سے اُس ”گڈ ریا“ کی شخصیت اخذ کی گئی جو بعد میں اردو ادب کے کلاسیک کا حصہ بن گئی۔

مارے باندھے جمائیاں لیتے آفتاب بھائی، افتخار بھائی، اقبال بھائی، اسٹیج بھائی اور خاں صاحب اٹھتے۔ رات کو گھر سے چوری چوری نکل کر اسٹیج بھائی کی ایجاد کردہ پولو کھیلنے سے ویسے ہی جسم چور ہوتا لیکن باباجی کا خوف غالب رہتا اور مارے باندھے اٹھتے۔

زندگی کی کروٹوں کو لاکھ جوش سے سمجھنے کی کوشش کریں، استخارے نکالیں، فال ڈال کر مستقبل تک رسائی حاصل کرنے کی سعی کریں۔ یہ اپنی کروٹیں اپنی مرضی سے لیتی ہے۔ حیدرآباد میں نواب صاحب کے بیٹے کا اتالیق اچانک بیمار ہو گیا۔ لاکھ درباری حکیم نے معجونیں شربتیاں، عرق پلانے، لیکن افاق نہ ہوا۔ دوست محمد خاں پر فالج کا حملہ ہو گیا۔

بابا دوست محمد خاں نے اپنی بیوی کی بد صورتی کے ہاتھوں اپنے آپ کو فرار کے عمل سے دوچار کیا تھا لیکن اللہ تو اوزن قائم کرنے پر تولا بیٹھا ہے۔ حیدرآباد میں جب بابا دوست محمد خاں پراچانک فالج کا حملہ ہوا تو بابا جی محمد خاں جو بے پردہ اپنے گھر کی چھت پر کبوتر اڑایا کرتے تھے اور لا ابالی طبیعت کے مالک تھے اچانک سنبھل گئے۔ ایک فالج کی آفت سے اللہ نے باپ بیٹا دونوں کے رخ موڑ دیئے۔ تو اوزن کے پلڑے برابر کر دیئے گئے۔ بابا جی محمد خاں اپنی بے حد خوبصورت بیوی سردار بیگم کے پاس آئے اور بولے ”میرے والد حیدرآباد میں بیمار پڑے ہیں۔ میں انہیں گھرانہ چاہتا ہوں۔“ یہ عہد بیویوں سے ڈرنے کا نہیں تھا۔ مرد ابھی اپنی فضیلت کے نشے میں سرشار صیہونیت کو خوبی سمجھتے تھے۔

”لے آئیں جی..... جیسی آپ کی مرضی.....“ دراز قد اماں جی نے کہا۔

بابا جی نے کھج کھا کر کہا ”اس بار میری مرضی نہیں تمہاری رضا چاہیے۔ بابا جی فالج کے مریض ہیں۔ ان کو نہلانا چھلانا بول و براز کئی گندے کام ہوتے ہیں، کروگی؟..... میں تو ہسپتال میں رہتا ہوں۔ زیادہ بوجھ تو تم پر ہی ہوگا۔“

”میں بچوں کی ماں ہوں..... میرے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں.....“

اب ڈاکٹر محمد خاں مکتسر سے حیدرآباد پہنچے۔ مردہ صورت باپ کو لے کر گھر پہنچے اور اپنی چاندی بیوی کو ان کی نرس بنا دیا۔ اماں بی نے بھی یہ خدمت دل و جان سے قبول کی۔ باپ بیٹے میں تو مفاہمت کے دروازے نہ کھلے لیکن بہونے اپنے سر کا دل جیت لیا۔ کچھ خوبصورتی سے کچھ خوبصورت عمل کے ہاتھوں۔ واقعی اماں جی سردار بیگم کے لیے اپنے سر کی تمہداری کوئی مسئلہ نہ تھی۔ انہوں نے اپنی کھلی ہوئی مسکراہٹ پھرتیلے ہاتھوں اور لہلہ لہک کی سپرٹ کے ساتھ بابا جی دوست محمد خاں کی سیوا کا بیڑہ اٹھایا اور خوب نبھایا۔

مکتسر میں بابا جی محمد خاں کا حویلی نما گھر تھا۔ اس کا آنگن کشادہ اور اس کے ویڑے میں ڈرائنگ روم کی تمام خوبیاں تھیں۔ دیہاتی ماحول کی ساری خصوصیات بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اصل میں ملازمین، اماں جی کی دیہاتی سہیلیاں، مزارعوں کی بیویاں بیٹیاں اپنی رشتہ دار خواتین کا آنا جانا رکھتا۔ تنور سلنگ رہے ہوتے۔ چولہے کے تو بے پر بھی روٹیاں دھپ دھپ پکتی چلی جاتیں۔ چار پائیاں اٹھائی چلی جاتیں۔ بچھانے کا عمل بھی اسی سرعت سے جاری رہتا۔ ان ہی چار پائیوں کو ڈائنگ ٹیبل کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ پھر ان ہی چار پائیوں پر بچوں کو نہلانے، سکھانے، مالش کرنے کے مرحلے پیش آتے۔ ان ہی چار پائیوں پر سکول سچ جاتا اور مولوی صاحب قرآن پڑھانے لگ جاتے۔ استاد صاحب کے آنے پر یہی نوٹری کچھ ادوائن والی چار پائیاں مکتب کی صورت اختیار کر لیتیں۔ تختیاں دھو کر ان ہی کے پائیوں کے ساتھ سکھانے کے لیے رکادی جاتیں۔ ان ہی کے گردا گرد ایک دوسرے کو پکڑنا، چور سپاہی کھیلنا بچوں کا معمول ٹھہرتا۔ دیواروں پر پوترے سوکھے، رضائیاں کھیس دھوپ سیکتے۔ دوپٹے لہکتے، لمبی ڈوریوں میں سبزیاں سوکھنے کے لیے لٹکتی نظر آتیں۔ ازار بند، موباف، پراندے، کمر بند، ہر نوع کی کھینچنے کسنے والی چیز نظر آتی۔

اسی آنگن سے ملحق فالج زدہ بابا جی دوست محمد خاں کا کمرہ تھا۔ فارسی اردو کی کتابوں سے آراستہ حیدرآباد دکن کے دربار کی تصویروں سے سجے کمرے میں نفیس کشمیری دوشالے، کبل سے آراستہ بستر۔ اس نستعلیق کمرے کی فضا میں..... جامی، حافظ، مولانا روم کی دانش مہکتی تھی۔ جب کبھی دو مختلف کلچر آپس میں ٹکراتے ہیں تو ایک دوسرے پر اثر انداز

ہوئے بغیر نہیں رہتے یا اللہ تعالیٰ اسی طرح جمود توڑنے کا سلسلہ جاری رکھتا ہے۔

ہولے ہولے باہر کے اثرات اندر والے کمرے پر مرتب ہونے لگے۔ کام کرنے والیوں کی محبت نے باباجی دوست محمد خاں صاحب کو تسلی، مینسی روٹی، سرسوں کا ساگ، کڑھی، بڑیاں کھانے کا شوق ڈال دیا۔ وہ کچی سبزیوں کو پسند کرنے لگے۔ مٹی لپی انگیٹھی میں جلتے اپلوں کی گرمی پر ہاتھ سینٹنے لگے۔ رفتہ رفتہ وہ سر میں اماں جی سردار بیگم سے سرسوں کا تیل جھسوانے پر آمادہ ہو گئے۔

ادھر باہر کی آبادی بھی باباجی دوست محمد خاں کی پُرکشش شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ ہولے ہولے ”جھا کا“ اترنے لگا۔ دیہاتی عورتیں آنے بہانے باباجی کو سلام کرنے اندر جانے لگیں۔ کبھی گرم پانی کی بوتل، کبھی بانٹی، کبھی چادر تبدیل کرنے کی خاطر، کبھی جھاڑو بہار کو دیز اینا کر لڑکیاں بارڈر کر اس کرنے لگیں۔

نئے پلچر نے اُن کے اندر چکا چونڈ پیدا کر دی۔ باباجی نے جامی، حافظ، مولانا روم کے اشعار انہیں رٹانے شروع کر دیئے۔ تلفظ خود سکھایا۔ آواز میں سے ڈنگر پن نکال کر شائستگی کی پیوند لگا دی۔ اب تو لڑکیاں بالیاں ڈھولک پر فارسی غزلیں گانے لگیں۔ عورتوں نے مولانا روم کے کلام سے ہندو نصائح اٹھا کر نئی پود کو عقل مت سکھانا شروع کر دی۔ گھر میں حیدر آبادی کھانے تو پکتے ہی تھے سلام دعا کا طریق بھی بدل گیا۔ اب ہاتھ کا چپو بنا کر ذرا سا کمر کو لچکا کر آداب کہنے میں لطف آنے لگا۔

یہ اللہ کی عجب کار سازی ہے کہ وہ اچھے میں سے بُر اور غلیظ میں سے پاکیزہ برآمد کرنے پر پوری طرح سے قادر ہے۔ باباجی محمد خاں کے اندر بھڑکتے کوئلے دکھتے رہے۔ پھر سرد پڑ کر دباؤ سہہ کر چمکدار ہیروں میں بدل گئے۔ اُن کی ساری توجہ رنگ گورا کرنے، کیل مہا سے چھائیوں کے بدنماداغ دُور کرنے کی طرف مبذول ہو گئی۔

دستِ تہہ سنگ نے ایک بڑی ایجاد کو جنم دیا۔ باباجی محمد خاں نے فیسرین کریم بنائی اور جا بجا اس کی سپلائی شروع کر دی۔ اب ذاتی غم و غصہ خلق کی ایک بڑی تکلیف رفع کرنے میں صرف ہونے لگا۔ پہلے یہ کریم معمولی کونڈی میں بنی۔ اسے ملانے گھوٹنے کے لیے ایک عام ڈنڈا لیا جاتا۔ ہولے ہولے جب اس کی سپلائی سارے ہندوستان میں پھیل گئی تو باباجی نے مشینوں کا سہارا لیا۔ اماں جی پیکنگ کرنے والی عورتوں کے مابین سردار قائم ہو گئیں اور کھنا کھٹ پھٹا پھٹ فیسرین کی بوتلیں جن پر نہایت معمولی لیبل اور اُس سے بھی ناقابل ذکر انداز میں فیسرین لکھا ہوتا تھا، پیک ہونے لگیں۔ مکتسر میں سنا ہے بصری تیلن اس کام میں پیش پیش تھیں۔ لاہور میں جب فیسرین پیک کی جاتی تو رجونا کین بڑی پھرتی سے ڈبیاں موڑتی جوڑتی اور اس میں سلیقے سے فیسرین کی بوتل پیک کر دیتی۔

لیکن باباجی دوست محمد خاں اور بابا محمد خاں میں دُوری کی فضا قائم رہی۔ بابا محمد خاں کے دل میں یہ بات جاگزیں ہو چکی تھی کہ میرے والد نے نہ کبھی میری والدہ کو اور نہ کبھی مجھے ہی قبول کیا۔ یہ زخم اتنا گہرا اور کاری تھا کہ اُن کی زندگی کا سارا تار و پود اسی زخم میں رنگا گیا۔

باباجی محمد خاں دل کے انتہائی نرم تھے، لیکن اُن کے رویے میں ایک ہیرے جیسی سختی تھی۔ کسی سے بغلگیر ہونا، مصافحہ کرنا، دوستانہ انداز میں ایک ہی تھالی سے کھانا، کسی لطیفے پر مل کر ہنسنا باباجی کے لیے بڑا مشکل کام تھا۔ وہ الگ تھلگ

لیے دیئے پتھر ملی نظروں سے دیکھتے۔ باباجی دوست محمد کے کمرے میں آتے جاتے رہے۔ اپنے سانولے رنگ، چھوٹے قد، چمک زدہ چہرہ اُن کو یاد دہانی کراتا رہا کہ ان ہی کی وجہ سے تمہارے والد کا دل تمہارے لیے ہمیشہ بند رہا۔

بڑے باباجی کسی بچے کو فارسی کی غزل رنا کر آنگن میں ایک کرسی پر چڑھا دیتے۔ گھر کے ملازمین، حاشیہ بردار، نحرین ارد گرد اکٹھے ہو جاتے۔ شخصیت مانجھنے خود اعتمادی پیدا کرنے میں یہ تحریک خوب کام آتی۔ بچہ بولنے کا فن جلد سیکھ جاتا۔ اُس کی زبان کھل جاتی اور جب وہ ہندوستان دھرم سکول میں اپنے سکھ اور ہندو ہم مکتبوں سے ملتا تو ایسے بات کرتا گویا سکندر کسی پورس سے ہم کلام ہو۔ بچوں میں خود اعتمادی کا یہ سارا فن باباجی دوست محمد خاں کا عطا کردہ تھا۔ سکھ استاد بھی ان فارسی آشنا شاہین بچوں سے ڈرتے تھے جو فر فر جامی حافظ اور رومی کا کلام لحن کے ساتھ پڑھتے تھے۔

بابا محمد خاں کے گھر نو بچوں نے جنم لیا۔ عجب سی بات ہے کہ یہ بچے سب کے سب دو دو سال کے وقفے کے بعد 20 مئی کو پیدا ہوئے۔ صرف اشفاق صاحب 22 اگست 1925ء میں اس دنیا میں تشریف لائے۔ سنا ہے اسی دن بابا دوست محمد خاں دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ اشفاق صاحب اور اشتیاق کے درمیان ایک بچہ اور بھی تھا جسے سب کالی بھونڈی کہتے تھے، لیکن وہ دو سال بعد فوت ہو گیا۔

سنا ہے کہ خاں صاحب ہو بہو اپنے دادا سے مشابہ تھے۔ اگر لفظ بھر ”آواگون“ پر اعتبار کر لیں تو لگتا ہے بابا دوست محمد دوبارہ دنیا میں آگئے..... اگر اسلامی روایات کے مطابق ہم اپنے باپ دادا کے گناہوں کے وارث ہیں تو عین ممکن ہے کہ اُن کی موروثی خوبیوں کے بھی امین ہیں جو ہماری Genetics میں چلن آتی ہیں۔

مرنے سے کچھ دن پہلے کا ذکر ہے اشفاق صاحب قدرے آرام میں تھے۔ کہنے لگے قدسیہ! شہنشاہ باہر اور گورونانک جی کا مکالمہ سنو گی۔

”کونسا مکالمہ؟“ میں نے سوال کیا۔

”بھائی سرور ازل..... منشی تلوک چند محرم کا تحریر کردہ۔“

”اچھا اچھا وہ والا۔“

”اچھی ایم اے پاس ہو اس قدر ناواقفیت۔“

”یاد تو ہے پر کچھ کم کم۔“

”جب گورونانک شہنشاہ باہر کے دربار میں پہنچے تو باہر نے بڑی شان سے بابا گورونانک کو اپنی مہمان نوازی میں

شامل کیا اور گویا ہوا۔

باہر: ہماری بزمِ عشرت میں جو لے آیا خدا بابا

تو بسم اللہ جامِ بادۂ احمر چڑھا بابا

جہاں میں آب زر سے کون ہے پاک تر پانی

کہ دُھل جاتا ہے جس سے دفترِ ماوشما بابا

ندے خانے کو دیکھا چاہیے چشمِ حقارت سے

کہ ہوتی ہے یہیں سے بے خودی کی ابتدا بابا
 نہ یونہی میکشوں کو خاک پر بیٹھا ہوا دیکھو
 پہنچتی ہے نظر ان کی سرفوق السما بابا
 صداحق حق کی سنتے ہیں سدا وہ شیشہ مے سے
 اسی سے دل ہیں رندوں کے حقیقت آشنا بابا
 جراحی کھلتی ہے راز دل جب بانگِ قفل سے
 فلک سے پکار اٹھتے ہیں ملائک مرحبا بابا
 نہ ہو گلہ بانگِ مستوں کی تو دنیا بزمِ ماتم ہے
 ہمارے دم سے کچھ کچھ زندہ ہے دارالفنا بابا
 غنیمت جان صحبت کو اک دو جام پیتا جا
 میانِ محفلِ رنداں در و آشام پیتا جا

خاں صاحب اس لہک سے زبانی پڑھ رہے تھے گویا وہی بابر ہوں۔ پھر انہوں نے ناک پر انگلی رگڑ کر پوچھا

’کچھ یاد ہے بابا گورونانک نے کیا جواب دیا تھا؟‘

’ہاں جی۔‘

’اچھا سنو..... بابا نانک بولے:

مبارک ہو مئےِ احرر تجھے صاحبقران تیری
 رکھے بس سرور تجھ کو شرابِ ارغواں تیری
 دل فرخندہ تیرا واقفِ رمزِ حقیقت ہے
 اگر ہے ترجمانِ دل حقیقت میں زباں تیری
 مگر جب کیفیتِ دل میں ہے کیفِ مے کی حاجت کیا
 غرض محفل سے کیا خلوت ہو جب رشکِ جہاں تیری

مئےِ انگور پی کر اگر کوئی متوالا ہوا تو کیا

نہ آئی دل میں مستی ہاتھ میں پیالہ ہوا تو کیا؟

وہ مئےِ اپنی ہے جس سے بن پے مخمور رہتے ہیں
 خیالِ چشمِ ساقی کے نشے میں پُور رہتے ہیں
 وہ میکش ہیں کہ مہر و ماہ اپنے با مہ و ساغر ہیں
 جو صہبائے مروق سے سدا بھریا رہتے ہیں
 ہمارا دور مے ہر سر نفس کے ساتھ پہننا ہے

اسی سے ہر نفس ہر لحظہ ہم مسرور رہتے ہیں
کثافت روح میں آلائش دنیا سے آتی ہے
شراب ظاہری سے اہل باطن دُور رہتے ہیں
چڑھا ڈوان کو سولی پر بھی تو حق حق سناتے ہیں
جو عاشق ہیں وہ سرشار مئے منصور رہتے ہیں
لنڈھائے ہوں جنہوں نے خم کے خم صہبائے عرفاں
کہاں وہ طالبِ افشردہ انگور رہتے ہیں

مناسب ہے یہی ترک مئے انگور شاہا
ہمارے ہاتھ سے تھوڑی سی اب منظور کر شاہا

نظم سنانے کے بعد انہوں نے تپائی پر پڑے ہوئے گلاس کو میری طرف بڑھایا۔ میں نے گلاس میں باقی ماندہ
چند قطرے پی کر کہا..... ”خاں صاحب! آپ کا کمال کا حافظہ ہے۔ آپ کو اس نعمت کا تحفہ پہنچ نہیں کہاں سے ملا ہے۔“
”باباجی دوست محمد خاں سے اور کہاں سے..... کہتے ہیں کہ ہماری Genetic Coding ہی دراصل ہماری
قسمت ہے۔ شاید اسی لیے اللہ کہتا ہے کہ گناہ سے بچو۔ ہم تمہارے گناہ تمہاری آنے والی نسلوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔
مجھے بابا دوست محمد خاں کا حافظہ ملا ہے..... سنا ہے جس روز وہ فوت ہوئے اسی دن میں اس دنیا میں آیا۔ انہوں نے جانے
سے پہلے اپنی وراثت Genes کی شکل میں مجھے سونپ دی تھی۔“

آفتاب بھائی اور خاں صاحب کے اندر علم کی ایک بھوک تھی جو کورس کی کتابوں سے ماورا تھی۔ وہ دونوں
ڈگریاں حاصل کرنے کے درپے اس لیے رہتے کہ کہیں اندر وہ ڈاکٹر محمد خاں سے خوفزدہ تھے اور انہیں خوش کرنے کے لیے
محنت کرنا چاہتے تھے۔ آفتاب بھائی نے اپنے کمرے میں یہ تختی آویزاں کر رکھی تھی۔

”اپنے باپ کی خاطر“

یہی تختی اُن کی تحریک کا باعث بنی اور وہ L.L.B. کر گئے۔

اسی خوف تلے خاں صاحب نے ایم اے اردو کیا۔ پھر اٹلی چلے گئے۔ وہاں فرانسیسی میں ڈپلوما لیا۔ اطالوی
سیکھی۔ اُن کا پڑھنا لکھنا مسلسل تھا لیکن وہ خالی علم کے قائل نہ جوانی میں تھے نہ بڑھاپے میں۔ اُن کے نزدیک علم ہمیشہ
زانوئے تلمذ تہہ کر کے مودب ہو کر اپنا آپ مرشد کو ارپن کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ جب تک کوئی اپنی Will سرنڈ نہیں
کرتا تربیت یافتہ نہیں ہو سکتا۔ مرشد کا یہی تصور ہر عمر میں اُن کے ساتھ ساتھ رہا حتیٰ کہ مرشد ہی کی تلاش انہیں باباگری میں
لے گئی۔ جب وہ اردو بورڈ میں ڈائریکٹر تھے تو اُن کے رفیق کار حنیف رامے کے بڑے بھائی رشید احمد چودھری انہیں دھرم
پورہ میں بابا فضل شاہ صاحب کے ڈیرے پر لے گئے جہاں سے انہیں بابوں کی فضیلت، تربیت، انداز زیست کا چسکا پڑ گیا۔
بابوں کی تربیت کا جزو اعظم یہی ہے کہ پہلے انہیں خلق سے علیحدہ کر کے اللہ کی رضا تلاش کرنا ہوتی ہے۔ باباجی
اسے مستی پہرہ کہا کرتے تھے۔ جب وہ کسی انسان کے قریب نہ تھے۔ جانوروں پرندوں کے ساتھ حشرات الارض اور

فطرت کی بولی سیکھتے تھے، بھوک پیاس سہتے تھے۔ پھر جب مستی پہرہ مجاہدہ، مشقت، خود اذیتی کا باب ختم ہو جاتا پھر انہیں خلق کی طرف لوٹا دیا جاتا۔ یہی کچھ خاں صاحب کے ساتھ ہوا۔ پہلے وہ اپنے اندر گم ہوئے۔ اندر اندھ کونٹوں میں گرے رہے۔ پھر انہیں خلق کی طرف لوٹا دیا گیا۔

خاں صاحب کے چھ بھائی اور دو بہنیں تھیں۔ جس طرح آج لوگ نیویارک دیکھے بغیر اس کے عشق میں مبتلا ہو جاتے ہیں اسی طرح 1- مزنگ روڈ دیکھے بغیر میں اس کے طلسماتی سحر میں مبتلا ہو گئی۔ خاں صاحب کی سب سے بڑی بہن فرخندہ آپا تھیں۔ دراز قد، کھلے کھلے ہاتھ پاؤں والی گوری چٹی مردانہ وجاہت، لیکن بڑی نرم دل خاتون جو زندگی کو ساری عمر ڈر ڈر کر گزارتی رہیں۔ اُن کی آنکھ میں بڑا الجھاؤ تھا۔ وہ خود بھی رسالہ ”مخزن“ اور ”عصمت“ میں مضمون لکھتی رہی تھیں اور انہوں نے ہی اشفاق احمد کو سیٹی پر لگا کر افسانہ نگاری کی طرف مائل کر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں میں اور خاص طور پر عورتوں میں مذموم رسم و رواج اور جہالت پر قلم کاری کیا کرتی تھیں۔ وہابی خیالات کی خاتون تھیں اور تعویذ گنڈے، قبر پرستی، مزاروں پر حاضری وغیرہ کو مسلم سوسائٹی کے لیے دیکھ کی طرح بگاڑ کی وجہ سمجھتی تھیں۔

آپا فرخندہ کی شادی ڈاکٹر ایوب احمد خاں سے ہوئی تھی جو جنگ اسپین میں شرکت کر کے اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ انہوں نے ایک بڑی بصیرت افروز کتاب بھی لکھی جس میں Zionists کا پول کھولا اور ایسے ایسے سلوگن ایجاد کیے:

Democracy is demon-crazy

Tis sale money and weapons of war

Which corrodes the nations through,

Axe down the curse of usury!

And the world blooms, with you,

Like the beautiful flowers, red and blue.

(The Sages of Ages)

وہ مغربی طاقتوں کا پول کھولنے اور ان کی منافقت سے مشرقی ممالک کو آگاہ کرنے والوں میں بہت پہلے سے واویلا مچا رہے تھے۔ ان ہی کے صاحبزادے جووا احمد خاں ہیں۔ ایوب بھائی آدرشوں سے محبت کرنے والے، لکھنے پڑھنے کی تحریکیں چلانے، اسرائیل کو مسلمانوں کا دشمن سمجھنے والے آدمی تھے۔ جب وہ لندن میں اپنی پڑھائی کے سلسلے میں گئے تو آپا فرخندہ مزنگ روڈ پر منتقل ہو گئیں اور یہیں پر اُن کی بیٹی ناہید اشفاق احمد اور دوسرے بہن بھائیوں کی بہن بن کر چلی۔ اُن سے خاں صاحب کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ ناہید کو شہد سے میٹھی اور چاند سے پیاری جیسے القاب دے کر خط لکھا کرتے تھے۔ آپا فرخندہ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں اور اپنی خوبصورتی کے باعث باپ کی لاڈلی تھیں۔ اُن کے لیے نوکرانیاں مقرر تھیں۔ ڈاکٹر صاحب آپا جی کے لیے لاہور سے Pears کے صابن منگواتے تھے۔ ان کے پیروں کو مساج کے لیے اٹلی سے زیتون کا تیل اپورٹ کیا جاتا۔ ہر قسم کی کولڈ اور Vanishing گھر میں آتیں حتیٰ کہ باباجی اپنی ذہانت کے باعث فیسرین کریم بنانے میں کامیاب ہو گئے جو آج بھی مہاسوں، چھائیوں اور دانوں کے لیے

کسب کسب جاتی ہے۔ آپاجی کی اولاد میں ڈاکٹر جواد ساجد قابل ذکر ہیں جو نامور مصری ڈاکٹر مگدی کے دستِ راس رہے اور خود بڑے نامور ہارٹ سرجن ہیں۔ ڈاکٹر جواد احمد اس وقت ہارٹ کے سرجن ہیں اور PIC میں CEO ہیں۔ اُس کے کام کی اتنی شہرت ہے کہ اُسے ہلال پاکستان بھی مل چکا ہے لیکن اُس کا طرہ امتیاز اُس کے اپنے نزدیک کچھ اور ہے۔

جواد کے آباؤ اجداد کا گاؤں جہان خیلاں ہے جہاں اُن کی ایک بڑی متبرک درگاہ ہے۔ جہاں خیلاں ہوشیار پور میں واقع ہے۔ یہ درگاہ سکھوں اور مسلمانوں دونوں کے لیے متبرک ہے۔ ابھی سال بھر پہلے کی بات ہے درگاہ کے سکھ عقیدت مندوں نے جواد کو وہاں مدعو کیا۔ اُس کے ساتھ مل کر درگاہ پر چادر چڑھائی۔ جواد کے سر پر پگڑی باندھی۔ عظمیٰ کے سر کو چادر سے ڈھانپا اور بارڈر تک اُسے چھوڑنے آئے۔ وہ جس فخر سے اس واقعے کا ذکر کر رہا ہے اُس کے سامنے اُس کی ہارٹ سرجری ماند پڑ جاتی ہے۔

آپا فرخندہ کے بعد آپا فرحت کا نمبر آیا۔ دونوں بہنیں لکھنے پڑھنے کی شوقین تھیں۔ بابا محمد خاں چونکہ آپا فرخندہ کو زندگی بھر اولیت بخشے رہے اور آپاجی ہی کی خاطر انہوں نے فیرین ایجاد کی اس لیے ایک طرح سے دونوں بہنوں میں Sibling جیلسی کا رشتہ قائم ہو گیا جو ساری عمر آپا فرحت کے لیے احساس کمتری کا باعث بنا رہا۔ آپا فرحت حسن میں آپا فرخندہ سے کمتر تھیں۔ اس لیے انہیں گھر پر بی کلاس سٹیشن سمجھا جاتا تھا، لیکن اس درگزی کی وجہ سے اُن میں اصول پرستی اور انصاف طلبی بڑھی اور انہیں پاکستان کی تحریک سے گہری محبت ہو گئی۔ ان ہی آپاجی سے خاں صاحب کا گہرا رشتہ تھا اور وہ بروقت ان کا دم بھلا بنے رہتے۔ دسویں جماعت کے بعد وہ ان ہی کے پاس فیروز پور میں منتقل ہو گئے جہاں انہوں نے ڈی اے وی کالج میں بڑے مشاعرے مباحثے اور پڑھائی میں توجہ دی۔

آپاجی کے میاں ڈاکٹر عبدالقادر گائے طبیعت آدمی تھے۔ کلینک پر مریضوں کا دم بھلا اور گھر پر آپا فرحت کے کھونٹے سے بندھے رہتے۔ مسلم لیگ کے جلسوں میں خاں صاحب مائیک پکڑ کر اونچی اونچی تقریریں کرتے۔ آپاجی کو ایک تقریر کے موقع پر قید کر لیا گیا۔ وہ اپنے آدرش کی خاطر فرخندہ پیشانی سے جیل چلی گئیں۔ یہی پاکستان سے آدرشی محبت دونوں بہن بھائی کو پاکستان ساتھ لے آئی اور اسی کے باعث خاں صاحب نے پورے 39 سال تک شاہ مکھا۔

آپاجی کو اپنے بڑے بیٹے جاوید طارق (جو ان دنوں ہائی نون لیبارٹری کے چیئر مین ہیں) کی بہت فکر تھی۔ جاوید بی اے میں تھا اور پڑھائی سے مکمل طور پر بے پرواہ۔ دائیں بائیں دوستی یار باشی کا چمکاؤ وقت کا ضیاع اس کے مشغلے تھے۔ آپاجی نے جاوید کو میری شاگردی میں دے دیا۔ میں اُسے زیادہ تر انگریزی پڑھاتی تھی۔ 1951ء میں اشفاق صاحب اٹلی جا چکے تھے اس لیے آپاجی کے پاس آنے جانے میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ جاوید جب پڑھنے آتا تو بیشتر وقت اپنا چھوٹا سا کتا ساتھ لے آتا اور نوٹس بنانے کے بجائے صرف زبانی لیکچر سننے پر اکتفا کرتا۔ کتے کو گود میں لے کر پڑھنا اور پھر نائغے بھی کرنا اس کا معمول تھا، لیکن یہی جاوید آگے چل کر ہائی نون لیبارٹری کا خالق بنا اور میرے بیٹے انیس احمد خاں کو اپنی دامادی میں قبول کیا۔ میں ان دنوں اپنی خالہ فیروزہ کے پاس 60- فیروز پور روڈ میں رہتی تھی۔ جاوید اور ناہید یہاں ہی پڑھنے آتے رہے۔

ان دو بہنوں کے بعد آفتاب بھائی کا نمبر آتا ہے۔ وہ چھ فٹے لمبے دبلے پتلے لڑکیوں کی طرح شرمیلے میٹھی

مسکراہٹ اور ہلکی کھلکھلاہٹ والے آدمی تھے۔ وہ کورٹ سے نکلنے کے بعد کبھی کسی کے متعلق تجسس، کھوج نہ لگاتے۔ غیبت جیسے مشاغل سے دور رہتے۔ خاں صاحب کا تعلق جب ایم اے میں مجھ سے پیدا ہوا اور انہوں نے میری تربیت پرورش اور خود اعتمادی کو سہارے دینا چاہے تو آفتاب بھائی اس محبت میں گپ چپ شامل ہو گئے۔ وہ کبھی کبھی پکھری سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کالج کے سامنے والی پڑی سے ہو کر اپنے گھر 1- مزنگ روڈ جاتے۔ راستے میں مجھ سے مٹھ بھیسڑ ہو جاتی اور ایک ہی ملاقات کے بعد انہیں مزید تعارف کی ضرورت نہ رہی۔ میری والدہ کو وہ آ پا جان کہتے تھے۔ جب میرا پہلا مضمون Our Men چھپا تو پہلا تعریفی خط اُن ہی کا تھا۔ جب خاں صاحب اٹلی چلے گئے اور ہم سمن آباد میں منتقل ہوئے تو آفتاب بھائی اور آ پافرحت بھی سمن آباد آدے گئے تھے۔

آفتاب بھائی کے بعد افتخار بھائی اس دنیا میں آئے۔ ان میں بغاوت کا مادہ تھا۔ انہوں نے غالباً اپنے والد صاحب کو چرانے کے لیے پڑھائی اور پوری چھوڑی اور بی اے نہ کیا۔ جب ڈاکٹر محمد خاں اپنے بیٹوں کو مارتے تو یہی بھائیوں کو چھڑاتے۔ سب سے زیادہ انہوں نے خاں صاحب اور اشتیاق کو چھڑایا۔ وہ انوکھا راستہ انوکھی بات انوکھا رویہ اختیار کر کے سب کو چونکا دیتے تھے۔ جب شادی کا مسئلہ چھڑا تو اپنی خالہ کی بڑی بیٹی باجی ضیاء کے ساتھ بیاہ کرنے سے منکر ہو گئے اور چھوٹی بہن آ پی منیر کو دلہن بنا لیا۔ فیسرین کا کام والد کی حیاتی میں نہ کیا اور شخص خاں کی زمینوں کی دیکھ ریکھ کرنے چلے گئے۔

افتخار احمد خاں بقول ساری دنیا کے ”ڈیڈی جی“ ادنیٰ بے براؤن آنکھوں اور براؤن بالوں والے دیہاتی عادتوں والے ڈیڈی جی بڑے سمن موہن تھے۔ ہر انسان کا چلتے چلتے ہاتوں ہاتوں میں دل چرانے کا فن جانتے تھے۔ ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر طارق بن افتخار شکارگو میں بڑے نامور آرٹھوپیدک سرجن ہیں۔ یہ وہی ہیں جنہوں نے اشفاق صاحب اور میری وہ تصویریں بنائی ہیں جو آپ ہماری کتابوں کے پچھلے صفحے پر دیکھا کرتے ہیں۔

لیکن بیٹوں کی تعلیم و تربیت کا سہرا ڈیڈی جی کی بیگم آ پی منیر کو جاتا ہے۔ ڈیڈی جی اور اقبال بھائی نے اپنی خالہ کی دو بیٹیوں سے شادی کی، لیکن یہاں بھی تھوڑا سا گھپلا ہوا۔ باجی ضیاء بڑی بہن تھیں۔ انہیں اصولاً افتخار بھائی کی بیگم بنایا جانا چاہیے تھا لیکن دونوں بھائیوں نے دونوں بہنوں میں باہمی رضامندی سے اس طرح شادی کی کہ چھوٹی آ پی منیر تو بڑے بھائی افتخار سے بیاہی گئیں اور باجی ضیاء کی شادی اقبال بھائی سے طے پائی۔ ڈیڈی جی کو بچپن سے کتوں کا شوق، کھیتی باڑی سے دلچسپی تھی۔ اس کا آ پی منیر کو ولی قلق تھا۔

خاں صاحب نے روم سے واپسی پر شادی کا ارادہ کر لیا، تو اس گم گم شہزادے کا کوئی مددگار 1- مزنگ روڈ میں نہ تھا۔ ان دنوں ڈیڈی جی چلی منزل میں مقیم تھے۔ نہ جانے کیسے انہوں نے بھائی کی مشکل کو بھانپ لیا۔ یا پھر مفتی جی نے انہیں راز داں بنایا۔ وہی میری والدہ تک پہنچے۔ وہی نکاح خواں لائے۔ ان ہی کے دستخط نکاح نامے پر ہوئے۔

455- این سمن آباد میں ہماری شادی بڑی سادگی سے ہوئی۔ میں نے پرانا سفید شلوار قمیض پہنا، خاں صاحب

معمولی لکیروں والے گرتے میں ملبوس تھے۔ مفتی جی، محمد حسین آرنٹ اور ڈیڈی جی براتی تھے۔ ریزی اور محمودہ اصغر میری والدہ سمیت مائیکہ والے تھے۔

نہ کوئی ڈھولک بجی نہ کوئی مہندی کی رسم ہی ہوئی۔ نکاح کے بعد خاں صاحب نے اپنی پاس بک میرے ہاتھوں میں چپ چاپ تھما دی۔ اس میں نو سو روپے جمع تھے۔ محمودہ اصغر کی شناخت کا ایک حوالہ خالدہ حسین ہے جو اُس وقت چھوٹی ہی خالدہ اصغر تھی۔ محمودہ اور خالدہ انجینئرنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اصغر صاحب کی صاحب زادیاں تھیں۔

اس شادی کی خبر جب پھیلی تو باباجی نے خاں صاحب کو کچھ نہ کہا۔ البتہ افتخار بھائی اور آپنی جی کو گھر سے نکال دیا۔ اپنا یوریا بستر اٹھا کر اپنے بچوں سمیت ڈیڈی، جی میری خالہ کے پاس 450- این سمن آباد آ گئے۔ آپنی جی بڑی ہمت والی خاتون تھیں۔ اُن کے بیٹے طارق حارث اور عدنان کرینٹ ماڈل سکول میں پڑھتے تھے۔ آپنی جی نے بڑی محبت کا ثبوت دیا۔ اپنے بیٹے طارق کو میری گود بٹھا کر گود بھرائی کی رسم ادا کی اور اس طرح طارق بن افتخار میرا متبقی بن گیا۔ یہ بھانے والے لوگ ہیں۔ طارق نے رسم کی لاج رکھی اور آج تک اُس نے اپنے چچا اور میری ایسی عزت اور محبت کا مظاہرہ کیا جو اس رسم کی یاد دلاتا رہتا ہے۔

کچھ دیر تک ڈیڈی، جی اور آپنی میری خالہ کے پاس رہے۔ اتنا بڑا حادثہ یا واقعہ رونما ہوا۔ گھر بدری کے باوجود آپنی نے ہمت نہ ہاری اور بچوں کو اسی زور شور سے پڑھاتی رہیں جیسے وہ 1- مزنگ روڈ پر کمر بستہ رہتی تھیں۔ میری خالہ بھی بچوں کو حساب پڑھانے میں آپنی جی کی مدد کرتی رہیں۔

اور جب کچھ عرصہ بعد قتلِ شفاغی کے پڑوس میں ڈیڈی، جی 427- این ٹائپ میں منتقل ہو گئے تو آپنی جی بچوں کی تعلیم کی طرف اور بھی مستعد ہو گئیں۔ وہ بچوں کو بڑے جوش و خروش سے پڑھاتیں۔ محبت اپنی جگہ وہ کئے گھونے اور ٹھنڈے مارنے سے بھی دریغ نہ کرتیں۔ میں آپنی جی کے اس پہلو سے بہت متاثر تھی۔

میں نے بھی کہیں اندر یہ پختہ ارادہ کر لیا کہ اولاد ہونے پر خود انہیں تعلیم دوں گی، لیکن ایم اے پاس ہونے کے باوجود معمولی ایف اے پاس آپنی منیر کا میں مقابلہ نہ کر سکی کیونکہ مجھ میں نہ وہ ڈسپلن تھا نہ میں سائنسی علوم ہی سے واقف تھی نہ پڑھانے کے علم سے آگاہ۔ آپنی نے بچوں کو علم میں خود کفیل کر دیا۔ میں نے بچوں کے ہوم ورک خود کر کے انہیں اپنے اوپر انحصار کرنے کا طریقہ سکھایا۔

اس کی وجہ میری شخصیت کا نقص ہے جس کا علم اب مجھے حاصل ہوا۔ میں خدمت کر کے اپنا جھنڈا بلند کرنا چاہتی ہوں۔ میری شہنی مجھے یہ سوچنے کا موقع نہیں دیتی کہ میں اُس شخص کی فلاح کا سوچ سکوں جس کی مدد کرنے پر میں مصر ہوتی ہوں..... خیر!

میں اور خاں صاحب روز شام کو آپنی جی اور ڈیڈی کے گھر جاتے۔ وہاں کھانا کھاتے۔ اُن کی بڑی بیٹی لبتی مجھ سے بہت مانوس ہو گئی تھی اور کبھی کبھی میرے ساتھ سو جاتی تھی۔

مکتر میں اقبال بھائی ایک طور پر باباجی سے بغاوت پر آمادہ رہتے، لیکن اتنی ہمت نہ تھی کہ کبھی بھی منہ در منہ بحث کر سکتے۔ افتخار بھائی کی طرح انہیں بھی پڑھائی سے نفرت تھی۔ اقبال بھائی خاں صاحب سے مشابہہ بڑی من موہنی شخصیت کے مالک ہیں۔ اُن کے گرد حسیناؤں کا گھیرا رہتا۔ انہیں لوگوں کی توجہ لینا مشکل نہ تھی۔ گھر کی مامائیں، سیلیں، مہریاں سب اُن کی بات جلدی مان لیتیں۔ سب سے پہلے اُن کے کپڑے ڈھلتے۔ اُن کا بستر جھاڑا جاتا۔ انہیں لسی

ایسی دی جاتی جس میں مکھن کا پیڑا تیرتا۔ اسی وجاہت کے باعث وہ جلد اپنی خالہ زاد باجی ضیاء کی آنکھ کا تارا بن گئے۔

اخلاق بھائی بھائیوں میں ماسٹر مائنڈ تھے۔ انجینئر طبع سوچ اور عمل کے بندے تھے۔ اُن کے متعلق کچھ کہانیاں سب بہن بھائی اپنے اپنے رنگ میں سناتے ہیں۔ مکتسر میں ٹیلی فون صرف ڈاک بنگلے میں تھا۔ یالدهارام کے گھر تھا جو ہندو سینٹھ تھا اور کاشن کا بزنس کرتا تھا۔

حسن اتفاق سے اس ٹیلی فون کی تار باباجی کے گھر سے گزرتی تھی۔ جو بھائی کے دل میں سمائی کہ گھر کے اوپر سے گزرنے والی تار پر ذاتی تار پھینک کر ٹیلی فون اپنے مصرف میں لایا جاسکتا ہے۔ اب ٹیلی فون کی تار کا مسئلہ اٹھا۔ مکتسر سے کوٹ کپورہ سات میل دُور تھا۔ وہاں ٹیلی فون کی تار ملنے کے امکانات تھے۔ اس کام کے لیے خاں صاحب کو چنا گیا کیونکہ جو بھائی کا خیال تھا کہ ان کا چہرہ بھولا بھالا ہے۔ کوئی تار کے متعلق سوال جواب نہ کرے گا۔

سکول سے فرار ہو کر خاں صاحب کوٹ کپورہ پہنچے۔ بڑی مشکل سے تار چرائی اور گھر آئے۔ اب جو بھائی نے اوپر گزرنے والی تار پر کاشی مار کر اپنی تار کا Connection لگایا۔ لیجئے چرایا ہوا فون اور کھسکائی ہوئی تار کا میاب رہے اور لدھارام کی دکان سے فون مل گیا۔ اب فون پر کپاس کی خرید و فروخت اور روٹی کے بھاؤ آنے لگے۔

اخلاق بھائی نے سوچا کہ ہم بنانا چاہیے۔ اس ہم کام مصرف کیا ہوگا۔ یہ انہوں نے نہ سوچا۔ ایک طبعی سائنسدان کی طرح انہیں صرف ہم کی ایجاد سے غرض تھی۔ اب گھریلو ہم کے لیے منجھل پناس اور پارے کی ضرورت تھی۔ منجھل پناس تو بازار سے مہیا کی جاسکتی تھی لیکن پارہ کیاب بھی تھا اور اس کے خریدنے کی پسلی بھی نہ تھی۔ سکول میں سائنس لیبارٹری میں قریباً دو سیر پارہ پڑا تھا۔

اب یہ سوچنا تھا کہ پارہ وہاں سے کیسے اُڑایا جائے؟ بڑے بھائیوں سے بات چیت مشکل تھی۔ اشتیاق ابھی چھوٹا اور بے سمجھ تھا۔ طے یہ ہوا کہ خاں صاحب اور کوٹ پہن کر جائیں اور پارہ لیبارٹری کی بوتل سے چرا کر کوٹ کی جیب میں ڈالیں اور گھر لے آئیں۔

جب شقو اور کوٹ پہن کر سکول پہنچے تو سب حیران کہ اتنی گرمی میں یہ کوٹ کیوں؟ بہانہ بھی پہلے تراش کر دیا گیا تھا۔ خاں صاحب نے سب سے کہا کہ ملیس یا بخار ہے بہت سردی لگ رہی ہے۔ مشکل سے لیبارٹری تک رسائی ہوئی۔ پارہ کوٹ کی جیب میں ڈال کر چوروں کی طرح باہر نکلے۔

ووڈھائی سیر پارے کی وجہ سے ایک سائڈ جھکی ہوئی تھی۔ بہر کیف جیسے کیسے پارہ اوپر والے کمرے میں جہاں سائنسی تجربہ گاہ تھی پہنچایا گیا۔ جو بھائی نے منجھل پناس پارہ اور جانے اور کیا اجزاء ملا کر ایک چھوٹا سا تجرباتی ہم تیار کر لیا گیا۔ بد قسمتی سے یہاں ہی کبوتروں کی چھوٹی چھوٹی کابکس تھیں۔ ماچس کی خالی ڈبیاں ایک چھوٹا سا ہم بنا کر رکھ دیا گیا۔

یہ بھائی مزے لے لے کر غلط انفریشن ہم پہنچاتے۔ لدھارام علیحدہ پریشان۔ ڈاک بنگلے میں کسی نہ کسی افسر کی آمد کی اطلاع دیتے، کمرے بک کر دیتے، متعلقہ افسر کبھی نہ پہنچ پاتا۔ ڈاک بنگلے کے کارندے بسترے تو لیے تبدیل کرکھانا وانا پکا کر منتظر رہتے۔ یہاں تک تو خیر ذہانت کی چمکا رکھنا مقصود تھا، لیکن ایک اور سائنسی تجربہ خطرناک صورت اختیار کر گیا۔

واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اوپر والی منزل میں چھوٹی چھوٹی کابکس باباجی کے کبوتروں کے لیے تھیں۔ ان میں کبوتر لمبی اڑانوں کے بعد بسرام کرتے۔ ان کابکوں کو صاف کرنے پر ملازم مامور تھا۔ ججو بھائی کا تجرباتی ہم ایک کابک میں چھپایا گیا تھا۔ جس وقت طوطی ان کابکوں کو صاف کر رہا تھا تو اس نے ماچس کو گندی چیز سمجھ کر اپنے پیروں سے دوفٹ ٹھہر پھینکا۔ یوں تو شاید ہم دیر تک پڑا رہتا اور کسی کو خبر تک نہ ہوتی.....

اب جو اسے زور سے فرش پر دے مارا تو ہم فعال ہو اور اس نے یہ کرتب دکھایا کہ طوطی کے دائیں پاؤں کا انگوٹھا لٹ گیا۔ لہو کی دھار ناک تک پہنچی۔ طوطی نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ باباجی کو غصے پر بھاگے آئے۔ مرہم پٹی کرنے کے بعد سب بچوں کو لائن اپ کر لیا۔ ایسی قرار واقعی سزا دی کہ سب کی سسٹی گم ہوگئی۔ نانی اماں ہاتھ جوڑتی پھریں۔ اماں جی نے بچوں کی طرف سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافیاں مانگیں لیکن باباجی نہ مانے۔ اوپر کے کمروں تک اسحق، اشفاق اور اشتیاق کی رسائی بند ہوگئی۔

لیکن اس سزا کا سارا فائدہ بچوں ہی کو پہنچا۔ خاں صاحب اپنی ادبی سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہو گئے اور ججو بھائی کو بھی ادبی خمیر لگا دیا۔ تقو پیدا آئی ایتھلیٹ تھا۔ وہ کھیوں کی طرف راغب ہو گیا اور یوں ان تینوں کو اپنی صلاحیتوں کا سراغ مل گیا۔

اشتیاق اپنی فوجی صلاحیتوں کو بھانپ کر فوج میں چلا گیا۔ اسحق بھائی کو ہوائی جہازوں نے متاثر کیا اور وہ ایئر فورس میں بھرتی ہو گئے، لیکن جب وہ سکوڈرن لیڈر تھے تو اچانک نوکری چھوڑ کر مرنگ روڈ آ بسے۔ واپسی کا چکر ان کی ایجادات کی صلاحیت اور اہلیت تھی۔ وہ فیئرین کریم کو نیا Get up اور خوبصورتی عطا کرنا چاہتے تھے۔ اس کا لیبل ماڈرن کرنے کے آرزو مند تھے۔ یہ میری شادی سے بہت پہلے کی باتیں ہیں۔

ججو بھائی یہ جانتے ہوئے بھی کہ باباجی پورے امریکہ میں انہوں نے مغربی ممالک کی کریم ساز کمپنیوں سے رابطہ قائم کیا۔ ان میں نیویا، الزبتھ آرڈن، کی نائیٹ اور وینٹنگ کریم پیش پیش تھیں، لیکن باباجی پرانے خیالات کے تھے۔ وہ کسی مارکیٹنگ کی خاطر نہ تو فیئرین کی شیشی بدلنا چاہتے تھے اور نہ اس کا لیبل ہی۔ اس دوغلی حکومت میں انجام کار دونوں ہی ناخوش ہو کر رہ گئے۔

پھر اماں جی سردار بیگم اور اسحق بھائی کی بیگم ذکیہ جی میں بھی خیالات کے ٹکراؤ کی فضا پیدا ہوگئی۔ مرنگ روڈ میں کسی قسم کا تہوار سا لنگرہ عیدیں منانے کا رواج نہ تھا۔ ذکیہ جی نے داصف کی سا لنگرہ بڑے دھوم دھڑکے سے منائی۔ باباجی تو خیر شریک ہی نہ ہوئے۔ اماں جی موجود تو رہیں لیکن شریک نہ ہوئیں۔ اس سرد جنگ کے نتیجے میں ججو بھائی نے بوریا بستر یا تہا اور مین روڈ پر واقعہ ایک بنگلے میں جا بسے۔

یہاں ایک نئے ماحول میں ججو بھائی نے نیوسما کریم ایجاد کی۔ اس کی مارکیٹنگ کے لیے کوشاں رہے لیکن ایک ٹیکنیشن ایزدی بھی ہوا کرتا ہے۔ نیوسما نہ چل سکی۔ ذکیہ جی ایک ایسی با حوصلہ بیوی تھیں جس نے ہر جگہ پر کام میں اسحق بھائی کا ساتھ دیا۔ نیوسما کریم بنانے پیک کرنے میں ساتھ لگی رہی۔

جب نیوسما فیل ہوگئی تو یہ میاں بیوی کینیڈا چلے گئے۔ شادی سے پہلے ذکیہ جی نے ہال روڈ پر واقعہ سنگر کے

سکول سے سلائی اور کشیدہ کاری کا کورس کیا تھا۔ جب یہ دونوں کینیڈا پہنچے اور روزگار کی تلاش ہوئی تو ذکیہ جی نے اسی کورس کا فائدہ اٹھا کر وہ سلائی کی کہ دہن کا سفید لباس سینے پر جلد ہی مامور ہو گئیں۔ وہاں بھی ججو بھائی نے نیو سیما بنائی، لیکن مقابلہ سخت رہا اور یہ کریم مسابقت کے ہاتھوں ختم ہو گئی۔

بچپن میں خاں صاحب اور تقو اپنے رنگ لیڈر ججو بھائی کے اشاروں پر ناپتے تھے۔ اقبال بھائی کی شرارتوں میں شریک رہتے تھے۔ آفتاب بھائی سے فاصلے پر مودب رہ کر اُن کی عزت کیا کرتے تھے۔ اُن کی بہنوں نے انہیں گودوں کھلایا تھا۔ اُن سے رشتہ چھوٹی امی کا سا تھا۔

بچپن میں جب اُن کے کانوں میں پٹھانوں کی روایات اور رسم و رواج کا چرچا پڑا۔ انہیں معلوم تھا کہ پٹھانوں کے دو قبیلے ہجرت کر کے پنجاب میں وارد ہوئے تھے۔ نیازی قبیلہ ہوشیار پور میں قیام پذیر ہوا۔ ان میں عمران خاں نے نیازی قبیلہ کا نام روشن کیا۔ یہ لوگ مہمند قبیلے سے زیادہ پڑھے لکھے اور فارغ البال تھے۔ مہمند قبیلے نے جائیداد میں پڑاؤ ڈالا اور ان کی شہرت کا باعث اشفاق احمد بنے۔

باباجی ضلع فیروز پور میں مکتسر آ گئے۔ یہ سکھوں کا ایک مقدس قصبہ ہے۔ ان کے ایک گرو یہاں مقیم رہے۔ مکتسر کے لفظی معنی لکتی کا تالاب ہے۔ امرتسر میں امرت کا تالاب ایک بہت متبرک جگہ مانی جاتی ہے۔ باباجی نے اپنے سارے بچے میونسپل بورڈ اسکول میں داخل کروائے لیکن شاید اپنی شناخت کی فکر میں شتو جی کو اسلامیہ دینی مدرسہ میں داخل کرا دیا۔

یہ اسکول مسجد میں قائم تھا۔ یہاں ہی خاں صاحب نے بچپن ہی میں بہت سے دینی مسائل رٹ لیے۔ اس اسکول میں ناٹوں پر بیٹھتے۔ قلمیں گھڑ کے دوات میں کپڑے کا سوف ڈال کر کالی سیاہی بنا کر قلم سے لکھا جاتا۔ خاں صاحب کو تختی پر لکھنا، تختی کو دھو کر گاچنی مل کر صاف کرنے کے لیے سکھانا بڑے تخلیقی عمل لگتے۔

پھر نہ جانے کن وجوہ کی بنا پر پانچویں جماعت میں خاں صاحب کو بھی انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا گیا۔ سرکاری اسکول میں بیٹھتے بیٹھتے خاں صاحب کے پاس تقابلی مقابلے کا مواد بہم ہو گیا تھا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ انگریزی پڑھنے والوں میں ایک خاص قسم کا تکبر تھا اور وہ مقامی لوگوں کو بیچ سمجھتے تھے۔ انہیں تجربہ تھا کہ اُن کی دائی مائی کا بیٹا مسجد اسکول میں اُن کے ساتھ پڑھتا تھا اور اُس کی خطاطی بہت خوبصورت تھی اور شتو جی اُس سے اصلاح لیا کرتے تھے۔

خاں صاحب کے گھر میں ایک ملازم بھینسوں کی دیکھ رکھیہ پر مقرر تھا۔ وہ دور سے آتی ہوئی بھینس کو دیکھ کر بتا دیتا کہ بھینس کس کی ہے اور آٹھویں مہینے میں ہے اور اس بار کفادے گی۔ پھر جب اگلے مہینے بھینس کفادتی اور اُس کی پیشانی پر ویسا ہی سفید داغ ہوتا جس کی پیش گوئی ملازم کر چکا ہوتا، تو شتو جی حیران نہ ہوتے۔

بادلوں کو دیکھ کر بارش کے متعلق جو کچھ ملازم بتاتے عموماً ٹھیک نکلتا۔ چھوٹی عمر میں خاں صاحب اس حقیقت سے دوچار ہو گئے کہ پڑھے لکھوں کا علم اپنی جگہ لیکن دانش و فراست میں تجربے اور زندگی سے سیکھنے کے عمل میں ان پڑھ بھی اپنا ایک جداگانہ علم اور مقام رکھتے ہیں۔

دسویں مکتسر سے کرنے کے بعد خاں صاحب اپنی بہن آپا فرحت کے پاس فیروز پور چلے گئے۔ یہاں پر آپا جی کے شوہر ڈاکٹر عبدالقادر پرائیویٹ پریکٹس کرتے تھے۔ شروع میں تو ان کی فیس چار آنے تھی اور پریکٹس میں بڑی دقت

جس آئی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان کی انسان دوستی اور اخلاق نے رنگ دکھایا۔ ڈاکٹری کا دھندا چل نکلا۔

خاں صاحب کو فیروز پور میں رام سکھ داس کالج میں داخل کرا دیا گیا۔ یہاں ان کی نصابی کارکردگی تو نہ چمکی لیکن یہ خوبصورتی، جامہ زہبی، طرحداری کی وجہ سے ہم جماعت طالب علموں میں ان کا نام اُبھرنے لگا۔ ان ہی دنوں ان میں شاعر کروٹ لے کر بیدار ہوا جو پھر نثر کی طرف مز گیا اور پھر لمبا چکر کاٹ کر اردو بورڈ سے ریٹائرمنٹ کے بعد پنجابی کھسوں کی شکل میں بیدار ہوا۔ وہ شاعری جو رام سکھ داس کالج میں جاگی اور ساری جوانی سلپنگ بیوٹی کی طرح سوئی رہی، بھرتی لے کر ”کھٹیاوٹیا“ کی شکل میں دوبارہ بیدار ہوئی۔

سنا ہے جب وہ بی اے میں تھے تو کالج میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا۔ خاں صاحب کالی شلو اور قمیض میں کھیر و فون پر پہنچے اور اپنی غزل پڑھ کر مشاعرہ لوٹ لیا۔ اس غزل کا ایک شعر جو سارے کالج میں زبان زد عام ہوا یہ تھا:

ع کہکشاں بن گئی ہر را ہنذر آج کی رات

لیکن گورنمنٹ کالج پہنچ کر جو کچھ ہوا وہ تو آپ تک ہو لے ہو لے ہی پہنچ پائے گا۔

تقو بیچارہ نہ تین میں تھا نہ تیرہ میں۔ بڑے بھائیوں کا نولا اُسے قابل اعتنا نہ سمجھتا تھا۔ اسحق بھائی اور شتو جی اسے ساتھ ساتھ لیے پھرتے لیکن اُس کی حالت کبھی برادری سی تھی۔ دراصل خاں صاحب اور تقو کے درمیان ایک بیٹا اور بھی باباجی کو عطا ہوا تھا۔ وہ دو سال کا ہو کر اللہ کو پیارا ہوا۔ اس کا کسے کو اشتیاق ”کالی بھونڈی“ کہہ کر پکارا کرتا تھا۔ خاں صاحب پورے چار سال تقو سے بڑے تھے۔ وہ اور جو بھائی تقو کو ساتھ ساتھ رکھتے لیکن جب وہ صحیح گولکنتر کے تالاب میں تیرنے جاتے تو تقو کو سوتا چھوڑ جاتے۔

تقو کو اس بے وفائی پر بہت ملال تھا۔ وہ خاں صاحب کے ساتھ سویا کرتا تھا۔ تقو نے بالآخر یہ ترکیب سوچی کہ رات کو اس وقت تک جاگتا رہتا جب تک شتو جی سوند جاتے۔ پھر وہ کمال آہستگی سے اپنا ازار بند خاں صاحب کے کمر بند سے باندھ دیتا۔ شتو جی جب تالاب پر جانے کے لیے اُٹھتے تو ازار بند کی کھینچ پڑتے ہی تقو جاگ جاتا۔

اب بڑے بھائی تقو کو ساتھ لے جانے پر متامل ہوتے لیکن تقو دھمکی دیتا کہ اگر مجھے ساتھ نہیں لے جائیں گے تو میں باباجی کو جگا دوں گا۔ مارے باندھے تقو کو ساتھ لے جانے لگے اور بہت جلد تقو ان دونوں سے بہتر تیرا ک بن گیا۔

یوں تو ہر شخص پر بچپن کی چھاپ گہری ہوا کرتی ہے لیکن خاں صاحب اپنے اس آبائی وطن کو کبھی نہ بھولے۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر وہ کہیں اور پروان چڑھے ہوتے تو شاید ان کی تخلیقی قوتوں کو یوں چنپنے کا موقع نہ ملتا۔ وہ ساری عمر اپنے اسی بچپن کی شکرگزاری میں مبتلا رہے جس نے انہیں کچھ باتیں ذہن نشین کرا دیں۔

وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ بچپن میں عام انسان کے اس قدر قریب نہ رہے ہوتے تو وہ کبھی سمجھ نہ پاتے کہ غریب آدمی کا بنیادی مسئلہ ضروریات زندگی کی فراہمی ضرور ہے لیکن سب سے بڑا مسئلہ ”عزت نفس“ ہے۔ وہ جانتے تھے کہ اگر عام آدمی کو روٹی، کپڑا اور مکان میسر آ جاتا ہے لیکن وہاں عزت نفس نہیں ملتی تو وہ بظاہر زندہ رہتا ہے لیکن اندر سے مر جاتا ہے۔

اُن کا یقین کامل تھا کہ پاکستان کا خواب دراصل اسی خواہش کی تکمیل کے لیے دیکھا گیا تھا کیونکہ 1947ء سے پہلے اونچی ذات کا ہندو اپنے آپ کو اشرف المخلوقات سمجھتا تھا اور اس کے نزدیک ہندوستان کی باقی ساری جاتیں شور

تھیں۔ مسلمان تو خاص طور پر ایسے پیچھے تھے جن کے برتنوں میں کھانا پینا اپنا مذہب بھرشت کرنے کے مترادف تھا۔ ہر حکومت تحریک سیاست کا بنیادی مسئلہ دراصل عزت نفس کی بحالی ہے۔ اس کے علاوہ باقی سب نعرہ بازی ہے۔ پتہ نہیں وہ اپنے نظریے میں حق بجانب تھے بھی یا نہیں؟

ان آٹھ بہن بھائیوں کے ساتھ آپا فرخندہ کی سب سے بڑی بیٹی ناہید بھی مزنگ روڈ میں ہی پلی بڑھی اور پروان چڑھی۔ خاں صاحب اُس سے بہت محبت کرتے تھے۔ ناہید کی شادی جہلم میں پرائم گلاس فیکٹری کے سانجھے مالک رشید احمد خاں سے ہوئی۔ اُس کے چار بچے ہیں۔ بڑی بیٹی ربیعہ بڑی صالح روح ہے۔ وہ عورت کی نو حاصل کردہ آزادی اور مذہب کی حدود کے امتزاج کو اعتدال سے سمجھ گئی ہے۔ حجاب بھی پہنتی ہے اور جہلم میں انگریزی میڈیم سکول کی منتظم بھی ہے۔ گاڑی بھی چلاتی ہے۔ اے لیول اولیول کی تیاری بھی کراتی ہے لیکن آزادی کے ہمراہ بے راہ روی کو اپنے اُد پر جائز نہیں سمجھتی۔

ایک بیٹی ثانیہ جو ماں کی طرح آرٹسٹ نکلی۔ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ کینیڈا جا بسی۔ مغربی ماحول نے اُسے صیقل کیا۔ وہ اپنی تصویروں کی نمائش لگاتی ہے۔ فرانس جرمینی جا کر اُس نے اپنے کام کی بدولت بڑا نام پیدا کر لیا ہے۔ ایک بیٹا میمون رشید اور اُس کی من موہنی بیوی از کالہ ہور میں سیٹل ہو گئے ہیں اور بڑی خاموشی سے ایک بڑی کمپنی کے کرتا دھرتا ہیں۔

لیکن ناہید کی اصل وجہ شہرت ڈاکٹر حسنا احمد خاں ہیں جو غالباً آج کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ حسنا اور ڈیانا کی محبت اب پبلک پراپرٹی ہے۔ اس پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ کئی پروگرام ٹیلی ویژن پر بھی آچکے ہیں جن میں ایک انٹرویو خاں صاحب کا بھی بڑی شہرت حاصل کر چکا ہے۔

میں نے تعارف کے طور پر آپ کو خاں صاحب کے گھر والوں سے ملا دیا ہے۔ اس گھر میں جا بجا چراغ فانوس شمعیں روشن کرنے کی کوشش کی ہے۔ خاں صاحب کے علاوہ اس گھرانے میں طارق بن افتخار جیسے قابل سرجن ہیں جو انٹرنیشنل فوٹو گرافر بھی ہیں۔

جس طرح جواد ساجد نے آپا فرخندہ اور ڈاکٹر ایوب کا نام روشن کیا اور جیسے آپا فرحت کے بیٹے جاوید نے دو بیٹیوں کی دنیا میں تہلکہ مچایا ایسے ہی ڈاکٹر طارق بن افتخار نے بڑی انٹرنیشنل شہرت پائی ہے۔ دو سال پہلے جب باغ میں زلزلہ آیا تو طارق اپنے ساتھ کچھ امریکی سینٹر لے کر باغ پہنچا۔ سینٹر تو رفاہی کاموں میں مصروف ہو گئے لیکن طارق نے ان گنت ہڈیاں جوڑیں..... لیکن خاندان میں اس کا چرچا نہ کیا۔ وہ کامیاب بھی ہے اور بڑا انسان بھی..... یہ دونوں خوبیاں ایک ہی انسان میں کم کم ہوتی ہیں۔

اور پھر حسنا ہے۔ وہ بھی بنیادی طور پر بچوں کے دل کا آپریشن کرتا ہے اور لندن میں اُس کی شہرت کا ڈنکا بجتا

ہے۔

میں نے خاں صاحب کے خاندان اور اُن کے چیدہ چیدہ مشہور آدمیوں کو آپ سے اس لیے روشناس کرایا ہے

کہ رشتہ جی ان لوگوں کی محبت میں گندھے ہوئے تھے۔

اشفاق صاحب نے دنیا کمائی تو بیوی بچوں کے لیے لیکن یقین جانے وہ دنیا سے وابستہ نہیں ہوئے۔ وہ ہمیشہ تھکن کی غلام گردشوں میں پھرتے رہے۔ ایک مدت انہوں نے رشتے ناطوں کو اپنا سرمایہ سمجھا۔ خاں صاحب کو سمجھنے کے لیے کسی وقت بھی یہ دھاگے ہاتھ سے چھوڑے نہیں جاسکتے۔ گو آخر میں غالباً وہ بھی جان گئے تھے یہ سب بتانِ وہم و گماں ہیں اور اُن کی تلاش کا راستہ اور جانب جانکا تھا لیکن ان رشتوں کی اہمیت کو سمجھے بغیر ایک قاری اشفاق احمد کی تصویر میں لگی ایک گراؤنڈ کو نہیں سمجھ سکتا!

اسی لیے میں نے اُن کا شجرہ نسب بھی ساتھ نہتھی کر دیا ہے کیونکہ یہ نام یہ رشتے جا بجا آئیں گے، کبھی کبھی تو اتر کا شجرہ ہوگا، کبھی دو ہرائی بات دوبارہ بیان کرنے کی ضرورت ہوگی لیکن کیا کیا جائے زندگی ہمیشہ سیدھی لائن کا سفر نہیں کرتی۔ کبھی کبھی اس کا سفر دائرے کا بھی ہوتا ہے۔



داستانِ وقت
مذہبِ کلام کی سزا

محمد مستقیم خاں (ہجرت کر کے آنے والے)

محمد معظم خاں

دوست محمد خاں

بابا محمد خاں + بی بی سردار بیگم

انفخار بھائی

18 مئی 1918ء

انفخار خاں کی زمینوں پر کھیتی باڑی

اقبال بھائی کے سومری ڈاکٹر طارق بن

انفخار سر جن کے والد

نعمت کی والدہ

جاوید طارق خاں ہائی ٹون لیا باری

اشفاق صاحب کے سومری

ٹولید پٹی سے جناب امیر احمد خاں کی شادی ہوئی



8
اشفاق
کالی بھونڈی
(عمر دو سال)

7
اشفاق احمد خاں
22 اگست 1925ء

6
اقبال بھائی
18 مئی 1920ء

5
انفخار بھائی
18 مئی 1918ء

4
بابا محمد خاں + بی بی سردار بیگم
16 مئی 1916ء

3
آپ فرحت
16 مئی 1916ء

2
جناب آفتاب احمد
20 مئی 1912ء

1
آپ فرخندہ

9
ریٹائرڈ بریگیڈیئر اشفاق احمد خاں
(کورکمانڈر) 1929ء

لیڈی میکلیگن کالج سے ساندہ کلاں تک

قیامِ پاکستان کے بعد فضا ابھی ایسی باتوں سے بوجھل تھی جن سے مسلمانوں کے ناآسودہ سوالات اُن کی بے چارگی کی کہانیاں اور چھوڑے ہوئے گھروں کے Nostalgia کی خوشبو آتی تھی۔ کچھ لوگ بہادر تھے جو جملہ قربانیوں کو اس ملک کے قیام کے مقابلہ میں بیچ سکتے تھے۔ کچھ ایسے تھے جنہیں پچھلے گھر، آبائی وطن، وہاں کے موسم، رہن بہن، دوست احباب بھولے نہ بھولتے تھے۔ وہ پاکستان میں رہتے ہوئے یہاں کی نعمتوں سے فیضیاب ہونے کے باوجود سداہن پانی کے پودے کی طرح سکتے رہتے۔ کچھ ایسے لوگ تھے جو ابھی بین بین چل رہے تھے۔ کبھی نئے وطن کی عافیت اور راحت کے شکر گزار ہوتے، کبھی پچھلی یادوں میں ڈوب کر گلہ گزار بن جاتے۔

کئی پشتوں سے اشفاق صاحب کا گھرانہ تعلیم یافتہ اور سیاست سے وابستہ رہا تھا۔ خاں صاحب کی بڑی بہن آپا فرحت نے جدوجہد پاکستان میں بڑا عملی حصہ لیا تھا۔ تقریریں کی تھیں۔ قائد اعظم کے موقف کو پاکستان کی اہمیت کو لوگوں تک پہنچانے میں ریرہوں پر چڑھ چڑھ کر مخاطب کیا تھا اور اس کے نتیجے میں جیل بھی بھگتی تھی۔

جب لوگ نعرے لگاتے "پاکستان کا مطلب کیا؟"

تو خاں صاحب اُن کے ساتھ مل کر جواب دیتے "الا الہ الا اللہ۔"

پھر وہ مجمع کو دونوں ہاتھوں سے شانیت کرتے اور اپنی تقریر کرتے جس میں ایک ہی بات پر زور ہوتا کہ پاکستان میں لوگ وسائل کے حصول کے لیے دیوانہ وار نہیں بھاگیں گے۔ چونکہ معاشرہ اسلامی اقدار پر قائم ہوگا اس لیے انصاف کی بنیاد پر قائم کیا جائے گا، لیکن سب سے بڑی بات پاکستان میں یہ ہوگی کہ اس دیس میں سب کی عزت نفس محفوظ ہوگی۔ وہ ذلت جو ہندو اکثریت کے ہاتھوں مسلمانوں کا نصیب تھی اب ایسی ذلت سے کوئی مسلمان دوچار نہیں ہوگا۔

وہ جانتے تھے کہ قائد اعظم نے جداگانہ حق خود ارادیت کے لیے بہت کوشش کی۔ وہ صرف اس قدر چاہتے تھے کہ جس علاقے میں مسلمانوں کی اکثریت ہو وہاں سے اُن ہی کا نمائندہ منتخب کیا جائے۔ پنڈت نہرو چودہ نکات پر مشتمل دستاویز پرکلی طور پر متفق تھے لیکن پھر اسی سے منکر ہو گئے.... قائد اعظم نہ دھرنا مارتے تھے نہ جھگڑا کرنے کے قائل تھے نہ

جیل جا کر وقت ضائع کرنے کے ہی شوقین تھے۔ انہیں آئینی جنگ جیتنے کا خیال رہتا۔ انہوں نے مسلمان اقلیت کو ایک نئے ملک کا سندیسہ دیا جس میں جا کر یہی اقلیت راتوں رات اکثریت میں بدل جائے گی۔

خاں صاحب پر قائد اعظمؒ کی تعلیمات اور ترغیبات کا بڑا گہرا اثر پڑا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر نہ کبھی دھرنا اختیار کیا نہ باواز بلند احتجاج کیا نہ کبھی اپنے قلم کو مزاحمتی ادب کی طرف راغب کیا۔ وہ اپنے میں تو انانی، تقویت، خود ارادیت اور لگن پیدا کرتے اور بڑی ثابت قدمی سے استقامت کے ساتھ منزل کی طرف چلتے رہتے۔

اُن کا ہیرو گاندھی نہیں تھا۔ وہ کبھی کبھی سوال کرتے کہ مہاتما گاندھی تو فلسفہ عدم تشدد کے پیروکار تھے۔ اُن کے چاہنے والوں نے سرکار انگلشیہ کی لائٹھیاں کھائیں، آنسو گیس کے ہاتھوں روئے، لیکن پلٹ کر ایک پتھر روڑا بھی ان مظالم توڑنے والوں پر نہیں پھینکا۔ پھر یہی ہندو جنتا جس کا "اہنسا" پرچارک مسلک تھا، مسلمانوں کے خون سے کیوں داغ دار ہوا؟ ان کے ہاتھوں مسلمان خواتین کی عصمتیں کیوں داغدار ہوئیں؟ بہار کے مسلمانوں پر جب تشدد ہوا تو مہاتما گاندھی نے زبان کیوں نہ کھولی؟ وہ بہار کے مسلمانوں کی دلجوئی کے لیے کیوں نہ پہنچے؟ اس معاملے میں اُن کا فلسفہ عدم تشدد کیوں خاموش رہا؟ پھر جب پنڈت جواہر لعل نہرو اقوام متحدہ کی سکیورٹی کونسل میں خود جا کر کشمیر یوں کا حق ارادیت مان آئے تھے تو پھر ہندوستان نے اس وعدے کا پاس کیوں نہ کیا؟ شیخ عبداللہ کو میر جعفر کا جیتا جاگتا روپ دے کر اُسے کشمیر پر مسلط کیوں کیا؟ کشمیر یوں کی جنگ آزادی کو بغاوت کا نام دے کر اس پر فوج کشی کیوں کی؟ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ساز باز کر کے گورداسپور کا علاقہ جہاں مسلم اکثریت تھی، ہندوستان کے حوالے کیسے کر دیا؟

گلی کوچوں میں، والٹن کیمپ میں جہاں جہاں ریفوجی پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے، کہانیاں خون آشام تفصیل سے داغدار گھوم پھر رہی تھیں۔ تیج بہادر سپرو، مظہر علی خان، علی برادران، حسرت موہانی ابھی زندہ ہیرو تھے، لیکن اس آدرشی گفتگو کے ساتھ دنیاوی مسائل حل کرنے کی ضرورت بھی بہت اہم تھی۔ مقامی انصار کی پُر جوش مددنا کافی تھی۔ لوگ مال غنیمت سمیٹنے، تالے توڑنے، گھروں پر نجانا قبضہ جمانے کا شعار بھی اپنائے ہوئے تھے۔ روزگار کا کچھ ٹھیک نہ تھا۔ حکومت ابھی استوار نہ ہوئی تھی۔ روزمرہ کے مسائل، مادی ضرورتیں، صبح و شام کے مسائل بھولے نہ بھولتے۔

اسی فضا میں جو تضاد تھا، تنگی اور بددی کی جو آمیزش تھی، گندے اور صاف لہو کا بیک وقت دل میں رہنے سے جو آری ہر وقت لوگوں کے اندر چلتی تھی، اس سے خاں صاحب بھی مستثنیٰ نہ تھے۔

خاں صاحب کا خاندان لٹا پٹا پاکستان پہنچا۔ باباجی اس چھوٹے سے قافلے کے سربراہ تھے۔ باباجی کے چھ بیٹے اور دونوں بیٹیاں ساتھ تھیں۔ بے سرو سامانی کا یہ عالم تھا کہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ اتنے سارے لوگ کہاں سے کھائیں گے؟ کہاں سوئیں گے؟ ایسے میں یہ لوگ یہ سارا لاؤ لشکر ماڈل ٹاؤن پہنچا۔

یہاں 96- ڈی ماڈل ٹاؤن میں اماں جی سردار بیگم کی بہن رشیدہ بیگم کے ساتھ رہتی تھیں۔ اُن کے شوہر بھائی فیاض پولیس میں آئی جی تھے۔ ماسی رشیدہ کا رشتہ گو بہن کا تھا، لیکن ماسی رشیدہ ہمیشہ اماں جی کو اپنی ماں جانی سمجھتی تھیں۔ ثانی اماں جو باباجی کے قافلے کے ساتھ آئی تھیں، عجیب صابر شا کر عورت تھیں۔ انہوں نے کبھی زندگی سے کوئی توقعات وابستہ نہ کی تھیں۔ عین جوانی میں اُن کا شوہر ایک گائے کو ساتھ لے کر کوئٹہ چلا گیا، لیکن انہوں نے کبھی شوہر کے خلاف

تو یہاں نہ کھولی۔ آپا فرخندہ کے شوہر ڈاکٹر ایوب احمد خاں لندن میں تھے اور آپا جی نے کبھی نہ پوچھا تھا کہ اُن کی واپسی کب ہوگی؟ بھائی ایوب ایف آرسی ایس کرنے کی غرض سے لندن گئے تھے لیکن وہاں سے وہ ہسپانیہ کی جنگ آزادی میں بھرتی ہو گئے لیکن آپا فرخندہ نے کبھی کوئی سوال نہ اپنے سے نہ کسی سے پوچھا۔ آپا فرحت کے شوہر ڈاکٹر عبدالقادر ان دنوں ساہیوال میں تھے اور وہیں آپا فرحت بھی چلی گئیں۔

کچھ دیر تو اماں جی اپنے کنبے کے ساتھ ماڈل ٹاؤن میں رہیں، لیکن پھر انہیں پتہ چلا کہ موج دریا کے قریب مزنگ روڈ پر ایک ڈھنڈار سا تین منزلہ مکان پڑا ہے۔ کوئی اس کا والی وارث نہیں۔ اس وقت جب لوگ کوٹھیوں کے تالے توڑ رہے تھے یہ لوگ 1- مزنگ روڈ پہنچے جس کے سارے دروازے کھڑکیاں چوہٹ کھلے تھے۔ اینٹیں جا بجا بکھری تھیں۔ پانی کے ٹل سوکھے اور بجلی کے میٹر غائب تھے۔ ایسے میں یہ لٹا پٹا کنبہ یہاں پڑاؤ ڈالنے پر مجبور تھا۔ حالانکہ رشتہ داروں نے باباجی پر تہمت لگائی کہ انہیں یہاں سے ایک سیف ملا جس میں لاکھوں کی نقدی تھی، لیکن انواہ، گمان اور شک تو مشرقی معاشرے کا ضمیر ہیں۔ ہم لوگ ان ہی تین جذبوں کے تحت اخبار بینی کا شوق پالتے ہیں اور غیبت کے چسکے لیتے ہیں۔

آفتاب بھائی سرکاری وکیل تھے، لیکن ابھی ان کا کچھری سے رابطہ استوار نہ ہوا تھا۔ اقبال بھائی نے ہانڈی روٹی چلانے کے لیے ایک انوکھا روزگار تلاش کیا۔ وہ بکر منڈی سے بکرا خریدتے اسے اپنے مضبوط کندھوں پر سوار کرتے۔ دن بھر اسے بیچنے کے لیے گاہک تلاش کرتے اور پھر جب بکرا بک جاتا تو پیسے اماں جی کی پھینٹی پر لا کر رکھتے۔ ان کی اس ترکیب سے سب کو روٹی میسر آ جاتی۔ باباجی روز صبح انا رکھی جاتے۔ یہاں بیلی رام کی دکان تھی۔ اس تاجر بیچنے نے باباجی سے بہت ادھار لے رکھا تھا۔ باباجی کی آرزو تھی کہ کچھ رقم انہیں مل جائے لیکن دکان بند تھی اور ادھار ملنے کے کوئی آثار نہ تھے۔

کھکھو بھائی جنہیں سب ڈیڈی جی کہتے تھے ادھر ادھر نوکری تلاش کرنے کی بے سود کوشش کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ ”داستان گو“ کے دفتر سے بھی چھٹی لی جائے اور بخش خاں جا کر باباجی کی زمینوں کی جمع بندی پر توجہ دی جائے اور اس اراضی سے جو روپیہ حاصل ہو اُسے خاندان کی بحالی میں لگایا جائے، لیکن ابھی یہ سکیم بھی سرے نہ چڑھ سکی اور وہ بے کار صورت گھر والوں پر بوجھ بنے رہے۔

اشتقاق سب سے چھوٹا تھا۔ اُس سے کوئی توقع نہ کی جاسکتی تھی لیکن اُس نے کشمیر فرنٹ پر جانے کا پروگرام بنا لیا۔ اماں جی اندرونی زخموں سے نڈھال تھیں اور ویسے بھی ”تقو“ چھوٹا ہونے کے ناطے انہیں سب سے پیارا تھا لیکن تب مسلمان مائیں بچوں کو جہادنی سبیل اللہ سے نہ روکتی تھیں۔ یہ جہاد نفس کی شکل میں ہوتا یا کسی فرد یا معاشرے کے حقوق بحال کرنے کے لیے پیش آتا، بخوشی اجازت مل جاتی۔ اسی جذبے کے تحت تقو آزاد کشمیر سدھارا اور غازی بن کر لوٹا۔

خاں صاحب کی مشکل اُس وقت سامنے آئی جب وہ متواتر محکمہ روزگار کے دفتر جاتے اور ناکام لوٹتے۔ ایک روز خاں صاحب نے وہاں ایک مہربان صورت کلرک سے پوچھا ”بھائی! میں روز آتا ہوں۔ آپ بغیر کسی وعدے کے لوٹا دیتے ہیں۔ آخر وجہ کیا ہے؟“

کلرک تھوڑی دیر زیر لب مسکرایا۔ پھر بولا ”جناب! آپ کے پاس بی اے کی ڈگری ہے اور ہمیں دسویں پاس درکار ہے۔ بی اے پاس نہ تین میں نہ تیرہ میں.....“

”یہ تو آسان سا مسئلہ تھا۔ آپ میری دسویں کی ڈگری رکھ لیں اور مجھے نوکری دے دیں۔“

کھرک بادشاہ نے خاں صاحب کو والٹن کیمپ میں جو نیر کلرک کی آفر دی۔ اُن کی تنخواہ 65 روپے ماہانہ تھی۔ انہیں والٹن کیمپ میں مائیکروفون پر گم شدہ رشتہ داروں کے پیغامات بے گھروں، گم شدہ لوگوں تک براڈ کاسٹ کرنا تھے۔ خاں صاحب صبح ایک پوٹلی میں دو روٹیاں، اچار یا کچھ بچا کھچا سالن لے جاتے اور رات تک اس پر گزارہ کرتے۔ کچھ راستہ تو بس لے جاتی۔ باقی وہ پیدل چلتے۔ نہ کبھی وہ کوئی حرف شکایت منہ پر لائے نہ کبھی اپنی Contribution بی پریشانی ماری۔ اس طرح کی شیخی اُن کے گھر میں حرف ممنوع تھی۔

یہیں انہیں ممتاز مفتی ملے جو اس یونٹ کے کرتا دھرتا تھے۔ وہ مہاجروں کی مشکلات کو رقم کرتے ان کے حل تلاش کرتے اور ہر روز افسران بالا کو رپورٹ کرتے۔ مفتی جی اور خاں صاحب کی دوستی Instant کافی کی طرح تھی..... فوراً تیار۔ فوراً استعمال کے قابل.....

دونوں اویب تھے۔ دونوں لوگوں کے ہمدرد تھے۔ دونوں کو عادت تھی کہ توجہ کی سرچ لائٹ اپنے تک نہ آنے دیتے۔

میری والدہ بھائی پر ویز چٹھہ اور میں گورداسپور سے ہجرت کر کے لاہور پہنچے تھے۔ ہمارے دل میں گورداسپور چھوڑنے کا برا قلق تھا۔ کیونکہ ہم اطمینان سے اس اُمید پر بیٹھے تھے کہ گورداسپور مسلم اکثریت کا علاقہ ہے یہ تو یقیناً پاکستان کا حصہ بنے گا، لیکن سیاسی جھوٹ تو سیاست کا ناگزیر حصہ ہوا کرتے ہیں۔ اصل حقیقت برسوں بعد چھان پھنک کر سامنے آتی ہے جب اس سچ کا فائدہ کچھ نہیں ہوتا۔

گورداسپور میں ہمارا گھر اُس سڑک پر واقع تھا جو پتین کی طرف جاتی تھی۔ اس گھر کا کالا پھانک عین سڑک پر کھلتا۔ پھر بائیں جانب چھوٹا سا کچن گاڑڈن تھا جس میں پودینہ، دھنیا، گاجر، کھیرے اور دو چار بوٹے بیر یوں کے نظر آتے۔ دوسری طرف ایک لیٹرین اور اُجاڑ صورت جگہ تھی جس کی دیکھ کر دیکھ کے لیے کسی کے پاس وقت نہ تھا۔ دونوں بانچوں میں لمباراستہ آگے چل کر ایک ڈیوڑھی میں کھلتا جس کے آگے پھر پھانک تھا اور اس کے دائیں بائیں دو کمرے تھے۔

ایک کمرہ تو ملازموں کے لیے مختص تھا اور دائیں جانب مہمان خانہ تصور کیا جاتا۔ اس کے بعد ایک کھلا صحن تھا جس میں بائیں ہاتھ باورچی خانہ تھا جس میں ہمارا خانساں چراغ دین کام کرتا تھا۔ وہ عادتاً کام چور اور ویسے بھی چور تھا۔ تمام مراعات ملنے کے باوجود وہ ہیرا پھیری سے باز نہ آتا۔ ایک روز جب اُسے میری والدہ نے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تو وہ طیش میں آ کر بولیں ”چراغ! میں بیوہ ہوں۔ میں نے بڑی مشکل سے بچے پالے ہیں۔ میری دعا تو پتہ نہیں لگتی ہے کہ نہیں لیکن میری بددعا تمہیں ضرور لگے گی۔“

جب ہم لیڈی میکلیکین میں مقیم تھے تو ایک دن میری والدہ کو چراغ مانگتا ہوا انارکلی میں ملا۔ میری والدہ کو پہچان کر بولا ”بی بی جی..... یہ میری آنکھیں نہیں گئیں آپ کی بددعا لگی ہے..... دیکھتی ہیں.....“

میری امی کئی دن پشیمان صورت پھرتی رہیں لیکن یہ بھی نیک لوگوں کے عمل کا ایک خاص منفی قسم کا اجر ہے۔

تو میں آپ کو گوردا سپور کے گھر کے متعلق بتا رہی تھی۔ باورچی خانے اور صحن کے عین سامنے تین بڑے کشادہ کمرے غسالخانوں سمیت بنے تھے۔ ایک میں میری والدہ اور میں رہتے تھے اور دوسرے کمرے میں میرا بھائی ریزی رہا کرتا تھا۔ لاہور میں جس روز بی بی متھس کے اے کورس کا پرچہ تھا کنفیڈ کا لُج کے پچھواڑے آگ لگ گئی۔ متحن اعلیٰ نے ساری لڑکیوں سے پرچے اکٹھے کیے۔ ہمیں ایف سی کالج پہنچایا اور وہیں ہم کنفیڈ کی لڑکیوں نے باقی پرچے دیئے۔ امتحان دے کر میں اور ریزی افراتفری میں گوردا سپور پہنچے۔ امی انپکس آف سکولز تھیں، لیکن حالات کے پیش نظر انہوں نے کچھ دیر کے لیے دورے منسوخ کر دیئے تھے۔

گوردا سپور ہندوستان کا حصہ بن گیا۔ ہندو اکثریت کو کشمیر تک راہداری مل گئی۔ گوردا سپور کی مسلم آبادی جان بچاتی کروہ درگروہ پنن کی طرف جانے لگی۔ میرے بھائی کے دل میں پاکستان کے تصور سے عملی محبت تھی۔ ایک روز اُس نے باہر جانے کے لیے باہر کا گیٹ کھولا تو چند بے آسرا غریب لوگوں کو ننگی تلواروں سے قتل کرنے کے عزم میں چند سکھ ٹوٹ پڑے۔ ریزی نے پھانک کھول کر ان چند نفوس کو اندر دھکیلا اور گیٹ لاک کر دیا۔ ریزی کی یہ عملی مدد اُس وقت بھی جاری رہی جب ہم عافیت کے ساتھ لاہور پہنچ چکے تھے۔ وہ قافلوں کی مدد کرنے کے لیے بسوں پر آیا کرتا۔ جو کچھ اُس سے بن پڑتی کرتا۔ اُس وقت جب سب لوگ جان بچانے کی فکر میں تھے یوں جان بچانے پر رکھ کر قافلوں کے ساتھ آنے جانے کی رسم وفا میں نے صرف ریزی میں دیکھی۔ وہ اسی طرح جان چھڑکنے والوں میں شمار ہوا کرتا تھا۔

گوردا سپور اب ہمارا گھر ایک طرح سے رفیوجی کیمپ بن گیا۔ ان لوگوں میں ایک زینب تھی جو بیٹالہ کے کسی تحصیلدار کی بیوی تھی اور جو بہت بعد میں کئی برس ہمارے گھر کھانا پکانے پر مامور رہی۔ اُس کے ساتھ اُس کا چھوٹا سا بیٹا لالو تھا اور جب میں 24۔ ایس کی سال میں تھی تو یہی لالو میرے ساتھ کالج جایا کرتا تھا۔

شاید ہم پنن والے گھر سے نکلنے کا نہ سوچتے اگر ایک واقعہ نہ ہو جاتا۔ ہمارے گھر سے عین ملحق بائیں جانب ایک کھلی سی گراؤنڈ اور آرمی افسروں کی چند بیرکیں تھیں۔ یہاں اُن دنوں رونق تھی۔ پریڈ کی آواز بھی آتی تھی اور بگل بھی بجا کرتا تھا۔ ایک روز چراغ لمبا سا چہرہ لے کر میری والدہ کے پاس آیا ”بی بی! ایک بات ہے.... اب یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ آپ بوریا بستر ہمیش اور لاہور چلیں۔“

”لیکن وجہ....“

”وجہ یہ ہے جی....“ اُس نے رازداری سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔

”میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے جی۔ ساتھ والے لفوجی افسر بات کر رہے تھے۔“

”کیا بات کر رہے تھے فوجی افسر؟“

”وہ جی کیسے عرض کروں وہ کہہ رہے تھے کہ چھوٹی بی بی کو اغوا کر کے بیرکوں میں لے جائیں گے۔“

”کیا کیا کیا....“ امی گزبڑائیں

”ہاں جی وہ تو اور بھی بڑی پلید باتیں کر رہے تھے جی....“

وہ تو یہ کہہ کر چلا گیا، لیکن امی سٹ پنا گئیں۔ پاکستان آنے کا فیصلہ آنا فانا ہو گیا۔ جب محافظ ہی لومڑی صفت

ہوں تو حفاظت کیا معنی..... کو نوائے کبھی کا چاچا تھا۔ امی نے اپنا تمام اثر و رسوخ لگا کر ایک ٹرک لیا۔ اس میں وہ چند فیوجی چڑھائے جو ہمارے گھر میں مقیم تھے۔ مجھے ایک رضائی میں لپیٹ کر ڈرائیور کے پیچھے والی روک کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ حکم تھا کہ کسی قیمت پر کبھی رضائی سے باہر سر نکال کر جھانکنا نہیں ہے۔ میرے بھائی کے پاس دھرمسالے کی ایک ڈیزی گن تھی جس سے وہ پرندے پھڑکایا کرتا تھا۔ اسی گن کو تو اُس نے ”جھاکے“ کے طور پر تھوڑا سا سچھت سے نکال کر سارا سفر کسی فوجی کی سی مستعدی سے طے کیا۔

دو چار مرتبہ ٹرک کو راستے میں روکا گیا، لیکن عافیت گزری اور ہم بالآخر یونیورسٹی کی مپس پہنچے۔ یہاں یونیورسٹی بندھی۔ ہم نے یونیورسٹی کی میزبانی پر بیٹھ کر روٹی کے ساتھ کریوں کا اچار کھایا جو چراغ کی قلمبندی سے ساتھ چلا آیا تھا۔ لاہور شہر ہمارے لیے اجنبی تھا اس لیے ہماری والدہ نے اپنی بہن فیروزہ خاں کے گھر کو تلاش کیا۔ وہ لٹے پٹے لاہور کی مین فیروز پور روڈ پر رہتی تھیں۔ یہ گھر مسز گیلانی کا تھا جو سکول میں پونا ماچھا (خالہ فیروزہ) کے نیچے پڑھاتی تھیں۔ ہم ان کے گھر پہنچے۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ میری والدہ کو لیڈی میٹکین کالج کی پرنسپل بنا دیا گیا۔ یہ کالج اساتذہ تیار کرنے کی درس گاہ تھی۔ یہاں بے وی اور بی ٹی کی سندیں حاصل کر کے لڑکیاں پڑھانے کے قابل ہو جاتی تھیں۔

اس کے ساتھ ہی انڈر ٹریننگ ٹیچرز کے عملی کام کے لیے ایک باقاعدہ سکول بھی تھا جس میں دسویں تک جماعتیں تھیں۔ ایک اور اضافی کام یہاں یہ جاری ہوا کہ سکول میں مہاجر لادارٹ چھوٹے بچوں کا کیمپ بھی کھول دیا گیا۔ یہاں بچوں کو مانی، طبی امداد دینے کے بعد ان کے وارثین کی تلاش کی جاتی یا پھر بچوں کے آرزو مند والدین کے حوالے کر دیا جاتا۔

کالج سے ملحق پرنسپل لاج تھا۔ کالج کا احاطہ ختم ہوتے ہی ایک بڑی پختہ دیوار تھی جس میں ایک دروازہ کالج اور پرنسپل لاج کے درمیان کھلتا تھا۔ اس دروازے کو صرف پرنسپل لاج کی طرف سے زنجیری کنڈی لگ سکتی تھی۔ پرنسپل لاج دو حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک حصے میں پرنسپل اور دوسرے حصے میں ہیڈ مسٹریس رہا کرتی تھیں۔ قیام پاکستان کے دوران امریکن پرنسپل مس رائس چلی گئیں اور ہیڈ مسٹریس بھی غائب ہو گئیں۔

اب پورا پرنسپل والا ہمارے قبضہ قدرت میں تھا۔ میرے بھائی اُن دو کمروں میں منتقل ہو گئے جو ہیڈ مسٹریس کے لیے مختص تھے، لیکن وہ ان کو استعمال نہ کرتے تھے۔ ایک چھوٹا کمرہ جس کا دروازہ برآمدے میں تھا اسے گودام بنا لیا گیا۔ ریزی بھائی ہمارے ساتھ ہی کھاتے پیتے اور سوتے تھے۔ بے سے برآمدے کے پیچھے تین بڑے کمرے تھے۔

دائیں طرف پہلا کمرہ ڈائننگ روم، پھر ڈرائنگ روم، آخر میں بیڈ روم۔ اس کے ساتھ ڈریسنگ روم اور غسل خانے کے علاوہ ایک گودام سے مشابہہ ایک اور کمرہ تھا جس میں غیر ضروری چیزیں پڑی رہتیں۔ ہمارا زیادہ وقت برآمدے میں گزرتا تھا۔ یہاں کالج کی پروفیسریں لڑکیوں کے والدین اور لواحقین فسادات میں پھنڑے ہوئے ملاقاتی آتے رہتے۔

برآمدے کو آپ ایک طرح کا Visitors روم کہہ لیجئے۔ یہاں پاکستان کے حالیہ مسائل، سرکاری افسران کی مشکلات اور عوام کی بے چارگی، سیاست کے الجھاؤ، وسائل کی کمی اور نہ جانے کیا کچھ زیر بحث آتا۔ ابھی امن کی وہ شکل پیدا

تھی جہاں پہنچ کر لوگ گھروں کی زیبائش، فرد کے لباس اور بچوں کی تعلیم کے پیچھے دیوانہ وار مسابقت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ابھی دولت کی پوجا سے لوگ قریب قریب نا آشنا تھے۔

میری والدہ کو کالج کی مشغولیات مصروف رکھتیں اور وہ زیادہ وقت اپنے دفتر اور سٹاف روم میں گزارتیں۔ میرے بھائی ریزی ابھی تک اپنے سوشل ورک میں مصروف تھے۔ وہ کبھی امرتسر سے مہاجروں کے کونوائے لاتے۔ کبھی چائے پھیلے پر رکھ کر جانندھر اور لدھیانے کی طرف سے آنے والی لاوارث سی بسوں کے ساتھ ہوتے۔ ریزی بھائی نے کبھی ان سفروں میں اپنے لیے کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی وہ سارا دن کے بھوکے پیاسے گھر پہنچتے۔ ان کے ساتھ مہاجروں کی کئی کہانیاں ہوتی تھیں، لیکن میری والدہ کے پاس ان کو سننے کا وقت نہ تھا۔

میں ویسے ہی کھلڈری طبیعت کی مالک تھی۔ جب تک مسئلہ میرے جڑے میں گھونسنے مار کر مجھے متوجہ نہ کرے میں پریشان نہیں ہوتی۔ مجھے بھی ریزی کی کہانیوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔ مجھے اپنا دل لگانے کے لیے پروفیسران میں بڑا مست راستہ مل گیا تھا۔

کالج کی جانب پختہ دیوار میں بنے ہوئے دروازے کو میں کھولتی اور کالج کے اوقات کے بعد ہاتھ میں بیڈمنٹن کے کمرے کے کالج میں چلی جاتی۔ عین پرنسپل والا سے ملتی بیڈمنٹن کے کورٹس تھے۔ یہاں عموماً میرے ساتھ کوئی نہ کوئی کھیلنے آیا، دو مل جاتا۔ پرنسپل کے دفتر اور پی اے کے کمرے سے ملحقہ دو کمرے سٹاف کی رہائش گاہ تھے۔ یہاں میں رات کا کھانا کھا کر چلی جاتی اور یہ پروفیسران کچھ مجھے پرنسپل کی بیٹی سمجھ کر اور کچھ وقت کئی کی خاطر میری دوستی کا دم بھرتی تھیں۔

ان میں سب سے پیش پیش جمیلہ ظفر تھیں۔ یہ میری ہم عمر، ہم مزاج اور ہم مشغلہ ساتھی بن گئیں۔ جمیلہ کا مزاج ٹھنڈا ٹھنڈا تھا۔ ان کا خاندان بھی مہاجر تھا۔ بہن بھائی سب راولپنڈی میں تھے۔ رات گئے تک ہم باتیں کرتے ناچنے گانے کا شوق پالتے۔ ان دنوں مجھے گانے کا اس قدر شوق تھا کہ اپنی ملک نے میرا نام ’کول‘ رکھ دیا تھا جو وقت کے ساتھ ساتھ صرف ’کو‘ میں بدل گیا۔

جمیلہ ظفر کی شادی کچھ عرصہ بعد ڈاکٹر زیدی سے ہو گئی جو ایک بہت بڑے ہارٹ اسپیشلسٹ تھے۔ بدقسمتی سے زندگی نے وفانہ کی اور جمیلہ بیوہ ہو گئیں.....! لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ تب ہماری دوستی میں تیز چشمے کا سا بہاؤ تھا۔ اسی جوش کے تحت ہم نے کالج کے ہال میں ایک ناچ کو مرتب کیا جس میں نے زندگی کا رول کیا اور جمیلہ نے موت کا روپ دھارا۔

اس نیبلونما ناچ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ زندگی چاہے کیسی ہی کیوں نہ اترائے، کد کڑے مارے بالآخر موت اُسے سر کر لیتی ہے۔ جب کالج میں ڈرامہ ہوا تو ہمیشہ کی طرح میں نے ڈرامہ ڈائریکٹ کیا اور اسی میں یہ ناچ زندگی اور موت کے نام سے دکھایا گیا۔ جمیلہ سے میرا رابطہ ساری زندگی رہا۔ گو ہم دونوں رہن نم روزگار رہے لیکن ایک دوسرے کو طاق نسیاں میں رکھ کر بھولے بھی نہیں۔

دوسری دلآویز شخصیت اقبال ملک تھیں، جنہیں ہم سب اپنی ملک کہتے تھے۔ یہ وائس پرنسپل تھیں اور عمر میں ہم سے بڑی تھیں۔ بڑی شفیق، سادہ طبیعت اور کام کر خاتون تھیں۔ وہ خود تو میرے اور ٹوٹو کے مشاغل میں حصہ نہ لیتیں، لیکن

بڑی گرم جوشی سے تالیاں بجانے والوں میں شامل رہتیں۔

آپی ملک نے ساری عمر شادی نہ کی۔ پہلے وہ لیڈی میٹکلیکن کالج میں پڑھاتی رہیں۔ پھر ملتان میں گورنمنٹ کالج کی پرنسپل بن گئیں جہاں ان دنوں میری والدہ انسپکٹر آف سکولز تھیں۔ ملتان میں میری والدہ نے زمینوں کے چکر میں پھنس کر استعفیٰ دینے کی کوشش کی تو آپی ملک وہ واحد رکاوٹ بن گئیں جنہوں نے انہیں استعفیٰ دینے نہیں دیا۔ امی کا ارادہ لینڈ لارڈ بننے کا تھا۔ وہ برج جوزا کی پیدائش تھیں۔ یہ عموماً بہت خیال پرست ہوتے ہوئے تو امی بچوں کی صورت ہمیشہ تضاد اور دوئی کا شکار رہتے ہیں۔ ملکو آپی کے پاس ایک طرح سے امی کا گھر ہی بن گیا تھا۔ وہ زمینوں سے لوٹیں تو آپی کے پاس ٹھہرتیں..... دورے سے آتیں تو اپنے گھر میں قیام کرنے کے بجائے سیدھا آپی کے پاس چلی جاتیں۔

یہ باتیں بہت بعد کی ہیں۔ اس وقت یہ سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ آپی ملک ملتان چلی جائیں گی۔ ابھی تو وہ وائس پرنسپل تھیں۔ ہمارے میں جمیلہ آپی ملک کے علاوہ یہاں ایک اور معتبر پروفیسر اینڈ ملک تھیں۔ دراز قدر گوری چٹی کشمیری خاتون، جن کی شادی بعد میں ادیب شفیق الرحمن سے ہوئی۔ اللہ نے انہیں بڑے خوبصورت دو بیٹے عطا کیے جن میں سے ایک بیٹے کا نیک انجام نہ ہوا اور اس کی خودکشی کے بعد شفیق الرحمن بھی زندہ نہ رہ سکے..... لیکن ابھی یہ کھیڑے قبضہ قدرت سے منظر عام تک نہ آئے تھے۔ اینڈ آ پابینڈ منٹن سے لے کر گانا، بجانا، پارٹی، ڈراموں میں شمولیت اور گپ بازی کی شوقین تھیں۔ ایک بار جب سکول میں مغل اعظم کا ڈرامہ سٹیج کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں تو انہیں شہزادہ سلیم بنانے کی تجویز ہوئی۔

میرے ساتھ خصوصی رعایت ہوا کرتی تھی اس لیے مجھے نور جہاں کا رول دیا گیا۔ افسوس چند ریہرسلوں کے بعد یہ ڈرامہ پتہ نہیں کیوں بغیر سٹیج کیے ڈراپ سین کو پہنچ گیا، لیکن عجیب بات تھی کہ ہمارا گروپ ملال آشنا نہیں تھا۔ جو ہو گیا وہ بھی ٹھیک، جو نہ ہو سکا وہ بھی قابل قبول۔

اس گروپ میں ایک شخصیت انور کی بھی تھی۔ انور آرٹ کی پروفیسر تھیں اور ان کے والد سے میری والدہ کی جان بچان تھی۔ انور رشید کے والد ملتان کے ڈی ای تھے اور ان ہی نے سب سے پہلے میرے بھائی کو اس کی خدمات کے عوض سات مربع سرکاری زمین کے الاٹ کیے تھے اور پھر میری والدہ ان ہی مربعوں کی وجہ سے نناوے کے چکر میں پھنس گئی تھیں اور انہوں نے پورے تیس مربع الاٹ کرا لیے تھے۔

لیکن ابھی انور صرف سویٹی تھی اور گروپ میں چینی کی طرح حلول کیے ہوئے تھی۔ وہ نہ بیڈ منٹن کھیلتی تھی نہ ناچتی گاتی تھی۔ اسے اپنی بہنوں کی طرح ڈراموں میں شرکت کا شوق بھی نہ تھا۔ پھر بھی کوئی محفل اس کے بغیر مکمل نہ تھی۔

یہ باتیں بیان کرنے سے فقط یہ بتانا مقصود ہے کہ میں کیسی بے فکری کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں، لیکن میری والدہ یقیناً میرے لیے پریشان تھیں۔ جسے میں خوش وقتی سمجھ رہی تھی اسے وہ تعطل سے تعبیر کر رہی تھیں..... ایک روز ہمارے گھر زبیدہ آ پا آ گئیں۔ غالباً وہ لاہور کے ڈی سی کی بیگم تھیں اور امی سے کسی تقریب میں ملی ہوں گی۔ لمبے برآمدے میں آ پا زبیدہ بیٹھی چائے پی رہی تھیں۔ وہ لاوارث بچوں کا سروے کرنے آئی تھیں۔ اس وقت میں کالج کی طرف سے ریکٹ لے کر وارد ہوئی۔ شاید میں لان میں بنے ہوئے ٹیوب ویل کا معائنہ کرنے چلی جاتی لیکن امی

نے مجھے آواز دے کر بلا لیا۔

”یہ میری بیٹی قد سیدہ ہے.....“

آپاز بیدہ نے میرے سلام کا جواب خندہ پیشانی سے دیا۔

”آؤ بیٹھو..... کیا کرتی ہے؟“

امی نے تعارف کرایا ”بی اے کیا ہے، کنیئر ڈکالچ سے۔ بے چاری کی فسٹ ڈویژن ماری گئی۔ بڑی افراتفری

میں امتحان دیا ہے۔ اب کوئی ڈھنگ کا بندہ مل جائے تو بیاہ ڈالوں.....“

پتہ نہیں کیوں آپاز بیدہ جھنجھلاہٹ سے بولیں ”ایویں شادی کرائیں گی۔ چھوٹی سی ہے..... پہلے اسے ایم اے

کر لینے دیں آرام سے..... کیا عمر ہے اس کی؟“

”انیس سال.....“ امی نے بتایا۔

”ناں ناناں مسز چھٹھ ناناں ایسا ظلم نہ کریں۔ پلیز..... اسے ایم اے کرنے دیں۔ شادی کوئی بھاگی جاتی ہے۔ ذرا

بیچھڑ ہو لینے دیں..... ساری عمر پڑی ہے شادی کے لیے.....“

اگر آج کا عہد ہوتا تو زبیدہ آپا ضرور تحریک Feminism کی سرگرم کارکن ہوتیں۔ ابھی عورتوں کی جاگرتی

کی پو پھٹنے والی تھی اور کوئی عورت بھی زنا نہ حقوق کی علمبردار بن کر آواز نہ اٹھاتی تھی۔

”اچھا ایم اے تو کراؤں لیکن کنیئر ڈکالچ میں تو صرف بی اے تک تعلیم ہے.....“

”کنیئر ڈکالچ کیوں؟ گورنمنٹ کالج بھی ہیں۔ وہاں ایم اے اردو شروع کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ میں

نے داخلہ لے لیا ہے۔ پطرس بخاری سارا کچھ دیکھ رہے ہیں۔ اچھی پڑھائی ہوگی۔ آپ بے فکر رہیں۔“

امی کچھ متذبذب ہو کر بولیں ”لیکن جب یہ کنیئر ڈکالچ میں پڑھتی تھی تو اس کے ریاضیات کے پروفیسر سرداری لعل کہا

کرتے تھے کہ اسے ایم اے Mathematics کرنا چاہیے۔“

”مس مستحانی کہتی تھیں امی کہ میں اکنامکس میں ایم اے کر لوں۔“ میں نے اضافہ کیا۔

”چلو جی اس بات کو جانے دیں مسز چھٹھ..... وہ پاکستان سے پہلے کی باتیں ہیں۔ اب تو اردو قومی زبان

ہے..... پاکستان حقیقت ہے۔ ہم نے انگریز اور ہندو کی غلامی سے آزادی حاصل کی ہے۔ آپ تو خود بڑی

Educationist ہیں۔ محبت وطن ہیں۔ مہاجرین کی خدمت کرتی ہیں۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ اردو کے بغیر پاکستانی کی

شناخت ممکن نہیں..... وطن کا تصور اردو سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ اگر ہم نے سندھ میں سندھی، بلوچستان میں بلوچی، پنجاب

میں پنجابی اور صوبہ سرحد میں پشتو کو اولین جگہ دی تو ہماری شناخت بھی اتنے ہی حصوں میں بٹ جائے گی۔“

”نہیں بابا! تو بات کو کہاں سے کہاں لے گئی..... مجھے تو صرف اس قدر فکر ہے کہ گورنمنٹ کالج میں

Co-education ہے اور..... میں.....“

”جی جی کیسا فکر؟“

”اس نے جب بی اے کا امتحان دیا تو بڑے مشکل حالات تھے۔ جس روز کا کی کا حساب کا پرچہ تھا کنیئر ڈکالچ

میں کچھ فساد یوں نے آگ لگا دی۔ پرنسپل نے فوراً لڑکیوں کو امتحان گاہ سے نکالا اور ایف سی کالج لے گئیں۔ وہاں ہی انہوں نے حساب کا پرچہ دیا۔“

”پھر جی یہ تو حالات سب کے ہیں۔ پھر؟“

”میرا کہنے کا مطلب ہے کہ میری بیٹی مخلوط تعلیم کو صرف اتنا جانتی ہے اس سے زیادہ اس کا Exposure نہیں

ہے۔“

پتہ نہیں امی کو میری نیت پر شبہ تھا یا وہ مخلوط تعلیم کے حوالے سے لڑکیوں کو غیر محفوظ سمجھتی تھیں۔ وہ کچھ چپ سی ہو گئیں اور حامی نہ بھری۔ امی کا تذبذب بھانپ کر زبیدہ آپا بولیں ”بیٹھے میں وہاں ہوں۔ مرغی کے پروں تلے قدمیہ رہے گی۔ آپ خدا کے لیے فکر نہ کریں.....“

ریزی نے مزاحمت کی کیونکہ وہ خود ان دنوں گورنمنٹ کالج میں ایف ایس سی کر رہا تھا، لیکن امی نے اس کی پروا نہ کی۔ دوسری مزاحمت بابو محمد یعقوب کی طرف سے آئی۔ بابو محمد یعقوب ان دنوں لیڈی میکلیکین کالج میں ہیڈ کلرک تھے۔ پی اے کا لفظ تو ابھی ایجاد نہ ہوا تھا، لیکن یوں سمجھئے کہ وہی صاحب کی تاریں کھینچنے والے اور اُسے پتلی کی طرح نچانے والی طاقت تھے۔

ایک اچھے Executive کے لیے ایک قابل پی اے نہایت اہم ہوتا ہے۔ اگر وہ آئین اور اصولوں کو زبانی Quote کر سکتا ہے۔ افسر کو نکلنے کے راستے بتا سکتا ہے۔ حدود میں رکھنے اور حدود کو سلیقے سے توڑنے کی ترکیبیں سمجھا سکتا ہے تو ایسا افسر بڑی جلدی نیک نامی کو پہنچ جاتا ہے۔

بابو محمد یعقوب جالندھر میں ہماری زمینوں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے۔ جب 1936ء میں میری والدہ جالندھر سے تبدیل ہو کر دھرمسالہ گئیں تو ان کے پاس جالندھر شہر میں کچھ زمین تھی جس پر سٹرو بیڑی بس بھری اور دیگر بھیلوں اور سبزیوں کی کاشت ہوتی تھی۔ بابو محمد یعقوب جالندھر کے سکول میں بھی امی کے ہیڈ کلرک تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی زمینیں اور ہماری زمینوں کی دیکھ ریکھ بھی کرتے تھے۔

اب لیڈی میکلیکین میں بابو جی محمد اسر نوامی کے ہیڈ کلرک بن گئے۔ یہی بابو جی بہت بعد میں چشتیہ مسلک کے پیر بن گئے۔ ان کے دربار پر قوالی ہوتی تھی۔ لوگ نذرانے پیش کرتے تھے اور وہ اپنے مریدوں سے کہا کرتے تھے..... ”بھائی رجوع کرو۔ رجوع کرو۔ سب جواب مل جائیں گے۔ سب شکوک رفع ہو جائیں گے۔ تم صرف رجوع کرو۔“

سنت مگر میں جہاں ان کا ڈیرہ بن گیا بڑی محضلیں ہوئیں لیکن امی ریزی اور میں نے کبھی رجوع نہیں کیا..... ہمارے لیے وہ ہمیشہ بابو جی رہے..... امی جی کے شفقت ہیڈ کلرک۔ جب انہیں پتہ چلا کہ میں ایم اے اردو کرنے گورنمنٹ کالج جانا چاہتی ہوں تو انہوں نے چند جسٹ اٹھائے امی کے دفتر کی چٹ اٹھائی اور مے آئی کم ان پلیز کہے بغیر اندر داخل ہوئے۔

”جی ایک عرض کرنا تھی..... اگر آپ کے پاس وقت ہو۔“

”جی بابو جی۔“

”ویسے تو جی مجھے دخل دینے کی کوئی ضرورت نہیں، لیکن میں چھوٹی بی بی کو تب سے جانتا ہوں جب میں

چھ رسالے آیا کرتا تھا۔ وہ بہت بھولی روح ہے۔“

”ایسی روحوں کی نگرانی کرنا پڑتی ہے۔“

”بابو جی! میں نے ایسی تربیت کی ہے کہ وہ بھٹک نہیں سکتی۔“

اب سامنے ایک افسر بول رہا تھا۔ بابو جی کچھ گھبرا گئے ”دیکھ لیجئے آپ بہتر سمجھتی ہیں۔ لیکن مخلوط تعلیم میں بیٹی کو

بھیجنا میرا خیال ہے کہ..... عقلمندی نہیں ہے۔“

امی نے پتہ نہیں اندر کیا محسوس کیا لیکن معاملے کو Dismiss کر دیا اور تنخواہوں کے کاغذ سامین کرنے میں

مشغول ہو گئیں۔

گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لیے امی کو ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے بھی منایا۔ وہ گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے

تھے۔ عربی کے سکالر تھے اور اردو ایم اے کے پہلے Batch میں عربی کی کلاس اُن ہی کی ذمہ داری تھی۔ ایک روز وہ بی ٹی

کی کلاس کو لیکچر دینے آئے تو بڑے ہال میں لیکچر کے بعد باتوں باتوں میں امی نے اُن سے ایم اے اردو کا ذکر کیا۔

”آپ جی آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ فوراً قدمیہ کو داخل کرائیں۔ وقت بدل گیا ہے۔ اب لڑکیوں کا وقت بھی قیمتی

ہے۔ پاکستان کو تعلیم یافتہ خواتین کی ضرورت ہے۔“

”لیکن میں اُس کی شادی کرنا چاہتی ہوں۔“

”ذرا سوچیں اگر آپ تعلیم یافتہ نہ ہوتیں.... تو آج آپ بیوگی کے بعد بچوں کو لے کر کس کے پاس جاتیں؟

تصمیم تو جتنی ہو کم ہے۔ اس کی خاطر تو چین بھی جانا پڑے تو حکم سمجھ کے جانا چاہیے۔“

فیصلہ بڑی آسانی سے ہو گیا۔ ہمارے گھر میں فیصلے عورتوں کے ہاتھ میں تھے۔ اس مایا چھندر میں ریزی اور

بی بی کی آواز ڈوب گئی۔ امی جی نے پرنسپل کرامت صاحب کو فون کیا اور میں کالج پہنچ گئی۔

کچھ باتیں گویا مقدر کا حصہ ہوتی ہیں۔ مجھے گورنمنٹ کالج میں اشفاق احمد سے ملنا تھا۔ میرے مستقبل کا تعین

ہفت امکانات سب اس بات میں پوشیدہ تھے کہ میں گورنمنٹ کالج پہنچوں۔ اس مقام پر پہنچنے کے لیے مجھے بی اے کرایا

گیا۔ حالانکہ 1947ء میں جب پاکستان معرض وجود میں آیا، حالات دگرگوں تھے۔ جس روز میرا ریاضیات کا پرچہ تھا

کنٹر ڈکالک کے اُس بلاک میں جو لب سڑک تھا آگ لگ گئی۔ اصولاً تو کالج بند ہو جانا چاہیے تھا، لیکن مجھے ایم اے کرنا

تھا۔ مجھے خاں صاحب سے ایک مقررہ مقام پر ملنا تھا، اس لیے بی اے کا پرچہ دینا پڑا۔

اُس وقت کالج کی پرنسپل مس مکینئر (Macnaire) تھیں۔ قریباً چھ فٹ اونچی لمبی، سخت قسم کی منظم خاتون نے

بی اے کی لڑکیوں کو کمرہ امتحان سے نکالا۔ کالج بس میں سواریا۔ خود ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی اور سیدھی ایف سی

کالج پہنچیں۔ یہاں لڑکے بی اے کے پرچے دے رہے تھے۔ انہوں نے امتحان سے ساز باز کی، ہمیں بٹھایا اور خود بکریوں

کا رکھوالا بن کر کمرہ امتحان میں بیٹھ گئیں.... مخلوط تعلیم کا یہ پہلا منظر میری نگاہ نے دیکھا۔

ادھر اشفاق صاحب کو گویا حکم ملا کہ وہ ایم اے اردو کر لیں۔ وہ اس وقت تک منشی فاضل کر چکے تھے۔ مکتبہ

جدید سے اُن کی کتاب ”ایک محبت سوانح“ چھپ رہی تھی اور انہیں ہرگز ایم اے اردو کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ

حب الوطنی کے سلسلے میں بڑی پُر جوش تقاریر کر چکے تھے اور جانتے تھے کہ تبدیلی زندگی کا اہم حصہ ضرور ہے لیکن ساتھ ہی جانتے تھے ۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے

مرے بُت خانے میں تو کبھے میں گاڑو برہمن کو

فیصلہ میری تقدیر نے کیا یا میری والدہ نے۔ مہر کیف میں کالج پہنچی۔ پرنسپل آفس میں پروفیسر کرامت موجود تھے۔ اُن کی شخصیت میں بڑا میٹھا سا زعب تھا۔ جیسے وہ پہلے آپ کی مان کر پھر اپنی منوانے کے عادی تھے۔ قیام پاکستان کے بعد تعلیم ایک بڑے انقلابی دور سے گزر رہی تھی۔ مسائل ان گنت تھے۔ وسائل کی کمی تھی۔ بھانت بھانت کے لوگ اپنے ذاتی مسائل میں الجھ کر اپنے آپ کو مظلوم سمجھنے میں مصروف تھے۔ ہر ایک کی اپنی شناخت کے چکر میں تھی۔

پروفیسر کرامت صاحب نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔

میں ہر خوف زدہ انسان کی طرح کرسی پر آگے ہو کر بیٹھی۔

”آپ نے بی اے کہاں سے کیا؟“

”کنینئر ڈکالچ سے جی۔“

”اور فسٹ ڈویژن آئی؟“ سوال ہوا۔

”جی فسٹ ڈویژن ضرور آتی..... لیکن جس روز میرا ریاضیات کا پرچہ تھا اُس دن جنیل روڈ پر آگ لگ گئی۔

ہمیں بس میں بیٹھا کرایف سی کالج لے گئے۔ بڑی افراتفری میں ہنگامی سنٹر بنا..... ہم لڑکیاں اتنی نروس تھیں کہ پر پے زیادہ

اچھے نہیں ہوئے ورنہ تو جی..... میں نے بار بار بتائی ہوئی حقیقت بیان کی۔

”اور بی اے میں کون کون سے سبجیکٹ لیے۔“

میں لچا جت سے بولی ”اے کورس Maths اور اکنائکس۔“

”اور میتھس کون پڑھاتا تھا؟“

”پروفیسر سرداری لعل۔“

”اچھا اچھا..... وہ تو ہمارے ہی پروفیسر ہیں اور اکنائکس۔“

”مس مٹھائی۔“

”جی۔“

”ساؤتھ سے آئی ہیں۔ اُن کے بھائی نے اکنائکس پر بڑی معرکے کی کتاب لکھی ہے۔ وہی مس مٹھائی۔“

”جی۔“

”پھر بھائی اتنے قابل پروفیسروں سے پڑھ کر تم ایم اے اردو کر کے کیا کرو گی..... یا Math میں ایم اے کرو گی

Economics میں۔“

”جی مجھے اردو کا شوق ہے۔ میں رائٹر بننا چاہتی ہوں۔“

وہ ہلکا سا مسکرائے اور پھر کچھ وقفے کے بعد بولے ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ پطرس بخاری صاحب نے اس سبکیٹ میں ایم اے کا اجراء کیا ہے، لیکن اب وہ یونین کو چلے گئے ہیں۔ ہم کچھ تجرباتی سا کام کر رہے ہیں۔ ابھی پروفیسروں کا بھی انتخاب مکمل نہیں ہوا۔ بہر کیف تم برس صاحب سے مل لو۔ فیس وغیرہ داخل کروادو..... فارم احتیاط سے بھرنا..... تھینک یو۔“

پرنسپل صاحب کھڑے ہو گئے یعنی مجھے برخواست کر دیا۔ میں نے وہی زبان میں شکریہ ادا کیا اور اُن کے کلرک کے پاس پہنچی۔ کھڑکی کے ساتھ لگ کر ایک نوجوان کھڑا تھا۔

گورا چٹا خوبصورت لڑکا جس نے کھڑکی کے ساتھ کہنی ٹیک رکھی تھی۔ جس وقت میں وہاں پہنچی وہ فوراً مودب انداز میں ایک طرف ہو گیا۔ نظریں نیچی رکھیں اور مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہ کی۔ جب میں فیس دے چکی تو برس صاحب نے تعارف کے انداز میں کہا ”بی بی یہ اشفاق احمد ہیں۔ یہ آپ کے ساتھ ایم اے اردو کریں گے۔ ان کی فیس میں نے ابھی جمع کی ہے.....“

یہ میرا خاں صاحب سے پہلا تعارف تھا.....

لیڈی میٹلکین سے گورنمنٹ کالج تک دو چوراہوں کا راستہ تھا۔ پہلے سیکرٹریٹ کو جانے والا چوک آتا۔ اس کے بعد وہ چوک جس پر بھنگیوں کی توپ نصب تھی۔ اگر مالی روڈ کی طرف رخ کر کے دیکھیں تو دائیں ہاتھ وہ عمارت آتی جو بعد میں NCA کی درس گاہ بنی اور یہیں لاہور کا مشہور میوزیم تھا۔

بھنگیوں کی توپ کے دائیں ہاتھ ایک اور چوک آتا جو انارکلی بازار کا سنگھم تھا۔ گورنمنٹ کالج کے عین سامنے چھوٹا سا باغ تھا اور یہی سڑک بائیں ہاتھ لڑکوں کے ہوسٹل کی طرف بھی جاتی تھی۔

گورنمنٹ کالج کا پچھانک کھلتے ہی وہ اپنی سڑک آتی جس کے بائیں ہاتھ نشیب میں اول کی گراؤنڈ تھی جس میں ہر سال سپورٹس ڈے منایا جاتا۔ لڑکیوں کا چائنی ریس میں حصہ لینا ایک بڑا ہر لطف Event تھا۔ اول سے دوسری پلے سائیکل کالوجی ڈیپارٹمنٹ تھا۔ پھر یہ سڑک ذرا سی چڑھائی چیزہ کر پرنسپل آفس تک پہنچتی۔

پرنسپل صاحب کی کارپورج میں کھڑی نظر آتی تو طالب علم خاموشی سے گزرتے ورنہ ہنسنا بولنا فقرے کسنا آوازیں دینا تو اس عمر کا خاصا ہے۔ پرنسپل کے دفتر کے ساتھ ہی بائیں طرف ایک چھوٹا سا لان تھا اور اس کے عین سامنے بھی کھلی جگہ تھی جس پر بعد میں اوپن ایئر تھیٹر تعمیر کیا گیا۔ اس لان سے ملحق سوئمنگ پول تھا جس میں سپورٹس کے دنوں میں بڑی جوش و خروش کی ریسیں ہوتیں۔

فٹھ ایئر کے آخر میں جب سوئمنگ Events ہوتے تو اس میں ایک ریس اپنی نوعیت کی اختراع تھی۔ ایک تڑکی سوئی دھاگہ پکڑ کر ٹینک کے آخری سرے پر بیٹھتی اور فری سٹائل میں تیرنے والا اُس تک پہنچتا۔ لڑکی سوئی میں دھاگہ پکڑ کر Contestant کو پکڑاتی۔ وہ اسے واپس لے جا کر ریفری کو پکڑاتا۔ اگر سوئی سے دھاگہ نکل جاتا تو اُس کے ٹیسٹ کرتے۔

اُن دنوں جب ہمارا فٹھ ایئر ختم ہوا تو ریزی بھائی کا دوست بھی کالج میں پڑھتا تھا۔ ان کے ساتھ ہمارے گھوڑا سپور سے مراسم چلے آتے تھے۔ میں نے اس کے ساتھ مل کر اس ریس میں شرکت کی اور ریاض فٹس آیا۔

لیڈی میککین سے دورا سے گورنمنٹ کالج کو جاتے تھے۔ ایک راستہ تو میں اوپر بیان کر چکی ہوں۔ دوسرا راستہ پرنسپل لاج کے سامنے سے گزر کر باہر نکلتا تھا۔ سامنے بہت بڑی گراؤنڈ تھی جس میں ہر سال انٹر کالجیٹ مقابلے ہوتے تھے اور بڑی بڑی ٹرافیوں لڑکیوں کو ملتی تھیں۔

حسن اتفاق سے دو مرتبہ ان کھیلوں کی اناؤنسمنٹ کرنے کا مجھے موقع ملا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ میں اناؤنسمنٹ کرنے سے پہلے عموماً اشعار پڑھ کر ناظرین کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی تھی۔ مجھے یہ تو معلوم نہ تھا کہ Master of Ceremony کو کیا کرنا چاہیے چونکہ ایم اے کی وجہ سے اشعار سے واقفیت تھی اس لیے میں نے از خود یہ طریقہ رائج کر لیا تھا۔

اس گراؤنڈ میں ملحق خواتین کے لیے سوئمنگ ٹینک تھا اور اس کے بعد سڑک پار کر کے ایم اے او کالج کی بلڈنگ آتی تھی۔ میں نے اس ٹینک کا بھی فائدہ اٹھایا اور سوئمنگ سیکھی اور بالآخر مقابلے میں حصہ لے کر فٹ آئی اور کلر ہولڈر بنی۔

میں نے آپ کے لیے بساط بھرا اپنی رہائش گاہ کی تفصیل بیان کر دی ہیں۔ میری والدہ مجھے اس محاصرے سے نکال کر سڑکوں کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی، لیکن فیصلہ ہو جانے کے بعد انہوں نے ایک لفظ منہ سے نہ نکالا۔ جب ہم دھرمسالہ میں تھے تو دسویں کرنے کے بعد مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لیے یا تو بوائز کالج بھیجنا پڑتا یا پھر لاہور میں داخلہ لینے کی ضرورت پیش آتی، لیکن میری والدہ مخلوط تعلیم کے حق میں نہ تھیں۔ انہوں نے چند معتبر لوگوں سے مل کر ایک چھوٹے سا پرائیویٹ کالج لوہڑ بازار میں کھول دیا۔ یہاں پر وہ تمام لڑکیاں داخل ہو گئیں جو لاہور جانے سے معذور تھیں۔

یہاں ہی موسیٰ کو چہرہ اسی کی نوکری دی گئی۔ تین سالہ خاموش طبع، فزہی مائل درمیانے قد کا موسیٰ عموماً بے رنگ سے کپڑے پہنتا تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ موسیٰ نے امی کو تلاش کر لیا اور لیڈی میککین آ پہنچا۔ اسے فوراً چہرہ اسی کی نوکری مل گئی اور اسی کو مجھے کالج لانے لے جانے کی ڈیوٹی دے دی گئی۔

موسیٰ نے کبھی میرا نام نہ لیا۔ ہمیشہ بی بی جی کہہ کر بست پکڑ لیتا۔ ہولے ہولے ایک دو قدم پیچھے چلتا لیکن جب ہم پرنسپل کراچی کے دفتر کے قریب پہنچتے تو یکدم موسیٰ میرے آگے آگے چلنے لگتا۔ گورنمنٹ کالج کے برآمدے بڑے بڑے خوبصورت اور گوتھک آرٹ کا نمونہ تھے۔ ایسا ہی ایک لمبا سا برآمدہ اردو کلاس کے سامنے بھی تھا۔ یہاں پہنچ کر عموماً موسیٰ کمرے کا دروازہ کھول کر ایک طرف ہٹ جاتا اور جب میں اندر داخل ہو جاتی تو دروازہ بند کر کے غائب ہو جاتا۔ اس کے بعد اوول کے گرد بنی ہوئی سڑک پر ہمیشہ ایک ہی بیچ پر بیٹھتا جو پرنسپل کے دفتر سے ذرا سی دور تھی۔

جس روز پہلے دن میں ایم اے اردو کی کلاس میں داخل ہوئی۔ میں تھوڑی سی نروس تھی۔ ہر نئی چیز عموماً ہیبت کا باعث بن جاتی ہے۔ کلاس کے کمرے میں ایک لمبی مستطیل میز بچھی تھی۔ اس کی لمبائی کے دونوں رُخ پر کرسیاں تھیں۔ میز سے قریباً چار سیزر ہیاں اونچا ایک ڈائس تھا جس پر ایک روسٹرم اور دیوار کے ساتھ لمبا سا بلیک بورڈ لٹکا تھا۔ اس بلیک بورڈ پر عموماً عربی، فارسی اور انگریزی لکھی نظر آتی۔ بہت کم اردو کے الفاظ لکھے جاتے۔

پہلے دن کمرے میں کوئی پروفیسر موجود نہ تھا۔ لمبی میز پر سامنے کی طرف مولوی طوطا، قمر صاحب بیٹھے تھے۔

تھیں کی پشت دروازے کی طرف تھی اور اس وقت یہاں آواز بیدہ اور ذکیہ بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر آپا نے مجھے اپنے ساتھ ہائی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

ابھی کا بیٹیاں کتابیں رکھ کر سیٹل ہو رہی تھی کہ ایک خوبصورت گورا چٹا اطالوی شکل و صورت کا نوجوان اندر داخل ہوا۔ اُس نے لٹھے کی شلوار نیلی لکیروں والا سفید کرتا اور پشاوری چپل پہن رکھی تھی۔ وہ بڑی ملائمت کے ساتھ آگے بڑھا اور مردانہ قطار میں مولوی طوطا کے ساتھ بیٹھ گیا۔

چند لمبے خاموشی رہی۔ پھر نوجوان نے اپنا تعارف کرانے کے انداز میں کہا..... ”خواتین و حضرات! میرا نام اشفاق احمد ہے۔ میں مشرقی پنجاب کے ضلع فیروز پور سے آیا ہوں۔ ہمارے قصباتی شہر کا نام مکتسر ہے۔ میرے والد وہاں ڈپٹی کمشنر تھے۔ پھر رفتہ رفتہ حیوان ناطق کا علاج بھی کرنے لگے..... ہم آٹھ بہن بھائی ہیں اور اس وقت میں موج دریا کے پلانتھ 1- مزنگ روڈ میں رہتا ہوں۔ میرے پاس ایک سائیکل ہے جس پر میں اس وقت آیا ہوں.....“

یہ کہہ کر اشفاق احمد نے کلاس کے لڑکے لڑکیوں پر نظر دوڑا آئی۔ سب خاموش تھے۔ ابھی Orientation کی کلاسوں کا رواج نہ تھا۔ لوگ اپنا تعارف حدوداً ربع ہنسری بتاتے ہوئے شرماتے تھے۔ صرف اشفاق احمد نے سب کی سیٹ کو مد نظر رکھ کر اپنا آپ تھالی میں رکھ کر پیش کر دیا۔

آواز بیدہ اور مولوی طوطا نے غالباً اسے شوخی سمجھا۔ ذکیہ جو بلند شہر سے آئی تھی اشفاق احمد جیسے صاحبِ حسن و جمال سے متاثر ہوئی۔ مجھے تو ویسے ہی متاثر ہوتے دیر نہیں لگتی۔ لیکن میرے اندر بھی تھوڑا سا رد عمل پیدا ہوا۔ میں نے دل میں سوچا کہ مقابلہ سخت سہی لیکن میں محنت کروں گی اور بالآخر ضرور جیت جاؤں گی۔

سب سے پہلے غلام محی الدین کمرے میں آئے۔ انہوں نے اپنا تعارف آتے ہی انگریزی میں کرایا۔ بلیک جیٹ صاف کر کے کپٹنل لیٹرز میں اپنا نام لکھا۔ پھر روسٹرم پر آئے اور اپنا تعارف جاری رکھا۔ کچھ دیر انگریزی میں بولنے کے بعد وہ اردو میں جاری ہو گئے۔

اُن کالج و لہجہ اس بات کا غماز نہ تھا کہ اُن کی اردو اکتسابی ہے۔ وہ زیادہ وقت انگریزی بولتے لیکن جب اردو میں کچھ دیتے تو ایسی نکسالی اردو اور اس قدر روانی کے ساتھ جاری ہوتی کہ فلسفہ خودی ”اسرار و رموز“، ”ارمغانِ حجاز“ سب ممتاز بن جاتی۔ سمجھنے میں کچھ دشواری نہ ہوتی۔

دُبلے پتلے ہری نیلی آنکھوں والے اثر صاحب انگریزی میں بولے..... ”میں مدراس سے آیا ہوں اور اس وقت کنٹرولر آف Examinations ہوں۔ میرا کمرہ لیڈیز روم کے بالکل سامنے ہے جہاں برآمدہ مڑتا ہے عین وہاں..... آپ میں سے کسی کو کسی قسم کا مسئلہ درپیش ہو تو وہ میرے پاس آئے..... میں دیکھوں گا کہ آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟“

مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ اس پہلی ملاقات میں ہی کس بنا پر اثر صاحب اور خاں صاحب نے ایک دوسرے کو پہلے پہچاننے کے لیے چن لیا۔ بہت جلد خاں صاحب اثر صاحب کے گھر آنے جانے لگے لیکن کالج میں کبھی کسی کو شک تک نہ گزرا کہ اشفاق صاحب اور اثر صاحب میں کالج کے بعد ایک بے تکلفی کا رشتہ بھی ہے۔ اس دوستی کی گہرائی اور گیرائی کو بس

یہی دونوں جانتے ہیں۔

اثر صاحب مدراس میں ڈپٹی کمشنر تھے لیکن مہاجر بن کر یہاں آ گئے اور ڈپٹی کمشنری کا رعب کبھی نہ جھاڑا۔ صرف میں انہیں ڈپٹی صاحب بلاتی تھی اور بلاتی رہی۔ وہ بیڈن روڈ کے عقب میں کشمی مینشن کی ایک چمکی منزل میں اپنی اہلیہ آپا ممتاز کے ساتھ رہتے تھے۔

کالج کے اوقات کے بعد وہ ’سول اینڈ ملٹری گزٹ‘ کے لیے کالم لکھتے۔ رفتہ رفتہ وہ اسی اخبار کے ایڈیٹر ہو گئے۔ خاں صاحب بھی وہاں پہنچ جاتے۔ اثر صاحب آئی سی ایس تھے لیکن اُن میں وہ شیخی خوبوند تھی جو عموماً اس کلاس میں ہوتی ہے۔

اثر صاحب کو اقبال اور پاکستان کی محبت کھینچ لائی تھی۔ پاکستان آ کر ڈپٹی صاحب نے بڑی طوفانی زندگی گزاری۔ اُن کے بچے جاوید کمال، سعیدہ، تمہینہ اور سلمیٰ اپنے مقام پر گئیں تھے لیکن اثر صاحب میں عورتوں کے لیے بڑی کشش تھی۔ ایک امیر کبیر بیگم اُن پر لٹو ہو گئیں اور دوسری شادی پر آمادہ کر لیا۔ ممتاز آپا کا کمال ہے کہ انہوں نے کبھی اُف تک نہ کی اور بیگم صاحبہ جب گھر کے اوپر والے پورشن میں منتقل ہو گئیں تو بھی وہ خاموش رہیں۔

سعیدہ ٹیلیوژن کی بڑی آرٹسٹ بنی۔ تمہینہ کے نصیب میں ممتاز مفتی کی بہو اور عکسی مفتی کی بیوی بنا لکھا تھا۔ سلمیٰ ابھی بھی ٹیلیوژن سے منسلک ہے اور جاوید اثر نے امریکہ جا کر ایک امریکن خاتون سے شادی کر لی اور کمال اپنی آئی اے میں بڑا افسر بن گیا۔

اثر صاحب ایک آرٹسٹ تھے۔ اُن کی زندگی طوفانی تھی اور آخر تک رہی..... آرٹسٹ لوگ لہروں کی طرح ساحلوں پر پھینٹنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہم ان کی حالت کو سمجھ نہیں سکتے۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ وہ ایک باپ کی طرح میری حفاظت کرتے تھے اور کرتے رہے۔

خاں صاحب ایم اے اردو میں منشی فاضل کر کے پہنچے تھے۔ اُن کے افسانوں کا مجموعہ ’ایک محبت سوا فسانے‘ چھپ چکا تھا۔ وہ کالج کے بعد عام طور پر مکتبہ جدید چلے جاتے، لیکن ہم سب ہم جماعت کم تجسس اُس سے کم انفرمیشن اور بے حد کم علم طالب علموں کا گروہ تھا۔

آپاز بیدہ ڈپٹی کمشنری بیگم ضرور تھی لیکن علم سے اُن کا کوئی ناطہ نہ تھا۔ ذکیہ لب ولہجہ کو اردو زبان پر عبوری کا سرٹیفکیٹ سمجھتی تھی۔ مولوی طوطا شاید اپنی عربی کے بن بوتے پر اپنے آپ کو اردو دان سمجھتے تھے۔ رہ گئے قہرازماں یہ بڑے سادہ لوح انسان تھے۔ نہ انہیں کسی بات پر مان تھا نہ کسی بات کی شیخی ہی تھی۔ وہ بچوں کے سے تحیر کے ساتھ پروفیسروں کو دیکھا کرتے۔

یہ عجیب سی بات ہے کہ جو کوئی بھی اُن دنوں کونونٹ یا کسی مشنری سکول کی شکل دیکھ لیتا تھا، اس میں مغربی کلچر انگریزی زبان اور رہن بہن کی شدہ بدھ پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ مقامی کلچر، علم، زبان والے کو کمتر سمجھنے لگتا تھا۔ یہ احساس غالباً فاتح کے ساتھ مل جانے سے پیدا ہوتا ہے۔

اب انگریز تو رخصت ہو چکا تھا اور وجہ بھی وہ نہیں رہی کہ فاتح کا کلچر اپنا کر انسان اپنے آپ کو برتری کی خلعت

حکا کرے لیکن سفید فام قوموں کا تہور پہلے سے بڑھ گیا ہے۔ امریکہ بہادر کے ہاتھ میں مشرقی قوموں کو سجدہ ریز رکھنے کا سحر ہے۔ جاپانی، چینی تو اس رعب تلے اس قدر دبے ہوئے نظر نہیں آتے لیکن مسلمان تو میں آنکھیں بھی دکھا رہی ہیں اور یہ بھی حسب توفیق خوب کھا رہی ہیں۔ اگر وہ اٹھتے ہیں تو بنیاد پرست کہلاتے ہیں۔ دہشت گرد بن جاتے ہیں اور اگر تھیوارڈا لیتے ہیں تو لبرل تو بن جاتے ہیں لیکن بی کلاس شیمن کی طرح ان کی اپنی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔

کالج میں مجھے ان باتوں کا قطعی احساس نہ تھا۔ میرے پاس ”فسانہ آزاد“ کی ساری جلدیں تھیں اور میرا مبلغ علم ہی تک محدود تھا۔ میری عقل ملاحظہ فرمائیے کہ اتنی تعلیمی استعداد پر مجھ میں خود اعتمادی سب سے زیادہ تھی۔ جس اشفاق احمد کو ”گلستان“، ”بوستان“ حفظ تھی جو فارسی عربی کا سکا لڑ ہونے کے باوصف اردو کی ان گنت کتابیں کھنگال چکا تھا۔ میں اسے اندر ہی اندر Underrate کر رہی تھی۔

اب مجھے پتہ چلتا ہے کہ ان کا ایک مسئلہ تھا۔ وہ اپنے کسی ہم جماعت کو احساس کمتری میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ احساس کمتری میں مبتلا انسان ناکارہ ہو جاتا ہے۔ وہ دہشت گردوں سے جا ملے یا خود کش بم کے سہارے اپنا آپ ختم کر ڈالے۔ ذہنی مریض بن کر کسی ہسپتال میں جا پہنچے یا کسی قتل کا مرتکب ہو جائے۔ بہر کیف زندگی اس کے لیے مٹی کھودتی ہے۔

وہ ہم سب کی تھوڑی تھوڑی مدد یا رہنمائی کرتے رہتے تھے، لیکن ہمیں کسی شکرگزاری میں مبتلا نہیں کرتے تھے۔ میں ”بہمد دی“ لفظ کو ”ہمد دری“ لکھا کرتی تھی۔ اشفاق صاحب اپنی کاپی پر ہمد دی لکھ کر یوں آواز بیدہ کو دکھاتے گویا اصلاح چاہتے ہیں۔ میری نظر پڑ جاتی تو میں اپنی اصلاح کر لیتی، لیکن مجھ میں اتنی عقل نہ تھی کہ اعتراف شکست کرتی۔

ابھی Self-projection کی بیماری عام نہ ہوئی تھی اور خود ستائشی انداز زیست کو بڑا سبھا جاتا تھا۔ خاں صاحب تو اس معاملے میں بہت ہی شرمیلے اور گونگے تھے۔ وہ اپنا سارا وقت اپنے جملہ نالائق ہم مکتبوں سے اپنا آپ کمتر سمیت کرنے میں صرف کیا کرتے۔ زیادہ جانتے اور کم ظاہر کرتے۔ ان کی کتاب ”ایک محبت سو افسانے“ چھپ چکی تھی لیکن ان کے منہ سے اس کتاب کا ذکر بھی نہ سنا۔

ان کی ذاتی لائبریری تھی جس میں ان گنت کتابیں تھیں۔ ان کی ملاقات ادیبوں سے تھی۔ کافی ہاؤس میں باقاعدگی سے جایا کرتے تھے۔ کالج سے ملتے جدید جاننا ان کے معمولات میں سے تھا۔ اثر صاحب سے ملاقاتیں عام تھیں لیکن ان ساری Activities کا خاں صاحب نے کسی کلاس میں کبھی ذکر نہ کیا۔ کلاس میں انہوں نے کبھی ذہانت کا سکہ جاننے کے لیے مشکل سوالات نہ پوچھے۔

ایک بات البتہ ان کی علم دوستی کی غماز تھی اور وہ لائبریری کی کتابیں تھیں۔ ان کو بھی کوئی شمارے بغیر وہ کسی نیچے کی طرح اٹھائے پھرتے۔ میں نے بوینورسٹی لائبریری کا نیا نیا کارڈ بنوایا تھا۔ یہ لائبریری انارکلی جانے والے راستے پر تھی اور عام طالب علم کو خوفزدہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

ایک روز جب میں لائبریری سے باہر نکلی تو برآمدے میں مجھے اشفاق احمد ملے۔ انہوں نے نہ مجھے سلام کیا نہ خوش لیا۔ بس آہستہ سے بولے..... ”کیا میں آپ کی کتابیں دیکھ سکتا ہوں؟“

میں نے کتابیں پیش کر دیں۔ انہوں نے چند لمحے اور اراق الٹ پلٹ کر دیکھے اور پھر بولے ”دیکھئے اگر آپ چاہیں تو ہم کتابیں Exchange کر لیتے ہیں۔ میں چند دن کے بعد آپ کو یہ ساری لوٹا دوں گا۔“

جب میں کتابیں لے کر گھر آئی تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے کورس کے متعلق درست چوائس نہیں کی تھی اور میں درست نئج پر کتابیں نہیں پڑھ رہی تھی۔ اشفاق صاحب نے مجھ سے جو کتابیں تبادلے کے طور پر لی تھیں ایم اے کے مطالعے کی غرض سے بے کار تھیں، لیکن انہوں نے میری عزت نفس کا پاس رکھا۔ یوں میری اندمجروح کیے بغیر مجھ پر اپنی علیست کا زعب ڈالے بغیر خاں صاحب نے مجھے تاریخ ادب اردو موازنہ انیس و دبیر مولوی عبدالحلیم شرذ کے ناول محمد حسن عسکری کے افکار پیش کر دیئے۔

عورتیں کن بلند یوں کو چھو سکتی ہیں اس کی طرف توجہ دلانے کے لیے انہوں نے عصمت چغتائی کی ”میزھی لکیر“ اور قرۃ العین حیدر کے افسانے بھی ساتھ تھی کر دیئے۔ میں نے اس کے بعد پنجاب لاہریری جانا چھوڑ دیا۔ مجھ تک کتابوں کی ترسیل مسلسل ہو گئی تھی۔ وہ اگر اپنی ذاتی لاہریری سے کتابیں مستعار دیتے تو ہمیشہ ظاہر کرتے گویا یہ بھی پنجاب پبلک لاہریری کی کتابیں ہیں۔

ان کتابوں کی آمدورفت سے اچانک میں خوفزدہ ہو گئی۔ ایک روز میں گھر جانے کے لیے برآمدے میں لنگی بی تھی کہ اشفاق احمد کہیں سے آ گئے۔ اُن کے ہاتھوں میں حسب معمول کتابیں تھیں۔ چہرے پر جلتی بھجتی مسکراہٹ تھی۔

”آپ نے یہ خطوط پڑھے ہیں؟“

مجھے معلوم نہ تھا کہ وہ کن خطوط کی بات کر رہے تھے؟

”جی نہیں.....“

”یہ کورس کی کتاب نہیں ہے۔ ملینا (Malina) کے نام خطوط ہیں لیکن بڑے خوبصورت.....“

وہ آؤٹ آف کورس بات کر رہے تھے چونکہ مجھے اُن کی کتابوں سے فائدہ پہنچ رہا تھا۔ میں نے ملینا کے خطوط بھی پکڑ لیے۔

یہ خط جذبات میں بھیکے ہوئے بلکہ آنسوؤں میں نئے ہوئے تھے۔ لکھنے والے نے بڑی عاجزی سے ملینا کے حضور عرض کی تھی کہ ”جس کرسی پر تم بیٹھ کر جاتی ہو وہ تمہارے جانے کے بعد بھی تمہارے وجود سے بھری رہتی ہے۔ جس کمرے میں سے تمہارا وجود گزر جاتا ہے وہاں تمہاری خوشبو سانس لینا دشوار کر دیتی ہے۔ ہر موسم میں ہر جگہ تمہاری چھاپ لگی ہے۔ بتاؤ میں اس دیوانگی سے کیسے نجات پاؤں؟“

ان خطوں کو پڑھنے کے بعد میں چورسی بن گئی..... اب مجھے کتابیں پکڑتے ہوئے خوف سا آتا تھا۔ وہ نہ ہو کسی دن کسی کتاب میں سے کوئی محبت نامہ نکل آئے اور پھر وہ خط مجھے اپنی والدہ کو دکھانا پڑے۔ اب میں نے اس کا یہ راستہ نکالا کہ کبھی کتابیں لے لیتی کبھی انکار کر دیتی۔ رفتہ رفتہ جب کتابوں کی ترسیل میں تو اترا نہ رہا تو اشفاق صاحب نے ایک اور راستہ نکالا۔

مجھے برآمدے میں روک کر انہوں نے سوال کیا ”آپ کے پاس دوئی ہوگی؟“

جی..... ہے۔“

”دے دیجئے میری سائیکل پیکچر ہوگئی ہے۔“

میں نے دونی نکال کر دے دی۔

بغیر شکر یہ ادا کیے وہ چپکے سے چلے گئے۔

انہوں نے ہتھیلی بڑھائی۔ دونی یوں وصول کی گویا کسی دربار میں خلعت سے نوازے گئے ہوں۔ پھر شان

استغما سے بغیر شکر یہ ادا کیے لوٹ گئے۔ سفید ہتھیلی کے آگے پست سوال صورت بڑھنا اور بگڑے دل شہزادے کی طرح

لوٹ جانا..... دونی کا مثل جزیہ کے پیش کرنا اور برتھ ڈے کی طرح قبول کیے جانا..... ایک کندھا جھکا کر پشاور

چیلوں پر بوجھ ڈالتے ہوئے براؤن رنگ کی آنکھوں والے کاٹیکھی نظر سے دیکھتا اور پھر روہانسا ہو کر لوٹ جانا.....

یہ سب میری یاد کی چلمن پر بنی ہوئی تصویریں ہیں۔ جب میرا جی چاہتا میں چلمن گرا کر اس کی سکرین پر بنی پرانی

یاد کی تصویریں دیکھ لیتی۔ جب جی نہ چاہتا اس حق تما چلمن کو پلیٹ کر اوپر کر دیتی۔

آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں یادیں ایک عجیب و غریب رول ادا کرتی ہیں۔ ہر انسانی

مثل کی طرح یاد کا طباغ پر مختلف اثر پڑتا ہے..... اس کے خصائص بھی انسانی اعمال کے جملہ خصائص کی طرح اچھے بھی

مرتب ہوتے ہیں اور ان میں برائی کا نمک بھی شامل رہتا ہے۔

بابے لوگ کہا کرتے ہیں جو لوگ ماضی کی یاد اور مستقبل کے اندیشے میں مبتلا رہتے ہیں وہ اپنے حال کو برباد

کریتے ہیں۔ وہ حال کی گھڑی پر جو کچھ میسر ہے اس کا نہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں نہ حالیہ نقصان سے بچنے کی امید رکھ سکتے ہیں۔

لیکن اس امر کو بھی کیا کیا جائے کہ ماضی اپنی گہری چھاپ یاد کی صورت چھوڑ ہی جاتا ہے اور اس کی گرفت سے

تعمداتی ممکن نہیں۔ جیسے ساحل سمندر پر گیلے پیروں کے نشان ریت پر دور تک نکل جائیں۔

یاد کا اپنی اپنی طبیعت کر دار جملہ جراثیم ہسٹری سے گہرا تعلق ہے جو لوگ معمولی درمیانی سطح کی زندگی گزارتے

ہیں جن کی وابستگی روح سے کم اور جسم سے زیادہ ہوتی ہے جن کے Genes خوش رہنے کا فن جانتے ہیں اور جنہیں

صحت میں کام کر دوہ ہنکار نہیں ملا ہوتا انہیں یادوں کا Lasso پکڑ کر زرخیز نہیں بنا سکتا۔

یہ لوگ کھانے پینے پینے اوڑھنے نسل آگے بڑھانے اور سیر سپائے میں مگن زندگی کو بیہودہ یادوں کے حوالے

تھیں کرتے..... ایسے لوگ آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ نہ یہ خود ارتقائے انسانی میں حصہ لیتے ہیں نہ ارتقائے حیات کی

تعمدات میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ ان کے لیے واقعات، حادثات، واجبات آئے اور چلے گئے۔ بیٹھ کر ان پر تاسف کرنا حساب

کتاب کرنا، جمع جتھا ملانا ان کی عادت نہیں۔ جب تک ان کی جسمانی ضرورتیں بمقدار وافر سہولت کے ساتھ پوری ہو رہی

ہیں انہیں کسی سنگ میل کنارے کھڑے ہو کر پُرانے راستے کو دیکھتے رہنے کی حاجت پیش نہیں آتی۔

بنی نوع انسان زیادہ تر ایسے ہی انبوہ کثیر کی کثرت سے بنا ہے۔ یہ نہ ماضی کی یاد میں بے قرار ہوتا ہے نہ مستقبل

کے اندیشے میں مبتلا ہوتا ہے۔ حال میں رہتا ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اس کی حال میں مشغولیت بابوں جیسی نہیں ہوتی۔

یہ جب حال میں مشغول ہوتے ہیں تو غالباً وہ حال کی گھڑی کو رب سے منسوب کر کے راضی برضا ہونے کو زندگی کا

کندن بناتے ہیں۔

عام دنیا دار آدمی کو نہ رب کی آگہی ہوتی ہے نہ راضی برضا ہونے کا فن آتا ہے۔ وہ گویا خالی الذہن ہو کر اپنی زندگی میں خوشی خوشی مگن، جسم کی ضرورت سے آگاہ چھوٹے بڑے کپڑے کو ناپتا چلا جاتا ہے۔ نہ اُسے مابعد کا خوف ہوتا ہے نہ نروان کا بھلیہ کا ستا تا ہے۔ نہ اُسے جنت اور دوزخ ہی کے وسوسوں کا کوئی اندیشہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ ہری ہری دھوپ کی طرح حد نظر تک سبزہ پھیلائے رکھتے ہیں اور آنکھ کا حالیہ منظر حسین رکھتے ہیں۔

ان لوگوں سے ہٹ کر کچھ لوگ فنون لطیفہ کے شیدائی، امر ہو جانے یا امر کر دینے کے شائقین، بے قرار، مضطرب..... ایسے لوگوں کے لیے یادیں تخلیق کا باعث بنتی ہیں..... ان کے لیے گزرے موسم ان کہی باتیں، ان چھوئے جسم، ادھورے واقعات، دھندلے چہرے، چھوٹی چھوٹی وارداتیں، غیر محسوس حد تک ابھرنے والی خوشبوئیں، مسکراہٹیں، آنکھوں سے لوٹ جانے والے آنسو..... بستروں کی سلوٹیں، کھونٹیوں سے ٹنگے ہوئے پرانے کپڑے، پرانا ٹوتھ برش، ٹونا ہوا پن، کاغذوں پر ادھوری سطر میں سوکھے پن ہمیشہ با معنی رہتے ہیں۔

یوں سمجھئے جو کچھ گزر گیا ان کے اندر کسی پتھر کی سل پر موجود اڑو کی عبارت بن کر مرسم ہو گیا..... تخلیق کار اس عبارت کو پڑھنے میں برسوں صرف کرتا ہے۔ وہ ان ہی یادوں کے سہارے ان لوگوں تک پہنچتا ہے، جو تخلیقی عمل میں تو داخل نہیں ہو پاتے لیکن یادوں کے ڈسے ہوئے رہتے ہیں۔

ان ہی یادوں کی کھنکھاتی مٹی سے آرٹسٹ کبھی شعر لکھتا ہے، کبھی مجسمہ بناتا ہے۔ کبھی صفحہ قرطاس پر شناسا چہرہ بھولی بسری لگی اداس دریچہ بنا لیتا ہے۔ گانے والے کی نئے میں اُس کے سوز و گداز میں یہی یادیں ابھرتی ہیں اور سننے والے اور اُس کے مابین ایک رشتہ استوار کر لیتی ہیں۔

یادوں کے ایندھن کے بغیر کبھی با اثر آرٹ جنم نہیں لیتا۔ اس گندھی مٹی کے نہ ہونے پر کوئی مہا تما بدھ کا مجسمہ نہیں بنتا۔ جسے صدیوں بعد لوگ حیرت سے دیکھیں۔ یادوں کے بغیر کبھی ایسی Levitation ممکن نہیں جس سے ارض زمین کا گھیر دُور تک نظر آسکے.....

کچھ عاشقوں کے لیے یادزہر ہلاہل ہے۔ وہ محنوں ہو یا سسی، ہیر ہو یا ماروی..... اُن کے لیے ایک چھوٹی سی یاد ساری زندگی پر محیط ہو جاتی ہے۔ وہ اس یاد کے گرد اب سے نکل نہیں پاتے۔ یہی اہل یادیں انہیں امر کر دیتی ہیں۔ پھر وہ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک تو سفر کر سکتے ہیں، لیکن ان لحوں سے نکل کر عام روایت، رسم و رواج، اقدار، مسلک کی پیروی نہیں کر سکتے۔ اُنٹھے بیٹھے اُن کے لیے ان ہی یادوں کا تریاق اور ان ہی کا زہر ہلاہل ساتھ ساتھ دونوں کی طرح چلتا ہے، جن میں آڑ تو رہتی ہے لیکن وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔

یاد ایک عمومی، اساسی بنیادی کیفیت ہے جو ہر دل پر اپنا وار کرتی ہے۔ محبت کی طرح یہ بھی ہر در پر دستک دیتی ہے۔ پھر ہر انسان اپنی طبیعت، کردار، جینز کی انجینئرنگ، موروثی افتاد طبع، تلاش کے مطابق اس یاد کو اپنے فائدے یا نقصان میں ڈھال لیتا ہے..... کچھ لوگ یادوں سے ایسے ڈسے جاتے ہیں جیسے کوڑیا لے ناگ کا ڈسا پانی نہ مانگے..... کچھ دریچے کھولتے ہیں۔ دُور کا منظر دیکھتے ہیں اور کھڑکی بند کر کے آرام سے سو جاتے ہیں۔

میرا خیال تھا کہ اس ”دونی“ کی وجہ سے کہیں بات نہ بڑھ جائے..... لیکن ہر بار وہ دونی مانتے لوٹانے کا وعدہ کرتے اور بغیر شکریہ ادا کیے آگے چلے جاتے..... بات کبھی آگے نہ بڑھی کیونکہ اشفاق احمد لڑکیوں کی طرح شرمیلے اور پختہ توں کی طرح غیرت مند تھے۔

اشفاق احمد خاں اپنی خاندانی روایات کے تحت کسی غیر پٹھانی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا چاہتے تھے۔ لکن کو اپنے گھر والے افراد اور مجموعی طور پر اتنے پسند تھے کہ وہ ان کی گرفت سے نکلنا گناہ کبیرہ سمجھتے تھے۔ ایسے میں وہ ایک قدم میری جانب بڑھتے تو دس قدم پسپائی کے اختیار کر لیتے۔ اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے انہوں نے ایک بڑا خوبصورت Defense mechanism اپنالیا تھا۔

ایک روز صبح کے وقت جب وہ کالج آئے تو اُن کے بائیس ہاتھ کی تیسری انگلی میں شادی کا جھلا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح شادی شدہ ہونے کا اعلان تمام لڑکیوں کو اور خاص کر مشنری سکول کی پڑھی لکھی لڑکی کو ڈور باش رہنے کی لال جھنڈی دکھا دے گا..... وہ کبھی کبھی نوٹس لینے سے پہلے چھلے کو انگلی میں گھما کر ہاتھ میز پر بھی اعلانیہ انداز میں رکھ دیتے لیکن مجھ پر اس اعلان نے خاطر خواہ اثر نہ کیا۔

میں ایسا فقیر تھی جو مانگنے تو نکلے لیکن اپنی عزت نفس بچانے کے لیے کاسہ چھپائے رکھے۔ قرض مانگنے کی اشد ضرورت ہو لیکن ساتھ ہی یہ آرزو بھی پال رکھے کہ یہ قرض کبھی واپس نہ مانگا جائے۔ بیٹی کا رشتہ خود ہاتھ جوڑ کر کرانے پر مجبور ہو لیکن مشہور یہ کر دے کہ لڑکے والوں نے پھیرے ڈال ڈال کر وہ لیز توڑ دی ہے..... میں وہ لڑکی تھی جو عاشق کو اغوا پر مجبور کر دیتی ہے اور چاہتی ہے کہ گھر والے معاشرہ قانون سب عاشق کو مورد الزام ٹھہرائیں..... ہنس ہنس کر یاری لگانے والی اور درو کر سارا کچا چٹھا بیان کرنے والی کا تضاد بڑا کر بناک ہوتا ہے.....

ہم دونوں کے بنیادی تضادات نے ہماری شخصیت پر خوف کی مہر لگا دی تھی۔

اس خوف کا رنگ ہم دونوں میں یکساں نہ تھا۔ اشفاق خاں کا خوف شام کی دھندلی روشنی سے مشابہ تھا جس میں نظر تو سب کچھ آتا ہے لیکن واضح کچھ نہیں ہوتا۔ میرے خوف کا رنگ ہسنتی تھا۔ سارے میں سرسوں کھلی تھی۔ مجھے سارا جج سرسوں کے کھیت کی طرح نظر آتا تھا۔ اسے ماننے کی ضرورت بھی نہ تھی لیکن اس سے مقابلہ کرنے سے میں بدکتی تھی۔

میں ہر روز کسی مجزے کا انتظار کرتی اور پھر خوف کی چادر اوڑھ کر سو جاتی۔ خاں صاحب شام ڈھلے پر بچکے مارتی لائین کے لیے تیل خریدنے جاتے، لیکن دکان پر پہنچ کر وہ دونی دیتے ہوئے خوفزدہ ہو جاتے اور اپنے آپ کو غالب کی طرح سمجھاتے کہ اب میری آرزو ہے کہ زندہ نہ رہوں۔ خواہش اور گریز آری کی صورت اُن کے انداز چلتے۔ نہ وہ خواہش کے میدان میں نبرد آزمانی کرنے کے اہل تھے نہ مکمل طور پر بھاگ جانے کے اہل ہی..... پہلے انہوں نے چھوٹے چھوٹے سفر اختیار کیے اور پھر اسی گریز کی خواہش نے انہیں روم پہنچا دیا۔

اپنی اس کیفیت کو سمجھنے کے لیے وہ نوٹس لکھا کرتے تھے جواب ملے ہیں۔ اُن کی شادی کا چھلا تو آپ کو دکھایا نہیں جاسکتا کہ اب وہ عکسی مفتی کی ملکیت ہے اور وہ اسے اپنے بائیس ہاتھ کی تیسری انگلی میں شادی کا سبیل نہیں بلکہ اشفاق احمد سے وابستگی کے طور پر پہنتا ہے لیکن خوف کے متعلق اُن کی کاپی سے یہ خیالات برآمد ہوتے ہیں۔

فیصلے دو تھے اور دونوں پر عمل پیرا ہونا خطرناک بھی تھا اور ناممکن بھی لیکن جب انسان اپنی بساط بھر دو فیصلے کر کے ان دونوں پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہے تو عموماً اُسے دوہری ناکامی ملتی ہے۔ خاں صاحب نے بھی محبت کو شطرنج کی بازی سمجھ کر بار بار مہرے بدلے۔

جب اشفاق صاحب کی انگوٹھی نے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ کیے۔ کتابوں کا رابطہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ دونی بار بار مانگنے کا کھیل بھی پھپکا پڑ گیا تو انہوں نے ایک اور سوانگ بھرا۔ وہ ایک دن کلاس میں آئے اور مولوی طوطا سے کہنے لگے..... ”کیا آپ نے اپنی اصلی عمر فارم میں بھری ہے؟“

”ہاں تو اور کیا.....“

”بڑی غلطی کی۔ آخر دو چار سال تو نوکری کی تلاش میں لگ جائیں گے۔ کیا پتہ ایم اے دو سالوں میں نہ ہو سکے تو پھر تو آپ سروس کے لیے Over age ہو جائیں گے۔“

سارے طالب علم چونکے ہو کر سننے لگے۔

”میری عمر چھتیس سال ہے لیکن میں نے ساری باتوں کا پڑتا لگا کر سچ نہیں لکھا..... یہ حکمت ہے۔ جھوٹ نہیں ہے.....“

یہاں اُن کا مقصد ایک بار پھر لڑکیوں کو بڑھاپے کا خوف دلا کر بھگانا تھا۔ اب کبھی کبھی وہ کلاس میں کندھے پر مکیاں مارتے۔ اسپرو کی گولیاں پھاکتے..... چلتے میں لنگڑانے کی ایکٹنگ کرتے۔ مجھ سے آواز بیدہ نے ایک روز کہا..... ”ہائے اشفاق! تو بڑھاپے، لیکن لگتا نہیں ہے..... ہے نا.....“

میں چپ رہی۔ اُس زمانے میں واقعی چھتیس برس کا نوجوان بوڑھا لگتا تھا۔ مجھے سارے پروفیسراں ٹپی عمر کے ناکارہ بوڑھے لگتے تھے، لیکن خاں صاحب کے متعلق مجھے شبہ بھی نہ ہوا کہ وہ دوہرے فیصلے میں گھر کر یہ کھیل کھیلتے جا رہے ہیں۔ اُن کی عملی اور علمی مدد نے میری نالائقی کو اور مستحکم کر دیا تھا۔

اب بڑھاپا اُن کا تھا Defense mechanism بن گیا۔ اب بات بے بات بڑھاپے کا ذکر بڑھاپے کا ڈھونگ بڑھاپے کا رونا دھونا حلانہ اور اشارتا ہونے لگا۔

اسی بڑھاپے کا ذکر انہوں نے اُن خطوں میں بھی کیا ہے جو انہوں نے اپنی بھانجی نابید کو لکھے۔ اُسی کافر کو دیکھ کر جینا جس پر دم نکلے اُن کا وطرہ حیات بن گیا۔ وہ محبت کو انسان کی معراج بھی سمجھتے تھے اور اس محبت سے کنارہ کشی بھی چاہتے تھے۔

بڑھاپے نے ابھی اصل صورت بھی نہ دکھائی تھی لیکن پودا جو ”زاویہ“ تک پہنچتے پہنچتے پورا چھتنا درخت بن گیا تھا اس کا بیج بہت پہلے بویا گیا۔ ان دنوں وہ اپنی نوٹ بک میں بڑھاپے کے متعلق جو کچھ ارشاد کرتے رہے حاضر خدمت ہے:

بڑھاپا

آج ایسا دن پھر پتہ نہیں کب آئے گا۔ اس وقت مجھے اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ جی چاہتا ہے اونچے اونچے گاتا ہوا باہر سڑک پر نکل جاؤں اور ہر نوجوان کو روک کر اس کے بالوں کو فور سے دیکھ کر ٹھنڈے مار کر ہنسون اور چلا چلا کر کہوں جاؤ اپنی

بہن سے کہانیاں سنو۔ اپنی اماں کو دھمکیاں دو۔ اپنے باپ سے پیسے مانگو!

صبح صبح شیو بناتے ہوئے آئینے میں ایک لمحے کے لیے میں نے صابن کے پھین سے نظریں ہٹا کر اپنے چہرے کو دیکھا۔ اپنی چنیاں سی آنکھوں کا جائزہ لیا اور اچانک میری نگاہ بائیں کینٹی پر جا پڑی۔ میں نے دیکھا وہاں ایک سفید بال بھڑے اور سیاہ بالوں کے درمیان تسمیں تاری طرح چمٹا ہوا تھا۔ دوسرے بالوں کو ایک طرف ہٹا کر میں نے اچھی طرح سے اس کا جائزہ لیا کہ کہیں مجھے دھوکا نہ ہوا ہو۔ لیکن واقعی وہ ایک سفید بال تھا۔ سفید بال۔ Gray hair۔ میری امیدوں کا تارہ میرے ارمانوں کا روپہلی پتلا۔ میرا جی چاہا کہ میں اُسے ایک مرتبہ تو چوم ہی لوں۔ بائیں ہاتھ کی سیدھی انگلی سے اُسے چھو کر میں نے اپنا پونا چوم لیا.... صابن کے جھاگ کو اپنے چہرے پر اسی حالت میں چھوڑ کر میں جلدی جلدی نیچے اتار کر بیڑھیوں پر مجھے تو قیر ل گیا۔ میں نے اُسے اپنی کینٹی دکھا کر کہا ”دیکھنا یہاں ایک سفید بال بھی ہے؟“

تھوڑی سی تلاش کے بعد تو قیر نے اُسے ڈھونڈ نکالا اور کہا ”ہاں ہے! کیا میں اسے اُکھاڑ دوں؟“
میں نے فوراً اپنے سر کو جھکا دے کر ہٹا لیا اور کہا ”نہ! نہ! کہیں ایسا ظلم نہ کرنا۔ میری جان فکل جائے گی۔ میری صحت خراب ہو جائے گی۔“

اپنے کمرے میں واپس آ کر میں نے جھاگ کو چہرے سے پونچھ ڈالا اور شیو نہیں بنائی۔ پھر میں کرسی کھینچ کر شیشے کے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے کہا ”میری پیری کے پیامبر! تو دبے پاؤں میرے گھر آیا ہے ڈرتے ڈرتے جھپکتے جھپکتے لیکن میں ایک مفلس اور نادار ادھیڑ عمر کا آدمی ہوں۔ بتاؤ میں تمہاری کیا خاطر کروں؟ لیکن اس قدر مسرور ہونے کے ساتھ ساتھ تم میں تم سے ناراض بھی ہوں۔ بتاؤ تو تم اتنی دیر سے کیوں آئے۔ تمہاری راہ تکتے تکتے میں نے حشر سے کئی دن گزار دیئے۔ تمہارا انتظار کرتے کرتے میں نے کئی راتیں سیاہ کر ڈالیں اور تم اتنی دیر کے بعد آئے اور اگر تمہیں دیر ہی سے بتاؤ تھا تو اکیلے کیوں آئے؟“

کیا تمہارے گروہ کو یقین نہ تھا کہ میرا سر تسلیم تمہارے لیے ہمیشہ خم رہتا ہے۔ کیا تمہارے قبیلے کو اعتبار نہیں آتا تھا کہ میرا سر تیار اُن کے آستانے پر ازل سے جھکا ہوا ہے؟
بتاؤ تا تم اکیلے کیوں آئے؟

میں اپنے سفید بستر پر سواری رنگ کی پالش کی رضائی لپیٹے بیٹھا تھا کہ میرا سب سے چھوٹا پوتا محمود میرے پاس آ کر کہنے لگا ”بابا جان! کئی دو میں قتلوں گا۔“ میں نے نیلے کے نیچے ہاتھ پھیر کر اُسے دوئی نکال کر دی۔ وہ دوئی لے کر تیزی سے دوڑا۔ میں نے پکار کر کہا ”جان بابا آہستہ“ اُس نے میری طرف مڑ کر نہیں دیکھا پر اس نے اپنی رفتار ہلکی کر دی۔ اُسے اس طرح دوڑتے ہوئے دیکھ کر مجھے اس کے ابا کا بچپن یاد آ گیا۔ وہ بھی اسی طرح دوڑا کرتا تھا۔ اسی طرح ضد کیا کرتا تھا اور ایسے ہی روتا تھا۔

اور میرا سب سے بڑا پوتا کالج میں داخل ہو کر کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گیا ہے۔ بلیزر پہنے ٹینس کا ریکٹ بغل میں دبائے میرے پاس سے گزرا کرتا ہے اور مجھے بڑے ادب سے سلام کیا کرتا ہے۔ میں اس کے سلام کا جواب ہمیشہ ”جیسے رہو“ کہہ کر دیا کرتا ہوں۔ مجھے بس یہی ایک دعا آتی ہے اور یہی اچھی لگتی ہے۔ کبھی کبھار وہ میرے پاس رُک کر

پوچھا کرتا ہے ”بابا جان! آپ کے زمانے میں بھی کالج میں ٹیلیویشن تھیڑ تھا؟“ تو میں مومن کا دیوان بند کر کے اور اپنے عینک اتار کر آہستہ سے کہا کرتا ہوں ”جب ہم تمہارے کالج میں پڑھتے تھے بیٹا تو سنا کرتے تھے کہ ٹیلیویشن ایجاد ہو چکا ہے اور امریکہ میں اس کے مظاہرے ہو رہے ہیں۔ اس وقت تھیڑ کہاں سے بنتا۔ یہ ہمارے بہت بعد کی بات ہے۔ اس وقت تو اس تھیڑ کی جگہ لائبریری ہوتی تھی اور اس کا لائبریرین اچھی عمر کا ایک سندھی تھا جو کب کا مرکھپ چکا ہوگا۔“

میرا چھوٹا پوتا آ کر کہتا ہے ”بابا میرا لٹو دیکھو! تمہیں گھمانا آتا ہے بابا؟“

میں چپکار کر کہتا ہوں ”اچھا ہے جان بابا۔ بڑا اچھا۔ اب مجھے گھمانا نہیں آتا۔ اب تم گھماؤ۔“

اور میرا پوتا اپنا منٹا ہاتھ کھول کر میری طرف اشارہ کر کے کہتا ہے ”لواتے بڑے ہو گئے اور لٹو گھمانا نہیں آتا۔“ میں ہنس دیتا ہوں اور میرا پوتا بھی ہنسنے لگتا ہے۔

میری پوتی آ کر کہتی ہے ”بابا سا راون لینے کیا کرتے رہتے ہو۔ مجھے ”دیوان غالب“ ہی پڑھا دیا کرو۔“ اور میں کہتا ہوں ”دیوان غالب“ کسی سے پڑھا نہیں کرتے بیٹا! خود ہی سمجھا کرتے ہیں اور پھر تمہارے

”دیوان غالب“ کو میں کیا پڑھاؤں گا۔ ہمارے زمانے میں تو ”دیوان غالب“

نقش فریادی ہے کس کی روشنی تحریر کا

کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

سے شروع ہوا کرتا تھا اور تمہارے ”دیوان غالب“ کی سب سے پہلی غزل

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ میں ہوتا تو کیا ہوتا

کے شعر سے شروع ہوتی ہے۔“

اور میری پوتی روٹھ جاتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ پچھلے دیوان کی ترتیب غلط تھی اور مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔

بہت دنوں کی بات ہے جب وہ اپنا دیوان میرے بستر پر چھوڑ گئی تھی اور میں نے اسے اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیا تو اُس کے ہر صفحے پر ایس (S) لکھا ہوا تھا اور ایک جگہ (Shahid) لکھ کر کاٹا ہوا تھا۔ میں نے اُسے ہلا کر کہا ”اپنی کتابیں اس طرح خراب نہیں کیا کرتے بیٹا اور کتاب پر صرف اپنا ہی نام لکھا کرتے ہیں!“

یہ سن کر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ اپنی کتاب لے کر واپس چلی گئی۔

میرے ان جگر گوشوں کا ابی شام کو دفتر سے آ کر ہر روز پوچھا کرتا ہے ”اباجی! گلوڈین پی تھی؟“ اور میں مسکرا کر کہتا ہوں ”پی تھی بیٹا۔ پی لی تھی!“ اور وہ میری مسکراہٹ سے بھانپ جاتا ہے کہ میں نے دوا نہیں پی۔ چڑ کر کہتا ہے ”باجی! پتہ نہیں آپ کو کیا ہوا ہے۔ میری بکواس پر تو آپ توجہ ہی نہیں دیتے۔“ میں پھر ہنس پڑتا ہوں اور کہتا ہوں ”تیری بکواس سننے کے لیے ہی تو زندہ ہوں۔ بھلا مجھے اب اور یہاں کیا کرنا ہے؟“

اس دوران میں میرا بڑا پوتا پھر آ کر پوچھنے لگتا ہے ”بابا جان! آپ کے زمانے میں کالج کی مسجد اتنی ہی بڑی

تھی؟“ تو میں پچھلے دن یاد کر کے کہتا ہوں ”مسجد کہاں تھی بیٹا! ایک چبوترہ ساتھ۔ اُس کے پاس یو۔ او۔ ٹی۔ سی کے لڑکے چاند ماری کیا کرتے تھے۔ اس کے پہلو میں انگریز پرنسپل کے نام پر ڈنکلف ملک بار تھی اور اس کے ساتھ پھل فروش کی ایک مختصر سی دکان۔ میں اس چبوترے پر نماز پڑھنے تو کبھی نہیں گیا تھا لیکن اپنے ہم درسوں سے سنا کرتا تھا کہ وہاں جمعہ کی نماز بھی ہوتی ہے۔“

پھر وہ پوچھنے لگتا ہے کہ انا مک ریسیرچ لیبارٹری میں.....

تو میرا بیٹا بات کاٹ کر کہتا ہے ”کیا فضول چیزیں پوچھتے رہتے ہو۔ تمہیں کالج کی تاریخ لکھنا ہے کیا؟“
میرا پوتا خاموش ہو جاتا ہے اور میں اپنے بیٹے کو جھڑک کر کہتا ہوں ”پوچھنے دو تمہیں کیوں تکلیف ہوتی ہے۔ مجھ سے پوچھتا ہے نا!“

اپنے زمانے کی ساری مشعلیں ایک ایک کر کے بچھ گئیں۔

اثر مر گیا۔ قمر صاحب کا جنازہ نکل گیا۔ ممتاز کی ہڈیاں بھی گل چکیں..... کو تہدق نے آلیا اور وہ دو بچے چھوڑ کر مر گئی..... اپنی عمر کو پہنچ کر ختم ہو گئی..... کا پتہ نہیں۔ لمری نہ ہوگی تو مرنے والی ہوگی۔ ایک ایک کر کے سارے ساتھی چھوٹ گئے۔ بس زوہبی اور میں رہ گئے۔ دیکھوں ہم میں سے پہلے کون چلتا ہے!

☆ گزرتے ہوئے سال ہم سب کو بوڑھا بنا دیتے ہیں لیکن دانشمند کسی کسی کو بناتے ہیں۔

☆ بڑھا پا بھی دراصل پتھر اور دھات کے زمانے کی طرح دھات کا زمانہ ہوتا ہے۔ دانٹوں میں سونے کے تار لگے ہوتے ہیں۔ بالوں میں چاندی ہوتی ہے۔ آنکھوں میں قلعی کا رنگ ہوتا ہے۔ (اور شلوار میں سکہ لٹک رہا ہوتا ہے۔)

☆ انسان کی تین عمریں ہوتی ہیں۔ جوانی، درمیانی عمر اور ”ماشاء اللہ ٹھیک ٹھاک نظر آ رہے ہوئے“

☆ بوڑھے آدمی اس لیے اچھے اچھے ہو جاتے ہیں کہ اُن سے بُرے بُرے ہوا نہیں جاتا۔

☆ وہی بچے ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہوتے ہیں جنہوں نے ہمیں بوڑھا بنایا ہوتا ہے۔

☆ جوانی میں ہم مشکلات میں پھنسے رہتے ہیں بڑھاپے میں مشکلات ہمارے اندر پھنسی رہتی ہیں۔

☆ جب آپ تجربات سے بھر جاتے ہیں تو اس قدر بوڑھے ہو چکے ہوتے ہیں کہ کوئی بھی آپ کے تجربے کو ملازمت نہیں دیتا۔

☆ بھرپور بڑھا پا اس وقت آتا ہے جب آپ کی کالی ڈائری میں صرف ڈاکٹروں کے فون نمبر ہوتے ہیں۔

☆ بڑھاپے میں ہر روز دو دن کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

☆ بوڑھا ہونے میں یوں مزا نہیں کہ اُس کا مستقبل روشن نہیں ہوتا۔

☆ بڑھاپے کا اندازہ اس وقت لگتا ہے جب چلے بغیر آپ کے پاؤں ڈکھنے لگیں اور بستر سے اترے بغیر آپ کی ٹانگیں تھک چکی ہوں۔

☆ بڑھاپے کا ایک مزا یہ بھی ہے کہ جس قدر شور کالیول اونچا ہوتا جاتا ہے، سماعت کالیول نچا ہوتا جاتا ہے۔

- ☆ جب آدمی جھولا کرسی میں بیٹھا ہو اور اُس کو ہلانا نہ سکتا ہو اس وقت وہ بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔
- ☆ مجھے اس وقت یقین آ گیا کہ میں واقعی بوڑھا ہو چکا ہوں جب ہوائی جہاز میں ایئر ہوسٹس نے پوچھا آپ چائے پیئیں گے یا کافی یا ماہ اللہم؟
- ☆ بوڑھے ماضی میں رہنا اس لیے پسند کرتے ہیں کہ ماضی بڑھاپے کے مقابلے میں کھلا وسیع و عریض اور لمبا چوڑا ہوتا ہے۔
- ☆ جب آدمی بس میں اپنی سیٹ چھوڑ کر کسی خاتون کو دینی چاہے اور اس سے کھڑے نہ ہو جائے تو سمجھئے بوڑھا ہو چکا ہے۔
- ☆ سو سال زندہ رہنے کا ایک راز ہے..... سانس لیتے جاؤ!
- ☆ اکیلے بوڑھے ہونا بڑی دردناک بات ہے۔ میری بیوی ابھی تک وہیں کھڑی ہے جہاں کئی سال پہلے کھڑی تھی۔
- ☆ سڑک میں اپنے ہاتھ دھونے اور سیدھے چلنے پر جس قدر کوشش کرنی پڑتی ہے اس سے ایک بوڑھے کی اچھی خاصی ورزش ہو جاتی ہے۔
- ☆ بوڑھا ہونے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی جلدی نہ کرے۔ بس آہستہ آہستہ بڑھاپے میں داخل ہو۔
- ☆ آدمی اس وقت پورا بوڑھا ہو جاتا ہے جب اپنے سارے دانت ایک گلاس میں ڈالنے کے قابل ہو جاتا ہے۔
- ☆ کئی بڑھے جوانی میں رہنا اس لیے پسند کرتے ہیں کہ وہاں سب کچھ سستا پڑتا ہے۔
- ☆ لمبے سفر پر جب ابھی نقدی ہو اور طاقت ختم ہو جائے تو سمجھو کہ بوڑھے ہو گئے۔
- ☆ بڑھاپے کا کچھ طے نہیں ہے۔ آدمی ایک صبح اٹھتا ہے۔ منہ پر ہاتھ پھیرتا ہے اور وہ بوڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔
- ☆ آدمی بوڑھا کب ہوتا ہے:
- ☆ جب ہوٹل میں جا کر ادھر ادھر جلوہ لینے کے بجائے مینو دیکھنے لگ جائے اور قیمتوں کا موازنہ کرے۔
- ☆ جب اس کو 8 کا ہندسہ نظر آنے لگے۔
- ☆ سیر کے لیے جائے اور جا کر بیٹھ جائے اور سارا وقت بیٹھ کر یہ سمجھے اُس نے سیر کر لی۔
- ☆ جب اس کو سارے سوالوں کے جواب آتے ہوں اور کوئی بھی اس سے سوال پوچھنے والا نہ ہو!
- ☆ جب ہڈیاں سخت ہو جائیں۔ ناڑیاں سخت ہو جائیں..... نہیں جناب دل سخت ہو جائے!
- ☆ جب آدمی اٹھنا چاہے اور اٹھ نہ سکے۔ ہنس کے دکھا دے۔
- ☆ آدمی اُس وقت جوان ہوتا ہے جب صبح گیارہ بجے میں سے نکال کر شارٹ کرے تو سوئی صفر پر پہنچی ہوئی ہو اور بوڑھا اُن دنوں ہو جاتا ہے جب گیارہ بجے میں پہنچے ہمیشہ پٹرول کی ٹینکی فل پائے۔
- ☆ جب آرام کرنے میں زیادہ وقت لگے اور تھکنے میں کم تو سمجھو کہ بڑھا پا آ گیا۔
- ☆ بوڑھا ہونے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ہر وقت چھوٹوں کی نصیحتیں سننا پڑتی ہیں۔

بڑھاپے سے گریز کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ آدمی چند نئے احمقانہ رویے سیکھ لے۔
جب آدمی یہ سیکھ جاتا ہے کہ اُسے سوچ کر قدم اٹھانا چاہیے اُس وقت قدم اٹھانا مشکل ہو جاتا ہے۔
بڑھاپے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کوئی تمہاری کہانی نہیں سنتا اور کوئی تمہاری نصیحت پر عمل نہیں کرتا۔
بہت سے آدمی بس زندگی میں بوڑھے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

جیسے جیسے آدمی بوڑھا ہوتا جاتا ہے ویسے ہی اس کی دواؤں کی الماری بڑی ہوتی جاتی ہے۔
بڑھاپے میں ہرانگ میں درد ہونے لگتا ہے اور جس میں نہیں ہوتا وہ کام کا نہیں رہتا۔
بڑھاپے میں جب آپ اس بلندی پر پہنچ جاتے ہیں کہ کوئی کچھ ہی کہے آپ کو تکلیف نہیں ہوتی اس وقت کوئی
بھی اپنا وقت ضائع نہیں کرتا، کوئی کچھ بھی نہیں کرتا۔

زندگی میں بس ایک بڑھاپا ہی ایسی کمال کی چیز ہے جو بغیر کسی محنت اور کوشش کے خود بخود آ جاتا ہے۔
دادا بننے سے آدمی بوڑھا نہیں ہوتا۔ دادا ہی کا خاندان بننے سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔
آدمی اس وقت پورا بوڑھا ہو جاتا ہے جب ایئر ہوٹلس کی طرف دیکھنے کے بجائے کھانے کی ٹرے پر غور کرنا
شروع کر دیتا ہے۔

ہر شخص لمبی عمر کا خواہاں ہے لیکن بوڑھا ہونا کوئی نہیں چاہتا۔
بڑھاپے سے دور رہنے کے لیے نئے خیالات اپناتے رہنا چاہیے اور پرانی عادتیں چھوڑتے جانا چاہیے۔
آدمی زندگی گزارنے سے بوڑھا نہیں ہوتا۔ زندگی میں دلچسپی نہ لینے سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔
بوڑھا ہونے سے بھی ایک بڑی بات یہ ہے کہ بڑھا بوڑھے ہونے سے انکار کر دے۔

بوڑھے ہونے کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ آدمی دیر سے بوڑھا ہوتا ہے۔
اگر پرانے فرنیچر کی طرح پرانے بڑھوں کی بھی ایسی قدر افزائی ہوتی تو پھر بڑھاپے کا مزہ تھا۔
ایک شادی شدہ جوڑے کو بڑھاپے کے لیے صرف اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنا چاہیے۔
جو لوگ بڑھاپے میں مزے کی زندگی گزارتے ہیں انہوں نے جوانی میں ضرور چھوٹی چھوٹی خوشیاں خیرات کی
ہوں گی۔

آدمی سالوں کے گزرنے سے بوڑھا نہیں ہوتا۔ اپنے اصول چھوڑ دینے سے بوڑھا ہو جاتا ہے۔
چالیس برس کی عمر جوانی کا بڑھاپا ہے اور پچاس برس کی عمر بڑھاپے کا بچپنا ہے۔

میں بوڑھا آدمی ہوں اور میں نے بڑے خوفناک دن اور دردناک راتیں گزاری ہیں اور کئی کئی سال بڑے
بھیا تک اندیشوں میں گھرا رہا ہوں..... لیکن یہ سارے واقعات مجھ پر گزرے نہیں۔ بس مجھے دور سے ہی
ڈراتے رہے اور میری زندگی اجیرن کرتے رہے۔

بوڑھے ہونا ایک بُری عادت ہے جو انسان بڑی عمر میں پہنچ کر سیکھ جاتا ہے۔ اگر وہ مصروف رہے اور مسجد آتا
جاتا رہے تو پھر یہ بُری عادت پڑ ہی نہیں سکتی۔

- ☆ اگر کوئی شے ”بوڑھی“ یا ”پرانی“ یا ”عمر رسیدہ“ ہے تو اس بات کی علامت ہے کہ یہ چیز رہنے کے قابل تھی۔ اس لیے رہتی چلی آ رہی ہے اور رہتی چلی جائے گی۔
- ☆ جو شخص بیس برس کی عمر میں خوبصورت نہیں اور تیس برس کی عمر میں مضبوط اور طاقتور نہیں اور چالیس برس پر پہنچ کر امیر نہیں اور پچاس برس پر دانشمند نہیں تو پھر سمجھ لیجئے کہ وہ کبھی بھی خوبصورت امیر، سمجھدار اور طاقتور نہیں رہا۔
- ☆ بڑھاپے میں جب ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے تو بڑھا کبھی بھی فون نہیں اٹھاتا کہ میرے لیے تھوڑی ہوگا!
- ☆ دل کی عمر کاراز سفید بالوں سے لگایا جاسکتا ہے۔
- ☆ عورت اپنی عمر کے بارے میں اُس وقت جھوٹ بولنا شروع کرتی ہے جب اس کا چہرہ سچ بولنا شروع کر دے۔
- ☆ جب آدمی میزھیاں چڑھتے وقت اور میزھیاں اُترتے وقت ایک سارے جوان ہوتا ہے اور جب میزھیاں اُترتے وقت بھی اس کی سانس پھول جائے تو وہ بڑھا ہو چکا ہوتا ہے۔

بزرگ افراد کا یوم

اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے شروع تک تو بزرگوں کی عزت اور بزرگوں سے محبت مغرب میں بھی ایسے ہی تھی جیسے ہمارے یہاں مشرقی ممالک میں ہے۔ لیکن صنعتی انقلاب کے بعد یورپ اپنی دھن میں مصروف ہو گیا۔ بہت زیادہ مصروف۔

وہاں رشتوں میں رخنے پڑنے لگے اور خاندان اور گھریلو زندگی اور کنبے کی زندگی میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ صنعتی ریل پیل اور دولت کی افراط نے جہاں سارے انسانی رشتوں پر خون مارے وہاں بوڑھے بزرگوں بوڑھے عزیزوں اور بوڑھے لوگوں پر مصروف معاشرے کی توجہ سب سے کم ہو گئی۔

مالی اور معاشی طور پر تو بوڑھے لوگ.... کسی قسم کے ”خطرے“ کا شکار نہ ہوئے لیکن جذباتی اور ”تعلقاتی“ طور پر انسانی گروہ سے پھیل گئے اور تقریباً آدھی صدی تک بے توجہی کا شکار رہے۔

اس کے بعد مغرب کے مفکروں اور دانشوروں اور سیاستدانوں نے اپنے بزرگوں کی طرف دوبارہ توجہ دی اور انہیں ”سینئر سٹیزن“ کا نام دے کر دوبارہ معاشرے میں.... اُن کا کھویا ہوا مقام دلانے کی جدوجہد شروع کر دی۔

وہ دن اور آج کا دن اب وہاں سینئر سٹیزن ڈے اور Senior Function اور.... سینئر سٹیزن Occasion بڑے شوق سے منایا جاتا ہے.... مشرق کے لوگ اور تیسری دنیا کے باسی بھی چونکہ ولایت کے مہذب دنیا کی پیروی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اس لیے وہ بھی اس قسم کے تہوار منانے ضروری سمجھتے ہیں جو ترقی یافتہ دنیا میں منائے جاتے ہیں۔

باوجود اس کے کہ بوڑھے اور بزرگ اور عمر رسیدہ لوگ ہمارے معاشرے کا ایک اٹوٹ جزو ہیں اور ان کے بغیر ہمارا معاشرہ مکمل نہیں ہوتا۔ ہم بہ امر مجبوری اس قسم کے ڈے منانے پر مجبور ہیں....

اب یہ تو ہوئی ناں میری جذباتی بات اور وابستگی کی بات.... لیکن اگر ہم اپنی کچی روایت کے باوصف اپنے

تو میں کی حالت پر نگاہ ڈالیں تو بڑے معاشرے کی مختلف لکڑیوں میں..... کہیں کہیں..... ان کی زندگی ویسی پُر وقار نہیں تھی کہ ہمارے باپ دادوں کے زمانے میں تھی۔ وہ بالکل بھلائے تو نہیں گئے البتہ..... بے توجہی کا شکار ضرور ہیں۔ مجھ سے ابھی کوئی پوچھ رہا تھا کہ بزرگ کب ہوتا ہے۔ یعنی کوئی سینئر سٹیزن کب ہوتا ہے۔ تو میں کہہ رہا تھا کہ مدت میں جب وہ ریٹائر ہو کر گھر آ جائے۔

اور دوسرا کام کاج، تجارت، صنعت، دکانداری کرتے ہوئے وان پرست دور میں داخل ہو جائے۔ ایک تو بچپنا ہوتا ہے۔ ایک گھر بہت دور ہوتا ہے اور اس کے بعد وان پرست دور ہوتا ہے۔ جب گھر کا بڑا دکان کی چابیاں بیٹے کے ہاتھوں میں آتی ہیں اور باقاعدگی سے محلے کی مسجد میں جانے لگتا ہے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد یا وان پرست دور کے بعد یا سینئر سٹیزن بن جانے کے بعد محلے کی مسجد میں جا کر نماز شروع کر دینا ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ یہاں سینئر سٹیزن کو ایک روحانی اور معاشرتی کلب میں مقنا مفت داخل جاتا ہے۔

”خوبی“

جب انسان میں کوئی چیز گوانے کے قابل نہ ہو میرے آقا تو پھر اُسے سال ہی گوانے پڑتے ہیں۔ جو شخص یہ سمجھنے لگ جاتا ہے کہ اس نے کمال حاصل کر لیا ہے اور نکتہ عروج پر پہنچ گیا ہے تو سمجھنے کہ وہ فوت ہونے کے قریب ہے۔

بڑے درخت پھل زیادہ نہیں دیتے، سایہ زیادہ دیتے ہیں۔ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ تم نے کتنی جلدی کام کیا۔ یہ یاد رکھتے ہیں کہ کیسا کام کیا۔ دنیا میں سب سے بڑی لذت اُس کام کے کرنے میں ہے جس کو لوگ مشکل سمجھیں اور یہ کہیں کہ یہ کام نہیں ہو سکتا۔

"Old"

بالوں کے گرنے سے آدمی بوڑھا نہیں ہوتا میرے آقا! جب وہ اپنے اصول چھوڑتا ہے اور Ideal چھوڑتا ہے پھر بوڑھا ہو جاتا ہے۔ سال چہرے پر چھریاں ڈال دیتے ہیں اور ہمت اور امید کو چھوڑ دینے سے روح پر چھریاں پڑ جاتی ہیں۔ پریشانی، خوف، حزن و ملال، نا اُمیدی، مایوسی یہ انسانی سر کو جھکا دیتی ہیں اور روح خاک میں ملنے لگتی ہے۔

ایک پُر سکون بڑھا پا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان نے جوانی اچھی گزاری اور شرافت سے گزاری۔ میرا تانا محکمہ زراعت میں بیلدار تھا اور اپنی ماہوار تنخواہ میں سے بھی ہر مہینے کافی کچھ بچا لیتا تھا۔ (اس کے بچے اُس کو Old کہتے ہیں)۔

بڑھاپے کا ایک یہ فائدہ بھی ہے جی کہ انسان ایک بار جھکنے میں دو چیزیں اٹھا لیتا ہے (ایک پڑی ہوئی ہو تو سوچتا

ہے جب دو اکٹھی ہو جائیں گی اس وقت اٹھاؤں گا۔

5- جو عورتیں اپنی زندگی میں صرف خوبصورت رہی ہوتی ہیں ان کے لیے تو بڑھاپا موت ہے جی (شمسی) (بیگم صاحبہ)۔

6- جب دوست ایہ کہن لگ جان کہ شاہ جی اچھا ہے تو بہت جوان نظر آ رہے اور سمجھو بڑھاپا آ گیا اے اور چھا گیا اے۔

7- میں بوڑھا آدمی ہوں اور میں نے بڑے خوفناک دن اور سہناک راتیں گزاری ہیں اور کئی کئی سال انڈیشوں نے مینوں مارکٹ کے فنا کر دتا لیکن یہ سارے واقعات میرے پر وار نہیں ہوئے بس ڈرانڈے ای رہے۔

"Old Age"

☆ بڑھے ہونا ایک نہایت اسی بُری عادت اے جو کسی انسان بڑی عمر ماں پہنچ کے سکھ جاتا اے۔ اگر اوہ مصروف رہے اور مسجد آندا جاندا رہے تاں ایسے بُری عادت پے ای نہیں سکدی۔

☆ ڈاکٹر نے کہا "اماں! میں تیریاں سب بیماریاں سن لیاں ایں۔ میں آپ نوں جوان نہیں بنا سکدا۔" اماں بولی "میں کد کہندی ایں جوان بنا دے۔ میں تاں کہندی ایں بڑھا کی بنا دے۔ ایہ راہ ماں کیا پھسار رکھیا اے۔" دل کی عمر کا اندازہ سفید بالوں سے نہیں لگایا جاسکتا جی۔

☆ واہ جی واہ ایہہ عینک آپ پر بہت اسی سوہنی لگدی اے۔ دس سال جوان لگدے او اپنی عمرتے۔ پھر میں یہ نہیں لوں گی۔ کیونکہ جب بھی اُتاروں گی عمر میں دس سال کا اضافہ نظر آیا کرے گا۔

☆ لڑکیوں نے پوچھا "اماں! آپ اس عمر میں پہنچ کر بھی اتنی خوبصورت نظر آتی ہیں تو آپ کو نسامیک اپ استعمال کرتی ہیں۔" کہنے لگی "میں ہونٹوں پر سچائی کی سرخی لگاتی ہوں۔ آواز میں دعا کے الفاظ استعمال کرتی ہوں۔ آنکھوں میں ترس کا اور شفقت کا سرمہ ڈالتی ہوں۔ ہاتھوں پر خیرات کا لوشن استعمال کرتی ہوں۔ جسم کے لیے اپنے فکر کے لیے صداقت اور راستی استعمال میں لاتی ہوں اور دل کے لیے محبت کی ٹانک استعمال کرتی ہوں اور اب میں آپ کے سامنے ہوں۔"

☆ دیکھیں جی! اگر کوئی شے بوڑھی ہے یا پرانی ہے یا عمر رسیدہ ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ چیز رہنے کے قابل تھی اس لیے رہی اور رہتی چلی جا رہی ہے۔ پُرانے خاندان ہیں۔ پُرانی رسمیں ہیں۔ پُرانی روایتیں ہیں یہ سب اس لیے زندہ ہیں کہ زندہ رہنے کے قابل ہیں۔ ان کے تسلسل کے ساتھ قائم رہنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ واقعی یہ گارنٹی والی چیزیں تھیں۔ (ان کے تسلسل کی گارنٹی اس بات کی ضامن ہے کہ کوالٹی اچھی تھی) آپ ایک اعلیٰ پُرانی قدر کوئی چیزوں کے طوفان میں غرق کر دیں تو نئی چیزوں سے جب زمانہ اچھائیاں اخذ کرے گا تو وہ پُرانی اعلیٰ قدر پھر بھر کر ساتھ آ ملے گی۔ پرانی وضع کی مہمان نوازی پُرانی شرافت، اخلاقی تقاضے، تجارت

میں ایمانداری یہ سب ایسی چیزیں ہیں کہ مر نہیں سکتیں۔ لوٹ لوٹ کر پھر واپس آئیں گی۔

☆☆☆

خاں صاحب اپنے خیالوں میں غلطیاں و بیچاں رہتے تھے، لیکن مجھ پر اللہ کی خصوصی رحمت تھی۔ ہر مقام پر ہر جگہ رحمت مجھے خصوصی توجہ بڑے وقار سے مفتا مفت مل جاتی۔ اس کی نہ میں حقدار تھی نہ میرا کوئی میرٹ ہی تھا۔ بس کچھ اوپر لے کر رحمت تھی جو توجہ خاص بن کر مجھ پر ہلکی ہلکی پھوار بن کر برستی رہتی۔

یہاں ہی سے میرے اس اعتقاد کی پبیری لگی کہ صحت، عزت اور رزق خصوصی طور پر اللہ کی دین ہے اور وہ جس کو چاہے پر ترجیح دیتا ہی چلا آتا ہے۔ اس کے باوجود سعی اور جدوجہد کا حکم بھی ہے کہ انسان اپنی محنت سے ان نعمتوں کو اپنے اوپر حلال کرتا رہے۔

جب میں گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے چکی تو مجھ پر پروفیسراں کی توجہ نارنج کی طرح پڑنے لگی۔ مجھے کالج میں پروفیسر سعید سے دوبارہ ملنے کا اتفاق ہوا۔ میں ان سے دھرمسالے میں پہلے بھی پڑھ چکی تھی۔ دسویں کا امتحان دینے کے بعد میری والدہ مجھے اکیلی لاہور بھیجنا نہ چاہتی تھیں۔

دھرمسالہ میں لڑکوں کا کالج تھا جہاں میرا بھائی فٹ ایئر میں داخل تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اُن کے ساتھ کالج میں مخلوط تعلیم کی قباحتوں کے حوالے ہو جاؤں۔ میری والدہ مجھے آگے پڑھانا بھی چاہتی تھیں اور نظروں سے دور بھی بھیجنا نہ چاہتی تھیں۔ انہوں نے لبرل تعلیم یافتہ والدین کا ایک گروپ بنایا اور ان کی اعانت اور حوصلہ افزائی سے لوئر دھرمسالہ میں بازار سے کچھ ہی اوپر ایک کونٹری کرائے پر لی اور ایف اے تک کلاسیں شروع کر دیں۔

اس کالج میں صرف ہمارا Batch زیر تعلیم تھا۔ ہمارے گروپ میں ملا گیان سنگھ، مہندر کالسی اور طیبہ نیکا بڑے سچے گھرانوں کی سادہ سی لڑکیاں تھیں۔

ہمارے کالج سے وہ سڑک گزرتی تھی جو اوپر دھرمسالہ کی طرف رواں دواں تھی۔ اوپر دھرمسالہ انگریزوں کے گورکھا پٹنن کی چھاؤنی تھی اور یہاں ہی ایک بڑا وی آئی پی قسم کا بازار تھا، جس میں ایک پارسی تاجر ناروجی کی دکان تھی۔ یہاں ٹین کے ڈبوں میں پیک پھل، جیم، چیز، مکھن، Sausages اور وہ سارا الم غلم ملتا تھا جو انگریز سوپر مارکٹ پر لکھنا پسند کرتے تھے۔

گورکھا سپاہیوں نے بھی انگریزوں کے ساتھ رہ رہ کر ساری شیخیاں اور Tatste اپنا لیے تھے جن کی وجہ سے وہ ہم لوگوں سے مختلف ہو گئے تھے۔ ترائی کی یہ سڑک کو تو والی بازار کے چوراہے سے بائیں ہاتھ تھی۔ دائیں ہاتھ نکلنے والی سڑک گھنیا را کی طرف جاتی تھی جہاں ایک چھوٹی واٹر فال گھنیا را تھی۔

اس سڑک پر کو تو والی بازار سے کوئی دو سو میٹر دور ”ہمالیہ ٹاکیٹ“ سینما تھا۔ سینما سڑک سے اتر کر بنایا گیا تھا، لیکن اس کے Bill Board لب سڑک لگتے تھے اور بازار میں بھی عین چوراہے پر بڑا بورڈ نصب ہوتا جس پر لکھا ہوتا

”آج شب کو“ ہم نہ جانے کیوں کبھی سمجھ نہ پائے اور اسے ملا کر آج سبکو ہی پڑھتے رہے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ

آجسکو کے کیا معنی ہیں اور کسی سے پوچھنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ اس سینما کے مالک دھرمسالے میں ہمارے ہمسائے تھے اور پشاور کے ہندو Settlers تھے۔ اپنی وضع قطع سے یہ بھائیہ گھرانہ پٹھان لگتا تھا۔ ان کے مردسروں پر پٹھانی عچکے پہنتے اور لڑکیاں باہر ننگے پرسروں پر چادریں اوڑھ کر جایا کرتیں۔

وملا گیان سنگھ کا گھر ہمارے یعنی 1- ٹمپل روڈ جانے والی سڑک کی بائیں طرف تھا۔ اس سے اوپر گھنا جنگل اور لیڈیز کلب تھا۔ گیان سنگھ بزنس میں تھے۔ اُن کی بیسویں دھرمسالہ سے کانگریز اور دھرمسالہ سے پٹھان کوٹ کی طرف شیڈول سے چلتی تھیں۔ وملا کا ایک بھائی سندھ میں حرمتا بلے میں مارا گیا تھا، لیکن یہ عہد نہ میڈیا کا تھا۔ نہ شہنی کا.... وہ اپنی امارت کا اظہار گفتگو میں نہیں کرتے تھے۔ وملا اور میں نے بی اے تک اکٹھے ہی تعلیم پائی۔

دوسری اہم لڑکی مہندر کالسی تھی۔ وہ کالسی سٹیٹ کی مہارانی کی بیٹی تھی اور مہارانی بھی وہ ٹھسے دار خاتون جو مردانہ لباس پہنتی تھی۔ برجس چڑھا کر سر پر سولو ہیٹ لے کر وہ بینڈ ماسٹروں جیسی چھڑی بغل میں دبا کر وائسرائے کے دربار میں جایا کرتی اور وائسرائے بہادر اُس کے لیے کھڑا رہتا۔

مہندر کالسی سکول سے کچھ ہی اوپر ایک خوبصورت سی کوٹھی میں رہتی تھی۔ پیدل کالج آتی اور میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھا کرتی۔ نہ کبھی اُس کے ہونٹوں پر کالسی ریاست کا نام آیا نہ اُس نے اپنی پھوپھی صاحبہ کی کبھی کوئی ذکر کیا۔ وہ عہد Status کو بگھارنے کا نہیں تھا۔ لوگ اپنی خوبیوں کو چھپانے اور عوام کا حصہ بنے رہنے پر مان کرتے تھے۔

تیسری وی آئی پی لڑکی طیبہ عتیق اللہ تھی۔ ان کے والد کی بھی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ اگر کبھی آپ کو دھرمسالہ دیکھنے کا اتفاق ہوا ہو یا آپ نے اس کا نقشہ دیکھا ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ شہر پہاڑی پر آباد تھا۔ ایک سڑک تھی جو لوہڑ دھرمسالہ سے اُپر دھرمسالہ کی طرف کوٹوالی بازار کے چوراہے سے ہو کر جاتی تھی۔

اس شہر سے نشیب کی طرف بہت بڑی وادی تھی جس میں بھیڑی خانہ اور ریاست کا عتیق اللہ تھی۔ طیبہ کا خاندان دھرمسالہ میں ہی قبیلہ موڑ والی سڑک پر تھا۔ طیبہ کالج بھی پیدل ہی آتی تھی حالانکہ اُن کے گھر میں کار تھی۔

میں نے ان لڑکیوں کا تعارف آپ سے اس لیے کرایا کہ ان کے محیر والدین کی بدولت میری والدہ نے ایک پرائیویٹ کالج کھولا۔ جس میں فل ٹائم صرف ایک پروفیسر مس متھانی تھی جو کیرالا سٹیٹ سے آئی تھی۔ ان کے علاوہ باقی تمام پروفیسر گورنمنٹ کالج فار بوائز سے چل کر آتے تھے۔

یہاں پر مجھے پروفیسر سرداری لعل سے ریاضیات پڑھنے کا اتفاق ہوا اور حسن اتفاق ملاحظہ کیجئے کہ بعد میں کنیئر ڈ کالج میں بھی میں اور وملا گیان سنگھ ان سے میتھ پڑھتے رہے۔ مس متھانی بھی ہمیں دوبارہ کنیئر ڈ میں اکنامکس پڑھانی رہیں، لیکن پروفیسر سعید سے کنیئر ڈ میں ساتھ چھوٹ گیا۔

کشمیری النسل خواجہ سعید نے ہمیں ایف اے میں غالب کی چاٹ لگا دی۔ انہوں نے ہمیں پورا دیوان غالب شعر بہ شعر ترکیب در ترکیب، حرف بہ حرف پڑھایا۔ غالب کے ذومعنی، ابہام سے پُر اور باعثِ بحث شعروں پر وہ عموماً کہا کرتے ”یہ بات یوں ہے اور وہ بات یوں ہے۔ سمجھ نہیں آتی۔“ یہ جملہ ہماری تفریح کا باعث تھا۔ تب ہمیں علم نہ تھا کہ اصلی تحقیق کی روح سمجھنے والے کا یہی رویہ اُسے زندگی سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

”سائنس یوں کہتی ہے۔ مذہب یوں کہتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ بات یوں ہے اور یہ بات یوں ہے۔“
 ”ماں باپ یوں کہتے ہیں۔ بیوی یوں کہتی ہے۔ سمجھ نہیں آتی۔“
 ”بہن بھائی یوں کہتے ہیں۔ دوست یوں کہتے ہیں۔ سمجھ نہیں آتی۔“

پروفیسر خواجہ سعید سے دوبارہ گورنمنٹ کالج میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے نہ تو کبھی دھرمسالے کا ذکر کیا۔ نہ کسی قسم کی خاص مراعات ہی دیں۔ باقی تمام طالب علموں کی طرح انہوں نے مجھے قبول کر لیا۔ وہ ہر لیکچر میں عام طور پر چوتھی صدی ہجری کا ذکر نہیں نہ کہیں ضرور لاتے اور اُسے بیسویں صدی تک کھینچ کھانچ کر ایک ہی لڑی میں پرو دیتے۔ اُن کے ساتھ ہم نے چوتھی صدی ہجری کا ذکر اتنی مرتبہ سنا کہ لڑکوں نے اُن کا نام ہی ”چوتھی صدی ہجری“ رکھ دیا۔ جب بھی وہ کلاس میں آتے.... ہولے ہولے ”چوتھی صدی ہجری“ کی کھسر پھسر سنائی دیتی۔

دوسرے پروفیسر جن کا ذکر میں ذرا پہلے کر چکی ہوں اثر صاحب تھے۔ اثر صاحب بھی میرے معاملے میں Protective تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میری اردو کمزور ہے اور اردو ادب کی معلومات ناکافی۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ جتنی کلاس پر میرے عیب و ہنر نہفتہ باشد رہیں۔ اُن دنوں میں لیڈی میکلیگن سے ساندہ کلاس میں شفٹ ہو چکی تھی۔ کرشن نگر سے بس لے کر گورنمنٹ کالج آتی۔ ساندہ میں موی کا ساتھ چھوٹ گیا۔ اب میرے ساتھ باڈی گارڈ کے طور پر لاہر بتا۔

مجھے اثر صاحب کی ایک خصوصی مہربانی آج تک یاد ہے۔

فقہہ ایئر کے امتحان تھے۔ جب میں کمرہ امتحان میں پہنچی تو ممتحن اعلیٰ نے مجھے ہال میں داخل ہونے سے منع کر دیا۔ پتہ نہیں کیوں خال صاحب اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑے ہوئے، لیکن نہ وہ میری طرف بڑھے نہ ممتحن اعلیٰ ہی کی طرف۔ شاید کسمسا کر رہ گئے۔

میں بھاگی بھاگی کنٹرولر امتحانات کے دفتر میں پہنچی.... وہ اقبال پر انگریزی میں کوئی مقالہ لکھ رہے تھے۔ مجھے حیرت سے پردستک دیتے دیکھ کر بولے ”کم ان چائلڈ۔“

میں اندر گئی اور لجاجت سے بولی.... ”سر میرا پرچہ ہے اور وہ مجھے اندر داخل نہیں ہونے دیتے۔“

”بٹ چائلڈ! آدھا گھنٹہ ہو گیا ہے۔ پرچہ آؤٹ ہو چکا ہے۔ انڈر وراٹاب کوئی ہال میں داخل نہیں ہو سکتا....“

”میں کیا کرتی سر.... کرشن نگر سے بس نہیں ملی ٹائم پر۔“

”کم ودی.... آؤ۔“

وہ آگے آگے چلے۔ میں میسنی صورت پیچھے پیچھے ہوئی۔ اس وقت اُن کی عمر بمشکل تمام چالیس یا پالیس برس

تھی لیکن وہ مجھے خزاں رسیدہ بوڑھے نظر آئے۔ پھر چائلڈ چائلڈ کہنے والا میرے لیے فادر فلڈ بن گیا۔ پتہ نہیں انہوں نے ممتحن اعلیٰ سے کیا کہا مجھے پرچہ بھی مل گیا۔ سیٹ بھی اور جوابات رقم کرنے والی خالی کاپی بھی۔

عجیب سا اتفاق ہے کہ اپنی نالافتی کے باوجود میں فقہہ ایئر میں فسٹ آئی اور خال صاحب سکینڈ.... پتہ نہیں یہ خال صاحب کی کرم نوازی تھی کہ پروفیسروں کی مہربانی، لیکن ایک بار پھر مجھے اہلیت نہ ہونے کے باوجود اللہ کی مہربانی سے

عزت مل گئی۔

سعید صاحب اور اثر صاحب کے علاوہ دوسرے پروفیسراں بھی ہمیں زیادہ تر انگریزی میں پڑھاتے تھے اور بڑی اعلیٰ Guidance دیتے تھے۔

پروفیسر آفتاب احمد ہمیں تنقید کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ وہ زیادہ تر ایسی انگریزی کتابوں کا ذکر کرتے جن کا نام بھی ہم نے نہ سنا تھا۔ کبھی کبھی کچھ ایسی کتابیں اُن کے پاس ہوتیں جو وہ خاں صاحب کو اُدھار دے دیتے اور ایک طرح سے عمومی رابطے میں خصوصی توجہ کے مرتکب ہوتے۔ پروفیسر صاحب نے بہت بعد میں غالب پر بہت کام کیا اور انگریزی اور اردو دونوں میں معرکے کی کتابیں لکھیں، لیکن یہ باتیں بعد کی ہیں۔

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ہمیں عربی کا پرچہ پڑھاتے تھے۔ وہ لیڈی میٹلیکن میں بی بی ٹی کی کلاسوں کو لیکچر دینے آیا کرتے تھے اور میری والدہ سے اُن کی واقفیت تھی۔ کالج میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے امی نے ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ سے ہی استدعا کی کہ وہ میرا خیال رکھیں۔ جب بھی وہ ہماری کلاس لیتے ایک ہی جملے سے لیکچر کا اجراء کرتے..... ”قدسیہ توجہ دو.....“

جاتے وقت بھی وہ ہمیشہ پوچھتے..... ”قدسیہ کیا تمہیں سمجھ آئی؟“

کبھی کبھی جب وہ دروازے تک ہی پہنچتے ہوتے تو کوئی نہ کوئی لڑکا ہولے سے کہتا..... ”قدسیہ توجہ دو۔“

وہ بلیک بورڈ پر عربی حروف لکھتے۔ عربی میں جمع بنانے کے طریقے اور تشبیہ کے لیے خصوصی انداز سمجھاتے..... مجھے شاید ایک حرف بھی پلے نہ پڑتا لیکن ففٹھ ایئر میں چھینوں کے دوران جب میں کوئے گئی تھی جہاں مجھے میری ڈاکٹر خال نے پروفیسر محمد صادق سے عربی کی ٹیوشن لگوا دی تھی۔ اتنے بڑے سکاڑکی محنت اور توجہ سے میں عربی کی گرانمر کچھ کچھ سمجھنے لگی تھی۔

لیکن سب سے زیادہ محبت ہمیں صوفی غلام مصطفیٰ تبسم سے ملی۔

کلاس میں آ کر حکم لگاتے ”انھو اشفاق! یہ غزل پڑھو۔“

کبھی کہتے..... ”قمر! اس شعر کی تشریح کرو۔“

”بتاؤ متنازع فیہ کے سچے کیا ہیں؟“

اس کلاس میں خاں صاحب خوب کھل کھیلتے۔ جان جان کر الٹ الٹ کر شعر کو بے وزن کر کے پڑھتے۔ صوفی صاحب جھڑکیاں دیتے۔ وہ جھڑکیاں سہہ کر منہ بناتے۔ دوبارہ شعر پڑھتے اور زیادہ خرابی بسیار پیدا کرتے اور لعن طعن سہتے۔ کسی اور کی باری بھی ہوتی تو خاں صاحب اُٹھ کر شعر پڑھنے لگ جاتے۔ یہاں ہی سے خاں صاحب اور صوفی صاحب کی چھیڑ چھاڑ سے گزر کر دوستی کی بنیاد رکھی گئی۔

صوفی صاحب ہمارے ساتھ پانچویں جماعت کے طالب علموں کا سا سلوک کرتے۔ ہم کسی پروفیسر کی آمد پر کھڑے نہیں ہوتے تھے، لیکن صوفی صاحب کے آتے ہی فوراً سیلوٹ کرنے کے انداز میں اُٹھ جاتے اور باجماعت سلام کرتے۔ ہمیں کھڑا پا کر وہ وعلیم السلام وعلیم السلام کہتے اور بیٹھنے کا اشارہ کرتے۔ پھر دو ایک شعر

پڑھ کر ان اشعار کی تقطیع کرتے

فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

اُن کے منہ سے اشعار کی بندر بانٹ بڑا آسان سا کام لگتا، لیکن گھرا کر جب شعروں کو طبلے کی تھاپ میں سے کی کوشش کی جاتی تو شعر کا ستیاناس ہو جاتا۔ صوفی صاحب جانتے تھے کہ کلاس میں ایک ہی گنیا آدمی ہے باقی سارا بھوکت مال ہے۔ اُن کا من چاہا شاگرد اشفاق احمد ہی تھا..... عموماً جملہ یوں شروع کرتے..... ”اُوئے پٹھانا ٹرن ٹو پیج تیر نمبر (52) اور غزل پڑھ۔“ خاں صاحب بڑی مشکل سے انگلی کو تھوک لگا کر صفحہ باون نکالتے اور شعریوں پڑھتے کہ کوئی سمجھتا حساس کمتری میں مبتلا نہ ہو جائے۔

صوفی صاحب سے محبت اور دوستی کا رشتہ بھی ہمیشہ قائم رہا۔ جب خاں صاحب دیال سنگھ کالج میں پروفیسر لگ گئے تو کبھی کبھی صوفی صاحب سے ادبی محفلوں میں مٹھ بھیسر ہو جاتی۔

صوفی صاحب کہتے..... ”اُوئے اشفاق! ملازم ہو گیا ہیں؟“

”جی صوفی صاحب۔“

”تنخواہ ملتی ہے؟“

”ہاں جی۔“

”پھر؟“

”جی..... پھر کیا؟“

صوفی صاحب ویسا ہی جھڑکا لگاتے جیسا ایم اے میں صادر کرتے تھے..... ”اُوئے تیری کمائی میں سے میرے لیے پھولی کوڑی نہیں۔“

پکا سامنہ بنا کر خاں صاحب کہتے..... ”صوفی صاحب! خرچے ہی پورے نہیں ہوتے۔“

”ہاں تیرے جیسوں کی اپنی ضرورتیں کب پوری ہوتی ہیں۔ اُوئے کم عقلو! تم نے تو ماں باپ کی خدمت نہیں

کی۔ اللہ کا شکر یہ کبھی قرض حسنہ کی شکل میں ادا نہیں کیا۔ تم کو کیا پتہ استاد کے کیا حق ہیں؟“

”جی..... واقعی۔“

”واقعی کے بچے دفع ہو جاؤ۔“

اور جب خاں صاحب واقعی دفع ہونے لگتے تو صوفی صاحب کہتے..... ”اُوئے اشفاق گھرا آ جانا..... کلچے اور

کشمیری چائے ملے گی..... میرے جیسے نان کلچے کوئی سارے شہر لاہور میں لگا کر تو دکھائے.....“

صوفی صاحب نے کبھی اپنی شاعری کی تعریف نہ چاہی تھی، لیکن کشمیری چائے اور نان کلچے کھا کر جو تالی نہ بجا

سکتا اس سے صوفی صاحب ناراض ہو جاتے۔

جب ایران کلچرل کمپلیکس سے صوفی صاحب وابستہ ہو گئے تو ان کا ایک چھوٹا سا دفتر مال روڈ پر تھا۔ یہاں خاں

صاحب کی قاعدگی سے جاتے تھے۔ میں بھی شادی کے بعد دو ایک مرتبہ اُن کے ساتھ گئی۔ صوفی صاحب نے بڑی مزیدار

کشمیری چائے کے ساتھ کلچے کھلائے۔

”صوفی صاحب! پلیز مجھے بھی ایسی چائے بنانا سکھا دیجئے.....“

وہ کچھ دیر متاثر رہے پھر مرے ہوئے لہجے میں ساری ترکیب سمجھائی۔ پھر مجھ سے اس ترکیب کا اعادہ کرنے کو

کہا۔ میں نے اعادہ کر دیا۔

بس کر کہنے لگے..... ”زبانی تو ترکیب ٹھیک ہے لیکن عمل کا مرحلہ سوچ سے مختلف ہوا کرتا ہے۔ کیا تمہارے

ہاتھ میں ذائقہ ہے؟“

میں نے اپنے ہاتھوں پر نگاہ ڈالی۔

”ہاں جی ہے..... ہے صوفی صاحب۔“ خاں صاحب نے ہر زور سفارش کی۔

”لو پھر تو بات بن گئی..... ذائقہ اللہ کی دین ہے اشفاق یار۔ کوئی کوئی ساری عمر پکاتا ہے پر لذت پیدا نہیں

ہوتی۔ کوئی کوئی دو دن میں ماسٹر کک بن جاتا ہے۔“

صوفی صاحب نے مجھے خاص بہتی بھی مرحمت فرمائی۔ طریقہ بھی دل لگا کر سمجھایا، لیکن کھانا پکانا ایک پریم ریتی

ہے۔ کچھ ہاتھوں سے ایسی لہریں نکلتی ہیں جو کھانے پینے میں داخل ہو جاتی ہیں۔ قبوہ بنانے میں جس محبت کی ضرورت تھی

مجھ میں اُس کی کمی تھی۔ نہ میں ویسارنگ پیدا کر سکی نہ خوشبو۔ یہی حال میرا تب ہوا جب اے حمید نے مجھے قبوے کی

خوبصورت پیالیاں، کشمیری قبوہ اور چینی تک دی، لیکن میرا رزلٹ پاس پاس ہی رہا۔

لوگوں کو کھانا کھلا کر خود خوشی حاصل کرنا پریم ریتی کا جزو عظیم ہے۔ میں اس کام کو ساری عمر کرتی رہی ہوں لیکن

مسرت حاصل کرنا کبھی بھی میری نیت نہ تھی۔ میں تو اس نظریے سے لوگوں کے آگے کھانا پروستی رہی کہ وہ میری تعریف

کریں۔ میرے بچے ہوئے کھانے کو سہلائیں۔ خود تعریفی کی یہ خواہش پوری ہوتی رہی..... لوگوں میں میری خدمت کے

چرچے رہے.....

لیکن صوفی صاحب اور اے حمید جیسی چائے کبھی نہ بن سکی۔ شاید اسی وجہ سے میں نے کبھی نان کلچے بنانے کی

ٹرائی نہ لی۔ زندگی کے آخری دنوں تک خاں صاحب اصرار کرتے رہے کہ گیس کا تنور لے لو۔ کلچے نان، خمیری روٹی سب بہ

سہولت سے بن جائیں گے، لیکن میں نے اس سیکم پر کبھی آمادگی کا اظہار نہ کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھ میں پریم ریتی کی کمی

ہے۔ میرے ہاتھ میں ذائقہ نہیں۔

اب کبھی کبھی افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اس معاملے میں نہ صوفی صاحب کی شاگردی کی نہ خاں صاحب کے

کہنے ہی پر گیس کا تنور لگایا۔ میں نے کچھ نیا سیکھنے کا موقع گنوا دیا۔ انسان اسی طرح نئے مواقع کھو کر سوچتا رہتا ہے کہ اس

میں کشش پیدا کیوں نہیں ہوتی۔ وہ لوگوں کی توجہ سہولت سے حاصل کیوں نہیں کر سکتا۔ اصلی پرکشش انسان تو فعال پانچوں

کی طرح شکل بدلتا جاتا ہے۔ کبھی بھنور کبھی لہر..... کبھی گرداب اور کبھی پُر سکون تال۔

ان مہربان پروفیسر حضرات کے علاوہ ڈاکٹر محمد صادق کا ذکر بھی بہت ضروری محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنی توجہ کو

توازن میں رکھنے والے منظم اعتدال پسند اور بڑے ہی ڈسپلن والے تھے۔ کلاس میں کوئی کاغذ، چھلکا، بورڈ پر کوئی عبارت

بھول چکی کھڑکی آڑے ترچھے بیٹھے لڑکے سب اُن کو پریشان کر دیتے۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ کہتے لیکن اُن کی نظریں خشکیوں جیسا گبر سائے لگتیں۔ اُن کے لیے لڑکے اور لڑکیاں سب برابر تھے۔ وہ کسی سے رورعایت نہیں برتتے تھے۔

آپ سے میں ذکر کر چکی ہوں کہ مجھے پہلے موسیٰ پھر لاو کا لُج چھوڑنے آیا کرتا تھا۔ پھر وہ کسی بیخ پر بیٹھ کر وقت گزرتا۔ ابھی مرد حضرات اپنی عزت نفس اور شرافت کی پاسبانی لڑکیوں کی طرح کیا کرتے تھے لیکن اتنی احتیاط کے بغیر۔ بار سے چھیڑ چلی جاتی تھی۔ کبھی کبھی جب میں گھر جانے کے لیے اوول کے ساتھ ساتھ ڈھلوان کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچتی تو موسیٰ میرے ساتھ سائے کی طرح ہوتا۔ کچھ منچلے پیچھے سے قوالی کرتے..... ”سگِ لیلیٰ سگِ لیلیٰ..... کدھر آیا کدھر بھولا.....“

موسیٰ یہ تو نہ سمجھتا تھا کہ ان الفاظ کے کیا معنی ہیں اور ان کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ لیلیٰ کون ہے اور سگِ لیلیٰ کس کو پکارا جا رہا ہے، لیکن اپنی چھٹی حس سے وہ اس قدر جان گیا تھا کہ لڑکوں کی ازلی شرارت رنگ لارہی ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا۔

ابھی مرضی کی شادی، گینگ ریپ، بغیر نکاح کے کسی کے ساتھ رہنا، طلاق لیے بغیر دوسری شادی کر لینا..... ایسے تصورات اور ان سے وابستہ آزادی دُور کا خواب تھی، لیکن لڑکے بالے تو ازل سے شوخ ہوا کرتے ہیں۔ غلیل کا نشانہ بنانا، کسی پر پانی کا چھیننا چانک مارنا، بلاوجہ کھانسناسیٹی، بجا کر توجہ لینا یہ تو بند بند سوسائٹی میں بھی رائج تھے۔

اب آپ آزادی کا فقدان کہہ لیجئے یا مشرقی اقدار کی سر بلندی۔ ابھی کالجوں میں مخلوط تعلیم کے باوجود طالب علموں میں بڑے فاصلے تھے۔ معصوم چھینر چھاز، چھپی ہوئی لگاؤ، تعلق جنس سے پاک تھا۔ محبت اگر ہو جاتی تو وہ ملنے ملنے کے ناجائز راستے تلاش نہ کرتی۔ ابھی محبت اور جنس الگ الگ تھیں۔ ابھی ایسی این جی اوز نہ بنی تھیں جو سکولوں میں جنس کی تعلیم پر اصرار کرتیں۔ کالج میں ایسے سوالنامے بھیجتیں جن میں پوچھا گیا تھا کہ بچپن میں کس کس نے آپ کو Abuse کیا؟ کیا قریبی رشتہ دار بھی اُن کے ساتھ جنسی تعلقات رکھتے تھے..... ابھی ٹاپ شار بھی مائیکل جیکسن کی طرح Child abuse کے مقدموں میں ملوث نہ تھے۔ اگر تھے بھی تو میڈیا نے انہیں گھر گھر کی کہانی نہ بنا دیا تھا۔ انٹرنیٹ پر Chat کا تصور دُور کی بات تھی۔ میلبون ابھی سلف فون کے دور میں شامل نہ تھا۔ ابھی باتوں کے دوران ٹیپ ریکارڈر پر گھنٹوں کا ریکارڈ کرنے اور بعد ازاں اسے بلیک میل کرنے کی سہولت موجود نہ تھی۔ فون کے دوران تصویر بھی کھینچی جاسکتی ہے۔ اس کی ٹیکنالوجی انسان کے ہاتھ نہ آئی تھی۔ سائنس کی برکات ابھی اسلئے کی جدید تخریب کاری سے نا آشنا تھیں۔ ایسی رنگ برنگی ایجادات سے زندگی میں نیرنگی رنگارنگی اور تجرباتی عیاشی کی رفتار ہلکی تھی۔ ابھی آزادی کا تصور کم کم اور حیا میں لپٹی خوشی کا حصول زیادہ اہم تھا۔

اس روز ڈاکٹر صاحب کا لیکچر لمبا ہو گیا تھا۔ پرنسپل صاحب کے دفتر سے کچھ دُور ڈھلوان کی طرف لڑکوں کی ٹولی رخصتوں پر طبلہ بجا کر قوالی کی پریکٹس کر رہے تھے۔ پتہ نہیں ڈاکٹر صاحب کے لیکچر کی طوالت وجہ بنی کہ لڑکوں کی قوالی نے موسیٰ کو گھبرا دیا۔ وہ گھبرایا ہوا ہمارے کمرے تک پہنچا اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر اندر جھانکنے لگا۔ موسیٰ نے آج تک ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا مزاج جانتے ہوئے میں کچھ گھبرا گئی۔

اس وقت خاں صاحب کھانتے ہوئے باہر چلے گئے۔ مجھے پورا یقین ہے کہ انہوں نے باہر جا کر موسیٰ کو سمجھا دیا ہوگا کیونکہ جب میں باہر نکلی تو موسیٰ نے ہلکا سا کھانس کر کہا..... ”وہ بی بی جی! آپ کی کلاس کا لڑکا آیا تھا۔ بولتا تھا کہ میں اندر نہ جاؤں.....“

اس سے زیادہ موسیٰ اور مجھ میں گفتگو نہ ہوئی۔

لیکن پروفیسر محمد صادق کے ساتھ کچھ دیر بعد ایک اور پھٹا ہو گیا۔

میرے بڑے بھائی ریزی بھی کالج میں داخل تھے اور ایف ایس سی کر رہے تھے۔ ہم ان دنوں لیڈی میکلیکین چھوڑ کر سائنہ کلاں میں جا بسے تھے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ریزی شکاری آدمی تھا۔ پتہ نہیں اُس کے دل میں کیا ترنگ سمائی۔ اپنی ڈیزی گن اٹھا کر گورنمنٹ کالج پہنچا۔

گورنمنٹ کالج کے اونچے مینارے پر کبوتر رہا کرتے تھے۔ اتوار کے دن کالج قریباً سناں تھا۔ ریزی نے دو تین کبوتر گن فار کر کے مار گرائے۔ اتنے میں کہیں سے ڈاکٹر محمد صادق آ گئے۔ انہوں نے ریزی سے گن چھین لی۔ دوسرے دن کلاس میں پختہ ہی ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے انگریزی میں پوچھا..... ”پرویز چھٹہ تمہارا بھائی ہے.....؟“

”جی سر.....“

”وہ اتوار کے روز کالج میں کیا کر رہا تھا۔ وہ بھی سائنس سٹوڈنٹ۔“

مجھے علم نہ تھا کہ ریزی اتوار کے روز بھی کالج آیا تھا۔

”اُس نے کالج کے Rules violate کیے ہیں۔ کوئی لڑکا کالج کے کبوتر مار نہیں سکتا اور تمہارے بھائی نے پورے تین کبوتر مار دیئے۔“

میں حیران اُن کا چہرہ دیکھنے لگی۔ خاں صاحب اٹھ کر کھڑے ہو گئے..... جیسے وہ مارنے مرنے پر تلے بیٹھے ہوں۔

”سر.....“ آہستہ سے خاں صاحب نے کہا ”سر! قدسیہ کا بھائی شکاری ہے۔ یہ لوگ پہاڑوں کے رہنے والے ہیں۔ یہ اپنے گورکھا استاد کے ساتھ شکار کیا کرتا تھا۔ سر! ریزی نے ایک بار میری غ بھی مارا تھا۔“

نہ جانے انہیں یہ سب کیسے معلوم تھا۔

پروفیسر محمد صادق کو اور بھی غصہ چڑھ گیا۔

”شکاری ہوگا اپنے گھر۔ رولز آرولز۔“

”پہلی بار تو معافی ملنی چاہیے۔“ اشفاق صاحب نے لجاجت سے کہا۔

”نو..... There is no first time ہر بار Last time ہوتا ہے۔ قدسیہ..... کل سے اپنے بھائی کو کالج

نہ بھیجنا۔ اس کا نام Strike off کر دیا ہے.....“

خاں صاحب چپکے سے اٹھے اور باہر چلے گئے۔ اُن کے لیے بے عزتی کا یہ منظر ناقابل برداشت تھا۔

مجھے نہ جانے کیوں احساس ہوا کہ نیلی لکیروں والی سفید قمیض پہننے والا میرا گاڑین اتھل ہے..... وہ کیسے

رینڈی کو جانتا تھا؟ اُس نے لالو سے کیا کچھ پوچھ رکھا تھا..... وہ کون تھا؟ کیا تھا؟..... کیا چاہتا تھا؟ اور کیا چاہنے سے گریز کرتا تھا؟ یہ بہت سے سوال مجھے سمجھ میں نہ آئے۔ اتنی بات ضرور پتہ چل گئی کہ اُس کی نیت نیک ہے اور وہ مجھے کسی مشکل میں نہ کچھ کر پریشان ہو جاتا ہے.....

گھر واپسی پر زینب کے پاس باورچی خانے میں بیٹھ کر جب میں روٹی کھا رہی تھی تو لالو نے کہا..... ”صوفی صاحب! وہ جو گورے صاحب آپ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا دروازے سے کبھی مت جھانکا کرو..... جب یہ کھانے میں خود تمہیں بتا جاؤں گا۔ تم برآمدے میں نہ آنا۔“

”صوفی صاحب کس کی بات کرتا ہے لالو؟“

”مجھے کیا پتہ کون کون ہے اب تو نئی لفٹھ ایئر بھی آگئی ہے..... کیا پتہ چلتا ہے کون کہاں سے آیا ہے۔ رنگ رنگ کی بولی..... رنگ رنگ کے لوگ۔“

”یہ تو ٹھیک ہے صوفی صاحب۔“

پتہ نہیں کیوں زینب نہ مجھے آج بھی کہتی تھی نہ باجی..... بس اُس نے اپنے سے میرا نام صوفی صاحب رکھ چھوڑا تھا۔ میں نے رینڈی سے کبوتروں والی بات بھی نہ کی۔ میرا خیال تھا کہ اُس کا دل ڈاکٹر محمد صادق کی بات سن کر پریشان ہوگا۔ ویسے بھی ہم دونوں ایک دوسرے سے محبت ضرور کرتے تھے، لیکن کم آ میرا اور کم گورا بٹے میں ہر بات Share کرنے کی عادت نہ تھی۔

اُن دنوں جب میں گورنمنٹ کالج میں اپنا مقام تلاش کرنے میں مگن تھی اور لیڈی میکلیگن کالج سے موسیقی کے ساتھ جی کراچی پہنچی تھی۔ خاں صاحب اپنے کنبے سمیت 1- مزنگ روڈ میں رہتے تھے۔ موج دریا کے سامنے اور ٹیمپل روڈ کے آخر میں یہ رہائش گاہ ایک تین منزلہ عمارت تھی۔ گھر کا ماتھا کمروں پر مشتمل تھا اور اس کے پہلو سے سیڑھیاں اوپر تیسری منزل کو جاتی تھیں جہاں خاں صاحب کا بیرا تھا۔

سینٹ کی چکی دیوار بائیں طرف اُس چھوٹے سے مستطیل آنگن کے سامنے تھی جس میں اماں جی کا کھلا پھینکی خانہ تھا۔ ہولے ہولے اس کھلے باورچی خانے کو چھت اور دیواریں نصیب ہو گئیں۔ اماں جی یہاں فراخ دلی سے محنت روٹیاں، کھلے شور بے پکاتی رہیں۔ جب وہ بیمار پڑ گئیں تو بی بی خیر جان جنہیں سب بی بی (نئے جان) کہتے تھے، جینتی پرات سنبھال کر گھریلو نظام کی سو پرنیجر بن گئیں۔

باورچی خانے کے عین سامنے ایک چھوٹا سا برآمدہ اور اُس کے پیچھے باباجی محمد خاں کا کمرہ اور اُس کے بائیں طرف اماں جی کا عوامی ڈرائنگ روم اور بائیں طرف ایک ڈرائنگ روم قسم کا لمبا کمرہ تھا، جس میں کچھ دیر کے لیے اسحق بھائی اور ذکیہ جی رہے اور باقی وقت یہ لمبا کمرہ اقبال بھائی کی تحویل میں رہا۔

دروازے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا باورچی خانہ تھا، جس میں بارشوں کے علاوہ بہت کم گوندھنا رہتا ہوتا تھا۔ اماں جی کو پکین گارڈن کا بہت شوق تھا۔ اسی لیے انہوں نے کھلے باورچی خانے کے ساتھ جامن کا درخت، دو ایک بھریک کے قد آور پودے، کیاری میں دھنیا، پودینہ، آگ رکھا تھا۔ مہند لوگ بنیادی طور پر کاشتکار ہوتے ہیں۔ ان کی رگ

پنجاب کے کاشتکاروں سے ملتی جلتی ہے۔ تھوڑی سی جگہ دیکھ کر کچھ نہ کچھ بوڈالنے پر اُکساتی رہتی ہے۔

دوسری منزل پر باہروالی میٹریاں بھی جاتی تھیں اور اندر سے بھی اُوپر راستہ جاتا تھا۔ یہاں اقبال احمد خاں اپنی زوجہ حاجی ضیاء کے ساتھ رہتے۔ ان کے بچے فاروق، نیلو و وِرداء بھی چھوٹے تھے۔

تیسری منزل پر صرف ایک کمرہ اور چھوٹا سا آنگن تھا۔ یہاں خاں صاحب، بیرا کرتے تھے۔ کمرے میں کوئی فرنیچر نہ تھا۔ وہ فرش پر سوتے۔ کمرے میں جا بجا کتابوں کے ڈھیر اور سگریٹوں کے ٹوٹے۔ پیالیوں میں کافی اور چائے کے پس ماندہ پڑا رہتا۔ یہاں نہ کوئی صفائی والا چڑھتا نہ کوئی ملازم ہی آ کر خبر لیتا۔

اپنے چھوٹے سے سٹو پر خود ہی چائے کافی بناتے۔ کھانے کی طلب ہوتی تو نیچے اماں جی کے پاس جا کر کھانا کھا لیتے۔ اماں جی اپنے اس درویش صفت بیٹے کے لیے پریشان رہتی تھیں، لیکن یہ بند بند لوگ تھے۔ اظہار محبت ان کے ضابطہ حیات میں موجود نہ تھا۔

تیسری منزل پر کمرے سے نکل کر ایک چھوٹا سا آنگن تھا، جس میں ایک مٹی کے مٹکے کو خاں صاحب نے حمام صورت بنا لیا تھا۔ پیتل کی ٹوٹی مٹکے میں فٹ کی تھی اور اسی کے پانی سے منہ ہاتھ دھو کر باسی برتنوں کو اشان کر کے خود کھیل رہنے کا فن خاں صاحب نے سیکھ لیا تھا۔

لیکن میرے لیے یہ سب سنی سنائی باتیں تھیں۔ میں کبھی خاں صاحب کے کمرے تک نہ پہنچ پائی۔ میرے لیے 1- مزنگ روڈ جادوگری تھا۔ یہاں ایک ایسا خاندان آباد تھا، جس کے رسم و رواج، اقدار، کلچر مقامی لوگوں سے مختلف تھے۔ وہ کسی کھڑکی، دروازہ کھلے دروازے سے جھانکنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔

مہمند لوگ کھیتی باڑی کرتے آئے تھے۔ یہاں آ کر بھی ان ہجرت کرنے والوں نے مٹی کی دیواریں بنانا، ٹال پر لکڑیاں بیچنا یا پھر کسی زمین کے ٹکڑے پر آباد کاری کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ عزت نفس، ہجرت کرنے والوں کا بنیادی مسئلہ ہو کرتا تھا۔

جب بھی کوئی وطن چھوڑ کر کسی نئی بستی میں آباد ہو جاتا ہے تو ہر وقت اُسے یہی خوف گھیرے رکھتا ہے کہ کہیں مقامی لوگ اُسے کمتر نہ سمجھ بیٹھیں۔ اپنے میں جذب کرنے کی کوشش نہ کرنے لگ جائیں۔ ہجرت کرنے والوں کو اپنے رسم و رواج کی پاسبانی کرنا پڑتی ہے۔ اپنے آگے ڈھال لے کر چلنے کے عمل میں اُن کی سوشل لائف سکڑتی جاتی ہے اور ان کے ارد گرد حصاری دیواریں اونچی ہوتی جاتی ہیں۔

اسی لیے اظہار کے معاملے میں ہجرتی پٹھان گونگا ہو جاتا ہے۔ منیر نیازی ہمیشہ دیر کر دیتا ہے۔ اشفاق احمد چپ رہتے رہتے صوفی راستوں پر پڑ جاتا ہے۔ احمد فراز شاعری میں پناہ ڈھونڈ لیتا ہے۔ خاں صاحب کو شادی کے فیصلے پر پہنچنے میں پورے سات سال لگے۔ اگر ممتاز مفتی، محمد حسین اُن کے پاس 1- مزنگ روڈ نہ آتے جاتے.... ڈیڈی جی اُن کا جیک نہ بننے تو شاید خاں صاحب یہ قدم کبھی اٹھا ہی نہ سکتے! وہ کبھی کالج میں مجھے روک کر نہ پوچھ سکتے کہ ”قدسیہ! تم مجھ سے سرگراں کیوں ہو؟“

ادھر مجھ سی سبک سر سے بھی کوئی فیصلہ نہ پڑتا تھا۔ میری والدہ نے مجھے مخلوط تعلیم کے حوالے کر تو دیا تھا لیکن وہ

مجھے عادیہ واضح کرتی رہتی تھیں..... ”کاکی! تم ایک بیوہ کی بیٹی ہو۔ تمہارے سر پر کوئی باپ نہیں جو تمہاری عزت کا تحفظ کرے۔ پھر تمہارے بھائی کا مسئلہ ہے۔ وہ انجینئرنگ نہیں کر سکا۔ بی اے بھی ابھی فقط خواب ہے۔ تمہارا ایک غلط قدم اسے ساری زندگی کے لیے پٹری سے اتار دے گا۔“

غلط قدم اٹھانا تو ذور کی کوڑی لانا تھا۔ میں تو سیدھے سبھاؤ کسی سے بات کرنے کی بھی اہل نہ تھی۔ ہم دونوں اپنے اندر امدھے کونئیں میں اپنی اپنی موٹر سائیکل چلاتے رہتے۔ موت کے کونئیں سے باہر نکلنا ہمارے بس کی بات نہ تھی۔ دونوں میں اعتراف کرنے، قبول کرنے یا پھر کچھ کر گزرنے کی ہمت نہ تھی۔

مجھے یہ وثوق سے علم نہ تھا کہ اشفاق صاحب مجھے پسند کرتے ہیں۔ وہ بھی غالباً میرے متعلق وثوق کی حد تک نہ سمجھتے تھے۔ دن میں کالج آنا جانا پڑھنا پروفیسروں کی توجہ میں لگن رہنا جاری رہتا۔ شام کو میٹھلیکن کالج کی پروفیسروں کے ساتھ بیزمنٹن کھیلتی۔ کالج کے سامنے یونیورسٹی کے سوئمنگ پول پر چلی جاتی۔ میری والدہ بڑی ڈپسین کی عادی تھیں۔ وہ میرے اس میل جول سے خوش تو نہ تھیں، لیکن چپ رہتیں کہ زیادہ روک ٹوک سے کہیں بیٹی کی زبان نہ کھل جائے۔

اُن کی پتہ نہیں خدا نے کیسے سنی کہ محترمہ فاطمہ جناح کالج کی وزٹ پر آئیں۔ امی کے کام کو سراہا اور پھر انہیں سحر دیا کہ دیانندار لوگوں کو کسی ایک ادارے میں جکڑ بند نہیں کرنا چاہیے۔ پاکستان میں ہیومن Resources کی کمی ہے۔ تیا ملک ہے ہر جگہ بہتر افسروں کی کمی ہے اس لیے اگر آپ کی تبدیلی کی جائے تو آپ انکار نہ کیجئے.....

امی کی تبدیلی شیخوپورہ میں انسپکٹر آف سکولز کے عہدے پر ہو گئی۔ میں اور میرا بھائی دونوں اُن کے ساتھ شیخوپورہ گئے تھیں ہم دونوں کی پڑھائی کا مسئلہ تھا۔ میرا بھائی ابھی ایف اے کلیئر نہ کر سکا تھا۔ میں ایم اے کے فائل میں تھی۔

ریزی بہت ذہین اور فطین تھا لیکن استقامت سے عاری..... وہ مکمل آرٹسٹ تھا۔ نہ تو ذور اندیش تھا نہ مالی حثیت ہی کی اُسے سمجھ آتی تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو دیکھ کر حیرت میں چلا جاتا۔ اُسے خوش کرنے یا خوش ہونے کے لیے ماؤنٹ ایورسٹ کی ٹرونی درکار نہ تھی۔ بس زندگی ہی اُس کے لیے بڑی Excitement کا باعث تھی۔

اسی ریزی نے بڑی محبت کے ساتھ 1980ء میں میرے ناول ”راجہ گدھ“ کا سرورق بنایا۔ جس طرح ڈاکٹر طارق بن افتخار نے خاں صاحب کی اور میری وہ تصویر کھینچی جو ہماری قریباً ہر کتاب کے پیچھے پرنٹ کی ہوئی ہے۔ ریزی نے ایڈووکیٹس بورڈ کی ان گنت کتابوں کے سرورق بنائے۔ سکھی گھر رسالے کا آرٹ ڈائریکٹر رہا۔ امریکہ گیا۔ وہاں اپنے آرٹ کی نمائشیں کیں اور بغیر کسی دقت اور پریشانی کے آکر سمن آباد کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہنے لگا۔

ریزی میں ایک بے قرار آرٹسٹ کی روح تھی۔ ایک شکاری، سائنس کے معجزات سے مسحور پہاڑوں کو تسخیر کرنے والا ستار پرز مزمے بجانے والا۔ وہ ان گنت سمتوں میں سفر کر کے ہنسی خوشی لوٹ آنے والا آرٹسٹ ہے۔

ابھی ہم لیڈی میٹھلیکن میں ہی تھے کہ ایک روز ریزی یونیورسٹی کلرز لے کر گھر آیا۔
 ”یہ کیسی ٹرونی ہے.....“ امی نے پوچھا۔
 ”میں سائیکل ریس میں سیکنڈ آیا ہوں۔“

اس ٹروفی پر اسی خوش ہونے کے بجائے اٹلاریزی پر برس پڑیں..... ”تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ مجھ سے اجازت کیوں نہ لی؟“

ابھی آپ اتھارٹی سے پوچھے بغیر خدا کو بھی تلاش نہ کر سکتے تھے۔

جب میری والدہ شیخوپورہ چلی گئیں تو ہم کو رہائش کی تکلیف کا اندازہ ہوا۔ ہمارا اب پرنسپل لاج پر کوئی حق نہ تھا۔ امی کی یہ خواہش تو پوری ہوئی کہ پروفیسراں سے گھٹے جو ختم ہونے کی صورت نکل آئی، لیکن ایک اور مشکل یہ آن پڑی کہ اب گورنمنٹ کالج میں پڑھنے والے بچے کہاں سرچھپائیں۔ کرائے کا مکان اتنا مہنگا بھی نہ ہو کہ امی کرایہ نہ بھر سکیں۔ ایک روز میری والدہ نے مجھے اور ریزی کو سامان باندھنے کا حکم دیا۔

”ساندہ کلاں میں گھر مل گیا ہے..... تم دونوں وہاں ٹھیک رہو گے۔ تمہارے پاس زینب اور لالو رہیں گے۔ کرشن نگر سے بس گورنمنٹ کالج تک آتی ہے..... کوئی فکر کی بات نہیں۔ میری تہذیبی شیخوپورہ میں انسپکٹرز آف سکولز ہو گئی ہے۔“

انہوں نے کوئی لمبا چوڑا دم دلا سنبھلیا دیا۔ بس ہمارا سامان ساندہ کلاں پہنچا دیا۔ ساندہ کلاں کا یہ گھر ایک گلی میں تھا اور قریباً آخری گھر تھا۔ گورنمنٹ کالج سے بس لے کر میں پہلے کرشن نگر پہنچی۔ پھر وہاں سے عموماً پیدل ہی ساندہ کلاں پہنچ جاتی۔

ساندہ کلاں میں ہمارے گھر کی دو سیزھیاں چڑھ کر اندر دروازہ صحن میں کھلتا تھا۔ دائیں ہاتھ باورچی خانہ اور دو چھوٹے کمرے زینب اور لالو کی تحویل میں تھے۔ صحن پارکر کے چھوٹا سا برآمدہ اور دو بڑے کمرے تھے..... یہ گھر ہماری ضرورت کے لیے کافی تھا۔

یہاں ہمارے ساتھ زینب اور لالو کہیں سے آ گئے..... زینب ہمارے ساتھ گوردا سپور سے آئی تھی۔ وہاں جب گروہ درگروہ، قافلہ در قافلہ بے آسرا لوگ ستائے ہوئے در ماندہ پتین کی طرف جاتے تو ان بے سرو سامان لوگوں پر حملے ہو جاتے..... ہندو لوگ خود تو نہ اتنا چاری بنتے تھے نہ انہما کا پرچار کبھی چھوڑتے تھے، لیکن ان کا کام سکھوں کو ابھارنا اور پرانی دشمنی کو ہوا دینا تھا۔

یہاں پھر نیت کا معاملہ تھا۔ نہ جانے کیوں محسوس ہوتا تھا کہ کہیں اندر وہ اس نئے ملک کے قیام پر خوش نہ تھے۔ ہمارا گھر گوردا سپور میں ترسور ڈپر تھا جو پتین کی طرف جاتی تھی۔ اس گھر کے بڑے پھانک سے ایک لمبی روش گھرتا جاتی تھی۔ پھر ڈیوڑھی کا دروازہ آتا۔ یہ بیٹھک نما ڈیوڑھی اندر صحن میں کھلتی، جس کے چاروں طرف اور اوپر بھی کمرے تھے۔ جب بھی سڑک پر شور و غوغا ہوتا، میرے بھائی ریزی بھاگ کر باہر والے پھانک تک جاتے اور کبھی کبھی دو تین لوگوں کو پچانے میں کامیاب ہو جاتے۔ میرے بھائی پرویز میں دو خوبیاں تھیں۔ ایک تو وہ سو فیصد آرٹس تھا، دوسرے نڈر تھا۔ اُسے شاید اپنے نفس سے جہاد کرنا نہیں آتا تھا لیکن ظلم ہوتا دیکھ کر وہ کبھی بیٹھانہ نہ سکا۔

اُس شام زینب اور لالو پتین کی طرف جا رہے تھے، جب سکھوں کا حملہ ہوا۔ نگلی کرپان میں نیم دھند لکے میں لٹک رہی تھیں۔ ”جو بولے سونہال“ کا نعرہ فضا میں ارتعاش پیدا کر رہا تھا۔ ایسے میں ریزی نے زینب اور لالو کو اندر گھسیٹ کر

تے گیٹ کو تالا لگا دیا۔

زینب جیسے کچھ اور بے آسرا بھی اندر بیٹھک میں ڈرے بیٹھے تھے۔ یہاں سے زینب اور لالو ہمارے ساتھ آئے اور لاہور آ کر نہ جانے کہاں چلے گئے۔ اُن دنوں لوگ اپنوں کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں بہہ جاتے تھے۔ پھر تلاش بسیار کے بعد جب زینب کو پٹیلے والے لوگ نہ ملے تو وہ ہمارے پاس ساندہ میں آ گئی..... ملنا اور پھر ایسے تو زندگی کے کھیل میں شامل ہے لیکن اس میں بھی جو اسرار ہے وہ بھی کئی طور پر انسان کو سمجھ میں نہیں آ سکتے۔ زینب پٹیلے میں کسی نمبر دار کی بیوی تھی لیکن اب اُسے میرے گھر کی ورکر بننے میں کوئی عار نہ تھا۔

ادھر ساندہ کلاں میں ہم دونوں مکمل طور پر آزاد تھے اور کسی کو جواب دہ نہ تھے۔ اپنے عمل، کردار اور وقت کے بیکٹ طرح سے ضامن ہم دونوں خوش تھے، لیکن خاں صاحب 1- مزنگ روڈ میں ایک بھرے پُرے خاندان میں رہتے تھے انہوں نے اپنی آزادی کی ایک منعکس شکل تیسری منزل کے الگ تھلگ کمرے میں نکال لی تھی۔ خاں صاحب ایک ایسے ماحول کی پیداوار تھے جہاں سزا میں کھلم کھلا اظہار تھا، لیکن جزا کے سلسلے میں منہ بند رکھنے کا سلیقہ جاری تھا۔ شاید اس گھر کے بڑوں کا خیال تھا کہ تعریف و توصیف سے بچے سر چڑھ جاتے ہیں اور پھر وہ آسمان میں تھکی لگانے چل نکلتے ہیں اور اس طرح فرعون صفت بچوں کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اُس زمانے میں بچوں کے آگے ہتھیار ڈالنا، اُن کی رائے طلب کرنا درست پرورش کے منافی تھا۔

ایسے میں خاں صاحب اظہار کو احساس شکست سمجھتے تھے۔ جب انہیں کئی یقین تھا کہ محبت کا ہلکا سا اعتراف بھی ان کی مکمل شکست پر منج ہوگا۔ ابھی تو وہ اپنے خاندان کی روایات میں جکڑ بند تھے۔ پھر قدسیہ بیگم کی ہتھکڑی بھی لگ جائے گی لیکن اندر کا تضاد انہیں کسی طور جینے نہ دیتا تھا۔ ایسے میں وہ عجیب طرح سے خوفزدہ ہو کر رہ گئے۔

1- مزنگ روڈ میں مفتی جی محمد حسین، زوبی صاحب اور کبھی کبھار شہاب صاحب آتے جاتے رہتے۔ لیکن حقیق صاحب رفتہ رفتہ وہ گم سم گونگے بن گئے جو اپنے کونئیں کے پائیوں میں نہ تو کسی کو جھانکنے دیتا ہے نہ ٹھنڈے پانی کا پتہ بھر پینے کی اجازت ہوتی ہے۔

اب یہ داستان گونہ سوز، ہر لمحہ دل لگی اور چھینر چھاڑ کرنے والا مفتی جی کا گونگا بن گیا تھا۔ ایسے میں لبوں پر آنے والی باتوں نے کاغذ قلم کی سرنگ بنائی اور خیالات کی گاڑی اندر ہی اندر چلنے لگی۔ کچھ نوٹ جواب ان کے کاغذات سے ملے ہیں آپ کے درشنوں کے لیے حاضر خدمت ہیں۔ ذرا دیکھئے اُن کی قوت متخیل نے کیسے حال سے مستقبل کا نقشہ کھینچا ہے۔

”خوف“

پتہ نہیں ڈر کیا ہے۔ کیوں لگتا ہے۔ کیسے لگتا ہے اور آج مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے رات کو کوئی آکر میرا گلا گھونٹ دے گا۔ میں سمجھوں گا میں مر گیا لیکن میں مروں گا نہیں۔ آدمی یہ سمجھے کہ میں مر گیا ہوں اور وہ نہ مرے! یہی خوفناک بات ہے۔ آدمی یہ سمجھے کہ میں زندہ ہوں اور وہ جی نہ رہا ہو کس قدر کرناک بات ہے! باجی اوپر کے کمرے میں اس لیے نہیں جاتی کہ اُسے ڈر لگتا۔ میں نے اُسے ڈرا رکھا ہے کہ ڈاکٹر آپا کی روح اوپر کے کمروں میں بھٹکتی رہتی ہے۔

مرے ہوئے ”ڈپٹی“ کی روح اوپر کے کمروں میں یونہی گھوما کرتی ہے اور وہ آدھی رات کو دہلی دہلی چیخیں مارا کرتا ہے لیے باجی کبھی اوپر نہیں جاتی۔ ظفر کہہ رہا تھا کہ دھرمسالے میں چڑیلیں رہتی ہیں۔ کانگڑہ آوارہ روحوں کا مسکن ہے۔

ایک دن اُس نے ایک کہانی سنائی کہ وہ اپنے کسی دوست کے بھائی کی شادی پر دھرمسالے گیا تھا۔ یہ گرمیوں کے دنوں کی بات ہے۔ وہ رات گئے تک ایک کمرے میں بیٹھے تاش کھیلے رہے اور جب آدھی رات گزر گئی اور انہوں نے بے راہی کے لیے ادھر ادھر کسی چارپائی کو دیکھا تو تمام چارپائیاں دوسروں کے تصرف میں آچکی تھیں۔ ظفر کے دوست نے کہا یہاں سے ایک میل دور گھاٹی کی طرف ایک گاؤں ہے۔ وہاں میرا ایک دہقانی دوست رہتا ہے۔ چلو اُس کے پاس چل کر رات بسر کریں۔ سیر بھی ہو جائے گی۔ رات بھی کٹ جائے گی اور تمہیں ایک کردار سے بھی ملائیں گے۔ پڑ پڑ پھاڑی راستوں پر قدم اٹھاتے وہ آہستہ آہستہ چلتے رہے۔ آدھی رات گئے پر ایک فقیر کی جھونپڑی نظر آئی۔ یہ لوگ جب اس کے قریب سے گزرے تو فقیر نے ظفر کے دوست کا نام لے کر کہا ”شاہ جی جا رہے ہیں؟“ اور شاہ جی نے اثبات میں جواب دیا۔ فقیر گڑھی بجاتے ہوئے ظفر کے دوست سے باتیں کرنے لگا۔ دیر تک ان کی اس بے معنی گفتگو نے ظفر کو آہستہ آہستہ چلنے پر مجبور کر دیا اور وہ اپنی راہ لگ گیا۔ اگلا موڑ گزرنے پر ظفر نے دیکھا کہ ایک درخت کے نیچے گھاس میں پاؤں چھپائے ایک نہایت جمیل عورت کھڑی ہے۔ اس میں اور ظفر میں کوئی آدھ فرلانگ کی دوری ہوگی۔ ظفر ٹھنک گیا۔ اس عورت نے مسکرا کر ظفر کو آنکھ ماری اور یہ دم بخود ہو گیا۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اپنی بھووں اور چوتوں سے بڑے لطیف اشارے کر رہی تھی۔ دفعۃً ظفر کو خیال آیا کہ رات اندھیری ہے اور میں اس عورت سے کافی دور کھڑا ہوں۔ پھر بعد اس کے چھوٹے چھوٹے اشارے کیسے نظر آ رہے ہیں۔ اُس نے ایک لمحے کے لیے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اندھیرے کے دامن سے چھٹے ہوئے پہاڑ اپنا وجود بالکل کھو چکے تھے۔ اس نے پھر اس عورت کو دیکھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہی تھی اور اس کی کلائی سے لے کر کہنیوں تک سنہری بالوں کی لوائیں صاف نظر آ رہی تھیں۔ ظفر نے کہا یہ سوائے چڑیل کے اور کوئی نہیں۔ وہ ہمیشہ ایسا ہی خوبصورت روپ دھار کر راگیروں کو قتل کیا کرتی ہے، لیکن چڑیل کا تصور آتے ہی اس نے اُس کی چھاتیوں کو بڑے غور سے دیکھا۔ بچپن میں چڑیلوں سے متعلق دو ہی باتیں سننے میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اُن کے پاؤں اُلٹے ہوتے ہیں اور دوسرے یہ کہ انہوں نے اپنے پستانوں کو اٹھا کر کندھوں پر ڈالا ہوا ہوتا ہے۔ ظفر کو اس کے پاؤں تو نظر نہیں آئے کیونکہ وہ گھاس میں کھڑی تھی لیکن اس کا سینہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سرخ رنگ کے پھولوں والی قمیض پہن رکھی تھی اور اُس کی چھاتیاں انسانوں کی سی تھیں۔

اپنی مسکراہٹوں کو ادھر ادھر بکھیر کر وہ عورت آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھنے لگی۔ ظفر نے بھاگنے کا ارادہ کیا تو وہ تیزی سے قریب آنے لگی اور جب اس نے بھاگنا چاہا تو وہ اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔ سڑک کے کنارے چند بڑے بڑے پتھر پڑے تھے۔ ظفر اُچک کر ایک پتھر پر چڑھ گیا اور پھر وہاں سے کھسک کر اُس کے ساتھ والے پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس عورت نے پتھروں پر چڑھنے کی کوشش میں جب اپنا پاؤں زمین سے اٹھا کر پتھر پر رکھا تو وہ اُلٹا تھا۔

اُس دن کا کہہ رہی تھی کہ ”اشفاق صاحب! رات کو میں کمرے سے پھل لینے گئی تو مجھے یوں لگا جیسے کسی نے اندھیرے کو نے میں ہلکی سی سیٹی بجا کر انگلی چٹائی ہو۔ میں چپ چاپ اسی طرح واپس آ گئی۔ مجھے ڈر تو لگتا ہے جی! پر کوئی

میرے ساتھ چلے تو میں ذرا بھی خوف نہیں کھاتی۔“

اشتیاق خالص فوجی آدمی ہے۔ جسمانی تکلیفوں سے خائف نہیں ہوتا۔ روحانی مصائب اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔ یہ وہ گھیس والی کونٹری سے اب بھی بہت ڈرتا ہے۔ آپا فرخندہ بچارے کو کس قدر تنگ کیا کرتی تھیں۔ بات بات پر گھیس والی کونٹری کی طرف گھسنتیں۔

لیکن میرا ڈر تو کچھ عجیب سا ہے۔ میں اس لیے نہیں ڈرتا کہ اوپر کے کمروں میں ڈاکٹر آپا کی روح پھرتی ہے اور مجھے سچے سچے مارا کرتا ہے۔ مجھے ایسا خیال کم ہی آیا ہے کہ ظفر کی طرح میں بھی کسی خوبصورت عورت سے دو چار ہوں گا اور ان کا دل اٹھا ہوگا اور اگر کسی اندھیرے کمرے میں پھل پڑے ہوں تو چاہے وہاں انجن و سل دینے لگے۔ میں تو سب اور گھسے اٹھا کر ہی آؤں گا۔ اشتیاق کی گھیس؟ فیل ہوگی! مجھے یقین ہے کہ ڈر خارجی حالات سے کبھی بھی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے کہ ماحول کی مہیب صورتیں کسی کو بھی ڈرا نہیں سکتیں۔ ڈر تو اندر پیدا ہوتا ہے۔ ڈر تو ایک داخلی کیفیت ہے لیکن پھر یہ کس میں نے اپنے کمرے کی چٹخنی آج پہلی مرتبہ کیوں چڑھائی ہے۔ میں نے سیڑھیوں کا دروازہ کیوں بند کیا ہے۔ یہ سب اچھی طرح سے جانتا ہوں کہ کوئی بھی باہر سے نہیں آئے گا۔

میرے کمرے میں میرے بکس سے میری الماری سے ایک صورت آگے بڑھے گی اور میرا گلابا دے گی اور میں سمجھوں گا کہ میں مر گیا اور میں مرانہیں ہوں گا۔ اب بھی یہ سطور لکھتے ہوئے میں پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ جوئی میں پیچھے مڑ کر دیکھوں گا میرے پیچھے کھڑے ہونے والا وجود اسی تیزی سے پھر میرے پیچھے ہو جائے گا۔ شام کا کھا کھا کر غسل خانے میں ہاتھ دھو کر گیلری میں جس ٹوٹی ہوئی کرسی کے پاس سے ہر روز گزر کر میں سیڑھیاں چڑھنے لگتا ہوں وہی ٹوٹی ہوئی کرسی اس وقت میرے ذہن پر سوار ہے۔ یوں لگتا ہے کہ میں اسی ٹوٹی ہوئی کرسی کے ہاتھوں قتل ہوں گا۔ یہ مرنا نہیں! مجھے اس ٹوٹی ہوئی کرسی پر کبھی کوئی ہیولے نظر نہیں آیا لیکن مجھے محسوس ہوتا ہے کہ یہ کرسی کسی کے نیچے ہے جس پر اس وقت کوئی اور نہیں بیٹھ سکتا۔ پتہ نہیں یہ کیسا ڈر ہے۔ نہ باہر کی نہ ظفر کا نہ کا کی اور نہ اشتیاق کا..... میرا خیال ہے کہ خوف ایک ایسی خشک شے ہے جس کا تعلق نہ تو انسان کے جسم سے ہے اور نہ روح سے۔ بلکہ اس کا تعلق اس کے مقدر سے

خشک = جذبات + کیفیات + تاثرات = وجدانیات

خلوص + خوف + کرب + ہیبت + ترس

☆☆☆

اس خوبصورت گونگے آدمی کو معلوم نہ تھا کہ ساندہ کلاں سے پیدل کرشن نگر آنے والی اور کرشن نگر سے بس لے کر گھسنت کالج کے مقابل ہوسٹل کے آگے بس سٹاپ پر جوڑکی آتی جاتی ہے، اُس کے دماغ میں بھی ایک خناس بھرا ہوا ہے۔ وہ اس قدر آزادی پسند ہے کہ کسی کو اپنا راز داں بنا کر اعتراف شکست نہیں کر سکتی۔

مجھ میں سرانڈیپ کی سروپ لیکھا جیسا حوصلہ نہ تھا کہ سبک سر بن کر مہاراجہ رام چندر کے چرنوں میں پہنچ کر جس حال دل سناتی اور اپنی ناک کٹوا کر لڑکا کوٹ لوٹ سکتی۔ اعتراف شکست بڑے لوگوں کا کام ہے۔ وہ عموماً انا کا بُت

توڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی ہیرو کے بجائے ویلن بن جاتے ہیں لیکن ایسے بڑے لوگوں کو پرواہ نہیں ہوتی۔

ادھر خاں صاحب اپنی خواہش کے پیچھے سرپٹ بھاگنا چاہتے تھے۔ ساتھ ہی اس خواہش سے گریزاں بھی تھے۔ اس تضاد نے انہیں بیکل کر رکھا تھا۔ وہ خواہش کو چھپانے اور اُس کا پرچم لہرانے سے روکے نہیں جاسکتے تھے۔ ایک طرف وہ پوری طرح Commitment کے آدمی تھے اور ساتھ ہی فرار کی راہیں بھی انہیں کشاں کشاں کھینچتی تھیں۔

یہ اُن کے جبلی جرثوموں میں موجود تضاد تھا۔ اس Genetic Coding کو اُن کے تمام گھر والوں میں باسانی شناخت کیا جاسکتا ہے۔ جو بھی اس جبلی تضاد سے رہائی پاسکا اُس نے دنیا میں بڑانا م اور مقام پیدا کیا۔ اس کی مثال خالد آفتاب (وائس چانسلر جی سی یونیورسٹی) ڈاکٹر طارق بن افتخار (ہڈیوں کے سرجن، شکاگو) ڈاکٹر جواد ساجد (ہارٹ سرجن) اور پھر خود اشفاق احمد ہیں لیکن اس تضاد سے نکلنے کے لیے انہیں قریباً سات سال لگے۔

وہ خاندان سے باہر ایک جاٹ لڑکی سے شادی کرنے کے آرزو مند تھے اور ساتھ ہی خاندانی شناخت اور روایات کی پاسداری قریبی بہن بھائیوں بھتیجیوں کی غیر مشروط محبت انہیں کوئی قدم اٹھانے نہ دیتی تھی۔

وہ نہیں چاہتے تھے کہ بانو قدسیہ انہیں بے وفا ہری چگ سمجھے اور ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کے بھی آرزو مند تھے کہ گھر والوں کے دل کو ٹھیس نہ لگے اور وہ اُس اعتماد کو مجروح نہ کر بیٹھیں جو باباجی اماں جی سردار بیگم اور بہن بھائی اُن پر رکھتے ہیں۔ آری کی یہ کیفیت دن رات اُن پر گزرتی تھی۔ اوپر جاتی تو بھی کانتی نیچے آتی تو بھی ذبح کرتی۔

اُن کے جانے کے بعد سب رشتہ داروں سے میں نے تصویریں اور خط مانگے۔ اخبار میں اشتہار دیا لیکن کسی نے خاطر خواہ مدد نہ کی۔ مجھے یقین ہے کہ کتاب چھپ جانے کے بعد دادیلا بعد از مرگ ہوگا، لیکن یہی آج کی تیز رفتار زندگی کا المیہ ہے۔ نہ ہم ماضی کو محفوظ کرنے کے اہل رہے ہیں نہ مستقبل کے لیے کسی مثبت پلان پر استقامت سے عمل ہی ہونے کی قوت رکھتے ہیں۔ سب کچھ حال کی افراتفری کی نذر ہو گیا ہے۔

اشفاق صاحب 1۔ مزنگ روڈ سے کالج کبھی اپنی سائیکل پر کبھی پیدل راستہ ناپتے رہے لیکن دونوں طرف اعتراف شکست قسم کی کوئی بات نہ ہوئی۔ ایک روز میں اوول والی سڑک پر آ رہی تھی۔ میرے دماغ میں ”سیب کا درخت“ کہانی گھوم رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا جیسے کوئی کہہ رہا ہو ”پہاڑوں سے اترتی ہوئی میگن سن۔“

جب میں لڑکوں کے ہوشل بمقابل بس سٹاپ کے قریب پہنچی تو مجھے لگا جیسے کوئی پیچھے آ رہا ہے۔ مڑ کر دیکھا تو اشفاق صاحب بڑی لجاجت اور بظاہر لعلقی سے چلے آ رہے تھے۔ میں سمجھی شاید کچھ کتابیں مستعار دینا ہوں گی۔ میرے ساتھ ہی لالو بھی ڈک کر سر کھجانے لگا۔

میں نے بات کا آغاز نہ کیا۔

پاس آ کر وہ بولے ”قدسیہ! ادھر کچہری ہے۔ میرے بڑے بھائی آفتاب کا یہی راستہ ہے۔“

میں سمجھ نہ پائی کہ آفتاب کون ہے اور اُن کا ذکر کیوں کیا جا رہا ہے۔ میرے چہرے پر So what? قسم کا تاثر

دیکھ کر وہ بولے۔

”اگر انہوں نے مجھے آپ سے باتیں کرتے دیکھ لیا تو قیامت آ جائے گی۔ 1۔ مزنگ روڈ میں۔“
 ”تو آپ مجھ سے بات نہ کریں پلیز۔“

وہ چپ ہو گئے۔ ہم دونوں نے پھر کوئی بات نہ کی۔ راجہ رام چندر نے نہ بے بردان دیا نہ بے مالا میرے گئے میں ڈالی۔ سروپ نکھا کی ناک ہی کاٹی۔ میں نے پلٹ کر کچھ نہ پوچھا اور بس پڑ گئی۔ میں نے کھڑکی میں سے بیٹ کر نہ دیکھا نہ ہاتھ ہی بلایا، لیکن میں جانتی ہوں بس سٹاپ خالی ہو جانے کے بعد بھی دیر تک اشفاق احمد وہیں کھڑے رہے۔ تب تجربہ اہم تھا۔ تجربہ کرنا ممکن نہ تھا۔ مجھے سمجھ نہ آئی تھی کہ میرے ہم جماعت کے اندر وہ کون سی باڑھ لگی ہے جسے وہ بچا نہ نہیں سکتا۔

بہر کیف تبدیلی تو چلی آ رہی تھی۔ تبدیلی زندگی کا ناگزیر حصہ ہے۔ کچھ لوگ شعوری طور پر کچھ لاشعوری طور پر تبدیلی سے نا آشنا ہوتے ہوئے بھی اپنی معصومیت کے سہارے اس تبدیلی کے آگے سر جھکا کر قبول کر لیتے ہیں۔ ایسے معصوم لوگوں کو نہ کسی فلسفی کی رہنمائی درکار ہوتی ہے نہ کسی صوفی کی دانش ہی۔ بیشتر لوگ تبدیلی سے دوچار ہوتے ہی بھونچکا ہوتے ہیں پھر ان میں زندگی کے ساتھ نپٹنے (Cope) کی سکت باقی نہیں رہتی۔

کچھ تبدیلیاں موسم کے ساتھ آتی ہیں۔ کچھ عمر بڑھنے کے ساتھ چپکے سے در آتی ہیں۔ گود کا بچہ ہمیشہ گود بالک لگے رہ سکتا۔ کھیلنے کودنے کھانے پینے کی عمر نوبالغ کی آرزو بدلتے ہی جنس کی طرف راغب ہو جاتی ہے۔ پھر یہ کیفیت بھی ایک دور با سلخاؤ کی تلاش میں ایک نئی تبدیلی سے آشنا ہو جاتی ہے اور ہر بالغ اپنا گھونسلہ ساتھی اور بچوں کے تصورات میں گھس جاتا ہے۔ جونہی بچوں کی کفالت کی ڈگریاں ہی ڈگر پر چلتے چلتے عادت سی بن جاتی ہے۔ ایک نئی تبدیلی انسان کے اندر سے پر دستک دیتی ہے۔

ہر انسان چالیس کے لگ بھگ پہنچ کر Midlife کے کرائسس (Crisis) اور اس سے جنم لینے والی تبدیلیوں کا تجربہ کرتا ہے۔ اس عمر کو پختگی کی عمر کہہ لیجئے لیکن یہی عمر ہے جب عام آدمی بڑی بڑی غلطیاں کرتا ہے اور عمل میں نا پختگی کا تجربہ دیتا ہے۔ تبدیلی کو خاموشی سے قبول نہ کرنے کی وجہ سے کئی بار انسان کا image موساساتی میں بالکل برباد ہو جاتا ہے۔ پے در پے شادیاں، معاشقے، معیار زندگی کو بلند کرنے کے لیے در بدر کی ٹھوکریں، ماں باپ سے بیچانی تصادم، بے توازن رابطہ غرضیکہ اس عہد کی تبدیلی میں زلزلے کی سی کیفیت ہوتی ہے۔ ہندو دھرم نے ان تبدیلیوں کے تجربے سے چار روکن طے کر دیئے ہیں۔ بال آشرم..... گرہست شرم..... وان پرست آشرم اور بالآخر سنیاں آشرم.....

آخری تبدیلی عموماً بوہا پے کے ساتھ آتی ہے۔ جب نہ اشیاء سے لگاؤ رہتا ہے نہ انسانی رشتے ہی با معنی رہتے ہیں۔ اب اطمینان قلب صرف ذکر الہی سے حاصل ہوتا ہے، لیکن یہ بھی نصیب کی بات ہے۔

صوفی حضرات ان تبدیلیوں سے نپٹنے کے لیے شناسائی اور قبولیت پیدا کرنے کے لیے ”ماننے“ کا درس دیتے ہیں۔ انہیں علم ہے کہ جو لوگ اللہ اور رسول ﷺ کی بتائی ہوئی حدود کو جانتے ہیں ان کے لیے ماننا مشکل نہیں ہوتا اور وہ کھلت کے امر کوٹ میں قلعہ بند رہتے ہیں۔ ان کی عافیت اور راحت کچھ ایسی طاقتوں کے ذمے ہوتی ہے جو کبھی دعا نہیں دیتے۔ لیکن یہاں تھوڑی سی از جن لوگ اپنے لیے خود پیدا کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی تجویز اور فیصلے کو نہیں چھوڑ سکتے۔ انہیں

دنیاوی مشکلات کا حل درکار ہوتا ہے۔ انہیں مادی زندگی میں لائٹری نمائل کی تلاش ہوتی ہے اور ڈیرے پر وہ ان خواہشات کو چھپا کر یوں ظاہر کرتا ہے جیسے وہ اللہ کی تلاش میں ہو۔

صوفی حضرات اللہ کا راستہ صعوبتیں سہنے مجاہدے اور ریاضتیں کرنے کا علم جانتے ہیں لیکن اُن کے پاس ایسے نسخے موجود نہیں ہوتے جو لوگوں میں راتوں رات عزت اور امارت کی خوش کن تبدیلی لے آئے۔ عام خواہش کے آدمی اس لیے ماننے کا حکم دل سے مان نہیں سکتے۔ روز قیامت پر فرشتوں اور جنات کے وجود پر نبیوں کے علم پر پورے یقین اور ایقان کے ساتھ چلنے والے کے لیے ماننا کچھ ایسا مشکل نہیں.....

خاں صاحب بھی اندر کے تضادات کا شافی حل ڈھونڈنے کے لیے بالآخر ڈیڑھ برسوں تک جا پہنچے لیکن ابھی وہ وقت دور تھا۔ ابھی وہ اپنے اندر کے تضادات میں خود گھسن گھیریاں کھا رہے تھے۔ ابھی تک انہوں نے وہ مضمون بھی نہ لکھا تھا جو میں یہاں پیش کر رہی ہوں..... کیونکہ اس مضمون کے بغیر اُن کی گورنمنٹ کالج سے وابستگی مکمل نہیں ہوتی۔

چاند کا سفر

گورنمنٹ کالج کی طرف مراجعت کے کئی راستے ہیں اور سارے راستے اپنے اپنے رخ پر چل کر اس منزل تک پہنچتے ہیں جو ہر راہرواں کے من کا مندر ہے۔ اس منزل تک پہنچنے کے لیے سب سے مشہور شیر شاہی اور جرنیلی سڑک تو برتری تحفظ منفعت اور پاور کی سڑک ہے جس پر ایک جم غفیر رواں ہے۔ لیکن کچھ راستے جذباتی وادیوں سے ہو کر بھی اس منزل کی طرف جاتے ہیں..... ہم دونوں کا گورنمنٹ کالج سے بندھن ایک بہت ہی کمزور اور کچے سے دھاگے سے بندھا ہے۔ ایک گمنام اور بے نام پگڈنڈی ہے جو خود رو جھاڑیوں اور کھنگریلے رستوں سے الجھ الجھ کر بڑی مشکل سے من مندر تک پہنچتی ہے اور پھر وہاں سے تب تک اٹھنے کو جی نہیں چاہتا جب تک کہ کوئی وہاں سے اٹھا نہ دے! نکال نہ دے!!

بانو قدسیہ نے اور میں نے گورنمنٹ کالج کو کبھی بھی ایک درس گاہ نہیں سمجھا۔ نہ کبھی ہم اس کی علمی روایت سے متاثر ہوئے اور نہ کبھی اس کے استادوں کے تجربے علمی سے مرعوب ہوئے۔ اس کی قدامت اس کی عمارت اور اس کی شخصی وجاہت بھی ہمیں مسحور نہیں کر سکی۔ اس سے کبھی کچھ لیا نہیں مانگا نہیں دیا نہیں دلوایا نہیں۔ پھر بھی اس کے ساتھ ایک عجیب سا تعلق قائم ہے جسے ہم آج تک کوئی نام نہیں دے سکے۔ دراصل ہم دونوں گورنمنٹ کالج کو درس گاہ نہیں مانتے..... اس میں ”سین“ کے حرف کو دافر سمجھتے ہیں!

جب ہمارا پہلا بیٹا پیدا ہوا تو ہم من آباد میں رہتے تھے اور اپنے مکان کا کرایہ بڑی مشکل سے ادا کرتے تھے۔ میں ریڈیو میں ملازم تھا اور بانو پشاور کے لیے درسی کتابیں لکھ کر ساٹھ ستر روپے مہینہ گھر بیٹھے کمالیتی تھی۔ بچے کے دودھ کا ڈبہ بیالیس روپے میں آتا تھا اور وہ ایک مہینے میں تین ڈبے ختم کر جاتا تھا۔ اس زمانے میں مٹی کے تیل کا چودہ بتیوں والا چولہا آ گیا تھا اور ہمارا ایندھن کا خرچ کم ہو گیا تھا۔ بانو جب گورنمنٹ کالج کی سٹوڈنٹ تھی تو اس کو روٹی پکانی نہیں آتی تھی۔ میں جب گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا تو گھر کا سودا لانے کے علم سے ناواقف تھا۔ شادی کے بعد ہم دونوں نے یہ دونوں فن سیکھ لیے اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔ جب انیق ڈیڑھ سال کا ہوا تو جون کے مہینے میں سخت بیمار ہو گیا۔ اسے اسہال

صحت کی شکایت ہوئی جو دو تین دنوں کے اندر اندر بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کر گئی۔ محلے کی بڑی بوڑھیوں کے کئی بچے آئے لیکن کسی سے افاتہ نہ ہوا۔ بچے کی حالت تشویش ناک ہو گئی تو ہمیں کسی نے بتایا کہ اسے ڈاکٹر بروچہ کے پاس لے جاؤ۔ بڑی سخت گرمی میں سہ پہر کے چار بجے ہم ”سالم تانگہ“ کرا کر اسے ڈاکٹر صاحب کے کلینک پر میکوڈ روڈ لے گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے بچے کو الٹا پلٹا کر دیکھا۔ اس کی اندر دھنسی ہوئی آنکھوں کے پونے ٹھول کر معائنہ کیا اور پھر ہاتھ سے بخاب ہو کر بولے ”بابا تم لوگ کیسا پیرنٹ ہے جو اب اس کو ہمارے پاس لایا ہے۔ اس کا میں کیا ٹریٹ منٹ کروں گا؟“ یا تو زور زور سے رونے لگی اور جاہل فقیرنیوں کی طرح ہاتھ باندھ کر سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کے منہ سے کوئی بات نہ آتی تھی اور وہ خوف کے مارے روئے جا رہی تھی.... ڈاکٹر صاحب نے کاؤنٹر پر جا کر پانچ چھ دو اؤں کے امتزاج سے سیاہ رنگ کا ایملشن تیار کیا۔ اپنی میز کی دراز سے دس پڑیاں نکال کر دیں اور پھر ایملشن کی ایک خوراک میں ایک چم بھول کر مجھے بچے کو مضبوطی سے پکڑ کر گود میں لٹانے کا حکم دیا۔ بڑی بیدروی کے ساتھ انہوں نے اینق کے جڑے میں اپنے انگلیاں کھود کر اس کا منہ کھولا اور دوائی اس کے منہ میں اندر لے دی۔ بچہ اپنی نحیف آواز میں بڑے کرب کے ساتھ رویا تو جس نے اسے کندھے سے لگا لیا۔ گود میں لے کر تو میں اسے کھڑا تھا لیکن بانو قدسیہ خوف سے کانپتی ہوئی اسے تھپکے جا رہی تھی۔ اسے میں بچے نے منہ بھر کر قے کی۔ گرم اور بدبودار تھوڑی سی میرے کندھے پر گری اور باقی کی ساری فرش پر۔

ڈاکٹر صاحب نے جھلا کر کہا ”بابا تم کیسا پیرنٹ ہے بچے کو سنبھالنا نہیں جانتا سارا فرش خراب کر دیا۔ یہ کلینک ہے تم لوگ کا گھر نہیں۔“ ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کی ڈانٹ سے گھبرا گئے۔ ہمیں ڈاکٹروں کا اور ہسپتالوں کا کوئی تجربہ کبھی تھا۔ پھر ہماری مالی حالت بھی معمولی سی تھی۔ شکل و صورت سے بھی ہم سہم ہی سہم تھے اور بچہ کافی بیمار تھا۔ بانو قدسیہ نے ہاتھ دھو پتہ تو سر پر محفوظ رکھا اور باقی کے آدھے دوپٹے سے ڈاکٹر صاحب کا فرش صاف کرنے لگی۔

اس نے دونوں گھنے زمین پر نیچے ہوئے تھے اور بائیں ہاتھ کو آگے بڑھا کر جھکے ہوئے بدن کا سارا بوجھ اس پر رکھ رکھا تھا۔ وہ روئے بھی جا رہی تھی شرمندگی سے سر بھی جھکائے جا رہی تھی اور سسکیوں سے اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ اس نے نارنجی اور کاسنی پھولوں والی قمیض پہنی ہوئی تھی۔ سبز رنگ کی شلوار تھی اور پاؤں میں ہوائی سلپرتھے جس میں ایک فرش پر نائی مارتے ہوئے اتر گیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کا فرش پرانی اینٹوں کا تھا جن کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا تھا۔ کچھ اینٹیں نیچے کو ہو گئی تھیں کچھ سیم کی سب سے اوپر کو ابھرائی تھیں۔ اس اونچ نیچ کے درمیان دوپٹے سے جگہ صاف کرنا کافی مشکل کام تھا لیکن بانو نے اپنے ہضمہ تجربے کے زور پر ساری جگہ اچھی طرح سے صاف کر دی۔ ڈاکٹر صاحب نے چور آنکھ سے اپنے فرش کو اس کی اصل حالت میں دیکھ کر کہا ”بابا تم کیسا لڑکی لوگ ہے سارا دوپٹہ خراب کر لیا۔ اب اس کو باہر جا کر دھوؤ۔ اچھی طرح سے صاف کرو۔ اس میں جراثیم چلا گیا ہے۔ بچے کے پاس نہیں لانا یہ کیڑا۔“

میں نے کہا ”ڈاکٹر صاحب باہر نکلا ہے؟“

کہنے لگے ”کیوں نہیں ہے۔ یہ ساتھ باجو میں گھوڑوں کے پانی پینے کا حوض ہے نہیں۔ اس میں پانی ہی پانی

ہے۔ جا کر دھوؤ۔“ میں بچے کو کندھے سے لگا کر کھڑا رہا۔ بانو نے آدھا دوپٹہ کھیل میں ڈال کر کھنگال لیا۔

ایسے وقت میں اور اس قدر شدید گرمی میں سڑک کنارے پیدل چلنا تو شاید اس قدر مشکل نہیں تھا لیکن ایک بچے کو کندھے سے لگا کر کلینک سے ذلیل و خوار ہو کر اور زمین سے بوٹ کے پرانے ڈبے کا گتا اٹھا کر اور اس سے مرینے بچے کے چہرے کو چھاؤں کر کے چلنے میں ہم دونوں ایک دوسرے سے کچے پڑے ہوئے تھے اور شرمندگی کی وجہ سے ہمارے سراور پر نہیں اٹھتے تھے۔

سڑک پر کوئی سواری نہیں تھی اور ہمیں بس پکڑنے کے لیے ابھی بہت دور تک چلنا تھا۔ بچے کا بخار گرمی کی وجہ سے بڑھ رہا تھا اور بانو بار بار اس کے ماتھے اور لٹکتی ہوئی بے جان ٹانگوں کو چھو رہی تھی کہ بخار کم ہو رہا ہے یا بڑھ رہا ہے۔ اس دھوپ اور گرمی میں ہم اسی طرح سے چلتے رہے۔ تھکے تھکے، خوفزدہ مایوس، بے مراد اور اکیلے۔ بیمار بچے نے کئی مرتبہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن گرمی کی شدت اور روشنی کی چلکور نے اس کے پوٹے کھلنے نہ دیئے۔ ہم چلتے چلتے سوچتے سوچتے، چپ چاپ تے، جی پی او کے پاس پہنچ گئے۔ یہاں تار گھر کے پاس کئی تانگے کھڑے تھے۔ درخت کی چھاؤں تلے بیمار بچے نے آنکھیں کھول کر ایک سفید گھوڑے کو بڑی دلچسپی سے دیکھا اور اپنا ڈولتا ہوا سر ساکن کر لیا۔ میں نے تانگے میں بیٹھتے ہوئے کہا ”گورنمنٹ کالج“ اور بانو حیرانی سے میرا منہ دیکھنے لگی۔

کالج چھٹیوں کی وجہ سے بند تھا۔ پرندے شاخوں میں چھپے ہوئے تھے۔ اونچی بلڈنگ کے سائے دور دور تک پھیل کر درختوں کے سائے سے مل گئے تھے۔ سارے میں ایک خوشگوار خاموشی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم اپنے کلاس روم کی سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔ اہلیق بانو کی گود میں لیٹنا ہوا ایک اونچے درخت کی شاخوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے جھک کر اس کی آنکھوں کو قریب سے دیکھنا چاہا تو مجھے بانو کے دوپٹے سے کھٹی کھٹی بوسی آئی۔ میں نے بچے کے چھوٹے سے ماتھے پر اپنا ہاتھ ساتھ کا ماندہ چہرہ رکھا تو مجھے ایک بیماری ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ بچے نے مسکرا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا تو ماں کی جنت گمشدہ لوٹ کر اس کی جھولی میں آ گئی۔ بانو نے اس کے پاؤں کو ماتھے کو اور گلے کو چھو کر خوشی سے میری طرف دیکھا اور کہا ”بالکل خواجہ منظور کی طرح مسکرایا ہے۔“ خواجہ صاحب اپنی ساری زندگی میں صرف ایک بار مسکرائے ہوں گے لیکن بانو کے ذہن میں ان کی مسکراہٹ ہمیشہ کے لیے سٹل ہو کر ایک فریم میں جڑی جا چکی تھی۔ پھر ہمارے ذہنوں میں اپنے ایام طالب علمی کا ایکشن ری پلے شروع ہو گیا اور طوطے اپنی چونچوں میں ڈالیاں پکڑ کر ہاتھ چھوڑ کر تہب دکھلانے لگے۔

بیمار بچہ اپنی ماں کی گود سے پھسل کر پہلے ایک سیڑھی پر کھڑا ہوا۔ پھر ہاتھ پکڑ کر دوسری پر اترا اور پھر خود ڈگمگاتے قدموں سے روش پر چلا گیا۔ وہ کوئی ڈیڑھ گز تک ایک طرف اور کوئی دو گز کے قریب دوسری جانب چلا اور پھر تھک کر زمین پر بیٹھ گیا۔

ابھی ہمیں سیڑھیوں پر بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ نیلی پگڑی باندھے اور ہاتھ میں چایوں کا موٹا سا گچھ اٹھائے ایک شخص ہماری طرف آیا اور قریب آ کر پوچھنے لگا ”کون لوگ ہو تم؟“

میں نے کہا ”ہم لوگ ہیں۔“

اس نے کہا ”یہاں آنے کا اور بیٹھنے کا حکم نہیں ہے۔“

میں نے کہا ”کس کا حکم نہیں۔“

”پرنسپل صاحب کا“ اس نے درشت لہجے میں کہا اور ہمیں ہاتھ کے اشارے سے اٹھانے لگا۔ میں کچھ کہنے والا تھا کہ بانو نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر زمین پر بیٹھے ہوئے اپنے بچے کو اٹھایا اور اسے چلنے لگی۔ میں بھی خاموشی سے اس کے ساتھ ہولیا اور ہم تینوں آہستہ آہستہ پھانک کی طرف بڑھنے لگے۔ ہم آگے کو جا رہے تھے اور گورنمنٹ کالج پیچھے کو ہٹا جا رہا تھا۔ ہم نے پیچھے مڑ کر تو نہیں دیکھا لیکن ہمیں پتہ چل رہا تھا کہ ہمارے سامنے قافلہ بڑھ رہا ہے۔ کئی بیہودہ نکتے بد ہیئت اور بے کار لوگ درگا ہوں سے اٹھادیئے جاتے ہیں اور ان کے بعد فرش چھادیئے جاتے ہیں لیکن ان کے دلوں کے فرش پر درگا ہوں کی صورتیں ویسے ہی قائم رہتی ہیں۔

اصل میں گورنمنٹ کالج تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں۔ اس کی طرف رخ نہ بھی ہو تو بھی یا تری اسی کی طرف کا سفر کر رہے ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں جب سپیس شٹل زمین سے چاند کی طرف چھوڑا جاتا ہے تو اس کا رخ چاند کی طرف نہیں ہوتا۔ پھر بھی اس کا سفر چاند ہی کا ہوتا ہے اور اس کی منزل چاند ہی ہوتی ہے۔

خالدہ نے کچھ تاثرات اپنی محبت کے تحت لکھے ہیں۔ یہ اس کی سعادت مندی ہے۔ اللہ اُسے میرا دل رکھنے کی توفیق دے۔ ایسی محبت والی رو میں ہر روز کہاں پیدا ہوتی ہیں؟

”اے ترک غمزہ زن“

کتاب زندگی کے کچھ اوراق ہم سینت سینت کے رکھتے ہیں۔ اُن کا ہماری روح کے ساتھ ایسا گہرا رشتہ ہوتا ہے جیسا کہ فیضی اور تقدس کے پانیوں سے نمونپا تا حاصل حیات کا جزو بن جاتا ہے۔

قدسیہ آپامیری کتاب زندگی کا ایسا ہی ورق ہے مگر اس اعتراف کی وضاحت کے لیے مجھے گزرے وقت میں بہت دیر تک جانا ہوگا۔

یہ سن پچاس باؤن کے آس پاس کی بات ہے۔ لاہور کے لیڈی میکلیگن ٹریننگ کالج کے خاموش پارعبانوں اور سرسبز روشوں پر وہاں کی پُر وقار پرنسپل مسز چٹھہ اپنی چاق و چوبند چال کے ساتھ آتی جاتی نظر آتیں۔ گریس اور سائز، ہتھکڑیاں، کالے سفید بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا، نلک نلک کرتے کورٹ شووز۔ ہم جنرل منتر کی باڑ کے اُس پیرسکول سیکشن کی بے بضاعت، چھٹی ساتویں جماعت کی لاغر لڑکیاں، دم سادھے جھانکا کرتیں۔ سانولے چہرے پر حسرت اور سختی میں رلے ملے نقوش۔ ہمیں سب کچھ کسی اور ہی دنیا کا نظر آتا۔ وہ باڑھ کے پار ہمارے بہت قریب سے گزر رہے تھے مگر ہم وہیں منتظر کھڑے رہتے کیونکہ ان کے بعد کبھی کبھار ان کی چمپنی رنگت، کچھ نیپالی نقوش والی گیلی سی بیٹی اپنے پیچھے بالوں کی لمبی چوٹی جھلاتی، چھوٹے چھوٹے گورے پاؤں کے ساتھ کبوتری کی چال چلتی ادھر سے گزرتی اور جلدی جھٹکا کھٹکھٹا اٹھتی۔ جس روز ہم اُسے دیکھ لیتے باقی ماندہ دن کتنا اچھا گزرتا۔

پھر وہ سکول میں سٹیج ہونے والے ایک ٹیلو ”عشق اور موت“ میں ایک قدسی روپ میں نظر آئی۔ موتی رنگ کی لباس میں۔ عشق کی قوت سے مردوں میں زندگی کی لہر دوڑاتی۔ آج میں سوچتی ہوں کہ قدسیہ آپا کے ساتھ میرا کیسا

علامتی تعارف ہوا جس نظریہ کی عملی تفسیر میں انہیں اپنی زندگی بسر کرنا تھی وہ کس طرح مجھ تک پہنچا۔

تب مجھے معلوم نہ تھا کہ یہی کامی میری بہن کی عزیز ترین دوست ہوگی۔ میں اسے اتنا قریب سے دیکھوں گی بلکہ شب و روز کا ساتھ رہے گا اور ایک نئی دنیا کا دروازہ مجھ پر کھلے گا۔ لکھنے کی دنیا۔

پڑھنے کا ضبط تو مجھے تھا ہی۔ کبھی نو خیز لڑکیوں جیسا اُلٹا سیدھا لکھ بھی لیتی تھی۔ قدسیہ آپا تب لکھتی تھیں مگر ابھی چھپنا شروع نہیں ہوئی تھیں۔ اس وقت بھی تخلیق فن کا پورا کلچر اُن کی ذات میں سانس لیتا تھا۔

تب مجھے اتنی باریکیوں کی سمجھ کہاں تھی۔ بس اتنا احساس ہوتا تھا کہ یہ جو قدسیہ آپا ہیں کسی کھلی بے تحاشہ بڑی طلسماتی دنیا سے آتی ہیں۔ باجی، مٹھلے بھائی اور میری تو خیر بات ہی کیا اپنے کاموں میں بے حد مصروف رہنے والی اماں تک اُن کی گرویدہ ہو گئیں۔

سمن آباد میں خود اُن کا اپنا گھر ہر ایک کے لیے کھلی آغوش کی مانند تھا۔ صلاف ستھرا سادہ سے سامان سے مزین کمرے جہاں ہر کوئی بے تکلف چلا آتا۔ قدسیہ آپا ان کے مصور بھائی پرویز (کیا کمال کے آرٹسٹ تھے) اور امی یوں لگتا یہ سب پیدائشی میزبان ہیں۔ یہ لوگ محبت اور ناز اٹھانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ سرپا شفقت اُٹھتے بیٹھتے میں آپ کی آسائش و آرام کا خیال اور پھر باتیں۔ ایسی باتیں جو سارے غم فکر بھلا دیں۔ دل میں پھلجھڑیاں سی چھوٹے لگیں۔

اُن دونوں (بھائی، بہن) میں نریشن کا مہبوت کر دینے والا کمال تھا۔ انگریزی، اردو پنجابی سب میں یکساں رواں۔ رفتہ رفتہ مجھے قدسیہ آپا کے بچپن کے بہت سے واقعات اور شگفتہ کردار بالکل چشم دید محسوس ہونے لگے۔ گورواس پورڈھرم سالہ شملہ جنہیں کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا اپنے اپنے گلنے لگنے لگے۔ معلوم نہیں آج بھی ہم ان کی وضع کردہ کئی اصطلاحیں اور روزمرے انجانے میں بولتے رہتے ہیں۔

درد مندی کے باوجود ان میں زندگی کی خوشگوار چیزوں سے محبت اور ناخوشگوار کو نظر انداز کر دینے کی تہذیب تھی۔ شاید بیدل کے غنی لوگ تھے۔ ان کے ہاں خصوصی طور پر لڑکیوں کی گرومنٹ کا ایک تصور تھا۔ ایسی تربیت جو لڑکیوں کو سرپا خدمت و ایثار و سروس کے لیے باعث راحت اور ماحول کو خوبصورت بنا دے۔

بزرگ خود..... مجھے لگتا ہے کہ قدسیہ آپا کی صلاحیتوں کا جو شعور اور انداز مجھے ہے کسی اور کو شاید ہی ہو۔ انہوں نے میری بہن اور چند اور دوستوں کے ساتھ مل کر ان دنوں لاہور کے چھوٹے سے انحرال میں 'انارکلی' سٹیج کیا۔ ڈائریکشن اُن کی اپنی تھی، جنہوں نے میری بہن ایسی چھوٹی موٹی، معمولی سی ہستی سے شہزادہ سلیم کا کردار ادا کر دیا۔ مناظر کے سیٹ اور کرداروں کے ملبوسات۔ ان سب کے لیے کتنا تاریخی و تہذیبی شعور اور ڈرامے کے فن پر دسترس حاصل ہونی چاہیے۔ انارکلی کے کردار میں قدسیہ آپا خود تھیں۔ ڈرامہ ہٹ ہو گیا۔ (جو صرف خواتین کے لیے تھا)۔

وہ جو انہوں نے ریڈیو اور ٹی وی اور سٹیج کے لیے لازوال ڈرامے تخلیق کیے تو وہ ٹیلنٹ اور کرافٹ کے قابل رشک تال میل کا نتیجہ تھے۔ انہیں رقص، موسیقی، فوک لو، اردو فارسی پنجابی اور عالمی شعر و ادب کا جو وسیع و عمیق علم حاصل ہے، غیر معمولی کے زمرے میں آتا ہے۔ ایک بہت ہی نادر مرکب جو قدرت کبھی کبھار ہی عطا کرتی ہے۔ صلاحیت اور محنت کا امتزاج ہے۔ عام طور پر یہ دونوں اتنی وافر مقدار میں ایک ساتھ نظر نہیں آتے مگر قدسیہ آپا میں ان تھک محنت لگن پتہ مارنے کی صلاحیتیں یکجا

تجربہ کیا تھا۔ اتنا ایثار اپنے آپ کو منانے کا اتنا حوصلہ..... مشکل..... بہت مشکل..... قدسیہ آپا آپ نے لکھنے والوں بلکہ مجھے میں کے لیے کیا امتحان کھڑا کر دیا۔

ایک روایتی مسلم خاندان کی زندگی بسر کرتے ہوئے بھی خارجی دنیا کے ساتھ Exposure حیران کن تھا۔ اس وقت میں ریڈیو پاکستان کی سالانہ محفل موسیقی نہایت اعلیٰ سطح کی تقریب ہوتی تھی۔ قدسیہ آپا کے ساتھ ہم نے روشن آراء تجزیہ پر وین مہدی حسن سائیں مرنا اقبال بانو فریدہ خانم اور بہت سے مشاہیر کو سنا۔

اوپن ایئر تھیٹر کے بے مثال ڈرامے تھے۔ ہالی ووڈ کی شاہکار فلموں سے انہوں نے ہمیں روشناس کرایا۔ تب کی فلمیں جتنی معنوں میں ایک تخلیقی تجربہ ہوتی تھیں۔ گون و دو اونڈا پسیس باونڈ کم سپتھر، داجانسز، فروم ہیرو ٹو انٹرنی، ایڈشوز، برداز، اس وقت پر ویسی کیوشن اور ایسی درجنوں فلموں نے ہمارے فنی ذوق کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس بھرپور تہذیبی اور ثقافتی دور میں کیا کچھ تھا اور ہم قدسیہ آپا کے ساتھ اس میلے میں گھومتے پھرتے۔ عالم کی میر میر کی صحبت میں اس طرح ہوتی ہے۔

اس وقت تک انہوں نے بہت کچھ لکھ رکھا تھا مگر اشفاق صاحب کی ہدایت کے مطابق چھپوانا شروع نہیں کیا تھا۔ ان دنوں وہ غالباً روم میں تھے۔ پھر وہ آئے اور قدسیہ آپا کو چھین لے گئے۔ بانو قدسیہ بنا کر..... معاف کیجئے گا قدسیہ آپا کو میری یہ بات بار خاطر گزری ہو۔ مجھے معلوم ہے اشفاق صاحب کے ہاتھ پر ہیجت کر کے آپ تمام دنیا سے دست کش ہو گئیں۔ پھر آپ وہ نہیں جو انہوں نے آپ کو بنانا چاہا۔ جو آپ کے نزدیک عورت کا حاصل حیات ہے۔

بانو قدسیہ ہو کر آپ ممتاز مفتی اور قدرت اللہ شہاب جیسے بڑے اور باکرامت لوگوں کے حصار میں چلی گئیں۔ سب بات ہے ”گذریا“ ایسی کہانی لکھنے والا حال و حال کی دنیا میں نکل گیا اور قلمی ریاضت اور ایثار و خدمت کی سفیر کے طور پر انشان ادبی اٹھانے ہم ایسوں کو دیا مگر انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔ انارکلی کی صدا۔ اے ترک غمزہ کہ مقابل نشست“ مجھے اب بھی مضطرب کر دیتی ہے اور میں گزرے وقت کی گلیوں میں اتر جاتی ہوں۔

میری سب دعائیں عقیدت اور محبت آپ کے لیے۔ قدسیہ آپا۔

(خالدہ حسین)

ایک خط جمیلہ ظفر نے مجھے لکھا۔ میرے ساتھ ناپنے والی جمیلہ شادی کے بعد کہیں کھو گئی۔ خالده فوج میں تھا۔ کشمیر ختم پر شہید ہو گیا۔ پھر مجھے یہ خط ملا۔

Sunny Bano

Murree.

11-9-48

پیاری قدسیہ بہن

السلام علیکم!

آپ کا خط ملا۔ جواب کیا دوں۔ حیران ہوں دیکھ جو اللہ میاں کی بے نیازی۔ خواہ مخواہ میری دنیا برباد کر ڈالی۔

سمجھ نہیں آتی کس گناہ کی سزا ملی ہے۔ پھر بھی ہر دم اُس کی شکر گزار ہوں۔

میرا خالد مجھ سے چھین کر آخر خدا کو کیا مل گیا۔ بالکل.... نہیں آتا۔ کچھ سوچ نہیں سکتی۔ دل یہی کہتا ہے وہ آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ وہ زندہ ہے۔ وہ زندہ رہے گا۔ بھلا مجھے اکیلا چھوڑ کر وہ کیسے جاسکتا ہے لیکن یہ میرا وہم ہے۔ سراسر پاگل پن۔ سب سمجھتی ہوں لیکن سمجھتے ہوئے نہیں سمجھتی۔

قدسیہ! وہ اپنے وطن اپنے اسلام پر قربان ہو گیا۔ اللہ یہ قربانی قبول کرے اور اس کے عوض کشمیر ہمیں مل جائے تو پھر بھی کچھ تسلی ہو جائے۔ وہ تو شہید ہے۔ تمہاری جیلہ بہن اب ایک شہید کی ڈلہن ہے۔ ہمارا ایمان ہمیں کہتا ہے کہ شہید ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ تو پھر وہ مجھے کیوں دکھائی نہیں دیتا۔ مجھے کیوں ملنے نہیں آتا۔ میں تو اُس کا انتظار کر کر کے بھی تھک گئی۔ میں اُسے کہاں ڈھونڈوں۔ کیسے پکڑ لاؤں۔ مجھے کوئی نہیں بتاتا۔ سب چپ ہیں کوئی نہیں بولتا۔

وہ تو مجھے ضرور یاد کرتا ہوگا۔ اپنے پاس بلاتا ہوگا لیکن کوئی اُس کے پاس جانے نہیں دیتا۔ مجھے صینے کی آرزو نہیں۔ زندگی کی تمنا نہیں لیکن کیا کروں۔ مجبور ہوں سخت مجبور۔ کیا معلوم تھا خالد اس قدر بے وفا نکلے گا۔ اتنی جلدی مجھ سے روٹھ جائے گا۔ وہ تو مجھ سے کبھی خفا نہ ہوا۔ معلوم نہیں ایک دم کیوں بدل گیا۔ جب آیا تو میں نے اُسے اس قدر بلایا۔ آوازیں دیں۔ روٹی چلائی لیکن وہ چپکے لیے رہا۔ جیسے اُس کو کچھ خبر نہیں۔ بھلا اتنی بھی لاپرواہی کیا ہوتی۔ میں نے اب پکارا رہ کر لیا ہے کہ چاہے وہ مجھے کتنا ہی بلائے۔ منتیں کرے۔ میں بھی اُس سے نہ بولوں گی۔ خوب ستاؤں گی۔ دیکھنا پھر وہ خود بخود سیدھا ہوتا ہے یا نہیں۔

بس اب لکھا نہیں جاتا۔ سر چکر رہا ہے۔ خط لکھتی رہتا۔

بد نصیب
جیلہ

جنوری 1951ء

31 دسمبر کی آدھی رات گزر جانے کے بعد روشنی کے ایک ٹکڑے نے میرے کمرے میں آ کر مجھے جگایا اور کہا ”میں تمہارے محبوب کے مقدر کا ستارہ ہوں۔“ میں نے لحاف سے سر نکال کر کہا ”چائے تھرموس میں پڑی ہے اور بسکٹ میرے میز کی دراز میں اور سینما کا پاس میری پتلون کی جیب میں رکھا ہے۔“ پھر میں نے اپنا منہ رضائی کے اندر کر لیا۔

کڑوی دوا میرے حلق میں یوں اترتی ہے جیسے ریاضی داں لڑکی کا سنگیت کانوں میں!

دریائے جہلم میں چاند ستارے والے ایک روپے کو پڑے ہوئے دیکھ کر ایک کچھوے نے کہا ”اچھا تو سکندر

تعمیر نہیں چلا گیا!

جب زندگی کے سارے باب بند ہو جاتے ہیں اور فرار کی تمام راہیں مسدود ہو جاتی ہیں تو موت چور دروازے سے آ کر کہتی ہے ”آؤ بھاگ چلیں۔“

میرے لیے میری ماں کا وجود اُس ناممّ پس کی طرح ہے جسے میں نے مدت سے چاہی نہیں دی، لیکن جسے میں کسی خاص صبح کو جاگنے کے لیے چلا بھی دیتا ہوں اور لارم بھی لگا دیتا ہوں۔

ایک ماں نوجویں کی نگہداشت کر سکتی ہے لیکن نو بچے ایک ماں کی نگہداشت نہیں کر سکتے۔ (ترکی مقولہ)

اس سے بڑھ کر اور کوئی احمق نہیں ہو سکتا جو ساری دُنیا کو اور اپنے باپ کو خوش کرنے کے ارادے رکھتا ہو۔

(La Fontaine)



فونٹین
ذوالبصائر لاکھنؤ کی سرزمین

1- مزنگ روڈ سے کینال پارک 24- ایس

ابھی ہمارے ایم۔ اے کے امتحان نہ ہوئے تھے کہ ایک اور تبدیلی نے سر نکالا۔

میری والدہ ساندہ والے گھر میں تشریف لائیں اور نادر شاہی حکم فرمایا کہ ”یہ گھر خالی کر دو۔ میں نے تمہارا انتظام کینال پارک میں کر دیا ہے۔ اچھی کھلی جگہ ہے۔ تم لوگ بیڈمنٹن کا کورٹ بھی بنا سکو گے۔“

ان دنوں والدین کو جواب دینے کا رواج نہ تھا، نہ اپنے حکم کو مضبوط کرنے کے لیے کسی قسم کی تاویل ہی دینے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ ہم دونوں بہن بھائی بوریا بسز باندھ 24- ایس کینال پارک کی طرف روانہ ہو گئے۔ جیل روڈ سے جو راستہ گلبرگ کی طرف جاتا ہے، اسی پر نہر کے پل سے گزرتے ہی دائیں ہاتھ ایک راستہ نہر کے ساتھ ساتھ جاتا ہے۔ دوسرے راستے سے کینال پارک کی بہتی شروع ہو جاتی ہے۔

ایک سڑک کینال پارک کی کونھوں سے گزر کر جاتی ہے۔ دوسرا راستہ کچا تھا اور کچھ دوکانوں سے ہوتا ہوا آگے چل کر پکی سڑک سے مل جاتا تھا۔ میں اسی راستے سے شہر ما تھی۔ یہی سڑک اور کچا راستہ مل کر ہمارے 24- ایس کینال پارک کے سامنے سے گزر کر آگے بازار میں جا نکلتا تھا۔

24- ایس کینال پارک ایک چھ کینال کی کونھی تھی، جس کا کالا پھانک تھا۔ جیسا پھانک اب 121- سی کے سامنے ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے کالے پھانک کے ساتھ کچھ میری تغذیر کا گھرانک ہے۔ جب بھی میرے گھر کے آگے ایسا پھانک ہوتا ہے، میں بڑا تحفظ محسوس کرتی ہوں۔

یہ پھانک کھلتے ہی بائیں ہاتھ ایک بڑا سادرخت تھا۔ اس سے آگے ساری جگہ ڈھنڈار، اُجاڑ، جڑی بوٹیوں اور جنگلی پودوں سے اٹی ہوئی تھی۔ پھانک سے کوئی پچاس فٹ کے فاصلے پر کونھی تھی۔ ایک عرصہ سے بند رہنے کی وجہ سے عمارت خستہ حال تو نہ تھی لیکن بوسیدہ بوسیدہ سی لگتی تھی۔

سب سے پہلے چند میٹرھیاں چڑھ کر برآمدہ آتا جس کے فرش پر کالی اور پیلے موزیک کی شطرنجی بچھی تھی۔ اس برآمدے کے دونوں جانب کمرے تھے۔ بائیں ہاتھ عین شروع میں جو کمرہ تھا اُسے میں نے اپنا پڑھائی کا کمرہ بنا لیا۔

تھے۔ کسی دوسری طرف باورچی خانہ تھا، جوزینب اور لالو کی راجدھانی تھی۔ میرے آفس سے پیچھے ایک کمرہ اور غسل خانہ تھا۔ غسل خانے کا دروازہ کھولیں تو تھوڑی سی خالی جگہ تھی، جس میں ایک لیٹرین بنی تھی، جسے زینب اور لالو استعمال کرتے تھے۔

میرے بیڈروم سے ملحق اور برآمدے کے پیچھے دو بڑے کمرے اور ان سے پیچھے تین چھوٹے کمرے تھے۔ میرے کمرے کا دروازہ ڈرائنگ روم میں کھلتا تھا اور اس سے پیچھے گودام صورت کمرے میں ریزی نے چارپائی ڈال لی تھی۔ اس کے ساتھ والے کمرے میں کاٹھ کباڑ اور کھانے کے کمرے کے پچھلے کمرے میں زینب اور لالو رہتے تھے۔ پھر تین خانے کے سامنے ایک حوض تھا، جس میں دستی نلکہ لگا ہوا تھا۔

میں نے گھر کی تفصیل اس لیے بیان کی کہ آپ کو بتا سکوں کہ گھر کے ماحول میں رہائش گاہ بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ اُس کے کینوں پر بڑا اثر ہوتا ہے۔ میں نے گھر میں قدم پڑتے ہی آفس پر قبضہ کیا۔ پھر اس سے ملحق اپنا بیڈروم اور غسل خانہ چن لیا۔ زینب اور لالو ایک طرح سے میرے ملازم تھے۔ میں نے کبھی انہیں ریزی بھائی کے لیے کوئی خصوصی کام نہیں دیکھا۔ ہر جگہ میں ہی اہم تھی۔

میں نے دیکھا ہے جن گھروں میں مجھ جیسی خود اعتماد عورتیں یا لڑکیاں ہوا کرتی ہیں، وہاں ایسی شیرنیوں سے ایک کو مرد اپنے آپ کو چھپا لیتے ہیں۔ جب وہ اپنی منوانہیں سکتے تو اپنے اندر ہی کہیں گم ہو جاتے ہیں۔ عموماً مردوں کا گھبراہٹ اور اُن کے ڈپریشن کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ مردوں کی طرح ایسی عورتوں کو بھی اتھارٹی کا بہت شوق ہوتا ہے۔ میں نے بھی لائق بن کر اپنا رعب والدہ صاحبہ پر ڈال دیا تھا۔ وہ گھریلو خرچ کے پیسے مجھے دیتیں۔ جب بھی وہ مجھ پر چہرے آتیں، میرے ساتھ سوتیں۔ جب اُن کی تبدیلی ملتان ہو گئی تو وہ مجھے ملتان سے خط لکھتیں۔ ریزی کے لیے یہ حصوں میں کوئی چھوٹا مونا پیغام بھی نہ ہوتا۔ جب بھی ذکر ہوتا ضمنی یا سرسری ہوتا۔

ریزی بھائی طبعاً شریف آدمی تھے۔ مجھ سے زیادہ ذہین۔ ہر طرح سے زیادہ Deserving تھے۔ اسی سادگی اور محبت کے باعث تقاضا کرنا اُن کی فطرت میں شامل نہ تھا۔ نہ وہ مسابقت میں یقین رکھتے تھے نہ کبھی کسی چیلنج ہی کو تھل کھاتے تھے۔ جو کچھ زینب پکا دیتی کھا لیتے۔ جو کچھ میں کہہ دیتی فوراً مان لیتے۔

موسیٰ لیڈی میککلن میں ہی رہ گیا تھا۔ میں صبح لالو کے ساتھ بغلی کچے راستے سے ہو کر جیل روڈ پر پہنچی جہاں نہر کے کنارے سے کچھ پہلے بس سٹاپ تھا۔ یہاں سے بس سیدھی مال روڈ پر پہنچتی اور بھنگیوں کی توپ کے پاس والے بس سٹاپ سے سڑک میں اور لالو کا لُچ پہنچتے۔

پنجاب یونیورسٹی کے بڑے ہال میں ہمارا فائنل کا امتحان ہوا۔ برآمدہ گزرتے ہی اندر بڑے ہال میں ہر طالب علم کے لیے ڈسک اور کرسی تھی۔ غالباً یہ چوتھے پرچے والے دن کا واقعہ ہے۔

اشفاق احمد کو کاسہ بردار کارول پسند تھا۔ وہ مجھ سے دونی مانگ کر کچھ اُدھار لے کر مجھے غالباً یہ یقین دلانا چاہتے تھے کہ وہ مجھ سے کمتر ہیں۔ اُن کی یہ عادت میں نے دوسروں کے معاملے میں بھی راسخ دیکھی۔ وہ اپنے سے کمتر کو فرمائش کر کے کچھ نہ کچھ مانگتے۔ لڑکیوں سے بڑی عاجزی سے کچھ نہ کچھ پکا کر لانے کو کہتے اور پھر اس پکوان کو ایسی نیاز مندی سے

کھاتے گویا اس سے پہلے کبھی اس جنت کے میوے کا مزہ نہ چکھا ہو۔ تحفے لینے کا فن جیسا خاں صاحب کو آتا تھا۔ میں۔
اس عاجزی کے ساتھ پھر کبھی کسی کو اس طرح تحفے قبول کرتے نہیں دیکھا۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ غالباً چوتھے پرچے کا ذکر ہے.....

خاں صاحب کے دل میں وہی عاجزی در آئی۔ اپنا پن اٹھا کر میری سیٹ تک آئے اور بولے ”آپ کے پاس

بلو بلیک انک ہوگی؟“

قطاروں میں چکر لگانے والے Invigilator نے انہیں دیکھا۔ یکدم مڑا اور دور سے آواز لگائی۔

”کیوں بھئی کیا ہے؟“

میری دوات اٹھا کر اشفاق صاحب نے اُسے دکھائی۔ وہ بات سمجھ نہ پایا۔ قریب آ کر بولا۔

”کیوں بھئی آپ کو کیا چاہیے؟“

”سر! میرے پن میں سیاہی ختم ہو گئی ہے۔ میں ان محترمہ سے سیاہی مانگنے آیا تھا۔“

”کیا آپ کو معلوم نہیں کہ کمرہ امتحان میں آپ کسی سے بات نہیں کر سکتے؟“

بڑی معصومیت سے بھولے سے بن کر اشفاق احمد بولے۔ ”جی میں بات تو نہیں کر رہا۔ میں تو سیاہی مانگ رہا

ہوں۔“

”آپ مجھ سے اپنی ضرورت کا ذکر کرتے۔ ممتحن اعلیٰ سے بات کرتے۔“

”سوری سر! نہ میرے پاس کوئی بوٹی ہے نہ ان کے پاس۔ آپ میری تلاشی لے سکتے ہیں۔“

Invigilator نے غصے سے خاں صاحب کی طرف دیکھا۔ پھر یکدم اُس کے چہرے پر ملانمت آ گئی۔ ”آپ

اشفاق احمد ہیں؟“

”جی..... جی!“

”آپ ادیب ہیں؟ آپ نے ”ایک محبت سوا فسانے“ لکھی ہے؟“

”جی..... حسن اتفاق سے۔“

”بڑی خوبصورت کہانیاں ہیں۔ اتنے چھوٹے چھوٹے واقعات سے آپ اتنی بڑی کہانیاں کیسے بنا لیتے

ہیں؟“

جواب دینے کی نوبت نہ آئی۔ اس وقت ممتحن اعلیٰ ڈاؤس سے اتر کر ہمارے پاس آ گئے۔

”کیا ہوا؟“ انہوں نے تشویش بھرے لہجے میں سوال کیا۔

”یہ پن میں سیاہی بھرنا چاہتے ہیں۔ میں پاس کھڑے ہو کر سیاہی بھرا رہا ہوں کہ کہیں کوئی چیننگ نہ ہو

جائے۔“

”Oh I see.“

سپرینٹنڈنٹ واپس چلا گیا۔ خاں صاحب نے سیاہی بھری اور میرا شکر یہ ادا کیے بغیر یوں مڑ گئے گویا دوات اُن

تھی اور انہیں کسی سے پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے آج تک کبھی پن میں سیاہی نہیں بھری۔ میرے لیے یہ بڑا سکے والا ٹیکنیکل سا کام ہے۔ میں نے نہ جانے کیوں بڑی دیر تک اس دوات کو سنبھالے رکھا۔

ان ہی امتحانوں کے دنوں میں میرا پہلا تعارف خاں صاحب کے خاندان سے ہوا۔ پرچہ ختم ہونے پر ہم لوگ اس میں باہر نکلے۔ ہال کے باہر آمدے میں اشتیاق احمد خاں سے ملاقات ہوئی۔

”یہ میرا چھوٹا بھائی اشتیاق ہے۔ ہم سب اسے تقو کہتے ہیں۔ فوج میں نیا نیا بھرتی ہوا ہے.....“
تقو نے بڑی اجلی سی مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا۔

خاں صاحب نے عجب اپنائیت سے میرے ہاتھ سے قلم، کاغذوں کے نیچے رکھنے والا گتہ پکڑا اور اسے تقو کے

”یہ قد سید میری ہم جماعت ہیں۔ تم انہیں کاکی کہہ کر پکار سکتے ہو۔“
نہ جانے کس طرح اشتیاق صاحب میرا گھریلو نام جانتے تھے۔

مجھے کچھ پوچھنے کا وقت نہ ملا کیونکہ تقو نے بڑی محبت سے پوچھا ”شکو پرچہ کیسا ہوا؟“
اب مجھے پہلی بار علم ہوا کہ اشتیاق صاحب کا رنگ نیم شتو ہے۔

”بس ہو گیا۔ چپ چاپ چلے آؤ۔ ان کا ملازم غالباً گورنمنٹ کالج میں ان کا انتظار کر رہا ہے۔ وہاں تک جانا ہے۔ تو ہمیں ہوتا ہے لیکن خیر کوئی بات نہیں۔“

تقو بڑی خاموشی کے ساتھ ہم دونوں سے دو قدم پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اُس نے شکو اور کاکی سے کوئی بات نہ کی۔
خاں صاحب اور قد سید ہی نے آپس میں کوئی رابطہ قائم کیا۔ حتیٰ کہ یہ بھی نہ پوچھا کہ کون کون سے سوال کیے گئے اور پرچہ
کیسے ہوا؟ گیت کے قریب ہی لالو منتظر نظر آیا۔ خاں صاحب نے تقو سے میری چیزیں پکڑ کر لالو کو پکڑا دیں اور دونوں بھائی
میں جڑے گویا سرے سے واقف ہی نہ ہوں۔

اشتیاق ابھی فوج میں نیا نیا بھرتی ہوا تھا۔ وہ کاکول میں کیڈٹ تھا اور انڈر ٹریننگ تھا۔ وہ اپنے خاندان سے نیا نیا
مجھ سے اور سخت زندگی کی چھاپ ابھی اُس کے چہرے پر نہ تھی۔ چھوٹا دوانچ لہبا۔ گورا چٹا سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں
وہ تھا اور خاموش رہتا تو امریکن لگتا۔

اس پہلی ملاقات میں تقو اور میری دوستی کی بنیاد رکھی گئی۔ ہولے ہولے یہ دوستی گہری ہوتی گئی۔ وہ جہاں بھی
مجھے خط ضرور لکھتا اور میں بھی اُس کے خط کا جواب اہتماماً دیتی۔ ڈیڈی جی سے محبت کا رشتہ ضرور تھا لیکن اس میں احترام
تعمیر تھا۔ تقو اور ناہید سے بڑی بے تکلفی تھی۔ وہ ساری زندگی میرا رازداں، دوست، بھائی، مددگار رہا۔ ایک عاشقی کا
رشتہ نہ ہو سکا باقی سارے رشتے مضبوطی سے قائم رہے۔ غالباً یہ سکھوں کے ساتھ رہنے کا اثر تھا کہ ہم دونوں ایسے
دوست بنے جو سکھ خاندانی نظام کرشن چوڑا کی بازگشت تھے۔

یہ امتحانوں کے بعد کی بات ہے۔ میں بڑے درخت کے جھولے پر تھی جس وقت کالا پھانک ہولے سے کھلا۔
اسے اس کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ ہمارے گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت نہ تھی۔ میری والدہ ان دنوں ملتان میں انسپکٹرز آف

سکولز تھیں۔ انہوں نے نادر شاہی حکم دے رکھا تھا کہ شہر میں بھانت بھانت کے لوگ ہیں۔ جب تک میں موجود نہ ہوں کہ سے دوستی کرنے کی ضرورت نہیں۔ ریزی کو بھی آرڈر دے رکھا تھا کہ کسی دوست کو گھر بلانے کی تکلیف نہ کرنا ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔

پھانک کھلا۔ سائیکل کا ایک پہیہ اندر گھسا۔ پھر ہینڈل پر ایک سفید ہاتھ نظر آیا جس پر سنہری بال تھے۔ پھر سائیکل اندر آئی۔ خاں صاحب نے احتیاط کے ساتھ اپنے پیچھے کالا پھانک بند کر دیا۔ میرا جھولارک گیا۔ میں حیرانی سے سراپا استقبال بن گئی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ 1- مزنگ روڈ کی تیسری منزل پر رہنے والے کو میرا پتہ معلوم ہو سکتا ہے۔ پھانک کے ساتھ دائیں طرف اینٹوں کا لال روڑی ملا ملے پڑا تھا۔ خاں صاحب نے سائیکل وہاں کھڑی کر دی اور درخت سے لٹے گھر بلو قسم کے جھولے کی طرف آئے۔

”السلام علیکم.....“ چھوٹی سی بے ترتیب ہاڈا لنگ کروہ قریب آتے ہوئے بولے۔

”جی السلام علیکم.....“

”آپ جی کا بہت استعمال کرتی ہیں۔ میں نے کالج میں بھی یہ محسوس کیا تھا.....“

”جی..... جی.....“

میں انہیں بتانا نہ سکی کہ خوفزدہ لوگوں کے پاس جی جی کی ٹکڑا ایک نوعیت کی ڈھال ہوا کرتی ہے۔ مرانی مزارعہ، یتیم، مسکین، ملازم کے پاس یہ ایک قسم کا Defense mechanism ہے جسے استعمال کر کے وہ جاگیردار نمبردار، آمر، ڈکٹیٹر، مالک غرضیکہ ہر قسم کے اپنے سے برتر کے دل میں جذبہ ترحم ابھارتا ہے اور کسی کے رحم و کرم پر بھیج کر کے اپنی انا کو مجروح ہونے سے بچاتا ہے۔

میں نے شوق کو جھولے کے پاس بٹھانا مناسب نہ سمجھا۔ حالانکہ یہاں دو تین بوسیدہ سے ڈگڈگی نما موڑھے پڑے تھے۔ میں برا آمدے کی طرف چلی۔ وہ موڈب انداز میں پیچھے پیچھے ہو لیے۔ تین سیڑھیاں چڑھ کر ہم برآمدے میں پہنچ گئے۔ یہاں فرش تو موزیک کا تھا لیکن اس کا ڈیزائن کالے اور پیلے رنگ کی شطرنجی کا تھا۔ یہاں خوبصورت آرام دہ فیک کھڑی کی بنی ہوئی گول گول پشت کی کرسیاں تھیں۔ میں نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور جی کہنے سے گریز کیا۔

”مجھے ریزی کی تلاش ہے..... آپ اُسے بلا دیں گی؟“

آج تک پردیز کو کسی نے ریزی نہ کہا تھا۔ اب ایک لمحہ میں اُس کا نام ہمیشہ کے لیے ریزی پڑ گیا۔

”وہ تو جی گھر پر نہیں ہیں۔“

”کب تک آئے گا؟ مجھے اُس سے ایک سرورق بنوانا تھا۔“

”بس جی آتا ہی ہوگا جی.....“ میں نے بڑے وثوق سے کہا۔ حالانکہ مجھے ریزی کی آنیاں جانیاں کبھی ٹھیک طور

پر معلوم نہ ہو سکیں۔

”میں جی پوچھ کر بتاتی ہوں۔“ میں اٹھ کر باورچی خانے تک گئی۔

زیب دروازے میں کھڑی تھی۔

میں اندر چلی گئی..... ”ذرا لالو کو بازار بھیج کر نمک پارے اور برنی منگوا لو۔ ساتھ چائے بھی بھیج دینا۔“
 ”یہ کون ہے صوفی صاب؟“

”میرے ساتھ کالج میں پڑھتے تھے۔ پرویز بھائی کا پوچھنے آئے ہیں۔“

”اتنے سوہنے صوفی صاب، اتنے سوہنے..... ہائے رباتے سوہنے۔“ زینب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
 ”وہ چپ ہوگئی۔ غالباً اس وقت زینب نے کوئی دعا مانگی ہوگی جو بعد میں میرے کام آئی۔“

”دیر نہ کرنا..... یہ رکنے والے نہیں..... جلدی لالو کو بازار بھیجو۔“

کیٹال پارک کا بازار بالکل پینڈ و صورت تھا۔ اس میں چھوٹی موٹی دکانیں اور سستے سودے تھے۔ ایک حلوائی کی دکان پر کئی کئی کاپیاں دی کام دہی دودھ بیچتا تھا۔ لیکن وہ اپنی دکان کی عزت بڑھانے کے لیے نمک پارے اور برنی بھی بیچتا تھا۔ خاں صاحب نے یہ برنی اور نمک پارے اس طرح کھائے جیسے من و سلوئی کھا رہے ہوں اور یہ نعمتیں انہوں نے کئی بار کئی ہوں۔

”آپ کو علم ہے کہ میں مزنگ روڈ پر رہتا ہوں؟“

”کتی..... پتہ ہے۔“

”کیا آپ جانتی ہیں کہ جب ہم پاکستان آئے تو پہلے ہم اپنی خالہ رشیدہ کے پاس ٹھہرے تھے لیکن جلد ہی ہمیں روڈ کا پتہ چلا۔ آپ کو پتہ ہے ہم..... بے سرو ساماں تھے۔ تقو اور میں چھوٹے تھے۔ ججو بھائی کراچی میں تھے۔ ہمیں ساری وال میں..... باباجی میرے والد ساری پونجی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ اقبال بھائی نے بڑی ہمت کی۔ وہ چوری چھٹی کمر منڈی جاتے۔ ایک آدھ بکر خرید کر اپنے کندھوں پر سوار کرتے اور پھر اسے گھوم پھر کر بیٹے اور گھر آ کر ساری بیٹے ماں کی تکلی پر رکھ دیتے۔“

میں بلائنگ پیپر کی طرح ساری انفریشن چوس رہی تھی۔

”آپ نہیں سمجھ سکتیں کتنی مشکلات تھیں۔ میری بڑی آپا فرخندہ حاملہ تھیں۔ اُن کے شوہر ڈاکٹر ایوب احمد خاں تھے۔ سارے پاس چھوڑ کر لندن جا چکے تھے۔ بالو بھائی کے پیسوں سے گزارا نہ ہوتا تھا۔ پھر میں نے سوچا.....“
 ”مجھے سمجھ آئی کہ یقیناً اقبال احمد ہی بالو بھائی ہیں۔“

”میں نے دل میں سوچا کہ کیوں نہ میں کوئی نوکری تلاش کر لوں۔ مجھے پتہ چلا کہ والٹن کیمپ میں ایک کلرک کی تلاش خالی ہے۔ میں بڑے رعب سے اپنی بی اے کی ڈگری لے کر پہنچا۔ لیکن کلرک نے ڈگری دیکھ کر کہا، بھائی یہاں کلرک پاس آدھی چاہیے۔ دوسرے دن میں اپنی دسویں کی ڈگری لے کر گیا اور مجھے نوکر رکھ لیا گیا۔“
 میرا دل ترس سے بھر گیا لیکن میں نے منہ سے کوئی اظہار نہ کیا۔

وہ کہتے گئے..... ”والٹن میں ان دنوں ایک بہت بڑا مہاجر کیمپ تھا۔ ٹولے، فرد، قافلے، اجڑے اجڑے لوگ آتے تھے۔ حیران پریشان پڑاؤ ڈال کر سارے کیمپ میں گھومتے پھرتے جیسے کچھ تلاش کر رہے ہوں۔ انہیں اپنے گھرے ہوئے رشتہ داروں کی تلاش تھی۔ چھت سے محروم یہ لوگ گھر ڈھونڈ رہے تھے۔ روزگار نہ تھا اور انہیں معلوم نہ تھا کہ

روزی کا وسیلہ کیسے بنے گا؟

”میں کیمپ میں معمولی کلرک تھا۔ میری ڈیوٹی تھی کہ میں مہاجروں کے نام، پتے، کوائف اور ان کی شکایتیں اپنی نوٹ بک میں لکھا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجھے ایک مائیکروفون مل گیا۔ میں اس پر اہم اناؤنسمنٹ کرنے لگا۔ پھر سلسلہ سے اور مجھے ملتان کیمپ بھی جانے کا حکم ملا۔

”ہوائی جہاز پر دورے ہونے لگے۔ یہ میرے پہلے ہوائی سفر تھے اور میں ان سے بہت مسحور ہوتا تھا۔ صرف ایک مشکل تھی میرے پاس کوئی سواری نہیں تھی۔ 1- مزنگ روڈ سے والٹن پیدل جانا پڑتا۔ واپسی پر بہت تھک جاتا.....“ وہ لمحہ بھر کوزے کے تو میں نے سوچا بھلا یہ فاصلہ کتنا ہوگا؟ میں لاہور کی سڑکوں، یہاں کے محلوں سے قطعی ناواقف تھی۔ اس لیے اس فاصلے کا اندازہ لگانا بھی میرے لیے ممکن نہ تھا۔

”والٹن میں ہی ممتاز مفتی مجھ سے ملے۔ بڑا بھلا آدمی ہے۔ وہ بظاہر اڑب لگتا ہے لیکن دل رکھنے کی ریت اس سے زیادہ کسی کو نہیں آتی۔“

بات کرنے والا داستان گوبلا کا سحر الہیان تھا۔ میں سنی سنائی سے گزر کر والٹن کیمپ میں پہنچ گئی اور قریب سے ممتاز مفتی کو دیکھنے لگی۔

وہ مجھے Entertain کر رہے تھے۔ بار بار وہ پھانک کی طرف اس طرح دیکھتے کہ مجھے یقین ہو جائے وہ واقعی ریزی کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے بھی کسی طرح ان کی گفتگو سے آؤ بھگت کرنی چاہیے۔ میں اندر گئی اور اپنی ایک پسندیدہ البم اٹھالائی۔

”یہ البم میں نے بڑی مشکل سے تصویریں اکٹھی کر کے بنائی ہے۔ کیا آپ اسے دیکھنا پسند کریں گے؟“

”آپ کی فیملی البم ہے؟“

”جی نہیں یہ ان فلمی ایکٹرز اور ایکٹریوں کی تصویریں ہیں جو مجھے جی جان سے پسند ہیں۔ جب ہم دھرمسالہ میں ہوتے تھے تو وہاں ایک سینما گھر ہمالہ ٹاکنز ہوا کرتا تھا۔ ان کا بل بورڈ کو توالی بازار کے چوراہے میں لگتا تھا۔ اس پر لکھا ہوتا ”آجشبکو.....“ مجھے کبھی سمجھ نہ آئی کہ یہ آجشبکو کیا چیز ہے۔“

وہ ہلکا سا مسکرائے.....

”ہمالہ ٹاکنز کے مالک ہمارے پڑوسی تھے۔ یہاں سے مجھے اور ریزی کو فلمیں دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔“

”مزے تھے تمہارے۔ مفت فلمیں دیکھنے کو ملتے تھیں.....“ شتو جی نے کہا۔

”ناں ناں جی میری امی نے بھائیہ صاحب کو بڑی شدت سے منع کر رکھا تھا کہ بچوں کو بغیر ٹکٹ خریدے ہال میں نہ جانے دیں۔“ میں نے جلدی سے ٹوکا۔

”ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ سینما کے مالک آپ کے ہمسائے تھے۔“

”ہمسائیگی اور چیز ہے ٹکٹ اور معاملہ تھا۔“

البم کے پہلے صفحے پر کندن لعل سہگل کی تصویریں تھیں۔ کندن لعل سہگل نے پہلی مرتبہ فلم ”دیوداس“ میں رول

یہ کہنے کا کیا کہ اس کماری سے لے کر پشاور تک سینما کے شائقین عیش عیش کر اٹھے۔ اس فلم میں پارو کارول ڈبلی تیلی
تھے یہ تھا اور بروانے اُس کے شوہر کارول ادا کیا تھا۔

اللہ کے عجیب کام ہیں۔ وہ عروج کے مقامات بدلتا رہتا ہے اور زوال کو کبھی کسی ایک مقام یا شخص پر مستقل نہیں
کرتا۔ بھارت میں بھی فلمی عروج کی داستان کچھ اسی طرح تھی کہ سب سے پہلے بمبئی ٹاکنیز نے تہلکہ مچایا۔ ”اچھوت
کیسے جھسی تھمیں بنائی گئیں، جس میں دیوکارانی نے شوڈر لڑکی کارول ادا کیا۔ ان کے ساتھ ایک کھیپ بڑے ایکٹروں اور
تھیں فلم کی پیدا ہو گئی۔

پھر گویا اوپر سے اشارہ ہوا اور ساری شہرت سارا عروج نیو تھیٹر ز کی شکل میں بمبئی سے کلکتہ منتقل ہو گیا۔ کندن
کانن کی آواز نے ڈھانپ لیا۔ مدھو بالا، سلوچنا کو بھول کر لوگ کانن بالا کے گن گانے لگے۔ میں خود کانن
تھیٹر سے بیڑی فین تھی اور اُس کی ”جواب“ فلم نے مجھ پر جادو کر رکھا تھا۔

سہگل جب دیو داس کے روپ میں گاتا..... ”دُکھ کے اب دن بیتت ناہیں“ تو دل میں شام ہی پڑ جاتی۔
کانن بالا جب منت بھرے لہجے میں گاتی.....

”جانے نہ دیں گے نہ جانے دیں
لیٹ رہیں گے راہوں میں“

تو گویا ہیروئن کے ساتھ ساتھ ٹکٹ خریدنے والے بھی ہیرو ڈکوریڈ کنا چاہتے۔

کندن لال سہگل ایک مرتبہ دھرمسالہ آئے تھے۔ ریٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ وہاں ہم اُن سے اسی عقیدت
سے ملے گئے جس طرح سارے فین (عقیدت مند) جاتے ہیں۔ سہگل اپنا ایک ٹی سیٹ بیچ رہے تھے۔ امی نے وہ ٹی
سیٹ سو روپے میں خرید لیا۔ عجیب بات ہے کہ وہ سیٹ میرے پاس C-121 تک رہا اور بالآخر میں نے اسے ایک ایسے
محلے کی دکان پر لے کر گیا جو سہگل کی یاد میں جمع کر رہا تھا۔

میں یہ الیم خاں صاحب کو پوری جانکاری، دلچسپی اور توجہ سے دکھا رہی تھی لیکن وہ بظاہر متوجہ لیکن بہ باطن وہ کسی
دوسرے میں تھے۔ کچھ دیر توقف کے بعد وہ بولے..... ”یہ تو بڑی اچھی ہالی ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور سنجیدہ قسم کی
صحیبت۔ آپ کے بھائی تو بہت اچھے آرٹسٹ ہیں۔ آپ کا کوئی ایسا مشغلہ؟“

”اشفاق صاحب میں..... کچھ کہانیاں لکھ لیتی ہوں۔ ایسے ہی..... ٹاک ٹوئیاں..... کچھ مہاجر کیمپوں سے
تھیں سوئی کہانیاں..... کچھ ارد گرد کا تجربہ۔“

”واہ یہ بات ہوئی ناں..... یہ شوق تو بہت ہی مثبت ہے۔ کیا آپ مجھے اپنی کہانیاں دکھا سکتی ہیں؟“

میں اپنے آفس میں چلی گئی..... میز کی دراز سے میں نے وہ پیلے کاغذ نکالے جن پر میری کہانیاں رقم تھیں۔
سے اوپر ”فاطمہ“ کہانی تھی۔ بہت بعد میں اس کہانی کا ڈرامہ ”صبح کا تارا“ بنایا گیا۔ جسے پہلی مرتبہ آغا ناصر نے
پیدا کیا اور انور سجاد نے اس میں ہیرو کارول کیا۔

جب میں کاغذوں کا پلندہ لے کر آئی تو خاں صاحب بڑی بے تکلفی سے لالو سے مشغول گفتگو تھے۔ اُن کا انداز

ایسا تھا گویا وہ برسوں سے لالو کو جانتے ہوں۔ مجھ سے انہوں نے افسانے پکڑ لیے اور بڑی دلچسپی سے ورق گردانی کر لگے۔ ایک مبتدی کی طرح میرے ہاتھ پاؤں کاٹنے لگے۔
 ”کاکی! آپ صفحہ نمبر نہیں لکھتیں.....“

میں نے کبھی پوری توجہ اور اہتمام سے یہ کام نہ کیا تھا۔ یہ تو وقت کٹی کا ایک شغل تھا۔ اچانک یہ افسانے ایک نئے رابطے کا سنگ بنیاد بن گئے۔

”جی بات یہ ہے کہ میں نے جلدی میں کچھ ترتیب سے کاغذ اکٹھے نہیں کیے۔“

”دیکھیے کوئی جلدی نہیں، آرام اطمینان سے الگ الگ کر کے افسانے مرتب کر لیجیے۔ میں پھر آ جاؤں گا۔“
 ریزی تو ابھی آیا نہیں، اچھا پھر سہی۔“

کالے پھانک کے پاس کھڑی سائیکل باہر نکالی۔ اس کے سوار نے نہ مڑ کر ناٹا بائی بائی کرنے کی کوشش کی تھی کوئی الوداعی جملہ ہی کہے۔ بس ایک وردناک سی خاموشی کے ساتھ باہر چلا گیا۔ پھر مری سے اُن کا خط آیا کہ وہ جلد آئیں گے اور افسانے ضرور دیکھیں گے۔

ایسے ہی ہوا۔ جب دوبارہ وہ ہمارے گھر آئے تو چند افسانے اپنے ساتھ لے گئے۔ میری حیرانی کی انتہا نہ تھی جب میرا پہلا افسانہ ”واماندگی شوق“ ادب لطیف میں چھپ گیا۔ وہ یہ رسالہ دستی لے کر میرے پاس آئے۔
 ”لیجیے مبارک ہو۔ ادبی سفر شروع ہو گیا۔“

رسالے کے اوپر لکھا تھا ”کاش میں بھی ایسا ایک افسانہ لکھ سکتا!“

کہانی پر میرا نام بانو قدسیہ لکھا تھا۔ یہ نام خاں صاحب نے اپنی طرف سے عنایت کیا تھا۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ میرا یہی نام شہرت پکڑتا گیا اور میں اپنا آباؤی نام قدسیہ چھوڑ کر خود بھی بھول گئی۔
 یہ ”نام“ کی بھی عجیب کہانی ہے۔

میری والدہ نے کبھی مجھے قدسیہ کہہ کر نہ پکارا۔ وہ مجھے کاکی اور ریزی بھائی کو کاکی کہتی تھیں۔ لیڈی میکین میری سہیلیاں جمیلہ ظفر، امینہ ملک، انور ملک اور آپی اقبال ملک مجھے ”ٹو“ کہہ کر پکارتیں۔ میں بھی اس نام پر خوش رہتی۔ مفتی جی مجھے قدسی پکارتے رہے لیکن شہاب صاحب نے جب مجھے بانو کہہ کر بلانا شروع کیا تو ہر نام ماند پڑ گیا۔ اب تک یہی نام مستعمل ہے۔ چھوٹے بڑے مجھے ”بانو آ پا“ کہہ کر پکارتے ہیں اور میں اس نام کے ساتھ اندر باہر بڑی مناسبت محسوس کرتی ہوں۔

ایک دفعہ بانو قدسیہ بن جانے کے بعد مجھ میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہو گئی، لیکن شوق میرے لیے پریشان تھے۔ جانتے تھے کہ میری اردو کمزور، مشاہدہ کمزور تر اور تخیل بھی واجبی سا ہے۔ لیکن اب اُن کے پاس کینال پارک آنے کا بہت اچھا جواز پیدا ہو گیا۔ وہ مجھے کبھی کبھار کچھ لکھنے کے لیے دے جاتے اور پھر اس ورق کو بڑے احترام سے لے جاتے۔
 کرنے کا یہ انوکھا ڈھنگ خاص اُن کی اختراع تھی۔

اسی جذبے کے تحت انہوں نے بعد میں مجھے ”داستان گو“ کا ایڈیٹر بنا دیا۔ کبھی کبھار وہ ”من چلے کا سودا“ کہتے

تحت مجھے ایک آدھ سین کی ون لائن پکڑا دیتے اور لکھنے کی فرمائش کرتے۔ یہ سب کچھ میرا مان بڑھانے کے لیے تھا۔ اس سے ان کا اپنا کوئی فائدہ ملحوظ خاطر نہ تھا۔ بس میری خود اعتمادی اور انا کے لیے بڑھاوا تھا۔

یہاں اشفاق احمد کی ایک مشکل سمجھنے کے قابل ہے۔ وہ ہمارے گھر کا قریباً فرد بن گئے تھے۔ ہمارے ساتھ بھئی وہ زیادہ اپنائیت محسوس کرتے۔ نمک پارے اور برنی کھاتے ہوئے انہیں محسوس ہوتا کہ وہ اب دور نہیں جاسکتے۔ پھر اتنی ہی شدت سے وہ فرار کا راستہ اختیار کرتے۔

1950ء سے 1955ء تک بڑے طوفانی سال ہیں۔ میں کبھی ملتان چلی جاتی تو ان کے خطوط میرا تعاقب کرتے۔ میں ملتان سے آتی تو چند بے ربط سی ملاقاتیں ہوتیں۔ پھر وہ کبھی جہلم، کبھی مری، کبھی تراز کھیل میں ریڈیو کی تقریبی کرنے چلے گئے لیکن دور بھاگنے کے باوجود وہ اس تعلق سے کئی طور پر شفا یاب نہ ہوئے۔ گریز کا پہیہ انہیں کینال بندک سے ڈور بھگا تار ہالیکین لوٹ آنے کے لیے راستہ چھوڑتا رہا۔

ایک عجیب سی بات یہ تھی کہ وہ جہاں بھی گئے ہمیشہ خط لکھتے۔ یہ خط جذبے سے عاری اور بیاناہ موشگافیوں سے بھرے ہوتے لیکن اندر ہی اندر وہ سوچ رہے تھے کہ یہ دوری یہ فاصلہ کافی نہیں۔ انہیں ضرور کسی لمبی اڑان پر جانا ہوگا تاکہ گھر والوں کی روایات اور وفاداری کو ٹھیس نہ پہنچے۔ گویا انہیں ایک ایک قطرے کا مجھے اور اپنے گھر والوں کو حساب دینا تھا۔

دراصل اشفاق احمد نے بڑی کرب کی زندگی گزاری اور اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ کسی کی دلا زاری کو سب سے زیادہ گناہ سمجھتے تھے۔ ان پر یہ حقیقت نہ کھلی کہ دل شکنی زندگی کا ایک وصف ہے۔ اللہ میاں کبھی کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر آفت بنا کر نازل کر دیتا ہے، کبھی رحمت بنا دیتا ہے۔ یہ سب اس کے کھیل ہیں۔

اس حقیقت کو طائف کے واقعے یا رحمتِ دو عالم پر کوڑا پھینکنے والی مائی کے حوالے سے سمجھنا چاہیے کہ ہمارے نبیؐ نے کبھی ان لوگوں کو موردِ الزام نہیں سمجھا بلکہ یہی جانا کہ بیچارے لوگ معیشت کے ہاتھ میں اس آشوب کا ہتھیار بنے ہوئے ہیں۔

اس کو کیا کیا جائے کہ قدم قدم پر ہر لمحہ ہر موسم اور مقام پر دل ٹوٹتے ہیں۔ کبھی کسی غلط فہمی کے تحت کبھی خوش فہمی کے باعث دل شکنی ہو ہی جاتی ہے۔ کبھی حسدِ خلقی کا باعث بنتا ہے کبھی طیش۔ انسانی جذبول نے قلب اور نفس میں جو بھری کڑی پچا رکھی ہے دماغ کی شریانیں بیرون کی جن تبدیلیوں سے متاثر ہوا کرتی ہیں، وہ سب حالات کی تبدیلی سے مل کر سخت وریخت کا باعث بنتے ہیں۔

شاید اسی لیے تمام مسلک خواہش سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے ضرورت بھر کھانا، حدود کے طور متعین جنس، انکساری کے ہمراہ ضرورت بھر عزتِ نفس کا حصول، رزقِ حلال کی یافتِ اسلامی تعلیم ضرور ہے لیکن یہ عام حقیقت کے بس کی نہیں۔ خواہش ہمیشہ ان ضروریات کو بڑھا دیتی ہے اور انسان اس خواہش کے حصول میں دلا زاری کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی دل شکنی ہو ہی جاتی ہے۔

خاں صاحب نے ایک بار اپنے مسائل سے ستانے کا وقفہ لیا اور جہلم چلے گئے۔ یہاں پر ائم گلاس فیکٹری تھی

جس کے مالک سعید احمد خاں تھے جو اماں سردار بیگم کے کزن تھے۔ یہ پاکستان کی پہلی گلاس فیکٹری تھی۔ Amroc سے تھی وجود میں آئی تھی۔ گیس سارے شہروں میں پہنچی لیکن جہلم محروم رہا اور بالآخر گیس نہ ہونے کی وجہ سے فیکٹری بند ہو گئی۔ ان دنوں پرائم گلاس فیکٹری کو گیس نہ ملی تھی اور وہ تیل کی بھٹیوں سے کام کر رہے تھے۔ یہاں جتنی مرتبہ خاں صاحب گئے انہوں نے مجھے خط لکھے جن سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہیں اپنے خاندان کے لوگوں سے کس قدر محبت تھی اور ان سے بانہہ چھڑانے کے بعد وہ کس کرب سے گزر رہے ہوں گے۔

دراصل پٹھانوں میں جو کچھ ریل ایک جہتی ہے وہ انوکھی چیز ہے۔ وہ کبھی بھی اپنوں کے قرب سے چھٹکارا حاصل کرنا نہیں چاہتے۔ اگر بوجہ کچھ بھی جائیں تو چھپکلی کی کٹی دم کی طرح پھڑکتے رہتے ہیں۔ وہ عم زاد کی محبت سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ انہیں حفاظت کا احساس اپنے رشتہ داروں سے گھلے ملے رہنے سے ملتا ہے۔

غیر پٹھانوں کے ساتھ کھانے پینے، اعتقادات، رسم رواج کا Osmosis جاری رہتا ہے لیکن وہ غیر پٹھانوں میں ضم نہیں ہو سکتے۔ ہر پٹھان غیر پٹھان کے ساتھ دوستی تو کر سکتا ہے، محبت کا مرتکب ہو سکتا ہے، قلب میں سیر بھی لگا کر ہو سکتا ہے لیکن غیر پٹھان کے ساتھ مکمل طور پر کمزور نہیں ہو سکتا۔

اگر مجھے درست یاد ہو تو تراڑ کھیل میں یوسف ظفر، ممتاز مفتی، عمر صاحب (جنہیں خاں صاحب عمر بکری کہتے تھے کیونکہ عمر ہر پہاڑی پر بکری کی طرح چڑھ جاتے تھے) یہ بھی سنی سنائی سمجھیے کہ یہ چاروں مری سے ایسے پروگرام نشر کرنے میں مشغول تھے جو پاکستانی نقطہ نظر کی وضاحت اور نظر یہ پاکستان کی حفاظت کر سکیں۔

”ہم آگئے“ پروگرام نشر ہونے لگا۔ اس پروگرام کی خوبی یہ تھی کہ پندرہ منٹ پہلے جو پروگرام بھارت سے ہوتا اس کا جواب خاں صاحب ڈنکے کی چوٹ لکھتے اور جوابی حملہ اس قدر منہ زور اور سخت ہوتا کہ غالباً ہندوستان والے سارا دن اس کا جواب ہی سوچتے رہتے۔

تراڑ کھیل میں ایک ٹرک میں ریڈیو سٹیشن قائم کیا گیا تھا۔ یہاں کا سماں عجیب تھا کہ ٹرک میں باہر کے شور سے چھٹکارا پانے کے لیے مائیکروفون اور ایکسٹرا اپنے اوپر رضائی اوڑھ لیتے تھے۔ یہ اختراع اس لیے کی گئی تھی کہ ہندوستان سے ہونے والے پروپیگنڈہ پروگراموں کا فوراً جواب دیا جائے۔ خاں صاحب کے ذمے ”ہم آگئے“ کا سکرپٹ لکھنا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کا پروگرام سنتے۔ ساتھ ساتھ حاضر جوابی سے سارے اعتراضات کا جواب رقم کرتے۔ جو نہیں بھارتی پروگرام بند ہوتا تو تراڑ کھیل سے اناؤنسمنٹ ہوتی..... ”ہم آگئے!“

اس پروگرام میں مشہور آرٹسٹ محمد حسین اور تاج صاحب پیش پیش تھے۔ کبھی خاں صاحب بھی صدا کاروں کرتے لیکن زیادہ تر وہ سکرپٹ ہی لکھتے تھے۔ ممتاز مفتی بھی وہیں تھے اور وہ بھی سکرپٹ لکھا کرتے تھے۔ خواتین صدا کاروں میں جمیلہ اختر سے خاں صاحب کی یہیں ملاقات ہوئی تھی۔ خاں صاحب ازل سے محنتی تھے۔ اُن کے لیے گھر سے دوری، کالے پھانک والی سے فاصلہ، اپنی تنہائی کا غم اس پروگرام کے سامنے دھندلا جاتا۔

یہیں رہ کر غالباً سب سے پہلے اُن پر یہ بات واضح ہوئی کہ اُن کے دل میں پاکستان کی محبت دائمی ہے۔ کبھی محبت پھر جوان ہو کر ”تلقین شاہ“ پروگرام میں ابھری جو پورے 39 سال نشر ہوتا رہا۔ اس پروگرام سے اُن کی وفاداری

تھوڑے۔ اُن کی محنتِ طلبی کا ایک عجیب واقعہ بھی ہے کہ جب باباجی محمد خاں اس جہاں سے چلے گئے تو ابھی اُن کا جنازہ گھر پہنچا تھا اور خاں صاحب ماتم داروں سے چھپ کر ”تلقین شاہ“ لکھ رہے تھے۔

پاکستان سے والہانہ محبت نے 1971ء کی جنگ میں ”دادو لوہار“ کا روپ دھارا۔ اس پروگرام کو وہ لاہور سے صبح کیا کرتے تھے اور اس میں صدا کار بھی شتو ہی تھے۔

خاں صاحب شاید تراڑ کھیل سے جلد واپس نہ آتے لیکن ایم اے کا رزلٹ نکل آیا۔ ہم دونوں پاس ہو گئے تھے۔ آپس نے مجھے مبارک باد کا تار بھیجا تو مجھے لگا جیسے میری محنت ٹھکانے لگی۔ امتحان میں خاں صاحب فٹ آئے۔ جس صبرے نمبر پر آئی لیکن مجھے ایک بار بھی اس بات کا رنج نہ ہوا۔ وہ ترنت ہی لاہور واپس آئے۔

کالا پھانک کھلا..... اشفاق صاحب نے اپنا ہو پر سائیکل لال بگری کے ساتھ دائیں کونے میں رکھا۔ میٹرھیاں تھیں اور برآمدے کی آرام کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر یوں بیٹھے جیسے کوئی تھکا ہارا مسافر سفر سے گھر لوٹتا ہے۔ ایک لمبا وقفہ خاموشی کا گزرا۔ پھر نہ تو کوئی بات تراڑ کھیل کی ہوئی نہ امتحانوں کے متعلق دہرائی گئی۔ اشفاق صاحب نے بڑی لجاجت سے کہا ”دیکھیے میری اماں کو شوق چڑھا ہے کہ وہ میری کامیابی کی خوشی میں دعوت کریں۔ آپ نہ صرف روڈ آئیں۔ کل رات قریب آسات آٹھ کے درمیان۔“

میری والدہ ملتان میں تھیں اور اُن کی اجازت کے بغیر میں کہیں جا نہ سکتی تھی۔ ویسے بھی خوف میری شخصیت کا حصہ ہے۔ خود بخود پھلتا پھولتا ہے۔ خود بخود دیوانہ وار مجھ پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ سوسائٹی میں ابھی لڑکیاں اتنی ماڈرن نہ تھیں کہ یوں آزادانہ گھوم پھر سکیں۔ ابھی تو سہیلیوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کی اجازت بھی مشکل سے ملتی تھی۔ پتہ نہیں کہ میں مجھے خیال آیا کہ میں 1۔ مزنگ روڈ جا کر اپنے آپ کو بے وقعت اور Cheap ثابت کروں گی۔

”مشکل یہ ہے کہ میں تو آپ کے گھر نہیں آسکوں گی۔ آئی ایم سوری، یہ ممکن نہیں۔“

شکوہ فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے..... ”میں تو اماں کو مرغیاں خرید کر دے آیا تھا۔“

میرا انکار سن کر غیرت مند پشیمان بچے نے اصرار نہ کیا۔ میٹرھیاں اترے ہو پر سائیکل سنبھالا، کالا پھانک کھولا اور چلا گیا۔

چند دنوں بعد مجھے ایک خط ملا، جس میں تحریر تھا کہ خاں صاحب نے وہ تمام مرغیاں اماں سے لے کر کوٹھے پر رکھیں اور چیلیں اُن کی خوشی کو مرغیوں سمیت نوج نوج کر کھا گئیں۔

خاں صاحب نے اس کے بعد فرار کے کئی راستے اختیار کیے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ پائے۔

لیکن دعوت کی یہ خطگی تا دیر قائم نہ رہ سکی۔ کچھ ہی دن گزرے تھے کہ شتو اپنے چھوٹے بھائی تقو کو لے کر ہمارے پاس آئے۔ اشتیاق کو کچھ دنوں کی چھٹی تھی اور کیڈٹ صاحب اپنے خاندان سے کچھ ہمت، حوصلہ افزائی اور محبت کی گرمی کا نیکل بھر دانے آیا تھا۔ باباجی محمد خاں سے تو سب بچوں کا دوری اور سرد مہری کا رابطہ تھا لیکن اماں جی ان ساری کوتاہیوں کو نہ مٹھتی سے برابر کر دیتیں۔

تقو کے سنہری بالوں میں سرسوں کے تیل کا مساج کیا جاتا۔ اُس کی پسند کے کھانے پکائے جاتے۔ تقوا ماں کے کمرے میں سوتا۔ وہ پھل شوق سے کھاتا جو ماں جی امیری بیگم سے خرید کر الماری میں رکھتی تھیں۔

ہمارے گھر میں گھتے ہی تقو نے مجھے بے تکلفی سے پوچھا۔ ”کاکی! تمہارے پاس کرکٹ کا بلا ہے؟“
”تم آرام سے برنی کھاؤ۔ تمہیں کرکٹ سے کیا“ میں نے جواب دیا۔

”بھائی میں Sportsman ہوں۔ روز جو گنگ کرتا ہوں۔ سوئمنگ میری عادت ہے۔ میں یوں بیٹھ کر صرف

باتوں کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہاں مزنگ روڈ میں بھی کوئی نہیں کھیلتا۔ نہ ان ڈور نہ آؤٹ ڈور.....“

اتنے میں ریزی کہیں سے ایک بیس بال کا ڈنڈا تلاش کر کے لے آیا۔ یہ ڈنڈا اس کوٹھی میں پرانا پڑا ہوا تھا۔
”کیا اس ڈنڈے سے کام بن جائے گا؟“ ریزی نے سوال کیا۔

”ذرا ہٹ لگا نامشکل ہوگا لیکن گزارہ ہو جائے گا..... اور وکٹیں؟“ تقو نے پوچھا۔

”یار کیا مصیبت ڈال رہے ہو۔“ چائے پیتے ہوئے خاں صاحب بولے۔

”دیکھیں تو سہی کیا مزا آتا ہے۔“ تقو نے کہا۔

اس کے بعد تقو اور ریزی نے جنگلی سرکنڈوں میں سے خشک ڈنڈے تلاش کر کے برابر کی وکٹیں بنا لیں۔ لاکھ

بازار بھیج کر گیند منگوا یا۔ یہاں بازار میں کھیلوں کی دوکان نہ تھی۔ پتہ نہیں لالو کس دکاندار سے ٹینس کا ایک بال لے آیا۔

کھیل کا بنیادی سامان تیار ہو گیا۔ ہم سب بیڈمنٹن، سوئمنگ، کیرم بورڈ، لوڈو کے شوقین تھے۔ فنانٹ تیار ہو

گئے۔ طے یہ پایا کہ چونکہ زیادہ کھلاڑی موجود نہیں اس لیے ہر کھلاڑی اپنی اپنی رز بنائے گا اور جو سب سے زیادہ رز بنائے

وہی جیت گیا۔

وکٹیں سیڑھیوں کی طرف فٹ کی گئیں اور باؤلر پھانک کی طرف سے حملہ آور ہونے لگا۔ ہر کھلاڑی دو دو اوور

گیند دینے کا مجاز تھا۔ ان بارہ گیندوں میں اُس کی پوری کوشش ہوتی کہ ٹینس میں آؤٹ ہو جائے۔ نلکے والے حوض سے

آگے چھکا شمار ہوتا۔ اس کھیل میں ہر کھلاڑی کافی روندی مارتا۔ اپیلیں ہوتیں اور ہر کھلاڑی چونکہ بزم خود ریفری بھی تھا

کھیل میں بلا ٹھکرا رہتا۔

میرے کزن معظم سب سے کمزور کھلاڑی تھے۔ وہ دو چار گیندوں میں آؤٹ ہونا شروع ہو جاتے لیکن اُن کا

آرٹ یہ تھا کہ پورے دو اوور کھیل کر نکلتے۔ کبھی کبھی میری کیلی محمودہ منظور آ جاتی۔ اس کا نام چھوٹے ہی تقو نے ”بتو“ رکھ

دیا تھا اور کبھی کبھی وہ نام رکھنے کی وجہ اس مصرع سے دیتا ’بتو دالک چیتے ورگا۔‘

بتو متحمل مزاج تھی، جلدی آؤٹ ہونے پر اُس نے کبھی برا منایا نہ کسی کے بتو پکارنے ہی کا..... ہم سب کھیٹے

کے شوقین تھے۔ ہمیں جیتنے یا ہارنے سے کوئی سروکار نہ تھا۔

اس کھیل کے علاوہ اشتیاق نے ایک اور کھیل بھی ہمیں سکھایا۔ یہ ایک طرح سے چور سپاہی کا کھیل تھا۔ رات

کے اندھیرے میں سب چھپ جاتے اور ایک کھلاڑی سپاہی بن کر تلاش میں نکلتا۔ جب اُسے کوئی دوسرا کھلاڑی نظر آتا۔

وہ کہتا ”Smy کسی۔“ یعنی (It is me) اور کھونے والا کھلاڑی پھر سپاہی بن جاتا۔ کھیل کھلاڑی میں مشغول سب

صحت سے ایک دوسرے کے قریب آتے چلے گئے۔

ہم سے پچھڑ کر جب تقو واپس ”کا کول“ جاتا تو اُس کے خط مجھے، ریزی اور معظم کو آتے رہتے۔ یہاں بھی صاحب نے میں کبھی کسرنہ اٹھا رکھی گئی۔ خاں صاحب البتہ محتاط رہتے۔ وہ اگر دو قدم آگے بڑھتے تو تین قدم پیچھے بھی اسی وقت سے لوٹ جاتے۔ گھر میں کوئی بڑا بوڑھا نہ تھا جو جھڑکتا، ٹوکتا لیکن ابھی اقدار زندہ تھیں۔ ان دیکھے والدین کی ناراضگی کا خوف بھی اور معاشرے سے ڈر بھی نئی پود کو بے راہ روی سے روکے رکھتا۔

اشتیاق کے بعد ”نیلو“ ہمارے گھر کا فرد بن گئی۔ نیلی آنکھوں والی ڈیڑھ دو برس کی بچی ریزی اور مجھے پسند آئی۔ تریاں بھائی اور باجی ضیاء کی بیٹی نیلو کو سائیکل کے ڈنڈے پر بٹھا کر سائیکل سٹینڈ پر اُس کے دو تین جاگیے رکھ کر خاں صاحب کیسٹل پارک آتے۔ ان دنوں لاہور کی سڑکوں پر رش نہ تھا۔ اتنا لمبا سفر خاں صاحب بڑی سہولت سے طے کر لیتے تھے۔ یہاں پر حادثے کا خوف دامن گیر نہ ہوتا۔ ٹریفک مہربان تھی۔ سڑکیں کشادہ اور ویران۔

نیو سائیکل کی سیر پر خوش ہوتی اور خاں صاحب اُسے خوش دیکھ کر نہال ہوتے۔ ابھی خاندان مٹھی بند ایک صاحب کی محبت میں سرشار لوگوں کا مجموعہ تھا۔ مزنگ روڈ والے شقو پر تو اعتماد کرتے ہی تھے، رفتہ رفتہ انہیں ہم پر بھی اعتبار آنا شروع ہوا۔

اس چھوٹی سی بچی میں خاں صاحب کی جان تھی۔ ریزی میں محبت کرنے والی روح تھی۔ وہ نیلو کو دودھ پلا کر دیکھتی۔ نیلو کے آتے ہی اس اُجاز، ڈھنڈار پرانی بوسیدہ کونھی میں جان پڑ جاتی۔ جس چھوٹے سے چوپچہ نما حوض کا ذکر میں کرتی ہوں یہ نیلو اور میری بہشت تھی۔

گرمیوں کا موسم تھا۔ میں نیلو کو نلکے کے نیچے کھڑا کر دیتی اور ہتھی اوپر نیچے کرنے لگتی۔ نیلو پانی کی دھارتلے کھڑکی ہو جاتی۔ جونہی ٹھنڈا پانی پڑتا وہ ہلکی سی سبکی بھر کر تھوڑا سا لرزتی۔ لیکن اگر پانی بند کر دیتے تو وہ رونے لگتی۔ وہ اتنی دیر تک تھکتی رہتی جب تک اُس کا جسم ٹھنڈا برف نہ ہو جاتا۔ اُس کی آنکھوں میں دھند سی چھا جاتی اور اُس کے ہونٹ کاٹھننے لگتے۔ پھر میں اُسے تو لیے میں پلیٹ کر اندر لے جاتی۔

نیلو کے آنے سے ہم لوگ جیسے ”گھر گھر“ کھینے لگتے۔ نیلو کو میرے سپرد کر کے خاں صاحب نے کبھی کوئی حدیث نہ دیں۔ میں نے کبھی اُن سے نہ پوچھا کہ وہ کیا کھائے گی؟ کیا پئے گی؟ کب جاگے گی؟ بس اس نعلی گھر داری کی آواز سن کر خاموشی تھی۔

ایک روز گہری شام کے وقت کالا پھانگ کھلا۔ اقبال بھائی اندر آئے۔ یہ میری اُن سے پہلی ملاقات تھی۔ دُبلا پتلا کسرتی جسم، خاں صاحب جیسا چہرہ، لب و لہجے میں شائستگی۔ بڑی لجاجت سے آگے بڑھے۔

”نیلو..... کیا نیلو یہاں ہے؟“

”جی آئی تھی لیکن شقو کے ساتھ چلی گئی۔“

”کتنی دیر ہوئی؟“ بھالو بھائی نے سوال کیا۔

”یہی کوئی آدھا گھنٹہ۔“

تشویش اُن کے چہرے پر تھی لیکن اُن کا لب و لہجہ اس تشویش کو ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔
 ”شکریہ۔“

وہ لوٹنے لگے۔

”جی آپ بیٹھیں گے نہیں۔“

”میں ضرور بیٹھ جاتا لیکن باجی ذرا پریشان تھیں۔“

میں تھوڑی سی احساسِ جرم میں چلی گئی اور اصرار نہ کر سکی۔ کالی سائیکل پر گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے یوں احساس ہوا گویا خاں صاحب واپس جا رہے ہوں۔

میں اس سال کے دوران کبھی کبھی ملتان چلی جاتی۔ کبھی امی ہمارے ہاں دورے پر آ جاتیں۔ ریزی بھائی کا چھوڑ چکے تھے۔ وہ اور معظم کبھی مکتبہ جدید چلے جاتے۔ کبھی شفق سے ملنے مزنگ روڈ کا پھیرا لگاتے۔ کبھی انارکلی اور مال کی سیر کرتے۔ ریزی بھائی اپنی پینٹنگ سے غافل نہیں تھے۔ کوئی ایک آدھ سرورق بنانے کو مل جاتا تو بروقت اسے ڈالتے۔

آسان سے وقت تھے۔ ابھی بیرون زمانے نے تیزی اختیار نہیں کی تھی لیکن خاں صاحب نے اپنے اندر تھکاوٹ اور تھکاوٹ کے باعث بڑی مشکلات ایجاد کر رکھی تھیں۔ نہ انہیں بھاگنے اور گریز کرنے پر اختیار تھا۔ نہ وہ بار بار خطوں کے ذریعے ہی ملاقاتوں کا سہارا لے کر مجھ سے ہر بار از سر نو رابطہ قائم کرنے سے اپنے آپ کو روک سکتے تھے۔

آپ کو جو صوفی ”رنگ رلیاں“ افسانے میں نظر آتا ہے اُس صوفی کی ابتداء یہاں ہی سے ہوئی تھی۔ مٹھ میں رہنے والے بھگت، کسی ڈیرے پر چپ تپ کرنے والا راہب ایسی ہی منہ بند کیفیت سے گزرتا ہے۔ صوفی بھی عشق کرتے ہیں۔ اُس کی ضروریات بھی اُسے ستاتی ہیں۔ انسان ہونے کے ناطے اُس کے اندر بھی دنیاوی آسائش کے خواب اُگڑائیاں لیتے ہیں۔

اگر صوفی ساتھ ساتھ شریعت کا بھی پابند ہو تو وہ اطلس و کنو اب کے فرشوں پر تکیہ لگا کر بیٹھنے کے خواب بھی دیکھتے ہیں۔ میوے اُس پر جھکے چلے آتے ہیں۔ وہ ایسی حوروں کے خواب دیکھتا ہے جن کو نہ انسان نے ہاتھ لگایا ہو نہ کسی جن نے..... صوفی، راہب، بھگت اپنی جسمانی اور روحانی خواہشات سے بڑے سلیقے سے ان خواہشات کو پورا کرنے کے بجائے جہادِ نفس میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

ان ہی دنوں میں خاں صاحب نے بھی جہادِ نفس کا طریقہ سیکھ لیا تھا۔ مگر غالباً فرار کا تھا۔ جس مقام پر اپنی ذمہ داریوں کی حفاظت کے قابل نہ رہتی، وہ اس مقام پر بھونڈی جنگ کرنے کے بجائے وہاں سے بھاگ جانے میں ہی مصلحت سمجھتے۔

ایک صوفی کا واقعہ بہت بعد میں خاں صاحب اپنے چاہنے والوں کو بتایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک صوفی بادشاہ اپنے مرید کے ساتھ سفر کر رہے تھے۔ راستے میں ایک ندی آ گئی۔ پاس پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں ایک صاحبِ جمال جو اس سال، طرحدار خاتون ندی کنارے کھڑی ہے۔ صوفی کو دیکھ کر بولی..... ”اے اللہ کے بندے! رات آیا چاہتی ہے مجھے پار پہنچانا ہے لیکن پانی کا بہاؤ تیز ہے۔ کیا تو مجھے پار اترنے میں مدد دے سکتا ہے؟“

مرید اس وقت اپنے پانچ اٹھانے میں مشغول تھا۔ صوفی نے عورت سے یہ سوال نہ کیا کہ وہ کہاں سے آرہی ہے۔ کس وقت پار جانا ضروری ہے۔ چپ چاپ اُسے کندھوں پر اٹھایا اور پار لے گیا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر محبت نے کمال بے اعتنائی سے اپنا راستہ لیا۔

کچھ دیر تو مرید نے اپنے اندر کندھ بد کو برداشت کیا۔ پھر قدرے حیرانی اور خفگی سے بولا۔

”یوں عورت کو کندھے پر اٹھا کر دریا پار کرانا باباجی..... کیا یہ گناہ نہیں؟“

باباجی ہنسے اور محبت سے بولے ”واہ بھائی! میں نے عورت کو دریا پار کرتے ہی اُسے اپنے وجود سے اُتار دیا۔ تم

بھی کبھی اسی میں مشغول ہو۔“

یہی جہادِ نفس کی پختگی ہے۔ اس مقام تک کوئی کوئی پہنچ پاتا ہے۔ خاں صاحب سلیقے سے زندگی گزارنے کا گرتو سمجھ گئے تھے لیکن کچے مرید کی طرح اس پر کار بند ہونے کی صلاحیت اُن میں نہ تھی۔ وہ تو ابھی زندگی کے چھوٹے چھوٹے پیمانے کے چھپے بھاگنے والے تھے۔ اُنہیں ریزی اور معظم نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ زوہبی صاحب کے چکر تھے۔ اثر صاحب اور شفقت باباجی کو اُن کی محبت پر تکیہ تھا۔ اتنی ساری کھینچا تانی میں وہ سکون قلب کا نسخہ کیسے لکھ سکتے تھے۔

معظم میرے ماموں زاد بھائی پتہ نہیں کیسے ہمارے گھر منتقل ہو گئے تھے؟ ماموں فضل نے اُنہیں بی اے کرنے کے لیے میرے پاس بھیجا تھا لیکن معظم دنیا جہاں کی کتابیں پڑھتے، کافی ہاؤس میں ادیبوں کی سنگت میں بحث مباحثہ کرتے لیکن کورس کی کسی کتاب کو ہاتھ نہ لگاتے۔ ریزی اور مجھ سے زیادہ معظم خاں صاحب کی زندگی میں دخیل ہو گئے۔

دیال سنگھ کالج میں نوکری کر کے جب خاں صاحب گھر لوٹتے تو معظم کو 1- مزنگ روڈ پر منتظر پاتے اور پھر گھر کی تیسری منزل پر شتو جی اور معظم ہاتوں کے غبارے اُڑایا کرتے۔ جس قدر معظم اردو ادب کا رسیا تھا اُسی قدر ریزی صاحبان روایت سے دُور تھا۔ وہ کیونوس رنگ اور پراسپیکٹو (Prospective) کے چکروں سے کبھی آزاو نہ ہوا۔

ابھی ہم کالج میں تھے۔ جب خاں صاحب کی دوستی غلام محی الدین اثر صاحب کے ساتھ طے ہوئی تھی لیکن ایم اے کے دوران ہی ایک اور چکر چلا۔ سال کے بعد نئی کلاس نے داخلہ لیا۔ ان میں باباجی شفقت تھیں۔ اُن کا لب و لہجہ شستہ تھا۔ نصابی قابلیت قابلِ مَحَدُوش تھی۔

پروفیسروں کی عادت ہے وہ ہر نئی کلاس میں اپنے منظورِ نظر چن لیا کرتے ہیں۔ ہماری کلاس میں سے اثر صاحب نے میرا انتخاب کیا اور نئی لفٹھ ایئر کی کلاس میں اُنہیں شفقت ایسی نظر آئیں جو قابلِ توجہ تھیں۔

جب چھوٹی اڑانوں سے خاں صاحب کی سیری نہ ہوئی اور وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ لاہور سے کہیں اتنی دور نکل جائے جہاں تک اُن کے اندرونی تضاد کی رسائی نہ ہو۔ ان دنوں خاں صاحب روم جانے کے لیے پرتول رہے تھے۔ ایم اے

کے کالج میں ان دنوں سید عابد علی عابد پرنسپل تھے۔ جب روم یونیورسٹی سے ملحقہ ادارے (ISMEO) میں خاں صاحب کو اردو پڑھانے کا جاب مل گیا تو وہ چھٹی کے سلسلے میں سید عابد علی عابد کے پاس پہنچے۔ ہتیر سائٹریالی کا Appoint لیٹر ہاتھ میں لیا اور اسے سید صاحب کی میز پر رکھ کر بولے ”روم سے یہ خط ملا لیکن اب چھٹی کا مسئلہ۔“

ہمیشہ کی طرح وہ تضاد کا شکار تھے۔ روم میں نوکری بھی کرنا چاہتے تھے اور دیال سنگھ کالج کو چھوڑنا اُنہیں قابل

قبول نہ تھا۔

سید عابد علی عابد نے خط دیکھا۔

”بھائی یہ تو اطالوی میں ہے۔“

”اس کے معنی یہی ہیں کہ اگر میں بروقت پہنچ گیا تو نوکری مل جائے گی۔“

”سوچ لو یہ کوئی سرکاری خط معلوم نہیں ہوتا۔“

”بس آپ مہربانی فرمادیں، باقی اللہ پر چھوڑ دیں۔“

عابد صاحب نے اجازت مرحمت فرمائی اور خاں صاحب نے روم کا رخصت سفر باندھ لیا لیکن 1956ء میں
 اکیاون اُن کے لیے بڑے طوفانی سال تھے۔ اب اُن کی ڈائریاں اور نوٹس دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ وہ کس کرب سے گزر
 رہے تھے۔ ذرا دیکھیے۔

اُس نے آگے بڑھ کر ہسپتال کے پتروں سے منڈھے دروازے پر دستک دی۔

”کون ہے؟“

اور اندر سے آنے والی آواز اس کے سینے میں ٹھنڈے کی طرح لگی۔ وہ چہوترے سے گلہ میں کودا اور شمال کی
 جانب بھاگ گیا۔ گلہ کا ایک کتا عادتاً اس کے پیچھے بھاگا اور پھر کھبے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ چاند ایک کالی بدلی سے نگر
 کر دوسری میں چھپ گیا۔ سرس کے پتوں سے بارش کی کچھ بوندیں جھنڑ کر اس کی مانگ میں ٹھنڈی سلائی کی طرح پھر گئیں۔
 اس نے اپنی رفتار مدہم کر لی لیکن پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

کسی نے ضرور دروازہ کھول کر ایک بار پھر پوچھا تھا..... ”کون ہے؟“ اس کی چھاتی نے دھوں کر کے خشک
 کھانسی کی آواز نکالی اور وہ پھر تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔

ٹین کی چھت پر بارش کی موٹی موٹی بوندیں ٹپا ٹپا برس رہی تھیں اور پلیٹ فارم کی روشنی میں ریل کی سیاہ پٹی
 دھل رہی تھی۔ لوہے کے بیچ پر سا گوان کا مونہا تختہ لگا تھا اور فضا میں نمی کی وجہ سے اس پر جما ہوا میل لسلسا ہو گیا تھا۔ نیا سال
 طلوع ہونے میں پورے دو دن باقی تھے اور سا گوان کے تختے میں لگے ہوئے آہنی کا پلے بڑے ٹھنڈے تھے۔ اس نے
 اپنے کوٹ کے کالر اٹھا کر دونوں کان ڈھانپ لیے۔ کالروں کے نیچے کپڑے کا اصل رنگ نکل آیا۔ ایک بارہ ماشیا ہتھوڑی
 کے دستے میں ربڑ کی واشریں فٹ کرتا اندر آیا۔ اس نے کوٹ کا اصل رنگ دیکھے بغیر کہا۔ ”رات یہاں کاٹو گے؟“

”ہاں۔“

”کہاں جانا ہے؟“

”لاہور۔“

”لیکن یہاں تو بہت سردی ہے۔ تمہارے پاس اوڑھنے کو کچھ نہیں؟“

”نہیں۔“

”اچھا۔“

اور ”اچھا“ اس کے سر پر دست شفقت بن کر پھر گیا۔ بارہ ماشیا مسافر خانے سے باہر نکل گیا اور پلیٹ فارم کی

سورج کی پیلی روشنی میں پیتل کے پترے چمک رہے تھے۔ دروازہ کھلا تھا۔

اور چوکھٹ کے ایک طرف ”میلارام داروغہ صفائی“ کا بورڈ لٹک رہا تھا۔

اب ڈی کوثر افضل کے دفتر میں موجود ہے اور اس سے قطعہ زمین کی تعریفوں کے پل باندھ رہا ہے۔ افضل کچھ
کھڑکھڑاسا اس کی باتوں پر توجہ دے رہا ہے۔ اتنے میں پرویز دفتر میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی ایک نظر ڈی کوثر پر پڑتی
ہے۔ وہ بھائی سے کہتا ہے کہ وہ میں سکون کی چابی تو نیچے ہی بھول آیا۔ وہ چابی لینے جاتا ہے اور افضل کوثر سے پھر معذرت
مانتا ہے۔ کوثر بولی خواہتا اس کے دفتر سے نکلتا ہے۔ سیزھیوں پر اس کی مٹھ بھینٹ پرویز سے ہوتی ہے جو چابی لے کر واپس
آتا ہے۔ پرویز کوثر کو روک کر پوچھتا ہے ”آپ کا نام الہ داد تو نہیں؟“ کوثر کہتا ہے ”اللہ دتہ۔“

پرویز کہتا ہے ”اوشاید!“

اللہ دتہ کہتا ہے ”لیکن اب میں اے ڈی کوثر کہلاتا ہوں۔“

پرویز کہتا ہے ”ہم آپ کو آٹھویں میں پڑھتے رہے ہیں۔“ مکار کوثر کہتا ہے۔ ”اوہ ٹھیک، خوب یاد آیا۔“

پرویز زمین کی کہتا ہے وہ آسمان کی بتاتا ہے لیکن دونوں ایک دوسرے سے تفصیلی حال پوچھتے ہیں۔ معلوم ہوتا
ہے کہ ڈی کوثر پر اپنی ڈیلر ہے۔ پرویز اپنے بارے میں بھی بتاتا ہے اور کچھ کرنے اور تجارت میں بین الاقوامی شہرت
کے لئے کاڈ کر کرتا ہے۔

پرویز اسے اپنا پتہ دیتا ہے اور کوثر اس خوبی سے ملاتا ہے کہ مزاج کے ساتھ ساتھ پرویز کے دل پر یہ بات بھی رقم
کرتی ہے کہ یہ اس کا پرانا کلاس فیلو ہے۔

پھر ملنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چل دیتا ہے۔

Describe دے کر بتاتے ہیں کہ کوثر ایک کنڑی میں ایک چھوٹے سے مکان میں پہنچ کر نجیا کو بتاتا ہے کہ
تسے تو بے بھائی کو گیا تھا لیکن چھوٹا بھائی شیشے میں خود اترتا چلا آیا۔

تمناؤں کے تیز گام شہدیز کو دوڑاتے ہوئے میں ایک صحرا میں گر کر بے ہوش ہو گیا تو ایک نولے نے مجھے ہوش
سے کر کہا۔

”تو نے پیدل چلنے میں کیوں احتراز کیا؟“ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس نے کہا۔

”اب تجھ سے پیدل بھی نہ چلا جائے گا۔“

ایک مرتبہ میری محبوبہ جنہم میں مجھ سے ملنے آئی تو میں نے کہا۔ ”جانِ تمنا! اس سیاہ خانے میں تم کیوں چلی

اس نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔ ”مجھے کسی نے بتایا تھا کہ دوزخ کے شعلوں نے تمہاری بینائی چھین لی ہے۔ تمہاری بیمار پرسی کو آئی ہوں۔“

آنکھ پھولی کھیلتے ہوئے برآمدے کے بیچ میں نے اُسے بازوؤں میں لے لیا اور کہا ”اب تمہاری ہے“ لیکن غلام گردش ٹس سے مس نہ ہوا اور میری باری یونہی چلتی رہی۔

راولپنڈی

(1951ء)

مہینے کا آخری دن ہے۔ ابھی ابھی راولپنڈی پہنچا ہوں اور اسی ہوٹل میں قیام کر رہا ہوں جہاں دو مہینے گزارے تھے۔ جہاں رات رات جاگ کر سکر پٹ لکھے تھے۔ اخباریں نشان کی تھیں اور دفتر کی فائلوں میں سرکاری قسم کے افسانے کیے تھے۔ شہر وہی ہے، بازار وہی ہے، عمارت وہی لیکن کمرہ اور موسم بدل گیا ہے۔ پنڈی مجھے کبھی بھی اجنبی دلیس نہیں لگتی تھی۔ ہمیشہ یہی محسوس ہوتا رہا کہ میں اس شہر میں پیدا ہوا۔ اسی شہر کے کسی سکول میں پڑھتا رہا۔ یہیں سے بی۔ اے اور پھر چند سال سی۔ ایم۔ اے میں ملازمت کرنے کے بعد فوت ہو گیا۔ اسی شہر کے راستوں پر تھوڑی دیر کو میرا جنازہ اور پھر مجھے بڑے قبرستان کے ایک گوشے میں دفن کر دیا گیا۔ مہد سے لے کر لحد تک زندگی کے سارے ایام میں نے دلیس میں گزارے اور اسی شہر میں بسر کیے۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ میں اپنے ہوٹل سے ریڈیو سٹیشن کو جانے والی سڑک کے علاوہ اور کسی راستے سے واقف نہیں ہوں۔ میرا سارا سامان یہیں تھا۔ پنجاب کے سیلاب کی وجہ سے میں اپنا سب کچھ اٹھا کر لاہور نہ لے جا سکا۔ ٹرنک اور بستر مفتی کے پاس چھوڑ کر ایک اچھی کیس لے کر لاہور چلا گیا۔ آج مفتی نے میرا ٹرنک لا کر دیا۔ میں نے کچھ مجھے ایسے لگا جیسے یہ میرا ٹرنک نہیں۔ اس میں کچھ کپڑے تھے، استعمال شدہ اور میلے۔ ایک کیرہ تھا۔ کافی کا ایک سالمہ تھا۔ دو پنسلیں۔ نشر شدہ ”ڈھول کے پول“ کی چند کاپیاں اور کچھ خطوط۔ میں دیر تک ان خطوں کو پڑھتا رہا اور ابھی نے خطوط خوانی ختم کر کے قلم اٹھایا ہے۔“

(چند خطوط خاں صاحب کے نام)

(سب سے بڑے آفتاب بھائی خاں صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں جو انہوں نے تراڑ کھیل سے لکھا۔)

عزیزم اشفاق سلمہ!

آپ کا پہلا خط بنام اماں جان اور دوسرا میرے نام تشریف لایا۔ دلی مسرت ہوئی۔ حیرت ہے کہ جو خط نے آتے ہی آپ کو پشاور روڈ کے پتے پر لکھا تھا، آپ کو کیوں نہیں ملا! اگر یہ آپ تک پہنچتا تو آپ اس کا تذکرہ ضرور کرتے۔

ہم بفضلِ تعالیٰ سیلاب کی زد میں نہیں آئے۔ کرشن نگر اور راجگڑھ روڈ وغیرہ میں پانی اب تک ہے لیکن اُسے کھینچ کر پانی پینا چاہیے۔ خطرناک نقصان ان دیہات کو پہنچا جو تحصیل شاہدرہ میں دریا کے کنارے آباد تھے۔ افتخار میاں اور ان کے بچے نہیں آئے۔ مری میں آپ کے ساتھ جو راحت میں نے کنگز ہوٹل میں پائی، وہ آپ کے موجودہ ہوٹل میں کھینچ لی گئی۔ جنت کا جھونپڑا جہنم کے محل سے بدرجہا بہتر ہوتا ہے۔ یہ آپ کو گمان محض ہے کہ مری میں مجھے تکلیف ہوئی۔ جنت میں آرام نہ ملتا تو میں اتنا تومند کیونکر ہو جاتا۔ میں تو ہمیشہ یہی کہوں گا کہ مری کی پُر بہار سیر صرف آپ کی بدلت ہوئی۔

(ایک خط جو انہیں بابا محمد خاں نے مری لکھا)

عزیز محترم سلامت رہو! السلام علیکم، مزاج شریف۔

آپ کا خط آیا، حالات سے آگاہی ہوئی۔ یاد آوری کا شکر یہ۔ تاحال مشینری کے متعلق کوئی انفارمیشن نہیں ہے۔ بابا محمد خاں صاحب نے جب اُن کو سعید احمد کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ کا منشا مشینری لگانے کا ہے تو چچا صاحب سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب سعید احمد خاں کو لنڈسٹورج لگا رہے ہیں۔ اُن کو کچھ روپیہ کی ضرورت ہے۔ کیا آپ ہم کو کچھ بھیج سکتے ہیں؟ یہ بات اُنہوں نے بطور پیش بندی کے کی تھی۔ مہاوا محمد خاں اُن سے کچھ روپیہ مانگ لے۔ فیسرین سنواور کریم کے لیے شیشی کی ضرورت ہے۔ سینٹ کی ضرورت ہے۔

اشتیاق میاں بھی آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ افتخار بھائی مع بال بچوں کے لاہور آنے والے ہیں۔ آپ نے کھسے مری کی بابت دریافت فرمایا ہے۔ جو اب عرض ہے کہ ہم کباب سوختہ ہیں ہمیں سردی گرمی سے کیا کام؟

نقطہ محمد خاں

(کاکی کا خط)

محترم اشفاق صاحب، السلام علیکم!

آج عید ہے۔ روایتی نہیں بلکہ اصلی۔ میرے ہاتھوں میں آج سی۔ ایم۔ جی (سول اینڈ ملٹری گزٹ) ہے اور میں نے غور سے اردو ایم۔ اے کا رزلٹ پڑھ رہی ہوں۔ کاش آپ کی طرح مجھے بھی Subtle Thanks ادا کرنے کے وقت آتے تو میں بھی کوئی دس پندرہ برس پرانا واقعہ یاد کر کے اس کی روشنی میں آپ کو مبارکباد دیتی لیکن بہت سچے کے باوجود بھی نہایت معمولی واقعات یاد آ رہے ہیں اس لیے معذور ہوں۔

مجھے یہ بتائیے کہ آپ نے شکر یہ ادا کرنے کے ڈھنگ کس سے سیکھے؟

شیخ سعدی سے؟

یہ آپ کی محنتوں کا ثمر ہے کہ کسی کی دعاؤں کا اعجاز؟ یا پھر کہیں در پردہ آپ نے بھی تو اپنی نئی سائیکل سے امداد کی؟ بہر کیف نتیجہ واقعی قابل رشک ہے۔ دلی مبارکباد قبول کیجیے۔

من و سلویٰ کھلانے کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا ہے کہ پھر..... چلیے صاحب! میں تو اس کا تقاضا کرنے کی نہیں۔ یہ جتنی ہم جماعتوں سے آپ خود نیٹ لیجیے۔ میں تو تھوڑی سی مٹھائی پراکتفا کر لوں گی۔ وہ بھی اگر آپ کھلانا چاہیں تو۔

ماچھیا، امی، پرویز اور معظم کی طرف سے ڈھیروں مبارک باد۔

(عمر کا خط)

اشفاق جی!

مہاجرین پروگرام میں گروپیش (آج کل) لکھنے کے لیے آپ نے دو دن کا وعدہ کیا تھا لیکن مری آ کر نیت خراب ہو گئی ہے اور میں ایک دن اور یہاں ٹھہرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ میری خاطر اسے ایک دن یعنی 4 تاریخ (وار) اور سکرپٹ لکھ دیں گے۔ بے حد مشکور ہوں گا۔ باقی مری آ کر محسوس ہو رہا ہے کہ پھر سے زندہ ہو گیا ہوں۔

(پاس ہونے پر شفقت کا خط مری پہنچا)

شفقی بھیا نمستے! خوشیوں اور مسرتوں میں ڈوبی ہوئی، دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اور شگفتگی اور اطمینان سے ہوئی ننھی سی مبارک کہا قبول ہو۔

گو میں اس قابل تو نہیں کہ آپ کو یہ چند حروف لکھ سکوں کیونکہ میں بھی اسی لاہور کی باسی ہوں جس سے آپ شدید نفرت ہے اور یوں بھی یہ مبارک باسی ہو چکی ہے۔ لیکن بقول غالب کیا نماز قضا نہیں پڑھتے اور وہ قبول نہیں ہوتی۔ اور سب خیریت ہے۔ خدا کرے آپ بخیریت ہوں اور خوش!

اس خط کے نیچے باجی کے انگریزی میں دستخط ہیں "S.Ara"

(منشی نعمت اللہ خاں کا خط)

گر انقدر۔ عالی مرتبہ اشفاق احمد خاں صاحب۔ ہمیشہ ہمیشہ سلامت باشد!

السلام علیکم با مصافحہ کے بعد واضح رائے عالی ہو کہ اس جگہ خیریت ہے اور آپ کی خیریت مدام نیک مضامین ہے۔ آپ نے راولپنڈی آ کر اپنی خیریت سے آگاہ نہیں فرمایا۔ اس لیے مقام شکوہ ہے۔ امید ہے آپ اللہ کریم کے سے خوب ہشاش بشاش ہوں گے۔ آپ جس محبت اور خلوص سے خادم کے ساتھ پیش آتے رہے ہیں، بندہ اس کا احسا پشتوں تک نہ بھلا سکے گا۔ عرض یہ ہے کہ میرا لڑکا عرصہ پانچ سال سے گھر میں بے کار بیٹھا ہے۔ Type کا کام جانتا ہے۔ اگر آپ کے خیال شریف میں اس کے واسطے کوئی آدمی دکھائی دیوے تو تحریر فرمائیں۔ اس کی بے کاری نہایت ہی بُرا ہے۔ قبیل داری میں تو ایک دن بھی بغیر آمدن کے گزارنا مشکل ہے۔ خیر آپ کے خیال مبارک میں کوئی تجویز ہو تو فرمائیں۔ خداوند کریم آپ کو خوش و خرم سلامت رکھے۔ آمین ثم آمین۔

باقی مجھے اپنی صحت کے بارے میں ضرور اطلاع دیں کہ اب کیا حال ہے۔ خدا آپ جیسے لائق فرزند گھر گھر فرمائے۔ خدا کرے آپ دن دو گنی اور رات چو گنی ترقی کریں۔ خوب عیش و عشرت وافر و جلال باقبال زندگی بسر ہو۔ آمین ثم آمین۔

فقط والسلام

تابع دار منشی نعمت اللہ خاں

(اس خط میں خلوص کا لفظ قابل غور ہے)

ایک خط انصار کا ہے۔ اس کے آخر میں لکھا ہے۔

شکو بھیا! یہ خط کسی کو دکھائیے نہیں۔

ایک کونے میں لکھا ہے۔

شکو بھیا! جواب میں ذرا ان باتوں کا ذکر نہ ہو کہیں۔

افتخار بھائی کے خط کے چند جملے (اپنے بیٹے رومیو کا ذکر)

شکو میاں سلامت رہو! عزیز یی تمہاری بطح بہت شرارتی ہو گئی ہے۔ ان دنوں رضیہ کے سکھلانے پر مجھے

کہتا ہے۔ بالکل اپنے چچا ابا یعنی تمہاری تصویر ہے۔ ضد کا یہ عالم ہے کہ مجھے اس کی بات پر تم یاد آ جاتے ہو۔

تصنیف طرح زمین پر لیٹ کر اور منی میں لوٹ کر اپنی ہر بات منواتا ہے لیکن پھر بھی جب میں اُسے غور سے دیکھتا ہوں تو

مجھے غصہ ہوتا ہے کہ ابھی تمہارے جیسی ضد کا بچہ ہمارے خاندان میں پیدا نہیں ہوا۔

اس کی اور تمہاری ضد میں یہی فرض ہے کہ یہ رنگ برنگے غبارے لے کر مان جاتا ہے اور تم دونوں جہان کی

بستی لے کر بھی نہ مانا کرتے تھے۔ اب تو لاہور آ جائے گا۔ تمہیں بھی آنا چاہیے کیونکہ جو جو ظلم بچپن میں تمہارے جیسے

علاقوں پر ہوتے رہے ہیں کہیں اس پر بھی نہ ہوں۔

مضیر معذرت کرتی ہے کہ بچوں کی عداوت کی وجہ سے تمہارے خطوں کا جواب نہ دے سکی۔ شکو میاں! اب چھوڑو

یہ سب نوکری۔ ریڈیو کی نوکری مری کی وجہ سے تھی نہ کہ نوکری کے سبب سے۔ عزیز یی خدا مالک ہے فکر نہ کیا کرو۔ پتہ نہیں

تھیں لکھنے کی طبیعت کب صحت یاب ہوگی۔

اثر کا خط (روسی سگریٹ۔ ریڈیو لیبل کی چائے کا تحفہ ملنے پر)

عزیز من اشفاق!

کل شب کو تمہارا گراں بہا تحفہ ملا۔

اور آج طوفان اور آندھیوں میں لکھی ہوئی چھٹی۔ پرسوں زوبی نے کہیں سے ہاتھ مارا تھا اور حسب دستور

گھٹ سینڈ کے مع بچوں کا نذرانہ عقیدت نکالا تھا۔ سٹوڈیو سے جھومتے جھومتے گھر پہنچے تو جاوید نے پارسل دیا۔ اول شب

بہت بوقت، ریڈیو لیبل کا منہ میں تازہ تازہ لطیف ذائقہ اور انتہائے افلاس کے عالم میں روسی سگریٹ کا ڈبہ۔ ماشاء اللہ، خدا

کے جوری کے نہیں اس کی عظمت کے بھی قائل ہو گئے اور اللہ جانے تمہیں کیسی کیسی دعاہائے دارین دیں۔ تمہاری خوش

حالی سے عقیدہ تھی اب جزو ایمان بن گئی ہے۔

آج تمہارا خط ملا۔ برق و باراں میں لکھا ہوا لیکن میری جان تمہیں یہ کیوں مشتبه لگتا ہے کہ وہ مجھے ملے گا نہیں۔

ایک چھت کو تمہارے لیے دودو یواریں بہت ہوتی ہیں۔ تم نہیں جانتے کہ زندگیوں اس سے بھی مہین سہارے پر مدتوں

تھکتی ہیں۔ چھت تو پھر بھی چھت ہوئی اور بالخصوص جب اس کے نیچے ایک ندی دہکی ہوئی ہو۔ موت کو زندگی سے کوئی

تعلق نہیں۔ زندگی موت کی محبوبہ ہے۔ جس سے موت اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ موت زندگی کی گھات میں نہیں رہتی، زندگی موت

کو تھک کرنے کے لیے دام بچھاتی ہے اور اپنی رنگینیاں دکھا دکھا کر اسے پھانستی ہے۔ پھر بھلا تمہاری چٹھی نہ ملتی تو کیونکر۔

کا کی کو حسب ہدایت تمہارا سلام پہنچا دیا۔ وہ تم سے سخت ناراض ہے۔ کہہ رہی تھی کہ تم بڑے ناخلف بیٹے ہوئے اور یہ کہ اب وہ تمہاری مٹی نہیں رہی۔
آخر تم آکب رہے ہو؟

تمہارا
اثر

اور میں نے ان سارے خطوں کو جمع کر کے اور ان پر ایک آخری نظر ڈال کر Scent Brand Safety Matches کی ایک تیلی سے جلا دیا۔

نہ جانے مجھے کیوں ہمیشہ کوئلبس کی طرح اُن دیکھے براعظموں کی طرف سفر کرنے کا شوق ہے۔ جوانی میں مجھے بڑی آرزو تھی کہ میں ماسکو سے ولاڈی واسٹک تک پورا ایک ہفتہ ٹرین میں گزاروں۔ اُس کے کھیت، شہر، قصبہ، نہریں، پلے سینما سکرین کی طرح کھڑکی سے گزر جائیں اور مجھے بغیر کسی واقعے سے دوچار ہوئے ان کا منظر نامہ مفاہفت ہفتہ آجائے۔

میرا یہ خواب تو پورا نہ ہوسکا لیکن 1975ء میں جب چند ادیبوں کو روس مدعو کیا گیا تو اس گروپ میں میرا نام بھی تھا۔ میرے علاوہ شیخ ایاز صاحب سندھ سے، خاطر غزنوی پشاور سے تھے۔ اس سفر میں مجھے ماسکو سے لینن گراڈ جانے کا اتفاق ہوا اور ہولی ریشیا کی یہ زیارت کسی عجوبہ سے کم نہ تھی۔

ایم اے اردو کے تجربے سے میں نے جو کچھ مال غنیمت اور بوٹی جمع کی اُس کا زیادہ تر تعلق اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق حالات کو سمجھنے کا تھا۔ اب میرے پاس کچھ ایسی یادیں ہیں جن کا تعلق موسموں، ذومعنی باتوں، ابہام بھرے جملوں سے زیادہ نہیں۔ یہ ساری جھوٹی پچی ادھوری باتیں اس لیے بامعنی سمجھتی ہوں کہ شاید اشفاق صاحب کو سمجھنے میں کچھ مدد مل سکے۔

گو کسی شخص کو سمجھنے کے لیے تمام تر تجربے، مشاہدے، تخیل، احساس کے ہمراہ بھی قریب قریب ناممکن ہے۔ اُن کے سارے وجود پر اگر سرج لائٹ بھی پڑتی ہو تو ایسے اندھیرے کو نے کھدرے میں ضرور رہ جاتے ہیں جن میں اس شخص کی کئی خوبیاں، خرابیاں دبکی رہتی ہیں۔

انسان کا پتھر ودھات کے زمانے سے اب تک یوں ارتقائی سفر میں چلتے چلتے آنا غالباً اسی گپت چھپے ہوئے رازوں کی بدولت ہے۔ انسان کا علم اسی لیے ہر مقام پر قلیل رہتا ہے۔ غالباً اسی لیے تمام اعمال کو جانچنے کے لیے نیت سے بڑا کوئی Catalyst نہیں۔ کبھی کبھی نیکی بھی بد نیتی پر محمول ہوتی ہے اور بار بار رابن ہڈ (Robin Hood) جیسے ڈاکو جت کے سر پر کامیابی کا سہرا لگا دیتے ہیں۔

میں نے ایک لمبا وقفہ خاں صاحب کے ساتھ گزارا۔ اُن کو قریب سے دیکھا۔ فاصلے سے مشاہدہ کیا۔ بار بار یوں بھی ہوا کہ مجھے ان کے رویئے، عمل اور سوچ سے اتفاق رائے نہ تھا لیکن ایک بات گورنمنٹ کالج کے اولین دنوں میں

نیت جو کبھی تھی۔ شوقی جو کچھ کرتے ان کے نتائج جو کچھ نکلتے، ان کی نیت صاف آسینے کی طرح آبدار رہتی۔ اسی نیت کی بدولت وہ کسی شخص سے تادیر ناراض رہنے والے شخص نہ تھے۔

رشتے ٹوٹ جانے پر، حیثیتیں بدل جانے پر اپنا اپنا راستہ اور اپنا اپنا منہ لے کر رخصت ہو جانے پر بھی ان کی نیت خراب نہ ہوتی۔ اسی لیے ان سے منافقت کبھی سرزد نہ ہوئی۔ غلطی سرزد ہو جاتی تو بڑی شرمساری سے اعتراف کیے۔ چھائی کر بیٹھے تو سر جھکا کر بھینی سی مسکراہٹ کے ساتھ خوش ہو جاتے۔ اسی لیے ان کی تحریروں میں مبالغہ آمیزی کے مہلے سے کبھی انہوں نے زندگی آراستہ نہ کی۔

نیت کی صفائی کے باوجود جس تضاد کا وہ شکار تھے وہ بدستور قائم تھا۔ چھوٹے چھوٹے سفر، نوکریاں جب تشریف لے کر گشت نہ ہوئیں تو انہوں نے روم جانے کا ارادہ کر لیا۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے غالباً سکھ کا سانس لیا لیکن آزادی کا سانس ہی قیمت ادا کر کے ملتی ہے۔ کوئی قوم یا کوئی فرد کبھی بھی یہ قیمت ادا کیے بغیر آزاد نہیں ہو سکا۔

انہیں غالباً اس سفر میں مجھے خط نہیں لکھنا چاہیے تھے لیکن روم سے ان کے خط آتے رہے اور پاکستان میں جو نیت خرابی تھا اب قدرے غیر محتاط ہو گیا۔ ایک Defense mechanism ہمیشہ کی طرح ساتھ تھا۔ وہ بیماری اور صحت کا بار بار ذکر کرتے۔ مجھے علم تھا کہ وہ دلا زاری کو گناہ سمجھتے ہیں کیونکہ ان کا مسلک غالباً محبت تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ خدا کا سب سے بڑا روپ ہے۔

اشفاق صاحب نے جب اردو بورڈ میں سروس کی تو یہاں کئی ماتحتوں کو ڈانٹا، برا بھلا کہا، لیکن یقین جانیے یہ سب کچھ ان کے تحت اپنی روزی حلال کرنے کے تحت کیا ہوگا۔ انہوں نے کبھی کسی کی اے سی آ خراب نہ کی۔ ان کے جانے کے بعد یہ چلا کہ بورڈ کے کچھ کارندوں کی وہ باقاعدگی سے مالی مدد بھی کرتے تھے لیکن اس کا ذکر کبھی کبھی انہوں نے نہیں کیا۔

گھر پر ان کا رویہ ملازموں کے ساتھ ایسا تھا کہ جو ایک بار آ گیا وہ پھر ان کی زندگی میں انہیں چھوڑ کر نہیں گیا۔ ان کے بچے بڑھتی لیکن سوال جواب کی نوبت کبھی نہ آتی۔ جام، قصائی، دودھ والا، سبزی فروش ابھی تک چلے آتے ہیں اور ان کے بچے بڑھتے ہیں جیسے ان کا کوئی اپنا انہیں چھوڑ کر چلا گیا ہو۔

ان کے برعکس مجھے دوسروں کی دنیا سدھارنے کا اتنا شوق ہے۔ دوسروں کو ٹھیک کرنے کا ایسا چسکا ہے کہ اپنے لیے کبھی کبھی کیے بغیر میں مجبور لوگوں کو مشورے دیئے چلی جاتی ہوں۔ میری نیت ہوتی ہے کہ لوگ مجھے سراہیں، میری تعریف کریں اور میری دانش کے قائل ہوں۔ مجھے خاں صاحب سے ایک گلہ ہے جو وقت کے ساتھ اب بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جہاں انہوں نے پڑھنے لکھنے میں میری مدد کی۔ میری تربیت میں اتنی تگ و دو کی وہاں مجھ سے ایک راز چھپا گئے کہ ہر سال ہر سال نیت کے قطب نما کو کیسے سیدھا رکھا جاتا ہے۔

اتنی بات مجھ پر عیاں ہو گئی ہے کہ نیت کی صفائی سے ہی ان میں محبت کا چشمہ اندر ہی اندر بننے لگا تھا۔ وہ اس نیت کا تو اعلان کرتے نہ اس کا پرچار ہی کرتے۔ ان کا رابطہ اپنے چاہنے والوں کے ساتھ بڑی خاموشی سے پروان چڑھتا رہتا ہے۔ ان کے چلے جانے کے بعد مجھ پر یہ بھید کھلا کہ ان کے قارئین، ناظرین، مداحین کی چاہت بھی کسی طور ان

سے وقت کے ساتھ کم نہیں ہوئی۔

محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کسی عمل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اچھائی برائی، کمی بیشی، اونچ نیچ محبت کے سامنے یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ محبت کرنے والا محبوب کی خوبیاں خرابیاں دیکھ نہیں پاتا بلکہ محبوب کی خرابیوں کو اپنی کج ادائیگیوں کی طرح نظر کر لیتا ہے۔ ڈیروں پر اسی محبت کا مظہر نظر آتا ہے اور غالباً اسی محبت کی تلاش خلق کو بابوں کے قریب لے جاتی رہی۔

مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگ محبت کے اہل نہیں ہوتے۔ انہیں اپنی ذہانت پر اس قدر مان ہوتا ہے کہ وہ دوسروں میں کیڑے نکال کر، کسی اور کا قد چھوٹا کر کے، کسی دوسرے کی خوبیوں میں خرابی کا پہلو نکال کر اپنی عظمت کی کلا جگاتے ہیں۔ ان میں یہ نہیں کہہ رہی کہ خاں صاحب فرشتہ تھے۔ ان میں انسان ہونے کے ناطے خوبی اور خرابی کے دریا ساتھ ساتھ بہتے ہیں۔ ان میں بھی حب و جاہ کی طلب ہوگی لیکن ان کے چاہنے والوں کی توجہ کبھی ادھر نہیں گئی۔ وہ کبھی ان کی بشریت دھیان نہ دے پائے اور انہیں ایک بہت بڑا آدمی، برگزیدہ صوفی اور ارمول ادیب سمجھتے رہے۔

لیکن سوسائٹی میں کچھ نکتہ چینی قسم کے لوگ رہتے ہیں جو مجبوری طریقہ نہیں اپنا سکتے اور پکڑ پکڑ کر، سینٹ سینٹ کے خاں صاحب کی غلطیاں نکالنے کے درپے رہتے ہیں۔ دونوں قسم کے لوگوں میں صرف روینے کا فرق ہے۔ مہربان لوگوں کا رویہ ماں کی طرح ستر پوشی کا ہے اور عیب ڈھونڈنے والے اپنے سچ پر اپنی ذہانت پر اعتماد کرتے ہیں لیکن یہ بہت بھاری باتیں ہیں۔ 24- ایس کینال پارک میں نہ مجھ میں یہ جاننے کی صلاحیت تھی۔ نہ اشفاق صاحب کسی ایسے مقام پر پہنچنے کے ان کے متعلق اندازے لگا سکیں۔ ابھی زندگی کو سمجھنے کے لیے نہ فلسفے کی ضرورت تھی نہ روحانیت کی، سب کچھ دن رات کے چکر میں مجبوس چل رہا تھا۔

اتنی بات ضرور تھی کہ خاں صاحب جس فرار کی راہ پر جاتے جس شہر میں پناہ لیتے وہاں سے خطوں کا سلسلہ جاری رہتا۔ افسوس جو خط میں نے انہیں تحریر کیے، وہ اس لیے میں نے نذر آتش کیے کہ میں خوف کا پرندہ ہوں۔ مجھے تالی مارا جاسکتا ہے۔



خواب بیدار لوگوں کی زندگی

14- ایس کینال پارک

اولاد اپنے ماں باپ کی محبت پر اس درجہ تکیہ کرتی ہے کہ اُسے کبھی علم نہیں ہو سکتا کہ وہ ماں باپ کی آزادی میں کس قدر رختہ اور اُن کے لیے کیسی سردردی کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ پرویز بھائی اور میرا بھی یہی حال تھا۔ ہم کینال پارک میں اپنی آنند کی کمفر ٹیبل زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہمارے پاس زینب جیسی جاٹا اور لا لوجیسا سعادت مند ملازم تھا لیکن بھرتہ والدہ اندر ہی اندر ہمارے لیے پریشان رہا کرتی تھیں۔ میری شادی نہ ہو چکتی تھی۔ ریزی بھائی کا روزگار ڈھب کا نہ تھا۔ مجھے ساتھ ملتان لے جاتیں تو وہاں اور مشکل پیش آتی۔ اُن دنوں افسران بالا ابھی فرعون صفت نہ ہوئے تھے۔ امی بھرتہ سرکاری میٹنگوں میں ہائی اتھارٹی افسران سے رہتا۔ وہ بھی امی سے بطریق احسن مہربانی سے پیش آتے۔

ڈاکٹر احمد خاں جو ملتان کی سرکاری زمینوں کے کرتا دھرتا تھے اور ڈاکٹر طوسی جو سرکاری ہسپتال کے انچارج تھے، ان کی چھوٹی بہن ممتاز طوسی میری والدہ کی ماتحت تھیں۔ جب کبھی میں ملتان جاتی ان دونوں ڈاکٹر صاحبان سے ملاقات ہو جاتی تھی مشکل یہ تھی کہ امی کو سکولوں کے معائنے کے لیے سارے ضلع میں دورے کرنے پڑتے۔ پاکستان بننے کے بعد بھی یہی ادارے اپنے طور پر سنبھلے نہ تھے۔ مجھے وہ ساتھ لے کر ریٹ ہاؤس میں جانا نہ چاہتی تھیں۔ اس لیے ملتان سے مجھے بلا ہو لوٹا دیا جاتا جہاں کم از کم میرا بھائی تو ہمہ وقت میرے پاس رہتا تھا۔

لیکن پھر نہ جانے کیوں ہمیں 24- ایس کینال پارک بھی چھوڑنا پڑا۔ پتہ نہیں کرائے کا مسئلہ تھا یا اس کوٹھی کے مالک کو خود اس رہائش گاہ کی ضرورت تھی۔ بہر کیف ہم نے بوریا بستر باندھا اور اس گھر کو خیر باد کہہ کر 14- ایس کینال پارک میں جا کر بسرا کیا۔

یہ نسبتاً نئی کوٹھی تھی۔ اگر پبل سے اتر کر سیدھے نہر کنارے چلتے جائیں تو پہلے موڑ پر بائیں جانب ایک چکی سڑک ہے۔ یہ پارک کی طرف مڑتی ہے۔ یہ گھومتی ہوئی سڑک اندر کی طرف چلی جاتی ہے۔ یہیں 14 ایس واقع تھی۔ کوٹھی کا بائیں حصہ ماری تحویل میں دے دیا گیا۔ پتہ نہیں مالک مکان اوپر کی منزل پر رہتے تھے یادائیں حصے میں۔ ان سے میل ملاقات نہ تھی۔ ریزی کرایہ ادا کر دیتا، وہ لے لیتے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ریزی ان دنوں بیکار تھا۔ کرائے کا بوجھ بھی امی کو برداشت

کرنا پڑتا۔ 14- ایس کینال پارک میں ایک ہمارا گھر، ایک ملتان میں اُن کی دفتر سے پیچھے رہائش گاہ۔ تیسرا وہاں باؤسوں میں بخشیش کا سلسلہ۔ امی نہ جانے کس طرح گزارہ چلا رہی تھیں۔

ڈاکٹر محمد خاں کی مہربانی تھی۔ کچھ امی کے اندران کا آبائی خون جوش مارتا ہوگا۔ انہیں زمینوں کا خبط ہو گیا۔ اب وہ اس بات کے درپے تھیں کہ ایسی چودھرائی بن جائیں جس کو پچھری میں گرسی ملا کرتی ہے۔ اسی الاٹمنٹ کے پختہ میں وہ دن رات مگن رہتیں۔ بالآخر انہوں نے 23 مربع الاٹ کروالیے جن میں سے چھ مربع تو اس قدر پیچیدہ کیے گئے تھے کہ یہ اُن کی زندگی میں اُن کے نام نہ ہو سکے اور انہیں بار بار لاہور میں بورڈ آف ریونیو کے دفتر جانا پڑتا۔ شہر کی نوکری بھی چھوڑ دیتیں اگر مس اقبال ملک ان کو سختی سے منع نہ کرتیں اور ان کا استعفیٰ اپنے ہاتھوں نہ پھاڑ دیتیں۔ آپ کی لیدی میٹیکلیکن سے میری والدہ کے ساتھ رہی تھیں۔ ان دنوں وہ ملتان کے ڈگری کالج کی پرنسپل تھیں اور امی ان ہی کے پاس ٹھہرا کرتی تھیں۔

امی کے جو حالات ملتان میں تھے، ہم ان میں کم ہی دلچسپی لیتے تھے۔ کینال پارک کی کوٹھی ہم دونوں کے کافی تھی لیکن 24- ایس کینال پارک کی طرح کشادہ نہ تھی۔ لان میں سے گزر کر برآمدہ آتا پھر ایک بڑا کمرہ تھا جسے دونوں نے بیڈروم، لیونگ روم بلکہ سب کچھ بنا رکھا تھا۔ باقی دو کمرے استعمال میں نہ تھے۔ ہماری خالہ فیروزہ جو شوخیوں میں ہیڈ مسٹریس تھیں، چھٹیوں میں اور ویسے بھی وقتاً فوقتاً ہمارے پاس آ جاتی تھیں۔ اسی طرح میری سہیلی محمودہ منظور بھی کبھار آ جاتی۔

اس گھر سے وابستہ دو واقعے مجھے ابھی تک اچنبھے میں ڈال دیتے تھے۔ مزنگ روڈ والوں میں پینے نہیں کیسی کھٹی مچی ہوئی تھی۔ جب سے تقو اور نیلو ہمارے گھر آنے جانے لگے تھے، کچھ دوئیں شاید اس شادی کے حق میں ہو گئی ہوں۔ بہر کیف وہاں کیا ہوتا تھا اور کیونکر ہوتا تھا اس کی مجھے واضح اطلاع نہ تھی۔

گرمی کے دن تھے۔ ہماری چار پائیاں باہر سڑک پر پھینچی تھیں۔ کچھ دیر پہلے سب اٹھ کر اندر چلے گئے تھے۔ میں چار پائیاں اٹھا کر بائیں ہاتھ کی گلی میں رکھ رہی تھی کہ باباجی محمد خاں آ گئے۔ میں حیران رہ گئی۔ چار پائی ہاتھ سے رکھ کر اُن کا سواگت کیا۔ اچھوت کنیا کو آنکٹے بھانپنے تول کنڈری پر پورا تولنے کے لیے باباجی نے کل دس منٹ کا قیام کیا اور چلے گئے۔ بہت بعد میں جب میری شادی ہو گئی اور مزنگ روڈ آنا جانا کھل گیا تو باباجی نے مجھے ایک دن بتایا کہ انہوں نے اُسی روز فیصلہ کر لیا تھا جب مجھے چار پائیاں اٹھائی دیکھا تھا کیونکہ انہیں دنیا میں سب سے زیادہ محنت عزیز تھی۔ وہ محنت کے آگے نہ تقدیر کو کچھ سمجھتے تھے نہ توفیق الہی کو۔ اس اکلوتے واقعے نے غالباً اُن پر یہ ثابت کیا کہ پڑھی لکھی لڑکیوں کے دماغ میں کچھ ایسا خناس بھرا ہوا نہیں ہوتا اور شاید گھریلو کام کاج اور روٹین اپناتے ہوئے انہیں شرم نہیں آتی۔ وہ بھی عام گھریلو زندگی گزار سکتی ہیں۔

ان دنوں میری والدہ جب وہ ایک مرتبہ ملتان سے آئیں تو انہوں نے ایک فکر کا اظہار مجھ سے کیا..... ”کامی میں تو ملتان میں رہتی ہوں۔ تم ہی ریزی کے لیے کوئی رشتہ تلاش کرو۔“

”رشتہ، امی پہلے یہ پڑھائی تو مکمل کر لے۔ کسی ڈھب کی نوکری پر تو لگ جائے۔“

”کر لی اس نے جس قدر پڑھائی کرنی تھی۔ اب اس کی شادی ہونی چاہیے ورنہ ایک اور بکھیڑا پڑ جائے گا۔ کسی

”کیسا بکھیڑا؟“

”ویلا آدمی ہے، کچھ نہ کچھ گل تو کھلائے گا۔ بس تم کسی نائن سے مل کر یا پھر محمودہ منظور سے کہہ کر کوئی رشتہ تلاش

ریزی ان دنوں شادی کے لیے ذہنی طور پر تیار نہ تھا لیکن حکم عدولی بھی اُس کی طبیعت میں نہ تھی۔ ایک رشتہ
لڑکی کا بھائی انارکلی بازار میں سونے کے زیورات بیچتا تھا۔ اُس کی دکان پر ہر قسم کے قیمتی پتھر، کنگن،
بندے مگر بالیاں جانے کیا کیا بھرا پڑا تھا۔ میں نے ریزی کو حکم دیا کہ وہ گیارہ بجے کے قریب اس
بھائی کے بھائی سے ملاقات کر لے۔ ریزی نے ایڈریس سنبھال لیا اور چپ چاپ چلا گیا۔

شام کو جب ریزی واپس آیا تو اُس نے پورے سر کی حجامت کروا رکھی تھی۔ اُس کے چہرے پر جو روپ سروپ
تھا اس کے نیم گھنگھریالے بالوں کی وجہ سے ہی تھا۔ اُن دنوں چوڑے چٹے منجے پن کا فیشن نہ تھا۔ جب سے Yul
Bazaar ایکسٹرنل ٹنڈ کرائی ہے، اُس کی دیکھا دیکھی یہ ٹینڈ مردانہ وجاہت کا ایک فیشن بن گیا ہے لیکن ابھی منجے پن کو کسی
شرح قبول کرنا سوسائٹی کے لیے ممکن نہ تھا۔ سنا صاحب ریزی بھائی سے ملے۔ بوتل پلائی، کچھ زیورات بھی دکھائے اور
تسکیم سے گاہک کی طرح رخصت کر دیا۔ سنا صاحب کی دکان کے اوپر رہائش گاہ تھی اور شاید کسی طور عورتوں نے بھی
رہتی کو دیکھ لیا ہو۔ لڑکی نے کانوں پر ہاتھ دھرے اور اٹکا کر دیا۔

”یہ آپ اس طرح گئے تھے؟“

”ہاں تو اور کس طرح؟“

”یوں سر پر استرا پتھر وا کر؟“

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

میں بھی اُن کا عندیہ سمجھ گئی کہ وہ شادی پر رضامند نہیں ہیں۔ امی کو خط میں رپورٹ بھیجی تو وہ کچھ دنوں بعد
تھیں۔ امی نے ہمارے ساتھ کبھی دل کی بات نہیں کی تھی۔ غالباً وہ اپنی اولاد سے مایوس تھیں۔ میں ایم اے کرنے کے
بعد گھر بیٹھی تھی۔ ریزی گھٹو ہو کر لاہور کی سڑکیں ناپتا، سرورق مل جاتا تو بنا لیتا لیکن اس کا مستقبل بھی مندوش تھا۔ غالباً اولاد
کی طرف سے مایوس ہو کر انہیں زمینوں کا خیال آیا۔ بہادر عورت کی زندگی کا یہ دوہرا عذاب تھا۔ مامتا کو چھپا کر باپ کی پتا
کاپے اوپر اوڑھے وہ دانت بھینچ کر اندر ہی اندر تجویزیں اور فیصلے کرتیں اور پھر اکیلی ہی ان کو پورا کرنے کے لیے کمر بستہ
ہو جاتیں۔

ان کے لیے اب دو گھروں کا خرچ اٹھانا بھی آسان نہ تھا۔ پھر اللہ ہی نے ان کی مدد کی۔ میری خالہ جو شیخوپورہ
میں گورنمنٹ ہائی سکول کی ہیڈ مسٹر تھیں، تبدیل ہو کر 60- فیروز پور روڈ کے گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ مسٹر لیس تعینات
ہو گئیں۔ جونہی ماچھاجی لاہور میں سیٹل ہو گئیں تو امی نے ان سے استدعا کی کہ وہ ہم دونوں کو اپنے پاس رکھ لیں۔

سامان پہلے ہی 24- ایس کینال پارک سے رخصت ہوتے ہوئے گوجرانوالہ میری کزن طلعت (کنو) کے گھر تھی، اب تھوڑا سا سامان لے کر ہم دونوں خالہ کے سکول پہنچے۔ میں نے ایک لمحے کے لیے نہ سوچا کہ مجھے اتنی تعلیم کے ساتھ کچھ ملازمت تلاش کرنی چاہیے۔ ریزی نے کسی مستقل نوکری کے متعلق لہجہ بھر کو توجہ نہ دی۔ ہم خالص بیوہ کی اولاد تھے جس پر ایک محاورہ صادق آتا ہے۔

بیوہ کا پوتہ..... کنالی میں موت



نوید پبلشرز لاہور کی سرزیدی

ملتان (نانا کے پاس)

(ملتان)

(معرفت ڈویژنل انسپکٹرز آف سکولز ہیگم ڈاکر چھٹہ)

طوفانی سال

اشفاق صاحب کی زندگی میں 1950ء سے لے کر 1956ء تک بڑے طوفانی سال گزرے۔ جب وہ ہر لمحے مصائب کے مسافر تھے۔ میری جانب ان کے خطوں کی تیز رفتاری کا اندازہ آپ ان خطوں سے لگا سکتے ہیں جو انہوں نے میری والدہ اور بھائی کے نام ملتان میں لکھے۔

وہ لائق پیدا کرنے کے لیے فرار کی راہ اختیار کرتے۔ کبھی تراڑ کھیل، کبھی جہلم، کبھی کراچی جا دھکتے لیکن ان چھوٹے سفروں سے ایک شدید قسم کی محرومی اور تنگی ان کے اندر در آتی تھی کہ 1952ء میں انہوں نے ملک چھوڑنے کا حتمی فیصلہ کیا اور 1955ء تک روم میں ISMEO میں اردو پڑھاتے رہے۔ یہیں انہیں اسکندر باؤسانی (Alessandro Bausani) سے خوب گہرا رابطہ بنانے کا موقع ملا اور پیٹریسٹریائی کو اردو پڑھانے کی خوشی حاصل ہوئی۔

میرا بھی ان طوفانی سالوں میں کچھ عجیب سا حال تھا۔ ان دنوں اردو کی پروفیسراں قریب قریب ناپید تھیں۔ مجھے لاہور کالج فار ویمن میں جاب آفر ہوئی تھی لیکن میری والدہ کا خیال تھا کہ عورت جب مالی طور پر خود مختار ہو جاتی ہے تو بھروسہ کے قابل نہیں رہتی۔ میرے لیے بھی بس ایک شادی کا خواب باقی رہ گیا تھا۔

کبھی میں ملتان چلی جاتی، جہاں میری والدہ ڈویژنل انسپکٹر آف سکولز تھیں۔ کبھی لاہور آ جاتی کیونکہ میری والدہ کا کام کچھ ایسا تھا کہ انہیں دوروں پر جانا پڑتا۔ شک و گمان کا یہ عالم تھا کہ وہ مجھے کسی ریٹ ہاؤس میں اکیلا چھوڑ کر سٹریٹ نہ ہو پاتیں اور جلد ہی مجھے واپس لاہور بھیج دیتیں۔ جہاں انہیں یقین تھا کہ میرا بھائی کم از کم موجود رہتا ہے۔

ملتان میں میری والدہ کی رہائش دفتر کے ساتھ ہی ملحق تین کمروں پر مشتمل تھی۔ ایک مرتبہ اشفاق صاحب ریزی سے ملنے کے بہانے وہاں بھی تین دن کے لیے آئے تھے۔ یہ خطوط اور ملنا ملانا گویا جمود کے پانیوں میں پتھر ماکھڑا کو پھر بھنور صورت متلاطم کرنا تھا۔ مجھے ان کی توجہ سے غلط قسم کی امیدیں بندھ جاتیں۔ وہ امید نہ دلاتے ہوئے بھی دلا جاتے اور پھر گھر والوں کی ناراضگی کے بھوت سے خوفزدہ اور سراسیمہ ہو کر بھاگ اٹھتے۔

آپ کو میری گواہی درست تو نہ لگے گی لیکن میں بار بار آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ وہ دوست دشمن اپنے پرانے کسی کی دلا زاری کرنے کے اہل نہیں تھے اور اسی در ماندہ کوشش کی بدولت وہ کئی دل توڑنے کے مرتکب جاتے تھے۔ یوں سمجھیے ایک کمزور دل انسان کی اس کمزوری نے کتنے لوگوں کو اداس کر دیا؟

ملتان میں امی کی وساطت سے مجھے ڈاکٹر احمد خاں ملے۔ وہ ملتان ڈویژن کی سرکاری زمینوں کے ڈائریکٹر تھے۔ ان ہی کی وجہ سے میری والدہ کو زمینوں کا خطبہ ہوا اور انہوں نے زمینیں خرید لیں۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے عزت کا ایسا مقام پیدا کر رہی ہیں، جہاں کچھری میں زمیندار کو کرسی ملتی ہے۔

ڈاکٹر احمد خاں شوقیہ ہومیوپیتھک علاج بھی کرتے تھے اور بہت عرصہ بعد جب ہم داستان سرانے میں رہے تھے تو ایک روز وہ ہمارے گھر آئے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ ریٹائر ہو چکے ہیں اور موہنی روڈ پر ان کا کلینک ہے۔ اطلاع ہوئی کہ کوئی ڈاکٹر احمد خاں تشریف لائے ہیں۔ میں انہیں وقتی طور پر بھول چکی تھی۔

”آپ؟..... آئیے اندر بیٹھیے۔“

”نہیں مجھے بیٹھنا نہیں ہے۔ قد سید! میں یہ پوچھنے آیا ہوں کہ گھر پر کون بیمار ہے؟“

میں حیران رہ گئی۔

میوہسپتال میں ڈاکٹر طارق بن افتخار کی نگرانی میں اشیر میاں کا Liver Absces کا آپریشن ہوا تھا لیکن آپریشن کے باوجود بخار نہ اترا۔ وہ مضطرب پھرتا تھا۔

”جی اشیر..... میرا چھوٹا بیٹا۔“

پھر میں نے ساری تفصیل بتائی۔

”ٹھیک ہے۔ تم اسے لے کر میرے کلینک پہنچو۔ میرے پاس ایک ایسی مشین ہے جس پر لہو کی ایک بوتل رکھتے دوائی خود بخود تجویز ہو جاتی ہے۔“

اول تو ڈاکٹر صاحب کا آنا کم معجزہ نہ تھا پھر لہو کی بوتل سے دوائی کا تجویز ہو جانا اور بھی محیر العقول تھا۔ اب آپ کو کیا بتاؤں کہ ان کی ہومیوپیتھک دوا سے ہی اشیر صحت یاب ہوا۔

کچھ لوگ آپ کو جب ملتے ہیں تو ان کی افادیت کا علم نہیں ہوتا۔ ان کا فیض بہت بعد میں کھلتا ہے۔ کچھ لوگ آپ کو فل سٹاپ کے طور پر ملتے ہیں جیسے تبدیلی، دور اور واقعات کے ختم ہو جانے کی نوید ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب مجھے ملتان میں ملے اور ان کی افادیت داستان سرانے میں جا کر کھلی۔

ایسے ہی خاں صاحب کی بابرکت ذات تھی۔ وہ مجھے کالج میں ملے اور افادیت ان کی داستان سرانے میں آکر

تجربہ میں نے ان کی مہربانیوں کا پورا بادل برستے دیکھا۔ یہ خطوط اس مہربانی کی اولین پھوار ہیں۔ آپ کی تفریح طبع کے لیے پیش کیے دیتی ہوں۔

شوقی (اشفاق صاحب) کے خطوط
والدہ بانو قدسیہ کے نام

دیال سنگھ کالج

لاہور

19 اکتوبر 1951ء

حضور امی جان!

اس خط کو بہت پہلے آپ کی خدمت میں پہنچانا چاہیے تھا لیکن افسوس کہ چند ناگزیر حالات کی بنا پر ایسا نہ ہو سکا۔ جس نے آپ ملتان کے لیے روانہ ہو رہی تھیں میں سٹیشن پر گیا تھا اور گاڑی کے روانہ ہو جانے کے ایک عرصہ بعد تک آپ کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اگلے دن اثر صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ آپ دوسرے دن صبح کی بس سے عازم ملتان ہوئی تھیں۔

قدسیہ کی وہ کہانیاں جو ایک عرصے سے میرے پاس تھیں، اچانک طلب کر لی گئیں۔ ایک رات اثر صاحب نے لائے اور کہا کہ کاکی نے لکھا ہے کہ وہ افسانے اشفاق سے لے کر اُسے پہنچا دیئے جائیں۔ میں نے بلاچون و چرا اثر صاحب کے سپرد کردی اور انہوں نے اسے مقام مقصود تک پہنچا دیا۔

ان کے استفسار پر کاکی نے بتایا کہ اشفاق کو ہر گھڑی میری اور میرے گھر والوں کی تذلیل مقصود ہوتی ہے۔ یہ بیان بوجھ کر ان کی بے عزتی کرتا ہے۔ میں آپ کو اس وقت سے امی کہتا رہا ہوں جب میں نے آپ کو دیکھا تھا۔ میں نے آپ کو اس وقت تک امی ہی سمجھا رہا ہوں گا جب آپ مجھے دیکھنا کریں گی۔ اگر میں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر ارادی یا غیر ارادی طور پر آپ کی ہتک کی ہو یا آپ لوگوں کو بیٹھا سمجھا ہو تو میری دعا ہے کہ میری ایک سچی دعا اور میری آنکھوں کے سامنے سر بازار اس کی اوڑھنی اتر جائے۔ چوراہے پر اس کی عصمت دری ہو اور میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔ میری موجودگی میں بھرے مجمع میں اس کا نیلام ہو۔ آسمانوں سے لعنتوں کا نزول ہو اور زمین سے گھبر پڑھنا ہو اور خدا کرے کہ آپ بھی یہ سب کچھ دیکھنے کے لیے زندہ رہیں۔ اس کے سوا میں اور کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ میرا فیصلہ آپ کے یا اس کے ہاتھوں میں ہے جسے عرف عام میں خدا کہتے ہیں۔

والسلام

نیا زمند

اشفاق

دیال سنگھ کالج، لاہور

7 دسمبر 1951ء

امی جان!

آپ کا خط مجھے بڑے انتظار کے بعد ملا۔ میں ہر کلاس پڑھانے کے بعد سٹاف روم میں اپنی میز دیکھا کرتا تھا۔ اس پر گوہر مقصود نہ ہوتا۔ آخر آخر تو میں ناامید سا ہو گیا تھا لیکن آپ کا اور خدا کا شکر ہے کہ مجھے جواب ملا۔ پرسوں سے اور معظم سے ملاقات ہوئی تھی۔ وہ ٹھیک ٹھاک ہیں۔

آپ میرے لیے سویٹر بنانے کی زحمت گوارا نہ فرمائیں۔ اس مرتبہ مجھے کافی سویٹر مل گئے ہیں۔ ایک میں خرید لیا ہے اور مواد ضرورت سے زیادہ فراہم ہو گیا ہے۔ اگلی سردیوں پر اگر زندہ رہا تو پھر آپ ہی سے درخواست کر دوں گا اور کیا لکھوں۔ نہ کوئی خاص بات رونما ہوتی ہے اور نہ میں ہونے ہی دیتا ہوں۔ آج طبیعت خراب ہے سے چھٹی لے لی ہے۔ سٹاف روم میں بیٹھ کر یہ خط لکھنے لگا ہوں۔

تیس تاریخ کا بڑی شدت سے انتظار ہے۔ دیکھیے کب آتی ہے اور کیا لاتی ہے۔ میرا جی اس نوکری میں نہیں لگتا لیکن لاہور رہنے کے لیے اور سنگریوں کا خرچ چلانے کے لیے کوئی نہ کوئی نکالنا ہی پڑتا ہے۔ میں نے جب سے سردیاں شروع ہوئی ہیں، ایک مرتبہ بھی کٹ کیٹ نہیں کھائی۔ آپ آئیں تو لائیں گی تو کھاؤں گا اور کسی کو نہیں دوں گا۔

آپ کا اپنا
شکو

ڈی۔ ایس۔ کالج

لاہور

18 فروری 1952ء

امی جان!

میں کل آپ سے ملنے گھر گیا تو معلوم ہوا کہ آپ جا چکی ہیں۔ یوں تو میں دو تین گھنٹے وہاں بیٹھا لیکن وہاں رہی تھی۔ آج طبیعت خراب تھی۔ اس پر اباجی نے ذرا سختی کی اور میری حالت غیر ہو گئی۔ گھر سے کالج آیا ہوں لیکن لے رکھی ہے اور لاہور میں بیٹھ کر لاہور میں کے قلم دوات سے یہ خط لکھ رہا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں۔ میں اور کالج میں ایک فرق تو ضرور ہے کہ..... لیکن میں آپ کو پریشان کیوں کروں۔ پھر کبھی لکھوں گا جس دن میرا ذہن میرے قلم کا ساتھ دے گا۔

آپ کا
شکو

لاہور

7 اگست 1952ء

امی جان!

آپ کے تار کا بہت بہت شکریہ۔ مجھے پتہ تھا اس دن آپ مجھے ضرور یاد کریں گی۔ اس لیے میں کچھ

ہوتے دینے کے باوجود تھوڑے تھوڑے وقفوں کے بعد گھر آتا رہا۔

انہوں نے زندگی کے کتنے ہی سال رائیگاں گئے اور میں کسی کے کام نہ آسکا۔ نہ اپنے نہ اوروں کے! جب کبھی کا کا سے شکایات ہوتی ہے تو وہ اسے افسانہ نگاری پر محمول کرتا ہے لیکن سچ تو یہ ہے کہ بات میرے جی سے نکلتی ہے۔

آپ لوگوں سے جو کچھ ملا ہے، اس کا تذکرہ نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے لیکن میری تنگ دامانی کو ہمیشہ شکوہ رہا کہ مجھے نصرت و وسعت کے تصور سے واقف نہ ہو سکی اور مجھے اپنی کم نصیبی سے شکایت رہی۔

آپ کی دعائیں ہمیشہ میرے ساتھ رہتی ہیں لیکن مجھ پر ایک ہی خوف سوار رہتا ہے کہ کہیں مستقبل کی نحوستیں مجھ پر نہ لیں اور میں ویسے کا ویسا رہ جاؤں جیسا ماضی میں تھا۔

آپ سے ملنے کو جی چاہتا ہے شاید یہ آرزو جلد ہی پوری ہو۔ حال میں یا مستقبل قریب میں۔

والسلام

شفق

D.S.College

Lahore

12 اپریل 1952ء

وہ لوگ ہم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے

ڈھونڈا تھا آسمان نے جنہیں خاک چھان کر

امی جان سلام محبت!

ایک شام جب میں پرویز کو ایک ضروری چٹھی دینے کے لیے گیا تو وہ روح فرسا خبر ملی جس کی توقع نہ تھی اور جس سے حلق میں تو کیا شاید آپ لوگ بھی تیار نہ تھے۔ ماچھا کو میں نے تین مرتبہ دیکھا تھا اور تینوں بار سینما میں۔ ایک بار حفیظ نے ان کی اور پوتر ماچھا کی دعوت کی تھی اور مجھے بھی بلا یا تھا۔ دوسری مرتبہ جب میں اتفاق سے ریگل سینما میں موجود تھا اور تیسری اور آخری مرتبہ جب قمر صاحب کو کا کی سے کچھ کام تھا اور اسے ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم بلازہ پہنچے تھے۔ پہلی اور دوسری ملاقات میں ان سے شاید ہی کوئی بات ہوئی ہو۔ اسی قدر یاد ہے کہ انہوں نے مجھے محبت اور شفقت کی نگاہوں سے دیکھا تھا اور میری بات کی حوصلہ افزائی کی تھی۔

تیسری دفعہ ان سے البتہ کچھ باتیں ہوئیں۔ وہ زیادہ تر فلم سے اور میرے حوصلے سے متعلق تھیں۔ میں Under Capricorn دیکھ کر از بسکہ متوحش ہوا تھا اور انہوں نے اسے کھیل جانا تھا اور مجھے بھی تلقین کی تھی کہ فلم کو فلم ہی سمجھوں۔ اگر جانتا کہ یہ ان سے آخری ملاقات ہے تو اور بھی باتیں کرتا اور بھی یادیں جمع کرتا۔ ان کا چہرہ ذہن میں لاتا رہتا ہے مگر دھندلا سا اور ایسا نا پائیدار بن کر کہ زیادہ دیر تک کیفیات کے چکر میں نہیں رہتا۔

میں اس مختصری زندگی میں بہت سے تجربات کر چکا ہوں اور ان گنت چیزیں میرے مشاہدے میں آتی رہی ہیں لیکن کسی واقعے یا سانحے نے مجھے طرب پسند (Optimist) نہیں بنایا۔ ہم مشرق کے رہنے والے اکثر و بیشتر تقدیر یئ

ہیں اور قسمت کے پجاری ہیں۔ میں بھی لکھے کا قائل ہوں اور ریکھا کا ماننے والا ہوں۔

ماچھاکا وفات پر عمر خیام کی ایک بھولی بسری رباعی یاد آگئی۔ اب یہ کئی دنوں سے میرے دماغ پر چھڑ رہا ہے اور خدا جانے کب تک چھائی رہے گی۔ آپ کی نگاہوں سے یقیناً گزری ہوگی لیکن اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے آپ کو تسکین دینے کے لیے لکھتا ہوں۔

He moving finger writes; and having wit

Move on; nor all thy Piety nor wit

Shall lure it back to Cancal half a live,

Nor all thy Tears wash one word of it.

نہ آہوں کی دھند سے لکھا ہوا مٹا ہے نہ آنسوؤں کے ریلے سے ہونی کے انچھر دھلے ہیں پر کیا کیا جائے

جو تجھ سے چھٹ گئے ہیں ان کے آنسو ابھی جاتے ہیں

کلیجہ دکھ ہی جاتا ہے تری یاد ابھی جاتی ہے

میں تو اس جہان کے معمولی سے معمولی کام کو بڑی اہمیت دیتا ہوں۔ یہ تو موت ہے۔ موت بیگانے کی ہو

بیگانے کی میرے لیے بڑی تکلیف کا باعث ہے۔ صبر کی تلقین کرنا میرے مشرب میں نہیں۔ میں تو کہتا ہوں افسوس کہ جی بھر کے کر دیکیں ہمت شرط ہے!

نیلو آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ امید ہے آپ عنقریب آئیں گی۔ تقویاں آیا ہوا تھا۔ آج چلا گیا ہے۔ آپ

خط لکھنے کو کہہ رہا تھا۔ دیکھوں لکھتا ہے کہ پھر بھول جاتا ہے۔

کوشش مسلسل بہت دیر شاں چو زلف یار

عظیم مکن کہ در شب ہجر نوشتہ ام

خادم

شکو

امی جان!

آپ کا محبت نامہ ملا، میں کل بھی آپ کی خدمت میں ایک عریضہ تحریر کر چکا ہوں۔ امید ہے نظر سے گزرا ہوگا

آپ نے جس محبت اور خلوص سے میری روانگی کا خیر مقدم کیا ہے۔ اس نے بلکہ مجھ پر الٹا اثر کیا اور میرا جی یہیں کا ہو رہے کرنے لگا۔

روپوں کے بارے میں میں اس قدر پریشان نہیں ہوں۔ صرف ایک ہزار روپے کی ضرورت تھی، سو پونے

ہوگئی۔ آپ ہرگز ہرگز تردد نہ کیجیے گا اور کا کا کو زمین فروخت کرنے کا مشورہ نہ دیجیے گا۔ کپڑے میرے پاس بہت کافی

گئے ہیں۔ صرف ایک جوٹا اور ایک سوٹ کیس خریدنا باقی ہے۔ ان دونوں کے لیے آپ کو یا کا کا کو ضرور زحمت دوں گا۔ باقی

سب ٹھیک ہے۔

وہاں پہنچ کر تو عزت سے بسر ہوگی۔ ماہ بہ ماہ تنخواہ ملا کرے گی اور اس کے علاوہ یقیناً کسی فلم کمپنی سے مکان کے سسٹمز سمجھوتہ ہو جائے گا۔ کار لینے کا ارادہ میرا بھی ہے لیکن اپنے اندوختہ سے لوں گا۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے ایک دعا میں مجھے بڑا آدمی بنا دیں گی، بہت بڑا آدمی لیکن ساتھ ہی ساتھ ڈر بھی لگتا ہے کہ بڑا آدمی بن کر میں ان لوگوں سے بچ نہ جاؤں جو دل و جان سے مجھے چاہتے رہے ہیں۔

عابد صاحب نے یونیورسٹی روم کو خط لکھ کر میری خدمات انہیں سپرد کرنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ ابھی تک مجھے وہاں سے کوئی تحریر موصول نہیں ہوا۔ بس اس کا شدت سے انتظار ہے۔ یکم اکتوبر میں انشاء اللہ لاہور چھوڑ دوں گا اور پھر اس کے بعد لندن بعد آپ کا اور اپنا آبائی وطن بھی۔

ایک مرتبہ پھر عرض کرتا ہوں کہ آپ کسی معاملے میں بھی پریشان نہ ہوں۔ افتخار بھائی نے نیشنل خاں سے ڈیڑھ گھنٹہ تک گفتگو کی ہے۔

کا کا اور کا کی کو پیار۔

والسلام

خادم

شکو

میری پیاری امی کو میرا سلام پہنچے۔

پر سوں آپ کا خط ملا۔ باوجود اس کے کہ یہ کا کی والے خط کی پشت پر رقم تھا، میں نے سب سے پہلے اسی کو پڑھا۔ نیشنل کے کاؤنٹر پر بیٹھ کر مزے مزے سے چائے پیتا رہا۔ جتنی مرتبہ میں نے آپ کے خط کو دیکھا گا لوں سے لگایا۔ صحتی دیر میں کینٹین میں بہت سے گا بک آئے اور چلے گئے لیکن میں بدستور اپنی جگہ پر جم رہا۔

جاتی دفعہ میں نے بیرے کو ڈبل ٹپ دی یعنی بیس لیرے (پورے دو پاکستانی آنے) اس پر وہ اس قدر خوش ہوا کہ ہنس کر کہتا۔ اس نے دو مرتبہ جھک کر سلام کیا اور تین دفعہ گراتے (شکریہ) کہا۔ جب میں اپنا تھملا اٹھا کر جانے لگا تو چونکہ وہ پوچھ رہی تھی کہ پاکستان پر دو گرام والے نے بیس لیرے ٹپ کیا ہے، اس لیے ہر ایک نے ایک زبان ہو کر ”بونا“ (بونا کا سلام) کہا۔

اس رقم سے آپ کو یہاں کی ٹپ کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ روم کے ہوٹلوں کی سب سے اچھی بات یہی ہے کہ یہاں سے زیادہ سولیرے (آٹھ آنے) ٹپ دی جاتی ہے اور جو سولیرے دیتا ہے۔ یہ لوگ اس کا اور کوٹ اتراتے ہیں، جلتے ہیں، چھستری لا کر دیتے ہیں، آگے بڑھ کر دروازہ کھولتے ہیں اور ٹیکسی بلوا کر دیتے ہیں۔

یورپ کی کافی تکلیف دہ بات یہاں کی سردی اور بارش ہے۔ پتہ نہیں کب بارش ہونے لگے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں چھتری ہے۔ ہر ایک کے جسم پر برساتی ہے۔ اچانک ٹپاٹپ بوندیں برسنے لگیں۔ جل تھل ہو گیا اور گھڑی بھر میں ہاتھ بالکل خشک ہو گئیں، گویا صدیوں سے بارش نہ ہوئی ہو۔

کھڑکی یہاں بہت سستی ہے۔ ایک دن میں نے دریافت کیا تھا۔ بارہ آدمیوں کے کھانے کے نہایت نفیس

چھری کانٹے اور چچ ایک خوبصورت مخملی بکس سمیت 33 روپے میں مل جاتے ہیں۔ اس سے گراں قیمت چیزیں بھی ہوتی ہیں اور ان سے کم قیمت بھی۔ سبزی اور پھلوں کے معاملے میں یہ خطہ بہت خوش قسمت ہے۔ پاکستان کے سب سے سبزیوں کی زیادہ شاداب اور بہت سستی ہیں۔

پھل اتنے ہیں کہ جگہ جگہ ریزہیاں نظر آتی ہیں۔ مونگ پھلی (چونکہ میں صرف یہی خرید سکا ہوں) زیادہ مزیدار مجھے اب تک کسی اور جگہ نظر نہیں آئی۔ انگوروں کا تو اصلی گھر یہی ملک ہے۔ سفید انگور سے سیاہ زیادہ زیادہ ہے۔ بگوگوشے یہاں کی خاص سوغات ہیں۔ نارنگیں اور مالٹے بے شمار بے حساب ہیں۔ سیب سرخ آٹھ آنے کا ہے اور زرد تین آنے کا۔

ڈیری کا خالص مکھن والا دودھ چھ آنے کا ایک سیر ہے۔ دہی بارہ آنے سیر ہے۔ مکھن کی قیمت سستی ہے۔ لیکن آپ منوں کے حساب سے خرید سکتے ہیں۔ قیمت دودھ دہی سے اندازہ کر لیجیے۔ اٹھ چھ پیسے کا ایک سیر ہے۔ روپے کی۔ گوشت گائے کا البتہ مہنگا ہے۔ کوئی ساڑھے تین روپے سیر، سور کا گوشت اس سے بھی گراں ہے لیکن گوشت سستا ہے اور میں ان دنوں غالباً گھوڑے کا گوشت ہی کھا رہا ہوں۔ نہایت بدمزہ اور بے کیف ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص کا اپنا گھر ہو تو زندگی بن جاتی ہے۔ باورچی خانوں میں گیس استعمال ہوتی ہے۔ اس کا روپے سے زیادہ نہیں اٹھتا (ماہوار) بجلی اس سے بھی سستی ہے اور ٹیلی فون کا بل ڈھائی روپے مہینہ بنتا ہے۔ جس کا چار کمرے ہوں یعنی ایک کھانے کا کمرہ، ایک ڈرائنگ روم، ایک سلپنگ روم (مع دو پلنگ بستر) ایک متفرق کمرہ باورچی خانہ، ایک غسل خانہ، اس کا کرایہ سو اتنی روپے تک ہوتا ہے۔

مالک مکان ہر پیر کو بستر کی چادریں تبدیل کرتے ہیں اور ہر تیسرے دن دو تولیے بہم پہنچاتے ہیں۔ بہت سستی ہے۔ ٹی ٹرپ سلیٹن، لیکن چار ہزار میں ملتی ہے۔ خواہ نقد لے لیجیے خواہ پچاس روپے ماہوار قسطوں پر۔ آنے میں ایک کپ اور خالص انگور کی شراب آٹھ آنے سیر۔ مچھلی عام ہے اور بہت سستی۔ زیتون کا تازہ تیل گھی کے مزیدار اور مکھن سے زیادہ صحت بخش ہوتا ہے۔ وہ بھی کوئی بارہ آنے سیر کے حساب سے ملتا ہے۔

یہاں اگر کوئی چیز مہنگی ہے تو وہ مکان ہے یعنی ڈیڑھ سو یا ایک سو اتنی روپے کے قریب لیکن بڑا ہوادار ہوتا ہے۔ اب لیجیے نہانے کا خرچ۔ ایک مرتبہ گرم پانی اور صابن تولیے کے ساتھ نہانے پر ایک روپے خرچ اٹھتا ہے اس میں پابندی یہ ہے کہ آپ تین گھنٹے لگا تار سے زیادہ نہیں نہا سکتے۔ میں جب سے یہاں آیا ہوں ایک مرتبہ نہا چینی کے اتنے لمبے ٹب میں لیٹ کر پھر اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔ نیند سی آنے لگتی ہے اور ہاتھ پاؤں کھل جاتے ہیں۔ صابن اپنا ہو تو کوئی بارہ آنے دینے پڑتے ہیں اور بعد میں دس لیرے (ایک آنہ) اُس عورت کو دیئے جاتے ہیں۔ کے دروازے پر خدمتگار بن کر کھڑی رہتی ہے۔

مکانوں سے زیادہ مہنگی چیز ڈاک کے ٹکٹ ہیں۔ پاکستان میں بسنے والے عزیزوں کو لکھنے کے لیے ایک لیرے چاہئیں اور مجھ ایسا آدمی جسے یہاں روم میں بھی افسانے مانگنے والے نہیں چھوڑتے، قریباً ہر روز ایک خط لکھنا ہوتا ہے۔ باقی روم ہر طرح سستا اور اچھا شہر ہے۔ لوگ بڑے غریب اور احساس کمتری کا شکار ہیں۔ گاہے سڑکوں پر مانگنے والے

تھکتے لیٹے ہیں۔ انگریزوں والی اکڑان میں ہرگز نہیں لڑتے بالکل نہیں، تلخ کلامی تک ہی معاملہ رہتا ہے۔ کسی کو تھپڑ مارنے کے برابر ہے۔

یہاں کی سب سے بڑی گندی اور فحش گالی ”جادفج ہو جا“ ہے۔ اگر کوئی کسی سے یہ کہہ دے تو پھر مرنے مارنے سے بچتے ہیں۔ جزیرہ سسلی کے رہنے والوں کے لیے سب سے بڑی گالی یہ ”جا جا کے صابن کھا“ یہ سن کر تو کوئی سسلی سے بچتا ہے۔ اگر آپ چوراہے پر کسی سپاہی کو مخاطب کر کے راستہ پوچھیں گے تو وہ دونوں ایڑیاں جوڑ کر صابن کھا کر آپ کو فوجی سلام کرے گا۔ پھر کہے گا فرمائیے حضور! چالان کے لیے کچھ ہی نہیں جانا پڑتا۔ سپاہی چوراہے پر ہی بیٹھ کر سیدھے دیتا ہے۔ ڈیڑھ روپیہ یعنی تین سو لیرے بہت بڑا چالان ہے۔

تیس ہزار لیرے پانے والا اچھا افسر ہوتا ہے۔ پچاس ہزار لیرے گزٹڈ آفیسر کی تنخواہ ہے۔ اور ستر ہزار لیرے ہائی آفیسر کی تصور کیا جاتا ہے۔ اور کوٹ ڈیڑھ سو روپے میں بنتا ہے اور ہمارا گرم سوٹ ایک سو دس روپے میں اور اگر کسی کو ایک مشت ادا ہوگی کر دے تو اسے رئیس آدمی خیال کرتے ہیں۔

پاکستان کو یہ لوگ محض اس لیے امیر ملک تصور کرتے ہیں کہ سر آغا خاں کراچی کا رہنے والا ہے اور ہماری اس طرف سے کہتے ہیں کہ ریٹائر ہو تھ پاکستان کی بہو ہے۔ موقع ملتا ہے تو اجنبیوں خاص طور پر امریکیوں اور پاکستانیوں سے زیادہ لے لیتے ہیں۔ دکانیں مال روڈ والی بھی ہیں، انارکلی والی بھی اور ڈبی بازار والی بھی۔ اگر ”دینا ہے تو دوور نہ آتے تو ہکا تدار دام کم بھی کر دیتے ہیں اور جلد ہی کر دیتے ہیں۔

یہاں کی شادیاں اکثر ناکام رہتی ہیں۔ بیویاں دوسرے مردوں کے ساتھ وقت گزارتی ہیں اور خاوند اور عورتوں کے درمیان شام کے وقت دریائے ناہر کے کنارے اپنے دوست کے ساتھ بوس و کنار کرتی ہے۔ بارہ بجے رات پہنچ جاتا ہے۔ گو کافی لوگ شراب پیتے ہیں لیکن شراب نہ پینے والے کی عزت کرتے ہیں اور اسے اچھا سمجھتے ہیں۔ عداوت اور کیا لکھوں میں تو اب تک یہی کچھ دیکھ سکا ہوں اور اسی حد تک محسوس کر سکا ہوں۔

امی کا کی بھلا میرے خط پڑھ کر کیوں روتی ہے اور اس نے گھلنے والا رو یہ کیوں اختیار کر رکھا ہے؟ اگر وہ یہ سمجھتی ہے کہ میرے چکا ہوں تو اسے تلاوت کرنی چاہیے اور ہر روز فاتحہ پڑھنے کے لیے ہاتھ اٹھانے چاہئیں اور اگر زندہ سمجھتی ہے تو شہزادی شہزادہ کے شہزادے کی شہزادی اور لاشعوری طور پر کبھی سکھ نہیں دیا لیکن میں کیا کروں امی یہ تماشا کب تک نہ دیکھتی ہیں) آپ سے آپ بن گیا ہے۔

میں یہاں اکیلا بالکل اکیلا بے یار و مددگار زندگی کے دنوں کو دھکے مار مار کر آگے لڑھکا رہا ہوں۔ پتہ نہیں ابھی کہ میری قسمت میں لکھے ہوئے ہیں۔ امی! آپ دل پر ہاتھ رکھ کر میری قسم کھا کر سوچیں کیا میں برا ہوں؟ اور اگر سمجھتی ہیں کہ تو بس مجھے ایک خط میں یہ ایک لفظ لکھ کر بھیج دیجئے۔ خدا کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ اس کے بعد آپ اس قسم کی شے نہ دیکھیں گی۔

کبھی کبھی میں اپنے آپ کو بے ایمان اور بددیانت بھی تصور کرنے لگتا ہوں لیکن آپ کی محبت اور شفقت اس کو مجھے نہیں دیتی۔ آپ کے اس خط نے مجھے اپنی نگاہوں میں چورسا بنا دیا ہے اور میں اس وقت سے لے کر اب

تک سوچ رہا ہوں کہ شاید امی کی بات ٹھیک ہی ہو۔ پہلے مجھے اپنے دیس میں اپنے آپ سے شدید نفرت تھی، اب میں بھی مجھے اپنے وجود سے گھن آنے لگی ہے اور جرم کا احساس قوی تر ہو گیا ہے لیکن امی! میری امی! کیا تم بھی مجھ سے جاؤ گی؟

اگر ایسا ہوا تو مجھ پر موت بھی حرام ہو جائے گی اور میں..... لیکن امی یوں نہ ہونے دینا۔ بس میرا جی رکھے لیے جھوٹ موٹ کہہ دینا کہ میں برا نہیں ہوں اور امی اُسے سمجھانا اتنا سمجھانا کہ وہ سمجھ جائے اور اگر اس کا رویہ نہ بدلتا تو میں اس سے بڑا سخت انتقام لوں گا۔ جس مٹی سے وہ بنی ہے تقریباً اسی مواد سے میرا خمیر اٹھا ہے۔ اگر اس نے ہنسی کی تو وہ وقت بہت قریب ہو جائے گا جب چلتے پھرتے اجسام آنسوؤں کے وجود بن جایا کرتے ہیں۔

آپ کا

شکر

میری صحت پہلے سے دو چند بلکہ دہ چند ہو گئی ہے۔ شہوت کے طور پر اپنی تازہ تصویریں بھیج رہا ہوں۔ آنکھوں کے نیچے وہ حلقے رہے ہیں اور نہ چہرے پر سلوٹیں ہی! کیا آپ بھی مجھے اپنی تازہ تصاویر بھیجیں گی؟

رومٹہ الکبریٰ

(تاریخ پتہ درج نہیں کیا ہے)

امی جان!

آپ کا ایک خط ملتا ہے، ایک خط پتہ نہیں کہاں سے کل ایک لفافہ لاہور سے موصول ہوا۔ اب میں اصول بنا لیا ہے کہ مختصر لکھوں گا مگر لکھوں گا ضرور۔ باقاعدگی سے اور ہنرمندی سے۔ لوگ پہلے ہی مجھ سے ناراض تھے مزنگ والوں کے ساتھ تو میں نے خاصی زیادتی کر رکھی ہے۔ اللہ مجھے معاف کرے۔

اس وقت سب سے بڑا مسئلہ سامان کا درپیش ہے۔ مجھے سمجھ میں نہیں آتا پیک کیسے کروں اور کس کی مدد کروں آپ دور ہیں، ریزی دور ہے اور کاکی صاحبہ کو اپنے ڈرامے کی فکر ہے۔ پتہ نہیں اس نے یہ مصیبت اپنے گلے کیوں لے لی ہے۔ میں اپنی ایک پریشانی میں مبتلا ہوں، دوسرے اس کی کامیابی کا تردد ہے۔ خواہ مخواہ بڑی بڑی باتوں میں دخل لگ جاتی ہے اور مجھے پریشان ہونے کے لیے کھونٹے سے باندھ دیتی ہے۔ اللہ اس کو ہدایت دے۔

ان دنوں ہر لمحہ ریزی یاد آتا ہے۔ میری کتابیں، جنہوں نے میری ساری کمائی ہڑپ کر لی ہے اس وقت پھاڑے میری طرف دیکھ رہی ہیں۔ اُن کو کیسے پیک کروں اور کس طرح بنگ کراؤں؟ اگر ریزی یہاں ہوتا تو مجھے مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ اگر آپ مجھے خط لکھنا چاہیں تو 20 دسمبر تک یہیں روم لکھیں۔ اس کے بعد آپ کا خط مجھے میں آپ کے خط کو نہ مل سکوں گا۔

کل اپنی فریج کی اُستانی کو سلام کرنے گیا تو اس نے زبردستی کرسی پر بٹھا کر کاغذ سامنے رکھ دیا اور بولی کہ مرتبہ recitation لکھتے جاؤ۔ دیکھوں کتنی غلطیاں کرتے ہو۔ میں نے کہا اُدھر قدسیہ ڈرامہ کر رہی ہے، میرا دماغ نہیں ہے۔ پروہ نہ مانی اور مجھے لکھتے ہی بن پڑی اور تو اور 'باوجودیکہ' Malgre کے سپیننگ بھول گیا۔ اس پر جو وہ

یہ تمام سب کو معاف کرے۔ ایک قیامت برپا ہوگئی۔ اس کے خاوند نے مداخلت کر کے معافی دلوائی۔ خدا کی قسم
 شخص سے پڑھنا بہت مشکل ہے۔ اطالوی زبان اور ادب کا جو امتحان دیا تھا اس میں تیس میں سے 28½ نمبر آئے۔
 یہ تیسہ تیسے لائق بچے ہوں کہ نہیں؟

اور امی! آپ کا کی سے نہ بولا کریں۔ بہت بری لڑکی ہے۔ اس نے مجھے ایسے ایسے خراب خط لکھے
 ہیں کہ سچ نہیں آتا کہ یہ سب باتیں اس کے دماغ سے اُتری ہیں۔ آپ کی زمین کا کیا حال ہے؟ ہم وہاں شکار
 کیسے کب جائیں گے؟ ریزی کو پیار (اگر اس نے حجامت بنائی ہو اور اس کی ڈاڑھی نہ بڑھی ہو تو بے شک میری
 صحت سے منہ بھی چوم لیجے گا۔)

آپ کا
 شوق

پوسٹ بکس 509

لاہور

4 ستمبر 1952ء

امی جان! آپ کے دونوں خط بہ یک وقت ملے۔ ان کا مفصل جواب اگلے دن پر اُٹھا رکھتا ہوں۔ اس وقت
 میں پاس پر ویز بیٹھا ہے اور اس پر ”ملک شیک“ پینے کا موڈ سوار ہے۔ مجھے بھی ساتھ لیے جا رہا ہے۔ اس لیے تفصیلاً لکھنے
 سے محذور ہوں۔

آپ پیسوں کی فکر ہرگز نہ کریں۔ اکیس تاریخ کو جب آپ آئیں گی تو مجھے پانچ سو روپیہ دے دیجئے گا۔ اس
 سے مجھے ایک دھیلے کی بھی ضرورت نہیں۔ ابھی ابھی روما سے خط آیا ہے۔ ان لوگوں نے BOAC کی وساطت سے
 ٹکٹ خرید لیا ہے جو مجھے عنقریب پہنچ جائے گا۔

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے ہوائی سفر ہی اختیار کرنا پڑے گا کیونکہ یہی ان لوگوں کی خواہش ہے۔ آپ
 صحت رکھیں مجھ ایسے سخت جان کو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔

نی الحال آپ میری عیدی بھی اپنے ہی پاس رکھیے۔ میں آپ سے دستی وصول کروں گا۔ مٹی آرڈر نہ کیجئے گا۔
 جسے بھی چیز ہے لیکن مزنگ روڈ والے اچھے لوگ نہیں۔ بہر کیف جو جی میں آئے کیجئے۔

والسلام

آپ کا
 شوق

لاہور

18 اکتوبر 1952ء

میری پیاری بقلم خود امی!

آپ کا محبت نامہ ملا۔ میں اور آپ کے پاس آنے کی کوشش نہ کروں!
 خدا گواہ ہے آپ سے ملنے کو تو بہت جی چاہتا ہے لیکن.....
 اب میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ خواہ ایک دن کے لیے ہی کیوں نہ ہو
 آپ کے پاس پہنچوں۔ امید ہے اسی ہفتہ کے اندر یہ تمنا پوری ہوگی۔
 گمان غالب ہے آپ اپنے ہیڈ کوارٹر ہی میں ہوں گی۔
 اور کیا لکھوں؟ بہت سی باتیں ہیں جو میں اپنے ساتھ ہی لے کر جاؤں گا۔
 اُن کا علم میرے سوانح نگاروں کو بھی نہ ہوگا۔

آپ کا ایک ہی
 ناخلف بیٹا
 شوق

روما

2 دسمبر 1952ء

محترم امی جان!

ابھی میں ایک خط قد سید کے نام لکھ کر پوسٹ کر چکا ہوں۔ اُسے سپر ڈاک کرنے کے بعد خیال آیا کہ مجھے
 آپ کے نام لکھنا چاہیے تھا۔ وہ بھلا کیونکر میرے خط کا جواب لکھے گی۔ خدا کرے میرا خط پہنچنے تک اسے بالکل آرام
 ہو اور وہ اس قابل ہو چکی ہو کہ مجھے اپنی تحریر میں جواب لکھے۔

لیکن خدا نخواستہ اگر یوں نہ ہو تو آپ مجھے واپسی ڈاک اس کی صحت اور تندرستی کے بارے میں لکھیے گا۔
 یہاں آپ کا خط پا کر کافی پریشان ہو گیا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ کا اگلا خط آنے پر یہ پریشانی دور ہو جائے
 گی۔ (انشاء اللہ)

میری صحت بالکل ٹھیک ہے۔ یہاں اتنی ٹھنڈ نہیں ہے جتنی لندن میں ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ میں نے کئی
 مونا سا اور کوٹ سلوا لیا تھا۔ بس میں یا ٹرام میں سردی ہرگز نہیں لگتی۔ ریڈیو کے سٹوڈیو اور کلاس کے کمرے بجلی کے
 دانوں سے گرم کیے جاتے ہیں۔ اسی لیے وہاں بھی کوٹ اتار کر کام کرنا پڑتا ہے۔

لینڈ لیڈی نے بڑی موٹی سی رضائی اوڑھنے کو دے رکھی ہے۔ اس لیے کسی مقام پر بھی سردی لگنے کا احتمال
 صحت پہلے پہل ماحول کی ناموافقت کی وجہ سے گرنے لگی تھی، اب سنبھل گئی ہے۔ پھل بھی کھاتا ہوں اور دودھ بھی پیتا
 لیکن ریڈیو پر راول پنڈی ریڈیو جیسا کام کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ذہنی ورزش ہو جاتی ہے۔

آپ کو مفصل خط پھر کسی وقت تحریر کروں گا۔ اب شام چھارہ ہی ہے اور لوگ گھروں سے نکل کر تفریح گاہوں
 کلبوں کو جا رہے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں یہ چند سطور جلدی جلدی گھسیٹ رہا ہوں۔

پرویز ان دنوں کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ اس کے متعلق بھی کچھ لکھتے رہا کیجیے گا۔ وہ میری بات نہیں

تکلیف ہے لیکن وہ مجھے سب سے عزیز ہے۔

میرے نام سے پہلے پروفیسر ضرور لکھا کریں (معاف کیجئے گا) اس لیے کہ جس مینشن میں رہتا ہوں، وہاں سب مجھے اسی نام سے پکارتے ہیں اور اس لیے بھی کہ وہ میرا نام ادا نہیں کر سکتے۔ پروفیسر میرے نام کا ایک حصہ سمجھئے گا۔
 یہ لکھا ہو تو ڈاکیومنٹ پریشان ہوتا ہے اور ہر ایک سے پوچھتا ہے اسحاق کون ہے؟

والسلام

خادم

شکو

روما

14 اپریل 1953ء

میری پیاری امی!

مجھے آپ کے دونوں خط ملے۔ ان دنوں چونکہ نظامی یہاں آئے ہوئے ہیں اس لیے انہیں سیر کے لیے ادھر لے جانا پڑتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جواب میں تاخیر ہو رہی ہے۔ آپ کے ڈیڑھ سو روپے مجھے بہت دن ہوئے مل گئے اس کے لیے آپ کا شکریہ ادا نہیں کر سکتا۔

کاکا کے ساتھ میرا حساب چلتا ہے۔ آپ خدا کے لیے عید وغیرہ کے تحفہ کا سوال پیدا نہ کیجئے۔ میں نے اس سے مانگے تھے۔ آپ سے تو میں پہلے ہی اس قدر شرمندہ ہوں کہ خط بھی نہیں لکھ سکتا۔ خیر یہ تفصیلی بات ہے پھر عرض کروں گا۔

آپ کو زمین اور پرویز فارم کی خوشیاں مبارک ہوں۔ میرے آنے تک تو اس میں فصل لہلہا رہی ہوگی۔ آپ نے مجھے کہا کہ پانی کب نکلا ہے۔ مجھے فکر ہے کہ اس علاقے کا پانی فصلوں کے لیے اچھا نہیں ہوتا۔ خدا کرے ہمارے فارم کے لیے پانی بیٹھا نکلا ہو۔ سانپ کے منہ کی بابت ابھی میں نے دریافت نہیں کیا۔ پرسوں پوری تفصیلات روانہ کروں گا۔

لمتان کے ہشپ صاحب نے جو خط یہاں لکھا تھا وہ میں نے بھی پڑھا ہے۔ لکھتے ہیں کہ اس طرح روپیہ بھیجنے میں بڑی دقت ہوتی ہے۔ وہ واقعی ٹھیک کہتے ہیں۔ آئندہ ہرگز مت۔

مجھے ریڈیو روم نے Foreign Service کے Best اناؤنسر کے طور پر دو سو روپیہ انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ مجھے آپ مجھے اور پرویز کو نکما کہا کرتی ہیں۔ میں نے اکتالیس اناؤنسر میں نام پیدا کیا ہے۔ مجھے شاباش دینے کو یہ نام اور میرا کام میری صحت برباد کر گیا لیکن اکیلا کام ہی اس کی وجہ نہ تھی اور بھی دکھ ہیں..... اب مجھے شاباش دینے اور خوش ہو جائیے کہ میں محض سفید معظّم نہیں ہوں۔ کیوں امی؟

میں نے ناچ سیکھنا شروع کیا تھا لیکن وہ لڑکی جو میری پارٹنر بنتی تھی، اس کی نانگیں اور ٹخنے چھل گئے۔ بیچاری تھی اور میرا ناچ ادھورا رہ گیا۔ استانی نے کہا تو میرے ساتھ ناچا کر۔ ایک دن اس کے ساتھ ناچا تو نیچے استانی اور اوپر

میں۔ وہ پتہ نہیں فرینچ میں مجھے گالیاں دینے لگی یا شاباش کہنے لگی۔ اس کے بعد میں وہاں نہیں گیا۔

روم میں اس وقت بارش ہو رہی ہے۔ سردی چند دن کے لیے دور ہوئی تھی اب پھر بڑھ گئی ہے۔ میں تو یہ نہیں ہوں کہ یورپ مجھ کو قلفی بنا دے گا۔

آپ کب تک ملتان میں ہیں اور اس کے بعد کس جگہ پر لگنے کا ارادہ ہے؟ یہاں کا محکمہ تعلیم تو بہت اچھا ہے۔ مثلاً مجھے ایسے غریب پروفیسر کو سینما، تھیٹر، کلب اور نمائشوں میں کہیں آدھے داموں پر اور کہیں مفت جانے کی اجازت۔ دفتروں میں ہیرا پھیری بھی نہیں ہوتی۔

میری صحت بہت اچھی ہے۔ تازہ فوٹو کھنچواؤں کا تو بھیجوں گا۔ جانی ماموں کو بہت بہت سلام۔ وہ آتے ہیں اور ان کی باتیں ہمیشہ یاد آتی ہیں۔

آپ کا باورچی جو جیب میں دھنیا اور نمک چرا کر لے جاتا تھا اُس کا کیا حال ہے؟ میں اس کا نام بھول گیا ہوں۔

پرویز کی صحت کا کیا حال ہے۔ آپ اس کو زیادہ کام نہ کرنے دیں۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ وہ بہت ہی اچھا لڑکا ہے۔ ذرا ذرا سی بات کا اُس پر بڑا گہرا اثر ہوتا ہے اور یہ اثر اس کی صحت پر بھی اثر انداز ہو رہا ہے۔ اس کی صحت خراب نہیں ہے اور مجھے ہر دم اُس کی فکر رہتی ہے۔

آپ کے پاس وقت ہو تو جواب ضرور دیجئے گا۔

والسلام

آپ کا
شوق

رہم

8 جون 1953ء

میری پیاری امی!

خدا آپ کو لمبی عمر عطا کرے کہ آپ ہی ہم ایسے بے نوا لوگوں کا سہارا ہیں۔ ابھی آپ کے دو خط ایک ایک ملے۔ ایک تو میرے دل سے لیس کا چھ پیسے والا لٹافہ تھا جسے دیکھے ایک جگ پیت گیا تھا اور ایک ایئر لائنز جو میرے لیے زندگی درجہ رکھتا ہے۔ اس سے پہلے بھی آپ کا ایک محبت نامہ مجھے ملا تھا لیکن میں حسب دستور جواب نہ دے سکا۔ کبھی کبھی آپ کے ساتھ اپنی بے وفائیوں کو محسوس کر کے شرم آنے لگتی ہے لیکن کوئی میرے دل میں کہتا ہے کوئی بات نہیں اپنی امی ہی تو ہے اور ہاں اگر ہم نے آپ کے ساتھ لاڈ نہ کیا تو اور کس کے ساتھ کریں گے؟

آپ نے مجھ کو اس مختصری زندگی میں اس قدر پیار بخشا ہے کہ یہ میرے لیے ساری زندگی کافی ہوگا۔ آپ کے ساتھ گزارا ہوا ایک دن اور ایک ایک لمحہ یاد آتا ہے اور امی مجھے اس وقت تو آپ بہت ہی یاد آتی ہیں جب ہوٹل کا شور بے کی پلیٹ ایک اور گرم پانی کی پلیٹ میں رکھ کر لاتا ہے۔ میں ہنس دیتا ہوں تو وہ پوچھتا ہے "Ricorda Mama"

اور میں دل ہی دل میں کہتا ہوں ہاں تھوڑا تھوڑا کیونکہ جب کسی کو زیادہ یاد کرتا ہوں تو پھر سگریٹ کا دھواں دیکھتا ہوں۔

آپ کی دو تصویریں میرے پاس ہیں۔ ایک میں آپ لکڑی کے پرانے (24- ایس کینال پارک والے) تخت پر بیٹھے ہیں۔ دوسری میں آپ کا کی کے ساتھ کھڑی ہیں۔ یہ تصویر مجھے یہاں سے لے کر لائبریری کے سامنے دیوار پر لگی ہیں۔ میں نے ان کو فریم نہیں کروایا۔ بس یونہی لٹکی ہوئی ہیں۔

اور امی! آپ نے یہ کیا کیا کہ فادر کو سو روپے اور دے دیئے۔ میرے پاس تو بہت سی رقم جمع ہو گئی ہے۔ اب تو میرے پاس آپ کو عید پر کچھ بھیجا کروں۔ الٹا آپ مجھے دیئے جا رہی ہیں۔ سچ مجھے اس وقت روپے کی ضرورت نہیں تھی۔ جب پڑی تھی میں نے آپ سے آپ ماگ لیا تھا۔ خدا کے لیے مجھے شرمسار نہ کیجیے۔ واقعی میں کسی جوگا میں نہ لگنے کی نہ امی کی کوئی خدمت کر سکا۔

اور نہ ہی..... اور امی بھلا کا کی اداس کیوں ہے۔ ایسا تو نہیں چاہیے۔ میں یہاں بالکل اکیلا ہوں۔ نہ کسی سے میل جول ہے۔ سفارت خانہ کا رخ میں نہیں کرتا۔ یہاں کے لوگوں سے باری میں نے نہیں لگائی۔ اس پر بھی میں اداس نہیں تو ہوں۔ میں روتی ہے۔ یوں کیوں ہے۔ اُس کو آپ ایسا ہی محبت بھرا خط لکھیں جیسا کہ مجھے لکھا ہے کہ وہ خوش ہو جائے گی۔ مجھے کا کی اور کا کا سے بڑا ہی پیار ہے۔ شاید آپ دل میں کہیں اور جیسا کہ شرارت سے آپ کی آنکھیں چمکا کرتی ہیں۔ چمکا کر کہیں کہ شاید کا کی سے زیادہ۔ لیکن نہیں امی (اور اب مجھے پھر تھوڑی سی ہنسی آرہی ہے) دونوں سے ایک کو پتہ ہے کہ جس نے کبھی کسی بڑے سے بڑے سے بھی تو نہیں کہلوا یا میری ایسی ایسی جھڑکیاں برداشت کرتا رہا ہے۔ میں نے باباجی کی بھی نہیں کہیں۔

وہ اتنا اچھا بھائی ہے کہ آپ کو اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ وہ آپ سے ناراض نہیں۔ اپنی خالوں سے ناخوش نہیں ہوا۔ اس کو تو بس ماضی میں کھوئے ہوئے وقت کا احساس ستاتا رہتا ہے اور اس کا علاج نہ میرے پاس ہے نہ آپ کے پاس۔ خود اس کے پاس۔ آپ کی زمین میں کاشت کرنے سے لے کر ہوائی جہاز کی اڑان تک اگر اس کو ایک مقام پر پہنچا دیا جائے گا۔ آپ بس دعا کیا کیجیے۔

آفتاب بھائی کا خط مجھے نہیں ملا حالانکہ وہ ہر ہفتہ لکھ دیا کرتے تھے۔ شاید اب کے میرے خط میں کچھ بات ہی ہے جس نے ان کو سراسیمہ کر دیا ہوگا۔ پتہ نہیں انہوں نے جواب کیوں نہیں دیا۔

آپ ریڈیو روما کو ریکارڈ ہرگز نہ بھیجیں اور اگر آپ واقعی کلچرل تعلقات اچھے کرنا چاہتی ہیں اور میری اور اپنے ملک کی عزت چاہتی ہیں تو Legation of Italia کو کراچی خط لکھ کر پوچھیے کہ آیا وہ آپ کے ریکارڈوں کا تحفہ Diplomat تھیلے میں ڈال کر ریڈیو روما بھجوادیں گے۔ ان کو بس اسی قدر لکھیے کہ میں ریڈیو روما کے پاکستانی پروگرام کو سن رہی ہوں۔ اس لیے یہ تحفہ بھجوا رہی ہوں۔

اور امی میری پیاری امی! جب مجھے کسی چیز کی ضرورت ہوگی میں خود ماگ لوں گا۔ آپ تو بس حد کر رہی ہیں!

اب ختم کرتا ہوں۔ میری کمر اور سر میں بلا کا درد ہو رہا ہے کیونکہ دفتر سے ریڈیو اور ریڈیو سے یونیورسٹی بارش میں اور گھومتا رہا۔ ایک تو موٹر سائیکل بھسلنے کا خطرہ اس پر آنکھیں بند کرنے والی بو چھٹاڑا! اب بستر میں لیٹوں گا۔ انگلیٹھیں گا۔ اس وقت آپ کا بھیجا ہوا سوئیٹر پہن رکھا ہے لیکن تھوڑی تھوڑی سردی لگ رہی ہے۔ ہاں سچ امی! کیا یہ بات ملتان میں لو چلنے لگی ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔

ایک بات اور سنئے۔ یورپ میں اپنی امی اپنے امی اور بھائی بہنوں (یعنی سب رشتہ داروں) کو ”ٹو“ کہتا جاتا ہے۔ مجھے یورپ کی بس ایک یہی بات پسند آئی ہے۔ اگر میں آپ کو اسی طرح مخاطب کیا کروں تو آپ کو ”ٹو“ لگے گا؟

اچھا امی! جب تیرا جواب آئے گا تو اور بھی باتیں لکھوں گا۔

Via Catome 16

Roma

25 اپریل 1954ء

میری پیاری امی!

ایک مدت کے بعد آپ کا خط ملا اور وہ بھی اس وقت جب میں روما میں نہیں تھا اور اباجی کے کام سے میں ہوا تھا۔ مجھے آپ کا خط پا کر اس قدر خوشی ہوئی کہ ملتان آنے کو جی لپجانے لگا۔ آپ کے خط میں ایک فقرہ پڑھ کر میں رہ گیا کہ آپ کے کھیت میں سبزیاں اُگ آئی ہیں اور خربوزے پک گئے ہیں۔ خربوزے تو گرمیوں میں پکا کرتے ہیں۔ کونسی رُت خربوزوں کی پاکستان میں چل نکلی ہے۔

میں اس وقت کسبل میں لیٹا ہوا یہ خط تحریر کر رہا ہوں۔ یہاں سخت سردی پڑ رہی ہے اور میرے ہاتھ چمکے ہوئے جارہے ہیں۔ جب میں میلان گیا تھا تو اپنا اوور کوٹ اس لیے ساتھ نہ لے گیا کہ اب تو گرمیاں آگئی ہیں۔ گرمیوں وہاں پہنچا سرد ہوا میں چل رہی تھیں۔ میں اپنے ہوٹل میں انگلیٹھی کے سامنے بیٹھا ایک ناول پڑھتا رہا۔

اگلے دن کام سے باہر نکلا تو پہلے بارش شروع ہوگئی۔ اس کے بعد بر فباری نے گھیر لیا۔ میرے سینے میں سخت شروع ہو گیا۔ جس فرم سے مجھے کام تھا، انہوں نے مجھے ٹیکسی میں ڈال کر ہوٹل پہنچا دیا۔ اس ایک دن میں کوئی براعتیہ آدمی بوتل حلق سے نیچے اُتری۔ گلاسوج گیا مگر سردی دور نہ ہوئی۔

میں نے آپ کو بہت یاد کیا اور سب لوگوں سے جی ہی جی میں اپنی خطاؤں کی معافی مانگی لیکن اگلے دن آنکھ تو میں بدستور زندہ تھا۔

کاکا نے اتنا اچھا موٹا سوئیٹر بھیجا تھا، میں وہ بھی ساتھ نہ لے گیا۔ مجھ سے بے وقوف صاحبزادے پیدا ہوئے اب بند ہو گئے ہیں۔ آپ ذرا میری قدر کیجیے۔ لوگ کہتے ہیں ایسا موسم نہ یورپ میں پہلے دیکھا تھا اور نہ اس کی امید تھی

میں پھر میں پس چلا تھا مگر بیچ گیا۔ کام پورا کر کے واپس روم آیا ہوں۔ اب تو مجھے آپ کی اور ابا جان کی طرف سے...

بھی ریڈیو کے محکمہ موسم نے بتایا ہے کہ کل سورج نکلے گا۔ سواں اُمید میں خوش بیٹھا ہوں اور گیت گارہا ہوں۔
میں نے خود بنایا ہے اور اس میں دس مرتبہ سورج کا پانچ مرتبہ دھوپ کا ذکر آتا ہے۔ اب یہ خط ختم کر لوں گا تو اس
مرتبہ خربوزوں کا اضافہ بھی کروں گا۔ مجھے خربوزے بہت اچھے لگتے ہیں۔ میں آپ کے کھیت میں اتنا کام
کرتا ہوں کہ نئی دے بچوں اور میری لالچی بیوی کے بہت سے خربوزے ہڑپ کر جانے کے بعد بھی آپ کو کوئی
...

آپ خدا کے لیے عیدی و عیدی کی فکر نہ کریں۔ میں سچی بات کہہ رہا ہوں۔ یہ رقم آپ کا کی کو دے دیں۔ مجھے
اور وہ بار بار اس کا تقاضا کرتی ہے۔ ایک مرتبہ میں نے اس سے نو آنے لے کر سگریٹ کی ڈبیا خریدی
تو مرتبہ کہہ چکی ہے ”اشفاق صاحب ہے تو شرم کی بات اور مجھے بار بار تقاضا نہ کرنا چاہیے مگر آپ کو میرے نو آنے
کو ایک مرتبہ امی! جب میں نے چڑ کر کہہ دیا تھا کہ جائیں نہیں دیتا۔ اس لیے کہ میرے پاس نہیں ہیں تو اس
میرے سر پر پٹکھی ماری تھی۔ اس لیے ناکہ میں شریف آدمی ہوں اور آگے سے بولتا نہیں ہوں۔ اگر
...

تو سانس تریلی سے میری لڑائی ہو گئی ہے اور میں اس سے بولتا نہیں ہوں۔ اس لیے آپ ہرگز ہرگز اس کے
جب سے نہ ملیں اور نہ عیدی و عیدی ہی کی درخواست کریں۔ یہ میری التجا ہے۔ سانس تریلی ایسے برے عیسائی ہیں کہ
میں ان کو پسند نہیں کریں گے۔ مجھ سے چکار چکار کر کام لیتے رہے اور جب ایک دن میں نے ان سے کام کرنے کو
تاری ہو گئے۔ میں نے انہیں خوب خوب برا بھلا کہا۔ (جس کا مجھے بعد میں افسوس بھی ہوا) اب میں ان سے
وہ دفتر کے سب لوگوں سے کہتے پھرتے ہیں کہ اشفاق کی مجھ سے صلح کرادو لیکن میں کسی سے دیتا نہیں ہوں
مجھ سے دبتے بھی ہیں۔ امید ہے اب آپ پر بات کھل گئی ہوگی۔

نوٹو یہاں آئی تھی اور ڈھائی دن رہ کر چلی گئی۔ لندن سے ان کا ایک گروپ اطالیہ کی سیر کرنے آیا تھا۔ اس میں
چند قریب چغڈی لڑکیاں اور احمق سے لڑکے تھے۔ نوٹو کی میں کچھ بھی خاطر مدارات نہ کر سکا۔ دو دن کے بعد میری موٹر
کھانے کیا ہوا کہ سارٹ نہ ہوتی تھی۔ بارش زوروں پر تھی اور مجھے اس کے ساتھ بس یا ٹرام میں جانا پڑا۔ نوٹو تو چلی گئی
مجھ کے لوگوں نے میری زندگی آفت میں ڈال رکھی ہے۔

کبھی پوچھتے ہیں وہ حسین لڑکی پھر کب آئے گی؟ اس مشرقی حسن کی دیوی کا پتہ کیا ہے؟ میرے بہت سے
لیے مسلمان تک ہونے کو تیار ہیں۔ نوٹو کو اس کے حسن کے Compliments جس قدر روم میں ملے ہیں
وہ خود حیران ہو کر روم کے حسن کو دیکھتی تھی اور لوگ اس پر دیوانہ ہوئے جاتے تھے۔ اس ڈھائی
میں ایک مرتبہ جب موسلا دھار بارش ہو رہی تھی میری اور نوٹو کی لڑائی بھی ہو گئی۔

وہ کہہ رہی تھی آپنی ملک نے تم کو خط لکھا ہے اور تم نے جواب نہیں دیا اور میں عرض کر رہا تھا کہ ملک نے

مجھے نہیں لکھا۔ پتہ نہیں ہم میں سے کون سچا تھا لیکن بات یہاں ختم ہوئی کہ مجھے ٹوٹو کے منہ سے ”سبھی مرد ایسے ہیں“ سننا پڑا۔ میری وجہ سے بیچاری ساری مرد قوم کی بے عزتی ہوئی۔ اس کے لیے میں مردوں کے سامنے شرمندہ رہوں گا۔

آپ حلوہ وغیرہ بھیجنے کی فکر نہ کریں۔ ہاں اگر آم روانہ کر سکیں تو کمال ہو جائے بلکہ یہ تو ضرور ہی بھیجے گا جن لوگوں نے اُن کا مزا چکھا ہے۔ انہوں نے دوسروں کی (جنہوں نے نہیں چکھا) زندگی حرام کر رکھی ہے۔ میں آپ بھیجے ہوئے آموں سے ایک پھانک بھی نہ کھاؤں گا۔ یہ اخالوی لوگ کھائیں گے تو خوش ہوں گے۔

یہ میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ڈاکٹر ولونیکا صاحب (ہمارے مسلمان بھائی) کو ان کا حصہ ضرور دوں گا۔ اُن کا حصہ پہلے۔ اگر یہاں ہوائی اڈے پر پہنچ گئے تو میں نیٹ لوں گا۔

پرسوں آپ کے خط کے ساتھ حکومت اطالیہ کا خط بھی ملا کہ اکتوبر میں آپ کا معاہدہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس معاہدہ کرنے کی مہربانی فرمائیے گا۔ اب کی بار حکومت کچھ اس قدر خوش ہوئی ہے کہ ایک سال کے بجائے پانچ سال کے معاہدے کی بات کر رہی ہے۔ میں چپ ہوں اور اس خط کو گول کر رہا ہوں۔

اگر کاکی کو یہ خبر سنائی جائے تو وہ قتل کر دے۔ واقعی اس کے ساتھ نو مہینے کا وعدہ تھا اور میں دو سال یہاں گیا۔ یہاں نہ کچھ کھویا نہ پایا۔ بس اپنے ڈھرے پر زندگی چلتی رہی۔ پہلے ہاتھ سے روٹی کھاتا تھا اب کانٹے سے ہوں۔ پہلے لوٹالے کے غسل خانے جاتا تھا، اب خالی ہاتھ سیٹی بجاتا جاتا ہوں اور خالی ہاتھ ہی واپس آتا ہوں۔ فرق اتنا ہے کہ آتی مرتبہ سیٹی نہیں بھتی کیونکہ طبیعت ذرا پریشان ہی ہوتی ہے۔

سب سے بڑی بد نصیبی یہ ہوتی ہے کہ ان دو سالوں میں ایک بھی یورپی لڑکی سے عشق نہیں کر سکا۔ اول بڑی محبت سے ملیں لیکن جب میرے لچھن دیکھے تو واپس لوٹ گئیں۔ پاکستان واپس آنے سے پہلے کم از کم ایک حیدرآباد سے خطرناک طور پر محبت کرنی چاہتا ہوں لیکن ڈر ہے کہ ہونہ سکتے گی۔

اگر میں یورپ سے ایسا ہی آلوں تو میرے کالج میں سٹاف روم میں سب میرا مذاق اڑائیں گے۔ آج سے چار مہینے پہلے تک میرے ساتھی پروفیسروں پر میرا اچھا اثر تھا کیونکہ میں نے انہیں لکھا تھا کہ زیادتی کا قائل ہوں۔ بس دن میں دو بوتل شراب پیتا ہوں اور ایک لڑکی بغل میں رکھتا ہوں۔ وہ خوش تھی کہ چلو بہت نہ سہی اتنا ہی کافی۔ لیکن چار مہینے پہلے پنجاب یونیورسٹی کا ایک کیمت یہاں آدھمکا۔ اس نے جو مجھے دیکھا تو ایک تفصیلی خط دوستوں کو لکھ کر پاکستان سے بھی گیا گزرا ہو گیا ہے۔ اب سب لوگ مجھے گالیاں دے رہے ہیں۔ چنانچہ میں ایک عدد محبت کرنے پر مجبور گیا ہوں۔ اس لڑکی کے خط اور فونو ساتھ لاؤں گا۔

اثر صاحب کے بارے میں کوئی خبر موصول نہیں ہوئی۔ آپ پھر اپنے دفتر آ گئی ہیں کیا؟ ملک کا کیا حال ہے انہیں میرا سلام کہنا۔

میرا افسانہ ”گڈ ریا“ پتہ نہیں لوگوں کو اتنا کیوں پسند آیا ہے کہ اب تک ہندوستان اور پاکستان سے خط آرہے ہیں۔ مجھے افسانے سے زیادہ اس بات کی خوشی ہے کہ میرے پبلشر نے بڑی محنت سے مجھے اس کا معاوضہ روہ

کیا آپ مجھے جواب دیں گی؟

صرف آپ کا
شکو

C/o Zubey Artist.

Post Box 509

Lahore

24 نومبر 1951ء

امی! سلام مسنون۔

ابھی چند لمحوں کی بات ہے۔ میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ صادق آیا اور یہ خط مجھے دے گیا۔ اس نے کہا کہ اس خط میں جاسکا اور نہ بی بی جی کا یہ خط ہی مکتوب الیہ کو پہنچا سکا۔ آپ وہاں تو جائیں گے ہی۔ یہ خط لے لیجئے! میں نے اس وقت تو خط لے لیا لیکن بعد میں خیال آیا کہ میں تو کینال پارک نہیں جا رہا ہوں..... بہر کیف خط ارسال خدمت ہے جسے تمہاری ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی۔

ایک کارڈ بھی روانہ کر رہا ہوں۔ یہ آپ خود پڑھ کر کاکی کو سنا دیجیے۔ اس نے تو مرزا والے خط کا برا مان کر سب سے عیب خراب کر دی تھی۔ اب اگر میں اس کارڈ پر رنجیدگی کا اظہار کروں تو کس مان پر؟ رات بلیک آؤٹ ہوا۔ بڑا مزا آیا۔ میں اپنے چوہارے کی تکی چنگ سے جلاتا۔ سیٹیاں بچنے لگتیں۔ اباجی گھبراہٹ سے اٹھ کر مجھے بڑا لطف آتا۔ لڑائی کا انتظار کر رہا ہوں اور بڑی شدت سے کر رہا ہوں۔ پھر بہت مزا آئے گا۔ بچوں کو پیار۔

والسلام

احقر

شکو

1- مزنگ روڈ

لاہور

23 مئی 1951ء (11 بجے صبح)

کاکی! سلام مسنون۔ میں نے آج سیالکوٹ ایک اور تار دے دیا ہے کہ 24 ماہ حال سے پہلے نہیں آسکتے اور شاید میں نے اچھا ہی کیا۔ اس طرح میں کل صبح سنٹر پر شفقت کے لیے دعائے خیر کہنے جا سکوں گا۔ نوکری تو تھی ہی رہتی ہے لیکن ایسا موقع کم ہی ہوتا ہے۔ خدا کرے وہ پاس ہو جائے اور دنیوی اور اخروی نعمتوں سے نالاں ہو۔

امی کی طبیعت اب کیسی ہے؟ ان کا مفصل حال مجھے کل بتانا۔ مجھے بڑا ہی افسوس ہے کہ مجھے بیمار پرسی کے نہیں آتے۔ خدا گواہ ہے کہ کسی صاحبِ فراش کو دیکھ کر مجھے اس سے بڑی محبت ہو جاتی ہے لیکن ایک عجیب قسم کی شہت بائیں نہیں کرنے دیتی۔ مجھے پتہ نہیں لگتا کہ میں کیا کروں اور اس سے کیا پوچھوں! لیکن میرا جی چاہتا رہتا ہے کہ وہ بیمار ہو جائے اور پھر کبھی بیمار نہ ہو۔ امی کو میری اس فطرت سے مطلع نہ کرنا درنہ ان پر میری سپاٹ فردیت کی ایک اور سبب اُجاگر ہو جائے گی۔

کل میرا چکور بھائی جان کی مسہری کی لائٹی گرنے سے لنگڑا ہو گیا۔ ٹھیک طرح سے چل پھر نہیں سکتا۔ میرے پاس کوئی دوائی نہیں ہوتی۔ میں نے اس کی ٹانگ پر بالوں کو لگانے والا تیل لگا دیا ہے۔ دعا کرنا کہ پھر اُتے پھرتے ہنستے بولتے دیکھوں۔ میرے لیے تو یہ صاف شکن ہوتا جا رہا ہے۔

ہمارے علاقے میں اس قدر گرمی پڑتی ہے کہ اس کا ذکر ہی فضول ہے۔ آج اخبار میں پڑھا کہ سکھر میں آدھی گرمی سے ہلاک ہو گئے۔ پتہ نہیں بیچارے قیدیوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی جنہیں شام کے سات بجے ہی بارش بند کر دیا جاتا ہے۔

اسحاق بھائی آج صبح کراچی روانہ ہو گئے ہیں اور وہ ایک ہفتہ تک لندن پہنچ جائیں گے۔ میں نے ریکھا پر تھوڑا بہت یقین رکھتا تھا۔ اب ہتھیلی کے ان سپولیوں پر ایمان لے آیا ہوں۔ واقعی ہر کام اُس کی طرف سے ہوتا ہے۔

سب کو سلام۔

والسلام
دعا گو
شکو

17 اگست 1952ء

ابھی تمہارا تار ملا۔ مبارکباد کا شکریہ لیکن دیکھ لو پیارے زندگی کا ایک اور سال گھٹ گیا۔ ہے نا افسوس کی بات۔ کتاب کے حقوق ابھی تک فروخت نہیں کیے تھے کہ تمہارا تار ملا اور میں رُک گیا۔ تار میں لکھا ہے کہ پانچ روپے کا بندوبست ہو گیا۔ اس کا مطلب کیا؟

کیا سچ سچ کے پانچ ہزار روپے یا لائری، معصے کی رقم؟

کل کا دن مجھا اور صاحب کی حضوری میں گزرا۔ صاحب کی صحت دن بدن ٹھیک ہو رہی ہے۔ میں ان سے بہت زیادہ سونے لگا ہوں یعنی شام آٹھ بجے سے صبح آٹھ بجے تک۔ تم آؤ گے تو ایک دوسرے کو دیکھ کر پھر ویسی محنت شروع کر دیں گے۔

لاہور میں بارشیں بدستور ہو رہی ہیں لیکن تمہارے بغیر لطف نہیں۔

یونیورسٹی سے ابھی تک رقم نہیں ملی۔

جب بھی ملے گی ویسی کی ویسی رہے گی۔
 آلو کی نکیوں اور آکس کریم کی بالٹیوں پر خرچ نہ ہوگی۔
 سب کو سلام۔

تمہارا
 شفو

(ریزی کے نام)

بیارے پرویز!

اور سناؤ تم نے کراچی یونیورسٹی کا Crescent بنا یا تھا اُس کی رقم ملی یا نہیں۔ تم بھی بس سو گئے ہو گے۔ یار اس
 کیسٹ کے منظور ہو جانے سے مجھے اس قدر خوشی ہوئی کہ پاگل ہو گیا۔

میں زندگی سے پہلے ہی تنگ تھا۔ یہ کار لے کر اور بھی دکھی ہو گیا ہوں۔ سالے سالے روم میں گھومتے رہو۔
 (Parking) کی جگہ نہیں ملتی۔ کسی بھی جگہ کھڑی کرو، حرام زادے سپاہی سیٹیاں بجانے لگ جاتے ہیں۔ کبھی تو میرا
 پتہ ہے سانی کو آگ لگا کر بھاگ جاؤں۔ بھلا میرے جیسے شریف آدمی کو پارکنگ کی ہر جگہ اجازت کیوں نہیں دیتے؟
 یہاں کے سپاہی ایسے آلو کے پٹھے ہیں کہ چائے کافی کی رشوت بھی نہیں مانتے۔ بس کاپی نکال کر سر پر کھڑے
 رہتے ہیں۔ اگر سیدھے شریف آدمیوں کی طرح سڑکوں پر گھومتے رہو تو بھی روک لیتے ہیں اور بریک دبو اکردیکتے ہیں
 جتنی جتنی ہے یا نہیں۔ یہ بھی اُلٹا ملک ہے کہ اگلی بتی جلے نہ جلے پھجلی ضرور جلے۔

بھیڑ سڑکوں پر اتنی ہوتی ہے کہ میں تو رام نام لے کر چلتا ہوں۔ اگر کسی گزرنے والے کے کوٹ سے موٹر لگ
 جاتی ہے تو پچاس روپے ہرجانہ لیتا ہے کہ مجھے خوفزدہ کیا۔ اس سالے سے کوئی پوچھے کہ ہمارے یہاں تو کوئی موٹر کے نیچے
 کچھ تو بھی اُس سے کچھ نہیں لیتے۔ یہاں خوف کھانے کی رقم بھی لے لیتے ہیں۔

کیا تم زوبی صاحب سے کبھی ملے ہو؟ اُن کا کیا حال ہے اور وہ کیا کرتے ہیں؟ روما کی لڑکیاں اُن کو پسند کرتی
 تھیں۔ سردی بے عزتی کرتی ہیں کہ تم تو بدھو ہو۔ بس کتاب کا علم جانتے ہو اصلی علم نہیں جانتے۔ ہاں سچ ریزی..... نئے
 نئے سچے سچے لینے کا انعام لیا تھا۔ بس دکھا ہی کیا۔ خدا نے عزت رکھ لی ورنہ میرا تو برا.....

بہت تنگ آ گیا ہوں۔ جرمنی کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسری ملتی ہے لیکن وہاں سردی بہت ہے۔ سردی کم
 کرنے کے لیے پیٹ پر چادر ڈال کر سوتا ہوں۔ تم نے بہت بری بری عادتیں سکھا دی ہیں۔

اچھا اب ختم کرتا ہوں۔ دعا کرو کہ کیمرا خرید سکوں۔ جب تم کراچی آنا تو اپنے ساتھ سو دو سو روپیہ لے کر آنا۔
 یہاں کی ڈیوٹی دے سکوں۔ نہیں تو میں Tape Recorder سمندر میں پھینک دوں گا۔ یہ Recorder میں نے
 سنا ہے کہ وہ اچھا نہیں گاتی ہیں۔ ان کی آواز بھر کر ان کو سنائیں گے تو جنابہ قدسیہ چٹھہ کو پتہ چلے گا۔ ہاں سچ
 سچ آتی تھی۔ ریڈیو پر میں نے اُس کے ساتھ انٹرویو کیا۔ مگر بھائی! وہ تو ایسی تیزی سے بولی کہ پندرہ منٹ کا سکرپٹ
 پچاس منٹ ختم کرنے لگی۔ میں نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے مصیبت مالی۔ اب بتاؤ ہم ان لڑکیوں کو کیسے سمجھائیں۔

یہاں ایک ہندو لڑکی ایک دن کے لیے آئی تھی۔ اس سے مجھے عشق ہو گیا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ وہ امریکہ چلی گئی۔ وہاں سے اُس نے خط لکھا تو میں موٹر سائیکل سے گر کر بستر پر لیٹا تھا جو اب نہ دے سکا۔ اب پتہ نہیں ہے۔ اس بات کو ایک سال گزر گیا۔ بس یہ آخری عشق تھا۔ روم میں سب حرامزادی لڑکیوں نے میرا نام پادری دیا ہے۔ جب میرا بیٹا ہوگا تو میں اُس کو کھلی چھٹی دے کر روم بھیجوں گا۔

اچھا بھئی اب میں ذرا سا پیٹھا کھانے لگا ہوں۔ تمہارا ڈبہ اس کا سارا شیرہ چوس رہا ہے۔ بیدی آپا کا ہے۔ سالے کینے کتے تُو نے بھی کئی گھر برباد کیے ہیں۔ میں آ کر تیرے جوتے لگاؤں گا۔

صرف تمہارا ہمیشہ تمہارا

شکو

☆ ریزی نے 1952ء میں کراچی یونیورسٹی کا کریسٹ بنایا تھا۔ آج تک وہی کریسٹ چل رہا ہے۔

ریزی کے نام (والد کہہ کر مخاطب کرتے تھے)

18 اگست 1952ء

ابھی تمہارا خط ملا اور ابھی میں کچھری جا رہا ہوں۔ 5 ہزار روپیہ بھلا میرے کس کام آئے گا۔ مائی ڈیڑھ لاکھ صرف ایک ہزار کی ضرورت تھی، سول گیا۔ تم اگر مجھے شاپنگ کرا دو اور اگر ہو سکے تو ایک عدد Sight Weight کیس لے دو۔

کھلونوں کا کام شروع کرو اور جب تمہارے پاس بارہ ہزار روپے ہو جائیں تو مجھے اطلاع دو۔

Senes کو تو میں روم سے بچھاؤں گا۔ اس کے علاوہ گراموفون مشین کے بارے میں بھی تمہاری مدد کریں۔

روم میں میں ریکارڈنگ کرا کر بھیجتا رہوں گا۔

شاید ہمارے اچھے دن قریب آ رہے ہیں۔ (صرف مالی لحاظ سے ذہنی لحاظ سے نہیں۔)

اچھا کچھری جاتا ہوں۔ اس کے بعد اثر صاحب سے ملنا ہے۔

تمہارا

بڑا والد

عمارخ مزارخ

Dear Maka,

If the 3rd of next month I have Lahore for Multan (By mail) would it

suit you? Which station you suggest? Cantt. or City?

Your Shukko

27-5-1952

Lahore

26-5-1952

Dear Idiot,

Some three days before I wrote you a detailed letter having every description of my doings in your absence. It was placed in the dictionary for so intactness. But instead of steadiness it gave much to elopement and was kidnapped. Who removed it I do not know. When wish removed? I can say at the dead of night when as ~~some~~ came to my house borrowed the book, took it to home and did what even he liked.

Anyway, dear idiot, I am well and happy and me serious very ~~serious~~ about Yousaf sahib date 7. I can easily smell a rat in every happening. And here I smell about two dozen of rates. He is a genuine man and can help.

To-day I will start brewing at home (24-Canal Park), don't worry. When are you coming back, I am trying to know "her" responsibilities and duties? If so, I may come to you. Let me know you are progressive. Should I come on 3-6-52?

I am keeping fast and rumbling wet cloth on my legs. All the nerves (which are concerned with writing) have refused to work. Kindly excuse me for this small letter and its telegraphic language.

Your's B. Wala

Shukko

Lahore

15-5-1952

Dear Bho Wala,

Drawing is too hard.

Thank you.

Do not write any letter to.....

For God's sake don't

Don't!

Don't!!

Don't!!!

Detailed letter with your portrait, Tomorrow!

Shukko

Lahore

17-5-1952

Dear Razeer,

You must have received my last day's letter. Here I send you your portrait. Is this the thing you required? How I managed to get it, is a long story which you may hear from Qudsia.

You have taken great pains in delineating the drawing. I have shown it to the publisher and it has been forwarded to block maker who was much astonished to see it and was compelled to praise the craft of the artist who has done it with great skill for good results of 1/2 fore block

Dear one! Don't write any letter to bitter things are tasted once and left for others to taste it for experience. You are experienced enough and need not start the path you had been traveling for some time off the trash you went. Everybody saw you going astray and could not help. Do you still dare to write a letter at the cost of your regulation? Every goal seeks certain pack of systematic movements in the man in whose favor it is going to be jelled. We lack most of the required movements. Let us credit them first in the ledger of courage and then proceed. If once you go bankrupt no money can drain the disintegrated and ruptured honour. Think! And DO NOT write.

On the seventh of this month I reached there before time. Waited for him about two hours. Puffed half of the Capstain's packets contents. Backed up and down the canal for about 135 times. He did not turn up. Never sent a message. I think he must have been occupied. Must have gone some where. Or dead. If he still lives, I am sure he would come again. He would see us, hear us and help us. We the sons of humble parents!

Go on working. Anything may come out of labour. Any moment some red iron may appear. We may wake. Hit it and sleep again. And this slumber will never be disturbed. She who hit iron will protect our sleep. But the condition is to work and work. Bundle of kisses sweet, sour, bitter, tasteless and pungent assorted kisses in large packing.

Your
Shukla
Idiot

29-5-1952

Dear Idiot

1. Should I come on 3-6-52?
2. Where should I get down?
3. Where is your home situated?
4. And, if I am not granted to the required LEAVE will you

excuse me.

Rigge Idiot
Shukla

To reduce material desires doesn't always
Brings peace to mind. In order to live in peace.
Spiritual desires must also be reduced

(Kappa, Akutagawa)

ALONE

Thy young son

Eating his lunch, heard a plane go overhead, and put down his spoon. Remarking, the pilot does not know I am eating a egg. He smell shocked, just as if he had never known nor suspected he was locked in, from the beginning alone.

Buried alive in a body not my own the work apish, the feet a slaver

stands a woman's out of work.

The eyes as enemy's the teeth a dog's

The lips politic, the tongue a traitor's

The legs ill at ease, the ears not matched

the venal severed, the groin itchy.

The slain sun learned by day, goose fleshed at night.

The lungs drawing with air, the brain groggy

Buried alive in a body not my own.

(T.S.Mathews)

No one gives you a black eye,

You have to fight for it

The height of laziness

Is getting somebody else

To do you ours sting

Is a man

With a transplanted ticker

Living on borrowed time?

Modern technology

Owes ecology

An apology

Some have greatness thrust upon them

Others get it otherwise

Why the hell was mine all scattered

Round my waist and hips and thighs?

Over and above everything else

Jeremy was in love with himself

But he did not get on then

Why am I here

(When half me's asleep
 And the other's sill in bed)
 Making the coffee
 With tea bags.
 I don't need you for testing
 I have enough trouble with my own thoughts
 The solution
 To pollution
 Is hold you breathe?
 until your death
 Is I
 See on my back and cry
 Tears collect in my ears
 I am
 Completely, hopelessly, madly
 Passsionately, deeply, confusingly,
 Totally, absolutely, felly,
 Wholly, knowingly, desperately
 In love
 With you
 I think.
 Nostalgia's all right
 But it's not it was

خاں صاحب کی رنگارنگ زندگی، اُن کی تخلیقی قوتوں کی نیرنگی، اُن کے سفر و سفر، مختلف طبقات میں تعلقات کی
 سوج بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ یہ سارا تنوع ایک طرح سے تلاش کا سفر تھا۔ یوں تو ہر انسان
 کو تلاش کرنے کے درپے ہے لیکن اُن کی کہانیاں، ڈرامے، زندگی سب اس بات کے مظہر ہیں کہ ساری عمر وہ کسی
 شے کو تلاش کرتے رہے۔

یہ اشرف المخلوقات کا نصیب ہے کہ وہ کھوئی ہوئی جنت اس دنیا میں ڈھونڈتا ہے یا پیچھے کی یاد سے جینے

نہیں دیتی۔ شاید یہی بے نام بے قراری خاں صاحب کا مقدر تھی اور وہ ساری عمر گم گشتہ جنت کی تلاش میں رہے۔
 کا اصل مقصد جاننا چاہتے تھے۔ انسان کس لیے تخلیق کیا گیا ہے؟ اُس کی زندگی کیا کسی خاص مصرف کے لیے ہے؟
 اُن کے لیے شاید یہ سمجھنا کاردار تھا کہ مادی زندگی کا حصول اور روحانی سفر میں مطابقت کیسے کی جائے۔
 ایسے فارمولے کی تلاش میں تھے جس کی مدد سے وہ زندگی کی ٹرین کو ان دونوں پٹریوں پر توازن کے ساتھ چلا سکیں۔
 جو لوگ ان کی کہانیوں سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ اُن کی پہلی کہانیوں میں ”رنگ رلیاں“ ”حوش“
 مظہر ہیں اور جو آخری میں ”من چلے کا سودا“ ”زاویہ“ ”سجھانے افسانے“ میں بدل گئی۔

بہر کیف ذاتی زندگی میں جب جہلم، پنڈی، اسلام آباد، ترائی، کھیل کے چھوٹے چھوٹے سفرنا کانی جانے اور اُن کے اندر کی کیفیت یا تضاد کسی طور پر چل نہ ہو تو انہوں نے ایک لمبی اُڑان کی ٹھانی۔ زوبی ریڈیو روم سے چکے تھے۔ سید عابد علی عابد نے خاں صاحب کو چھٹی دے دی۔

ISMEO سے پیئر سانتریلی کا Appointment Letter آ گیا۔ سب کوائف پورے ہوئے۔
 شفقت کا مجھ سے بڑا دوستانہ تھا۔ وہ میرے پاس 24- ایس کینال پارک آتی رہتی تھی۔ کالج کی مشورے
 ہمارا کافی وقت لے لیتیں۔ شفقت میں عجیب خود اعتمادی تھی۔ انارکلی کے باہر وہ کسی چوہارے میں رہتی تھی۔ میرے
 یہ عالم تھا کہ کبھی اُس کے گھرا کیلی نہ جاسکی اور وہ تھی کہ اگر چاند کے سفر پر بھی اُسے جانا ہوتا اور پیراشوٹ سے چھوٹتا
 ہوتی تو وہ لمحے بھر کونہ سوچتی۔

زوبی جب اٹلی جانے والے تھے تو خاں صاحب زوبی کو میرے پاس ایک بار لے آئے۔ پھر خاں صاحب
 بھاگنے کے لیے اشارہ ہی کافی تھا۔ وہ زوبی صاحب کو روم کے لیے الوداع کہنے کراچی تک گئے۔ حسن اتفاق سے
 زندگی میں جو سب سے لمبا خط ملا وہ کراچی سے ہی لکھا گیا تھا۔

آپ اندازہ لگا لیجئے کیسے اشفاق صاحب وقت کو ساکت کرنے کا فن جانتے تھے۔ سمندر کی متلاطم لہروں
 دیکھتے ہوئے ساحلی ریت کو کاغذ پر سے جھاڑتے ہوئے اس خط کو پوسٹ کرتے وقت پتہ نہیں انہوں نے کتنی
 ہوگا..... پوسٹ کروں..... یا پھاڑ دوں؟

پھر وقت گزر گیا۔ زوبی اپنا وقت پورا کر کے لوٹ آیا تو اشفاق صاحب بھی ایک اور نتیجے پر پہنچ گئے تھے۔
 علم ہو گیا تھا کہ چھوٹے چھوٹے رابطے اور چھوٹے چھوٹے سفر سب پر کار ہیں۔ 1- مزنگ روڈ سے 24- ایس کینال
 کی گردش بے ثمر۔

دیال سنگھ کالج کی پروفیسری نے انہیں دو ایک منظور نظر قسم کی لڑکیوں سے ضرور متعارف کر دیا تھا لیکن یہ
 بھی بے سود اُن کا وقت ضائع کر رہی تھیں۔ وہ کسی ایک سڑک پر، کسی ایک مسلک کے ساتھ، کسی ایک مصرف کا ہو کر
 گزارنا چاہتے تھے۔

اسی لیے انہوں نے ایک لمبی اُڑان کا سوچا۔ 1952ء میں انہوں نے روم ہجرت کرنے کی ٹھانی۔
 دوست زوبی روم ریڈیو پروگرام کر رہے تھے۔ اُن کی واپسی پر یہ جگہ خالی تھی اور خاں صاحب کو قومی امید تھی کہ انہیں

پر اردو سروس کی نوکری مل جائے گی۔ اس وقت وہ دیال سنگھ کالج میں پروفیسر تھے۔ سید عابد علی عابد ان دنوں تھے۔ وہ سید عابد علی عابد کے پاس پہنچے۔

”کیوں بھائی چھٹی کیوں چاہتے ہو؟“

”مجھے روم جانا ہے سر۔“

”بھائی احمق نہ بنو۔ کیا وہاں سے نوکری کنفرم ہو جاتی ہے؟“

”جی یہ دیکھیے یہ پیئر سائنٹرلی کا خط ہے۔“

اکتوبر کا مہینہ تھا، نہ سردی تھی نہ گرمی۔ میں اگر اپنے لیے افسردہ اور اس تھی تو مجھے اتنی خوشی ضرور حاصل تھی کہ میں صاحب پالا کو آکر مجھے چھوڑنے پر پوری طرح کار بند ہو چکے تھے۔ بالآخر کسی سے مشورہ کیے بغیر کسی اظہار میں جائے بنا میں نے ایک مثبت فیصلہ تو کر لیا۔

ریزی نے فیصلہ کیا کہ وہ شوقو کو ملتان تک خدا حافظ کہنے جائے گا اور ملتان کے سٹیشن پر اتر کر امی کے پاس چلا جائے گا۔ ریزی، لالو اور میں رات کے وقت میاں میر کے سٹیشن پر پہنچے۔ یہ ان دنوں ایک بہت معمولی سا پلیٹ فارم تھا جس پر مسافروں کے لیے دو تین بنچیں پڑی تھیں۔ ہم اندر پہنچے، گاڑی بروقت آئی۔

چونکہ یہاں گاڑی کا قیام کم کم ہوتا تھا، اس لیے چھپاک سے ریزی سوار ہو گیا۔ اماں جی اپنے بیٹے شوقو کو کراچی لے جانے جارہی تھیں۔ شاید اماں نے سوچا ہو کہ کہیں قدسیہ بھی ساتھ ہمسفر تو نہیں۔ پھر سر جھٹک کر اس خیال سے پیچھا

خاں صاحب نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ الوداعی کلمات یا خدا حافظ کا والہانہ انداز بھی نہ اپنایا۔ لمحاتی قیام کے بعد میں نے کھڑکی میں ایک چہرہ نظر آیا۔ سفید ہاتھ اور بازو خدا حافظ کے انداز میں ہلے اور گاڑی چھک چھک کرتی پلیٹ فارم سے نکلے گی۔ رات کافی جا چکی تھی۔

میاں میر سٹیشن سے کینال پارک اچھا خاصا فاصلہ ہے لیکن تب خوف نامی چیز دلوں پر حکمران نہیں تھی۔ سڑکوں پر تھکن نہیں ہوتی تھی۔ لڑکیاں بخوبی نمٹماتی روشنیوں میں آ جا سکتی تھیں۔ میں اور لالو آہستہ آہستہ کینال پارک کی طرف

ڈراپ سین ہو گیا۔

میرے اندر نہ امید تھی نہ ناامیدی ہی..... بس ایک کھوکھلا پن تھا جس میں بار بار گاڑی کی وصل بھتی تھی اور بجے

تھک جاتی تھی۔ ایک بہت بڑا باب ختم ہوا۔



450- این، سمن آباد

ہم بچوں کے ارادوں کی عموماً بڑوں کو خبر نہ ہوتی اور جو نہیں وہ کچھ ارادہ کر لیتے ہمارے منصوبے ریت کے پھونکے جاتے۔

مجیب اتفاق ہے یا اب تک میری سمجھ سے بالاتر بات ہے کہ خالہ نے فیروز پور روڈ کی اقامت چھوڑ کر اپنے بستر اٹھایا اور 450- این، سمن آباد میں ہمیں ساتھ لے کر چلی گئیں۔ ان کی دو بیٹن و جوہات یہ سمجھ میں آ سکتی ہیں کہ خالہ کو خوفزدہ تھیں کہ ہمارے ملنے والے خاص کرتقو، ڈیڈی، جی اور ریزی بڑی باقاعدگی سے سکول کو اپنا ڈیرہ بنائے ہوئے تھے اس سے رنگ رنگ کی gossip چل نکلنے کا اندیشہ تھا۔ پھر ریزی کا لڑکیوں کے سکول میں کھینا مشکل تھا۔ وہ غریب جانے کس طرح سارا دن گزارتا تھا۔

یہ مشکل بھی لایمچل تھی۔ خالہ جب 450- این میں شفٹ کر گئیں تو ان کی مروت سے بعید تھا کہ وہ ہمیں بھی چھوڑ جاتیں۔ اب ہم دونوں بھی گویا ان کے جہیز میں گئے۔

450- این، سمن آباد کی اس گلی میں آخری مکان تھا۔ اس طرح اسے دور وہ یہ کی سڑک کا فائدہ تھا۔ ایک مکان عین اس کے سامنے تھی اور دوسری سڑک سمن آباد کے چھوٹے بازار کے سامنے سے گزرتی اور آگے سین بازار میں جاتی تھی۔ اس گھر میں ایک بار پھر رونقیں ہو گئیں۔ مجھے ملنے آئے مڑنگ روڈ والے کھلم کھلا وقت کی پابندی کو پس پشت ڈال کر آنے لگے۔ گورنمنٹ کالج سے ریزی کا دوست ریاض نہ جانے کہاں روپوش ہو گیا تھا۔ وہ بھی اب بلاوجہ آنے لگا۔

لیکن تبدیلی ہمارے تعاقب میں تھی۔ یکدم ہمارے ماموں فضل کے دونوں بچے سرفراز اور طلعت جیسے ہم سے گنو بلاتے تھے، لاہور خالہ کے پاس آ گئے۔ سرفراز ان دنوں I.C.S. کی تیاری کے آخری مرحلے میں تھا اور اُس کا سہارا میں رہنا ناگزیر تھا۔ طلعت اپنے ایم۔ ایس۔ سی بائیولوجی کی تیاریاں کر رہی تھی۔ ان دونوں کے لیے تنہائی کی ضرورت تھی۔ سرفراز اس امتحان میں پاس ہو کر لاہور میں آئی جی پولیس لگ گیا اور طلعت ایم۔ ایس۔ سی کر کے

میں پروڈکشن اور کوالٹی کنٹرول میں چلی گئی۔ سال بھر بعد جب سرفراز نے امیر محمد کلاباغ پریکس بنا دیا تو ہر لینڈ
 کے طرح امیر محمد صاحب نے بہت بے عزتی کے بعد سرفراز کو پولیس سے ہی نکلا دیا۔ اب سرفراز پر برے دنوں نے
 حملہ کیا تھا جو جدوجہد کے بعد ناکامی کے باعث وہ شدید Depression میں مبتلا ہو کر عین جوانی میں فوت ہو گیا لیکن یہ
 ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔

جب 450۔ این میں میرے اور ریزی کی وجہ سے گہما گہمی تھی۔ اشتیاق کی پوسٹنگ باہر ہو چکی تھی۔ وہ جب بھی
 آتا تو ایک آدھ دن ہمارے پاس گزارتا۔ ایسے میں کبھی کبھی اُسے رات پڑ جاتی اور وہ بھی ہمارے پاس تک جاتا۔ ان
 دنوں کے آدھ کے گھروں کی دیواریں اونچی نہ تھیں۔ مین بازار کی طرف جانے والی سڑک کی جانب ایک تین فٹ اونچی
 دیوار تھی جس کے ساتھ بنی تھی۔ رات کو تقو ریزی کا زرد پاجامہ پہن لیتا جو اُس کے گھٹنوں سے تھوڑا سا نیچے تک پہنچتا۔ ہم دونوں
 اس کے ساتھ اس دیوار پر بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ تقو اپنے شوق بھائی کا دیوانہ تھا۔ اُن کی غیر موجودگی میں گویا وہ مجھ پر اپنی
 محبت ڈالی کا رکھتا۔ میں تقو پر اس لیے مہربان تھی کہ وہ مجھے 1۔ مزنگ روڈ کی طرف ایک گپت راستہ لگاتا تھا۔

لیکن پھر جب گو اور سرفراز آ گئے تو تقو بہت جلد گو کا دوست بن گیا لیکن رات کی محفلیں برخاست ہو گئیں۔
 یہ نہیں امی کی خودداری تھی یا انہیں گو اور سرفراز کا خیال تھا۔ اب وہ دو ایک پارلمان سے آئیں تو کچھ سوچ
 میں آئی۔ اسی لائن میں آگے چل کر ڈاکٹر سعید رہتے تھے۔ جب بھی ہمیں ضرورت پڑتی ہم اُن کے گھر جا کر بلا تکلف فون
 کرتے۔ ایک معمولی سا تھینک یو اور بس! بہت بعد میں جب سعید صاحب کی دونوں بیٹیاں ٹیلی ویژن سے وابستہ
 ہو گئیں تو انہیں ٹاپ کی ایکٹریس بننے میں خاں صاحب سے بہت مدد ملی۔ پتہ نہیں کونسا ممبر کس وقت استعمال میں آتا ہے
 اور کس وقت کس کے ہاتھوں پٹ جاتا ہے۔ یہی دعا رکھنی چاہیے کہ اے باری تعالیٰ! تو اپنی مخلوق میں مجھے کسی پر آفت
 نہ پہنچائے۔ نہ فرما اور ہمیں کسی انسان کی بے عزتی کا باعث نہ بنا۔ اگر آپ اس دعا کو طیرہ حیات بنالیں تو آپ کو بہت جلد
 ملے گا کہ آپ کے ہاتھ اور زبان سے لوگ محفوظ رہنے لگیں گے جو معاملات میں اسلام کا بنیادی حکم ہے۔

60۔ فیروز پور روڈ سے میں اور ریزی کچھ دیر کے لیے اپنی خالہ فیروزہ کے پاس 450۔ این میں منتقل ہو گئے۔
 وہ دونوں سے پائی بھر بھی وصول نہ کرتی تھیں اور ان کی آزادی بھی سلب ہوتی تھی۔ شاید میری والدہ کی خودداری نے
 یہ فیصلہ کر دیا۔ خالہ سے چند گھر چھوڑ کر قریب ہی 455۔ این خالی تھا۔ اس میں رہائش اختیار کی گئی اور ہم دونوں نے
 ایک بھر پور یا بستر اٹھایا۔ تین کمروں کا یہ گھر اور باورچی خانہ ہمارے لیے بہت بڑا تھا۔ چھوٹا سا برآمدہ، اس سے ملحق
 کچن تھا، سامنے صحن اور لیٹرین بہت کافی تھے۔ اب اس گھر میں ایک نامور ادیب اے حمید رہتا ہے جس نے اپنے گھر
 کو ایک عجیب گھر میں بدل دیا ہے۔ کشمیری چائے، کچے، نان اس گھر کا منہ ماتھا ہیں۔ اے حمید اور ان کی بیگم ریحانہ قمر بانو
 مجھے دھن میں مشغول رہتے ہیں یا پھر تو واضح ان کا شعار ہے۔

خاں صاحب اطالیہ جا چکے تھے۔ ہم دونوں نہ کام پر لگے تھے نہ قرینہ سے ہمیں زندگی بسر کرنے کا سلیقہ، طریقہ
 یہ بھی زندگی کو بنانے کا ویسے بھی ہماری پود کو خیال تک نہ آتا۔ ہم میں ڈسپلن اور استقامت کی کمی تھی۔ میں نے اپنے
 وقت گئی کا ایک راستہ نکالا۔ ایک موسیقی کا استاد رکھ لیا۔ مجھے اُن دنوں گانے بجانے، ناپنے کا شوق تھا۔ ماسٹر صاحب

باقاعدگی کے ساتھ آنے لگے۔ میرا سا راقوت اُن کی شاگردی کی نذر ہونے لگا۔

اسی مصروفیت کے باعث ملازمت کی تلاش ہوئی۔ اتفاقاً زینب اور لالو کہیں سے آگئے اور باورچی خانے نے سنبھال لیا۔ میں نے لکھنے کا شوق اور ناپنے کی مصروفیت جاری رکھی۔ سارے گا ما لاپتے اور تھیا تھیا ناپنے کا عمل تھا۔ ادھر ریزی بھائی بھی ہمیشہ کی طرح بیکار سر کیس ناپنے کو بڑی مصروفیت سمجھتے تھے۔

دن گزرتے گئے۔ استاد جی آتے رہے۔ میں اپنے ناول پر کام کرتی رہی۔ ایک دن اچانک اُستاد صاحب

سے کہنے لگے۔ ”بی بی ایک بات تم سے کہنی تھی۔“

”جی فرمائیے۔“

”بات یہ ہے کہ میں ادھر شاہی محلے میں بیسیوں کو تعلیم دینے جاتا ہوں۔ وہ میری کبھی اتنی عزت نہیں کرتے ہیں

آپ نے کی۔“

میں حیرانی سے اُن کا منہ تکتے لگی۔ میرے نزدیک تو اُستاد کا مقام ہی ایسا تھا کہ اُس کی عزت کیے بغیر

تھا۔

”آپ کو شاید پتہ نہیں نور جہاں بیگم کو بھی اُس کے اُستاد کی دعا ہے کہ ترقی کر رہی ہے۔ میں بھی آپ کو

ہوں اللہ آپ کو اقبال مند کرے، عروج حاصل ہو۔“

میں نے منہ جھکا کر کچھ شکر یہ کہنے کی کوشش کی۔

”میری ایک فرمائش ہے۔“

میں نے دل میں سوچا، اس تمہیدی کی اصل وجہ فرمائش تھی..... اب رنگ لائی گلہری!

”بات یہ ہے کہ مجھے یہ سارا علم میرے اُستاد کدر پیا نے سکھایا ہے۔ جب آپ کسی مقام پر پہنچ جائیں تو میرا

فرما کر اُن کا کلام ضرور چھاپ دیں۔ اسے ضائع نہیں ہونا چاہیے۔“ ساتھ ہی انہوں نے مجھے کدر پیا کے کلام کے

کاغذات پکڑا دیئے بطور نمونہ میں آپ کی خدمت میں ایک صفحہ پیش کرتی ہوں۔

کدر پیا

ٹھمیری کھماج

آئی بدریا جھوم کارے کارے

کہہ پیا پارس رُت آئی

انترہ

آنگن اندھیاری چھائی

لوچھپ گئے سب ہیں تارے

ٹھمیری کھماج

اوچٹ گئی موری نیندریاں سن لی مرلی کی تان

انترہ کہہ رکو ترمی ٹھمری بجاوت

یا نیچی بہت مورے پران
ٹھمری تلنگ

اے جی رسیارے دیکھی توری پیت

انترہ ہم سے بہانا سوتن گھر جانا

پانی کدری توری ریت اے جی رسیارے
ٹھمری تلنگ

اے میں پیاسوں مان چلی۔ باٹ تکت تھی کب کی کھڑی

انترہ اپن دن بن کدر کل زہرت ہے

دیکھو گسپان نئی نئی پرت بُری
ٹھمری پیلو

ارے ری گیاں گئے کدر بدیسا

رین دن مورے رہے اندیسا

انترہ گھڑی پل چھن موہے کل نہ پرت ہے

بنائے سکھی اُن کا سندیسوا

ٹھمری تلک کا موو

ایسی سندرنار کہیں دیکھی ناہیں

گوری گات پرتک نہیں سونلاہٹ

کدر دیکھے پڑت ہے نینن کی پرچھائیں

ٹھمری ایمین (سانجھ)

اپنی چٹائیں کا سے کہوں اے ترے کارن جو جو بکھ پایا

تج دینوتن من دھن اور چھوڑ اپنا پرایا

انترہ کون کرے تھی ایسی برائی

کدر پیا نہیں ترمی خطا کچھ

مور کہو مورے آگے آیا

ٹھمری تلنگ

اری سنولیا کا ہے پیت لگائی!

انترہ نت رہیں ہیں کدر سوتن سنگ

موسوں کرت چترائی!

ٹھمری بھیرویں

ایک نجر کھڑا دکھلا جا رہے

بن دیکھے کدر تو رہے کلنا پرت ہے

انترہ

بھول جیوں سارا دو کھڑا اے..... ایک نجر

ٹھمری ملتانی خیال نما

آج کہو موری لاج گئی سب سیکھن میں! مہاراج

نہس نہس نرکھ نرکھ کدر

انترہ

گروا لگا نیو اپنے پر اے میں مہاراج.....

ٹھمری جھنجھوٹی

اب گو دو پوچھے تھری بات؟

تڑپے اوڈ چاہے دن رات!

کدر پیا اونکا ڈھونڈت ہیں

انترہ

چین تھا جن کے دم کے سات

ٹھمری کانی

برہن زادا بکن لگا ہے

استانی

ہر روز اگر نئی توانی ایماہ ز لطف

انترہ

گا ہے گا ہے

پوشیدہ اگر کئی زاغیاں

در سیر یا من یا برا ہے

جان کرد فدا یقین نہ داری

تن بیجان شد گوا ہے

راست است کدر ہمیں کہ دانم

ظالم مفر بادشا ہے

ٹھمری شہانہ

بس ہٹو گیوں کی چترائی

کا ہے کدر اب بنتی کرت اے

انترہ

اتنی کر کے ڈھٹائی

کوؤ جتن کے کچھ نہ مانوں

ایہہ تو کہو کہاں رین گنوائی

ٹھمری سند ہڑا

بھٹکت نین رہے سوسورے آلی رے

کدر پیا کو سپنے میں دیکھا

چونک پڑی میں بھور بھئے

ٹھمری بھیرویں

چانگھٹو اپہ ڈھونڈن آئی میں سکھی

موری بندیا گئی رے

بھور بھئی مورے پنیاں بھرت

کدر پیا گروا لگائی

ٹھمری پیلو

پیت لگائی ہم سے چھپا کر..... ہار گئی سمجھا سمجھا کر

آ کھو (آخر) کدر پیا کیو چھل کیو

گیاں اپنے بس میں لا کر

سوتن کے ڈو دکھنا ہیں سنوں گی

سوئے رہوں گی میں کچھ کھا کر

ٹھمری پیلو بروا

پیت ناہیں رے گھر وندے کا کھیل

کدر جب جانوں جو دو دکھ جائے جھیل

بیوگ پیت پرت

تن من جلت

رکت گھٹت جیسے دلے کا پیت

ٹھمری سوہنی

پیت لگائی کا ہوسنگ؟

دیکھت ہوں میں سانج سکارے

کدر پیا لورے نت نئے ڈھنگ

ٹھمری کھماج

تمہاری بھولی بھولی صورت کے میں واری جاؤں
 آنٹھوں پیر موہے دھیان رہت ہے
 کہت کدر کیسے پاؤں؟

انترہ

ٹھمری دیس

تم بن مور اجیانہ پہلے

برا بھلا جو چاہے کہہ رہے

لاج سدھ سب پت کھوئی

انترہ

ایسوں ووج نیہہ لگائی کوئی

کدر میں کا جانتی تھی پہلے

ٹھمری پیلو

جو گجرے تھرے من پر کدروہ کا جانیں؟

اپنے جیا کی اُن سے کہو تو

انترہ

چاہیں ماہیں نہ ماہیں

ٹھمری کافی

جانے دو موہے چھوڑو پیروا

کدر پیا تو ہے لاج نہ ڈر ہے

انترہ

اتنے لوگن میں لگانے بہت گروا

ٹھمری کھماج

جو کر موم میں ہو سو ہے سویا

ترپت روت رب کا ہوت

آنکھ لگاوت ہے کدر من موہ لیو

انترہ

نا کچھ جادو ٹونا

ٹھمری جھنھوئی

چھلا دیو موراری کا ہے کرت بدنام

کدر پیا جن سے ہنس بولت ہو

انترہ

ان ہی سے را کھو کام

ٹھمری پیلو

دیکھو کدر مورے گاری دینی رے

میں تو کہنوں پر پنیاں بھرت تھی
اور ناہک گاگر جھینے رے

سترہ

ٹھمری بیاگ

دیکھو کدر لگر لگر مور۔ بھاری

چھلکت بھجیت ساری

بار بار پنیاں بھرن بھجیت

سترہ

ساس دے دے گاری

ٹھمری کھماج وتلنگ

سکھی ری موراجی گھر میں لگت ناہیں بن پی

رک تو گئے کدر بدلیوا

سترہ

دوج برت تندی

ٹھمری سند ہڑا

سن اے ری بجنی مورے دھن دھن بھاگ

رک رے کدر ہمری۔ سبجریاں

سترہ

موہے پٹ پٹ گلے لاگ لاگ

ٹھمری کھماج

کدر پیا کیوں گئی

بولوں گی تم سے کاہی نہیں

چلو ہٹو کاہے بنتی کرت ہو

سترہ

اٹھو اٹھو بس جاؤ وہیں

ٹھمری بھیرویں

کہو کدر لاگی پار نیادیا

دیکھو نیا مورے بن کھویا

سترہ

دو جے ہے منجد ہار

ٹھمری کافی

کیو آج چھیل چھیل کنورے

چٹ پٹ پٹ چھٹ

مورا انچرا شیخ

اچانک کدر پیا مکھ چوم لیورے
ٹھمری دلیس

کاہی کہوں گنیاں تمس میں رات کی بات
سگری ریں موہ پے جیسی گزری
اور جو کچھ کدر کہنی مورے سات

انترہ

ٹھمری جٹگلہ

کدر پیا کیسی آؤں توری پاس
اک تو پانکلیا چھن چھن باجے
دو بجے جاگے موری ساس

انترہ

ٹھمری جٹگلہ

کدر پیا کیسے آؤں توری میر
جات ہوں میں بھرتی نیر
سائخمر کو سکھیاں پنیاں بھرت ہیں
پنکھٹ پر ہوئی بھینز

انترہ

ٹھمری تلنگ

کائے کو پیت لگانی کدر چاردن کی ری
اورن سے پیاہنت بولت ہیں
ہم سے کرت چڑائی

انترہ

ٹھمری پیلو

کون بکھیڑے میں آن پھنسی گنیاں
درن ان کے
سُنیاں اسے جنکے
دیکھے بانکے سنولیا
رنگیلے بن کے

گائیں بجائیں رجا میں سکھی ری
وہ تو گنی ہیں سب ہیں گن کے
تب تو کدر کی ناہیں کدر تھی

انترہ

انترہ

اب ترپت ہوں خبر سُن سُن کے

ٹھہری پرچ

کب آئیں سیان موری گنیاں

میں توری میوں بلیاں

ساس نند موری بیرن بھوری

یا ہکسنا یک ہکا لونیوں لو یہاں

اپنی پپتا میں کائے کہوں کدر بن

جو جو پڑیاں سہیاں

ٹھہری بہاگ

کدر پیا نہیاں لگا کر چھائے

ہم ترپت تم سوتن سنگ سوت ہو

ناہک تمرے کہے میں آئے

ٹھہری کھماج

کدر میں تو ناہیں ہوں توری ناری

کیوں بھوئی چوز موری ساری

نہ موہے جانور نہ موہے چینو

کاہے ماری پچکاری

ٹھہری بھوپالی

کہور سیا چھل بل کیو مائی

کر چترائی ساری رین گنوائی

کدر سوتن گھر آج گئے

اُن کی ڈھٹائی ایسی

مہکانہ سہائی

ٹھہری جھنجوئی

بنتی توری نہ مانوں نا پوچھوں توری بات

رات کدر کاہے سوتن سنگ سوئے

اور ہم سے کنئی گھات

ٹھمری کھاچ

میں پنیاں بھرن کیسے جاؤں کدر پیا؟

ایک گگر بھاری

دو بے دھک دھک کرت ناری

ڈگر چلت

پگ دھرت

ٹھہر ٹھہر کانپے جیا

ٹھمری پیلو

میں تو کدر کے کارن بھی جو گن

تج کرتن میں بھی برو گن

کانن کنڈل گلے مرگ چھالا

انترہ

بن کے جو گن

میں پھری بن بن

ٹھمری جنگلہ پیلو

موری سکھیاں ڈھونڈ رہی

اونکا پاوت ناہیں کہیں

کدر پیاتم جنکا چاہت ہو

انترہ

کا جانے کون دیس گئیں

کیسے اکھاں پھیر لیں کدر ہی ملن کی نہ آس

مورے آنسو ڈھلنے لاگے گھلنے لاگا ماس

ٹھمری پرچ

موری گجر گئی اولن بن برسوں

ڈھونڈن نکسی ہوں گھرسوں

رین وفا ہمیں ترپ بتی

انترہ

اس پے درس کے ہیں جیتی

آئی بسنت اور انہوا بورے

بہار آئی پھولی برسوں

راہ تکت مورے نین تھکے

اب جائے کوئی یہ اُن سے کہے
جھوٹ کد رقم کیوں کرت ہو
دسونہیں کہت آج کل پرسوں

شھری بارہ ماہہ

جب سے سیاں پردیسوا گیوری
من میں رہت واکا دھیان ری
برسن گجری سیاں بن ہم کا
درسن کارمان ری

سترہ

اپنے پیا کو میں ڈھونڈن نکسی - کا ہو کی نہ رکھی آن ری
نیناں کی گھائل برہا کی مائی - ہمری یہی پہچان ری
پاتی میں لکھیو یہی مورگی گنیاں - تم بن نکسی پران ری
نیناں لگا کر من لموہ لینو - تن من دھن اور جان ری
پیت نہ کرنا کدر سنگ کوڈ - ہم کا بھی اب کان ری

سترہ

واورا کافی

چلی گئی ہم سے سیاں مکھ مور

اوکوتھا جانا کرت بہانہ کوڈ

سترہ

سوتن کی اور

دیکھے کدر کی یہ پترائی بہیاں چھڑا کر جور

سترہ

واورا پیلو

کہہ پیا ناہیں کہوں ڈکھ اپنا

ساس تندکا ڈرمو ہے کیسے؟

سترہ

بولوں جیسے گوئی کا پنا

ہولی پیلو

آگ لگی ایسی ہولی کو گنیاں

کیسی کدر نے مروی ہیں بہیاں

چھین پچکاری مو سے

سترہ

سوتن پر رنگ ڈالا

دیکھونا ہک ہم کا جلاوت ہیں سیاں

تال ہولی کافی

اپنی پیتا کہوں کا سکھی من کی

تنگ سدھنا ہیں ہم کاتن کی

اب مورلی جیا پیا، ناہیں آوت

انترہ

ہوسن گی ایسی کن بیرن کی

ہولی کافی

اچانک انجرا پکڑمورا کھینچا

چولیا مسک گئی چوریاں کرک گئیں

گرواگت ایسے جوڑے سے پہنچا

کدر پیا اوروں میں تو ہنستی تھی

یہ سچ ہے بڑے مول کا سر پہنچا

ہولی کافی

پیا ہولی نہ کھیلو گی اب کی بار

تم تو بھاگت ہو رنگ ڈار ڈار

جاؤ کدر کھیلو سب سکھین سنگ

انترہ

بٹی رہی ہیں ہار ہار

ہولی کافی

رنگ نہ ڈارو پکڑ کر سیاں

مانو کہنا ذرا چھانڈو تو بتیاں

کدر ہم سے تم کیوں ٹھٹھولی کرت ہو

انترہ

اور بھی تو ہیں ساتھ کی گئیاں

ہولی کھماچ

کدر میں تو ناہیں ہوں توری ناری

کیوں بھجونی چوزموری ساری

نامو ہے جانو نامو ہے چنہو (چنی ہو)

انترہ

کا ہے ماری پککاری

دو ہڑہ جوگن

برسوں سے وہ آئے نہیں رہی اکیلی سوئے

ترپت روت بیٹھ رہے ہیں اسون سے منہ دھوئے
 کدر پیا سے نہیہ لگائے کچھ جنم کاسات
 کدر پیا بن ہمکا گنیاں دن سوچھے نہ رات
 کدر کی مور ت آنکھ میں ہے پتلی وین بجھائے
 تل دھرنے کی جگہ نہیں ہے تو اور کہاں سے آئے
 سرمہ دوں تو گر گر جائے کا جل دیا نہ جائے
 جن نینن میں پی بسیں دو جا کون سمائے؟
 آؤ پیا تم نینن میں پلک ڈھانپ تو ہے لوں
 نامیں دیکھوں اور کونا تو ہے دیکھن دوں
 ارے پیسے بانورے تو آدھی رات نہ کوک
 ہوئی ہوئی سلگن دے اک بار ست بھوک
 آہ کروں تو جگ جلے اور جنگل بھی جال جائے
 پانی جیا رانہ چلے کہ جانیں آہ سمائے
 جمن سکاری جائیں اور نینن بریں گے لائے
 بدھنا ایسی رین کو کہ بھور کبھی نہ ہوئے
 دوہترہ

جب دانتوں کی چمک پڑی تو رنگ بھیا سفید
 بجلی گرتی روکے کون اور کیا کر کے پیدا؟



خوبصورت لوگوں کی سرزمین

روم سے.....60 فیروز پور روڈ کا تعلق

ہمیں 14۔ ایس کینال پارک کے مالک مکان نے پیغام بھجوایا کہ وہ سارا گھر استعمال میں لانا چاہتے ہیں لیے گھر کو خالی کر دیا جائے۔ وہ ایک ایسا عہد تھا جب مالک مکان بھی دھونس سے گھر خالی نہ کرواتے تھے نہ کسی قسم کی دیتے تھے۔ ہم نے شرمندہ شرمندہ اپنا سامان ریڑھیوں پر لادا اور 60۔ فیروز پور روڈ روانہ ہو گئے۔ ان دنوں سڑکیں طرح سامان سے لدے ریڑھے عام نظر آتے تھے۔

یہ لڑکیوں کا سکول تھا جس میں دسویں تک تعلیم دی جاتی تھی۔ میری خالہ کے لیے ہمیں سٹاف اور کچھ چھپا کر رکھنا بڑی بدنامی کا باعث ہو سکتا تھا۔ محکمہ اُن کی انکوائری کر سکتا تھا، لیکن ابھی لہو سفید نہ ہوا تھا۔ ہماری خالہ تھیں اس لیے اُنہوں نے اپنی ساری شفقت مادری ہم پر مرکوز کر رکھی تھی۔

خالہ نے ہمیں سکول کے بائیں ہاتھ یہی دو چھوٹے چھوٹے کمرے رہنے کے لیے دیئے جن کے ساتھ غسل خانہ بھی تھا۔ سکول کے پچھواڑے ایک گراؤنڈ تھی جس کی چار دیواری کے ساتھ ساتھ درخت اُگے ہوئے تھے۔ ہاتھ ہی ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اور سرونٹ کو اڑھتا تھا جس میں ہماری نئی ملازمہ اور اس کی بیٹی خورشید نے تو بیڈ مسٹریس کی رہائش گاہ تھی۔ بیڈ مسٹریس کے رہنے کے لیے دو کمرے مختص تھے۔

یہ پاکستان کے ابتدائی جیمانی سال تھے۔ اوپر سے ریزی بھائی کا مسئلہ گھمبیر تھا، بلکہ سارا مسئلہ ہی میں تو خالہ کے ساتھ کسی طرح کھپ سکتی تھی لیکن ریزی کا رکھنا دشوار تھا۔ وہ پہلی گھنٹی بجنے اور ”لب پہ آتی ہے دعا“ سے بہت پہلے سکول سے باہر نکل جاتے۔ پتہ نہیں کہاں کہاں سڑکیں ناپتے، نوکری تلاش کرتے یا کام کی کھوج لگاتے۔ سکول اُس وقت لوٹتے جب ساری بلڈنگ ویران ہو جاتی۔ کبھی باورچی خانے میں جا کر کھانا کھا لیتے، کبھی خورشید کے کھانا لگا کر کمروں میں لے آتی۔

اس سکول میں شام کے وقت دسویں کی خالی جماعت میں ہمارے ملنے والے آ جاتے۔ اب 1۔ حرم والوں کا خوف اور دھڑکا بہت کم ہو چکا تھا۔ خاں صاحب روم سدھار چکے تھے۔ شادی کا سائرن بند تھا۔ افتخار بھائی

میں ہمارے پاس باقاعدگی سے آنے لگے۔ یہ بھی ایک دوہری Situation تھی۔ جس قدر 1- مزنگ روڈ
 کے لیے سو کر ملنے لگے تھے، اسی قدر تو اتر کے ساتھ روم سے خاں صاحب کے خطوں نے میرے اندر دھوم مچا رکھی
 تھی۔ سکول ختم ہوتا میں سکول کے باہر نکلے ہوئے پوسٹ بکس کی طرف لپکتی۔ بہت کم ایسے ہوا کہ مجھے خاں صاحب کا

میں سے ہماری دوستی 24- کینال پارک میں ہو چکی تھی۔ وہ ایک Sportsman ہے۔ بیٹھ کر غیبت کرنا
 اور کرنا اس کا محبوب مشغلہ کبھی بھی نہیں رہا۔ کینال پارک میں اُس نے ہمیں خوب کرکٹ کھلائی اور
 اس کی جسم کی لگن مینی "Smy" سے بھی متعارف کرایا۔ اس کی پوسٹنگ لاہور سے باہر ہوئی تھی لیکن جب بھی وہ
 سکول میں ملنے شام کے وقت ضرور آتا۔

تو اس کی محبت میں عجب اپنائیت تھی۔ اُسے دیکھ کر لگتا گویا ہم اکٹھے بڑھے پلے ہوں۔ اُس پر سکھوں سے میل
 کرتا تھا۔ وہ بھابھی کے رشتے کو ماں، دوست، بہن اور آدھی گھر والی کے طور پر دیکھتا اور جاچٹتا اور پرکھتا تھا۔
 تو یہی ریزی کی طرح شام یا گہری شام کے وقت آتا۔ وہ کبھی پچھلے کمروں میں نہ بیٹھتا بلکہ دسویں جماعت
 کے روم میں کرسی نکال کر ڈسک پر کہنیاں بجا کر بیٹھ جاتا۔ کبھی کبھی چاک اٹھا کر ڈسک پر ہی اسی سیدھی تصویر
 کھانے کے وقت پچھلے باورچی خانے میں یا اسی ڈسک پر بیٹھ کر کھانا بھی کھا لیتا۔

اسی سکول میں تقو کی ملاقات محمودہ منظور سے ہوئی۔ محمودہ منظور بے وی پاس تھی اور ملتان میں میری والدہ کی
 بہن تھیں۔ وہ اول اول تو میری والدہ کو خوش کرنے کے لیے اُن کا تعاقب کرتی رہی، لیکن پھر رفتہ رفتہ میری دوست بن گئی۔
 محمودہ کی والدہ بیکطرفہ تھی کیونکہ اس میں محمودہ کی طرف سے بہت زیادہ جذبہ اور اظہار تھا۔ اُس کے والد تو حیات نہ تھے
 اور ان کی والدہ باغبان پورہ میں رہتی تھیں اور ایک سکول چلاتی تھیں۔ مجھے اور ریزی کو کبھی اُن کے گھر جانے کا اتفاق نہ
 ہوا۔ سکول میں بیشتر وقت وہ ہمارے ساتھ رہتی، ہمیں اُس کی ملاقات تقو سے رہتی۔

محمودہ کا جسم بے حد متناسب تھا لیکن شکل سادہ تھی۔ کبھی کبھی تقو اُس کا مورال بلند کرنے کے لیے کہتا: "بھئی
 پیتے ورکا" اسی سلوگن نے محمودہ کا نام "پتو" ڈال دیا۔ وہ بھی ہمارے ساتھ کرکٹ اور "سمی" (Smy) کھیلنے لگی
 تھی۔ سمي چل نہ سکی کیونکہ کمروں میں ڈسک اور کرسیاں زیادہ تھیں۔ اس لیے کچھ ویر بعد یہ کھیل چھوڑ دی گئی اور
 کرکٹ پر اکتفا کیا گیا۔

باقی مزنگ روڈ والے تو ابھی سکول کی طرف رخ نہ کرتے تھے لیکن تقو سے بھی زیادہ افتخار بھائی ہماری دلجوئی اور
 سکول کے لیے سکول کا رخ کرتے۔ وہ مجھ سے بہت کم بولتے تھے لیکن میری خالہ (ماسی جی) ماچھی جی اور ریزی سے اُن
 کی کاٹھی چھنتی تھی۔ وہ ماچھا کو اپنی "کالی ماں" کہہ کر بلاتے تھے۔ ابھی افتخار بھائی میرے لیے ڈیڈی جی نہ بنے تھے۔
 یہ مجھے جانچنے آکنے اور پرکھنے کے لیے آتے تھے۔ مجھے وہم پالنے کی عادت ہے۔ میں ان دونوں بھائیوں کے آنے
 سے کھینچے لگی کہ شاید میری جملہ کمتری کو دل سے مزنگ روڈ والوں نے معاف کر دیا ہے اور واقعی انہوں نے مجھے پسند کر لیا ہے
 میں شاید وہ لوگ صرف اتنا سمجھتے تھے کہ خطرہ ٹل گیا۔ روم میں کوئی اطالوی لڑکی (میم) پسند آ جائے اور وہ خواہ مخواہ کی

بد مزگی مول نہ لیں۔

ڈیڈی جی دل کے نرم انسان دوست اور کامریڈ قسم کے شخص تھے۔ جب باباجی کی وفات کے بعد کچھ عرصے لیے انہوں نے فیسرین کا کام بھی سنبھالا۔ یہاں ان کا دفتر ان میٹھیوں کے ساتھ تھا جو اوپر شقو جی کے چوبارے پر بیٹھتی تھیں۔ یہاں اس دفتر میں ان کی آدرشی گفتگو سے متاثر ہو کر لوگ ان کے پاس آنے لگے اور ان میں لیڈرشپ کی ترقی ابھرنے لگیں۔ شاید لیڈرشپ کی خوبی جس کی وجہ سے وہ بعد میں میری اور خاں صاحب کی شادی میں کود پڑے۔ شادی کی پاداش میں انہیں 1- مزدگ روڈ سے باباجی نے نکال دیا تھا، لیکن یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ ابھی 60- فحہ

شوق شقو جی

ابھی تو میں آپ کو ان لوگوں سے متعارف کرانے کی کوشش کر رہی ہوں جو سکول میں ہماری بے سرو سامان باوجود ہم سے جڑے رہے۔ کھکھو ڈیڈی اور تقو کے بعد ناہید میرے پاس سکول آنے لگی۔ ناہید خاں صاحب نے آپا فرخندہ اور ڈاکٹر ایوب احمد خاں کی بیٹی ہے (اور ڈاکٹر ایوب خاں ماڈل ٹاؤن میں 36- جی میں رہتے تھے) فرخندہ کو کم اور اماں جی سردار بیگم کو اپنی والدہ زیادہ سمجھتی تھی۔

جن دنوں شقو جی مزدگ روڈ میں رہا کرتے تھے اور ناہید اپنے گھر ماڈل ٹاؤن میں رہنے کے بجائے شقو جی کے مکان میں مقیم تھی تو خاں صاحب نے ناہید کو پڑھانے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔ ناہید پیدائشی آرٹسٹ تھی۔ وہ اپنے تصویروں میں رنگ بھرنے میں مشغول رہتی تھی۔ ابھی اُس کا یہ جوہر آشکار نہ ہوا تھا لیکن ایک ست الوجود آرٹسٹ کے اُسے کبھی اس فکر نے نہ ستایا کہ اُس کا مستقبل کیا ہوگا۔ اُسے محنت، کوشش، جدوجہد کے ساتھ کسی منزل کے لیے کوشش ہوگا۔

جب 1950ء میں ابھی خاں صاحب روم نہ سدھارے تھے، ناہید بڑی سعادت مندی کے ساتھ کراچی سے دوپٹے سے ڈھانپ کتاہیں ہاتھ میں لے کر اندروالی میٹھیوں سے چڑھ کر خاں صاحب کے پاس اوپر چوبارے پہنچتی۔ خاں صاحب اُسے پڑھاتے۔ وہ نہ کبھی کوئی چیز نوٹ کرتی نہ دوہراتی۔ دوسرے دن خاں صاحب پوچھتے۔ جو سوالات میں نے تمہیں حل کرنے کے لیے دیئے تھے، وہ ہوم ورک کر لیا؟

ناہید کی خوبصورت براؤن آنکھیں خمیر سے بھر جاتیں۔ ”کون سے سوالات شقو بھائی؟“

”اچھا وہ مضمون پڑھ لیے جن پر میں نے نشان لگا کر دیا تھا؟“

وہ مظلوم بن کر نظریں جھکا لیتی اور مری سی آواز میں کہتی۔ ”کون سے نشان شقو بھائی؟“

خاں صاحب اپنی تمام تر قوت برداشت کے باوجود چڑ جاتے۔ ”سارا دن کیا کرتی رہتی ہے بریتی؟ کیا ہے اپنے وقت کا؟ کس طرح اپنا سونا پیتل کرتی ہے؟“

ان جھڑکیوں کا اُس پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ وہ معصومیت سے سوال کرتی۔ ”شقو بھائی! برتی کیا ہوتی ہے؟“

پنسل سے اپنے بالوں کو کریدتے ہوئے شقو جی کہتے ”خشکی کا وہ ریتلا ٹکڑا جو دریا کے بیچ بھگینے سے

ہے۔ پانی اُس کے دائیں بائیں سے گزرتا ہے لیکن وہ برتی خشک رہتی ہے۔ تیرے ارد گرد علم کا دریا بہ رہا ہے غافل

تو کسی یہ وقت واپس نہیں آئے گا اور کچھ نہیں تو پیٹنگ میں ہی نام پیدا کر۔ کوئی سمت کوئی شوق کوئی جہت تو ایسی
پہنچ جائے گی۔ تیری کوئی اپنی شناخت ہو۔“

یہ مکالمہ شتو جی نے کئی بار دہرایا لیکن اس اُکسانے سے ناہید نے نہ کبھی کچھ سیکھانہ براہی منایا۔ روم جانے سے
پہلے ایک نر خاں صاحب نے مجھ سے کہا۔

”تو میرا ایک کام کر دو گی؟“

”جی۔“

”ناہید کو تم جانتی ہو۔ اُسے ذرا بی اے کرادو۔ وہ شہد سے بیٹھی اور سمندر سے گہری ہے لیکن میرے قابو میں برتی
تھی۔“

”جی میں کچھ باقاعدہ استاد نہیں ہوں۔ میری کوئی ٹریننگ نہیں ہے۔“

”استاد ہونا ضروری نہیں، تم میں صبر زیادہ ہے۔“

بخیر سوچے سمجھے ہمیشہ کی طرح میں نے فوراً وعدہ کر لیا۔

لیکن اس وعدے کو ایفا کرنے کا وقت 60- فیروز پور روڈ میں ایفا ہوا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس پڑھانے میں
کتنے وقت بھی ہوگی۔ پڑھانے سے پہلے میں رتی بھر خوفزدہ نہیں تھی کیونکہ میرے آئی کیو میں ایک یہ بھی کمی ہے کہ میں کوئی
بے ضمیر لکھنے کی بغیر کر لیتی ہوں۔ پھر اس Impulsive فیصلے کو توڑ بھانے کے لیے صدق دل سے ایڑی چوٹی کا زور بھی
لگاتا ہوں۔ عام طور پر اللہ میاں میری لاج رکھ لیتا ہے اور میرے عیوب کی پردہ پوشی بھی کرتا ہے۔ اسی ستر پوشی کے طفیل
میں نے ان لوگوں کا بھید معاشرے میں کھلنے نہیں دیتا اور میری محنت، لگن کو ترقی، کامیابی اور عزت میں بدل کر میری محنت
لگانے کا دیتا ہے۔

اس سکول میں میرے پاس ناہید کے آنے کی وجہ اُس کا بی اے کا درپیش مرحلہ تھا۔

تقویٰ کی طرح ناہید بھی عموماً شام کو ہی سکول پہنچتی۔ ہم دونوں یا ہیڈ مسٹریس کے دفتر میں یا پھر دوسری جماعت کی
کلاس میں بیٹھ کر پڑھتے۔ اگر اُسے کھانے کی طلب ہوتی تو وہ ہمیں بیٹھ کر ڈال ولید کھا لیتی۔ ناہید کبھی بھی خوش خوراک
نہیں۔ اس زمانے میں ابھی ریستورانوں کی بھرمار نہ ہونے کی وجہ سے ہماری ساری پود گھر کے سادہ کھانے خوشی سے کھایا
کرتے۔ کمرے میں چاک کی خوشبو کسی ڈسک پر بڑ پینسل پڑی نظر آ جاتی۔ ڈائٹنگ روم تو کیا مناسب میز بھی نہ ملتا۔

ناہید تو ازلی برتی تھی لیکن مجھے اسے پڑھانے، اُکسانے اور محنت پر راغب کرنے کا طریقہ نہ آیا۔ وہ نہ تو کبھی
کچھ سمجھتی نہ نوٹس بناتی نہ کبھی کسی جواب کو دہرانے کی کوشش کرتی لیکن لڑکی بنیادی طور پر ذہین تھی۔ میں کورس کی کتابوں
سے پڑھے جاتی تو وہ بے توجہی سے سنے جاتی۔ جیسے کیسے امتحان کا وقت آ گیا۔

کلیر ڈکالچ اس کا سینئر بنا۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ وقت پر امتحان دینے آ جاتی۔ اکیڈمک کمروں میں امتحان گاہ
سے پہنچ جاتی۔ مجھے ہر لحظہ خوف رہتا کہ کہیں وہ پرچہ نہ چھوڑ دے یا ماڈل ٹاؤن سے آنا ہی نہ بھول جائے۔ ریزی مجھے
امتحان سے بہت پہلے کالج کی لان میں چھوڑ جاتا۔ جب ناہید امتحانی گتا، جیومیٹری بکس، پن، فٹالے کر مجھ تک پہنچتی تو میں

شکر کا سانس لیتی۔

”پرچہ کیسا ہوا؟“

”اچھا ہوا ہے قدسیہ آپا۔“

میں امتحانی پرچہ غور سے دیکھتی۔

”اور اس سوال پر نشان نہیں لگایا، یہ چھوڑ دیا؟“

”بس نام نہیں ملا قدسیہ آپا۔“

میں اس خیال سے کہ کہیں اگلے پرچے نہ چھوڑ دے، چپ رہتی لیکن میری حیرانی کی حد نہ بڑھی جس

صاحب کی لاڈلی چھوٹی بہن (یا بھانجی) نے زلٹ آنے پر سیکنڈ ڈویژن میں بی اے کا امتحان پاس کر لیا۔

ان ہی دنوں میں جب ہم سکول میں منتقل ہوئے تو آپا فرحت نے سمن آباد میں گھر خرید لیا اور وہ بھی

ہولے میرے پاس پڑھنے کے لیے آنے لگیں لیکن ان کی کتابیں دیکھ کر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں نے

ثقیل کتابیں کبھی پڑھنے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔ پھر بھی میں نے ان کی مدد کرنے کی کوشش ضرور کی۔ وہ بھی بغیر

کیے آتی جاتی رہیں لیکن ذہین آپا فرحت نے سمجھ لیا کہ یہ پڑھائی نداشتاؤ کے بس کی ہے نہ شاگرد اس سے کچھ حاصل

ہے۔ رفتہ رفتہ ناغے پڑنے لگے۔ وہ نوٹس بنانا چاہتی تھیں۔ سوال کرنے کی خواہش مند تھیں۔ یہ سب کچھ میرے لیے

نہ تھا اور بالآخر آپا جی نے سکول آنا چھوڑ دیا۔

خاں صاحب کو جب یہ اطلاع ملی انہوں نے کسی خط میں مجھ سے بر ملا نہ پوچھا کہ ایسی کوتاہی کی وجہ کیا

آپا جی کیوں پڑھنا چھوڑ گئیں۔ خاں صاحب مجھے بغیر کسی سوال جواب کے خط لکھتے رہے۔ حالات کچھ امید افزا نہیں

لیکن میرے اندر امید کا چھوٹا سا دیا جلتا رہا۔ غالباً اس دیکھے کا تیل وہ خط اور کارڈ تھے جو مجھے روم سے ملتے تھے۔ ان خاص

میں کسی قسم کا وعدہ شادی کے لیے کوئی التجا وغیرہ کبھی رقم نہیں ہوئی لیکن اپنا نیت سے لکھے گئے ان خطوں میں اپنے

پیش آئے تجربات، مغربی لوگوں سے ملنے کے بعد تاثرات اور ثقافتی تقابل کی خوبصورت تفصیل ہوتی تھیں۔

میرے سکول میں رہنے کے باعث ایسی ٹیچرز سے دوستی ہو گئی جو نہ جانے کیوں میری طرف مہنت تھیں۔

اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ہیڈ ماسٹر ایس صاحب کی بھانجی تھی اور میرے کندھے پر بھی ایک اضافی بلا لگا تھا۔ ان دوستوں میں

سے قابل ذکر محمودہ اصغر تھی۔ وہ 30-جیل روڈ پر رہتی تھی اور مورن کار میں سکول آیا کرتی۔ مجھے اس کا یہ بد بے اور

شپا“ دل سے بھاتا۔ اس کا دنیاوی Status سکول والی ٹڈل کلاس استانیوں اور شاگردوں سمیت زیادہ تھا۔

محمودہ کے والد انجینئرنگ کے یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ ان سے کچھ تو میری دوستی کی وجہ سے اور کچھ

خالہ کی مرعوبیت کے باعث تعلقات بڑھ گئے۔ اصغر صاحب بھی ہر بڑے آدمی کی طرح اندر سے تنہائی کا شکار تھے۔ ان

بیگم ایک سیدھی سادی خاتون خاندان تھیں لیکن ان میں ایک خوبی اچھی خانداری کے علاوہ بھی تھی۔ وہ ڈھولک بہت عمدہ

تھیں۔

ہم ان کے گھر جاتے تو میری خالہ اصغر صاحب کے ساتھ تاش کھیلنے میں مشغول ہو جاتیں۔ تاش اور

خاندانی ان ڈور کھیل تھے۔ محمودہ کی والدہ ہر بڑے آدمی کی بیوی کی طرح Left out محسوس کرتیں تو وہ میرے ساتھ ہموک بجانے میں مشغول ہو جاتیں۔ میں روزایا چھوٹی چیخ بجاتی۔ پھر ہم دونوں مل کر شادی بیاہ کے گیت اور ادھر سے اگٹھے کیے نوک گیت گاتے۔ محمودہ تو تاش کھیلتی نہ کبھی ہمارے ساتھ سنگت ہی کرتی۔ اس کا وقت کبھی میز بجانے یا گھر کی آرائش درست کرنے میں لگتا۔ محمودہ اصغر کے گھر لذیذ کھانے ہمیشہ ہمارا سواگت کرتے۔

محمودہ اصغر کی دو اور شناختیں بھی تھیں۔ اس کی شادی اظہر صاحب سے ہوئی جو پاکستانی حکومت کے پہلے ایک ایڈوائزر رہے۔ کسی سفارش کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ وہ اس زمانے میں Economic Wizard تھے اور دنیا کی معیشت پر ان کی گہری نظر تھی۔ دوسری پہچان محمودہ کی اس کی چھوٹی بہن مشہور و معروف ادیبہ خالدہ حسین ہیں۔ سکول کے دور میں خالدہ بہت چھوٹی تھی۔ وہ ہم دونوں کی دوستی کومنہ میں انگلی ڈال کر دیکھنے کی عمر میں تھی۔

مجھے دو پہر کو سونے کی عادت ہمیشہ سے ہے۔ جب کبھی میں محمودہ کے گھر دو پہر کو ہوتی تو خالدہ بھی میرے اور محمد کے ساتھ تکیہ جوڑ کر لیٹی۔ خالدہ اُس زمانے میں پڑھنے کی رسیا تھی۔ یہی شوق آگے چل کر خووا سے لکھنے کی شکل میں نکلا۔ اس شوق کے علاوہ اسے لڈی، بھنگڑ اور کچھ کچھ کلاسیکی ناچ کی طرف بھی رغبت تھی۔

محمودہ اظہر کے علاوہ میری پرانی دوست نسرین رشید اور شمیم رشید بھی آ جاتیں۔ ان دونوں لڑکیوں سے میری محبت ایک آدھ بار ملتان میں بھی ہوئی تھی۔ وہاں ان کے والد رشید صاحب ملتان میں ان دنوں ڈپٹی کمشنر تھے اور ان کی والدہ سے نانا کے مراسم کافی جاندار تھے۔ ابھی نسرین بی اے کرنے کے مرحلے میں تھی۔

ناہید کی پڑھائی کا مرحلہ ختم ہوا تو ناہید آ پافرحت کے پاس سمن آباد میں منتقل ہو گئی۔ پھیرا نورا قائم رہا۔ میری سہیلیاں ناہید کو جھونگے (باگلی) میں مل گئیں۔ ایک روز ہم سہیلیوں نے ناہید کو چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ پیدل نالے کے ساتھ ساتھ لہ روانہ ہوا۔ اتفاقاً پیچھے سے ایک ریڑھے والا نظر آیا۔ ہم نے اُس کا راستہ روک کر ٹھہرایا۔ شریف آدمی نے بلا چون بول کر ریڑھا روک لیا۔ سب اس میں سوار ہو گئیں اور سمن آباد کا رخ کیا۔ چندہ کر کے پیسے اکٹھے کیے جو غالباً اجرت سے کم تھے سمن شریف آدمی نے کسی قسم کی مزاحمت نہ کی۔ ہمیں بغیر کوئی مذاق یا بھنگڑا کیے سمن آباد آ پاجی فرحت کے گھر اتار دیا۔

ہم آج کی نوجوان نسل پر آزادی کا لیل لگاتے ہیں لیکن ہم اس بات پر توجہ نہیں دیتے کہ ہر بیس پچیس سال کے بعد آزادی کا معیار بدل جاتا ہے۔ یہی ارتقاء کا راستہ ہے۔ ہمیں پسند آئے نہ آئے اللہ اسی طرح تبدیلی لاتا چلا جاتا ہے۔ ہمارے عہد میں بھی فاسٹ فوڈ تھا۔ گول گپے، دہی بھلے، چکڑ چھولے، پھسورے ہماری پود کے پسندیدہ تھے اور ماں باپ ان چسکوں سے منع کرتے تھے جیسے آج برگر، چپس اور سوفٹ ڈرنک سے منع کرتے ہیں۔ تب فون نہ تھے غالباً نہ گفتگو نہ سٹریٹ پر ہو سکتی تھی نہ فون پر لیکن خطوں کے کبوتر اور چوری چھپے کی ملاقاتیں عام تھیں۔ ایک موت ایسی اٹل حقیقت ہے جسے انسان آنکھوں سے دیکھتا اور جھٹلا نہیں سکتا۔ باقی سب کچھ اُس کی بصیرت اور آئی کیو اور جینز پر منحصر ہے۔ وہ کیا کچھ سمجھتا ہے کس چیز سے کیا سیکھتا ہے؟

میں نے اسی سکول میں اپنا ایک ناول قریب قریب مکمل کیا لیکن قیام پاکستان کے بعد کے واقعات اور نشیب و فراز مکمل نہ ہو سکے اور نیت کی تھیم پر یہ ناول تاحال نامکمل ہے۔ اپنے پڑھنے پڑھانے کے شغل میں مجھے پانچویں جماعت

میں انارکلی ڈرامے نے بے حد متاثر کیا تھا۔ میں چھوٹی عمر سے انارکلی کے کردار میں ڈھل جانے کی خواہش رکھتی تھی۔ اس خواب نے ابھر کر مجھے ستانا شروع کیا۔

میں نے سید امتیاز علی تاج کے اس ڈرامے کو سٹیج کرنے کی ٹھان لی۔ پیچھے میری نیت یہ تھی کہ میں انارکلی کی ادا کروں گی۔ محمودہ اظہر شہزادہ سلیم کا کردار تیار کرنے لگی۔ میں نے ناہید کو بلایا اور استدعا کی کہ وہ دلآ رام کارول ہوگی۔ لیکن وہ بیچاری روایت پسند بدگئی کیونکہ میں یہ ڈرامہ آرٹس کونسل میں کرنا چاہتی تھی۔ خیر سکول کی ایک ٹیچر بلقیس کے دے دیا گیا۔ اکبر کے رول کے لیے تھوڑی سی مشکل درپیش تھی لیکن پھر نسرین نے یہ ذمہ داری اٹھائی۔

نسرین نے بادشاہ اکبر کا رول اپنایا۔ چونکہ قد ذرا چھوٹا تھا اس لیے ہیل والی جوتیاں پہن کر اوپر سے زیب تن کر کے سٹیج پر براجمان ہوتی۔ اس زمانے میں نسبت روڈ پر ایک ”ہالی وڈ ٹیلرز“ ہوا کرتے تھے۔ فلموں کے لیے لباسوں کا شاک رکھتے تھے۔ پیسے جمع کر کے ان سے ساری کا سٹ کے ملبوسات جمع کیے۔ ناہید گوڈرامے میں شریک تھی لیکن وہ سکول میں ہونے والی ریہرسلوں پر آجاتی اور بڑے مزے کا وقت گزرتا۔

ہال کے لیے آرٹس کونسل کی طرف رجوع کیا۔ نئی بلڈنگ میں ایک لمبوٹرا ساسٹوڈیو دائیں طرف تھا۔ جس پر سٹیج شو اور ڈرامے کبھی کبھی منعقد کیے جاتے۔ میں وہاں پہنچی، یہیں میری پہلی ملاقات انور سجاد سے ہوئی۔ اس کی طرح اُس میں قدرتی تجسس تھا۔

”آپ؟“

”میرا نام قدسیہ چھٹہ ہے اور میں یہاں انارکلی ڈرامہ سٹیج کرنا چاہتی ہوں۔“

”لیکن یہ تو بہت Elaborate مغلیہ ماحول کا ڈرامہ ہے۔ آپ کیسے.....؟“

”ہم کر لیں گے۔ آپ تاریخیں دے دیجئے۔“

”وہ تو میں دے ہی دوں گا لیکن کیا آپ کو ایسا کوئی تجربہ پہلے بھی ہے؟“

”جی نہیں تجربہ تو نہیں ہے لیکن کر لیں گے..... تجربہ۔“

”سلیم کارول کون کرے گا؟“ انہوں نے چند فلمی ایکٹروں کے نام مدد کے لیے پیش کیے۔

”جی نہیں اس میں مرد کا سٹ شامل نہیں ہے۔ ہم لڑکیاں ہی سارا کام کریں گی۔“

انور سجاد نے ابرو اٹھا کر کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ چاپ تاریخیں دے دیں۔

اس ڈرامے کے دوران دو عجیب واقعات ہوئے۔ ناہید اپنے ساتھ اماں جی سردار بیگم کو لے کر ڈرامہ دیکھ آ گئیں۔ سٹیج کی لائٹیں اور مغلیہ سیٹ میرے بھائی ریزی کی کاوشوں کا نتیجہ تھا۔ واقعی سٹیج دیکھ کر لگتا تھا کہ مغلیہ دربار کا حصہ روشن ہو گیا۔ جب وہ سین آیا جب شہزادہ سلیم سے لپٹ کر انارکلی اپنے کینز ہونے پر روتی ہے اور شہزادے کو اپنی خواہش سے باز رکھنا چاہتی ہے تو میں نے سٹیج پر وارننگی کے عالم میں اتنے آنسو بہائے اور یوں محمودہ سے لپٹی کہ اس عشق و عاشقی اماں جی جو پرانی وضع کی خاتون تھیں، برداشت نہ کر سکیں اور غصے سے اٹھ کر باہر نکل گئیں۔ ناہید کو بھی بادل نخواستہ ساتھ لے کر جانا پڑا۔

اس واقعے کا میں نے کوئی نوٹس نہ لیا کیونکہ اس وقت ڈرامہ بڑی کامیابی سے چل رہا تھا۔ دوسرا واقعہ اس سے بڑی حیرت کا موجب ہوا۔ اس ڈرامے کی سکول میں خوب تکٹیں بکی تھیں۔ لڑکیوں نے اپنے ہاتھوں سے پیسے وصول کیے تھے اور ہماری خزانچی محمودہ نے بڑی رقم جمع کر لی تھی۔ جس وقت ہم سب اپنا سامان لے کر گھر سے جانے کو تھے تو ایک بار پھر انور سجاد وارد ہو گئے۔

”آپ کا ڈرامہ تو بہت کامیاب گیا۔“

”ہاں جی۔“

”ایک بات ہے قدسیہ۔ میرے پاس ایک فلم کے ڈائریکٹر آئے بیٹھے ہیں۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتے

”فلم ڈائریکٹر؟“

”وہ آپ کو اپنی فلم میں لینا چاہتے ہیں۔“

”مجھے؟..... پر انہیں کیسے پتہ چلا؟“

”یہ فلمی لوگ ٹیلنٹ ہنٹ کرتے رہتے ہیں بانو صاحبہ۔ کسی سراغ رساں نے انہیں خبر دی ہوگی۔ آپ کرنا

”تو میرے آفس میں چل کر ان سے مل لیں۔“

”نہیں سجاد صاحب! مجھے ایسی اجازت گھر سے نہیں ملے گی۔ ان سے ملنے کا فائدہ۔“

میں انور سجاد کو انکار کر کے واپس لوٹی تو میرے دل میں عجیب قسم کا ملال تھا۔ شاید اس روز میرے Career کا

یہ سلسلہ آئی آپ ہو گیا۔ اگر اس روز میں فلموں میں چلی جاتی تو شاید ادیب بننا میرے مقدر سے غائب کر دیا جاتا۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ زندگی کے ہر دور ہے پر انسان کو اپنا فیصلہ خود کرنا پڑتا ہے۔ اللہ میاں بھی انسان کی اس

تصانیف میں حائل نہیں ہوتا۔ اُس نے تضاد سے انسانی لہو کی تشکیل کی ہے۔ یہاں صاف اور گندے لہو آپس میں گڈنڈ

ہوتے ہاتھم اللہ کبھی نہیں دیتا۔ یہ ہر انسان کا اپنا ذاتی فیصلہ ہے کہ وہ کسی دور ہے پر پہنچ کر کونسی تضاد کی راہ اختیار کرے گا۔

فیصلے میں اُس کے سفر کی چال، کامیابی اور ناکامی کا لیول مضمحل ہے۔

ناہید نے جب اماں جی کے ساتھ چلے جانے کا فیصلہ کیا تو اُس نے ماننے والوں سعادت مند لوگوں میں اپنا نام

کھسکایا۔ وہ دل سے ہم جیسی ماڈرن لڑکیوں کے ساتھ تھی لیکن اس اندرونی سوچ کے باوجود اس کا عمل مثبت اور راسخ تھا۔

کیا کوئی کام نہ کرنا چاہتی تھی جس سے ان کے بزرگوں کے دل ڈھکیں۔ میں بھی آہستہ آہستہ اس فیصلے پر پہنچی کہ شاید مجھے

خود معاملگی اور خود ساختہ آزادی کو خدا حافظ کہہ کر ہی اشفاق صاحب کے گھر میں داخلے کی ٹکٹ مل سکتی ہے۔ میں اس

نعرے گروہ کی خود معین کردہ لیڈر تھی۔ ریزی غریب سارا دن غائب رہنے کے باعث اور بیکار ہونے کے ہاتھوں غریب

عصر کی طرح کچھ منوانے کی پوزیشن میں نہ تھا۔ والدہ ملتان میں تھیں۔ خالہ ویسے ہی احسان جتا کر اب اپنا کیا دھرا ضائع

کھین کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے انہوں نے کبھی روک ٹوک کا سہارا نہیں لیا۔ ادھر اس ساری خود سری کو ناہید کی طرح توجہ کر

نے مجھے کچھ حاصل ہونے کا امکان تھا۔ ادھر ان خطوں نے امید کا دیار روشن کر رکھا تھا۔

جب خاں صاحب روم سے لوٹے تو میں 455-این میں مقیم تھی۔ میری شیخیاں سنیں تو منہ سے اس نے کہا۔ صرف آہستہ سے بولے۔ ”اچھا وہ فارسی غزل جو تم نے گائی تھی ذرا وہ تو سناؤ۔“ میں نے گائے بغیر فارسی پڑھ دیا۔ انہوں نے اپنا سرائنگی سے کھجلا تے ہوئے کہا ”قدسیہ! کسی سے تلفظ ٹھیک کرو لینا تھا۔ تمہیں معلوم ہے سے بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔“ روکو مت جانے دو” کے اور معنی ہیں اور ”روکو! مت جانے دو.....“ کے کچھ اور معنی تھے وقتے سے سارا مفہوم بدل جاتا ہے۔“ کچھ انور سجاد کا واقعہ مجھے سرد کر گیا تھا لیکن اس کے بعد میرا Career ہمیشہ رک گیا۔ میں ایک عرصے سے ایک ٹریس بننے کے خواب دیکھتی آ رہی تھی۔ لکھنے لکھانے کا شوق واجبی سا تھا۔ راستے پر بورڈ لگ گیا۔ ”روکو! مت جانے دو۔“

آہستہ آہستہ خاں صاحب نے ہی میرے اس ثانوی شوق کی پرورش کی اور اب مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ نے ہی میرے دل میں یہ فیصلہ صادر کر دیا ورنہ اس دوسرے راستے پر چل کر مجھے کچھ زیادہ ہی ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔ اب میں برسوں کے لکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ میرے لکھنے اور خاں صاحب کے لکھنے میں آسمان کا فرق تھا۔ وہ Conviction کے آدمی تھے۔ انہوں نے جب بھی قلم اٹھایا اُن کی تحریر میں یہ صاف جھلکتی نظر آتی ہے۔

میں لکھتی ضرور ہوں لیکن میرے لیے یہ شغل ہمیشہ دوئم درج کی Activity رہا۔ میں نے کبھی اسے اولیٰں جگہ نہیں دی۔ جس طرح خاں صاحب اور کچھ اور میرے واقف کار ادیب اسے پرتوجہ دے کر سردھڑکی بازی لگا دیتے ہیں۔ جو کچھ مجھے ایم اے کی تعلیم میں نصیب ہو گیا میرے لیے کافی تھا۔ کچھ پڑھتی تھی کسی افادیت کے پیش نظر مطالعہ نہ تھا۔

60- فیروز پور روڈ سے میری خالہ فیروزہ 450-این میں منتقل ہو گئیں۔

میں اور ریزی اُن کے دم چھبے بھی ساتھ گئے۔ یہاں خاں صاحب کے خطوں نے ڈھارس بندھانے کی پوسٹنگ اُن دنوں کھاریاں میں تھی۔ وہ جب بھی آتا ہمارے پاس ضرور آتا۔ رات کو ریزی کا پا جامہ پہن جیتے کے گھنٹوں سے کچھ بھی بیچے تک آتا تھا۔

سمن آباد کے اس کوارٹر کی ساخت ایسی تھی کہ اس کا فرنٹ سانسے والی سڑک پر اور ایک چھوٹی سی وین مارکیٹ کی طرف جانے والی سڑک پر بنی تھی۔ میں اور تقو دیر تک اسی چھوٹی دیوار پر بیٹھ کر باتیں کرتے رہتے۔ اس کے الفاظ میں اپنی محبت یا وفاداری کا اظہار نہ کیا لیکن کوئی ایسی Frequency ضرور تھی جو اس کا جذبہ مجھ تک پہنچتا رہا۔ علاوہ کالی ماں سے ملنے افتخار بھائی آیا کرتے تھے۔ اب ناہید بھی قریب تھی۔ وہ بھی مجھ سے ملنے آتی رہتی۔

لیکن پھر ایک بار تبدیلی کا حکم ہوا اور میری والدہ نے ہمیں 455-این کا کوارٹر کرائے پر لے دیا۔ اب ایک پھر ریزی اور میں مختار گل تھے۔ ہم دونوں آزادی سے اپنے فیصلے سے راستے کا چناؤ کرتے۔ ہم کو اپنا وقت کیسے گزارتے کیونکر گزارنا ہے، اس کے لیے ہم کسی کے جوابدہ نہ تھے۔



455- این سمن آباد

اچانک استاد صاحب نے آنا چھوڑ دیا۔ یا تو وہ جس قدر جانتے تھے اُسے Deliver کر چکے تھے یا انہیں علم ہو گیا تھا کہ میں اس سے زیادہ علم موسیقی حاصل کرنے کی اہل نہیں ہوں۔ ہمیشہ کی طرح اس مشغلے سے فراغت پا کر میں نے اپنے دھونے میں وقت ضائع نہ کیا۔ اب کچھ کچھ زیادہ وقت میں خالہ کے پاس جاتی یا اپنے ناول کو سیدھا کرنے میں لگتی۔ ابھی صاحب کو روم سے آئے چند دن ہوئے تھے کہ میں نے ایک دن اُن کو مرعوب کرنے کی غرض سے شیخیاں مارنا شروع کر دیں کہ کس طرح ہم نے ڈرامہ کیا اور میں نے اس کا سکرپٹ لکھا۔ پھر کیسے سٹیج پر میں نے ”اک ترک غمزہ وزن کہ سہیل شہسئی“ گانا گایا۔

چند لمحے خاں صاحب خاموش رہے پھر بولے ”ڈرامہ مجھے گا کے تو سناؤ۔“

میں نے بڑے تکبر سے پہلا مصرعہ لگایا۔

وہ کچھ لمحے سوچ کر پھر بولے ”سنو کا کی اس مصرعہ میں تو غلطیاں ہیں۔ پھر ویسے بھی تمہاری آواز کا پتلی ہے۔“

مجھ کو انا تمہیں نہیں آسکتا۔ ہو سکے تو کوئی اور مثبت کام کرو۔“

پھر خاں صاحب روم سے لوٹ آئے۔ ایک دو دن غالباً گھر والوں سے میل ملاقات میں گزرا۔ تیسرے دن

ہم کے وقت خاں صاحب ہمارے گھر آئے۔ یہاں بڑا آدمہ گزر کر ایک لمبا کمرہ تھا جس میں ہم نے اپنی طرز کا ڈرائنگ

ہم اور کھانے کا کمرہ بنا رکھا تھا۔ اسی گول میز کے گرد چار پانچ کرسیاں تھیں جن پر بیٹھ کر میں ناول لکھتی۔ ریزی صاحب اپنی

تصویروں تخلیق کرتے اور ہم مل کر ناشتہ اور کھانا بھی کھاتے۔

خاں صاحب کو آئے ابھی آدھا گھنٹہ بھی نہ ہوا تھا۔ ہم اسی گول میز کے گرد بیٹھے تھے کہ اچانک حاجی ضیا

آگئیں۔ چند لمحے علیک سلیک کے بعد انہوں نے خاں صاحب سے کہا۔ ”چلو اٹھو شوق! جہلم سے سعید بھائی آئے ہیں۔“

پتہ تم کلاس فیکٹری کے مالک۔“

سعادت مند بھائی کی طرح خاں صاحب اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے نہ الوداعی سلام کیا نہ پھر آنے کا وعدہ کیا اور

خاموشی سے باجی ضیا کے ساتھ چلے گئے۔

منزہ اور میں اُن دنوں اکٹھے ہوتے تو ہم سر کیس ناپنے کے لیے چل نکلتے۔ ابھی منزہ اشتیاق کی بیوی تھی ہم دونوں میں ایک سی خواہش کہیں ہر وقت شور مچایا کرتی۔ اُس شام ہم دونوں نے 30۔ جیل روڈ محمودہ اصغر کے گھر سے ارادہ کیا۔ بس ارادہ کرنے کی دیر تھی، ہم چل نکلیں۔ اُن دنوں سڑکوں پر گاڑیوں کا رش نہ تھا۔ لڑکیوں کو اغوا کرنے کی نہ پڑی تھی۔ جیل روڈ پر پہنچے ہی تھے کہ پیچھے سے آواز آئی ”مٹو..... کا کی۔“ میں بے پرواہی سے چلتی رہی۔ پچھو ہوئی..... ”کا کی..... کا کی رُکنا.....“

منزہ نے مجھے روکا۔

پیچھے کھکھو ڈیڑی چلے آ رہے تھے۔

ہم دونوں نے سلام کیا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“

”جی یہاں 30۔ جیل روڈ پر میری سہیلی محمودہ رہتی ہے۔ اس سے ملنے جا رہی ہیں۔“

”کیا امی ملتان سے آ گئی ہیں؟“

”جی کل رات ہی پہنچی ہیں۔“

مجھے ہلکا سا شک بھی نہ گزرا کہ کھکھو بھائی اتنا بڑا سندیسہ لے کر آئیں گے۔ دوسرے دن میں خالد کے گھر ہوئی تھی تو ڈیڑی جی آئے۔ انہوں نے امی سے کہا..... ”امی جی! مجھ سے اب شتو کا یہ سنتا پ دیکھا نہیں جاتا۔ بچہ نہیں ہے۔ پھر اسلام میں ایسی پابندی کہاں ہے؟ آپ کل تیار رہیں۔ کل میں شام کو عصر اور مغرب کے درمیان آؤں گا۔ میں نے خاں صاحب کی طرف سے دو گواہ مقرر کر لیے ہیں۔ محمد حسین آرٹس اور قدیر ملک۔ مولوی کے ساتھ ہوں گے۔“

امی کا چہرہ فق ہو گیا۔

امی نے ذرا جرات سے کہا..... ”کھکھو بیٹا! ایسی کیا مجبوری ہے؟ تم یہ فیصلہ کیوں کر رہے ہو؟“

”آپ کی مجبوری نہیں، میرے بھائی کی مجبوری ہے۔“

”اچھا پھر تمہاری مرضی۔“

ڈیڑی نے ذرا ہچکچا کر کہا..... ”ایک بات ہے امی۔“

”ہاں، وہ کیا؟“

”میری کالی ماں اور گنو کو پتہ نہ چلے۔ ابھی 1۔ مزنگ روڈ کی فضا ٹھیک نہیں۔ اماں جی کو پتہ نہیں لگنا چاہیے۔“

”لیکن وہ تو ساتھ ہی رہتی ہیں۔“

”یہ آپ جانیں اور آپ کا کام..... منزہ کو بھی پتہ نہ لگے۔“

میں اپنے آپ کو ایک جاسوسی ناول کی ہیروئن سمجھ رہی تھی۔ اس سارے Adventure میں مجھے لطف آتا

پاس پہننے کے لیے نہ کوئی خوبصورت جوڑا تھا نہ کوئی زیور ہی۔ ہاں میں نے اتنی تیاری ضرور کی کہ ایک چوڑیاں سے کالج کی سرخ چوڑیاں خرید کر پہن لیں۔

16 دسمبر 1956ء کی یہ شام بڑی خاموشی لے کر آئی۔ محمودہ اصغر واقعے سے کچھ پہلے آ گئی۔ میرے پاس ایک سفید کرتا، سفید دوپٹا اور شلوار تھی۔ صرف قمیض تھوڑی سی پھٹی ہوئی تھی لیکن اسے سینے کا وقت بھی نہ تھا۔

”تم مجھے بتا دیتیں۔ میں تمہارے لیے کوئی اچھا سا جوڑا لے آتی۔“

”یہی ٹھیک ہے محمودہ، تم فکر نہ کرو۔“

میں اور محمودہ ڈرائنگ روم کے ساتھ والے کمرے میں تھیں۔ خاں صاحب، ڈیڈی جی، دونوں گواہان، ریزی

ان کے ہمراہ تھے۔ جب نکاح کی اویس لکھت پڑھت ہو گئی تو میری اجازت لینے ڈیڈی جی اندر آئے۔

تین مرتبہ انہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ کیا واقعی میں اس نکاح پر رضامند تھی؟ پھر میرے سائن کرائے۔ محمودہ نے جان کر خاموشی سے اُس کی طرف دیکھا اور شوق کو اندر بھج دیا۔ خاں صاحب نے اپنی پاس بگ مجھے دے کر

”میں کوئی انگٹھی وغیرہ نہیں لایا..... بینک میں میرے نو سو روپے جمع ہیں، یہ تمہارے ہیں۔“

مبارک سلامت کا کوئی شور بلند نہ ہوا۔ میز پر ایک ڈبے میں مٹھائی اور ایک میں پانچ چھ پیمہ سٹریاں پڑی تھیں۔

خیر دولہا پارٹی رخصت ہو گئی۔ محمودہ نے مزید باتیں کرنے کے بجائے چپ چاپ رخصت ہونے کو ترجیح دی اور سمیت غائب ہو گئی۔ ہم تینوں نے بھی کوئی تبصرہ نہ کیا اور خاموشی سے کھانا کھا کر سو رہے۔

اب ہم دونوں میاں بیوی تھے۔

دو دن کے بعد مجھے خاں صاحب نے کہا۔

”قد سید! یہ چوڑیاں اتار دو۔ تم عموماً ایسی شوخ چوڑیاں نہیں پہنتیں۔ کہیں اماں جی کو شک نہ ہو جائے۔“

میں نے کوئی حجت نہ کی۔ بس چپ چاپ چوڑیاں اتار کر زینب کو دے دیں۔

امی نے کسی قسم کا تبصرہ نہ کیا۔ سامان باندھ کر ملتان جانے کی تیاری کر لی۔ جاتے وقت انہوں نے مجھ سے کہا۔

”قد سید! اب خوش ہو؟“

”جی، بہت خوش۔“

”یاد رکھو اپنی مرضی کا فیصلہ عموماً مہنگا پڑتا ہے۔ اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔ قیمت ادا کرتے وقت نہ حوصلہ ہارنا

بیکے محض سے شکایت کرنا۔“

اس سے زیادہ تبصرہ اُن کی ڈکٹری میں نہ تھا۔

امی کے جانے کے بعد خاں صاحب رات دیر گئے میرے پاس آتے، بڑی رازداری سے رات رہتے اور صبح

کھانا کھاتے۔ میں نے اُن سے کبھی نہ پوچھا کہ ابھی کتنی دیر اور اس خبر کو صیغہ راز میں رکھنے کا ارادہ ہے۔ بہر کیف وہ میری ہی مطمئن تھے اور میں اپنے طور پر بہت خوش تھی۔

ایک روز علی الصبح ڈیڈی جی آئے اور میری کھڑکی پر دستک دی۔

”شوق..... شوق..... گھر چلو..... اماں اوپر تمہیں ملنے آ رہی ہیں۔ چلو فوراً۔“

خاں صاحب بستر سے چھلانگ لگا کر اترے۔ تھو تھمبو کر کے کپڑے پہنے۔

اور یہ جاوہ جا۔

چند دن نہ خاں صاحب آئے نہ ڈیڈی جی۔ 1- مزنگ روڈ میں بم کا گولا پھٹا۔

بابا جی نے شوق کو تو کچھ نہ کہا، ڈیڈی جی سے بولے۔ ”مجھے پتہ ہے یہ ساری تیری کارستانی ہے۔“

کام میں تجھے مزہ ملتا ہے۔ شوق کی کیا مجال تھی کہ شادی کر لیتا۔ تو نے بد بخت اسے اُکسایا۔“

اس جرم کی پاداش میں ڈیڈی جی کو ’مزنگ نکالا‘ برداشت کرنا پڑا۔ وہ دور بیڑھیوں پر سامان لادنے

کے گھر پہنچے۔ آپنی منیر اور بچے بے قصور تھے لیکن کیا کرتے۔ ساتھ ہی آتے بن پڑی۔ ماچھا جی نے ماتھے پر ہاتھ

اور ڈیڈی جی کی زبانی اُنہیں پہلی بار پتہ چلا کہ میری شادی ہو چکی ہے۔

آپنی منیر خاں صاحب کی خالہ زاد بہن اور باجی ضیاء کی چھوٹی بہن تھیں۔ انہوں نے کبھی کسی سے ڈیڈی

نکھنوں پن کی شکایت نہ کی۔ وہ اپنے بچوں کی تعلیم میں مشغول رہتیں۔ ایک شام الہتہ انہوں نے مجھے حیران کر دیا۔

بچوں کو لے کر ہمارے گھر آئیں۔ ایک مٹھائی کا ڈبہ ان کے ہمراہ تھا۔ انہوں نے اپنے بیٹے طارق کو میری گود میں

اُس کا منہ بیٹھا کرنے کے بعد بولیں..... ”گود بھرائی کی رسم ہو گئی۔ آج سے یہ تمہارا منہنی ہے۔“

اس رسم کی لاج ہمیشہ ڈاکٹر طارق بن افتخار نے رکھی۔ وہ نہ صرف شکا گو میں ایک عالمی شہرت کا حامل

سرجن ہے بلکہ اس کی بڑی ذاتی شناخت خاں صاحب کے حوالے سے ہے۔ اسے فوٹو گرافی اور ٹکٹس جمع کرنے

بہت شوق ہے۔ اس کی بنائی ہوئی تصویریں خاص کر خاں صاحب کی کالے گرتے والی تصویر ان کی تمام کتابوں کی

پہلی ہے۔ ابھی جب باغ میں زلزلہ آیا تو وہ چند امریکی سینئروں کے ہمراہ پہنچا۔ ہم چونکہ ہر وقت امریکیوں کی مہر تو

محتاج ہیں اس لیے یہ بھی ایک ایسی شناخت ہے جو اہم ہے اور غالباً (کو) طارق سے زیادہ ان سینئروں پر مینڈی

دی۔ وہ تو ہڈیاں جوڑتا رہا اور سینئر امریکہ کی شناخت میں اضافہ کرتے رہے۔

اماں جی اور بابا جی نے خاں صاحب کو کچھ نہ کہا لیکن جب ڈیڈی جی مزنگ روڈ سے نکل آئے تو یہ خاں

کی مروت سے بعید تھا کہ وہ وہیں چوہا رہے پر گئے رہتے۔ اُنہوں نے اپنا سامان دور بیڑھوں پر لادا۔ ٹونٹی والی

نشانی وہیں چھت پر رہا اور وہ سمن آباد آ گئے۔ ویسے بھی اُن کا زیادہ وقت ہمارے گھر میں ہی گزرتا تھا۔

ایک روز دو بیڑھے ہمارے گھر کے آگے رُکے۔ اُن میں زیادہ تر خاں صاحب کی کتابیں اور

الماریاں تھیں۔ اب وہ لمبا کمرہ جو ہمارا ڈرائنگ روم کم ڈائمنگ روم تھا، اس کی لمبی دیوار کے ساتھ کتابوں کی الماریاں

گئیں اور گول میز پر بیٹھ کر خاں صاحب مطالعے میں غرق رہنے لگے۔

نکاح کے بعد باقاعدگی سے گھر آنے والے جناب محمد حسین شاف آرٹسٹ ریڈیو پاکستان اور

ریکارڈسٹ ریڈیو پاکستان تھے۔ خاں صاحب ان سے باتیں کم ہی کرتے۔ نانانے اُن سے دوستی کر لی اور یہ

میں بیٹھ کر تاش پر می یا بینک بینک کھیلتے۔ کبھی کبھی جب ڈیڈی جی آجاتے تو اُن کو چوتھا پارٹنر مل جاتا۔ عموماً مجھے بھی کھیلتے پر اُستائے لیکن پتہ نہیں کیوں میں زیادہ وقت نہ نکال سکتی۔
اُن دنوں ایک اور تبدیلی نے سر نکالا۔

آپا فرحت من آباد میں آچکی تھیں۔ جاوید اپنی پڑھائی سے بہت غافل تھا۔ اس نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ تو لیا تھا لیکن اُس نے اپنے کلاس کے چند ناکارہ لڑکوں سے دوستی گانٹھ لی تھی اور ان کو اپنی جاوید بیانی سے مطیع کر رکھا تھا۔
جب میں سے کچھ دیر پہلے کا واقعہ ہے۔ جب میں 450-450 این میں خالہ کے پاس رہتی تھی۔

ایک روز آپا جی فرحت میرے پاس آئیں اور کہا..... ”قدسیہ! تم نے ناہید جیسی بے پروا کھلنڈری کو بی۔ اے لیا ہے۔ جب جیدی مجھے بی۔ اے کرنا نظر نہیں آتا۔ کچھ اس کی مدد کرو۔“ ہمیشہ کی طرح میں نے کام کی نوعیت سمجھے بغیر حامی

جاوید پڑھنے کے لیے آنے لگا۔ پڑھائی تو مشکل نہ تھی لیکن جاوید اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا پلا لے آتا۔ سارا وقت میں پڑھاتی وہ اس کتے کو گود میں رکھ کر کبھی سہلاتا، کبھی گلد گدیاں کرتا، کبھی غراتا..... اس مشغلے کے ساتھ پڑھنا ہی نہیں ہو گیا۔ ایک روز میں نے جاوید سے کہا۔ ”جیدی! تم کل سے کتابیں لاؤ گے۔ اگر کتاب لانا ہے تو گھر بیٹھو۔“
نتیجہ یہ نکلا کہ جیدی نے گھر آنا چھوڑ دیا۔

ایک روز آپا جی آئیں۔ مجھے کہنے لگیں۔ ”قدسیہ! امتحان میں کم وقت رہ گیا ہے۔ جیدی آنے پر رضامند نہیں ہوئے۔ یہ ممکن ہے کہ تم ہمارے گھر آ کر پڑھا جایا کرو؟“

اب میں باقاعدگی کے ساتھ آپا جی کے گھر جانے لگی۔ زندگی میں پہلی بار میں نے ایک صاف ستھری خانہ دار گھر میں کو قریب سے دیکھا۔ آپا جی کے شوہر نامدار بھائی عبدالقادر ساہی وال میں ہی تھے اور آپا جی جاوید کی خاطر یہاں آئی تھی۔ ساتھ والے گھر میں آفتاب بھائی رہتے تھے۔ اُن کے گھر چونکہ بیوی نہ تھی۔ خالد آفتاب اور وہ آپا جی کے ساتھ کھانا کھاتے اور خالد سکول کے بعد اپنے کتے Lassi کے ساتھ سڑکیں ناپتا تھا۔

آپا جی کے گھر کے قریب چوہدری برکت علی کی کوشی تھی۔ اُس زمانے میں ان کا رسالہ ”ادب لطیف“ اپنا مقام جیتنے میں بنا چکا تھا اور اُن کے اعزہ رشید احمد چوہدری وغیرہ کے مکتبہ جدید سے خاں صاحب کی کتاب ”ایک محبت“ چھپ چکی تھی۔ ریزی اُن کے سرورق بنانے کے لیے مکتبہ جدید جایا کرتا۔ چوہدری برکت علی فوت ہو گئے تو ان کے بیٹوں سے اتنا بڑا کاروبار سنبھل نہ سکا لیکن چوہدری صاحب کی بیٹی گواس وقت محض سولہ برس کی تھی، اس نے ہوش جمع کر لیا۔ بہت زیادہ پڑھنے والی صدیقہ ذہانت کے ساتھ ساتھ بڑے اچھے دل کی مالک تھی۔ جاوید پھرنے کے وقت شوقین، زندگی سے حظ اٹھانے کی عمر میں تھا۔ بسوں پر آتے جاتے، بس سٹاپ پر انتظار کے دوران دونوں کی بات چیت ہوتی۔ جاوید کی عمر اس وقت بمشکل تمام انیس برس کی تھی۔

پھر اچانک پتہ چلا کہ جاوید نے بھی پٹھان برادری کی روایت چکنا چور کر دی۔ اُس نے ایک غیر پٹھان عورت سے نکاح کر لیا اور آپا جی نے خاندان کی پاسداری میں جیدی کو گھر سے نکال دیا۔ وہ بوریا بستر لے کر

ہمارے گھر آ بسا۔

بظاہر یہ سارے کوائف اس بات کی دلیل تھے کہ جاوید ناکارہ، ناکام اور زندگی میں کسی مقام پر پہنچنے
تھا لیکن زندگی کا کچھ علم نہیں۔ آج وہ ہائی نون لیبارٹریز کا مالک ہے جو ایشیا کی ایک بہت بڑی ادویات بنانے
ہے۔ کوئی شخص کن وجوہات سے کہاں پہنچتا ہے، اس کے متعلق وثوق سے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔

یہاں کچھ لمحے توقف کیجیے۔ میں آپ کے ساتھ اپنے تجربات سے اخذ کیا ہوا کچھ مشاہدہ Share
ہوں۔ باری تعالیٰ ہمیشہ نیکی سے نیکی کے نتائج اخذ نہیں کرتا۔ کبھی کبھی وہ نیک اعمال کے نتیجے میں برے حالات
لاتا ہے اور کبھی کبھی برائی بھی بڑی کارآمد شاندار مستقبل کی ضامن بن جاتی ہے۔

آج 2007ء ہے اور میں دیکھتی ہوں کہ ”مختاراں مائی“ نے کس عروج کو چھو لیا ہے۔ وہ Rape کو
پتہ نہیں کیوں اور کیسے پہلے پاکستانی میڈیا نے اور پھر یورپی اور امریکی الیکٹرونک اور پریس میڈیا نے اُسے آ
دیا حتیٰ کہ وہ یو این او کی مہمان بن گئی اور شہرت کا وہ مقام پالیا جو محنت اور مثبت کاموں سے نکل نہ سکتا تھا۔

ہزاروں نہیں لاکھوں ایسی لڑکیاں ہیں جن سے اغوا اور جنسی تشدد کا واقعہ پیش آیا۔ تمام عمر ذلت
احساس کمتری کا شکار رہتی ہیں لیکن وہ بے نیاز، قادر مطلق کسی کے مشورے کا محتاج نہیں نہ روادار ہی۔ وہ یہ دکھانے
ہے کہ برائی سے بھی نیکی کے نتائج نکال سکتا ہے اور کئی بار ساری عمر کے نیک اعمال، عبادتیں بھی منفی نتائج نکال
ہیں۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ انسان نیک اعمال سے منہ موڑ لے اور یہ سمجھنے لگے کہ اگر میں نتیجے پر قابض نہیں تو
مشقت سے حاصل! بات وہیں آ کر رکھتی ہے کہ مالی کام پانی دینا ہے۔ پھل پھول لگانے والا کہیں اوپر بیٹھنے
چاہے نہ چاہے اُس بے نیاز کی مرضی۔ کسی کی محنت کو قبول نہیں کرتا اور کسی کی نااہلی کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

455- این آبد کا گھر ہمارے لیے عجیب بابرکت ثابت ہوا۔ خاں صاحب اور میں دونوں ماں
دکھانے کے مرتکب ہوئے لیکن عجیب بات اس کا نتیجہ ہمارے لیے مثبت ملا۔ ہم دونوں ایک ہی دھکے میں بڑے
اور تقویت سے پُر اپنی صلاحیت، قابلیت اور اہلیت کے متلاشی ہو گئے۔ یہاں ہی سے ”داستان گو“ رسالہ نکالا گیا۔
غالباً برصغیر میں پہلا اور اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ تھا۔ ریزی کی بیکاری بھی خوب کام آئی۔ اُس نے کچھ دیر
صرف کی اور پھر ایک روز خاں صاحب رسالے کی ڈمی بنانے میں مشغول تھے کہ ریزی اُن کے پاس آیا۔
”یار شقو! میں ”داستان گو“ کا ایسا سوراق بنواؤں گا کہ دنیا دیکھے گی۔“

”کیا مطلب؟“

”میں نے سلک سکرین پرنٹنگ (Silk screen printing) کا طریقہ سیکھ لیا ہے۔ میں وہ جالی
لوں گا جس پر جو بھی تصویر بنانا ہوگی بنا لوں گا۔ پھر ہم رنگ اوپر ڈال کر سکوجی پھیریں گے نقش نیچے کا غدر پر آ جائے
”یار یہ سکوجی کیا بلا ہے؟“

”جس طرح شیشوں کو صاف کرنے کے لیے ایک واپیر نہیں ہوتا، فرشوں پر پھیرنے والا واپیر؟“

”یار احمق نہ بنو ریزی۔ ابھی مغرب میں اس کی تحقیق تصدیق کو نہیں پہنچی۔ تم کہاں سے اتنے تیس مارخان

”ہاں ہاں۔ جو مرضی مجھے کہہ لو۔ میں کر کے دکھاؤں گا۔ ایک مشکل ہے۔ جتنے رنگوں کا نائٹل ہوگا۔ اتنی مرتبہ ہر رنگ لگانا ہوگا جیسے لباس سفید، دوپٹہ گرین، قالین سرخ ہو تو تین بار سرورق چھاپنا ہوگا۔“

”بھائی اتنے سارے کاغذ سکھائیں گے کیسے۔ باہر تو سکھانے کے لیے مشین ہوتی ہے۔“ خاں صاحب بولے۔

”میں نے اُس کا علاج بھی تلاش کر لیا ہے۔“

”کیا؟ مسٹر واس کوڈی گا ما۔“

”ہمارے برآمدے میں جو چھتیں لگی ہیں، ان کے کونوں میں جو خالی جگہ ہے وہاں سوکھنے کے لیے آرام سے بیٹھ جائیں گے۔“

”دیکھیں کہیں مروانہ دس۔ پہلے ہی خرچ نہیں چلتا۔“

میں جو یونی بیٹھی یہ گفتگو سن رہی تھی۔ میرا کام بھی متعین ہو گیا۔ میں ایک ایک کاغذ اٹھاتی اور اسے جتن میں رکھنے کے لیے لگا دیتی۔ خاں صاحب نے رسالے سے پہلے مال روڈ پر دفتر ”داستان گو“ بنا لیا تھا۔ سلیم چوہدری یہاں بیٹھے تھے اور ان کے علاوہ کاتب یوسف رسالے کے میٹریل کی کتابت کرتے تھے۔ اُن دنوں ابھی کمپیوٹر ایجاد نہ ہوئے تھے۔ کتب اور خطاطی کافن ہر کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ کاتب یوسف نے نہ کبھی اجرت مانگی نہ کبھی کسی قسم کا تقاضا ہی کیا۔ میں نے کہا تو کتابت کرنی نہ ملتا تو دفتر میں بیٹھ کر گھر چلے گئے۔ سلیم چوہدری محکمہ فوڈ میں ملازم تھے۔ وہ بھی کسی قسم کی تنخواہ یا سہولت کی خاطر نہ آتے۔ جب رسالہ چل نکلا اور دفتر میں لوگ آنے لگے تو اُن کا خیال کرتے، چائے پانی پیش کرتے۔

جب آجاتے تو پچھلی سیٹ اختیار کر لیتے۔

مجھے کبھی اس دفتر میں جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ میں گھر پر ہی بیٹھ کر کام کرتی تھی۔ محمد علی رقعہ لے کر میرے پاس آتے۔ صاحب عموماً ”داستان گو“ کی چھپی ہوئی پرچی پر لکھتے۔ ”قدسیہ! یوسف خالی بیٹھا ہے، میٹریل نہیں ہے۔ کوئی کتنی مضمون؟ فوراً لکھ کر بھیجو۔“

تمام کام پس پشت ڈال کر میں قلم کاغذ لے کر بیٹھ جاتی۔ رسالے میں اپنے پُر اعتماد لوگوں کے نام سے کہانیاں، مضمون لکھ کر بھیج دیتی۔ جیدی، صدیقہ، ڈیڈی جی کے نام سے کئی کہانیاں لکھیں۔ مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک روز ڈیڈی میرے پاس آئے اور کہنے لگے۔ ”کاکا! یہ تیت کی آنکھ کیا چیز ہے؟“

”ڈیڈی جی! یہ مصر کے فنون تہ آخ مون کے نام سے مخفف بنایا۔“

”مٹنی! مجھے تو بتا دیا ہوتا۔ آج دفتر میں ایک آدمی نے مجھے پکڑ لیا۔ وہ کچھ معلومات بڑھانا چاہتا تھا۔“

میں کچھ پریشان ہو گئی تو ڈیڈی جی بولے۔ ”چل میں نے سنبھال لیا تھا تو ایویرس فکر نہ کر۔“

عموماً ڈیڈی جی میری اور صدیقہ کی غلطیوں کو اسی طرح سنبھالنے کے عادی تھے۔ یہ جھوٹ کی وہ قسم ہے جو کسی کو بچانے کے لیے بولا جاتا ہے۔ ایک دفعہ ڈیڈی جی سری پائے اٹھا کر لے آئے۔ میں نے کبھی نہاری، سری

مجلسی کباب وغیرہ نہ بنائے۔ مجھے ڈیڈی جی بولے۔ ”یہ مٹنی! تیرے سپرد لیکن زینب سے نہ پکوانا خود پکانا۔“

وہ تو سودا پکڑا کر چلے گئے۔ میں ایک امتحان میں پڑ گئی۔ رات جب وہ اور ڈیڈی جی کھانے بیٹھے تو ڈیڈی جی

نے بڑے چسکے لے کر کھائے۔ میں سمجھی یہ پھر ڈیڈی جی میرا دل رکھنے کے لیے جھوٹ بول رہے ہیں۔ اُن کے پاس بعد میں نے تعریف طلب نظروں سے خاں صاحب کو دیکھا۔ وہ میری حالت دیکھ کر بولے۔ ”واقعی قدسیہ! تم نے اس کی طرح پائے پکا دیئے۔“

پھر انہوں نے جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا اور اس پر سائن کر کے مجھے دے دیا۔ اُن کی داد دینے لگا۔ انوکھا طریقہ تھا۔ وہ ایک روپے کے نوٹ پر آٹوگراف کر کے تعریف کیا کرتے تھے۔

کچھ دیر تو ڈیڈی جی اپنی کالی ماں کے پاس رہے لیکن پھر غیرت مند آپی جی نے گھر تلاش کر لیا اور وہیں کالونی بوریا بسز سمیٹ کر چلے گئے۔ میرا اور خاں صاحب کا معمول تھا کہ ہم شام کے وقت ڈیڈی جی کے گھر چلے جاتے۔ یہ ہمارے لیے بہت خوشی اور آئندگی تقریب ہوتی۔ خاں صاحب اپنے گھر سے زیادہ ڈیڈی جی اور آپی منیر کے گھر کو Home محسوس کرتے۔ فرش پر چھوٹا سا میز پوش بچھا کر آپی جی، ڈیڈی جی اُن کے بچے لکھی، ککو، حارث اور دسترخوان کے مزے لوٹتے۔ میں آپی جی سے پکانے کے گڑ اور ترکیبیں سیکھتی۔ ڈیڈی اور خاں صاحب 1- مزے باتیں کیا کرتے۔

جب کبھی خاں صاحب شہر سے باہر جاتے، میں آپی جی کے پاس رات گزارتی اور لکھی میرے پاس سوتی۔ خاں صاحب کے گھر میں رواج تھا کہ عام طور پر چھوٹے ہی بڑوں کے گھروں سلام کرنے جاتے اور شاز ہی چھوٹوں کے گھر پھرے اڑاتے۔ جس طرح ہمیں ڈیڈی جی کے گھر جانے کی عادت تھی ویسے ہی صدیقہ تقریباً ہر دوسرے تیسرے روز ہماری طرف آ جاتے۔

دن گزرتے گئے اور ہم بغیر شور مچائے ترقی کرتے چلے گئے۔ پھر وہ دن آ پہنچا۔ جب اللہ کو ہمارے گھر ایک نئی روح بھیجنا تھا۔ مجھے دیکھنے اور اور میرے حالات جاننے کے لیے ایک معمولی سی وائی حسین بی بی آیا کرتی تھی۔ دہلی پتلی دراز قد بڑی خاموش طبع۔ وہ چرب زبانی سے کم اور باتیں آنکھوں سے کام لینے والی تھی۔ وہ دوسرے تیسرے روز میرے پاس آتی اور مجھے دبانے کی خواہش ظاہر کرتی۔ کبھی اس آسائش کو اپنے لیے جا کر نہ سمجھا۔

جس روز ایشق بیٹے کو دنیا میں آنا تھا۔ میری تکلیف کے تیور دیکھ کر امی نے مجھے خالہ کے گھر 450- این میں ہونے کے لیے کہا۔ انہوں نے چھوٹے بچے کے لیے اپنے ہاتھ سے آٹھ جوڑے سی رکھے تھے۔ ان کی پوٹلی بنائی۔ چلمچی اٹھائی اور ہم دونوں نے ماچھا جی کے جا کر دستک دی۔ گویا دونوں بہنوں میں اس تقریب کے لیے پہلے سے متعلق ہو چکی تھی۔

فورا حسین بی بی کو بلوایا گیا۔ پتہ نہیں ڈیڈی جی کو کیسے خبر ہوگئی۔ وہ واقعی میرے باپ کا رول ادا کرنے آ گئے۔ انہوں نے اور تو کچھ نہ کیا۔ میرے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور ساتھ والے کمرے میں بیٹھ کر پورا وقت بیٹھیں پڑھتے رہے۔

جس وقت نوکی نے پہلی اضطرابی چیخ ماری، جمعے کی اذان ہو رہی تھی۔ ڈیڈی جی نے شکرانے کے دونوں ہاتھ

حسین بی بی نے نہایت خاموشی سے بچے کو نہلایا ڈھلایا، صاف چادر میں کس کے باندھا اور ڈیڈی جی کے بازوؤں میں
 ڈیڈی جی نے اینق بیٹے کے کان میں اذان دی اور بڑی خاموشی سے اُسے خاں صاحب کی گود میں ڈے دیا۔
 18 اکتوبر 1957ء میں اینق اس دنیا میں آئے۔

اور پورے سال بعد 16 ستمبر 1958ء کو انیس بیٹے نے ہمارے گھر کو روشنی بخشی۔ نانا تو گھر پر موجود تھے لیکن
 خاں صاحب کی تبدیلی شیخوپورہ ہو چکی تھی اور وہ لاہور میں نہ تھے۔ ڈیڈی جی بھی کراچی گئے ہوئے تھے۔ اس باران کا سہارا
 خاں صاحب نے باہر والے برآمدے میں اپنی چارپائی بچھائی۔ اندر نانا اور حسین بی بی اپنی کارروائی اور میں اپنی
 سسٹم میں جھٹکا ہو گئی۔ قریب دو بچے کے قریب انیس بیٹے نے چیخ مار کر اپنی آمد کا ڈنکا بجایا۔ حسین بی بی نے اسے نہلا ڈھلا کر
 سسٹم میں باندھ کر امی جی کو دیا تو وہ بولیں..... ”بائے بیچارے کو اتنی سختی سے کیوں باندھ دیا ہے؟“
 ”بی بی جی! اس طرح بچہ ڈرتا نہیں اور روتا بھی کم ہے۔“

اس سے زیادہ حسین بی بی نے کوئی توجیہ نہ دی۔ امی نے خاں صاحب کو بچہ دیتے وقت بہت ہولے سے
 دیکھا۔ تالیاں بجا کر چھین مار کر خوشی کا اظہار کرنے والی غالب پریشان تھیں کہ اوپر تلے کے بچے کیسے پالے جائیں
 گے۔ امی جی اپنی اتنی سادہ لوح اور غیر Practical ہے کہ یہ اتنی ذمہ داری کیسے اٹھائے گی۔ وہ خود تو ملتان جاتی رہتی تھیں
 لیکن اس کام میں ہاتھ بٹانا ممکن نہ تھا۔

لیکن ہم دونوں کو علم نہ تھا کہ بچے تو آفرینش کا مسئلہ ہے۔ پرورش تو اوپر والے کی صفت ہے۔ وہ فقط ماں کے سر
 سے لے کے لیے اس کا رخیر میں اسے شامل کر لیتا ہے اور اس کی جزا بھی مقرر کر دی ہے۔

اس معاملے میں خاں صاحب نے میری بہت مدد کی۔ چھوٹا سا اینق جب گجروم اٹھتا اور دودھ کے لیے ضد کرتا
 تھا صاحب اسے گود میں اٹھا کر باہر لے جاتے اور سڑک پر نہلاتے۔ اتنی دیر میں دودھ کی بوتل تیار ہو جاتی اور یوں بچے
 کو دودھ پلانی سے بچالیا جاتا۔ میری خوراک اور صحت ایسی نہ رہی تھی کہ میں اینق کو اپنا دودھ پلائی۔ تین چار مہینے کے بعد
 اسے بوتل پر لگانا پڑا۔

انیس کی پرورش میں اس قدر مشکل بھی پیش نہ آئی۔ ایک تو وہ اپنی Genetics کے اعتبار سے رونے دھونے
 سے بچتا تھا۔ پھر مجھے بھی بچہ پالنے کی انکل آ چکی تھی۔ بڑے آرام سے وقت گزرتا گیا۔ حسین بی بی اینق
 کے پوتے دھونے آتی تھی۔ پھر انیس کی جوگان دھو جاتی۔ اس سے زیادہ وہ ہم کھائی کی عادی نہ تھی۔

میرے تیسرے بیٹے اشیر احمد کی پیدائش 15 جون 1962ء میں ہوئی۔ اب تک ہماری زندگی میں مالی سہولت
 نہ تھی۔ جاوید کے پاس ایک ہری مورس گاڑی تھی اور وہ بینک میں اچھی خاصی تنخواہ لے رہا تھا۔ اس سے پہلے ٹیلیڈ کی
 پیدائش کے وقت ہمیں ایف سی کالج کے ہسپتال کا تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ ہم ڈاکٹر مارٹن جسے ہم لیڈی مارٹن کہتے تھے، واقفیت
 سے رکھتے تھے۔

اشیر کی پیدائش کے وقت ہم نے حسین بی بی سے رابطہ نہ کیا۔ انسانی فطرت کے مطابق ہم اس کی خدمات کو
 سنبھالنے کے لیے تھے۔ مجھے صرف یہ ڈرتا کہ اینق کی باری تو میرا فلیپوٹ کی بہن جیوانندن بروقت آگئی تھیں اور انہوں نے دس

ٹانگے بغیر بے ہوش کیے لگا دیئے تھے لیکن اب صرف خوف ہی تھا، انتظام نہ تھا۔

جاوید ایک دن گاڑی لے کر آ گیا اور مجھے اور خاں صاحب کو لے کر ایف سی کالج کے کمرچین ہسپتال میں لے گیا۔

”معائنہ کرانے میں کوئی حرج نہیں ماموں۔ اگر معاملہ ٹھیک ہو تو مامی کو واپس لے آئیں گے۔“

جب میں ہسپتال پہنچی تو ڈاکٹر مارٹن ان دونوں کو باہر چھوڑ کر مجھے ڈیوری روم میں لے گئی۔ مجھے لیٹنے کا حکم دیا۔

کچھ دیر معائنہ کرنے کے بعد اُس نے مجھے تعجب سے پوچھا۔

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ گیارہواں مہینہ ہے اور اگر ابھی بچہ کی ڈیوری نہ کی گئی تو اُس کی جان کا خطرہ ہے۔“

اس کے بعد اُس نے مجھے جلدی سے اوپر تلے ٹیکے لگائے۔ بے ہوش رکھنے کا جتن کیا اور اشرمیاں بڑی مشکل سے لگائی۔

کے پہلے پہر اس دنیا میں آ گئے۔ اس طرح ہماری دنیا کو منور کرنے تین چاند ہماری خوش قسمتی کا مظہر بن گئے۔

یہاں کچھ اور بچوں کی آمد کا حوالہ دینے پر طبیعت آمادہ ہو رہی ہے۔ آج سے دس بیس سال پہلے مجھے

پیدائش کا باب ممنوع تھا لیکن اب 2007ء میں ٹیک منہ میں انگلی ڈالنے کا نہیں اور صحت کے ضمن میں اس کی انگریزی

جنسی تعلیم بچوں کی تعلیم کا حصہ بن چکی ہے۔

ڈیڈی، جی ان دنوں چوبداری کا لونی میں رہتے تھے۔ انٹیج کی پیدائش سے ٹھیک دس دن بعد ڈیڈی، جی کی

اس دنیا میں تشریف لائی۔ ابھی حسین بی بی کا سکہ چلتا تھا۔ میں نے اور خاں صاحب بھگم بھگم ڈیڈی، جی کے گھر

خاں صاحب نے اس کے کانوں میں اذان دی۔ اس طرح بابا محمد خاں کے گھنے درخت میں ایک اور بیٹھا پھل لگا۔

صدیقہ بیگم دسے کی مر بیضہ تھی۔ کبھی کبھی جب اُسے ایک ہوتا تو اُس کا دم اکھڑ جاتا اور لگتا آخری

ہے۔ میں نے ایک دن صدیقہ کو مشورہ دیا کہ ایف سی کالج ہسپتال چلتے ہیں۔ تم اپنا معائنہ کراؤ۔ یہ کام حسین بی بی

بس کا نہیں لگتا۔

”لیکن مامی جائیں گے کیسے۔ گاڑی وغیرہ تو ہے نہیں۔ آپ کے بچے چھوٹے ہیں۔“

احقوں کی طرح میں نے کہا۔ ”بس میں چلیں گے۔ نہر کنارے تک بس لے جائے گی۔“

”اور اُس سے آگے۔“

”ٹھوڑا راستہ ہے نوکی چل لے گا۔ لالے کو میں اٹھالوں گی۔“

”دیکھ لیں، آپ کو تکلیف ہوگی۔“

”کوئی تکلیف وکلیف نہیں ہوتی۔ تم چلنے کی تیاری کرو۔“

تب سمن آباد سے نہر کے آخری سٹاپ تک ایک آدمی کی ٹلٹ دورو پے تھی۔

ہم دونوں مع بچگان ہسپتال پہنچے۔ یہاں اس وقت معائنے کی عرضی سے عورتیں جمع تھیں اور باری باری

مارٹن سے مشورہ کرنے کے لیے اندر جا رہی تھیں۔

ہمیشہ کی طرح میں ڈاکٹر مارٹن کا نام سن کر بڑی مرعوب ہوئی۔ سفید قوم کے گورے پن کی ہیبت کے سامنے

نے تمام ہتھیار ڈال دیئے۔ اندر ڈاکٹر مارٹن کے پاس پہنچ کر میں نے قدرے دلیرانہ انداز اختیار کیا اور اسے صورتحال

اس نے کچھ پڑتا لگا کر مجھے ایک چٹ دی جس پر وقت، تاریخ درج تھی اور لکھا تھا کہ پیدائش کے وقت میں
 کوئی ہسپتال پہنچ جاؤں۔ حُسن اتفاق سے نانا آگئیں اور بچوں کو ساتھ نہ لے جانا پڑا۔ جس وقت ہم ہسپتال
 پہنچے لیڈی ڈاکٹر نے پڑتے ہی صدیقہ بیگم کو اندر ڈیوری روم میں بھیجنے کا حکم دیا۔

جاوید اور خاں صاحب مع میرے باہر انتظار گاہ میں بیٹھ گئے۔

کچھ دیر کے بعد لیڈی مارٹن باہر آئی اور مجھے ایک گاؤن پکڑا کر بولی ”یہ پکڑے کا ماسک اور گاؤن پہن کر

میرے ساتھ آؤ۔ مریض کی حالت ٹھیک نہیں۔“

خاں صاحب نے جاوید کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ اور کر بھی نہ سکتے تھے۔ میں گاؤن اور ماسک چڑھا
 لیکن تم بھاگ اندر پہنچی۔ صدیقہ قریب قریب بے سدھ تھی۔ پھر لیڈی مارٹن کی تنگ و دو سے گھٹنے کے بعد ٹویلیہ اس دنیا میں
 آئی۔ یہ بچی Under-weight تھی۔ مشکل سے چھ پاؤنڈ کی ہوگی۔ بچی کو نہلا دھلا کر باہر لائے تو لیڈی مارٹن نے مجھے
 اس کی کلائی دکھائی۔ یہاں چھوٹے چھوٹے سفید پلاسٹک کے متنوں کا ایک ہار سا اس کی کلائی میں پڑا تھا اور اس پر ٹویلیہ کا
 پھینک لیا جاوید لکھا تھا۔

مجھے ہنسی سونپتے ہوئے ڈاکٹر مارٹن نے کہا۔ ”دیکھو، ماں کے زندہ رہنے کی امید کم ہے۔ تم قسم کھاؤ کہ تم بچی پال لوگی؟“

”میں..... لیکن میرے اپنے دو بچے ہیں۔ میں کیسے؟“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ بچی تنہا ہی محسوس نہیں کرے۔ قسم کھاؤ اپنی ہولی بک کی کہ تم بچی کو دغا نہیں دوگی۔“

ہمیشہ کی طرح میں نے حامی بھری۔

عجیب بات ہے اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ وزن نہیں ڈالتا۔ میں تو اپنی کمزوری سے آگاہ نہیں تھی لیکن ٹویلیہ کی

خبر اللہ نے صدیقہ کو صحت دے دی۔ پھر جاوید نے صدیقہ کا بڑا ساتھ دیا اور دونوں نے دو ہاتھ بن کر ٹویلیہ کو پال نکالا۔

جب اشیر کچھ سال بعد اس دنیا میں آیا تو ٹویلیہ کے تجربے سے مجھے فائدہ ہوا اور ہم بروقت ہسپتال جا پہنچے۔ جب

صدری کے بعد مجھے کچھ دن ہسپتال میں رہنا پڑا تو میرے پاس آپی منیر آ کر رہتی تھیں۔ وہ نووس بجے من آباد سے بس

چلا تھیں۔ اپنا کھانا ساتھ لاتیں اور شام کو میری سیوا، دیکھ کر رکھ کرنے کے بعد گھر لوٹ جاتیں۔ اس غیرت مند خاتون نے

مجھ پر کوئی بوجھ نہیں ڈالا۔ یہ بھی میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے ایسے لوگوں سے سیکھنے کا موقع ملا۔

ماموں کی باتیں (ریزی کی باتیں)

اس تحریر کو لکھتے ہوئے آپ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ میرے ماموں اصل میں ایسے ہی انسان تھے۔ اس کتاب میں

جیسی کیسے ہوئے افراد من گھڑت اور مصنوعی ہیں اور میرا کسی پر کچھڑا چھالنا اور کسی کے دامن پر داغ دھبہ لگانے کی منشا نہیں۔

میں اس کہانی میں آپ کی تفریح کا سامان مہیا کروں گا لیکن آپ کی بد مزاجی کے پیش نظر بچوں اور بیویوں کی سینڈلوں سے

خبردارہ آپ کو میری یہ تحریر فرسودہ اور فضول لگے گی۔

میری التماس ہے کہ اس کا پہلا باب پڑھ لیجیے اور اگر ممکن ہو تو پورا پڑھ لیجیے۔ اس کتاب کو خریدنے کی ضرورت

نہیں کیونکہ اس وقت جو کاپی آپ کے ہاتھ میں ہے، وہ ہم نے ایڈیٹنگ کے لیے بنائی تھی لیکن ایک کلرک کی نااہلی کے باعث دوسری کتابوں میں اسے ملا دیا، جس کی وجہ سے یہ کتاب بک سٹال پر پہنچ گئی۔ دوسرے آپ کی ذہانت کو دیکھ کر مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ آپ نے اپنے قیمتی سرمائے میں سے اسے خرید لیا ہے جو درحقیقت Pre-editing کی کاپی ہے۔

صبح سویرے کا وقت تھا۔ بھلا دو پہر کا ذکر تو نہیں ہو رہا۔ میری گال پر کسی نے ہلکی سی چپت لگائی جس کی وجہ سے میں ڈرنے کے بجائے مایوسی کے عالم میں چلا گیا کیونکہ جب آنکھیں کھولیں، سامنے ماموں کا چہرہ نظر آیا۔ دل ہی دل میں خیال آیا کہ آج کا دن بھی مایوسی کی بھینٹ چڑھ گیا۔

ویسے تو ماموں کے ساتھ ہماری بے تکلفی اور دوستی بہت گہری تھی لیکن خواب میں امریکی صدر کے الیکشن جیتنے مرحلہ درپیش تھا، جہاں ذاتی سکیمنڈل اور Perjury جیسے واقعات شروع ہو جاتے ہیں۔ یقیناً آپ میری تحریر سے واقف چکے ہوں گے کہ جو میں سالہ دو شیزہ مایزکا لیسکی کے تعلق سے صرف دو تین سالوں کے فاصلے پر تھا اور بیکدم اٹھنے کے باعث ایک کالا کھیر انما بکرا جس کے چند داڑھی کے بالوں سے مشابہت ہو، مجھے نظر آیا۔ آنکھیں ملنے پر تصویر اور اس کا صاف ہوئی تو یہ ہمارے ماموں تھے۔

یہ بات ابھی تک میرے لیے معیوب اور معنی خیز ہے کہ ہمارے نانا سرخ و سفید چھ فٹے باہمت آدمی تھے جن کی شادی پنجاب کی ایسی دو شیزاؤں میں سے ایک سے ہوئی جن کا تعلق بٹ خاندان سے تھا مگر چاند گربن کے باعث ہمارے ماموں کی رنگت کچھ ایسی تھی کہ رات کو ہنستے وقت ان کو شمالاً جنوباً پہچانا صرف دانٹوں کے باعث ہوا کرتا۔

شاید ایسی صورت میں گھر والوں کی توجہ اپنے بیٹے پر کم تھی، جس کی بنا پر ماموں کی تعلیم و تربیت کچھ زیادہ مکمل نہ ہو پائی۔ آپ آٹھ کے پہاڑے سے زیادہ نہ جانتے تھے اور املا کو عملاً لکھا کرتے تھے۔ اس نفسیاتی کیفیت میں ماموں نے ذہن چست اور جملے کی ادائیگی میں تیز و طراز تھا۔ میرے مشاہدے میں ایسا کوئی وقت نہ آیا جب ماموں نے حاضر جوابی سے کام نہ لیا ہو۔ آپ کی شہرت اور مشہوری ہام عروج پر تھی۔ آپ کو معززین میں سے سمجھا جاتا تھا۔ خلیفہ داڑھی منڈوانے والے کو زبردستی اٹھا کر ماموں کی کرسی پیش کرتا۔ اس اٹھک بیٹھک میں نہ صرف دوکان ہی میں ہنگامہ پہنچا بلکہ کئی دفعہ متعدد آستروں کے دارخانے جانے کی بنا پر اور ماموں کی جان مشکل سے بچتی۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجیے کہ بازار میں سائیکل مسٹری، کلچر فزوش، پرچون والا اور دیگر دوکانداروں سے ماموں کا باضابطہ رویہ کیسا تھا۔

سب سے خوش آئند بات یہ تھی کہ چند مشکل اوقات بازار کا ادھار ماموں پر لگ بھگ پندرہ ہزار تھا لیکن ان کی کریڈٹ کی لائن کسی IMF کی محتاج نہ تھی۔ رہا Debt Servicing کا معاملہ تو صرف شخص Collateral کی بنا پر ایک Multiple Revolving Finance کا چکر تھا۔ کبھی تو گوشت والے سے پیسے لے کر سائیکل والے کو پکڑا دیئے اور سائیکل والے سے لے کر نانبائی کو دے دیئے جاتے لیکن اس سے اپنی کمیشن جھاڑنا نہ بھولتے۔ اس کریڈٹ کے چلتے پہلے سے سارا بازار خوش اور مطمئن تھا لیکن اس محاورے سے بازار ناواقف تھا کہ احمد کی پگڑی محمود کے سر اس خوش اسلوبی سے پہنائی جاتی ہے کہ احمد بھی دلفریب رہتا ہے اور محمود تو دلکش ہی ہوتا ہے کیونکہ پگڑی بار بار اُس کے سر پر آ جاتی ہے۔



479- این، سمن آباد

455-479 این سے 479- این، سمن آباد میں نقل مکانی کسی بڑی شہ گھڑی ہوئی، کیونکہ اس مکان میں منتقل ہوتے ہی سمن آبادی اور غربی سے کافی حد تک نجات مل گئی۔ زندگی میں خصوصی مشکلات جو درپیش رہتی ہیں ان میں غربی بے عقلی، سمرانی جھگڑنے، ساس نندوں سے اڑ پھس، بے روزگاری، اولاد کی آزمائش، بیماری، موت جیسی تکلیفیں کس وقت کیسے آتی ہیں، ان کا قیام کس قدر لمبا ہوتا ہے یہ انسانوں کی اپنی Genetics، ان کے فیصلے اور ان کے ماحول سے نبرد آزما ہونے کی قوت پر منحصر ہے۔ جو کچھ مجھے سمجھ آئی وہ یوں ہے۔

جب بھی کسی شخص کو غربی سے پالا پڑتا ہے اس کے چھوٹے چھوٹے راستے کسی نہ کسی طور پر بندگی میں جا پہنچتے ہیں۔ بالکل معمولی ضرورتیں، ادھوری خواہشیں، نا آسودہ احساس کتری کی فضا، خود اعتمادی اور بے مائیگی کی فضا ہر لحظہ قائم رہتی ہے۔ کچھ لوگ غربی سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے رشتہ داروں سے جڑے رہتے ہیں اور اپنے حالات کی فکر سوچ کی کو مانگے کی شفقتوں سے سینچتے رہتے ہیں۔ لیکن جو نئی حالات بہتر ہو جاتے ہیں، وہ رشتے تاپے جو ذاتی ضرورت کے تحت اہم تھے، غیر اہم ہونے لگتے ہیں جیسے کوئی ستارہ اپنے مدار سے نکل جائے اور واپس نہ لوٹ سکے۔

غربی میں بنائے گئے روابط ساری عمر فٹ نہیں آتے۔ یہ یا تو کھلے ہوتے ہیں یا بہت تنگ..... دراصل غربی میں صرف کام ہی ہتھیار بن سکتا ہے۔ غربی میں صبر عموماً مجبوری کا نام ہے۔ حسرتوں کے چوکھے میں اس عہد کی تصویر نگاہی ہو سکتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ غربی میں انسان اپنی اس کمزوری کے ہاتھوں مجبور رنجور اور منہ اٹھائے آسمان کو تکتا رہتا ہے کہ کب حالات بدلیں۔ کب وہ ڈیپ فریزر میں جے گوشت کی صورت باہر نکلے..... نہ بوباس نہ ذائقہ..... بس گوشت ہی گوشت۔ وہ بھی مجبوری میں صبر کی طرح ٹھنڈا اور جما ہوا ہوتا ہے۔

اس کے برعکس امیری کچھ کم امتحان نہیں۔ امیری عجب تیزاب کا مٹکا ہے۔ اس میں آسائشیں، زیبائشیں، اسراف، لاپرواہی، کام چوری بہت کچھ آدمی کو اپنے میں گھولنے لگتی ہے۔ وہ اس تیزاب کے مٹکے میں یوں حل ہونے لگتا ہے جیسے کب کا ڈھیلا ہو لے ہو لے پانی میں حل ہوتا رہے.....

یہ مجھے بہت بعد میں ان دونوں امتحانوں سے گزر کر پختگی کی عمر کو پہنچ کر سمجھ میں آیا کہ انسان کو دراصل ایک مسئلہ ہر وقت درپیش رہتا ہے اور وہ ہے روح کی آزادی۔ جو مسئلہ بھی روح کو جکڑے وہ انسان کے لیے ناقابل حل ہو جاتا ہے۔ یہاں آ کر آج کی پود اور پچھلی پود کے نظریہ حیات میں تصادم شروع ہو جاتا ہے۔ بوڑھائی پود کو ہر وقت بولتا رہتا ہے یا پھر اپنے عہد کی عافیت کا نقشہ کھینچتا رہتا ہے۔ یہ بولنا نصیحت کرنا بالکل بے کار رہتا ہے کیونکہ جسم کے آزاد ہونے کے خواب دیکھتی ہے اور بوڑھے کو روح کی آزادی درکار ہوتی ہے۔ بوڑھے بھی غلط اور نوجوان بھی سرفہرے۔

اب نوجوان اپنی سوچ کو اس قدر سیکولر بنا چکے ہیں کہ وہ اب سمجھنے لگے ہیں کہ مذہب کا انسان کی زندگی کا رکاوٹ کے علاوہ اور کوئی کام نہیں۔ جو مذہب سے پیار کرتا ہے وہ ساری عمر کسی بڑھے کی طرح دروازے ہی بند کرتا رہتا ہے۔ کھڑکیوں میں چٹھنیاں اور گیٹ پرتالے ہی لگا تا رہتا ہے۔ وہ تازہ ہوا سے واقف نہیں ہوتا! نوجوان پود کو یہ معلوم نہیں کہ اگر واقعی روح کی آزادی مطلوب ہو تو مذہب کی کشتی درکار ہوتی ہے۔ یہ کشتی ہونیلی ہو چیلی ہو اس میں شک و گمان کے سوراخ نہیں ہونا چاہئیں۔ اگر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ کر کھلے آسمان سے رابطہ قائم ہے تو کسی ایک راستے کا انتخاب ضروری ہوگا۔ جو لوگ بار بار پگڈنڈی کشتی یا مسلک بدلتے رہتے ہیں ان کو روح کی آزادی ممکن نہیں رہتی..... اگر آپ کو روح کی آزادی چاہیے اور دنیاوی منفعت کے لیے جان کھپادیں تو بھی مذہب آپ سے مایوس کرتا رہے گا۔ اگر آپ ساری عمر دوسروں کی کشتیوں پر نمبر لگا کر رہیں کا تماشہ دیکھتے رہے تو آپ کو علم ہونا چاہیے کہ ساری جدوجہد اس کا کشتہ قربانیاں اوپر والا دیکھتا ہے اور بالآخر وہی آزادی کی نعمت بطور تلافی عطا کرنے والا ہے۔

آزادی انعام ہے..... حق نہیں.....
 آزادی منزل ہے..... راستہ نہیں.....
 آزادی سکون، طمانیت اور شکر کا مقام ہے..... متلاطم کیفیت کا نہیں.....

479- این میں ہمارے ہاں ریڈیو آرٹسٹ محمد حسین باقاعدگی سے آیا کرتے تھے۔ آپ محمد حسین کے ہم سفر بنوئی واقف ہوں گے۔ یہی وہ آرٹسٹ ہیں جنہوں نے بڑی شہرت پائی۔ تراڑ کھیل میں جب ایک ٹرک میں رضائی لگا کر اندر مائیکروفون لگا کر خاں صاحب پروگرام ”ہم آگئے“ کیا کرتے تھے اس وقت بھائی محمد حسین ایک معاون صدر تھے۔ ان کے ساتھ دوسری آواز ایک آرٹسٹ تاج صاحب کی ہوا کرتی تھی جو بڑی بھاری کھرج میں بولا کرتے تھے۔ پروگرام کشمیر کی آزادی کے حوالے سے غالباً پہلا پروگرام تھا۔ ادھر بھارت سے پروگرام نشر ہوتا۔ ادھر ساتھ ساتھ بھارتی اشفاق صاحب اُس کا جواب لکھتے جاتے اور پھر دھڑلے کی آواز میں اشفاق صاحب لکارتے۔

”ہم آگئے.....!“

اس پروگرام کے ختم ہونے پر خاں صاحب لاہور آگئے۔ ریڈیو پر ان کی مصروفیات بڑھ گئیں۔ سچ پوچھو تو ڈائلاگ لکھنا بھائی محمد حسین نے خاں صاحب کو سکھایا، جن سے بعد میں یہ علم میں نے ایسے جذب کیا جیسے سیاہی پتھر

بھائی بھائی کرتا ہے۔

بھائی قدریر یڈیو پر Recordist تھے۔ وہ اپنے کام کے ماہر تھے اور بڑی خاموشی دینت داری سے پروگرام
بھی کرتے تھے۔ بعد ازاں جب تلقین شاہ جاری ہوا تو اس کی ریکارڈنگ بھی ان ہی کی ذمہ داری ٹھہری۔

بھائی محمد حسین، قدریر ملک اور میری والدہ جب کبھی وہ ملتان سے آتیں، مل کرتا ش کھیلا کرتے اور اس سے
گھر میں عجیب قسم کی رونق آ جاتی۔ گھر کا باسیوں سے عجیب رشتہ ہوتا ہے۔ کھلے کھیتوں میں رہنے والا، کشادہ گھروں
میں پانے والے بازاروں سے ملحق گھروں میں ہر لحظہ شور کے عادی، گلیوں کے باسی، سکولوں کی ہمسائیگی میں رہنے
والے، ان کے شہزادے شہزادیاں غرضیکہ تمام لوگوں پر ان کے ضمنی اور زمینی ماحول کا ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ ساری عمر اسے
بھیٹتی طرح خود سمجھ سکتے ہیں نہ کسی کو سمجھا ہی سکتے ہیں۔ لیکن رگوں میں دوڑنے پھرنے کی طرح یہ ماحول ہم میں رواں
میں رہتا ہے۔

479۔ این ہمارے پہلے گھر یعنی 455۔ این سے کشادہ اور مقابلاً بڑا خوبصورت تھا۔ اس کی دائیں سڑک اس
کے گے سے ٹیوب ویل کے پاس سے ہو کر گزرتی تھی۔ یہی سڑک دوسری جانب یعنی مین بازار سے ہو کر گولائی اختیار
کرتی۔ یہ سڑک بھی بائیں جانب کو مڑ جاتی۔ عین ان دونوں سڑکوں کے سنگم پر 479۔ این واقع تھا۔ اس گھر کے عین
مٹنے کی ایک بہت بڑی گراؤ نڈھی جسے سب ڈونگی گراؤ نڈھی کہتے تھے جس میں بارش میں سستانے اور دھوپ سے
پتھر کے لیے ایک بارہ دری تھی جسے میرے بیٹے باندرادری کہا کرتے تھے۔

ہمارا کوٹھی نما گھر عین سڑک پر واقع تھا۔ ہمارے گھر سے آگے دائیں ہاتھ چمیل صاحب رہتے تھے جو کازپوں کی
کھوپ چلاتے تھے۔ پھر یہ سڑک سیدھی چودھری کالونی کی طرف جا نکلتی تھی، جہاں میرے بھائی نے شادی کے بعد
گھر پر گھر لیا تھا۔

گھر کے آگے ایک معمولی سا گیت تھا، جس کی گلی سیدھی صحن کی طرف جاتی۔ اندر کشادہ صحن میں بائیں ہاتھ
یہ چھوٹا سا غسان خانہ اور متصل ٹائل تھا۔ جب نظامی صاحب ریڈیو سٹیشن سے ریٹائر ہو گئے تو انہوں نے ہمیں بہت سے
پتھر کے گیلے تھے بیچے جن سے پچھلا صحن اور سامنے والا برآمدہ آراستہ کر لیا گیا۔

پھانک کے سامنے تقریباً پانچ فٹ اونچی دیوار تھی۔ آسانی سے اندر جھانکنا ممکن نہ تھا۔ ہمیں پر برآمدہ تھا۔ جب
مستحق کو رسالہ بند ہو گیا تو ہماری پرنٹنگ مشین جسے محمد علی چلایا کرتا تھا، اسی برآمدے میں لاکر دھردی گئی۔ برآمدے
میں دو دروازے کھلتے تھے۔ ایک تو ناورد نما گولائی لیے کمرہ تھا جسے ہم نے ڈرائنگ روم بنالیا اور جس میں نانا کی تاش پارٹی
کھیلتی تھی۔

جالی کا دوسرا دروازہ ہمارے نانا کے بیڈ روم میں کھلتا تھا۔ اس کے آتش دان کے اوپر فون دھرا تھا جو ہماری نئی نئی
کھیت تھا۔ جب کبھی مہمان آتے تو اس کمرے میں بیٹھنے کا اتفاق ہوتا، میرے دونوں بچے بڑے آرام سے اس آتش دان
کے نیچے بیٹھ کر باتیں سنتے رہتے۔ نعیم طاہر ان دنوں سائیکل پر ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ ابھی تک انہیں ان بچوں کا
آتش دان میں بیٹھنا نہیں بھولا۔

اس کمرے سے ایک ہی دروازہ ایک اور کمرے میں کھلتا تھا جسے ہم نے کھانے کا کمرہ بنا رکھا تھا۔ خوبصورت میز اور کرسیاں تھیں۔ یہ میز کرسیاں اس لیے خوبصورت تھیں کہ انہیں ٹیک وڈ سے بنوایا تھا، آسٹریلیا کے پہلے وہ یہ میز اور سائیڈ بورڈ ہمیں دے گئے۔ ایک خوبصورت سائیڈ بورڈ کے علاوہ یہاں اور کسی فرنیچر کی گنجائش نہ تھی۔ اس کمرے میں بائیں ہاتھ کی دیوار میں ایک بڑی پُراسرار الماری تھی جس کے دونوں تختوں پر کوئی پائنت یہ الماری خاص الخاص خاں صاحب کی کھل جاسم سم تھی۔ اس میں سب سے اوپر والے تختے میں خاں صاحب کی ریزگاری چھپا کر رکھتے تھے۔ ضروری خط اور رسیدیں، چیک بک اور یادداشتیں بھی یہاں ہی ہوتیں۔ میں نے الماری کو کھول کر نہیں دیکھا، لیکن جب واصف اور سارہ (اسحاق بھائی کے بچے) ہمارے پاس آئے تو پھر یہ آئس کریم گول گپے چنے بتاشے والے خواجہ فروشوں سے خریدنے کے لیے یہاں ہاتھ صاف کر لیا کرتے تھے۔ نہیں تھی میرے سامنے یہ کام ہوتا تھا۔ میں جانتی تھی کہ وہ ضرورت بھر ریزگاری لیں گے اور امیر ہو جانے کے بعد ان کی ان خواہشوں کا احترام کچھ ایسا برا بھی نہ لگتا تھا۔

اس کمرے سے پھر ایک چھوٹا سا برآمدہ تھا جو صحن سے ملحق تھا۔ اس برآمدے کے آخر میں ایک غسل خانہ ہماری ضرورت کے لیے بہت بڑا تھا۔ کھانے والے کمرے سے ایک دروازہ عین الماری کے سامنے بیڈروم میں کھلتا تھا۔ اس بیڈروم کی ایک لمبی کھڑکی گلی میں کھلتی تھی اور پچھلی جانب ایک دروازہ کھل کر ایک گپت قسم کے غسل خانے میں کھلتا تھا۔ یہاں سے اوپر گولائی میں سیزھیوں اور پچھت کی طرف چڑھتی تھیں، جب ہم یہاں شفقت ہوئے تو رضائیوں والے ٹرنک کے لیے ان ہی سیزھیوں پر پچھت پر پہنچنے سے پہلے جگہ بنائی گئی۔ سردیوں میں نانا یا سلطان ملازم اور پچھت پر پچھت سینے کے لیے چلے جاتے۔ ڈوگنی گراؤنڈ کا ایک مالی میرے لیے پھولوں کے گلدستے کبھی کبھار لایا کرتا تھا اور اسی مالی نے قریباً اکیلے ہی یہ پٹی اوپر چڑھائی تھی۔

پچھلے صحن والے غسل خانے میں ایک گولائی میں سیزھیوں اور نیم چھتی کو چڑھتی تھیں۔ اوپر دو کمرے تھے۔ میں خاں صاحب کی لاہوریری تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اشفاق صاحب کی کتابیں ان کی زندگی میں بڑا اہم رول ادا کرتی رہیں۔ جب وہ 1۵- مزنگ روڈ میں تھے تو کتابیں ان کے اوپر والے کمرے میں رہتی تھیں۔ وہ بوریا بسترا تھا جب وہ 455- این میں مقیم ہوئے تو ان کتابوں کو الماریاں ملیں اور یہ کچھ ڈرائنگ روم کی ڈینٹ بن گئیں اور کچھ بیڈروم الماریوں میں سجادی گئیں۔

جب ہم 479- این میں آگے تو ایک بار پھر ان کتابوں کو اچھا بیسرن مل سکا۔ دو تین الماریاں تو پہلے کمرے میں لگ گئیں لیکن باقی نیم چھتی کے دوسرے کمرے میں تہہ در تہہ لگا کر رکھ دی گئیں۔

اس نیم چھتی میں ہمارا پہلا رہائشی مہمان عکسی مفتی آیا! عکسی مفتی لاہور میں ایم اے سائیکالوجی کرنے آیا تھا۔ وہ کسی قسم کے آراستہ کمرے کا خواہش مند نہ تھا۔ مفتی اور عکسی مفتی میں خوشبو سونگھنے کی قوت ہے۔ وہ انسان کی نیت تک اسی خوبی کی وجہ سے پہنچ جاتے ہیں۔ صحن سے عین سامنے برآمدے سے ملحق ہمارا باورچی خانہ تھا۔ چھوٹا سا اور اس کے ساتھ ایک الماری تھی۔

کھلنے والی ایک جالی دار کھڑکی جس میں دودھ وغیرہ ابال کر بڑے اہتمام سے رکھا جاتا۔ بعد میں جب ہم کمرے کے توہارے پاس تیل کا چولہا بھی آ گیا۔ لیکن ابھی لکڑیوں کی آگ جلا کر میں روٹیاں پکاتی سیکتی اور جب روٹی پک کر پہنچتی تو مجھے ایسی خوشی ہوتی جیسے اب افسانہ ختم کر کے ہوتی ہے۔

اس چولہے سے کوئی ایک فٹ دور ایک چھوٹی سی میز بھی تھی جس کے آگے تین چار ڈگڈگی نما چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ان موندھوں پر عکسی مفتی ہمارے ساتھ بیٹھ کر سادہ سادہ کھانے کھاتا اور بے تحاشا تعریف کرتا۔

عکسی مفتی نے آتے ہی اشیر بیٹے کو اپنی جاگیر بنا لیا۔ وہ اسے نہ اشیر پکارتا نہ شیری۔ اس نے اپنا ہی نام اختراع کیا تھا۔ کھانے کے کمرے کے آخری دروازے پر کھڑا ہو کر وہ پکارتا۔ ”شیری..... شیری..... شیری.....“

اشیر خاں نے ابھی مشکل سے چلنا سیکھا تھا لیکن اپنے گوڈ فادر کی آواز سن کر جہاں بھی ہوتا بھاگ نکلتا اور اپنا ہی نام ”شیری..... شیری.....“ پکارتا رہتا۔ عکسی اسے ایک دلآویز مسکراہٹ کے ساتھ اٹھا لیتا اور اپنی نیم چھتی میں لے جاتا۔ مجھے کمرے کے رونے کی آواز کبھی اوپر والے کمروں سے نہ آتی۔ جب کبھی عکسی گھر نہ بھی ہوتا تو کبھی کبھی شیری اسے تلاش کرنے کے لیے کمرے میں آ کر پورا کھانا اور پھر اسے سلطان اٹھا کر نیچے لاتا۔

سلطان اور رحمت دو بہن بھائی تھے جو کہیں سے ہمارے گھر آ گئے تھے۔ رحمت جو ہمیشہ تمام بارہ سال کی ہوگی، وہ غیر بد صورتی تھی اور باورچی خانے میں میرا ہاتھ بٹاتی تھی۔ بچپن میں اسے شاید پولیو ہوا ہوگا، کیونکہ اس کی ایک ٹانگہ تھیں۔ رحمت تو دو ایک سال بعد کام چھوڑ گئی لیکن سلطان نے اشیر خاں کے ساتھ وفاداری کا ثبوت دیا۔ وہ اسے کھانا کھا کر بھائیوں کے ساتھ ڈوگی گراؤنڈ میں لے جاتا۔

عکسی مفتی شروع سے زندگی کے اصل معنی تلاش کرنے میں لگن تھا۔ ابھی اس کی یہ خواہش ناپختہ تھی اور وہ گھر کے پانیوں میں ٹانگہ نوٹیاں مار رہا تھا۔ اس تلاش کی ایک مبہم سی شکل اس کے دوست تھے جن میں صادق ایک اہم شخصیت تھی۔ وہ اپنے تین دوستوں کو لے کر کالج سے آتا۔ برآمدے سے ملحق ڈرائنگ روم میں ایک گول میز رکھی ہوتی۔ اس پر شیشے کا گلاس رکھا جاتا۔ چاروں دوست پوری توجہ حیرت اور مجسم سوال بن کر گلاس پر انگلیاں رکھتے۔

عکسی کہتا:

Any soul passing by kindly enter the glass move it.

حیرانی کی بات ہے۔ دو تین مرتبہ جب عکسی یہ التجا کر چکنا تو گلاس لرزنے لگتا اور چلنے لگتا۔ اب سوالات کیے جاتے تو عکسی ہر سوال کے بعد پوچھتا: ”اگر اس سوال کا جواب ہاں میں ہے تو گلاس میں آئی روح آپ ہاں تک چلی جائے اور اگر آپ کا جواب انکار میں ہے تو نوپر چلی جائیں.....“

گلاس کھٹا کھٹ پھٹا چھٹ جواب دینے لگتا۔ روح سے دنیاوی و دینی روحانی کئی قسم کے سوال پے در پے پوچھے جاتے۔ خاں صاحب اور مجھے کبھی اس مشغلے میں شامل ہونے کا موقع نہ ملا۔ لیکن ہمیں معلوم تھا کہ عکسی دوستوں کی سنگت میں رہتا ہے اور اس کے اس مشغلے سے ہماری زندگی میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، اس لیے ہم خارج نہ ہوئے۔

بہت بعد کی بات ہے کہ ان دوستوں میں سے صادق اسلام آباد میں کمیونسٹ تحریک میں مورڈ الزام ٹھہرا۔

مارشل لا کا زمانہ تھا۔ تحقیق کم اور گرفت زیادہ تھی۔ صادق کو گرفتار کر لیا گیا۔ پھر بہت بعد میں صادق کو لاہور کی جیل میں دیا گیا۔ یہاں سے اس کے خط میرے نام آیا کرتے تھے۔ پھر یکدم ایک دن خبر ملی کہ صادق کو کسی قیدی سے کر دیا..... کچھ لوگوں کو قید میں بھی راستہ مل جایا کرتا تھا۔ غالباً راستے کی تلاش کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر ایک اور شخصیت کا ذکر بھی کر دوں اور وہ کیپٹن یوسف ہیں۔ ان کا ذکر شہاب صاحب کیا کرتے تھے۔ کیپٹن یوسف سے ایک دو مرتبہ میں اسلام آباد میں ملی تھی۔ انہوں نے ایک مرتبہ شہاب صاحب سے کہا..... ”آج سے آپ میرے ابو ہیں۔“

شہاب صاحب نے بڑی شائستگی سے انکار میں سر ہلایا اور بولے: ”سوری یوسف! میں صرف ثاقب کا ابو ہوں۔ آپ کا یہ اعزاز قبول نہیں کر سکتا.....؟“

کیپٹن یوسف کو اس کے بعد مذہب کا جنون ہو گیا۔ وہ منبر پر چڑھ کر مائیکروفون کا سہارا لے کر تقریریں کرنے لگے۔ کچھ لوگوں کے اعتقادات مجروح ہو گئے۔ یہ لوگ بھی باؤ لے تھے لیکن سیاسی اعتبار سے طاقت ور بھی تھے۔ انہوں نے یوسف سے بدلہ لیا اور اسے ہتھکڑی لگا کر جیل میں ڈال دیا۔ جب تک خاں صاحب سلامت رہے ان کا یوسف سے تعلق تھا یا نہیں تھا مجھے اس کی خبر نہیں..... لیکن ان کے جانے کے بعد مجھے یوسف کے خط آنے لگے۔ ان خطوں میں پچھتے پچھتے بھی تھے یا اس کی جھلکیاں بھی تھیں اور اندھیرے سے روشنی کی طرف آنے کی خواہش بھی تھی..... پتہ نہیں یہ یوسف کی کتنی کے نتیجے میں ہوا کہ قدرت کو اس کی رہائی مقصود تھی..... ایک روز یوسف کو ساتھی قیدی نے قتل کر دیا! یوں صادق اور یوسف نے جیل سے رہائی پائی۔

میں نے بھی ممتاز مفتی کی طرح سچ بولنے کا دعویٰ نہیں کیا۔ مفتی جی اور میں عموماً گھنٹوں اس بات پر بحث کرتے تھے۔ وہ سچ کے داعی تھے۔ مجھے دل رکھنے کی بیماری تھی۔ عام قاری کے لیے سچ بڑی پُر لطف چیز ہے۔ وہ ایسی کہانی کہتے پسند کرتے ہیں جس میں لکھاری اپنے گندے کپڑے آپ کے سامنے دھوئے۔ جب ”علی پور کا ایلی“ مسودے کی شکل میں ہمارے پاس آیا اور ”داستان گو“ کو اسے چھاپنے کا اعزاز ملا تو مفتی جی سے میرا ایک ہی جھگڑا تھا۔

میں کہتی..... مفتی جی! اگر آپ شہزاد کے کردار کو سچ کی صورت بنا کر پیش کرنا چاہتے ہیں تو کیا یہ پورا سچ آپ کی بہادری بچوں کی بزدلی کا باعث نہیں بن جائے گی۔ آپ عکسی کے لیے اپنی بیٹیوں کے لیے کئی Complexes و راحت میں چھوڑ جائیں گے۔ میرا خیال ہے کوئی شخص بھی پورا سچ بولنے پر قادر نہیں کیونکہ ہر انسان کا علم الا قلبی ہے۔ کوئی شخص دوسرے کے متعلق تو کیا خود اپنے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔

میں سوچ بچار کے بعد اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ چونکہ ہمارے اندر گند اور صاف لہوا اکٹھا رواں دواں ہے اور اس کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ یہ دونوں لہو قلب میں مل نہیں پاتے۔ سنا ہے ایسے ہی جنت میں دو دریا جاری ہیں جو ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ بہتے ہیں۔ پران میں ایک قدرتی آڑ ہے۔ گویا اس دوئی یا تضاد نے انسان کی ساری زندگی کو لے الجھاؤ کے حوالے کر دیا ہے۔ وہ مکمل طور پر فرشتہ بن جائے یہ ممکن نہیں، مجسم ایلیس بن کر اترائے اور تکبر کی صورت زندگی سے کرے یہ بھی یقینی نہیں۔ اللہ نے اسے آزاد چھوڑ رکھا ہے۔ اگر ہدایت کا رخواستگار ہوا تو بدی کا سفر نیکی میں منتقل ہو جائے

سحر سے چھٹکارا حاصل نہ کرنا چاہے تو بھی فیصلہ اس کا صرف اپنا ہے۔ نجبی طاقت اسے تبدیلی پر آمادہ تو ہے لیکن تھانیداری نہیں کر سکتی۔

میں ایک بار پھر عرض کرنا چاہوں گی کہ میری کتاب سچ کی دعوے دار نہیں۔ میں نے سائنسی طریقہ کار کی طرح Premises طریقہ استعمال نہیں کیا۔ تخلیقی عمل کا تعلق ذہن سے کم اور قلب سے زیادہ ہے۔ یہاں تخیل، احساسات، 'Premonitions' پیش گوئیاں، تحت الواقعہ معنی، ذومعنی، ابہام پسند Interpretations اہم ہیں۔ یہاں معجزاتی طاقت صرف یقین محکم کا حصہ ہوا کرتے ہیں بلکہ ان کا انتظار لازمی اور زیادہ قرین قیاس ہوتا ہے۔

اسی لیے جو کچھ میں خاں صاحب کے بارے میں بیان کروں گی کسی سلسلہ وار یا تاریخ وار ہسٹری کی ضامن نہیں ہے۔ میرے پاس جو مائیکروسکوپ ہے اس میں سے ذرات اسی طرح دیکھے جاسکتے ہیں۔

جب میں نے بہت بعد میں 121- سی میں "مرد ابریشم" لکھی تو ممتاز مفتی اور میرے درمیان ایک محاذ قائم ہو گیا۔ آپ کا پہلا نسخہ مفتی جی کو بھیجا جس کے جواب میں فون پر بات ہوئی۔ مفتی جی بولے: "کاکی! تو نے بڑی سچ کتاب لکھنے کے بارے میں لکھی؟"

"کیوں مفتی جی کیا کیا میں نے؟"

"میں لاہور آ رہا ہوں۔ آ کر بتاؤں گا؟ یاد رکھ ایسی من من کن کن سے نہ لکھنے والے کا کچھ فائدہ ہوتا ہے نہ اس سحر سے جس کے بارے میں بات کی جاتی ہے۔"

مفتی جی کے آنے تک میں نے بڑے تذبذب میں دن گزارے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں نے کہاں غلطی کی تھی آئے بڑی محبت سے بسرام کیا۔ جب خاں صاحب روانہ ہو گئے تو ہم دونوں محاذ آرائی میں مشغول ہو گئے۔

"اوئے کاکی! تو بڑی لکھاری ہے لیکن اتنی جھوٹی ہے مجھے معلوم نہیں تھا۔"

"میں نے کیا جھوٹ لکھا مفتی جی؟"

"تو ہم سب سے زیادہ شہاب کو جانتی ہے..... وہ تیرے گھر میں آتا جاتا رہا، تو نے اسے بہت قریب سے دیکھا ہے۔"

"پھر؟"

"تو جانتی ہے کہ اس کا روحانی دنیا میں کیا درجہ تھا۔ وہ قطب تھا، ابدال تھا، ولی تھا۔ تجھے اچھی طرح سے معلوم ہے۔ پھر تو نے ساری کتاب میں کہیں ایک جگہ اپنے آپ کو Commit نہیں کیا۔ کیا یہ بددیانتی نہیں ہے، قلمی بددیانتی؟"

"مفتی جی! میں شہاب صاحب کی اس جہت کو نہیں جانتی جس کا آپ ذکر کر رہے ہیں۔"

"نہیں نہیں بیٹے۔ تو نہیں جانتی تو کوئی بھی نہیں جانتا۔ صرف تجھے بھی ایک بیماری ہو گئی۔ اپنے شوہر پر وقار High and mighty کی طرح تجھے بھی وہم ہو گیا ہے کہ تجھ سے بڑا کوئی نہیں۔"

میں ہکا بکا رہ گئی۔ میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا لیکن مجھے معلوم تھا کہ جس وقت مفتی جی کی باز چڑھی ہو وہ کسی کی نہیں سنتے۔

”بول بول..... بول..... جانتی ہے نا کہ جھوٹی کتاب لکھی ہے اس لیے چپ ہے۔ سچا آدمی اپنے آپ کو بولنے نہیں کرتا..... سچا آدمی بولتا ہے اور گج وچ کے بولتا ہے۔“

”مفتی جی! آپ مائیں گے نہیں۔ لیکن میں نے شہاب بھائی کو قرائن سے سمجھا۔ وہ جب جب بھی میرے ٹھہرے ہمیشہ خاں صاحب کے ساتھ دفتر چلے گئے اور واپسی پر اپنے کمرے میں مقید ہو گئے۔ اگر کبھی گھر پر ہوں تو بچوں کی سنگت میں ملے۔ سب سے زیادہ انہوں نے اشیر کے ساتھ وقت گزارا۔ وہ حالات میں نے قلم بند کر دیا۔ سارے۔“

”بالکل ٹھیک..... اب سچی بات منہ پر آئی۔ تو نے شہاب کا نام لے کر اپنی فیملی کو Build کرنے کا حکم اپنے ناخن کاٹنے والے شوہر کو ان کا خلیفہ بنا دیا۔ اشیر ڈرائیور کو نہ جانے کیوں یوں ظاہر کیا، گویا وہی ایک لاہور میں پوسان حال تھا..... شہاب بیچارے کا کچھ ذکر نہیں..... ساری شاعرانہ تعلیٰ ہے، شیخی ہے شیخی۔ یہ کتاب تو نے اپنے آپ کو Build کرنے اور اپنے گھر والوں کی ہوا باندھنے کے لیے لکھی ہے۔“

سچی بات ہے مفتی جی جیسے خاکے کسی نے اردو ادب میں نہیں لکھے۔ شہاب صاحب کہا کرتے تھے کہ جنت کے محذوب ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ان کا بھی وصف انہیں دنیائے ادب میں بھی معرکے کا مقام دلا گیا لیکن انہیں کروں آری کی طرح چلنے والا تیر کی مانند کھب جانے والا تین اور تیرہ کے درمیان کو تو ال کی طرح الف کھڑا سچ مجھ سے نہیں جاتا۔ مجھے موم بتی کی روشنی میں کھڑکی میں سے در آنے والی چاندنی، نارچ سے چاہیاں تلاش کر کے تالا کھول کرے کا منظر دیکھنا پسند ہے۔

جب سکی ہمارے پاس تھا تو مفتی جی اسلام آباد سے ہمیں ملنے آیا کرتے تھے۔ میں نے انہیں کبھی سکی خصوصی محبت کرتے نہیں دیکھا، وہ خاں صاحب اور مجھ میں مشغول رہتے۔ ہر مرتبہ جب وہ آتے تو ان کے ساتھ ہمیشہ تازہ بھوئی ہوئی مونگ پھلیاں ہوتیں۔ ان میں کبھی ایک دانہ بھی کبھی ممتاز مفتی نے منہ لگایا نہ سکی نے کھایا۔ میں پوری اپنے بیڈروم میں محفوظ کر لیتی اور پھر خاں صاحب ان کے دوست اور میں اس سے لطف اندوز ہوتے رہتے۔

مفتی جی کا سیرابھی اور پر نیم چھتی میں ہوا کرتا تھا اور مفتی جی چونکہ مفتی جی تھے اور محبت کرنے والی روح تھے، محبت کرنا ناگزیر ہے۔ یہ دونوں بچے مفتی جی کے پاس اور پر نیم چھتی میں گھس رہے، جہاں ممتاز مفتی اپنے کاغذوں کے کھلاڑ ”علی پور کا ایل“ لکھتے رہے۔ وقت پر نیچے آجاتے باورچی خانے میں اپنا مونڈھا لیتے، بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ گویا ہر سہ کی بھوک ہو۔ ہر نوالے پر داد دیئے چلے جاتے۔

مفتی جی اپنی جلو میں ہمارے لیے ایک تحفہ مرزا جی لے کر آئے۔ یہ وہی مرزا جی ہیں جن کا ذکر ”سفر در سفر“ میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ چھوٹے قد کے مرزا جی بڑے مزیدار آدمی تھے۔ ان کو سمجھنے کے لیے مزاح کی حس، قوتِ سارح آہستہ روی کی ضرورت تھی۔ وہ اپنے پرانے قصے بڑا لطف لے لے کے سناتے، خاص کر وہ واقعہ جب وہ بنگال میں انگریزوں کی فوج میں ٹھیکیدار تھے۔ باقی چھوٹی موٹی بے ایمانیاں تو ایک طرف، ایک مرتبہ انہوں نے بار بردار ہاتھیوں کی پوری کھیل

جی مرزا کو کھانا پکانے کا بھی بہت شوق تھا۔ مفتی جی اور عکسی تو صرف کھانا کھانے آتے تھے لیکن مرزا جی کبھی کبھی نئے نئے بھی بتاتے۔ رنگ برنگے مصالحات کا اضافہ بھی کرنے کو کہتے۔

”بانو اس میں تھوڑا سا زیرہ اور ادک بھی پیس کر ڈال دینا۔ پنے کی دال کا ذائقہ اچھا ہو جائے گا۔ ثابت مرچ کے ساتھ۔“

”تیرے پاس کلوچی ہے کلوچی..... اور اجوائن؟“

”ہاں جی..... دیکھ لیتی ہوں مرزا جی.....“

”دیکھ کیا لیتی ہے تجھے پتہ نہیں.....؟“ وہ قدرے ناخوش ہو کر کہتے۔

”جی کبھی ضرورت نہیں پڑی.....“

”اوائے اشفاق سارا دن بیٹھا رہتا ہے۔ میں اس کے لیے بڑی اعلیٰ معیار بنا دوں گا۔ چچی بھرنا شتے کے بعد کھلا

سوا وغیرہ سب خارج.....“

”اچھا جی.....“

”لا..... مجھے پیسے دے۔ میں فاروقی کی دکان سے سودا دیکھ کر لاتا ہوں.....“

جب میں انہیں پیسے پکڑاتی تو وہ کسمسا کر کہتے..... ”اوائے کڑیے! یہ تو تھوڑے سے ہیں۔ چلن اچھا میں گزارہ کر

”ہوؤ“ ان کا تکیہ کلام تھا۔ جو کچھ نہ ہو سکتا اس پر وہ ”ہوؤ“ کہہ کر خاموش ہو جاتے۔ جو کچھ سمجھ میں نہ آتا اس پر

”ہوؤ“ کہہ کر پردہ پوشی کر لیتے۔ جہاں سے محبت کی آرزو ہوتی اور محبت نہ مل پاتی تو وہ ”ہوؤ“ کہہ کر صبر کر لیتے۔

سب سے ان کا مجموعی فلسفہ حیات ”ہوؤ“ تھا۔ لیکن کبھی کبھی ہوؤ سے نکل کر وہ یکدم اکڑ بھی جاتے اور اپنی بات منوا کر رہتے۔

جب حجام آ جاتا تو مرزا جی چودھری بن جاتے۔

”اوائے چلو میں حجامتیں بناؤں گا تمہاری..... نوکی۔ کیسی چلو.....“

خاں صاحب کچھ ڈرتے ڈرتے کہتے ”ناں یار تو سچیل نہ کر..... میں کروا لیتا ہوں۔“

”تو پڑھ بیٹھ کر پڑھا کو..... حجامت میں کراؤں گا۔ مجھے معلوم ہے خلیفے کتنے ظالم بے حس ہوتے ہیں۔ کھڑا ہو کر

سے کراؤں گا.....“

بچے جو حجامت کے نام پر بدکتے تھے پتہ نہیں کیوں مرزا جی کی معیت میں بال کنوا نے کو کھیل تماشا سمجھتے۔

”کوئی نیا تولیہ لاکا کی..... یہ تو گندا ہے۔“

”دھل جائے گا مرزا جی..... بال ہی تو کنوا نے ہیں۔“

”اور گندا تولیہ ڈال دوں..... ان کے کندھوں پر؟“

”اب مجھے ایک مگ اور ڈیوئل لاکر دے۔“

میں سمجھتی تھی کہ ڈیول صرف وہاں استعمال کی جاتی ہے جہاں کسی زخم میں پیپ پڑ جانے کا اندیشہ ہو۔
 ”ڈیول کیا کرنی ہے مرزاجی؟“

”کیا کرنی ہے.....؟ ہے نا جھلی۔ میں خلیفے کا استرا، قینچی، سارے اوزار ڈیول میں بھگو کر خود صاف کرنے پیتے نہیں کن کم بخنوں کی حجامتیں بناتا آیا ہے۔ ایس بچے بیمار کرنے ہیں۔“
 اس کے بعد وہ بڑے اہتمام سے تولیہ، ڈیول، گک مع چوگان لے کر باہر والے برآمدے کے سامنے دو دنوں بچوں کو باری بار کرسی پر کھڑا کر کے کسی پولیس آپریشن کی طرح حجامت کرواتے۔ اس کے بعد سارے بال سے جمع کرواتے اور میرے پاس لے کر آتے۔ ”مٹنی! ان بالوں کو ایک تھیلی میں ڈال دے۔ میں خود جا کر نہر میں پھینک گا۔ تھیلی نہ ہو تو کوئی خاکی لفافہ لا دے۔“

”آپ فکر نہ کریں میں احتیاط سے کوزے میں پھینک دوں گی۔“

”ہے نا پاگل اوئے بالوں پر تو ٹونے ہوتے ہیں۔ لوگ تو ٹوہ میں رہتے ہیں۔“

غرضیکہ ایک حجامت یوں کروائی جاتی ہے جیسے کوئی بڑا پراجیکٹ ہو.....

مرزاجی کو ہم دونوں سے بڑی محبت تھی لیکن اس کا اظہار انہوں نے کبھی بر ملا نہ کیا۔

کبھی کبھی جب ہم سب صحن میں بیٹھے مفتی جی والی مونگ پھلیاں کھا رہے ہوتے تو مرزاجی کہتے.....
 بیوی کھری ہے کھری..... تو اس کی قدر کیا کر اشفاق۔“

”کھری سے آپ کی کیا مراد ہے مرزاجی؟“

”یار میں نے بڑی عورتیں بندائی ہیں۔ میں عورت کو اس کی آنکھ سے پہچانتا ہوں۔ تیری بیوی کی آنکھ میں

مرد کے لیے لاجھ نہیں۔ یہ کھری عورت کی نشانی ہے۔ اس کی آنکھ میلی نہیں ہوتی۔ بڑا خوش نصیب ہے تو اشفاق تجھے

ہا سے بہانے میں یہ مرد کو کیسے روغلا سیتی ہیں۔ ایک آنکھ کے اشارے سے بیچارا مرد الٹ بازی کھا جاتا ہے.....“

مفتی جی چلے گئے۔

مرزاجی اگلے جہان سدھارے۔

مفتی جی اپنا نعم البدل عکسی کی صورت میں چھوڑ گئے۔

لیکن مرزاجی بھی اپنی نشانی چھوڑنے میں پیچھے نہیں رہے۔

مرزاجی اپنا بھانجا ڈاکٹر عاطف مرزا ہماری خدمت کے لیے دے گئے۔

جب خاں صاحب 2002ء میں بیمار رہنے لگے اور انہیں باقاعدہ ڈاکٹروں کی حاجت رہنے لگی تو ڈاکٹر

نے سر نکالا۔ ہائی نون لیبارٹریز میں ڈاکٹر صاحب غالباً کوالٹی کنٹرول کے چیف تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف مرزاجی

حوالے سے کروایا۔ پھر باقاعدگی سے خاں صاحب کو دیکھنے آتے رہتے۔ انہیں اصرار ہوتا کہ اپنا بریف کس

سینٹھو سکوپ وہ خود اٹھائیں گے۔

خاں صاحب کے چلے جانے کے بعد انہوں نے اپنی ذمہ داری کو اور شدت سے محسوس کیا اور مجھے بھی

تھے۔ بلڈ پریشر چیک کرنے کے بعد عموماً ان کے چہرے پر ہلکی سی ناگواری اور تشویش ابھر آتی.... کبھی کبھی محالاً تھے، کبھی نسخے لکھ کر دے جاتے۔ ان کی شکل پر تشویش دیکھ کر بات ٹالنے کی غرض سے میں نے کہا: ”ڈاکٹر عاطف! آپ کی وائف بھی تو ڈاکٹر ہیں۔ وہ آج کل کیا کرتی ہیں؟“

”وہ جی آج کل قرآن پڑھاتی ہیں۔ الدعوة سے انہوں نے فرحت ہاشمی صاحب کا کورس کر لیا ہے۔“
 ”یعنی ڈاکٹر ہی چھوڑ دی۔“

”اندرون شہر نوکری ملی تھی.... جاتی تھیں لیکن بہت دور جانا پڑتا تھا۔ بس، چھوڑ دیا۔“

عاطف مرزا کا گھرانہ مذہب کی طرف مائل ہے اور میں ایک نتیجے پر پہنچی ہوں کہ وہ داستان سرائے میں ایک حد تک کی بنا پر کھنچے چلے آتے ہیں۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ ہم دوسرے لوگوں کے متعلق جو رائے قائم کرتے ہیں، وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہوتی۔ ہمارا علم ہر مقام پر الٹا قلیلا کا شکار ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر عاطف بھی خاں صاحب کی بات سے یہ قیادہ لگا چکے تھے کہ شاید ہمارے گھرانے کو مذہب کی شیفتگی اور عمل ویسے ہی نصیب ہو گیا ہے جیسے عاطف کی گھر جی کو میسر ہے۔ ڈاکٹر غریب کو معلوم نہیں کہ ہم تو سرائے رساں، شیخی خورے ہیں، جنہیں تلاش تو رہتی ہے لیکن بہت کم کچھ بھی نتیجے پر پہنچتے ہیں۔

لیکن اس گھر میں ہم تک جمیلہ ہاشمی کیسے پہنچیں، یہ بھی ایک دلچسپ داستان ہے۔

جمیلہ ہاشمی تب اتنی بڑی ادیبہ نہ تھی۔ اس کی تخلیقی روح بڑی جاندار تھی لیکن ابھی ادب کا راستہ متعین نہ ہوا تھا۔ مجھے کیسے خبر ہوئی یا جمیلہ نے مجھے فون کیا یا پھر کسی طور پر مجھے پتہ چلا کہ جمیلہ بہت بیمار ہے اور وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔

ان دنوں ساڑھ ہاشمی سمن آباد میں رہتی تھی۔ مین بازار کی سڑک جہاں گول دائرے پر منتج ہوتی ہے اس سے کچھ دیر کے ساڑھ کا گھر تھا۔ جو نہی مجھے جمیلہ کا پیام ملا، میں بھاگ بھاگ ساڑھ کے گھر پہنچی۔ جمیلہ بڑی دلبرداشتہ پریشان ایک حالت نما چار پائی پر عجب کسمپرسی کے عالم میں لیٹی تھی۔

”کیوں کیا ہوا؟“

”میں بہت بیمار ہوں قدسیہ۔“

”پھر چلو میں ڈاکٹر کو دکھا لاؤں....“ میں نے فوراً مشورہ دیا۔

”نہیں.... میں ڈاکٹر کو دکھا چکی ہوں۔ وہ میری بیماری کا علاج آپریشن بتاتے ہیں۔“

”تو کرا لوناں آپریشن۔ کیا ہرج ہے؟“

ہر احمق آدمی کی طرح میں نے بن مانگے مشورہ دیا۔

”اوائے نہیں بابا.... اگر آپریشن ہو گیا تو پھر میرے گھر بچے کیسے ہوگا.... میرے میاں گدی نشین ہیں۔ ان گنت

بچے ہیں۔ وہ کیا ہوں گی؟“

مجھے معلوم نہ تھا کہ جمیلہ سردار محمد صاحب گدی نشین کی اہلیہ ہے اور اتنی لمبی چوڑی زمینوں کی مالک ہے۔
 ”اچھا تو پھر کیا کریں..... علاج کے بغیر تو جمیلہ کام مشکل ہے۔“

جمیلہ کہنی کے بل ہو گئی اور پُر امید لہجے میں بولی..... ”میں نے سنا ہے کہ اشفاق کا کوئی ہو میو پیٹھک

واقف ہے۔ تم میرا علاج اس سے کروادو۔“

واقعی مین بازار میں فاروقی کی دکان کے پاس ایک ہو میو پیٹھک ڈاکٹر تھے۔ ہم بھی وقت بے وقت ان سے

علاج کرواتے رہتے تھے۔

”چلو ثرائی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ شام کو خاں صاحب آئیں تو تمہیں لے چلوں گی۔“

”نہیں بھی تم مجھے ابھی لے چلو..... اسی وقت۔ پھر موقع ملے نہ ملے۔“

میں کچھ حیران سی ہو گئی۔

”بھائی میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔ کیسے لے چلوں؟“

”دیکھو تم مجھے اپنے گھر لے چلو قدسیہ..... اس وقت ساڑھ گھر پر نہیں ہے۔ وہ آگئی تو پھر موقع نہیں ملے گا۔“

اسی وقت۔“

میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میری طبیعت میں عجلت بھی ہے اور نا سنجھی بھی۔ میں بغیر سوچے سمجھے فیصلہ کرتی

اور پھر فوراً اس پر عمل پیرا ہو جاتی ہوں۔ اس وقت کا فیصلہ بھی کسی دانشمندی پر مبنی نہ تھا۔ خاں صاحب عموماً مجھے کئی

سے پکارا کرتے تھے۔ ان میں ”ناؤلی..... لے بیج..... ہنجلی“ ان کے پسندیدہ تھے۔ ساڑھ کے شوہر وکیل اقبال گھر

تھے لیکن میں نے ان سے بھی مشورہ نہ کیا۔

میں نے فوراً چار مزدور بلائے۔ جمیلہ ہاشمی کے دو تین پیڑے سادہ سی استعمال کی چند اور چیزیں چار

ڈالیں، جمیلہ کو کھاٹ پر لٹا کر مزدوروں کو آرڈر دیا کہ مریضہ کو 479- این لے چلیں۔ میں چار پائی کے ساتھ ساتھ

مارچ کرتی چلی۔

گھر میں برآمدے کے سامنے والا کمرہ جو نانا کے لیے مختص تھا اس میں جمیلہ کو پلنگ پر ڈال دیا گیا۔ یہ

کشادہ، ہوادار اور ٹھنڈا تھا۔ قباحت صرف اتنی تھی کہ سڑک پر سے آنے والے ٹریفک کی آوازیں یہاں ذرا زیادہ

ہوتی تھیں۔

شام کو جب خاں صاحب یو ایس آئی ایس سے لوٹے تو میں نے انہیں نانا کے کمرے میں جانے سے

دیا۔ وہ صورت حال سے ناواقف تھے۔

”لیکن کیوں مجھے وہاں کچھ چیزیں رکھنا ہیں ذاتی۔“

”وہاں جمیلہ ہاشمی آئی ہوئی ہیں..... بیمار ہیں ان کا علاج کرانا ہے ہو میو پیٹھک....“

پھر میں نے کچھ خوف کے ساتھ کچھ شیخی کے طور پر رام کہانی سنائی۔ خاں صاحب نے لمبی سی سانس لی۔

کی نہ کسی قسم کی لعن طعن..... بس چپ ہو گئے۔

ہاں ایک اور بات ضرور ہوئی۔ بچوں کا لمبی ٹرین کا کھیل بھی بند ہو گیا کیونکہ اب انہیں بیمار کے کمرے میں

.....

ہمارے گھر میں نہایت سادہ کھانا پکتا تھا۔ پھل وغیرہ آتے ضرور تھے لیکن وہ بھی کبھی کبھار۔ اگر خاں صاحب کو

بچوں کا موقع مل جاتا تو پھر پھل میں افراط نظر آتی۔ ان دنوں دو مور یہ پل کے قریب سبزی اور پھل کی منڈی لگا

تھی۔ ہمیں اتنی دور جانے میں بھی کوئی مشکل درپیش نہ آتی کیونکہ ہم غریبی کے دور سے نکل کر اپنے آپ کو امیر سمجھنے

جمیلہ کے کپڑے دھونے کے لیے اسے دبانے کے لیے وہی مائی آیا کرتی تھی جس کے ہاتھوں میں انیق اور

تھوڑی دیر تو نک کر بیٹھ جایا کر قد سید۔

میں حکم کی تعمیل میں بیٹھ گئی۔

”یہ کھانا کون پکاتا ہے بڑا معمولی درجے کا کھانا پکاتا ہے۔“

میں کچھ شرمندہ ہو کر بولی..... ”کھانا تو خیر میں ہی پکاتی ہوں جمیلہ.....“

”میرا یہ مطلب نہیں کہ کھانا خراب پکا ہوتا ہے۔ تمہارے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں انہیں طاقت درخور اک

.....“

”مثلاً.....“

”مثلاً گوشت مرغی، قیہہ..... کھن دہی.....“

”وہ بھی پکتا ہے لیکن انیق اور انہیں سبزیوں ہی پسند کرتے ہیں۔ خاں صاحب کو دال پسند ہے اور خاص کر کاٹلی

.....“

”ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔“

”تم کسی کی فکر نہ کرو جمیلہ میرے ساتھ فورمن کرچین ہسپتال چلو..... وہاں ایک بڑی قابل لیڈی ڈاکٹر آئی ہے

.....“

”پھر وہی بات..... جس طرح میں تیری منطق نہیں سمجھتی تو میری بات نہیں جانتی۔ وہ پکڑ کر آپریشن کر دے

یہ ہومیو پیتھک علاج مجھے راس آ رہا ہے۔ خدا کی قسم اب تو لگتا ہے مجھے کچھ ہوا ہی نہیں۔“

واقعی لگتا تھا جیسے جمیلہ پوری تندرست ہو گئی تھی۔

جب چودھری سردار محمد جمیلہ کو لے کر گاؤں گئے تو میں حیران تھی کہ اتنے غلط فیصلے کا اس قدر مثبت نتیجہ کیسے نکل

.....“

خاں صاحب کو جانوروں سے بڑی محبت تھی۔ یہ جملہ بڑا بے معنی سا لگتا ہے جیسے کوئی آٹھویں جماعت کی لڑکی

فون پر آپ سے کہے کہ مجھے اپنی امی سے بڑا پیار ہے لیکن کبھی کبھی کلیشے کے جملے بڑے سچے بھی ہوا کرتے ہیں۔ جب عہد گزر جاتا ہے تو اس سے مستعار لی ہوئی اقدار بھی ماضی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ آج ساری دنیا میں صنعتی ترقی کے اثرات بول بالا ہے۔ دیہات دیہاتی رسم و رواج، دیہات سے وابستہ اقدار سب رول بیک کر رہے ہیں۔ وہ جو ساری دنیا کو پینا مہیا کرتے ہیں پینڈو کہلائے جانے پر احساس کمتری میں مبتلا رہتے ہیں۔ شہری مہذب آدمی جب جانور سے محبت ہے تو کتے کے گلے میں پینکا اور چین ڈالتا ہے۔ بلی کو پنجرے میں بند رکھتا ہے۔ سیزن آنے پر بلی کو ٹیکا لگوا کر اسے سچے بانجھ کرنا پڑتا ہے۔ طوطا ہے تو پنجرے میں۔ مجبوری سرخا ہے۔ بلبلیں ہیں تو پنجرے میں۔ شہر میں ہر چیز کو قید کر کے محبت جاتی ہے۔

لیکن دیہاتی لوگوں کی زندگی کھیت، باڑے، آنگن میں گزرتی ہے جہاں ریوڑ، گھوڑے، کتے، بلیاں، مرغیاں، گائے، بھینسیں سب ماحول کا ایک حصہ ہوتے ہیں۔ تصویر اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک راستوں پر گھنٹے جو ہڑ میں بطنیں، چھتوں پر کبوتر، گھونسلوں سے چڑیا کے بوٹ نہ گریں۔ بچپن سے بچے جانوروں سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ نہ انہیں کسی جانور سے خوف آتا ہے نہ وہ کسی Pet ہی سے زبردستی پیار کرتے نظر آتے ہیں۔ دیہاتی گاڑیوں میں گئے پیر کھاتے کئی کئی میل کا پینڈا طے کر لیتے ہیں۔ انہیں کے ڈاکٹر سے کبھی سلاوا کا نسخہ لکھوانا نہیں پڑتا۔ وہ طبعاً بڑے انداز میں جہاں جو چیز کچی نظر آئے منہ مارنے لگتے ہیں۔ بچنے ابھی مشکل سے جھاز یوں پر لگتے ہیں تو کچا جھولیا محسوس ”ہو لیں“ بنالی جاتی ہیں۔ امی ہری ہو تو اچار بن جاتا، چٹنی تیار ہو جاتی ہے۔ رس نکل سکے تو آم رس بننے لگتا ہے۔ صنعتی انقلاب نے جہاں زرعی طرز پر دو بادشاہ گنوا کر (اب اس کی تلاش بے معنی اور بے منزل ہو گئی ہے) از سر نو اس کی تلاش شروع کر دی ہے۔ وہ اس دین سے بھی کچھز گیا ہے جس کی پالنا دیہات میں آسان تھی۔ خاں صاحب کو جانوروں سے فیشنی سی محبت نہ تھی۔ وہ گھوڑے، بھینسیں، کتے، مرغی، بلی، کچھڑے کے محبت چکے تھے اور اس محبت میں مصنوعی پن نام کو نہ تھا۔

ان دنوں اشیر خاں بیمار تھا۔ اسے دودھ کی الرجی ہو گئی تھی۔ بھینس کا دودھ اسے ہضم نہ ہوتا۔ زبان پر سیدھی سی جم جاتی۔ کبھی کبھی تے کا عارضہ بھی ہو جاتا۔ سمن آباد کے بازار میں ہو میو پیٹھک ڈاکٹر فاروقی سے ہم بچوں کے دوائیں لایا کرتے تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ہم اشیر خاں کو بکری کا دودھ پلایا کریں۔

ان دنوں جبیلہ ہاشمی ہمارے گھر میں مقیم تھیں۔ جب وہ اپنے گاؤں واپس جانے لگیں تو خاں صاحب نے صاحب سے فرمائش کی کہ اگر وہ کوئی گا بھن بکری بھجوا سکیں تو ہم یہ تجربہ کر کے دیکھ لیں۔ کچھ وقت کے بعد بکری آ گئی۔ مکمل طور پر شہری تھی۔ مجھے کتوں کا تو پھر بھی کچھ تجربہ تھا لیکن بکری سے میں نا مانوس تھی۔ مجھے اس کے چارے سے بچنے سے گھن اور شکل سے بیزاری ہوتی تھی۔ لیکن میں نے اشیر خاں کی خاطر اس کی ٹہل سیوا برداشت کی۔

سمن آباد کے اندرونی غسل خانے میں کالے پیروں والی سفید گا بھن بکری کو باندھا جاتا۔ خاں صاحب آ جاتے تو بکری کو آنگن میں اُگے ہوئے دھریک کے نیچے لے آتے۔ محمد علی بکری کے لیے چارہ پٹھے لاتا۔ خاں صاحب خود اسے بڑے پریم سے دانہ پٹھے کھلاتے۔ میں ایک فاصلے سے ان کا شغل دیکھتی اور سوچتی کہ کیا انہیں بکری سے کچھ

کے چھینے ہوئے کھلے منہ سے خوف نہیں آتا۔ جس روز بکری نے بچے دیئے یہ بھی عجیب سادان تھا۔ ہمارے
 سے کسی ایک غسلاخانہ تھا، جس کے ساتھ اوپر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔ خاں صاحب صبح بکری بیگم کو اس غسلاخانے
 سے پٹھے ڈال کر چلے گئے۔ مجھے سمجھا گئے کہ بکری بچہ دینے والی ہے کبھی کبھی دیکھ لینا۔ اب گھر پر بچوں کے علاوہ
 یہ نہ تھا۔ میرے پاس ان دنوں کوئی ملازم بھی نہ تھا جس سے میں مشورہ کر سکتی۔ ماما بھی زمینوں پر گئی ہوئی تھیں محمد
 علی صاحبی "داستان گو" کے دفتر جا چکا تھا۔
 میں بہت نروس تھی۔

جب میں نے سمجھا کہ اب وقت کم ہے اور کچھ کرنا چاہیے تو میں گھر کی گلی میں سے باہر نکلی۔ سنا ہے جاہلوں کی
 سے بے اللہ فرشتے بھیجتا ہے۔ اس وقت اشیر خاں میری گود میں تھا۔ گھر کے آگے سے ڈوگلی گراؤنڈ کا ایک مانی گزرا۔ یہ
 کبھی کبھی پھولوں کا گلدستہ بنا سجا کر خاں صاحب کی خدمت میں دے جایا کرتا۔ میں نے اسے بلایا تو اس نے اپنی
 ہاتھ لگی میں رکھ دی اور پوچھا۔

”بی بی جی..... کیا حکم ہے؟“

مجھے اسے سمجھانا تو نہ آیا لیکن میں اسے اپنے ساتھ ساتھ گلی میں لائی۔ دروازہ کھولا تو بکری بلبلا رہی تھی۔ اس کی
 طرف متوجہ کرنا شاید وہ ہی سمجھ گیا۔ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ مجھے تو نہ اسے کچھ بتانے کی ضرورت پیش آئی نہ اس نے کوئی
 جواب ہی کیا۔ کچھ دیر بعد وہ باہر نکلا اور بولا: ”مبارک ہو بی بی جی! ایک بچہ تو مرا ہوا تھا دوسرا لیلادودھ لپی رہا ہے۔“
 اس وقت محمد علی سکول سے انیق اور انیس کو لے کر آیا۔ گھر میں رونقیں ہو گئیں۔ خاں صاحب کو ”لیل و نہار“ کے
 ستر میں فون کیا کہ گھر میں اضافہ ہو گیا ہے۔ وہ اپنے ہو پر سائیکل پر کچھ دیر بعد پہنچ گئے۔ اب بکری کا ٹھکانہ بھی غسلاخانہ
 تھا اس کی دیکھ رکھیے خاں صاحب اور محمد علی کرتے تھے لیکن اشیر خاں نے اپنی شہری والدہ کی طرح بکری کا دودھ بھی قبول نہ
 کیا اور اس طرح اسے Cow & Gate کا خشک دودھ ہی پلانا پڑا۔ شہری بچے عموماً سوکھے دودھ اور بوتلوں پر ہی پلا
 کرتے ہیں۔ گھر سے بکری اور لیلادودھ بھی رخصت ہو گئے۔ خاں صاحب کچھ دن کبھی درخت تلے، کبھی غسلاخانے کے آگے
 کبھی اندروالی سیڑھیوں کی طرف جا کر کھڑے رہتے جیسے کچھ یاد کرتے ہوں۔ اپنی بے وفائی کا احساس اور بکری کا اس گھر
 سے نہ ہونے کا جواز ہونے ہونے روزمرہ کے حوالے ہو گیا اور مسائل جنم لینے لگے۔ مختلف راحتیں شکل دکھانے لگیں اور خاں
 صاحب نے اس بکری کا پھر کبھی ذکر نہ کیا جسے وہ بڑے پیار سے تھپتھپایا کرتے تھے اور ہاتھ سے پٹھے کھلایا کرتے تھے۔ وہ
 جانتے تھے کہ شہری زندگی ایسی محبتوں کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ یہاں جانور کو پنجرے میں بند پٹے رسی میں قید ڈسپلن کے کھونٹے
 سے باندھ کر ہی رکھا جاسکتا ہے۔

اشیر خاں سوکھا دودھ شوق سے پینے لگے۔ ان کی بوتل Sterilize کرنا پڑتی۔ دودھ ابلے پانی میں بنانا ہوتا۔
 اس دودھ کے کئی منٹے اور شرائط تھیں۔ بکری کے لیے کچھ بھی کرنا نہ پڑتا تھا۔ نہ میں نے اسے باندھنا کبھی دانہ چارہ دیا لیکن
 اب بکری محمد علی کو عنایت کر دی گئی تو میرے سر سے ایک بوجھ اتر گیا۔ مجھے اب گھر سے بونہیں آتی تھی۔ غسلاخانے صاف
 سترے ہو گئے تھے۔ مجھے یوں لگتا جیسے کوئی نحوست ختم ہو گئی۔ بکری غریب رشتہ دار تھی۔ رخصت ہوئی تو اطمینان ملا۔ نادار

رشتہ دار روئیاں بھی پکاتا ہے۔ جھاڑ پونچھ صفائی سھرائی بھی دیکھتا ہے۔ کپڑے دھونے میں بھی کوئی عار نہیں۔ ٹانگیں دینے پکھا جھلنے میں بھی اپنی عزت محسوس کرتا ہے۔ اس کے برعکس امیر صاحب حیثیت رشتہ دار پانی کا گلاس بھی خود لا کر نہیں سکتا۔ وہ آپ کی آراء پر ناک بھوں چڑھاتا ہے۔ آپ چاہے پی ایچ۔ ڈی ہوں چاہے امریکہ پلٹ سپیشلسٹ، وہ آپ کو علم، کم جانکار اور سوسائٹی کا ناکارہ پرزہ سمجھتا ہے جو اپنی جہالت کی وجہ سے زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہے۔ میں بھی کبھی سے چھٹکارا حاصل کر کے بڑی پرسن تھی۔ اب میرے پاس خشک دودھ اور اس کی کہانی تھی۔ اس کے استعمال نے مجھے کبھی طرح سے سر بلند بھی کرنے میں مدد دی تھی۔

لیکن خاں صاحب دیر تک بکری کے بغیر خوش نہ رہ سکے۔ ایک دن ان کے ہاتھ میں ایک پنجرہ تھا اور اس میں سائیکل کے اوپر ایک لمبا سا ڈبہ دھرا تھا جس پر ہوائی جہاز کی تصویر بنی تھی۔ یہ ”لیل ونہار“ کی ایڈیٹری کا زمانہ تھا۔ خاں صاحب کے پاس ہو پر سائیکل تھی جسے ان کا آفس بوائے عبداللہ جان یوں صاف کرتا جیسے وہ کوئی بی ایم ڈ بلیو یا ماسٹر ہو۔ پنجرہ گھر کے آنگن میں کھلنے والے برآمدے میں رکھا گیا۔ دوسرا ڈبہ خاں صاحب کی لائبریری میں رکھ دیا گیا۔ پنجرے میں سرنے تھے۔ انیق انیس اور اشر کھکتے کھسکتے پاس آگئے۔ پنجرے کے اندر چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں پانی ڈالا گیا۔

میرے تینوں بچوں میں سے انیس احمد خاں میں جانوروں سے موروثی محبت زیادہ ہے۔ وہ بڑی بڑی بونٹوں تک پرندے اور جانوروں کی صحبت میں رہ سکتا ہے۔ انیس شغف اور دلچسپی سے دیکھ سکتا ہے۔ ان کی خدمت میں بے راحت ملتی ہے۔ وہ جانوروں کے ساتھ رہ کر اپنی ازلی معصومیت کے ساتھ ساتھ خوش رہتا ہے۔ سرنے بھی ان کی ملکیت بن گئے۔

وہ پنجرے کے پاس بیٹھ کر ان کی چھوٹی چھوٹی اڑانیں دیکھتا۔ لڑکیوں جیسے نرم و نازک ہاتھوں سے انہیں ڈالتا۔ کبھی کبھی مہر پنجرہ کہہ کر اڑاتا۔ انیق خاں ایسے میں اسے منع کرتا کہ مداخلت ہے۔ طبیعتوں کے جوہر بچپن ہی سے واضح ہونے لگتے ہیں۔ انیق خاں شائستہ رڈ شائستہ مزاج، کسی کو زبردستی اڑانے یا بٹھانے کا قائل نہ تھا۔

اشر نے ان دنوں تھوڑا سا دوڑنا سیکھ لیا تھا۔ جب بھی دونوں بڑے بھائی پچھلے برآمدے میں سرخا پارٹی کرتے وہ بھاگ کر آتو جاتا لیکن اس کے لبوں پر ایک ہی تکرار ہوتی ”ٹیپ کارڈر لینا...“ وہ ہمیشہ سے مشینوں کا شوقین تھا۔ اسے موم بتی بھی مشین لگتی تھی۔ اگر کبھی بجلی چلی جاتی اور موم بتی جلانا پڑتی تو وہ بھاگا آتا ”بائی لینا... موم بائی لینا“ اس کے لیے پریگیت کے مکھڑے کی طرح جاری رہتا۔

ہمارے گھر کے آگے دونوں جانب گراؤنڈس تھیں۔ ایک ڈونگی گراؤنڈ تھی جس کے قریب صوفی صاحب گھر تھا اور جہاں خاں صاحب صوفی صاحب سے ملنے جایا کرتے تھے۔ دوسری گراؤنڈ سے گزر کر بازار آ جاتا تھا جس میں ہومیو پیتھک ڈاکٹر کا کلینک تھا۔ ایک روز جب ہم وہاں پہنچے تو خاں صاحب نے کہا..... ”ڈاکٹر صاحب! مجھے کبھی کی طبیعت پھر ٹھیک نہیں لگتی۔ دودھ تو وہ اب ڈبے کا پیتا ہے لیکن اس کی زبان صاف نہیں جیسے کچھ سفید چمٹا ہوا ہے۔ آ نکھیں بھی دھندلی ہیں۔“

میں نے ان دونوں باتوں کا نوٹس نہ لیا تھا۔

ڈاکٹر صاحب تھوڑے تھوڑے مافوق الفطرت اشاروں کے آدمی بھی تھے۔

کہنے لگے..... ”کوئی پرندہ ورنہ تو نہیں پال رکھا؟“

”چھ سات سرنے ہیں۔ بڑی رونق لگا رکھی ہے۔ بچے انہیں باجرہ ڈال کر خوش ہوتے ہیں۔“

ڈاکٹر صاحب خاموشی سے پڑیاں بناتے رہے۔ ساتھ ساتھ کچھ ہوں ہاں کا شغل بھی جاری رہا۔

یہ پڑیاں ہر چار گھنٹے بعد..... اور اگر آپ برا نہ مانیں خاں صاحب! پرندے آزاد کرویں۔ آپ کے بیٹے کو

سے آزادی مل جائے گی.....“

جس روز خاں صاحب نے سرنے آزاد کیے وہ ڈبہ جس پر ہوائی جہاز کی تصویر تھی لاہریری منگوایا گیا۔ یہ ایک

تھوڑے بڑے سی تار اور بیڑی سے اڑتا تھا۔ اس کا ڈیزائن سامنے رکھ کر جوڑا گیا۔ خاں صاحب میں جو بچہ تھا اس نے

اپنے بچوں کی چھیڑ چھاڑ سے اسے بچا کر خانے کے کمرے کی میز پر ماسٹر پلان بچھا کر جوڑا۔ بیڑی لگائی۔

یہ کیسے چھت پر گئے۔ جب ہوائی جہاز کی اڑان تسلی بخش ہوگئی تو وہ بچوں کو اپنے ساتھ اوپر لے گئے۔

ہو میں اڑ جانے والے سرنے گویا اپنا نعم البدل چھوڑ گئے۔

اب ساری توجہ اس ہوائی جہاز پر تھی جو غالباً لاہور میں اپنی نوعیت کا پہلا کھلونا تھا۔

مجیب سی بات ہے سرنے اڑ جانے کے بعد اشیر خاں کی زبان بھی صاف ہوگئی اور باقاعدگی سے اپنے بھائیوں

کا دودھ پینے لگا لیکن اس کی ایک خواہش سر نہ پڑتی۔ اب بھی جب وہ کمروں میں بھاگتا..... ایک ہی

شہتہ کا رو لینا..... موم بتی لینا.....“

موم بتی تو آسان کام تھا۔ ریکارڈ رڈینا ابھی میرے بس کی بات نہ تھی کیونکہ نیوریلکو شہتہ ابھی گھر میں نو وارد تھا

صاحب سینت سینت کر رکھتے اور بڑی کنجوسی سے استعمال کرتے۔ انہیں خاں نے اسے البتہ چلانا سیکھ لیا تھا

ابو کی غیر موجودگی میں جب وہ اسے چلا لیتا تو ایشق کا وہی لہجہ ہوتا..... ”اسے مت چلاؤ کیسی..... ابو ناراض ہوں

.....“

اس بیماری سے نجات تو مل گئی، لیکن ہمیں معلوم نہ تھا کہ بیماریاں عموماً اپنے چنگے پونٹے انسانی جسم میں بطور

بیماری چھوڑ جایا کرتی تھیں۔ لیکن ابھی کچھ دیر کے لیے عافیت رہی۔ پھر انہیں پھار پڑ گیا اور اسی سلسلے میں نہ جانے کہاں سے

ڈاکٹر ظہیر کو پکڑ کر لے آئے۔

کنبہیا روپی ڈاکٹر ظہیر ہمارے گھر میں بڑی راحتیں لے کر آئے۔ وہ نہ صرف معالج تھے بلکہ نفسیات داں بھی

تھے۔ معالج کے ساتھ ساتھ وہ ہمارے خوف بھی دور کرتے اور ہمیں تسلی بھی دیا کرتے۔ ایک رات انہیں کو بہت تیز بخار تھا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے گھر نہ گئے بلکہ ہم دونوں کے ساتھ انہیں کے پانگ کے ساتھ جڑ کر بیٹھ رہے۔ رات گئے انہیں میری گود

میں سے ہاتھ کا اشیر آدھی رات کی فیڈ کے لیے جاگ گیا۔ ظہیر بولے..... ”خاں صاحب! اشیر کے لیے فیڈ بنا لائیں۔ انہیں

کوڈ سٹرب کرنا ٹھیک نہیں۔“

”بھائی میں نے تو کبھی دودھ نہیں بنایا۔“

پہلے ڈاکٹر صاحب نے سمجھانا چاہا کہ ڈبے کے دودھ کا فارمولا اس کے اوپر لکھا ہوتا ہے۔ اسے پڑھ کر لیکن پھر ڈاکٹر اٹھ کر باہر چلے گئے..... کچھ دیر بعد واپس لوٹے تو ان کے ہاتھ میں دودھ کی بوتل تھی.....

”آپ مجھے ساتھ لے چلتے ظہیر۔“

”ناں جی اصل کام تو کیا پڑا تھا۔ بوتل sterilize کرنا پڑتی تو وقت لگتا..... وہ تو تیار لائن میں پڑی ہیں۔“

انہیں کا بخار صبح سویرے ٹوٹ گیا۔ ہم دونوں سراپا تشکر تھے۔

”اسے دوائی کونسی پلائی تھی ڈاکٹر صاحب۔ اتنے دنوں سے مسلسل بخار..... ٹوٹ ہی نہیں رہا تھا۔“

”کچھ نہیں سر! ایک گولی اسپرو..... یہ بڑی زوداثر ہے۔ جب کبھی بڑی دوائیاں کام نہ دیں اسے آنتھ

”چاہیے۔“

یہاں سے ڈاکٹر اور خاں صاحب کی دوستی شروع ہوئی۔ ان کا کلینک موہنی روڈ پر تھا اور وہ زیادہ تر مریضوں کو مفت علاج کرتے تھے۔ ہمارے بھی وہ فیملی ڈاکٹر بن گئے۔

ابھی ہمارے پاس گاڑی نہیں تھی۔ ہوپر کی جگہ اب Lambretta سکوٹر آگئی تھی جسے خاں صاحب خوش سے چلاتے تھے گویا مرسیڈیز ہو۔ بڑا اچھا موسم تھا نہ سردی نہ گرمی بچے ٹکڑے تھے ہم دونوں یو ایس آئی ایس سے وابستہ تھے اس لیے راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ ایک شام خاں صاحب آئے کچھ متفکر تھے۔

”کیا بات ہے شتو جی؟“

”دہ..... یا منی کرشنا مورتی آرہی ہیں۔“

”کون؟“

”کیرالہ کی بہت بڑی فنکار ہیں۔ وہ لارنس باغ کے اوپر تھیٹر میں بھارت ناٹیم اور کنٹھک کلاسیکی ناچ کرنا سیکھ کر آئی ہیں۔ میری آرزو تھی کہ تمہیں اس کا شو دکھلا تا..... تم شادی سے پہلے ناچ سیکھا کرتی تھیں ناں.....“

”ہاں جی ایک استاد صاحب آیا کرتے ناہی دھنا ندھی دھنا سکھایا کرتے۔ کچھ کلاسیکی بول تو مجھے یاد ہیں۔ لیکن میرا سیکھنا سکھانا کچھ دیر کے بعد آپ ہی بندگی میں جاگھتا ہے۔ آپ کو پتہ ہے ناں کچھ دیر میں تے کھانا سیکھا تھا۔“

”اچھا کچھلی باتیں چھوڑ۔ جانا چاہو گی؟“

”اس سے بہتر خوش اوقاتی اور کیا ہو سکتی ہے۔“

”لیکن بچوں کا کیا کریں..... کس کے پاس چھوڑیں؟“

”نا نا آج ہی آئی ہیں۔ اندر بچوں کے ساتھ لوڈ وکیل رہی ہیں۔“

”لوجی مسئلہ حل ہو گیا۔ دو تکیے تیار کر لو۔“

یا منی کرشنا مورتی نے اپنے ناچ سے سب کو مبہوت کر دیا۔ ایک ناچ تو خاص طور پر یادگار تھا۔ اس نے ایک

تک کاروپ دکھایا جو مہاراج کرشن کی عبادت کرنے جاتی ہے اور کیسے اپنے آپ کو اپنے ہار سنگھار کولھ بھر کے لیے
 ایک ایک ایکشن تکبر، شیخی اور خود نمائی تھی۔ سارا اوپن ایئر تالیوں سے گونج اٹھا۔

مجھے اور خاں صاحب کو کسی مہربان نے بالکل سامنے والی قطار میں بٹھا دیا تھا۔ جونہی پروگرام ختم ہوا ہم بڑی
 کے ساتھ رش میں پھنسے بغیر باہر نکل آئے..... باہر ہمیں ظہیر اپنی کار میں منتظر ملا۔
 ”واہ آپ کو بھی شوق ہے کلاسیکی ڈانس کا.....“

”نہیں خاں صاحب! میں گھر گیا تھا۔ امی نے بتایا آپ دونوں یہاں آئے ہیں۔ میں تو آپ کو لفٹ دینے آیا
 ہم سکوٹر پر چلے جائیں گے ڈاکٹر صاحب.....“

”خاں صاحب! سکوٹر پر آ جائیں آپ میرے ساتھ چلیں۔“ انہوں نے کار کا پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھنے کی
 ایک ٹرینڈ ڈرائیور کی طرح خاموش رہے۔

”میل ونہار“ کے ساتھ ساتھ خاں صاحب ریڈیو پاکستان سے 1963ء سے وابستہ ہو گئے جہاں وہ تلقین شاہ
 لیکن تلقین شاہ پروگرام کرنے کی ایک وجہ ہو گئی۔ خاں صاحب یو آئی ایس پر V.O.A. (واؤس آف
 کے لیے پروگرام کرتے تھے۔ یہاں انہیں مارلاک ملا جو V.O.A. پروگرام کا کرتا دھرتا تھا۔ ایک مرتبہ خاں
 ایک پروگرام لکھا جس میں تلقین شاہ کا کیریئر ڈالا۔ اس کے پانچ رول تھے اور پانچ مختلف لب و لہجہ کے ساتھ
 یہ رول ادا کیے۔ مارلاک اردو پنجابی یا سمانہ کی بولی تو نہیں جانتا تھا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ
 خواجه سلیم اور چند دوسرے لوگ جو شوڈیو میں موجود تھے اس پروگرام سے بہت ملاحظہ ہوئے۔
 امریکہ سے بھی آنے لگی اور اسے کئی بار لگایا گیا۔ ایک روز مارلاک نے خاں صاحب سے امریکن انگریزی
 ”اشفاق! تم ایک کام کیوں نہیں کرتے؟“

”تو پہلے کیا میں کم کام کرتا ہوں..... جو ایک اور بھی کر لوں؟“
 ”ایک پروگرام کرو ریڈیو پاکستان سے..... کئی پروگرام کرنے کے بجائے ایک پروگرام۔ خدا جانتا ہے یہ اتنا
 ہوگا کہ لوگ تمہیں اسی پروگرام کے حوالے سے یاد کریں گے۔ ایسا کردار پیش کرو جو بڑا Lovable ہو لیکن
 حیرتوں کو نصیحت کرے اور اپنے پر کسی قسم کی پابندی نہ لگائے۔“

مارلاک تو ماچس جلا کر خاموش ہو گیا لیکن خاں صاحب کی تخلیقی لکڑی میں آگ لگ گئی۔ انہوں نے ترنت تلقین
 کردار گھڑ لیا۔ پھر اس کی کمینگی کو ابھارنے کے لیے ہدایت اللہ کو جنم دیا۔ ریڈیو سٹیشن سے انہیں بھائی نذیر حسینی مل گئے
 اللہ کے روپ میں امر ہو گئے۔

میں آپ سے عرض کر چکی ہوں کہ جب اللہ اچھے دنوں کی دستک دیتا ہے تو پھر وہ آپ کو وہ تقویت اور توانائی
 عطا کر دیتا ہے جس کی مہربانی سے آپ ہمت طاقت سے اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر بڑی استقامت سے

سارے کام بڑی کامیابی اور خود اعتمادی سے کرتے چلے جاتے ہیں۔ شرط صرف ایک ہے کہ اوپر والے کو آپ کی کوشش مطلوب ہو۔ سب سے بڑی امداد غیبی ہے کہ آپ کی تجویز، عمل اور فیصلہ مثبت نتائج مرتب کرنے لگتا ہے۔

تلقین شاہ آنا فانا مشہور ہو گیا اور لوگ پروگرام کو شیڈول بنا کر دیکھنے لگے۔ جس قدر شہرت تلقین شاہ کو ملتی تھی ایسی ہر دل عزیز ہی ہدایت اللہ کے نصیب میں بھی تھی۔ وہ جب بھی گھر آتے ان کے ساتھ خاں صاحب کے لیے ساٹھی پان ضرور لاتے۔ تلقین شاہ 39 سال چلا ما سوائے دو سال کے جب بے نظیر بھٹو آئی تو اسے دو سال کے لیے شکر گیا۔ اس کے ساتھ دو سال کے لیے انہیں اردو سائنس بورڈ سے بھی ہٹا دیا گیا لیکن نذیر حسینی کے کردار میں نہ پروگرام کو کوئی تبدیلی آئی نہ ان کے رویے میں ہی۔ وہ پہلے دن سے لے کر آخری پروگرام تک شاہ جی کے مؤدب جاں نثار رہے۔ شروع میں اس پروگرام میں رقیہ کا کردار ابوالاثر حفیظ جالندھری کی دوسری بیوی خورشید بیگم کیا کرتی تھیں۔ دوسرے کئی کردار آئے اور چلے گئے۔ عائشہ تسلیم ایک مدت اور مرتضیٰ برلاس کی بیگم فریدہ نے کافی دیر اس میں رول لیا۔ ریاض محمود صاحبزادہ صاحب کے روپ میں اس پروگرام میں شمولیت کرتے رہے لیکن ہدایت اللہ اور تلقین شاہ ہمیشہ ساتھ رہے۔ اب تو اس پروگرام کو ”گینرٹک“ میں بھی تیسرے مقام پر جگہ مل گئی ہے کہ پاکستان میں اتنی دیر تک اور ان قدر کرداروں کو مرکز بنا کر کوئی پروگرام نہیں چلا۔

خاں صاحب کی عادت تھی کہ جب بھی وہ کوئی کام کرتے مجھے اس میں شرکت کی دعوت ضرور دیتے۔ میں نے بھی کچھ عرصہ تلقین شاہ میں کام کیا لیکن میں یہ کام بھلا نہ سکی۔ ریڈیو سے قدر ملک اس پروگرام کی ریکارڈنگ برسوں کرتے رہے۔ پھر جب ہمارا گھر داستان سرائے میں بن گیا تو خاں صاحب نے اوپر والی منزل پر ریکارڈنگ روم اور سٹوڈیو بنوایا۔ انیس ایم بی اے کی تیاری کر رہے تھے، لیکن ساتھ ساتھ انہوں نے ریکارڈنگ کی ساری ذمہ داری اٹھالی۔ انیس میں ایک عجیب بات ہے کہ وہ جس شخص سے محبت کرتا ہے اس کے کام آنے کی کوشش کرتا ہے۔ انیس بیٹے کو باپ سے محبت محبت تھی۔ اس نے ریکارڈنگ ہی نہیں کی بلکہ تلقین شاہ کے تمام اکاؤنٹ اکاؤنٹ کی پے منٹ کی رسیدیں اور ایک maintain کیا۔ وہ ہر تلقین شاہ کی تاریخ، سال، وقت تو نوٹ کرتا ہی تھا، لیکن اس رجسٹر میں ہر پروگرام کی پہلی اور آخری سطر بھی لکھتا۔ اب میں حیران ہوتی ہوں کہ نہ جانے کیسے وہ سارا حساب کتاب لے کر اور صد اکاروں کی رسیدیں ترتیب وار لے کر ٹیکس والوں کے دفتر بھی جاتا رہا اور ٹیکس کے ضمن میں خاں صاحب کو کبھی کوئی زحمت نہ اٹھانی پڑی۔

جب پی آئی اے میں ملازم ہو کر انیس کراچی چلا گیا تو پھر اشیر نے ریکارڈنگ شروع کر دی۔ اشیر طبعاً مشین کے قریب ہے۔ اسے مشین دکھادیں تو وہ اس کی کارکردگی کو بآسانی سمجھ جاتا ہے۔ اکاؤنٹ اور رجسٹر تو اس کے بس کی بات نہ تھی، گو وہ مارے باندھے یہ بھی پنپاتا تھا۔ لیکن پہلی ریکارڈنگ سے لے کر آخری ریکارڈنگ تک خاں صاحب کو کبھی شکایت کا موقع نہ ملا۔

اشیر خاں کی شادی کے بعد رفیق میاں ہمارے ساؤنڈ انجینئر بنے۔ وہ باقاعدہ اور باضابطہ طور پر اردو سائنس بورڈ میں ملازم تھے، لیکن شام کو ہمارے پاس آ کر کام کرتے تھے۔ ساری مشینوں کی دیکھ رکھ بڑی ریلوں پر ان کی مشینوں کی گنتی شمار، سکرپٹوں کو اہتمام سے رکھنا، رفیق احمد کا معمول تھا۔ البتہ انیس کی طرح اکاؤنٹ نہ رکھے جاسکے جس کے

س نے اپنی خدمات حاضر کر دیں۔ اب کاسٹ کے چیک اور رسیدیں میں بناتی تھی۔ ٹیکس کے لیے ایک وکیل مقرر کیے جو سال بہ سال ٹیکس لگوانے کے لیے پیش ہوا کرتے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک خاں صاحب نے اس سے بے وفائی نہیں کر گئے۔

اب یہ سارے اکاؤنٹ رجسٹر غرضیکہ تلقین شاہ کی ہسٹری ”دبستان شہابیہ“ لوک ورثہ اسلام آباد میں محفوظ ہے۔ تحقیق اور تجسس کے نرغے میں رہتے ہیں وہاں جا کر تحقیق کر سکتے ہیں۔

ہر پروگرام کے دو حصے ہوا کرتے ہیں۔ ایک وہ حصہ جو Product کی شکل میں قارئین سامعین اور ناظرین تک پہنچتا ہے۔ دوسرا حصہ وہ تیاری کے مرحلے ہوا کرتے ہیں جس میں سکرپٹ، کاسٹ، سٹوڈیو، کیمرے، تکنیکی سٹاف، سٹے جانے کی گاڑیاں، مقررہ اوقات کی پابندی عجیب مصیبت ڈالتی ہے لیکن اصلی قباحت انسان اپنی طبعی خصوصیات کے باعث اپنے ذاتی حالات کے پیش نظر اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔ یہاں عموماً کئی مجبوریاں باہم ٹکراتی ہیں۔ بڑے بڑے عموماً خوشامد پسند اور وقت کو اپنے آپ پر لاگو نہیں سمجھتے۔ اگر وہ لیٹ ہیں تو لازماً سب کو خوشی سے انتظار کرنا چاہیے ہے۔ اگر کوئی دوسرا والدہ کے جنازے سے کچھ تاخیر سے پہنچے تو بڑا آرٹھ کسی کو بتائے بغیر گھڑی دیکھ کر رخصت ہو جائے تو سنا لگتا نہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ بڑا آرٹھ جان بوجھ کر بددماغی یا بد مزاجی اختیار کرتا ہے۔ ہر بڑے آدمی کی زندگی میں ہی built خرابی ہوتی ہے جیسے کسی کسی نئی مشین میں کبھی کبھی کوئی manufacturing نقص ہوتا ہے۔

عجب اتفاق ہے کہ تلقین شاہ کی ریکارڈنگ میں خاں صاحب کو نہ کاسٹ کی مزاج داریاں اٹھانی پڑیں نہ ٹیکنیکل سٹے کی غٹیں کرنا پڑیں۔ خاں صاحب ان خوش قسمت لوگوں میں سے تھے جو محبت کے پالنے میں پروان چڑھے۔ کچھ عرصے تک شہیدان کی خوش نصیبی سے حسد کرتے ہوں لیکن کیا کیا جائے اللہ بعض لوگوں کو بعض دوسروں پر ہر معاملے میں فضیلت بخشتے۔ کیا کیا جائے اگر اس نے مرد کو عورت پر فوقیت عطا کی۔ اب عورتیں اس بات کو غلط ثابت کرنے میں لگی رہتی ہیں۔ میں نہیں شاید علم نہیں کہ جہاں فضیلت ہوتی ہے وہاں ذمہ داری بھی تو اسی تناسب سے زیادہ ہوتی ہے۔

ہر مرد اسی فضیلت کے ہاتھوں عورت، گھر بار، اولاد، والدین کا بار بردار غلام بن جاتا ہے۔ ہر بڑا آدمی جسے بیت عزت، شہرت، سوسائٹی میں اونچا مقام مل جاتا ہے اس پر معاشرے کو اسی تناسب سے احسن طریق پر بہتر چھوڑ کر جانے کی ذمہ داری سونپ دی جاتی ہے۔ وہ اپنی لائف بوٹ گھاٹ پر نہیں پہنچا سکتا۔ اس کے ساتھ کئی بجرے کشتیاں، نئے پھوٹے پھٹوں پر سوار لوگ ساتھ ہو جاتے ہیں۔ خاں صاحب بھی ساری زندگی نعمتوں کی وصولی کے بعد بڑے تنگ روپ میں قرض حسنہ کے طور پر اس بڑائی کی قیمت ادا کرتے رہے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی ذمہ داری ایک باپ کی طرح محسوس کیا کرتے تھے اور اس ذمے داری کا کوئی بوجھ محسوس نہ ہوتا۔

یوں کہہ لیجیے کہ 479- این میں کیریئر کے اعتبار سے خاں صاحب نے کئی معر کے مارے۔ 479- این ایک عرصے سے بہت ہی اہم اور Eventful جگہ تھی۔ یہاں خاں کی اہمیت ان کے کام کے اعتبار سے بہت بڑھ گئی۔ 16 اگست 1961ء کو انہیں گلڈ کاسکریٹری بنا دیا گیا۔ یہ گلڈ ایسوسی ایشن کے حالات بہتر بنانے کے لیے تشکیل دیا گیا تھا۔ گلڈ میں کام کرنے

کے ساتھ ساتھ خاں صاحب کو ایڈیٹر ”لیل ونہار“ کی نوکری مل گئی۔ Progressive Papers کا دفتر میوہپتار کے سامنے تھا۔ اسی دفتر میں سیکرٹری سرفراز صاحب نے خاں صاحب کو 21 اپریل 1959ء کو نوکری دلائی۔ قریباً دو سال بعد 15 مارچ 1961ء تک خاں صاحب ”لیل ونہار“ کا رسالہ باقاعدگی سے نکالتے رہے اور اپنی ہوپر سائیکل پر سمن آجےتے دفتر آتے جاتے رہے۔ اس کے بعد تو یو ایس آئی ایس نے خاں صاحب کو مکمل طور پر جذب کر لیا۔ حتیٰ کہ 1963ء میں برکے Exchange پروگرام میں امریکہ چلے گئے۔

لیکن یو ایس آئی ایس ایک بالکل نیا تجربہ اس اعتبار سے تھا کہ پہلی بار خاں صاحب کے افق پر امریکہ کی بھرا۔ مارلاک یو ایس آئی ایس میں وی او اے کا کرتا دھرتا تھا۔ دبلا پتلا، خوش شکل، امریکیوں کی طرح خوش مزاج، آپ کو درست سمجھنے والا، ہر وقت اپنا نکتہ نظر سمجھانے پر مصرّ شائستہ و شائستہ زبان آدمی تھا۔ بہت بعد میں کسی نے یہ پرچہ لگایا کہ مارلاک دراصل سی آئی اے کا آدمی تھا اور اس کی ڈیوٹی میں خاں صاحب کو monitor کرنے کی ذمہ داری تھی۔ تب ہماری جنرل نوج اتنی نہ تھی کہ ہمیں امریکہ بہادر یا پھر سی آئی اے کی اچھی طرح سے سمجھ آ سکتی۔ ہمارے لیے بہت تھا کہ خاں صاحب کو ایک پروگرام لکھنے اور پھر اسے ریکارڈ کرنے کے لیے 180 روپے ملتے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ کچھ پروگرام لکھنے لگی اور اس طرح ہمارے پاس پیسوں کی ریل بیل ہو گئی۔

مارلاک کی وساطت سے یو ایس آئی ایس کے دفتر میں خاں صاحب کی ملاقات خواجہ سلیم سے ہوئی۔ وہ اسے کے لیے خاں صاحب کے پروگرام ریکارڈ کرتے تھے۔ خواجہ سلیم ایک انتہائی شریف النفس، کم گو اور محبت میں پت انسان تھے۔ مشفق خواجہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ لیکن انہوں نے کبھی اس بات کا برملا ذکر نہیں کیا۔ خواجہ سلیم خورے نہ تھے اس لیے انہیں کسی قسم کے سرٹیفکیٹ دکھانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ گھر آتے تو باورچی خانے میں مٹھی پر بیٹھ کر چپ چاپ جو کچھ ملتا، صبر و شکر سے کھاتے۔ ان کی محبت کا اظہار لڑکیوں جیسا تھا۔ خاں صاحب کا ہاتھ کھڑے رہتے اور انہیں تنگے جاتے۔ انہیں ان کی طرف کھنچا جاتا۔ مجھے دیکھ کر بھابی بھابی جی کا ورد کیے جاتے۔ ان کی محبت ایسی تھی جیسے اجڑے کھجوریں خالص شہد میں ڈوبی ہوتی ہیں۔

جب خاں صاحب نے ”دھوپ سائے“ بنائی تو خواجہ جی ہی اس فلم کے Recordist تھے۔ انہیں دس مرتبہ کے retake کے لیے کہا جاتا۔ ان کے ماتھے پر کبھی بل نہ پڑتا۔ ٹھنڈے میٹھے مزاج کے خاں صاحب کے چلے جانے کے بعد خواجہ جی میرے پاس آتے رہے۔ ان کی طبیعت پر گہرے Depression کے اثرات تھے جیسے وہ اپنی ہی مٹھاس کے ہاتھوں عاجز آ چکے ہوں۔ افسوس جس طرح خاں صاحب ان کا ہاتھ پکڑتے تھے مجھ سے خواجہ جی کی محبت لوٹائی نہ گئی۔ مجھ میں جو بناوٹ ہے غالباً اس کا بھیدان پر اور ان کی ڈاکٹرناہید پر کھل گیا ہوگا۔ ہولے ہولے ان کے پھیرے کم ہوتے گئے اور خواجہ جی بھی بغیر رسمی طور پر ملے ہم سے رخصت ہو گئے۔

خواجہ جی کے ساتھ بھائی احمد علی کی بھی اسی یو ایس آئی ایس میں ملاقات ہوئی۔ جس قدر خواجہ جی دھیرج پسند تھے اسی قدر بھائی احمد علی بلند بانگ، رولارپا اور اپنی منوانے والے تھے۔ رام پور سے ہجرت کر کے یہ غیرت مند پنڈت لاہور پہنچا تھا۔ غالباً سب سے زیادہ وہ خاں صاحب سے وابستہ تھے۔ وہ گھر آتے تو سب کو follow on کا حکم دیتے۔

میں بھی مجھے بھائی جی کہتے نہ تھکتے۔ انہیں سیخ کباب بنانے میں بڑی مہارت تھی۔ ان کے آنے پر باورچی خانہ ان کے ہاتھوں میں چلا جاتا۔ وہ قیمہ ساتھ لاتے۔ اس میں کچھ بالائی ملاتے۔ تھوڑا قیمہ ابال کر ڈالتے۔ کسی کو کبابوں کی انگیٹھی ملنے کی اجازت نہ ہوتی۔ بڑے لذیذ کباب بناتے اور سب سے پہلے خاں صاحب کو چکھاتے اور صرف انہیں ہی کھاتے تھے کہ وہ پنکھالے کر کبھی کبھی انگیٹھی سے شعلے اٹھادیں۔ وہ دور نہ جانے کب ختم ہو گیا۔

یہ سلسلہ جاری رہا حتیٰ کہ بھائی احمد علی نے لاہور کالج میں ایک دکان کھولی جسے پی آئی اے نے Sponsor کیا تھا۔ اس پر سامان رعایتی قیمتوں پر ملا کرتا تھا۔ خاں صاحب کے چلے جانے کے بعد بھائی احمد علی سے رابطہ قائم ہے لیکن اس سے کبھی سوک استقامت اور محبت نہ تھی جس سے رشتے ناطے سیراب ہوتے ہیں۔

یہ ایس آئی ایس کی بدولت ہی 1963ء میں پہلی بار خاں صاحب امریکہ گئے۔ یہ Berkeley Education پروگرام تھا۔ اس میں چند لکھاری پاکستان کی طرف سے بریڈ فورڈ گئے انہیں وہاں جا کر کچھ لکھنے لکھانے کی تھی۔ پھر ریکارڈنگ کافن سکھانے کی کوشش کی جانے والی تھی۔ امریکہ کے وہ دانشور جو اس پروگرام کے کرتا دھرتا تھے ان میں سے ہمیشہ کی طرح یہ پروگرام بہت ابتدائی رکھا۔ امریکی یہ سمجھتا ہے کہ کالا آدمی سرے سے کچھ نہیں جانتا اور اسے کچھ دیکھا کر یہ بھی بتانا چاہیے کہ ”طالب علمو! یہ مائیکروفون ہے۔ اس سے آواز ریکارڈ کی جاتی ہے۔“ یہ Creative کی کلاس تھی۔ خاں صاحب کے لیے جو کئی پروگرام ریڈیو پر کر چکے تھے جو صاحب کتاب بھی تھے اور جو ان کے لیے ”داستان گو“ نکالتے رہے تھے اور ”لیبل نمبر“ کے ایڈیٹر رہ چکے تھے۔ ان کے لیے یہ ساری پریکٹس تھیں لیکن دوسرے ممالک اور اڈیوں سے دوستی کے لیے یہ عہد بار آور ثابت ہوا۔

جن دنوں خاں صاحب برکلے پروگرام پر گئے، وہ گھر کی دیکھ بھال کے لیے ظفر کو تائید کر گئے۔ ظفر خاں صاحب کے رشتہ دار دوست اور راز دار بھی تھے۔ درمیانہ قدر گوری رنگت ڈرا بھاری جسم والے ظفر کو بچے انکل ظفر کہتے تھے۔ یہی رعایت سے میں اور خاں صاحب بھی انہیں انکل ظفر ہی کہا کرتے تھے۔ بھاری چہرے پر موٹے شیشوں والی عینک ہا کرتی جس سے ان کا چہرہ بہت سنجیدہ لگتا۔ ظفر جوانی میں نہ بوڑھے تھے نہ جوان۔ انہیں اپنی کسی رشتہ دار لڑکی سے بے تعلقی جو کسی اور شخص کے عشق میں بہتا تھی۔

ظفر جب بھی میرا اور بچوں کا حال چال پوچھنے آتے کبھی برآمدے سے آگے نہ بڑھتے۔ بچوں سے رمی گفتگو کے اپنی توجہ شیر پر مرکوز کر کے پوچھتے: ”کیجی کھائی؟“

وہ نفی میں سر ہلاتا۔

”خدا کے لیے قدسیہ آپا سے کیجی کھلائیں۔ یہ ضد کر کے تو کیجی نہیں مانگ سکتا۔“

میں ان سے کہنا چاہتی کہ ظفر اپنی ذہنی عیاشی ترک کر کے شادی کر لیں کیونکہ کوئی لڑکی ضد کر کے آپ سے تعلق نہیں کرے گی لیکن میری خواہش اس وقت پوری ہوئی جب ہم 121-سی میں گئے اور انہیں انعام کے طور پر خاندان کے خوبصورت ترین لڑکی ارجمند عطا کر دی گئی۔ زندگی نے وفانہ کی اور ظفر رخصت ہو گئے لیکن ارجمند کے تین بڑے بچے بچے موسیٰ، منیرہ اور انکل ظفر کی نشانی بن کر ارجمند کا ہاتھ تھامے ہوئے ہیں۔ سینت کر اپنی ذات پر خرچ نہ کر کے

انکل ظفر کافی اثاثہ اور ایک کوٹھی ماڈل ٹاؤن میں چھوڑ گئے ہیں اور انکل ظفر کی بدولت یہ لوگ موج میلا مناتے ہیں۔

479۔ این کی بات ہے ایک روز جب ہم ڈوگنی گراؤنڈ کے سامنے کھڑے تھے انکل نے پوچھا:

”اشفاق کا خط پتر قدسیہ آپا؟“

”باقاعدہ خط آتے ہیں بلکہ بچوں کی تصویریں منگوائی ہیں؟“

”اچھا تو بھیجی آپ نے؟“

حسن اتفاق سے اس وقت ریزی آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کیمرا تھا۔

بچوں نے اصرار کیا کہ تصویریں ڈوگنی گراؤنڈ میں کھنچوائی جائیں۔ محمد علی نے بچوں کو سنبھالا۔ میں نے سید

گود اٹھا لیا۔ پھر یہ قافلہ سڑک پار کر کے اس ڈھلوان پر پہنچا جس سے اتر کر ڈوگنی گراؤنڈ اور باندرا درمی آتی تھی۔

اینق میاں نے انکل ظفر کو اپنی ٹوپی عطا کی اور کئی تصویریں بنائیں۔ جب یہ تصویریں امریکہ پہنچیں تو ایک فرانسیسی لڑکی

خاں صاحب سے پوچھا: ”کیا یہ آپ کے کزن Confirmed bachelor ہیں؟“

”ہاں ابھی شادی نہیں ہوئی۔ تم نے کیسے اندازہ لگایا؟“

”ان کے چہرے پر لکھا ہے۔“

خاں صاحب نے اپنے خط میں لکھا: ”اسی لڑکی جو تصویر دیکھ کر اتنے گہرے نتائج نکال لیتی ہے۔ کل اسے

کلاس میں ایک ایسی کتاب کا مضمون پڑھنا پڑا جو امریکہ میں پانچویں کے طالب علم پڑھتے ہیں۔ اس سے اس پر گرا

جہالت کا اندازہ لگائیے۔“

اسی برکلے آکسیجن پروگرام میں خاں صاحب کو جیکو لین کینیڈی سے ہم مکتب کی شکل میں ملنے کا اتفاق ہوا۔

پروگرام میں بھانت بھانت کے ادیب جمع تھے اور اپنے اپنے ملک میں وہ بہت معرکے مار کر آئے تھے۔ لیکن امریکہ

نہ اپنی امریکن انگریزی کے علاوہ کسی زبان کو اہم سمجھتا ہے نہ اپنے نو ساختہ کچھ کے علاوہ اور کسی کچھ کے حسن کو مانتا ہے۔

وہ کسی گروہ سے تال میل کرتا ہے اسی احساس برتری کے باعث دوسروں پر چھا جانے کی قوت رکھتا ہے۔

جب خاں صاحب برکلے سے واپس آئے تو انہیں جیکو لین کینیڈی کی کتاب کا ترجمہ کرنے کی آفر ہوئی جو

نے بطریق احسن پوری کی۔ اس کے علاوہ انہیں ایک اور کتاب ترجمہ کرنے کے لیے ملی۔

The Golden Hawks of Genghis Khan جو انہوں نے ”چنگیز خاں کے سنہری باز“ کے

سے قارئین کے لیے چھوڑی ہے۔

ڈوگنی گراؤنڈ اور باندرا درمی نے ہمیں ایک بڑے آدمی سے ملایا۔ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم ایم اے میں

استاد رہے تھے اس لیے ان سے تعارف کی حاجت نہ تھی۔ صوفی صاحب ان دنوں ”ٹوٹ بوٹ“ کی نظمیں مرتب کر

تھے۔ وہ ان نظموں کا رد عمل دیکھنے کے لیے ڈوگنی گراؤنڈ میں آتے، بچوں کو جمع کرتے اور ٹوٹ بوٹ کی نظمیں سناتے

ہمیں ملتے تو خاں صاحب سے لاڈ کے انداز میں کہتے: ”اوائے تیری روزی میں میرا کوئی حصہ نہیں؟“

”صوفی صاحب! ابھی قدسیہ ایسا کھانا نہیں پکا سکتی جو کسی کشمیری کو کھلایا جاسکے۔“

توئے گدھے! تو میرا مطلب نہیں سمجھا۔ استاد کے گھر جا کر کھانا کھانا بھی اپنے ہی رزق سے کھانا ہے۔
 میں بڑے اچھے کچے خود لگاتا ہوں۔ کشمیری چائے کے ساتھ..... گولاش کھایا ہے کبھی؟ اوئے تم تو کبھی
 یہاں کیا آؤ گے۔“

اس طرح ہم سرکتے سرکتے صوفی صاحب کے دسترخوان پر پائے جانے لگے۔ میں نے صوفی صاحب سے
 جاننے کا طریقہ سیکھا لیکن خدا گواہ ہے وہ ذائقہ کبھی پیدا نہ ہو سکا۔ نہ کبھی شعروں سے مناسبت پیدا ہو سکی نہ
 میں لذت پیدا ہوئی۔ اب جا کر پتہ چلا کہ یہاں پھر ہماری جہلت کا بہت گہرا اثر ہے۔ ہمیں جو موروثی
 Genetic Coding کے حساب سے خاص صلاحیتوں کے مالک ہو جاتے ہیں۔ استاد کبھی
 لیکن وہ شاگرد جن کی مناسبت استاد کے علم کے ساتھ ہوتی ہے وہ بہت جلد ترقی کر جاتے ہیں اور
 کے باوجود کہیں نہیں پہنچ پاتے۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ نذیر بیگم موسیقی میں بے حد ریاضت کیا
 میں اور جہاں بہت کم وقت میں اپنی خداداد صلاحیتوں کے باعث وہاں پہنچ جاتی جہاں پہنچنا نذیر بیگم کے لیے
 اس گھر میں ہمارے پاس کا چھپا بھی آنے لگی۔

کا چھپا آج کے مشہور نفسیات داں ڈاکٹر ترین کی بیوی تھی۔ اس وقت ڈاکٹر ترین کچھ خاص مشہور نہ تھے۔ کا چھپا
 Pram میں ڈال کر ہمارے گھر بلا دھڑک چلی آئی۔ اس کی ملاقات خاں صاحب سے ڈوگلی گراؤنڈ میں ہوا
 یہاں سے وہ گھر آنے لگی اور رفتہ رفتہ مجھے یوں لگنے لگا جیسے وہ ہمیشہ سے 479۔ این کا حصہ ہی ہے۔

کا چھپا کے ساتھ اس کی ایک سہیلی عارفی بھی ہمارے گھر کا حصہ بن گئی۔ عارفی بیگم دراصل اشفاق صاحب کی
 تھی۔ وہ ”لیل و نہار“ میں بلا دھڑک چلی جاتی۔ خاں صاحب کام کرتے رہتے۔ وہ سامنے بیٹھ کر پکھی کی طرح
 کی باتیں کرتی رہتی۔

یہ تو اب مجھے یاد نہیں کہ عارفی پہلے گھر آئی اور اس کے ساتھ کا چھپا آئی یا کا چھپا عارفی کو متعارف کروانے والی
 میں مجھے ایک دو باتیں عارفی کے متعلق یاد رہ گئی ہیں۔ عارفی کو میرے منجھلے بیٹے انیس سے بڑی محبت تھی۔ اس نے
 وہ خوبصورت سویٹر انیس کے لیے بنایا تھا جس پر ایک سفید بلی اونی دھاگوں سے Knit کی تھی۔

عارفی برآمدے کے ساتھ والے نانا کے کمرے میں عین آتش دان کے پاس والے صوفے پر بیٹھ کر سویٹر
 ساتھ والے ڈانگ روم میں خاں صاحب بیٹھ کر لکھا کرتے۔ عارفی باتیں کیے جاتی اور خاں صاحب چھوٹے
 جواب دیتے رہتے۔ یہ ٹیلی گرافک سلسلہ ان دونوں کی دوستی کا باعث بنا۔ بعد ازاں عارفی نے احمد رضا قصوری
 کی شادی کر لی، لیکن عارفی کا لمبا چوڑا ذکر اس جگہ درست نہیں۔

مفتی جی ہمیں مرزا جی کا تحفہ تو دے کر گئے ہی تھے ایک عدد رہائشی مہمان قیصر مفتی کی شکل میں اور دے گئے۔
 مفتی کراچی میں امریکینوں کے لیے کام کرتا تھا۔ وہ جب بھی لاہور آتا ہمارے ہی گھر ٹھہرتا۔ مجھ سے اس کی خط و کتابت
 کے اصرار پر شروع ہوئی۔ ایک روز مفتی جی مجھے کہنے لگے: ”اوئے قدسیہ! تو ساری دنیا پر پٹو ڈال لیتی ہے ایک

میرا کام کر دے تو مانوں؟“

”فرمائیے۔“

”بھائی وہ قیصر تیرا بہت گرویدہ ہے۔ اگر تو اسے کسی طرح شادی پر رضامند کر لے تو میں مانوں۔ آج تک

شادی سے بدکنتار رہا ہے۔ اگر اس کا خوف ختم ہو جائے تو اس کی تنہائی کا علاج ہو جائے۔“

لیجیے کا تا اور لے دوڑی قسم کی قدسیہ کے لیے یہ بہت بڑی Activity تھی۔

اس گھر میں میری تجویزوں کے باعث شادیاں ہوئیں۔

قیصر مفتی کی شادی

میرے بھائی پرویز (ریزی) کا بیاہ

آپ کو شاید علم ہو گا کہ نصیر انور ان دنوں ریڈیو پاکستان میں سکرپٹ رائٹر تھے اور نصیر انور کے ساتھ

صاحب کا گہرا دوستانہ تھا۔ نصیر انور ان دنوں فلیمنگ روڈ پر رہا کرتے تھے۔ ان کی گھر والی کشور بہت جلد ہمارے ساتھ

مل گئی۔ کشور بھی ریڈیو پاکستان کے لیے لکھتی تھی اور کافی مشہور ہو چکی تھی۔

فلیمنگ روڈ سے خاں صاحب کا رشتہ پرانا تھا۔ ریاض محمود اسی سڑک پر رہ چکے تھے۔

اس جہاں سے رخصت ہونے سے کچھ دیر پہلے بھی ایک مرتبہ خاں صاحب اور میں لالی جان (کشور) کے

گئے تھے۔

یہ خالصتاً کشمیری گھرانہ تھا۔ ان کے دسترخوان پر ہر قسم کی لذتیں تھیں۔ گھر والوں کی آپس میں بڑی

تھی۔ لالی جان سے چھوٹی بہن نصرت کبھی بچپن میں پولیو کی شکار ہو گئی تھی اور اب وہیل چیئر کی محتاج تھی۔ آج کل

آباؤ میں شہنم تکلیل اور نصرت وہاں کی روح رواں ہیں۔ اس Handicap کے باوجود ”نجھی“ بڑی جان دار نہیں

ملنسار لڑکی تھی۔ اس سے چھوٹی بہن جیداں تھی جس سے بعد ازاں قیصر کا رشتہ طے ہوا۔

لالی جان ہمارے گھر عموماً کھانے پکا کر لاتی تھی۔ ہم ان کے گھر بھی بڑے جذبے کے ساتھ جایا کرتے تھے

لالی جان کی والدہ بھی بڑی شفیق خاتون تھیں۔ جب بھی ملتیں عموماً باورچی خانے میں پیڑھی پر سہائی ہوئی نظر آتیں۔

دعاؤں سے نوازا کرتی تھیں۔

جب لالی جان مان گئیں تو مفتی جی پردھان بن گئے اور اس طرح قیصر کی شادی جیداں سے ہو گئی

کراچی چلا گیا۔ قیصر سے رابطہ قائم رہا۔ 1984ء میں جب میں کینسر میں مبتلا ہو کر میوہ ہسپتال میں داخل ہوئی تو آٹھ

قیصر مجھے ملنے آیا۔ وہ پریشان تھا، لیکن کھلنا رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اے یہ کیا پا کھنڈ چا رکھا ہے۔ سیدھی طرح گھر جا کر اپنے کا کے اشفاق احمد کی خبر لے..... کینسر دینسرت

نہیں بگاڑ سکتا۔ تو مضبوط قوت ارادی کی مالک ہے باز آ جا..... پلنگ چھوڑ دے..... نہیں تو.....“

نہیں تو یہ ہوا کہ کچھ عرصہ بعد قیصر کینسر سے بیمار ہو کر آنا فانا اس جہاں سے چلا گیا۔ ایک کہانی ختم ہوئی۔ ایک صدی ہو گیا..... ایک دروازہ مقفل کر دیا گیا۔

یہی زندگی ہے.....

اس گھر کی برکت سے ایک اور بڑے انسان سے کچھ توقعات وابستہ ہیں۔ ان میں صدیقہ بیگم کا ذکر کرتی

صدیقہ بیگم چودھری برکت علی (مکتبہ اردو) کی ہونہار بیٹی تھی۔ باقی بہن بھائی تو باپ سے ادب کا شغف اخذ کرنے والی تھیں لیکن صدیقہ نے چھوٹی عمر میں لٹریچر سے بڑی شناسائی پیدا کر لی۔ وہ نصابی کتابوں کی طرف مائل نہ تھی لیکن ادب کا شغف اس کی دسترس رکھتی تھی۔ خاں صاحب کی بڑی بہن آپا فرحت اپنے بیٹے جاوید طارق خاں کے ساتھ کم آباد میں رہتی تھیں اور جاوید ہر لاڈ لے بیٹے کی طرح اس وہم میں مبتلا تھا کہ جو کچھ بھی وہ کر ڈالے آپا فرحت اس سے ناخوش نہیں ہوتی۔

چودھری برکت علی کی چھ کینال کی کوشی میں صدیقہ اپنے بہن بھائیوں اور سادہ لوح والدہ سمیت رہتی تھی۔ ان کی زندگی آسان اور سادہ تھی۔ جاوید اور صدیقہ کی مٹھ بھینر بس میں یا سڑکوں پر ہو جاتی۔ جاوید کو اپنے گھرانے سے ادب کا شغف ہی تھی۔ وہ بے شمار شعر زبانی سنا سکتا تھا۔ شاعروں، ادیبوں، تحریک پاکستان سے وابستہ لوگوں کے نام جانتا تھا۔ اس کا Presentation سوچتھی۔ اسے اپنا لوہا منوانے میں کبھی وقت پیش نہیں آئی۔ صدیقہ چودھری برکت علی کی بہن تھیں۔ مکتبہ اردو کی وجہ سے احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی، ممتاز مفتی جیسے بڑے ناموں سے وابستہ رہنے والے اس کے لیے اجنبی نہ تھے۔

یہ ملاپ آنا فانا شادی کے وعدوں میں بدل گیا۔

جاوید بمشکل تمام انیس برس کا ہوگا۔ صدیقہ بھی صرف سولہ کی تھی۔ ان دونوں نے زندگی ساتھ گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ خواب اور حقیقت ایک ہو گئے۔ روایت شکنی کی یہ شادی خاں کی شادی کے بعد دوسری بغاوت تھی۔ نتیجہ وہی نکلا جس کا ہم صدیقہ تھی۔ آپا جی جاوید طارق خاں سے ناراض ہو گئیں۔

صدیقہ ایک طرح سے میری بہن بن گئی اور دوسرا رشتہ جو اس سے جزا وہ میری سہن بھی بن گئیں۔ اس کی بیٹی صدیقہ بیگم میرے بیٹے انیس احمد خاں سے بیاہی گئی لیکن یہ بہت بعد کی بات ہے۔ جب ہم 121-سی میں آ گئے تھے۔

یہ اس وقت کی بات ہے جب صدیقہ کے ٹولید آنے والی تھی۔ اسے دس کے دورے پڑتے تھے اور خدشہ تھا کہ بچہ ضائع نہ ہو جائے۔ میں نے معتبری سے ایک راستہ یہ نکالا کہ صدیقہ کو ایف سی کالج کے زیر نگرانی چلنے والے ہسپتال میں لے گئی۔

یہاں ان دنوں زچہ بچہ کی ڈاکٹر مارٹن تھیں۔ جب ٹولید اس دنیا میں آ گئی تو لیڈی مارٹن نے بچی کی کلائی میں اس کا نام ”بے بی جاوید“ پلاسٹک کے منکوں میں پرویا ہوا ڈال دیا۔ بچوں کی شناخت کے لیے ایسا با ضروری تھا۔

”ہوش کر صدیقہ..... خدانے بیٹی دی ہے۔ اللہ کی رحمت گھر آئی ہے۔“

صدیقہ نے آنکھ کی جھری سے مجھے دیکھا۔ ”مامی..... اسے اٹھالیں..... یہ آپ کی ہے۔ آپ نے اس کو یاد ہے..... آج سے یہ آپ کی ہوئی۔“

پھر برس برس بعد جاوید طارق خاں دہتی میں تھے تو میاں بیوی نے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا اور ٹولیدہ ہمیں فرمائی۔ اس طرح صدیقہ پہلے میری بہو بنی پھر میں اس کی بیٹی کی ساس بن گئی۔ کچھ لوگ وعدے نبھانے میں خوب صحت ہیں۔ صدیقہ اس اعتبار سے بالکل منفرد ہے۔

یہاں پر ریزی کی شادی کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔

کبھی سوچتی ہوں کہ شاید اپنے گندے کپڑے یوں سرعام دھونا آپ کی بدمزگی کا باعث نہ بنے لیکن بتانا یہ مقصود ہے کہ زندگی کی کروٹیں عجیب و غریب ہوا کرتی ہیں اور بڑے انسان کی زندگی بھی معمولی واقعات سے متاثر ہوتی ہے۔ اور وہ بھی ہدی اور نیکی کی زد میں اسی طرح رہتا ہے جس طرح عام لوگ اس کے تھپڑے کھاتے ہیں لیکن واقعات میں نہیں بڑے آدمی کے رد عمل میں مضمر ہوتی ہے۔

میرے بھائی ریزی کا رشتہ ملنا ذرا مشکل تھا۔ جب تک ”داستان گو“ چلتا رہا، وہ ”داستان گو“ کا حصہ پاکستان میں سب سے پہلے Silk printing کی ایجاد ریزی نے کی تھی۔ وہ باہر کے مضامین پڑھ پڑھا کر بالآخر چھوٹی چھوٹی سکرینیں بنانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ان پر وہ پتہ نہیں کیسے تصویر اتارتا بناتا اور پھر سکرین کو لکڑی کے فریم میں اوپر پینٹ لگاتا۔ پھر ایک لکڑی کی سکوجی پھیرتا۔ نیچے پرنٹ آنے لگتا۔ یہ پروسس اسی کو سمجھ میں آ سکتا ہے جس نے ”داستان گو“ کے رسالے دیکھے ہیں۔ ہر ایک صفحہ علیحدہ ہاتھوں سے تیار ہوتا۔ 455- این میں یہ ریزی کر چکا تھا۔

گھر کے سامنے بڑے برآمدے میں چھتیں آدیزاں تھیں۔ میرا کام تھا کہ ہر ایک سرورق کو لے جا کر چھتوں کے کانوں (سرکنڈوں) کے درمیان سوکھنے کے لیے فٹ کر دیتی۔ سمن آباد کے پچھلے برآمدے میں خاں صاحب ریزی کی کرتے۔ ریزی بہت دھیان سے سکوجی پھیرتا۔ میں کاغذ اٹھا کر باہر والے برآمدے میں لاتی۔ ریزی اور خاں صاحب چونکہ تخلیقی لوگ تھے، انہیں کبھی اس کام سے بوریت نہ ہوتی۔ وہ ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے رہتے۔ انہیں اپنے کام کی کامیابی کا سروور تھا۔ جیسے کرکٹ کے کھلاڑی کو سچری کر کے ملتا ہے۔ یہ مشغلہ 479- این میں بھی جاری رہا۔ باورچی خانے سے ملحق گودام اور غسلخانے کے درمیان جو برآمدہ تھا، یہاں سلگ سکرین پرنٹنگ کا اڈہ لگتا۔

بارچھتیں نہیں تھیں۔ باہر چار پائیوں پر سرورق سکھانے کے لیے رکھے جاتے، لیکن پھر رسالہ بند ہو گیا۔ کچھ دیر ”لیل ونہار“ ”داستان گو“ اور یو ایس آئی ایس ساتھ ساتھ چلتے رہے لیکن پھر ”لیل ونہار“ میں خاں صاحب نے استعفیٰ دے دی۔ ”داستان گو“ کا دفتر گو پاس رہا۔ وہاں چودھری سلیم محمد علی اور ریزی پردھان رہے۔ لیکن خاں صاحب کی ساری توہین یو ایس آئی ایس اور امریکہ میں برکلی ایکیسیج پروگرام میں شمولیت کے بعد ریڈیو پاکستان کی طرف مبذول ہو گئی، جہاں شاف آرسٹ تھے۔ ان کا کوئی دفتر نہ تھا۔ وہ ریڈیو سٹیشن کی لان میں بیٹھ کر کام کرتے اور کینیڈین پرنٹنگ آرٹسٹوں کے ساتھ بیٹھ کر اپنی داستان گوئی جاری کیے رکھتے لیکن خاں صاحب نے کبھی اس بات کو اہمیت نہ دی کہ وہ معمولی شاف آرسٹ تھے۔

سکس پر عرب ڈالنے کے لیے ان کے پاس نہ کوئی دفتر ہے نہ گھومنے والی کرسی۔ کمپیوٹر تو خیر تب تک ایجاد ہی نہ ہوا تھا۔
خاں صاحب اور ریزی دونوں پیدائشی تخلیق کار تھے۔

ایک مدت ہوئی ریزی گورنمنٹ کالج چھوڑ چکا تھا۔ ہر آرٹس کی طرح اس کا کام افادیت سے نہ تھا۔ وہ دنیا میں کرنے کے لیے عام راستے چن نہ سکتا تھا۔ اس زمانے میں بھی نوکری کے لیے ڈگری اہم تھی۔ Establishment سے تعلق رکھنے کے لیے ہمیشہ ڈگری اہم رہی ہے۔ یہ بات میں آپ کو پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ ریزی ایف ایس سی نہ پاس کرنے کی وجہ ایک احمقانہ حرکت تھی۔ گورنمنٹ کالج میں جہاں گھڑی نصب ہے بہت سے جنگلی کبوتر آیا کرتے تھے۔ ان کے اندر ایک شکاری ہمیشہ تھا۔ ایک روز وہ صبح کے وقت اپنی ڈیزی گن لے کر کالج پہنچا۔ دو تین کبوتر پھڑکا دیئے۔

دوسرے دن یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ میں تب ایم اے اردو میں پڑھ رہی تھی۔ ڈاکٹر محمد صادق نے کلاس میں جتنا مجھ سے کہا..... ”قدسیہ! ہم لوگ ایک لڑکے پر بڑی کی تلاش میں تھے۔ پتہ چلا ہے کہ اس نے کالج کے مقدس کبوتر کا خون پی لیا ہے۔ اب دو صورتیں ہیں یا تو ریزی خود کالج چھوڑ دے یا مجھے آ کر explain کرے کہ اس نے ایسا کیا کیا؟“

جناب میرے بھائی صاحب نے کبھی کچھ کسی کو explain نہیں کیا تھا۔ جب ہم دھرم سالہ میں تھے اور ریزی دھرم سالہ کے بوائز کالج میں پڑھتا تھا۔ تب بھی اس نے کالج چھوڑ کر گھر پر ایک گورکھا نیچر رکھا تھا۔ اس استاد کے ساتھ رہنے کے بجائے وہ پہاڑوں پر بندوق لے کر شکار کرنے چلا جاتا۔ میری والدہ آیت الکرسی پڑھ کر ہلکان ہوتی اور دھرم سالہ کے گھنے جنگلوں میں تلاش کرتی پھرتی۔ یہ سب کچھ بتانے کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ ریزی ایک عرصہ تک گریوں سے بے نیاز ہو چکا تھا۔

لیکن لڑکی والے تو روز ازل سے مرد کی ساکھ مالی حیثیت، معاشرے میں عزت سے وابستہ رہے ہیں۔ ریزی کے پاس معاشرے میں بھنوانے کے لیے کوئی کریڈٹ کارڈ نہ تھا۔ دو چار جگہ کوشش کی لیکن کورا جواب مل گیا۔ اب ایک پریشانی کا دور شروع ہوا۔ لڑکی تلاش کرنا میرے لیے مشکل تھا، لیکن پھر اس مشکل کو آسان بنانے کے لیے عزیز بیگم کہیں سے آ گئی۔ مجھے اس کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ وہ کہاں رہتی ہے کون ہے لیکن وہ دن ایک دوسرے پر اعتبار کرنے کے تھے۔ 479۔ این میں ریزی کی شادی کا مسئلہ حل ہو گیا۔ جلد ہی اس نے ہمیں شہزادی مامی کا رشتہ تلاش کر دیا۔ مجھے وہ اندرون شہر میں میاں تقی صاحب کے گھر لگئی۔ میاں صاحب کی اس سارے محلے میں بڑی عزت تھی۔ ان کی ساس ان کے ساتھ اوپر چو بارے میں مامی شہزادی کے ساتھ رہتی تھی۔

پہلے دن میں میاں تقی صاحب کے گھر پہنچی۔ اینٹوں والے آنگن سے گزر کر اندر ڈرائنگ روم میں ایک خوش مزاج عورت بیٹھی تھی۔ یہ آپا مختار تھیں۔ شہزادی بیگم کی بڑی بہن اور میاں صاحب کی بیگم..... تھوڑی دیر کے بعد میری آئیں۔

سبز آنکھیں..... گورا چٹانگ..... بہت خوبصورت نقش.....

آگے بڑھ کر مجھ سے ہاتھ ملا یا۔

جو چیز اپنے میں نہ ہو ہمیشہ اس کی تلاش رہتی ہے۔ میرا بھائی اور میں ہمیشہ سے جمال پرست تھے۔ میں مکمل طور پر اس خاندان کی گرویدہ ہو گئی۔ شادی کی تاریخ جس دن طے ہونی تھی، خاں صاحب اور میں اسی ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ اچانک ریزی کی بے مائیگی کا پورا نقشہ ایک بار پھر ٹاپک بن گیا۔ شہزادی کے بھائی، بھائی نواز اور سرفراز اس شادی کے حق میں نہ تھے۔ میاں تقی اور مختار بیگم میرے ووٹ تھے۔ آخر میں معاملہ یہ طے پایا کہ میری والدہ اپنے مرے بچے ریزی کے نام وقف کر دیں تاکہ لڑکی کے لیے کچھ سکيورٹی کا بندوبست ہو جائے۔

بہر کیف جب اللہ کو منظور ہو تو کچھ معاملات خود بخود طے ہو جاتے ہیں۔ شادی طے ہو گئی۔ اس شادی کے کرنا دھرتا ہمارے ڈیڑی جی تھے۔ انہوں نے سکول جانے والی گراؤنڈ میں شامیہ لگوائے۔ بڑے اہتمام کیے۔ ڈیڑی جی نے اصرار کیا کہ ویسے پر تلے ہوئے بادام ضرور ہوں۔ یقین کیجیے میں نے سیروں بادام چھیلے اور انہیں تل کر ڈیڑی جی کے سپرد کیا۔ بڑی رونق اور مزے داریوں میں شادی ہوئی اور ہم ریزی کی طرف سے سبکدوش ہو گئے۔ ریزی نے دو چار دن بھی ہمارے ساتھ نہ گزارے اور شہزادی کے ساتھ چودھری کالونی میں کرائے کا مکان لے لیا۔ وہ قریباً روز شہزادی کو میرے پاس چھوڑ جاتا۔ میں نے ایسی گائے عورت کبھی نہیں دیکھی۔ نہ اس کے منہ میں تھی نہ دماغ میں طیش نہ حرکات میں تیزی۔ وہ کسی کام میں دخل اندازی نہ کرتی۔ کچھ تبصرے کیے بغیر ساتھ رہتی تھی۔ شہزادی اور ریزی کو تین بیٹیاں عطا کیں۔ سب سے بڑی بیٹی ارم میرے بیٹے اشیر خاں سے سال بھر بڑی ہے۔ آباؤ کے پرائیویٹ ہسپتال میں پیدا ہوئی۔

وہ ریزی جس کی شادی کے امکانات بھی ناممکن تھے شہر کی خوبصورت ترین لڑکی کا بلا شرکت غیرے شہر تھا.... باور ہوئی شہزادی اس کے گن گاتی تھی۔

یہ زندگی میں عطا کے رنگ ہیں۔ وہ جب چاہتا ہے چھینر پھاڑ کر دیتا ہے۔ اسے کسی سے کاغذ پر منظوری لینے کی حاجت نہیں۔ جب چاہے جسے چاہے جو چاہے دے دیا۔

اسی 479۔ این میں خاں صاحب سے ان کے رشتہ داروں میں سے سب سے پہلے معافی نامہ بن کر بھی آیا۔ جنگی جس کا اصلی نام نعیم احمد خاں تھا۔ ہوائی فوج میں کیڈٹ تھا۔ ابھی تک خاں صاحب اپنے خاندان سے بچھڑنے اندر ہی اندر سلگ رہے تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ سودا بہت مزنگا ہے اور اتنی بڑی قیمت ادا کرنے کے وہ اہل نہیں۔ جس روز ہمارے گھر آیا خاں صاحب گھر پر نہیں تھے۔ میں نے دروازہ کھولا۔ خاں صاحب سے مشابہت تھی۔ میں نے اس سے کہا: ”اندر آ جائیے۔“

”آپ نے مجھے پہچان لیا؟“

”جی نہیں.... لیکن اندر آ جائیے۔“

اس نے ذرا سا مسکرا کر کہا..... ”واقعی شقو بھائی نے ایک سادہ لڑکی سے شادی کی ہے۔ آپ پر اعتماد کیا جا سکتا

ہے۔“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

”میں اماں جی سردار بیگم کی چھوٹی بہن ماسی رشیدہ کا بیٹا نعیم احمد خاں ہوں۔ ہم لوگ ماڈل ٹاؤن میں رہتے

اس پہلی ملاقات ہی میں جنگلی اور میں Ideas کو ہر وقت discuss کرنے والے دوست بن گئے۔ جنگلی نے تمہاری تمہاری سوجھیں اور خیالات کی آماجگاہ تھا۔ وہ ہر بار ایک نیا خیال شطرنج کی چال بنا کر پیش کرتا۔ میں شہہ لے کر جاتی۔ ہم دونوں کبھی سچ کے متعلق اکٹھے سوچتے، کبھی الگ الگ سوچ پراڑ جاتے۔ کبھی روایات اور بغاوت کی بیخ کنی جاتی۔ کبھی محبت زیرِ عتاب آ جاتی۔ جنگلی کے آنے جانے سے خاں صاحب نے گویا سکھ کا سانس لیا۔ جس طرح کوئی سانس میں اپنے میکے والوں کی ہلکی سی خبر پانچ کر نہال ہو جاتی ہے۔ خاں صاحب کو بھی ٹھنڈی ہوا کا احساس ہونے لگا۔ بہت وقفہ نہیں گزرا۔ جب ایک روز ماما جی فیاض کو بھی نعیم اپنے ساتھ لے آئے۔ ماما جی پولیس میں ایک بڑے عہدے پر تھے اور اماں سردار بیگم کی سب سے چھوٹی بہن رشیدہ بیگم کے شوہر تھے۔ ماما جی کا بڑا اوبد بہ تھا۔ وہ مکمل طور پر اس عہدے کے شوہر تھے جن سے ماسی رشیدہ تھر تھر کانپتی تھی۔ رفتہ رفتہ نعیم کی مہربانی سے ماسی رشیدہ اور ماما جی فیاض ہمارے گھر آئے۔ ان کے آنے سے خاں صاحب کی تسلی ہوئی اور وہ اماں جی سے ملنے شاہی مسجد جانے لگے۔ جنگلی عموماً مجھے یہاں سے بارے خط بھی لکھا کرتا تھا۔ ہم دونوں میں خط و کتابت اچھی خاصی تھی۔ افسوس زیادہ خط وقت کے ساتھ تلف ہو گئے۔ ایک خط کی نقل پیش خدمت ہے۔

اچھی آپا قدسیہ!

ارے ارے ارے! یہ تو شروع ہی غلط ہو گیا۔ سوچا تو تھا کہ لکھوں گا ”بہت ہی خراب آپا قدسیہ“ لیکن جب لکھنا شروع کرتا ہوں تو اچھی ہی لکھا جاتا ہے۔ جانے آپ کے ہاتھ کیا معجزہ ہے کہ آپ کی طرف سے دل میں ذرہ بھر بھی شش پیدا نہیں ہوتی۔ آپ کے خیال سے ہی ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ مچلنے لگتی ہے۔ مجھے تو ہر دفعہ وہ پہلا دن یاد آ جاتا ہے جب میں آیا تھا تو شتو جی نے کہا تھا تو بھی قدسیہ یہ نعیم ہے ”نعیم؟“ آپ نے کہا ”آپ کے انداز سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہم کچھ غیر مانوس سا تھا۔ شتو جی نے بھی یہ محسوس کیا۔“ ارے بھی اتنی دفعہ تو اس کا ذکر کیا ہے۔ جنگلی یوں اور جنگلی جی۔ ”اوہ یہ ہے جنگلی؟“ آپ نے کہا ”کس قدر شیریں تھی آپ کے لہجہ میں۔ کس قدر یگانگت۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسا کہ میری آپ سے پہلی ملاقات تھی بلکہ ہمیشہ سے واقفیت تھی اور اب ایک لمبے عرصے کے بعد ملاقات ہوئی ہے۔ آپ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ آپ کی آنکھوں کی چمک کہہ رہی تھی۔ جنگلی میں تو ہمیشہ سے تمہیں جانتی ہوں۔ میں نے تمہارے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھا ہے اور اسی لمحہ آپ نے کہا: ”شتو جی سے تمہارا اتنی بار ذکر ہوا ہے کہ معلوم ہوتا ہے تمہیں ہمیشہ سے جانتی ہوں۔“ مجھے انتہائی طمانیت کا احساس ہوا اور میں ہمیشہ کے لیے آپ سے مانوس ہو گیا۔ نہ بننے کہاں تک اپنے خیالات کا صحیح اظہار کر سکا ہوں اور خط بھی قاعدہ سے شروع نہیں ہوا۔ نہ القاب نہ آداب اور لگے بے لگتی ہائیکے۔ لیکن مجھے کچھ بھی فکر نہیں۔ اگر آپ کو یہی بے ٹکا خط نہ لکھ سکوں تو شاید کسی کو بھی نہ لکھوں۔ آپ کو تو جو میرے من میں آ گیا لکھتا چلا جاتا ہوں۔ کچھ معنی ہوں یا نہ۔

اچھی آپا! آپ کا خط آنے سے کس قدر خوشی ہوئی۔ اس کا ذکر کرنا حاصل ہے کیونکہ میں اول تو بیان ہی نہ کر

سکوں گا اور اگر بیان کر بھی سکا تو آپ مبالغہ آمیزی کی تہمت لگائیں گی۔ بس یہ سوچ لیں کہ سکول سے واپس آیا تو سیدھ میل روم پہنچا۔ آپ کے خط سے تو قطعاً ناامید ہو ہی چکا تھا۔ اب جو خط ملا تو وہیں کھول کر پڑھنے لگا لیکن وہاں کچھ آفیسر کھڑے تھے جو مجھے گھورنے لگے۔ میں نے خط پڑھتے پڑھتے ہی چلنا شروع کر دیا۔ رستہ میں دو ایک آدمیوں سے گھر ہوتے ہوتے پکی۔ بہر حال کرہ میں صبح سلامت پہنچ گیا۔ ارادہ تو اسی وقت جواب دینے کا تھا مگر کچھ لوگ آپہنچے۔ ”تم نے ابھی تک کچھ کھایا یا تو نہیں؟“ میم صاحبہ ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی چیخیں ”نہیں بھئی۔ ابھی ابھی تو سکول سے واپس آئے ہوں۔“ میں نے کہا: ”تو بس پھر چلو۔“ صاحب بولے: ”آج ہم نے باربی کیو کا انتظام کیا ہے۔ تم کو لینے آئے ہیں بلکہ کرو۔“ میں نے لاکھ کہا کہ ابھی مجھے منہ ہاتھ دھونا ہے۔ دو خط اور آئے تھے جنہیں ابھی کھولا بھی نہیں۔ کپڑے بدلنے سے گئے۔ امتحان میں تین دن باقی رہ گئے مگر وہ لوگ گویا جھگڑے کے لیے تیار ہو کر آئے تھے۔ بس کپڑے بدلنے کی مہلت دی اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ رات کو جب واپس ہوا تو ڈھائی بج رہے تھے اور پھر اسی طرح دن گزرنے لگے۔ یہاں زندگی اس قدر سبک رفتار ہے کہ وقت پھسلتا چلا جاتا ہے اور اگر ہر لمحہ پر نظر نہ رکھی جائے تو انسان بھٹک جاتا ہے۔ بہر حال اب جا کر کہیں فرصت ملی ہے۔ یہ خط زریں کو لکھنا شروع کیا تھا مگر لکھ نہ سکا تھا۔ اب ادھار لے کر آپ کو لکھ رہا ہوں۔ اس کا پھر لکھ دوں گا۔

آپ آپ کا خط پڑھ کر تو خاصہ فکر لاحق ہو گیا ہے۔ مجھے تو کچھ خبر بھی نہیں تھی۔ گھر سے مجھے کبھی بھی خبر نہیں ملی کہ کوئی بیمار ہے یا کسی کی طبیعت خراب ہے۔ ہاں ٹھیک ہو جانے پر ضرور خبر ملتی ہے۔ ”تنو کو اپنیڈے سائنس کا حملہ ہو گیا۔ آپریشن کروا دیا تھا۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے اور ہسپتال سے واپس آ گئی ہے۔“ اس قسم کی خبریں ملتی ہیں۔ اللہ کرے کہ سب لوگ بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائیں۔ شتو جی کا بہت فکر ہے۔

رسالہ بھیجنے کی نیت کا لانا انتہا شکر یہ مگر اب تو میں اپنے واپسی کے سفر پر روانہ ہوں۔ واپس آ کر ہی پڑھوں گا۔ ہاں اچھی آپا۔ کیا سچ مج میرا افسانہ چھپے گا؟ میں نے افسانہ آپ کو بھیج تو دیا تھا مگر رول میں پچھتا تا رہا کہ یونہی بھیجا اور جب کافی عرصہ جواب نہ ملا تو میں سمجھا کہ آپ بھول گئیں اور میں نے اطمینان کا سانس لیا اور اب معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے افسانہ شائع کر کے واقعی میرا دماغ خراب کر دینا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ آپ نہ جانے شادی سے پہلے کیسی تھیں؟ اب جو میں لاہور آیا تو گفتگو کے لیے یہی موضوع رہے گا۔ میرف طرف سے عارفی کو ولی مبارکباد پیش کریں۔

ارے میں بھی کتنا عجیب ہوں کہ کس ٹرینٹل پر بیٹھا خط لکھ رہا ہوں اور یہ لکھا ہی نہیں کہ یہ میں یہاں کیسے کر رہا ہوں؟ یہاں کیا کر رہا ہوں؟ اور آئندہ کیا ارادہ ہے؟ تو آپ اپنی بات یوں ہوئی کہ میرا کورس پندرہ روزہ ہوئے ختم ہو گیا۔ کورس ختم ہونے پر میں نے ڈھائی ہفتے کی چھٹی لے لی۔ جیکسن، مسپی، ہمفس، ٹینیسی ہوتا ہوا میں کل صبح یہاں یعنی سینٹ لانس پہنچ گیا اور آج یہاں یعنی اب سوادس بجے رات کو سپرنگ فیلڈ لیا نوائے کے لیے روانہ ہو رہا ہوں، جہاں چند گھنٹے کے قیام کے بعد کنگو پلا جاؤں گا۔ وہاں سے انڈیا ٹولیس انڈیا نا۔ ٹولیز دو دوا ہوتا ہوا ڈیڑھے بجے جاؤں گا۔ وہاں چار پانچ روز قیام کا ارادہ ہے اور اردگرد کا چکر لگاؤں گا۔ خیال ہے کہ گرانڈ ریپڈز، ہیزر برڈ این آربر اور کینیڈا کا چکر لگا لوں گا۔ پھر کیوبیک پش برگ ہوتا ہوا واشنگٹن جاؤں گا۔ وہاں سے نارفوک رائج ہوتا ہوا چارلسٹن ساؤتھ کیرولینا جاؤں گا جہاں سے مجھے جہاز

ہے۔ اگر اس سفر کے بعد کچھ ڈالر بچ گئے تو شاید میا می فلوریڈا کا چکر بھی لگا آؤں۔ گو اس کی امید بہت کم ہے۔
دیکھ رہا ہوں یہاں پر سوائے بس کے کرائے کے ہر چیز بجٹ سے زیادہ پڑ رہی ہے۔ ڈالر یہاں پر چونیوں کی
شوق ہوتے ہیں۔

میری بس تیار ہے۔ اب بند کرتا ہوں۔ شقو جی، نوکی کو پیار۔ پرویز اور بھائی کو سلام۔ عارفی، جاوید، صادقہ سب

فقط آپ کا
جنگلی

خدا کے لیے آپ اپنی صحت کا بھی خیال رکھا کریں۔ میرا خیال ہے شقو جی سے ہی بات کرنا پڑے گی۔ آپ
سب ہی تمہاری۔

28.07.61 شکاگو

آپا خط پوسٹ نہ کر سکا تھا یہاں پوسٹ کر رہا ہوں۔

خدا حافظ

جنگلی

ادھر ماجی اور جنگلی گھر آنے لگے۔ ادھر خاں صاحب کے بڑے بھائی اسحاق احمد خاں جن کے متعلق میں نے
سینکھ لیا تھا کہ وہ بدوق لے کر میرے گھر کے چکر لگاتے رہے ہیں کہ میری وجہ سے اماں جی اور باباجی کو اس قدر تکلیف

ایک روز اسحاق بھائی اور ذکیہ اچانک ہمارے گھر آ گئے۔

ذکیہ جی تو بہت پہلے سنگر سہانی کورس میں میرے ساتھ تھی اور میں نے ان کے ساتھ مشین پر کشیدہ کاری کا کورس
کیا تھا۔ ابھی بھی میرے پاس ذکیہ کی خوبصورت Embroidery کے کئی میز پوش ہیں۔ لیکن اسحاق بھائی کو میں نے اس
سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

میں تو ان دونوں سے قطعی ناواقف تھی۔ مجھے تو صرف اس قدر معلوم تھا کہ ججو بھائی خاں صاحب کی خفیہ شادی
سے اس قدر دلبرداشتہ ہوئے تھے کہ ہسپتال لے کر ہمارے گھر کے ارد گرد گھوما کرتے۔ انہیں اُس ویلن کی تلاش تھی جس
سے ان کے والدین کا دل توڑا اور خاندانی روایات کو چکنا چور کرنے کی جرأت کی۔

ججو بھائی سامنے بیٹھے تھے۔ عجب ملائمت اور خاں صاحب سے مشابہت نے مجھے فوراً ان کے قریب کر دیا۔
میں نے بھی نہ جانے کیوں مجھے چھوٹی بہن سمجھ کر فوراً قبول کر لیا۔

”قدسیہ..... ایک کام ہے تم سے، کر لو گی۔“

”جی حکم دیں ججو بھائی۔“

”مجھے ایک بڑا اچھا سارلر شپ مل گیا ہے۔ یہ تو تمہیں اشفاق نے بتایا ہی ہوگا کہ میں ایئر فورس چھوڑ چکا ہوں۔“
 فیسرین کا کام بہت مشکل ہے۔ میں اسے ماڈرن basis پر چلانا چاہتا تھا۔ باباجی اس کی بوتل ڈبیا اور اندر رہ پیر تک نہیں چاہتے..... میں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے لیکن اگر فرانس کا سرٹیفکیٹ مل جائے تو Authentic ہو جاتا ہے۔
 مجھے اتنا معلوم تھا کہ اسحاق بھائی حسین روڈ پر منتقل ہو چکے تھے اور ”نیوسما“ کریم بناتے تھے۔ میرے بھائی ریزی نے
 کی اس کریم کی ڈبیا کالیبل ڈیزائن کیا تھا لیکن میں کبھی حسین روڈ نہیں گئی تھی۔
 ”جی میں کچھ سمجھ نہیں پائی؟“

”ذکیہ میرے ساتھ جائے گی لیکن بچوں کا جانا مشکل ہے سارا Jesus & Mary کو نیونٹ میں پڑھاتا
 ہے۔ واصف کی پڑھائی کا بھی حرج ہوگا۔ سینٹ انتونی میں اسے مشکل سے داخل کرایا ہے۔“
 مجھے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ مجھ سے کیا توقع کی جا رہی ہے۔ اس وقت ذکیہ نے میری مشکل
 کی۔

”قدسیہ جی..... بات یہ ہے کہ میری والدہ بیگم روڈ پر رہتی ہے۔ وہ ان بچوں کی ذمہ داری اٹھا سکتی ہیں لیکن
 بچوں کی ذمہ داری اٹھاتے ہوئے ڈرتی ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ میرے بچوں کو اپنے پاس رکھ لیں۔ مجھے پتہ ہے کہ
 یہاں خوش رہیں گے۔ آپ کے بچے ماشاء اللہ انہیں جلد ہی ہماری جدائی بھلا دیں گے۔“
 میں ”تفکروں“ کی عادی نہیں۔ سوچے سمجھے بغیر فیصلے کرنا میری جہالت میں ہے۔ میں نے فوراً ڈٹوک
 کہا..... ”لیس یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے۔ خال صاحب آپ کے بھائی پہلے ہیں اور میرے شوہر بعد میں..... یہ
 آپ کا پہلے ہے اور میرا بعد میں..... فوراً بچوں کو چھوڑ جائیے.....“

شکر ہے ان دونوں سامان سے اتنی محبت کرنے کا رواج نہیں تھا۔ بچے اپنے مختصر سامان کے ساتھ میرے پاس
 آ گئے۔ واصف ان سب سے بڑا بھائی تھا۔ انیق اور سارا قریب قریب ہم عمر تھے اور پہلے دن سے ہی ان دونوں کی بگڑ
 چھنے لگی۔ واصف نے آتے ہی اشیر پر قبضہ جما لیا۔ وہ ہر وقت اسے اٹھائے پھرتا۔ ڈوگی گراؤنڈ میں جاتا تو چیری ساتھ
 سکول والی گراؤنڈ میں جاتا تو بچہ ڈھاک پر۔ کچھ رشتہ داروں نے سمجھا غالباً میں نے واصف کو کھلا دی بنانے کے لیے پتہ
 رکھ لیا ہے لیکن خدا جانتا ہے میری ایسی نیت نہ تھی۔ مجھ میں نیت کو چھان پھٹک کر سچا کھونا جاننے کی بھی صلاحیت پیدا
 ہو سکی۔

سارہ واصف کافی بڑے تھے۔

لیکن میں ان پانچوں کو برآمدے والے غسلخانے میں اکٹھا کر لیتی اور کل جماعتی غسل شروع ہو جاتا۔
 پانچوں کو نہلا دھلا کر ”پے رانے“ بنا کر مجھے بڑا لطف ملتا۔ کھانا ہمیشہ کی طرح باورچی خانے میں چھوٹی چوکی کے آگے
 چھوٹے چھوٹے ڈگڈگی نما موڑھے لگا کر رکھایا جاتا۔ جب سارہ اور واصف ہمارے پاس پہنچے گرمیوں کا موسم تھا ہم آگے
 میں چار پائیاں ڈال کر سویا کرتے تھے۔ ایک ہی پیڈٹل فین تھا جو خال صاحب کی چارپائی کے ساتھ لگایا جاتا۔ پھر سارہ
 اور میری چارپائی ہوتی۔ اس کے بعد نوکی اور انیس اکٹھے سوتے۔

بڑے مزے کے دن اور عیش کی راتیں تھیں۔ سارہ اور واصف کے آنے سے گھر بھرا بھرا اور خوشیوں سے نبض
 طرح جانداز ہو گیا۔ ان ہی دنوں واصف کو خاں صاحب کی اس الماری کا پتہ چل گیا جہاں وہ ریز گاری اور گھریلو
 آلات کے لیے پیسے رکھا کرتے تھے۔ یہ الماری کے کمرے میں برتنوں کی الماری کے ساتھ تھی۔ اس میں خاں صاحب
 سے آ کر اپنے پن کا پیاں کتنا میں رکھا کرتے۔ اوپر والے خانے میں ایک ڈبے میں ریز گاری اور دوسرے میں نوٹ
 کے پیسے ہوتے۔ یہ بات میں اندازے سے کہہ رہی ہوں کیونکہ میں نے اوپر والے خانے میں کنسوٹی لے کر اصل
 کچھ کچھ حاصل نہ کی..... جب بچوں کو آکس کریم گول گپے مکئی کے دانے وغیرہ لینے ہوتے تو ادھر ہاتھ صاف کیا
 جت میں نے انہیں منع کیا نہ اس کی رپورٹ ہی خاں صاحب سے کی۔

سارہ ہمارے گھر میں بیٹی کا پہلا تجربہ تھا۔ ہمیشہ سے سارہ کو بھائیوں پر ترجیح اس لیے دی جاتی کہ ایک تو وہ اکیلی
 تھی میرے اس کے انداز بڑے دل لبھانے والے تھے۔ ہنستی تو جھرنوں کی طرح۔ مذاق کرتی تو بغیر دلاویزی کے۔
 کھانے تھی تو جو کچھ اچھا لگتا بامقہی چلی جاتی۔ خاص کر اپنے بیلی اینق کی پلیٹ پر تو خاص عنایت تھی۔
 پتہ نہیں آ پا فرخندہ بھائی کی کشش میں ہمارے ہاں پہنچیں کہ انہیں پتہ چلا سارہ اور واصف ہمارے پاس ہیں اور
 کچھ کچھ کی خواہش ہم تک لے آئی۔ بہر کیف آپاجی فرخندہ اور بھائی ایوب اب خود بخود ہماری طرف کھنچے آتے۔

یہ دور واصف کے سٹیج پروڈیوسر کے کمالات کا دور تھا۔ اسے شوق تھا کہ وہ سٹیج سجائے۔ سامنے گھر کے لوگ
 بھر جاتے بن کر بیٹھے ہوں۔ وہ اپنے احکامات تلے سب کو دوڑائے، نچائے، بٹھائے۔ ایک روز جب آپا فرخندہ اور بھائی
 آئے تو واصف نے بڑی پُر لطف رچنا رچی۔ بھائی ایوب کے پیچھے سبز شنیل کا لمبا سا بادشاہوں کی طرح کپڑا لٹایا۔
 سبز شنیل پہنایا۔ آپا فرخندہ کے پیچھے بھی ایسا ہی سبز شنیل کا کپڑا مغربی بادشاہوں اور دہنوں جیسا لٹکایا۔ اسے سارہ ایشق اور
 جس اٹھا کر پیچھے پیچھے چلتے آئے۔ سامنے ناظرین میں خاں صاحب، انکل ظفر، شہاب صاحب، مفتی جی، عکسی اور
 دیگر حضرات میاں بیٹھے تھے۔ آپاجی تو ہنستی رہیں اور کچھ نہ بولیں۔ بھائی ایوب نے یہ موقع بھی ہاتھ سے نہ دیا اور
 جسے ہی تقریر اسرائیل کے خلاف کی اور سب کو بتایا کہ ہمیں میں یہودی نے کیسی تباہی مچائی۔

Demon-crazy is Democracy ان کا فیورٹ موضوع تھا۔

اس کے ساتھ بچوں کا ایک ٹرائی سائیکل تھا۔ اس نے نوکی کو سائیکل پکڑا لیا جو اس پر انہیں کو بٹھا کر گلی کی طرف
 لے گیا۔ اشیر خاں میری گود میں سو رہا تھا اس لیے وہ سائیکل کی Excitement میں شامل نہ ہو سکا۔

”قدسیہ آ پا۔“

”جی۔“

”قدسیہ آ پا۔“

”ہاں کہو۔“

”قدسیہ آ پا۔“

”بتاؤ ناں ناہید کسی نے کچھ کہا ہے؟“

”آپاجی جواد..... سجاد؟ کوئی؟“

اس نے دائیں بائیں کچھ ذومعنی ساسرہلایا۔

”اچھا میں پرے دیکھتی ہوں۔ تم ہمت کر کے کہہ ڈالو۔“

”وہ جی آپ کو پتہ ہے ابولی بیگائے ہوئے ہیں۔ اب آپا کا بھی ارادہ ہے کہ وہ ابوجی کے پاس چلی جائیں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ اس میں بسورنے کی کیا بات ہے؟ ہر بیوی کو شوہر کے پاس ہی رہنا چاہیے۔“

”اتنا آسان نہیں قد سید آپا..... میں جہلم چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔“

جہلم کا نام سن کر مجھے یاد آیا کہ اب ناہید میری شاگرد نہیں تھی۔ ناہید آپا فرخندہ کی بڑی بیٹی تو جہلم پرانے

فیکٹری والوں کی بہوتھی۔ اس کے سسر سعید احمد خاں بڑے اصولوں کے آدمی تھے اور ان کے چھوٹے بھائی رشید احمد

جن کا ناہید بیوی تھی، جہلم سے گہری محبت رکھتے تھے وہ بھلا ناہید کو کیونکر جہلم چھوڑنے کی اجازت دیتے۔

”لیکن جہلم چھوڑنے کی ضرورت کیا پیش آئی ناہید؟“

”وہ جی..... بات یہ ہے کہ جواد کے دسویں کے امتحان ہیں۔ بلال بھی ایک سال بعد دسویں کا امتحان دے

گا..... نبیلہ آپ جانتی ہیں، تھوڑی سی ایب نارٹل ہے۔ اس کی ساس، دیور اور نبیلہ کا شوہرا فضل خاں ابھی سب لوگ

36۔ جی میں ہیں۔ نہ نبیلہ گھرداری کر سکتی ہے نہ بے بی..... پھر بتائیے آپا جی کس کے پاس 36۔ جی کا نظام چھوڑ

جائیں..... سجاد اور عمر تو خیر..... اپنے فیصلے کر سکتے ہیں لیکن جیونی رمضان اور یہ باقی سب ان سب کی ذمہ داری

اٹھائے؟“

ڈاکٹر ایوب احمد خاں اور ان کے فیصلوں کو سمجھنے کے لیے چند لمحوں کے لیے یہیں توقف کیجیے۔ بڑے لوگوں کی

طرح وہ فیصلہ پہلے کرتے تھے اور عمل کی دقتوں پر فکر کیے بغیر نتائج بعد میں بھگتتے تھے۔

ڈاکٹر ایوب بڑے سرجن تھے۔ جب قیام پاکستان سے بہت پہلے انہوں نے ڈاکٹر محمد خاں کی سب سے بہتر

بیٹی فرخندہ سے شادی کی تو اس دھوم دھام کی شادی کا چرچا دیر تک خاندان میں رہا کیونکہ اس شادی پر لاہور سے

Stiffls ہوٹل سے پیسٹری منگوائی گئی تھی۔ یہ گویا سکھوں کے اکثریتی علاقے میں کلچر ڈ اور پڑھے لکھے ہونے کا آئینہ

ثبوت تھا۔

لیکن اس فیصلے کے کچھ ہی عرصہ بعد ڈاکٹر ایوب احمد خاں میوہ ہسپتال کے ہو کر رہ گئے۔ وہ اپنی ڈاکٹری چمکا رہے

تھے۔ اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ رہے تھے۔ بیوی کی دلجوئی کے لیے وہ اپنی والدہ کو ذمہ داری سونپ کر بے فکر تھے۔ انہیں

علم نہ تھا کہ ڈاکٹر محمد خاں کی سب سے بڑی لاڈلی بیٹی فرخندہ جس کی خاطر باباجی نے چار خادمائیں رکھی تھیں، جس کے

چہرے پر ہلکا ساداغ پڑ گیا تو باباجی نے فیسرین ایجاد کر ڈالی۔ یہ بیٹی جب روایتی ساس کے پلے پڑی تو سارا لاڈ لاپن

پر دھرا رہ گیا۔ لکڑیوں کا چولہا جھونکنا، گوبر کی پاتھیاں لگانا، سسرالی رشتوں کو بہ عزت نبھانا اس لاڈلی کے لیے ماؤنت

ایورسٹ پر چڑھنے کے مترادف تھا۔ اس ساری بدسلوکی کے بعد جب ڈاکٹر ایوب تھکے ہارے گھر پہنچتے تو چندری ساس کی

طرح ان کی والدہ کہتیں۔

”سہمی لاڈلی نے مجھے صبح کا دودھ تک نہیں دیا..... ناشتہ تو یہ کیا دیتی؟“

یوب بھائی دن بھر کی تھکاوٹ کو Aggression میں بدل دیتے۔ پھر آپا فرخندہ کو تھپڑ تو ایک طرف، لاتوں سے بھی نواز دیا جاتا۔

یہ دوسری جنگ عظیم کا واقعہ ہے۔ ایک روز قبائلی بھائی مکتسر سے اپنی بہن کا حال چال پوچھنے 36۔ جی کے ساتھ تو انہوں نے ڈاکٹر ایوب کی مار پیٹ کا ڈراپ سین اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ بس پھر کیا تھا لاڈلی بہن کا یہ کہہ کر وہ گھر لوٹے اور بھائیوں کو اس بات پر اکسایا کہ ہر بھائی کے ہاتھ میں ہاکی ہو اور وہ اسی بے دردی سے مارے۔ گویا جس طرح کا منظر وہ دیکھ کر آئے ہیں۔ سارے بھائیوں کو یہ گیم اچھی لگی کیونکہ اس سے پہلے وہ سب گولف سے ناٹ گولف کی کھیل میں جہارت حاصل کر چکے تھے۔

مکتسر جیسے گاؤں میں جہاں سکھ سرداروں کا راج تھا باباجی محمد خاں کے بیٹوں نے باباجی سے بغاوت کے سلسلے میں ”پنگا“ ایجاد کیا تھا۔ باباجی خوفزدہ آدمی تھے۔ وہ بچوں کو سمیٹ ساٹ کر رکھنا چاہتے تھے۔ ذرا سی شرارت پر بھائی پھڑکی سے مارتے اور اماں جی کے سامنے ادھ موا کر دیتے۔ وہ تو آف تک نہ کر سکتیں لیکن نانی اماں سچ پچاؤ کے تنازعہ میں مدافعت کرتیں۔

”چھوڑوئے محمد خاں اللہ کا واسطہ تھم جا..... بہت ہو گئی۔“

”اوپے چندر یا اقبال تو ہی ہار مان لے..... معافی مانگ لو کھکھو..... پیر پکڑ لے باپ کے۔ ججو..... سن تو سہمی محمد ججو بھئیڑیا۔“

نانی کی منتوں کا جامین پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ نہ باباجی کا غصہ اترتا نہ نواسے معافی مانگتے بلکہ ہر مار کے بعد شرارت بڑھتی اور انوکھے پن میں اضافہ ہو جاتا۔ بائی IQ کے نیچے تھے۔ تخلیقی کارکردگی ہر وقت راہ بھاتی رہتی۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ سب سے ناک پر کبھی نہ بیٹھنے دیتے۔ باقی بھائی تو اپنے طور پر نئی شرارتیں سوچتے ہی تھے لیکن اسحاق بھائی ماسٹر ماسٹرنڈ کے علمی شورے اور پوناشیم کا آمیزہ بنا کر اس کا گھریلو بم بنانے میں ماہر تھے۔ بجلی کے مین سپلائی کی تاروں پر اپنی تار لٹکا کر بجلی چرانے کی ریت بھی ان ہی کی ایجاد تھی۔

لیکن سب سے بڑا کام انہوں نے ناٹ گالف organize کر کے کیا۔ رات کے وقت سارے بچے اپنی گولف کے لے کر بستروں سے چوری چوری کھسکتے۔ باباجی دن بھر کے تھکے ہارے بے سدھ خرائے لیتے رہ جاتے۔ ججو بھائی اور گالف ٹیم کے کھلے میدان میں گھر سے دوڑ گھوڑوں پر جاتے۔ سارا دن گیند کو مٹی کے تیل میں بھگو کر رات کو اسے آگ لگا دی جاتی۔ اب ہاکی سنک سے گھوڑوں پر سوار کھلاڑی گالف کھیلتے۔

یہ پیرا محض اعادے کے لیے رقم کیا کیونکہ مکتسر کی زندگی کے واقعات خود اشفاق صاحب اپنے افسانے ”پنگا“ میں لکھ چکے ہیں۔ میں تو فقط اس قدر بیان کرنا چاہتی ہوں کہ سب بھائی اپنی اپنی ہاکی لے کر 36۔ جی پہنچے حتیٰ کہ جمو آفتاب بھائی بھی پیچھے پیچھے رنجیدہ خاطر دل برداشتہ چلے آئے لیکن آپا فرخندہ کو اپنے شوہر سے بے پناہ محبت تھی۔

”بھائی! خدا کے لیے ایک بار اپنے بھائی ایوب کو معاف کر دو۔“

”کردیں گے لیکن ایک شرط پر۔“

”کیا شرط.... کیسی شرط؟“

”پہلے آپ کو شرط ماننی ہوگی ہماری۔“

بہت لے دے کے بعد آپا نے وعدہ کر لیا اور بھائیوں نے یہ شرط پیش کی کہ وہ اور بھائی ایوب ملکر آج کل کے آپا ب وعدہ کر چکنے پر مجبور تھیں۔

جو لوگ خاندانی نظام کے پروردہ ہوں جیسا کہ خاں صاحب تھے انہیں بچوں کے ساتھ رہنے کا ایک خاص طریقہ یاد دہنگ آتا ہے۔ وہ بچوں کو کبھی خصوصی توجہ نہیں دیتے۔ کبھی ان کی سا لگرہ نہیں مناتے۔ ان کی تفریح کا کوئی حکم نہیں جاتا۔ امتحانوں پر توجہ دینا تو درکنار اگر بچے فرسٹ بھی آجائیں تو کسی کے منہ سے مبارک باد کا لفظ نہیں نکلتا۔ بچے کی طرح Matter of fact ہوتے ہیں۔ جس قدر توجہ فرد اپنے آپ کو دیتا ہے اتنی ہی توجہ بچے کو ملتی ہے اور اپنے خاندانی نظام سر سے چڑھتا ہے۔

جب اسحاق بھائی ایئر فورس چھوڑ کر مزنگ روڈ منتقل ہوئے تو وہ صحن سے متصل بڑے کمرے میں رہتے تھے۔ فیسرین کریم کو سنبھالنے بہتر بنانے اور مارکیٹ کرنے کے خواب ساتھ لائے تھے۔ جو باباجی محمد خاں اور ان کی دو بیٹیوں کی باعث پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔

ایک عدد بنیادی غلطی ذکیہ جی سے بھی ہوئی۔ گو یہ غلطی نہ تھی صرف نظریے کا اختلاف تھا۔ ذکیہ جی نے جوش و خروش سے سارہ کی سا لگرہ کو جشن صورت منا ڈالا۔ ہم دونوں بھی خراماں خراماں پیچھے۔ گو خاں صاحب خود سب سے انہیں علم تھا کہ سا لگرہ منانا باباجی اور اماں جی کی روایات سے کھلم کھلا انحراف ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح شامل بھی تھے شمولیت سے باہر بھی تھے کیونکہ انہیں دونوں پارٹیوں کے دل کا خیال تھا۔ خاں صاحب کے دل کی یہی پھانس ان کے فیصلے پر حاوی رہی.... وہ عموماً دو ایسی پارٹیوں کی طرف دار رہے جن کا آپس میں نظریاتی اختلاف تھا۔

اماں جی اس دعوت میں چند لہجوں کے لیے آئیں۔ پھر وادف کے سر پر ہاتھ پھیر کر غائب ہو گئیں۔ باباجی پارٹی کے وقت دفتر میں چلے گئے اور پھر اندر نہ آئے۔ ہم دونوں نے کچھ کھلایا پیا، کچھ ہراساں ہوئے، کچھ پینے لگے، کچھ کیک کتنے پر تالیاں بجائیں۔ اماں جی سے رخصت چاہی اور ملول سے ججو بھائی کو چھوڑ کر آ گئے۔ اس وقت ججو جزیشن خصوصی طور پر آمريت پسند تھی۔ وہ چھوٹی چھوٹی معصوم خوشیوں کے لیے بھی راستہ دینے کو تیار نہ تھی۔ درجہ مضبوط تھی کہ بغاوت کے بغیر آزادی کی راہ ملنا ناممکن تھی۔

ابھی تک جہاں خاندان اکٹھے رہنے کے چکر میں ہیں اور جہاں خاندانی نظام چل رہا ہے یہی کیفیت ہے آزادی بغیر بغاوت کے نہیں ملتی اور ہر بغاوت سے روایات کی کچھ برجیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔ سب سے زیادہ کھسک درمیانے درجے کے لوگوں کا ہوتا ہے جن قوموں میں درمیانہ طبقہ خوشحال، مطمئن اور پروقار ہوتا ہے وہ بڑی ترقی کرتے ہیں اور خوشحالی سے ہم کنار رہتی ہیں۔

مشکل یہ ہے کہ ہمارے درمیانے طبقے کو اوپر والے طبقے نے شیر آیا، شیر بن کر خوفزدہ کر رکھا ہے۔ اس لیے

تھی خالم نہیں ہوتیں جس قدر امیر لوگوں سے مستعار لیے ہوئے خواب انہیں پڑمردہ کرتے ہیں۔ وہ بڑی کاروں
 سست سجے سجائے بنگلوں، انگریزی سکولوں میں بچوں کو تعلیم دلانے، بیرون ملک تفریح کی خاطر سیرسپائے بازاروں
 کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ قرضوں کے باوجود اوپر چڑھنا تو ممکن نہیں ہوتا۔ ہاں اپرٹل کلاس
 Frustration کے ہاتھوں جلد ہی لوئرٹل کلاس میں شامل ہو جاتی ہے۔ Process ہر خاندان میں بقدر
 A دیکھا جاسکتا ہے۔

مجھے اور خاں صاحب کو اس تنزلی سے نجات کچھ تو اوپر والے کی مہربانی سے ملی، دوسرے ہم دونوں اس خواب
 سے بچنے کے لیے بی بی الخال کچھ اور درکار نہیں اور ہم شیخی خورے بڑے لوگ ہیں۔ شیخی بھی کبھی کبھی بڑی مددگار ثابت ہوتی
 ہے کاموں سے بچانے میں ڈھال کی طرح کام آتی ہے۔ ہم سمن آباد میں رہتے تھے۔ ٹڈل کلاسیئے تھے لیکن شیخی
 کے بچائے رکھا۔

اصف اور سارہ کے اضافے کے ساتھ ان دنوں ایک اور خوبصورت واقعہ طارق بن افتخار تھا۔ ڈیڈی جی کا سب
 دنوں سنٹرل ماڈل سکول میں پڑھتا تھا۔ یہ سکول گورنمنٹ کالج کے نزدیک ایک اچھا تعلیمی ادارہ تھا۔ ان
 کے بچوں کو بچوں کی تعلیم کا اس قدر خوف نہ تھا، آپی جی ہر وقت اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے پریشان رہتی تھیں۔ پتہ
 یہ تھا کہ ڈیڈی جی کی وجہ سے تھا جنہوں نے بی اے کا امتحان نہ دیا۔ یا پھر وہ سمجھتی تھیں کہ تعلیم ہی وہ ہتھیار ہے جس
 سے انسان معاشرے میں مقام پیدا نہیں کر سکتا۔

وہ بڑے زور و شور سے طارق، حارث، لبنی کو پڑھاتیں۔ مارنے، جھڑکنے اور گھونے رسید کرنے سے بھی باز نہ
 آتی جی خود بھی بچوں کو سختی اور تنظیم سے پڑھاتیں اور طارق اور حارث کو باقاعدگی سے میری خالہ کے پاس
 میں بھیجا کرتیں۔ گویا میری خالہ فیروزہ کا مزاج بڑا ہی نرم تھا اور وہ بڑی سے بڑی غلطی کا جواز خود ہی نکالنے کی
 تھیں۔

طارق کو جب کبھی آپی جی سودا لینے کے لیے بھیجا کرتیں تو عزیز بی طارق تھیلا اور پیسے لے کر میرے پاس
 ہم دونوں مل کر ”ناٹم“ رسالے کو بنیاد بنا کر بہت سی باتیں کرتے۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں وہ مضامین کو خوب سمجھتا تھا
 ہر دو دن تبصرے کی استعداد رکھتا تھا۔

”میں یہ رسالہ گھر لے جاؤں۔“

”ضرور لے جاؤ سکو۔“

”کل پڑھ کر آؤں گا۔“

”لیکن پہلے ہوم ورک کر لینا۔“ میں بزرگوں والی نصیحت کرتی۔

”ضرور..... اُس کی آپ فکر نہ کریں..... میں خوب پڑھوں گا قدسیہ آپا..... لائق بنوں گا.....“

طارق بن افتخار سے تھوڑا سا تعارف اس مقام پر ضروری لگتا ہے۔

جب میری شادی ہوئی تھی تو ٹوٹے پھوٹے رواج جو اس وقت ممکن تھے ان میں سے ایک رواج دلہن کی گود میں

بچہ بٹھانے کا بھی ہوا کرتا تھا۔ اس سے مراد یہ ہوتی کہ اللہ جلد دلہن کو اولاد مزینہ عطا فرمائے۔ میری گود میں ایک بڑا سا تارق بٹھایا گیا..... اور تب ہی سے ہم نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا اور ابھی تک وہ کسی نئے شخص سے ہمارا تعارف کراتا ہے۔ حیثیت سے کراتا ہے۔

واقعی طارق بن افتخار نے اپنا ارادہ سچ کر دکھایا۔ خوب محنت کی۔ ہڈیوں کا ڈاکٹر بنا۔ ان دنوں وہ شکاگو میں ایک بہت بڑا سرجن ہے۔ ملک اور خاندان کا نام روشن کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ ڈاکٹری کے علاوہ اس کے دو بچے مشغول ہیں۔ ٹکٹیں جمع کرنا اور تصویریں کھینچنا۔ اس کے پاس بھانت بھانت کے مختلف ممالک کے نئے اور پرانے ان ٹکٹوں کا کٹ ہیں۔ وہ اپنے پیاروں کو یہ ٹکٹیں پریت سے دکھاتا ہے۔ یہ لگ بات ہے کہ دیکھنے والے پر عموماً ان ٹکٹوں کو دیکھ کر خوشی وارد ہوتی ہے نہ استعجاب۔ یہی اس جہان رنگ و بو کی بوالغی اور نیرنگی ہے۔ ہم جس مشغلے میں خود دلچسپی نہیں ہمارے لیے بے کار اور تفضیح اوقات ہے۔ جس شخص کو ٹینس کا شوق نہیں وہ نہ ٹینس کے کھلاڑیوں کو جانتا ہے نہ اس کی رموز ہی سمجھتا ہے۔ جو ہسٹری کا دلدادہ نہیں اس کے لیے پرانے کھنڈر ماضی کی داستان بن کر نہیں ابھرتے..... اللہ نے ساری مخلوق کے لیے ان گنت شوق مشغول اور مصروفیات کی رنگ پچکاری ہر وقت جاری کر رکھی ہے۔ جو جس رنگ میں جاتا ہے اس کے لیے بس وہی حقیقت زندہ رہ جاتی ہے باقی ساری مخلوق اور شوق بے کار ہو جاتے ہیں۔ ٹکٹوں کے علاوہ تصویریں کھینچنا اس کا دوسرا محبوب مشغلہ ہے۔

اس میں البتہ احباب دلچسپی لیتے ہیں کیونکہ اپنی تصویر دیکھ کر ہر انسان کی انا چھن اٹھا کر دل ہی دل میں کہتی ہے: ”کیوں دیکھا پھر۔ ہے کوئی ہم سا تو سامنے آئے۔“

جو چادو آئینے میں ہے وہی سحر تصویر میں بھی ہے۔ انسان اپنی شبیہ سے متاثر ہو کر ایک عجیب قسم کے سرور میں جاتا ہے۔ آپ نے خاں صاحب کی کتابوں کے پچھلے سرورق پر ایک تصویر دیکھی ہوگی جس میں خاں صاحب نے اپنے اور میں نے سفید لباس پہن رکھا ہے۔ یہ تصویر شکاگو میں طارق نے بڑی محبت سے کھینچی تھی۔ اس کے علاوہ دو اور تصویریں بھی سکو نے کھینچی ہیں جو مختلف ستابوں کے پشتوں پر نظر آتی ہیں اور جنہیں قارئین نے بہت پسند کیا ہے۔

میڈیکل کالج کی تعلیم کے دوران ککو کو شاید اس کی ہم جماعت لڑکیوں نے پسند کیا ہو لیکن طارق بن افتخار روایت پسند پٹھان بچہ تھا۔ اس نے اپنی پچازاد و رواء سے محبت کی اور اسی سے شادی کی۔ ورواء اقبال بھائی کی بیٹی منفر وڑکی تھی۔ اس نے ہمیشہ ایسے انفرادی فیصلے کیے جو حیران کن بھی تھے اور فرحت انگیز بھی۔ جب اس کی شادی ہوئی تو ڈیڈی جی اور آپی جی اس شادی کے حق میں نہ تھے لیکن ورواء کے ارادے کے آگے کسی کی نہ چلی۔ شادی ہوئی اور خجہ نہی۔

اب ورواء شکاگو کے اس علاقے میں رہائش پذیر ہے جو ڈاکٹروں کی ایک امیر بستی ہے۔ یہاں ورواء خجہ پختہ ہے۔ اس کی جواں سال بیٹی کو بھی حجاب پہنتے ہوئے کئی سال گزر گئے ہیں۔ اس کے گھر کا ماحول سادہ اور سادہ اقدار کا حامل ہے۔ میاں بیوی سچ کر آئے ہیں۔ ایک مسجد بنوادی ہے اور باقاعدگی سے دینی کاموں میں مصروف ہیں۔ ان کا بیٹا ارسلان وکیل ہے اور ٹی وی پر ایک ایسا پروگرام کرتا ہے جو امریکی لوگوں کو اسلام کی اقدار لبرل تعلیمات

کے مسائل سمجھاتا ہے۔

گہری تبدیلی میں جو طارق کی زندگی میں رونما ہوئی اور جو ارسلان، سویرا اور سلطان میں روح بن کر رواں رہی اسے اس تبدیلی کا طارق کے فیصلوں سے کوئی تعلق نہیں۔ خوبصورت سی داڑھی رکھ لینے والا سرجن اپنے کام اور ذاتی زندگی میں وہ دائیں بائیں جھانکنے کا عادی نہیں۔

جب ورداء ککو کے ساتھ امریکہ پہنچی تو غریبی کا سفر تھا۔ اس نے گھر پر رہ کر سلائی کی۔ روپیہ بنایا بچایا اور عقل مند بن گیا۔ غریبی میں عموماً عقل مثبت نارنج بن جایا کرتی ہے۔ ورداء کے سلیقے نے ککو کو ایف آر سی ایس کرنے کی صلاح دے دی اور پھر دھیرے دھیرے اپنی منزل تک پہنچنے کا ڈھب سکھایا۔ جب ککو سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، تو ورداء اس کی حالت بے فکر اور آزاد تھی۔ جب طارق کو اس کے آپریشنوں کی داد ملنے لگی۔ نرسوں کے فون، نوجوان بیمار اور بیمارداروں کے بلاتے بجاتے میں بھیگے ہوئے ہڈی توڑ ہڈی جوڑ ڈاکٹر سے ملاقات کی۔ آرزو سے لبریز فون آنے لگے۔ ککو نے کچھ اور ہو گیا۔ ایسے فون سن کر ککو کی اتنا، اس کے نفس کو خاص قسم کا Boost ملتا۔ وہ اوپر والی منزل سے شعر کہنے لگا۔ ککو نے سنیے اترتا.... ورداء چوکنی ہو جاتی.... عورت کو عموماً اس وقت شوہر کی طرف سے بے اطمینانی زیادہ ہلتی ہے۔ شہر میں دولت کی ریل پیل ہونے لگے۔ کہیں اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجتی ہے۔ اندرا پلیس کان میں شک کی آواز بولنے لگتا ہے۔ اُسے لاشعوری طور پر احساس ہوتا ہے اب تو میرا شوہر دوسری بیوی بھی afford کر سکتا ہے رکھیل کی حالت میں سے ہے۔ گرل فرینڈز تو روزمرہ ہیں ہی۔

حالانکہ نہ شک کی کوئی وجہ تھی نہ امکانات.... ککو پٹھان بچہ روایت پسند تھا۔ میں آپ کو پہلے بتا چکی ہوں خاں صاحب کے خاندان میں قیام کے بعد ہوشیار پور تک کے نوجوان ابھرے تھے۔ ایک وہ تھے جنہوں نے روایت کی ویسی ہی بات کی جیسے ان کے آباؤ اجداد ہوشیار پور تک کرتے آئے تھے۔ اشفاق احمد صاحب، بریگیڈیئر اشتیاق، جاوید طارق اور سید جواد خالق وہ بغاوتی سپاہی تھے جن کی آنکھیں کسی طرح کھل گئی تھیں اور انہیں اپنے خاندان کے علاوہ بھی کچھ دیکھنے کا تھا۔ ککو مغرب میں رہنے کے باوجود ابھی تک مشرق سے وابستہ تھا۔ اس کے دل میں ماں کی محبت تازہ جیسے کی جیسی رہی تھی۔ اس کا دھیان اپنے مرکز سے پرے نہیں نہ جاتا۔

لیکن ورداء کے کان میں شک کی بانسری جب ایک بار بجنے لگی تو اس کی پیدا کردہ کھلبلی سے فرار نہیں نہ تھا۔ وہ پہلے کی عورت ہے۔ اس نے جلد اس کا حل تلاش کر لیا۔ اسے سوائے مذہب کے اور نہیں پناہ نظر نہ آئی۔ جینز اور بنیان باندھ بیگنی۔ حجاب پردہ پوشی اور دور باش کے سلسلے میں پہنا گیا۔ نمازوں کی پابندی، مسجد سے رابطہ، درس کی کلاسوں میں شرکت، اللہ کی حضوری میں عاجزی، ورداء کے شکوک نے عجب مثبت رنگ اختیار کر لیا۔

عجیب سی بات ہے۔

انسان عام طور پر جسمانی ساخت کے علاوہ بیرونی طور پر بہت کم بدلا کرتا ہے۔

اصلی تبدیلی اس کے اندر کہیں آتی ہے۔ وہ نئے راستوں، فیصلوں، ارادوں کی وجہ سے پہلے اندر بدلتا ہے پھر اس بدلتے ہوئے اندر میں تبدیلی در آتی ہے۔

کریسنٹ سکول میں پڑھنے والے طارق کے علاوہ اُن دنوں ہمارے رحمت خانے میں ایک اور طالب قسم کا نوجوان بھی آیا کرتا تھا۔ ابھی اس کے پاس ایک سائیکل تھی۔ وہ پڑھائی سے فارغ نہ ہوا تھا اور ریڈیو سٹیشن پر یہ کچھ طاہر اور خاں صاحب کے ساتھ جب موقع مل جاتا، صداکاری کرتا۔

اس نوجوان کا نام نعیم طاہر تھا۔

ابھی آرٹس کونسل میں کرتا دھرتا ہونے کا اعزاز اسے حاصل نہ تھا۔ ابھی P.N.C.A. اسلام آباد کی کوئی سگ نہ تھی..... یہ ساری شناختیں تو مستقبل کے پردوں میں چھپی ہوئی اس کی منتظر تھیں لیکن ایک بات ضرور تھی، نعیم طاہر آنکھوں میں اس کے رویے میں کچھ کرنے کی آرزو جھلکتی تھی۔ وہ بڑی انکساری سے ہمارے گھر آتا اور کبھی اپنے خوب ذکر ہم سے نہ کرتا۔

اس کمرے میں جہاں نانا آ کر قیام کرتی تھیں اور جہاں جمیلہ ہاشمی رہ چکی تھیں، وہ آ کر بیٹھ جاتا۔ عجیب ہے کہ اس کے آنے پر میرے دونوں بڑے بچے اینٹ اور انیس آتش دان میں آ کر بیٹھ جاتے اور ہماری باتیں خاموشی سے سنتے رہتے۔ نہ وہ توجہ کے طالب تھے نہ کسی کو انہیں توجہ دینے کا خیال آتا۔ کھانے کا وقت ہوتا تو نعیم کو لے کر خاں صاحب باورچی خانے میں آ جاتے۔ بے حد سادہ کھانے محبت سے کھائے اور کھلائے جاتے اور اسی لیے ان میں وہ لذت جاتی جو مدتوں اطراف کو یاد رہتی۔

نعیم طاہر کے ساتھ ہی ایک اور یاد بھی رہتی چلی آتی ہے۔

اور وہ ہے ایلسا باؤسانی۔

جب خاں صاحب فرار ہو کر روم پینچے اور ISMEO میں اردو پڑھانے لگے تو ان دنوں اسکندر باؤسانی نے اطالوی میں Alessandro Bausani کہتے تھے ان کے ساتھ یونیورسٹی میں فارسی کے استاد تھے۔ باؤسانی کا طور پر زبانی سیکھنے کا پکا تھا۔ وہ اقبال پر کافی بڑی اتھارٹی تھا۔ مشرقی علوم میں اس کی دور رس نگاہ تنقیدی مقالوں اور اس کی شکل میں رونما ہونے لگی تھی۔

لیکن بظاہر باؤسانی نہایت سادہ طبیعت کا مالک تھا۔ وہ اطالوی لوگوں کی طرح دونوں بازو کھول کر ہنسنے سے کہتا: "ماما میا، mama mia" تو یقین آ جاتا کہ واقعی وہ کچھ نہیں جانتا۔ بھاری جسم پر بچھے بچھے رنگوں کے کپڑے ملبوس باؤسانی کو ہر وقت ایلسا کی ضرورت رہتی۔ یوں لگتا جیسے وہ ایلسا کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتا۔ اگر ایلسا پاس ہوتی اور باؤسانی آ کر مجبور صورت اسے دیکھتا تو ایلسا سب کچھ چھوڑ کر بھاگتی۔

ایلسا اطالوی عورتوں کی طرح خوبصورت اور دلکش تھی۔ پتی دھرم اس پر ختم تھا۔ باؤسانی کی ضروریات آگے اس کی اپنی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اُسے رب نے باؤسانی کی بیساکھی بنا کر بھیجا تھا۔ ایلسا میں محبت والی روح تھی۔ وہ جس سے ملتی بڑی جلدی گھل جاتی۔ بچوں سے بھی اس کا یہی رویہ تھا۔

”نوکی صاحب کھانا کھا لیا؟“

”کیسی صاحب آپ کیا لکھ رہا ہے؟“

ہوئی پھوٹی اردو میں بچوں سے رابطہ قائم کر لیتی۔ جب خاں صاحب گھر ہوتے تو یہ تینوں فر فر اطالوی بولتے،
میں نے اچک کر ہاتھوں کو فعال کر کے آنکھوں کے اشاروں سے گفتگو میں جان ڈالتے رہتے۔ ان کی اس
میں ہم خاموش ناظرین کی طرح شامل رہتے۔

تمہارا شوہر بہت اچھی اطالوی بولتا ہے قدسیہ..... مشکل یہ ہے کہ اس کی اطالوی خالص روم کی ہے اور میں
Dialysis کی عورت ہوں۔ مجھے احساس کمتری ہوتا ہے! Bravo۔“

ایک روز نعیم طاہر نے ایلسا اور باؤسانی کے ساتھ ہماری دعوت کی۔ مجھے نعیم اور یاسمین کے گھر اس سے پہلے
کا تعلق نہ ہوا تھا۔ نعیم اور یاسمین کا گھر عجائب گھر سے مختلف نہ تھا۔ یہاں جگہ جگہ پرانے تھال، ظروف، ٹوکریاں،
تین بچے تھے۔ جلد ہی خاں صاحب اور باؤسانی نے کسی کی دال گلنے نہ دی اور روم کی باتوں سے شام کو سجا دیا۔
ہم تانگے پر نعیم طاہر کے گھر گئے تھے۔ میں اور ایلسا تانگے کے سامنے اور باؤسانی اور خاں صاحب پچھلی سیٹ
تھے جس وقت سمن آباد کے مین بازار میں تانگہ پہنچا، ایلسا پر ہنسنے کا دورہ پڑ گیا۔ اس کے کان کے کویں سرخ ہو گئیں۔
سمن سے آنسو جاری ہو گئے۔

”کیا بات ہوئی ایلسا۔“ میں نے سوال کیا۔

”یہ دیوانی ہے..... کبھی کبھی اسی طرح ہنسی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔“

بڑی دیر بعد جب تانگہ بازار سے گزر چکا اور جوان صاحب اسے کئی بار حیرانی سے دیکھ چکے تو ایلسا نے بتایا کہ
سے کسی جگ پر ہنسی آرہی تھی۔

”جگ صاحب نے پھر کہا.....“

میں آج تک سمجھ نہیں پائی کہ وہ کسی انسان کو جگ کہہ کر پکار رہی تھی کہ کسی ظروف کے پرانے پن پر یوں خندہ
ہنسے۔ بس اتنی بات واضح تھی کہ واقعی ایلسا میں بچوں جیسی معصومیت تھی اور وہ اسی معصومیت کے طفیل ہر مقام پر کسی بھی
تک طرف اندوز ہونے کی قوت رکھتی تھی۔

باؤسانی اور ایلسا میں ایک اور بڑی خوبی ان کی Sharing تھی۔ وہ جو کچھ ہو رہا ہوتا اس میں بڑی بے ساختگی
ہوگی کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ میرا خیال ہے کہ Ideas are not for ever لیکن جو لوگ خیال کو لباس کی طرح
پن نہیں کرتے وہ زندگی کے کھیل کو انجوائے نہیں کر سکتے۔ لباس پہن کر بڑے قد آور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر
دیکھتے تو لانا چاہیے کہ لباس کارنگ فیشن تراش خراش کیا مجھ پر چچی کہ نہیں۔ کیا رنگ میری طبیعت کے مطابق ہے؟ ہر ماحول،
سین اور حالات اپنے ساتھ کچھ خیالات لے کر آتے ہیں۔ اگر خیال مثبت ہو اور اس کا ٹکراؤ آپ کے مسلک یا اقدار سے
ہو تو ایسے Idea کو ضرور آزما کر دیکھنا چاہیے۔ اس سے آپ کے علم میں اضافہ ہو رہا ہوتا ہے..... ”سیروانی الارض“ ایسا
ایک مثبت خیال ہے۔ سفر میں آپ کو کوئی انسان، جگہیں، کچھ اور انداز زیست کی بوقلمونیاں ملتی ہیں۔ آپ کسی بھی سفر پر
سننے کے شوق میں جائیں گے تو آپ کو پورا مکتب ملے گا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کلاس بدلتی رہتی ہے۔ آدمی ہمیشہ تختی ہی
سے کھتا رہتا۔ تختی سے پن، پن سے بال پوائنٹ پھر مہنگی سیاہیوں سے لکھنے والے مہنگے پن..... کبھی فقط پنسل کا سہارا۔

ڈرامے سے ہمارا تعلق پرانا ہے۔

ایک روز بیٹھے بیٹھے خیال آیا کہ کچھ ہیرا رانچا قسم کا کھیل ہونا چاہیے۔ صدیقہ اور جاوید بھی آئے تھے۔ ایسا کوہیر جیسا لباس پہنایا۔ ہاتھ میں شیشے کی جڑی پتھری پکڑائی۔ باؤ سانی کو رانچا بنایا..... صدیقہ نے کتھی دھارا۔ جاوید کچھ مانا کچھ نہ مانا۔ لڈی ڈالنے والوں کی طرح گلے میں کیسری دوپٹہ ڈال کر مہینوال بن گیا۔

آنگن کے پچھلے کونے میں تخت پوش بچھایا گیا۔ اس پر ایسا رانچے کو پنکھا جھلنے لگی۔ رانچا صاحب اترا اور بانسری پر غلط سلط سر بجانے لگے۔ اس دن کی یاد بڑی خوبصورت تصویروں میں محفوظ کر لی گئی۔

یہ تصویر بھی عجیب چیز ہے؟ دراصل جس شخص نے کیمرا ایجاد کیا، اسے ”یاد“ کو محفوظ کرنے کا خط ہوگا۔ تصویر سے ہرگز رہائی نہیں پاسکتا۔ بڑھاپے میں جوانی کی تصویریں دیکھنا، جوانی میں بچپن کی تصویریں دیکھ کر گھٹن چھڑی محبوبہ کی تصویر دیکھ کر پرانے عشق کی سولی پر لٹکنا، پرانے دشمن کی تصویر دیکھ کر واقعے کی اہمیت پر سوچنا، بوڑھے باپ، بہن بھائی دوست سب کی تصویروں سے تعلق خاطر کی ہلکی ہلکی پھواردل پر پڑتی رہتی ہے۔ تصویروں کا اثر اتنا ہے جیسا ہوتا ہے اور شاید اسی وجہ سے فلم میڈیا میں اتنی کشش ہے۔

تصویروں سے خیال آیا کہ ہماری زندگی میں عبدالرحمن میاں کیمبرے کی وجہ سے داخل ہوا۔ اسے تصویر بنانے کا جنون تھا اور ہم چوری چوری اس پبلسٹی سے خوش ہوتے تھے جو ہمیں ان تصویروں سے ملتی تھی۔

عبدالرحمن میاں منگلا میں انجینئر تھا۔ ان دنوں منگلا ڈیم زیر تعمیر تھا اور رحمن میاں زمین کھودنا اور اندر سے والے چشمے کو بیرون لاکر لوگوں کو پانیوں سے میراب کرنے کا فن جانتا تھا۔ پتہ نہیں خاں صاحب کی رحمن سے کس طرح کیسے ملاقات ہوئی۔ رحمن عام طور پر ہمارے گھر شام کے وقت آتا۔ ایک تخت پوش باہر والے برآمدے میں پڑا ہوا کبھی یہ بوسیدہ تخت پوش پچھلے آنگن میں چلا جاتا۔ کبھی اس کو اوپر چھت پر لے جاتے۔ کبھی یہ باہر گیٹ کے سامنے ڈال دیا جاتا۔ اچھے دنوں میں جب یہ اصلی مالکوں کے پاس ہوگا تو اس پر موٹی سی پلاسٹک سیٹ لگی ہوگی، لیکن ایسا حال کہیں ایک نکلی کہیں آدھی رکھا رہتا تھا۔

رحمن جب بھی منگلا سے آتا اسی تخت پوش پر سویا رہتا۔ رحمن کا پروفیشن تو انجینئرنگ تھا، لیکن اس کی فوٹو گرافی اور ادب تھی۔ تصویریں تو وہ بہت اعلیٰ درجے کی کھینچتا ہی تھا لیکن کہانی کہنے میں بھی اسے کمال حاصل تھا۔ پہلی کہانی ”نور انے کا پھول“ پہلی مرتبہ ”داستان گو“ میں چھپی اور اس نے قارئین سے بہت داد پائی۔ رحمن کہتے شاید..... شاید بڑا نام حاصل کرتا لیکن ہر تخلیق کار کی طرح اس کے اندر تنہائی نے جو فور چارکھا تھا، اس کے نتیجے میں لے کر پہلے تریا کے در پر پہنچا۔ تریا اس سے اس درجہ متاثر تھی کہ اگر کوئی سواری نہ ملتی تو دودھ والے کے ریزر سے رحمن سے ملنے چلی آتی، لیکن یہ حالات تب واقع ہوئے جب ہم 121- سی میں تھے۔

تریا کی شادی رحمن سے نبھ نہ سکی۔

رحمن کے اندر کا فنکار پتہ نہیں کیوں دم سادھ کے چپ ہو گیا اور سوسائٹی میں اس کی پہچان اس کی دوسری شادی بشری رحمن بن گئی۔ جوں جوں بشری پھیلتی گئی رحمن سکڑتا گیا۔ 2007ء میں یا تو رحمن تاشقند میں اپنے چھوٹے

کرنے میں لگا رہتا ہے یا پھر وہ اپنے گھر کے کسی پچھلے کمرے میں اپنے نفس اور ہمزاد کے ساتھ غلطیاں و پتیاں
کرتا رہتا رہتا ہے۔

لیکن میں 479۔ این کی بات کر رہی ہوں جب رحمن پر ابھی شوق کی ترنگ غالب تھی۔ وہ موقع بے موقع
کھینچنے کا شوقین تھا۔ ایک مرتبہ عید کا دن تھا۔ رحمن کہیں سے آٹپکا۔ مجھے بھی ان دنوں لباس میں گہری دلچسپی تھی۔ میں
بھی تیار ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ ہر عورت کی طرح میرے دماغ میں بھی ایک خناس تھا۔ میں بھی سمجھتی تھی کہ مجھ جیسا شہر میں دوسرا
کون ہے۔ میں نے چوڑی دار پاجامہ، گھیر والا شیفون کا فرائڈ، ٹائپ کرتا اور آپ رواں جیسی تین گز کی اوڑھنی اوڑھی۔
رحمن فوٹو گرافر نہال ہو گیا۔ اسے سبکیٹ کی تلاش تھی۔ کبھی بائیں کبھی فرنٹ کبھی بیک کبھی ہاف کبھی فل.... کڑک
کرتا تھا۔ اس تصور پر بنا ڈالیں۔ اس ساری گہما گہمی میں خاں صاحب چپ چپ تھے۔ وہ نہ سویاں کھا رہے تھے نہ حسب
مستند میں پیش پیش تھے۔ میں نے موقع پا کر خاں صاحب سے پوچھا..... ”کیوں کیا بات ہے؟“
”کچھ نہیں.... بس ایسے ہی۔“

مجھے معلوم تھا کہ جب وہ 1۔ مزگ روڈ کو یاد کرنے لگتے ہیں تو پھر انہیں ایسی ہی چپ لگ جاتی ہے۔
یہی طرح تعریف کی بھوکی عورت نے خاں صاحب سے پوچھا: ”میرا فرائڈ دیکھا آپ نے؟ بالکل
سیدھا ہے۔ صادق کہہ رہا تھا کہ اتنی باریک شیفون سینا بہت ہی مشکل ہے۔“

صادق کی دکان سنن آباد مارکیٹ میں تھی اور وہ میرے کپڑے بڑی پریت سے سینتا تھا۔ بچوں کے یونیفارم میں
کھلے بازار میں اسے Jolin تیار کرتا تھا۔ صادق سنن آباد چھوڑ کر چلا گیا تو پھر بھی اس کے ساتھ میرا رابطہ رہا۔
”ہاں ٹھیک ہے۔“ شتو جی بولے۔

”ن کی آواز میں رتی بھر گرم جوشی نہ تھی۔“

”میں..... کیسی لگ رہی ہوں شتو جی؟“

اب میں نے سیدھا دار.....

صلہ درست تھا، سیدھا جواب ملا۔ ”سنو قد سیہ..... فیصلہ تمہیں خود کرنا ہے..... جو بھی فیصلہ تم کرنا چاہو میں ساتھ
ہوں۔ اگر تم امر او جان ادا بننا چاہتی ہو تو تمہیں اختیار ہے۔ اگر تم مردانہ وار زندگی کی جدوجہد میں شامل ہو کر اپنا لوہا منوانا
چاہتی ہو تو تم کو آزادی ہے کہ اپنی شناخت اپنی محنت سے حاصل کرو..... لیکن راستہ ایک ہی چننا۔ دو راستوں کا مسافر زیادہ
سے نہیں کرتا۔“

”میں..... ذاتی شناخت.....؟ میں سمجھ نہیں سکی خاں صاحب۔“

”مرد عموماً اپنے اوصاف سے اور عورت اپنی ذات کے سہارے زندہ رہتی ہے۔ اچھا تر کھان ریشمی گرتے نہ
ہوتے تو جانا جاتا ہے..... قابل ڈاکٹر سفید کوٹ میں ہی بھلا لگتا ہے۔ اسے رنگ برنگے لباس کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جس
کے رزلٹ اچھے نکلتے ہیں اس پر تعریف کے ڈونگرے برستے ہیں۔ اسے کسی کو impress کرنے کے لیے اپنی ذات
نہیں پڑتی..... تم میں بھی بڑا پوٹینشل ہے۔ اس کی طرف توجہ دو تو تمہارے لیے شناخت کا دروازہ فوراً کھل جائے گا۔“

”میں سمجھی نہیں شتو..... بھلا مجھ میں کون سا پوٹیشنل ہے۔ میں ناچنا گانا چاہتی تھی لیکن آپ کی روایات نے

اُدھر بڑھنے نہیں دیا۔“

”چلئے ہم قصور وار سہی..... یا یوں سمجھئے ہم لوگ دقیانوسی مسلمان ہیں لیکن تم میں ایک خوبی اور بھی ہے جس

طرف سے تم لا پرواہی برتی ہو۔ تم بہت اچھا لکھتی ہو۔ اگر پوری توجہ دو تو دور تک اور دیر تک لکھ سکو گی۔“

”لکھتی تو ہوں خاں جی..... میرا شکاری کے قلمی نام سے کتنے مضمون لکھے ہیں۔ ادارت کرتی ہوں“ واضح

کی۔ جب کوئی افسانہ کم پڑ جاتا ہے تو جدیدی کے نام سے کھکھو ڈیڈی کی طرف سے حتیٰ کہ صدیقہ کے لیے بھی ایک آڈیو

لکھ ڈالی ہے۔“

”لکھی ہیں لکھی ہیں کہانیاں قلمی ناموں سے..... لیکن..... لیکن.....“ وہ ناک کھجانے لگے۔

”لیکن کیا.....؟ آپ گھبرائیں نا..... لیکن کیا؟“

”ہر عورت کی طرح تم بھی عورت کی زندگی بسر کرنا چاہتی ہو۔ عورت کی بد نصیبی کہہ لو وہ اپنی ذات کے سہ

زندہ رہنا چاہتی ہے۔ کم بخت اتنی ناقص العقل ہے کہ نہیں جانتی بڑھاپا پاس کے اندر پل رہا ہے۔ جسم بھدا ہو جاتا

دانت جواب دے جاتے ہیں..... بال جھڑوس بن کر رہ جاتے ہیں اور کوئی تعریف نہیں کرتا۔ پھر فیصلہ بدلنے کا وقت

نہیں ہوتا۔ لے دے کے بچوں کے سہارے جینا چاہتی ہے۔ وہ بھی اس کی توجہ جسٹک کر اپنی راہ لیتے ہیں۔

آیا.....؟ فیصلہ کر لو..... جوں جوں وقت گزرے گا..... تمہاری شناخت بڑھے گی..... جوں جوں کام میں پختگی آئے گی

دور دور پھیلے گی..... لیکن فیصلہ تم کو خود کرنا ہوگا۔“

”جی فیصلہ تو میں کر چکی ہوں نا خاں صاحب..... میں دونوں کام کروں گی..... عورت پن بھی برقرار رکھ

گی..... اور..... ادبی شناخت بھی پیدا کروں گی۔“

”دیکھئے عورتوں کے لیے مرزا ہادی رسوا نے اپنے ناول ”امراؤ جان ادا“ میں مشعل ہدایت روشن

ہے..... امراؤ جان ناچنے گانے والی بھی بنی رہی اور مشاعروں میں بھی آداب عرض کر کے شعروں پر تعریف

رہی..... پھر اس کا انجام بھی تمہارے سامنے ہے۔ انجام کار جو بھی قسمت میں لکھا ہو تمہیں مل جائے گا لیکن فیصلہ درست

چاہیے۔“

میں نے فیصلہ کیا لیکن خاں صاحب کو زبانی نہیں بتایا۔ میں چانتی تھی کہ عورت تو ویسے ہی مرد کی طرح کئی

میں بٹی ہوئی ہے۔ بچے گھر رشتہ داریاں سوشل لائف بازار ان گنت بکھیڑوں میں سے جس قدر کم ہو جائے اتنی

آسان ہوگا۔

میں نے اپنا زیور لا کر میں بند کرادیا۔ شادی کے لباس پیک کر کے دھردیئے اور سادہ لباس سلوا کر سفید

قمیص دوپٹہ اختیار کر لیا..... ایک بار اس کے بعد بھی مجھے ایک فیصلہ کرنا پڑا۔

صدیقہ کے بھائی کی شادی تھی۔

صدیقہ چودھری برکت علی کی کوٹھی میں بڑے اہتمام سے شادی کے انتظامات میں مصروف تھی۔ میں

صاحب بھی تیار ہو کر بروقت روانہ ہوئے۔ میں نے بنارسى ساڑھی، ہیل والی جوتی اور خوب میک اپ کر رکھا تھا۔ یہ لباس کلباس نہیں تھا اور غالباً خاں صاحب ایسی خاتون کے شانہ بشانہ چلنا نہیں چاہتے تھے۔

میں اپنے بھانویں خوبصورتی کا ماڈل بنی چلی جا رہی تھی۔

لیکن جب ہم گراؤنڈ کے دائیں راستے پر ٹیوب ویل کے پاس پہنچے تو خاں صاحب چلتے چلتے اچانک رُک گئے۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا..... ”خیر ہے شوقی طبیعت ٹھیک ہے؟“

وہ چند لمحے چپ رہے۔ غالباً سوچ رہے تھے کہ دلآزاری کیے بغیر کیسے بچ بولا جائے۔

”ہوا کیا ہے؟“

”بات یہ ہے قد سیہ کہ..... کہ..... دیکھو تم اپنا لباس تبدیل کر سکتی ہو؟“

”لباس..... کیوں اس میں کیا خرابی ہے۔ ہم شادی پر جا رہے ہیں۔ ایسی قیمتی ساڑھیاں ایسے موقعوں پر ہی پہنی جاتی ہیں۔“

”آپ حکم دیں آپ چاہتے کیا ہیں۔“

”حکم نہیں قد سیہ..... تم فیصلہ کرو..... ہمارے گھر میں ساڑھی کا رواج نہیں۔ اگر کسی نے دیکھ لیا..... ویسے ہی معتوب ہوں اور.....“

میں نے جرح کی، کیونکہ میں ساڑھی اتارنا نہ چاہتی تھی۔ ”خاں صاحب..... مشرقی پاکستان کا یہی لباس ہے۔ ہمیں ساڑھی پر فخر کرنا چاہیے۔“

”ہاں کرنا تو چاہیے لیکن ہمارے گھر والوں میں ابھی وسعت نظر نہیں ہے..... وہ کنویں کے مینڈک ہیں۔ جب کسی پاکستانی بن جائیں گے تو شاید.....“

وہ چپ ہو گئے۔ ان کے لیے مجھے یہ کہنا بھی کافی بوجھل ثابت ہو رہا تھا۔

میں نے گھر کی طرف چلنا شروع کر دیا اور سادہ شلوار قمیض پہن کر جب پھر باہر نکلی تو خاں صاحب مسکرا رہے تھے۔

مجھے میری والدہ نے بہت خوبصورت بنارسى کشمیری کڑھائی والی اتلے کے کام سے آراستہ قریبا پچاس ساڑھیاں سجھائیں۔ میں نے ان ساڑھیوں کو احتیاط سے پیک کر کے رکھ چھوڑا۔ اب میرا ارادہ پھر کبھی ساڑھی پہننے کا نہ تھا یا یوں سمجھئے

میں نے یہ ہندوانہ لباس ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا۔

اشفاق احمد چاہتے تھے کہ میرے تمام عیوب، کمزوریاں، غفلتیں، Shortcomings لوگوں کی نظروں سے چھپی رہیں اور میری خوبیوں کو ہیرے کی طرح تراش کر مجھے معاشرے میں پیش کیا جائے۔ اس معاملے میں وہ اللہ کی طرح سچی کرنے کو مدد کی بہترین صورت تصور کرتے تھے۔ میں نے کبھی انہیں اپنی کسی غلطی کا تمسخر اڑاتے نہیں دیکھا۔

لوگوں کے سامنے میری غلطیوں کو اس طرح پیش کرنا کہ سب کے لیے ہنسی مذاق نکل آئے، یہ حرکت ان کے لیے بڑی مذموم تھی۔ بار بار کسی نقص کا اعادہ کرتے رہنا ان کے مسلک میں ممنوع تھا۔ وہ تنہائی میں بھی انگلی اٹھا اٹھا کر

مسکان دکھا دکھا کر آواز اونچی کر کے اپنے آپ کو منبر پر چڑھا کر مجھ سے بات نہ کرتے تھے۔ جب بھی علیحدگی میں بات کی آواز مدھم لہجہ شیریں اور مفہوم مثبت نکالنے کی کوشش کی۔ ہم میں جو ساری عمر لڑائی جھگڑا نہ ہوا تو اس کی بنیادی وجہ صاحب تھے۔ میں تو شاید کسی وقت بھڑک اٹھتی۔ تقریری مقابلہ جاری کر دیتی لیکن وہ شاید اچھی طرح جانتے تھے کہ تو نے زخم تو مندمل ہو جاتا ہے لیکن زبان کا عطا کردہ زخم ایسا بیہودہ ہوتا ہے کہ اسے کوئی نانا کا نہیں لگ سکتا نہ یہ کبھی پورے طور پر مندمل ہوتا ہے۔

آپ سے پہلے عرض کر چکی ہوں کہ جونہی امیری فارغ الہابی بھلے دن گھر کا رستہ دیکھ لیتے ہیں، کئی تبدیلیاں اچانک گھر کے دروازے پر دستک دیے لگتی ہیں۔ غریبی میں عموماً وقت تھم جاتا ہے۔ مصیبتوں کی شکل تو نہیں بدلتی۔ صبح کو وہی ’رٹھی رونے‘ گلے پڑے رہتے ہیں، جس کے باعث غریب آدمی ڈیپریشن کا شکار ہو جاتا ہے۔ امیری میں اچانک بدل جاتے ہیں۔ تبدیلی بہت حد تک Opportunity کی شکل میں آتی رہتی ہے۔ آدمی کو جلد جلد فیصلے کرنا پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ گڑبڑا کر غلط راہوں کا فیصلہ کر لیتا ہے اور اس طرح شکست و ریخت کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی کئی بار تجھے ڈیپریشن کی صورت میں نکلتا ہے۔

ہم بھی 479۔ این میں کئی تبدیلیوں کا شکار ہوئے۔ اچانک ایک دن بیٹھے بٹھائے ہی مجھے لاہور کالج فور وین سے نوکری کی آفر ملی۔ میں نے کسی جگہ نوکری کی درخواست نہیں دی تھی لیکن ان دنوں نیچنگ سٹاف کی قلت ہر کالج میں تھی۔ لاہور کالج میں بھی اردو ڈیپارٹمنٹ نیا نیا کھلا تھا۔ ظاہر ہے اس آفر نے میری اتر اٹھ میں بڑا اضافہ کیا۔ رات جب یہ سو گئے اور گھر میں فراغت کا احساس ہوا تو میں نے وہ کاغذ نکالا اور خاں صاحب کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔

”یہ دیکھ لیجیے۔“

”کیا ہے؟“

”بس آپ دیکھ لیں۔“

شوقی نے کاغذ اٹھایا۔ عینک درستی سے لگائی۔ چند لمحے پڑھنے کے بعد بولے: ”مبارک ہو..... یہ واقعی اعزاز ہے۔ ہمیں تو نوکریوں کے لیے خاک چھانی پڑتی ہے۔ تمہیں گھر بیٹھے بٹھائے آفر مل گئی۔ شاباش.....“ پھر وہ ہاتھ بڑی نرمی سے تہہ کرنے لگے۔

”تو پھر جوائن کر لوں..... کیا خیال ہے آپ کا؟“

وہ چند لمحے چپ رہے۔ پھر بولے: ”دیکھ لو سوچ لو۔ فیصلہ تمہارا ہونا چاہیے۔ میرے خیال کی ضرورت نہیں ہے۔“

بچوں پر ملازموں پر رعب ڈالتے مجھ میں ایک خاص قسم کا استانی پن پیدا ہو گیا تھا۔ نانا نے ایک دن مجھے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔ ”قدسیہ! بچپن میں تو تیری طبیعت بڑی نرم تھی۔ اب تجھ میں مشنری میوں جیسی ڈسپلن یہ رہی ہے۔ نہ وہ خود آرام کرتی ہیں نہ کسی اور کو زندہ رہنے کا حق بخوشی دیا کرتی ہیں۔“ مجھے پتہ نہیں کیوں اس روز نانا کا یہ جملہ یاد آ رہا تھا۔

”لیکن آپ مجھے کچھ تو فیصلہ کرنے میں مدد کیجیے ناں..... چلئے رائے ہی دیجئے۔“
 ”ہاں..... مولانا اشرف علی تھانوی سے اگر کوئی رائے مانگتا تو وہ کہتے..... بھائی کرووہ جو تمہارا دل چاہے۔ ہاں
 کسے تمہاری جگہ ہوتا تو یوں کرتا۔“

”ہاں تو بتائیے ناں کہ آپ کیا کرتے؟“

انہوں نے سر کھجایا اور سوال کیا۔ ”تنخواہ قریباً کتنی ہوگی؟“

میں نے لجاجت سے جواب دیا۔ ”غالبا ڈھائی سو روپیہ یا پونے تین سو۔“

”اچھا تو پھر حساب لگاتے ہیں۔ تمہیں روز تانگے پر کالج جانا پڑے گا۔ سالم تانگہ 75 روپے ماہوار سے کیا کم
 ہے؟ پھر خاں ابھی چھوٹا ہے اس کی دیکھ رکھ کے لیے کوئی مائی رکھنا پڑے گی۔ وہ بھی پچاس ساٹھ سے کم میں نہ ملے گی۔
 پھر پورے تم پرانے کپڑوں میں گزارا کر لیتی ہو لیکن کالج میں تو ایسے کپڑے نہیں چلیں گے اور ہاں پھر کیا پتہ شام کو فنکشن
 ہے۔ تمہیں شام کو بھی کالج جانا پڑے۔“

”نانا کو مجبور کروں گی وہ گھر پر رہیں گی۔“

”جھیلہ ہے وہ کب مستقل طور پر یہاں رہ سکیں گی۔“

میں چپ ہو گئی۔ میرے غبارے میں سے ہوا نکل گئی۔

اس روز نوکی خاں بلا وجہ اتار دیا کہ مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوگی۔

میں نے جب لاہور کالج فور ویمن کو انکار کر دیا تو خاں صاحب منہ سے کچھ نہ بولے لیکن ان کے رویے سے
 مجھے حسرتی ہوا کہ وہ بڑے مطمئن ہیں۔ جیسے کسی بڑے قلعے کا محاصرہ توڑ دیا ہو۔

یہ 121۔ سی ماڈل ٹاؤن کا واقعہ چونکہ اسی ڈھب کا ہے اس لیے یہاں اس کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ ایک بار جب
 شہاب بھائی ہمارے پاس آئے تو انہوں نے کہا..... ”قد سید! یہ تمہارے پاس ہی شاہراہ علی میوزیم بن رہا ہے ہمیں اس کے
 لیے ایک عدد ڈائریکٹر کی ضرورت ہے۔ اگر تم مان جاؤ تو یہ نوکری میں تمہیں بہ سہولت دلا سکتا ہوں..... اچھی تنخواہ کے علاوہ
 پھر بھی ملے گی۔ گھر کے کام کے لیے دونو کر بھی آجائیں گے اور سفر کے دوران سرکاری ٹکٹ بھی مل جائے گی..... سوچ کر
 چھو۔“

ایک بار پھر میرے دل میں اٹا کا گلاب کھلا۔ اپنی اہمیت کا احساس ہوا۔ میں نے خاں صاحب سے
 پوچھا..... ”آپ نے سن لیا ناں شہاب بھائی جو کہہ رہے تھے۔“

”ہاں سن لیا۔“

”پھر کیا کہتے ہیں آپ؟“

”دیکھو قد سید! بات میرے کہنے سننے کی نہیں ہے۔ تم اپنی مرضی سے جو فیصلہ کرو گی ہم سب کو منظور ہوگا۔ ظاہر
 ہے اس وقت ہمیں پیسے کی تنگی نہیں ہے جس کی وجہ سے تم کو نوکری کرنا پڑے۔ گاڑی گھر پر موجود ہے۔ پھر پرسنل گاڑی اور
 ڈرائیور تو اسے درکار ہوتا ہے جو شخص بڑا سوشل ہو اور جسے گھر پر وحشت ہوتی ہو..... رہ گیا خانساں تو ہماری حیوانی رمضان

سلامت رہیں۔ گھر پہلے ہی خدمت گزاروں سے بھر پڑا ہے اور دو آدمی تابعدار بنا کر کیا ملے گا۔“

بہت سارے مسائل بدل چکے تھے لیکن میری نوکری سے ان مسئلوں میں سے کوئی بھی نہ سنورتا تھا۔ ایک ضرورت تھی کہ میری شناخت ایڑی کی گرگا بل مل جاتی۔ انسان کے اندر بسنے والی اس کی انا کسی طور پر مطمئن نہیں ہوتی۔ دم بھوکی پیاسی اور روکھی سی کچھ نہ کچھ مانگتی رہتی ہے۔ برسوں اس شہنی خورہ کو پانی دو..... اس کی پیاس ختم نہیں ہوتی۔ عمر کے آخری حصے میں جا کر کچھ کچھ پتہ چلا ہے کہ جس راستے پر اللہ کا ہاتھ یا ساتھ نہ ہو وہ راستہ صرف انا کا سفر میں ہے۔ یہاں کھانے کو تھوہرا اور پینے کو گرم پانی ملتا ہے۔ آپ کو فرعون کی طاقت ملے یا قارون کا خزانہ نہ اپنا فائدہ ہوتا ہے نہ کسی اور کا.....

بس میں نے بڑی دقت سے اپنے لیے یہ بات سوچی کہ کسی اور کا فائدہ چونکہ نہ ہوگا اس لیے یہ کام افادیت سے خالی ہے..... گھر بھرنے سکھ کا سانس لیا اور ایک بار پھر شناختی کی ہوائیں برآمدے میں چلنے لگیں۔

شہاب صاحب 121۔ سی ماڈل ٹاؤن میں ہمارے بہت قریب آئے لیکن اس بارش کے ہلکے ہلکے چھپے چھپے آباد کے اسی گھر میں شروع ہو گئے تھے۔ یوں تو وہ خاں صاحب کے اس وقت کے جان کار تھے جب وہ 1۔ مزنگ روڈ پر کرتے تھے۔ پھر جب میری شادی ہوئی تو وہ اور عنقت مجھے ہیلو ہیلو کہنے والوں میں شامل ہو گئے۔ لیکن شروعات اسی گھر سے ہوئیں۔

شہاب صاحب اس وقت وفاقی حکومت کے سیکرٹری تھے۔ محکمہ غالباً تعلیم کا تھا لیکن اب میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی۔ وہ سرکٹ ہاؤس میں رہا کرتے تھے، لیکن شام کو جب خاں صاحب گھر پر ہوتے وہ چھوٹے سے باورچی خانے میں تپائی نماییز پر بے جوڑ برتنوں میں گول ڈگڈگی موڑھے پر بیٹھ کر بڑے معمولی کھانے رغبت سے کھاتے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے دسترخوان پر مل بیٹھنے کی مہمان نوازی مسلمان ممالک میں چلی آ رہی ہے۔ روایت سب سے زیادہ ڈیروں پر نظر آتی ہے۔ یہاں فانیو شمارہ کا کھانا نہیں ملتا نہ ڈیج کار و اج ہے کہ اپنا اپنا ادا کیا اور پتے بنے۔ خاں صاحب کی تواضع بھی خاص الخاص دسترخوان سے وابستہ تھی۔ وہ چٹنی روٹی اچار پراٹھا کھلانے میں کبھی محسوس نہ کرتے۔ پُر تکلف کھانوں کی ان کے نزدیک کوئی شرط نہ تھی۔ میں عموماً اہتمام کے بغیر کھانا کھلانے میں سکی محسوس کرتی۔ میرا جی چاہتا کہ شہاب صاحب کے شایان شان کچھ ضرور ہو۔ خاں صاحب کہا کرتے: ”قد سیر! اہتمام نہ کرو۔“ انتظام کر لو۔“

میں ان دونوں کے فرق کو بہت بعد میں سمجھی۔ جب بھی شہاب صاحب آتے میں آلوکی پوریاں بنانے کی کوشش کرتی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اس قسم کی پوریاں رغبت سے کھاتے ہیں۔ لیکن ان سے گفتگو بہت کم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی طرف کبھی ان کی توجہ نہیں گئی۔ وہ خاں صاحب سے آگے ایک قدم نہ بڑھتے۔ انہوں نے کبھی مجھ سے اور بچوں سے فریاد ہونے کی کوشش نہ کی..... کوشش تو غالباً وہ ایک ہی سمت میں کرتے تھے، لیکن ابھی مجھ پر ان کی یہ سمت نہ کھلی تھی۔ شاید خاں صاحب اس جہت کو جانتے ہوں لیکن انہوں نے مجھ سے کبھی ذکر نہیں کیا.....

ذکر تو خاں صاحب ویسے بھی بہت کم باتوں کا کرتے تھے۔ انہوں نے مجھے ہر معاملے میں اپنی رائے

تو آزادی دی تھی۔ جس وقت وہ طفیل نیازی کے ٹیپ لے کر گھر آئے۔ انہوں نے طفیل نیازی کا نام تک مجھے نہ
 سنا۔ طفیل نیازی کی گونج دارآواز سے بھر جاتا۔ ایک جادو سا فضا میں تیرنے لگتا۔

”میں نہیں جانا کھیڑیاں دے نال“ کی کوک بن کر کمروں میں تیرنے لگتی اور میں سوچتی رہتی پتہ نہیں یہ
 کون ہے۔ پھر ایک دن ایک آدمی نانی اماں کے کمرے میں خاں صاحب کے پاس بیٹھا نظر آیا۔
 حیرت رہا ہے کہ جب کبھی بھی خاں صاحب کے پاس کوئی بیٹھا ہو میں از خود اس مجلس میں شرکت نہیں کرتی تھی، اگر خاں
 صاحب جیتے تو اور بات تھی۔

”قدسیہ.... ذرا ادھر آنا۔“

میں اندر گئی۔ ایک بھاری بدن اُلام م سا نولے چہرے اور کھرج دار آواز میں ایک شخص پینٹ قمیض میں ملبوس نانی
 صاحب کے کمرے میں بیٹھا تھا۔

”یہ طفیل نیازی ہے۔“

میرے چہرے پر شناخت نہ ابھری تو خاں صاحب بولے..... ”بھئی جس کے گانے سن کر تم باور پچی خانہ چھوڑ

”یہ میری بیوی ہے.... قدسیہ۔“

طفیل نیازی اپنی باتوں میں مگن رہا۔

طفیل سے بات کرنا مشکل نہ تھی کیونکہ اس کے پاس ان گنت باتوں کا پتارہ تھا۔ کبھی وہ چراغوں کے میسے کا کوئی
 کھیل بھی مانگنے والوں کی ٹولی میں مل کر گانے بجانے کی کہانی سناتا۔ کبھی کڑوی بجانے والیوں کا ذکر درمیان میں لے
 کر سب کو قاتل میں اس نے ایک عجیب واقعہ بیان کیا۔

”خاں صاحب! میں اور میرا چھوٹا بھائی فقیر یا ہمارے ساتھ پٹی ساز تندرے فیصل آباد کی درگاہ سے چوکی بھر کر آ
 گئے۔ ہمیں بس منڈلی۔ شہر سے دور ایک اجاڑ جگہ میں دریاں ڈال کر لیٹ گئے۔ خاں صاحب! کوئی آدھی رات گزری
 تھی کہ جنوں کی ایک ٹولی وہاں اتری۔“

”جنوں کی“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”ہاں بی بی جن ہوتے ہیں۔ ان کا ذکر اللہ کی کتاب میں آیا ہے۔ ٹھیک ہے آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ آپ
 سچے پر ایمان لاتے ہیں جو آپ کی آنکھ دیکھ سکے، لیکن ہوا بھی تو موجود ہے نا۔ آپ مانتی ہیں نا۔“

”بی بی قدسیہ! میں نے بھی آپ کی طرح انہیں نہیں پہچانا تھا۔ لیکن فقیر یا نے میرے کان میں کہا: ”دیکھو بھائی
 جنوں میں سے کوئی بھی آنکھ نہیں جھپکتا.... یہ دوسری مخلوق ہے، ہم میں سے نہیں۔“

”اچھا تو آگے چل۔“ خاں صاحب بولے۔

”ہاں تو سرکار وہ ٹولی بھی اُس رات اُسی درگاہ پر چوکی بھرنے آئی تھی جہاں ہم چوکی بھر کر آئے تھے۔ فقیر یا کی
 جھپکائی لیکن میں پتہ نہیں کیوں سو نہ سکا بلکہ چوری چوری انہیں دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے سلطان باہو کا

کلام ایسی لہک سے گانا شروع کیا کہ وجد طاری ہو گیا۔ جی چاہا سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی جنگل میں جا بسوں اور اسے سوائے کوئی اور رشتہ باقی نہ رہے..... لیکن سرکار ہم لوگ..... ہم جو گانے بجانے والے، قوالی کرنے والے، ٹر کے لوگ ہوتے ہیں، ہمیں اپنے رشتے بہت پیارے ہوتے ہیں۔ ہم لاکھ چاہیں، اپنے گھر والوں کے سوائے کسی کے یہ نہیں ہوتے..... میرا ارادہ میرے سوائے ہوئے بھائی، گھر بیٹھی بیوی اور بچوں نے تو زردیا۔ کچھ اونگھتا سوتا میں اُس کو غافل نہیں تھا۔ پھر وہ فجر سے پہلے اٹھے۔ اپنے ساز سنبھالے اور چلنے لگے۔ ابھی دس بارہ قدم دور ہو گئے ہوں کہ سارے غائب..... باجا سا رنگی ڈھولک طبلہ..... سمیت نہ کوئی نشان نہ کوئی اند پتہ نہ کوئی یادگیری نہ کوئی نشانی..... یہ واقعہ ہے سرکار..... لوگ تو میلوں پر اور بھی عجیب و غریب باتیں بتاتے ہیں.....“

طفیل اپنی مٹھلوی باتوں سے خاں صاحب کو رجمارہا تھا۔ میں اس کی باتوں سے متاثر ضرور ہوئی لیکن ایمان لانا میری تعلیم کی وجہ سے ناممکن تھا۔ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ انسان کا ماحول اس کی ذات کو گھڑنے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ انسان کی تعلیم، ماحول اس کی جبلت اور میل جول ایسے فیکٹرز ہیں جو ہر شخص کو ایک خاص ڈالتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے ایک انسان دوسرے انسان سے اس قدر مماثلت بھی رکھتا ہے اور بنین فرق کا شہتہ دیتا ہے۔

لیکن موسم ان سب سے زیادہ انسان کی بناوٹ کو بدلنے میں مدد دیتا ہے۔ جن ملکوں میں برف باری ڈالتی ہے شدید سردی معمول ہے وہاں لوگ گھروں میں محبوس ہو کر Introvert ہو جاتے ہیں اور سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ انسان کی اصلیت کا بغور مطالعہ کرنے کا وقت بھی ملتا ہے اور کرب بھی۔ اسی تہائی نے یورپ میں سائنس کو جنم دیا۔ دھیرے دھیرے انسان کو بھی سائنس کا حصہ بنا دیا۔

اس سلسلے میں بیسویں صدی میں یونگ، ایڈلر اور فرائیڈ نے نفسیات کی دنیا میں ایک انقلاب کی شکل اختیار لی لیکن انسانی مجبوری ہے کہ وہ اپنے نقطہ نظر میں محبوس ہو کر رہ جاتا ہے۔

فرائیڈ کے نزدیک انسان کی سب سے بڑی تخلیقی قوت جنس تھی۔ جب اس کی آسودگی ممکن نہیں ہوتی تو یہ جنس میں اس تشنگی کا علاج ڈھونڈ نکالتی ہے۔ فرائیڈ نے اپنی تھیوری کو تقویت دینے کے لیے بہت سارے راستے ڈھونڈ لیے۔ یہ Psycho-analytical طریقہ علاج تھا۔ خوابوں کی تعبیر اور ان میں Symbols کی تلاش ایڈلر کی کمپلیکس کی دہی اور نیوراسس اور شیوزوفرینیا کے علاج کی سائنسی توجیہات نکالیں۔ کچھ عرصہ یونگ اپنے استاد فرائیڈ کے کاتب شامل رہا اور اس کے انداز فکر سے مطابقت میں آنا و صدقہا کہتا رہا۔ یہ تعلق تو قائم رہا لیکن انسان کے متعلق تشریحات میں بھی خاطر خواہ اضافے ہوتے رہے۔

لیکن پھر یونگ نے انسان اور اس کی دیومالائی بیک گراؤنڈ کی طرف ایک اور نقطہ نظر سے شدید توجہ مرکوز کر دی۔ وہ سمجھنے لگا کہ فقط جنس ہی انسان کی واحد ضرورت نہیں۔ وہ اپنے ماضی کا بھی حصہ ہے اور ان دیکھی طاقتوں کا اور اس طرح Cosmic Consciousness کی ایجاد ہوئی۔ یونگ نے Introvert-Extrovert میں انسان کو تقسیم کیا اور ماورائی تجربات کو بھی زندگی کا ضروری حصہ بنا دیا۔ حضرت انسان کی تلاش نے ایڈلر کی سمت بھی متعین کر دی۔

سے زیادہ اس بات کو اہمیت دیتا تھا کہ انسان میں Will to power اہم ہے۔ ہر انسان رب بننے کی کوششوں میں حصہ لیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی قوت اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی خواہش میں پنہاں ہے۔
فرائیڈ کی جنس سے وابستگی۔

یونگ کا Archetypes سے عشق اور ماورائی قوتوں کی رغبت۔

یونگ کا Will to power کا فلسفہ۔

یہ تینوں اپنی اپنی سمت کے بڑے کام تھے، لیکن یہ سارا سچ نہیں تھا۔ میرا علم اتنا نہیں کہ میں ان تینوں پر آپ کو بتاؤں۔ وضاحتیں پیش کر سکوں۔ لیکن مجھ پر خاں صاحب کی صحبت میں ایک بات واضح ہو چکی تھی کہ انسان چاہے کتنا ہی مہیا حاصل کرے اس کی تلاش کی معراج مذہب ہے۔ یہاں آپ کو منوانے سے بھی زیادہ کسی کو ماننے کی جستجو رہتی ہے۔

انسان چاہے کسی مقام پر پہنچ جائے، تشنہ لب رہے گا۔ قارون کے خزانہ فرعون کی طاقت میں اللہ کا ہاتھ اور اس کے ہاتھ میں اللہ کا عقائد و ایمان اُسے ماتھا مٹینے پر ہمیشہ رضا مندر رکھے۔

خاں صاحب سمجھتے تھے کہ یہ تلاش جو انسان کا مقدر ہے سب سے زیادہ فنکاروں کا نصیب ہے۔ وہ شاید خدا کو کھینچ کر پاتے لیکن اپنے میں وہ جو ہر ڈھونڈ لیتے ہیں جو ان کی شخصیت کا بہترین اظہار و تشکر ہوتا ہے۔

جو لوگ طفیل نیازی کی طرح رب رب کرنے والے فنکار ہوں وہ اپنی جملہ خرابیوں کے باوجود (خرابیاں تو ہم سب کے نصیب ہیں) شاکر اور صابر آدمی طفیل نیازی کی اونچ نیچ، مشکلات، اوگت گھائیاں، زندگی میں بھی عام نارمل آدمی کی طرح آتی ہیں لیکن وہ کبھی اللہ کا شکوہ نہیں کرتا تھا۔

لیکن مجھ میں نہ تو خاں صاحب والی تلاش تھی۔

نہ طفیل نیازی جیسی تسلیم و رضا۔

مجھے میری تعلیم نے صرف یہ سکھایا تھا کہ اپنے زور بازو پر اعتماد کرو۔ جو لوگ اپنی توانائی اور تقویت کو بروئے کار لگاتے ان کی صلاحیتیں رنگ آلود ہو جاتی ہیں۔ مجھے نہ کسی مقدر پر یقین تھا نہ ایسی قوت پر اندھا یقین ہی تھا جو انسان کو کھینچ جانے کی توفیق دیتی ہے۔ میں تو کسی خود سرنچے کی طرح اپنے سینہ پر مکا مار کر کہنے کی عادت تھی۔

”نہیں میں آپے آپے۔ میں خود۔“

اسی جذبے کے تحت ایک روز جب طفیل نیازی ہمارے گھر آئے تو میں نے ان سے کہا۔ ”طفیل بھائی! مجھے گانے کا بہت شوق ہے۔ میں ایک ماسٹر صاحب سے کچھ دیر کلاسیکی موسیقی بھی سیکھ چکی ہوں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے گانا سنا دیں..... میں اس فیلڈ میں نام پیدا کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ ازراہ ادب چند ثنائی چپ رہے۔ پھر ہولے سے بولے۔ ”ہاں بی بی! ذرا میرے ساتھ گرم اٹھائیں۔“
ایک بار طفیل بھائی نے سارے گاما کی سرگرمی بڑی سادگی سے ادا کی۔ توقف کیا پھر سرگرم دہرائی اور چپ ہو گئے۔

میں نے ان کے تعاقب میں گویا سُر مُر ٹھیک ہی گایا۔

پھر انہوں نے دو تین بول ایک ٹھمری کے گائے۔ میں نے نقل بہ نقل اصل اتاری۔ جہاں تک نقل کا تعلق ہے۔ درست تھی لیکن ان کے بھانویں کچھ کسرتھی۔ وہ چپ ہو گئے۔ میرے گانے کی کوئی تعریف و توصیف نہ کی۔ میں بہت ہی ہونئی لیکن خاموش رہی۔ کچھ دیر بعد بولے۔ ”میں بی بی ہر ایک سے جھوٹا بولتا ہوں لیکن شاگرد سے ایسی دل لگی کو گونہ گونہ ہوں۔ تمہارے علم میں کوئی کمی نہیں..... لیکن تمہیں میرے رب نے وہ آواز نہیں دی جو اصلی گائیک کو ملتی ہے۔ میں تو درمیانے درجے کا اثر تو پیدا کر لیں گی لیکن وہ بلندی بس میں نہیں آ سکتی جو اچھی آواز کو ملتی ہے..... آپ جب گاتی جاتی ہیں تو آواز کا نپٹے لگتی ہے..... یہ بڑا نقص ہے۔“

میری شکل دیکھ کر طفیل بھائی کو ترس آ گیا..... ”آپ کسی اور فیلڈ میں کام کریں۔ کیا پتہ وہ شہرت مل جائے گی۔ آپ کو شوق ہے۔“

اس سے پہلے میں شوقیہ کمروں میں غسٹانے میں باورچی خانے میں گایا کرتی تھی لیکن اس کے بعد یہ کام بند ہو گیا۔ خاں صاحب نے بھی ایک دو مرتبہ مجھ سے کہا: ”ہاں یار آواز تمہاری تو کانپتی ہے.....“ میری والدہ بھائی اور میں پہاڑوں سے گاتے چلے آئے تھے۔ لیکن طفیل نیازی کی بات نے مجھے محتاط کر دیا۔

انسان کے ہر اچھے سے اچھے عمل کا راستہ برے عمل کی طرف نکل سکتا ہے اور اس کی بدی کا دروازہ ایک تھوڑے نیکی کی راہ پر کھل سکتا ہے۔ میری اس دلا زاری سے میرے لیے ایک بہت ہی اچھا تجربہ میری زندگی میں شامل ہونے لگا۔ قلم اور کاغذ تھام لیا اور اپنی دلچسپی کی سست بدل ڈالی۔

اگر میں کانپتی آواز میں تانیں اٹھانے والی ٹھمریاں گانے والی ہوتی تو شاید ہوشیار پور کے پشمان اندر تھم بھاگ جاتے اور میں منیر نیازی کو کبھی نہ جان سکتی۔ لیکن پتہ نہیں میری تقدیر کتنی یاد اور میری عقل کتنی کوتاہ ہے کہ مجھے بھلا قابل ذکر لوگوں کی تو جہلی۔

منیر نیازی ہمارے گھر آیا کرتے تھے لیکن مجھ سے کبھی لمبی چوڑی بات نہ کی تھی۔ ایک روز آئے تو خاں صاحب نے گھر نہ تھے۔

”قدسیہ..... جانتی ہو میں کون ہوں؟“

”جی جانتی ہوں۔ میں نے آپ کی دو تین غزلیں اور نظمیں ”داستان گو“ میں چھاپی ہیں۔“

ہر ایڈیٹر کی طرح ”داستان گو“ کا ذکر کر کے میں نے اپنی قدر و منزلت میں اضافہ کیا۔

”او میری بڑی مشکل آسان ہو گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ اشفاق رسالہ نکالتا ہے۔ اب پتہ چلا واقعی اس رسالے سے تیرا بھی کچھ تعلق ہے۔ ہاں بھی اشفاق گھر پر نہیں ہے۔ میں نے اپنی پنجابی نظموں کو اکٹھا کر لیا ہے۔ اگر تمہارے ادارے ارادہ ہو تو چھاپ لو.....“

”نام کیا رکھا ہے منیر بھائی؟“

”سفر دی رات.....“

حسین نیازی نے چپکے سے نظمیں پکڑائیں۔ مجھ سے کوئی لمبی چوڑی بات نہ کی اور جلدی رخصت ہو گئے لیکن پتہ
 حسیب بھائی کو مجھ پر مکمل اعتماد ہو گیا۔ یہی اعتبار اس وقت سامنے آیا جب انہوں نے اپنی نظموں کا انگریزی مجموعہ
 حسیب میرے نام کیا۔ ان کے لیے غالباً یہ ایک معمولی بات تھی لیکن میرے لیے یہ اعزاز کی تمغہ حسن
 سے تھی۔

حسین نیازی بھی پٹھان برادری کے جملہ مردوں کی طرح اظہار کے معاملے میں بڑے جھینپو تھے۔ خاں صاحب
 نے یہ نہیں رشتہ دار بھی تھے کہ نہیں، لیکن دونوں ہوشیار پور کے عاشق تھے جہاں ان کے پرکھوں نے پڑاؤ ڈال کر
 حسیب کے بعد سیکھ کا سانس لیا۔

حسین نیازی کی پہاڑیوں سے دونوں کو گہری محبت تھی۔ دونوں کے دلوں میں مچھڑی ہوئی گلیاں، بے آباد گھر،
 مٹی اڑاتے راستے، اجڑی بچڑی قبریں، گرے پڑے کتبے اور یادوں کی سنسناتی ہوائیں چلتی
 تھیں۔ ان کے اندر امید بن کر تو طلوع ہوئی لیکن یہ امید جیسے ہوا کی زد میں رکھا ہوا یا تھا کہ نہ بجھتا تھا
 حسیب کو دیتا تھا۔

حسین نیازی کے خوبصورت چہرے کو میں نے کبھی کھلکھلاہٹ میں نہیں دیکھا۔ وہ چہرہ ہمیشہ تھوڑا تھوڑا ہنستا ہو لے
 تھا۔ حسیب اپنی مسرتوں کو بھی چھپائے رکھتا گویا نظر بد سے بچا رہا ہو۔ سب سے بھلی چیز حسیب نیازی کی آواز تھی..... کچھ
 حسیب کی بھٹی بھٹی سی آواز..... کچھ کسی محبوبہ کے آگے عرض حال کرتے وقت رکی رکی سی، کچھ حاکم وقت سے مراعات
 حسیب کی اور اصرار سے بوجھل آواز.....

حسین نیازی کے مالی حالات کبھی درست نہ رہے۔ وہ ان مالی حالات کے ہاتھوں بڑے زچ ہوا کرتے تھے۔
 حسیب کو ہرگز کرنے کی جسارت دل سے بری لگتی تھی اور ساتھ ہی مانگے بغیر چارہ نہ تھا۔ حیرانی کی بات یہ ہے کہ آخر تک
 حسیب پر جانے کی حاجت رہی۔

حسین نیازی امریکہ، لندن میں ہونے والے مشاعروں میں جانے کے لیے پہلے دعوت کا انتظار کیا کرتے پھر خود ہی
 حسیب کو فون بھی کرتے اور شرمندہ بھی ہوتے۔ ہمارے ہاں عجیب بات ہے کہ مشاعروں میں شاعروں کو اکٹھا کرنے
 حسیب کے روایے شاعروں کا جہوم رہتا ہے جو ہر طرح سے ان کی خوشامد کر کے اپنا راستہ بناتے ہیں۔ خوشامد چونکہ انا کو
 حسیب کو ہے اس لیے نوڈولٹیوں کی طرح ان نو شاعروں کی کھپ سے مشاعروں کا بندوبست کرنے والوں کو بڑی
 حسیب تھی ہے۔

ان حالات میں حسیب بھائی کو بھی خوشامد رعیایا میں شامل ہونا پڑتا تھا۔ یہ تو بہت بعد کی باتیں ہیں۔ ان دنوں
 حسیب کا چکر نہ چلا تھا۔ حسیب نیازی ابھی ساہیوال میں رہتے تھے۔ جب بھی لاہور میں قیام ہوتا وہ ہمارے گھر ضرور
 حسیب ہی ایک دن وہ اپنی بیوی کو لے کر ہمارے پاس آ گئے۔

”یہ میری بیوی ہے قد سیدہ..... تم سے ملنے کا اسے بہت شوق تھا.....“
 میرے سامنے جوان سال خوبصورت حسیب نیازی کے ساتھ ایک جوانی پٹی، مرجھائی سی میلی میلی خاتون کھڑی تھی،

جس کے چہرے پر لجاجت آمیز مسکراہٹ، معافی کے انداز میں پھیلتی تھی۔ میں نے دل میں اس بے جوڑ شادی پر غصہ کیا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ خاں صاحب نے بھی تو خاندان سے باہر شادی کی تھی اور میں کسی طور پر ان کا مقابلہ نہ کر سکتا تھا۔ پھر سجاد تھا..... اشتیاق تھا..... خالد آفتاب تھا..... جاوید طارق تھا۔

ان روایت توڑ پٹھان بچوں نے خاندان سے باہر شادی کر کے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچادی تھی کہ خاں صاحب کے مرد گھر سے باہر جب بھی چناؤ کرتے تھے ہمیشہ برامال خرید کر اسے سرکا تاج بنا لیتے تھے اس لیے نہیں کہ ہمیں بے مائیگی کا علم نہیں تھا بلکہ بات صرف اتنی تھی کہ انہیں اپنی Commitment کا ہمیشہ پاس رہتا۔ وہ کسی غلط فیصلہ کر بیٹھنے سے اس سزا کے سزاوار بن جاتے۔

منیر نیازی اپنے سے عمر میں بڑی خاتون کے ساتھ بڑی محبت سے دن گزارتے گزارتے بالآخر اپنے پینچے جب ان کی بیگم داغ مفارقت دے گئیں اور وہ ایک بار پھر تہوارہ گئے۔ منیر نیازی بھی آتے رہے اور طفیل نیازی بھی۔ ایک روز جیلہ اختر اس وقت آئیں جب طفیل بھائی عمر تھے۔

جیلہ دراز قد، خوبصورت اور مرآت والی روح تھی۔ شہر کے ایک معتبر رئیس میر صاحب کی بیگم تھیں۔ میر صاحب دنیا سے رخصت ہو گئے تو جیلہ کو تین بچے دے گئے۔ ایک بیٹی امریکہ میں بیاہی گئی ہے اور دو بیٹے اچھے مقامات پر جیلہ کے لیے باعث فخر ہیں۔

ان دنوں جیلہ کے پاس اس کی آواز قہقہے کا ویزا تھا۔ وہ بڑی خوبصورتی سے ڈائلاگ ادا کرنے کی اس کا قہقہہ باعث شہرت تھا۔ اسی قہقہے کی بدولت وہ طفیل نیازی سے متعارف ہوئی۔ جب سُر کے رسیانے جیلہ کی ہنسی سنی تو خاں صاحب سے پوچھا: ”یہ کون سُر میں ہنس رہی ہے؟“ خاں صاحب نے جیلہ کو آواز دے کر بلایا۔ تعارف کرایا۔ ”یہ ہماری ڈرامہ واگس ہے۔ میرے ڈراموں میں عموماً یہی سنٹرل کردار ادا کرتی ہے۔“

طفیل نیازی نے بڑے اشتیاق سے کہا: ”بی بی! میرے پیچھے پیچھے ذرا سرگم گاؤ۔“ جیلہ اختر نے بڑی سہولت سے خوفزدہ ہوئے بغیر سرگم کا تعاقب کیا۔ پھر کسی ٹھہری کا مکھڑا گایا۔ یہ بھی جیلہ کے لیے کچھ مشکل نہ تھا۔ لوک گیت کے اونچے سروں میں طفیل کمرے میں گونج پیدا کر دی۔ جیلہ اختر نے اس گونج کی بازگشت سنا دی۔ بڑے امتحان میں پاس ہونے کے بعد جسے پروا تھی۔ ایک بڑے فنکار کی طرح اسے کام کر چکنے کے بعد کبھی گھبراہٹ کا احساس نہ ہوا تھا۔ ”لو بی بی اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنا شاگرد بنا سکتا ہوں۔“

مجھ پر حسد کا بم گولا گرا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ جیلہ جو میری چھوٹی سی اور خاں صاحب کی بڑی بیٹی یوں اس کی پذیرائی ہوگی۔ پرستار عموماً قابل اعتبار نہیں ہوتے۔ کچھ دنوں کے بعد مجھے پتہ چلا کہ طفیل بھائی جیلہ کے استاد ہیں اور اس کے گھر جا کر اس کی تعلیم فرماتے ہیں۔ میں نے کبھی طفیل بھائی کا ذکر اس سے نہ کیا۔

مجھے تو ایس حسد کی یلغار کے بعد اس کے تعاقب کا وقت بھی نہ ملا۔ جیلہ ہمارے گھر چھوٹی بہنوں کی طرح آنے لگی۔ سن آباد ہی میں رہتی تھی۔ پھر وہ ایک دن اپنے ساتھ صابرہ سلطانہ اور اس کی بیوی روجی کو لے کر آ گئیں۔ یہ سنہ سی تھیں جنہوں نے ”اُپے برج لہور دے“ میں جیل بسل کے ساتھ سیکوجی کا معرکتہ آرا رول کیا تھا۔ صابرہ نے خوش لباس اور اپنا آپ نہ منوانے والی خاتون تھیں۔ وہ بہت کم شلو اور قمیض پہنتی تھیں۔ عموماً ہلکے پھلکے رنگوں کی لباس پہنتی تھیں۔ جیلہ اختر اور وہ چند بار اکٹھی آئیں۔

پھر ہمیشہ کی طرح صابرہ اور روجی خاں صاحب کی زیادہ جیتی بن گئیں اور جیلہ دیکھتی رہ گئیں۔ یقیناً جیلہ پر بھی یہ پڑا ہوگا لیکن اس نے کبھی منہ سے اظہار نہ کیا اور ہولے ہولے پیچھے ہٹ گئی۔

ایک خطرہ ہمیشہ دوستی میں رہتا ہے۔ جب کبھی کوئی شخص اپنا دوست اپنے کسی دوسرے دوست سے ملواتا ہے تو یہ خطرہ ہے کہ جب تمہارے یہ دونوں دوست بہت قریب آجاتے ہیں اور آپ کی لٹی کر دی جاتی ہے۔ اس بات کو کیا کیا احتیاط سے اہل پسند ہے۔ جب کوئی بنا بنایا رشتہ تھالی میں رکھ کر پیش کیا جاتا ہے جو قابل اعتماد بھی ہو تو پھر انسان اس رشتہ میں پورا نہیں اتر سکتا اور غوطہ لگا جاتا ہے۔ ایسے ہی جیلہ بھی ڈبکی لگا گئی۔

479۔ این میں جب یو ایس آئی ایس ریڈیو پاکستان گویا خاں صاحب کی عادت کا حصہ بن گیا۔ ایک اور مرتبہ نکالا اور گھر پر بڑے زور کی دستک دی۔ یہ دستک ناہید کی تھی۔ آپا فرخندہ کی بیٹی ناہیدہ.....

میں شاید پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ اقلیت ہمیشہ مٹھی بند معاشرے میں اپنا تحفظ محسوس کرتی ہے۔ وہ اپنی صورت و رواج، لباس، انداز گفتگو زبان کے پیچھے مرٹنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ اکثریت کے دریا میں اپنی ناؤ بہاؤ کے لیے لڑتے ہیں، پر چلو بھر پانی کشتی کے اندر آنے نہیں دیتے۔

میں لوگوں کی تبدیلی جب بھی آتی ہے خاندان کے کسی فرد کی انفرادی سوچ کے ہاتھوں آسکتی ہے۔ جب سے باہر شادی کرنے کا ارادہ کر کے خاں صاحب نے پُرسکون پانیوں میں تلامہ برپا کیا تو خود ان کے اپنے اندر کی خواہش نے احترام جرم احساس کمتری اور حزن و ملال کے چھوٹے چھوٹے بھنور پیدا کر دیئے۔

اس بار ناہیدہ نے اس تبدیلی کا شوشا چھوڑا۔ اسے حسن اتفاق یا شومئی قسمت کے باعث قدسیہ سے محبت ہو گئی تھی۔ محبت میں ویسا ہی اعتماد تھا جیسا خاں صاحب نے مجھ پر کیا۔

خاں صاحب گھر پر نہیں تھے۔ بچے اور میں سن آباد 479۔ این کے بیرونی برآمدے میں بیٹھے تھے۔ کچھ دیر بعد ترین سائیکل لوجسٹ کی بیوی کا چھاپنے بچے کو پر ام میں دھکیلتی لے گئی تھی۔ اس وقت ہمیشہ کی طرح حیا کی مورت کی طرح کچھ سکنے والی ناہیدہ کلفا اتر آئی۔ اس کے ساتھ بچوں کا ایک ٹرائی سائیکل تھا۔ اس نے نوکی کو سائیکل پکڑایا جو اس کو بٹھا کر گلی کی طرف لے گیا۔ اشیر خاں میری گود میں سو رہا تھا۔ اس لیے وہ سائیکل Excitement میں شامل

”قدسیہ آ پا۔“

”جی۔“

”قدسیہ آ پا۔“

”ہاں کہو؟“ میں نے استادوں کی سی دھمکی کے ساتھ کہا۔

”قدسیہ آ پا۔“

”بتاؤ ناں ناہید۔ کسی نے کچھ کہا ہے؟“

”آپا جی جواد..... سجاد؟ کوئی؟“ اس نے دائیں بائیں کچھ ذومعنی سا سر ہلایا۔

”اچھا میں پرے دیکھتی ہوں۔ تم ہمت کر کے کہہ ڈالو۔“

”وہ جی آپ کو پتہ ہے ابولیمیا گئے ہوئے ہیں۔ اب آپا کا بھی ارادہ ہے کہ وہ ابوجی کے پاس چلی جائے۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔ اس میں بسور نے کی کیا بات ہے؟ ہر بیوی کو شوہر کے پاس ہی رہنا چاہیے۔“

”اتنا آسان نہیں قدسیہ آ پا..... میں جہلم چھوڑ کر نہیں آ سکتی۔“

جہلم کا نام سن کر مجھے یاد آیا کہ اب ناہید میری شاگرد نہیں تھی۔ ناہید کلغا آپا فرخندہ کی بیوی تھی۔

پرائم گلاس فیکٹری والوں کی بہوتھی۔ اس کے سر سعید احمد خاں بڑے اصولوں کے آدمی تھے اور ان کے

بھائی رشید احمد خاں جن کی ناہید بیوی تھی، جہلم سے گہری محبت رکھتے تھے وہ بھلا ناہید کو کیونکر جہلم چھوڑنے

اجازت دیتے۔

”لیکن جہلم چھوڑنے کی ضرورت کیا پیش آئی ناہید؟“

”وہ جی..... بات یہ ہے کہ جواد کے دسویں کے امتحان ہیں۔ بلال بھی ایک سال بعد دسویں کا امتحان

گا..... نبیلہ آپ جانتی ہیں تھوڑی سی ایب ٹارل ہے۔ اس کی ساس دیور اور نبیلہ کا شوہر افضل خاں ابھی

36۔ جی میں ہیں۔ نہ نبیلہ گھر داری کر سکتی ہے نہ بے بے جی..... پھر بتائیے آپا جی کس کے پاس 36۔ جی کا تھوڑا

جائیں..... سجاد اور عمر تو خیر..... اپنے فیصلے کر سکتے ہیں لیکن جیونی رمضان اور یہ باقی سب ان سب کی ذمہ داری

اٹھائے؟“

بچے ٹرائی سائیکل پر خوش گلی میں آ جا رہے تھے۔

”قدسیہ آ پا جواب دیں ناں..... آپ 36۔ جی آ جائیں گی.....“

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں ناہید لیکن کیا خاں صاحب مان جائیں گے؟“

”بس ٹھیک ہے آپ مان گئیں تو وہ آپا مان جائیں گے۔ اب میں خوشی سے جہلم جا سکتی ہوں۔“

اس نے جھینپتے ہوئے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔

میں نے بھی گرم جوشی سے ہاتھ دبایا۔

”تم فکر نہ کرو ناہید..... آپا جی کو مزے سے جانے دو..... وہ برسوں بن باس سہہ چکی ہیں۔“

اس رات خاں صاحب یو ایس آئی ایس سے لوٹے تو تھکے ہوئے تھے۔ مارلاک اور انہوں نے

وی او اے کے پروگرام کا زائچہ بنایا تھا۔ خواجہ سلیم بیچوں کی طرح آنکھیں کھولے ساتھ ساتھ تھے۔

کھانے کے بعد ہم دونوں صحن سے ملحق برآمدے میں چارپائی پر سونے کے عادی تھے۔ بچے اندر والے کمرے کے ساتھ سوتے تھے۔ رات گئے میں نے خاں صاحب کا کندھا ہلا کر کہا۔

”خاں صاحب آپ جی لیبیا جا رہی ہیں۔“

”کون سی آپ جی؟“

”آپا فرخندہ۔“

”اچھا تو جائیں۔ سو جاؤ اب۔“

”کیوں؟“

”کیوں کیا سو جاؤ؟“

”ووہم اگر..... یعنی اگر ہم 36۔ جی شفٹ کر جائیں تو پھر آپ تسلی سے جا سکتی ہیں۔ ورنہ.....“

”بھائی سو جاؤ آ خر صبح بھی تو ہوگی ناں۔ تب یہ رنڈی رونا کر لینا۔“

”دیکھیں ناں خاں صاحب! جو ادنے دسویں کا امتحان دینا ہے۔ بلال..... بھی پڑھ رہا ہے..... نبیلہ اس کی بے

”خاں اشرف..... اور پھر ان کے نمک خوار جیونی رمضان..... ان کو..... یہ سب کیا کریں گے۔“

”قدسیہ..... ہمارے اپنے بہت مسائل ہیں۔ میں کسی اور کے پھنڈے میں کیسے ٹانگ پھنسا سکتا ہوں۔ قدسیہ

”میں کہہ رہی ہوں۔ تم ہمیشہ بغیر سوچے سمجھے Commitment کر لیتی ہو..... کیا تمہیں کبھی خیال نہیں آیا کہ تقریباً ایک

”میں نے لیا ہے۔ مثبت سوچ کا آدمی جب کوئی عمل کرتا ہے تو پھر اس کے فیصلے سے نہ کسی کو نقصان پہنچتا ہے نہ اس کا اپنا حرج

میں نے لجاجت سے سر جھکا لیا۔

مجھ میں ایک کمال کی کم عقلی موجود ہے جو ثابت کرتی ہے کہ میں ’رج‘ کے ناقص العقل ہوں۔ مجھ میں ہر کام کو

کے اس قدر شوق و ولولہ اور Motivation بھڑک اٹھتی ہے کہ میں کبھی نہیں سوچتی کہ کام میرے بس کا نہیں۔ اسی

بے کے تحت جب میری شادی ہوئی، میں باورچی خانے میں گھس گئی۔ مجھے روٹی پکانا نہیں آتی تھی، لیکن میں نے سیکھنے

کے لیے نہ میری خود اعتمادی میں ہی کمی آئی۔ میں بغیر سوئمنگ سیکھے پانی میں کود جانے والی تھی۔

میں کھکھو ڈیڈی کی خصوصی طور پر شکر گزار تھی۔ انہوں نے والدین کی مرضی کے خلاف میرا اور خاں صاحب کا

”میرا حویلی تھا۔ وہ کھانے پینے کے شوقین تھے۔ مجھے کہنے لگے۔

”کا کی! میرے لیے روٹی پکا..... سالن میرے ڈبے میں ہے۔“

میں باورچی خانے میں گئی۔ حسن اتفاق سے گندھا ہوا آنا موجود تھا۔ میں نے بے ڈھنگی سی روٹی بیلی۔ قریب

”میرے کا بڑا ڈبہ پڑا تھا۔ اس کو روٹی پر گھمایا اور تھوڑا سا تھپ تھپ کر کے روٹی توے پر ڈال دی۔ حسن اتفاق سے کسی

”میں نے مدد کی۔ روٹی پھول کر لپکا ہو گئی۔ میں روٹی لے کر ساتھ والے کمرے میں بھاگی۔

”ڈیڈی جی خوب خوش ہوئے.....“ دیکھا شوق تو کہتا ہے یہ کھانا پکانا نہیں جانتی۔ میری منوسب کچھ جانتی ہے۔“

خاں صاحب نے لمحہ بھر کو میری طرف دیکھا۔ حیرانی سے روٹی پر نظر ڈالی اور چپ ہو گئے۔ وہ میرے Image سے خوش ہوا کرتے تھے۔

صدیقہ بیگم کا بیاہ جب جاوید طارق خاں سے ہوا تو اس کی عمر بمشکل سولہ برس کی تھی۔ وہ بھی لاڈلی بیٹی تھی۔ کام کاج سے فارغ رہی تھی لیکن ڈالڈاروٹی پریکٹس میں وہ بھی جلد روٹی پکانا سیکھ گئی۔ (میں نے سری پائے پکانے کیسے یہ بھی کبھی کھکھو ڈیڈی کے حوالے سے بتاؤں گی۔)

جب میں نے بچوں کو پڑھانے کی ذمہ داری اٹھائی تو مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حروف تہجی کتنے ہیں۔ ڈی میں کون سے حرف Vowels کہلاتے ہیں، لیکن کمر بستہ ہو کر بچوں کو پڑھاتی گئی اور بخدا اچھے خاصے بچے ماردی۔ انہیں پڑھائی سے اس قدر نفرت ہو گئی کہ وہ کلاس میں چھوڑ کر بیچ پر باہر بیٹھنے لگے۔ کالج جاتے لیکن باہر اول سن کر آ جاتے۔ اپنے بیٹوں کے تعلیمی مشاغل کی داستان میں پھر کبھی آپ کو سناؤں گی.... اب صرف یہ بتانا مقصود ہے نے بغیر سوچے تھے 36۔ جی جانے کا فیصلہ کر لیا۔ خاں صاحب نے ہمیشہ کی طرح میرے وعدے کا پاس کیا۔ مکانی کے لیے کمر بستہ ہو گئے۔

خاں صاحب اس تبدیلی کے لیے ہرگز ہرگز نہ ذہنی طور پر نہ جسمانی اعتبار ہی سے تیار تھے۔ اس وقت آئی ایس میں چودھری تھے۔ انہیں سمن آباد ڈوگنی گراؤنڈ اور 479۔ این سے بڑا گہرا لگاؤ تھا۔

جس روز ہم سب سمن آباد چھوڑ کر ماڈل ٹاؤن گئے۔ مجھے نئی ذمہ داریوں کے متعلق کچھ علم نہیں تھا لیکن صاحب فاروقی کی دکان درزی جمیل کا درزی خانہ جہاں سے بچوں کے یونیفارم بنواتے تھے، سہزی والے ماتھے سہزیوں سے لدے ٹوکرنے، بچوں کا سکول مین سڑک سے ملحق جوتوں کی دکان اور وہ راستہ جس سے وہ کئی برس کی موٹر سائیکل سے آتے جاتے تھے اور پھر یہی راستہ جہاں انہوں نے قدرے خوشحال ہونے کے بعد موٹر سائیکل Lambretta خریدی تھی.... یہ راستے، دکانیں، ہم شکل گھر، ساری بستی کو دل میں بسائے 36۔ جی ماضی سے سبکدوش ہو کر نیا کورا صفحہ الٹنے کے عادی نہ تھے۔ ہر نئی تحریر کے ساتھ پرانی لکھت ساتھ چمٹی چلی آتی۔ صحبتیں پیچھے نہ رہ سکیں، اذیت دینے کے لیے ساتھ آ گئیں۔

آپاجی کے پاس جانے سے پہلے غیرت مند پٹھان بچے نے اپنی بڑی بہن سے یہ طے کر لیا کہ وہ ہرگز انہیں دوسوروپہ کراہیہ دیتے رہیں گے۔ اسی قدر ماہانہ وہ سمن آباد کے گھر کے لیے دیتے تھے۔

سامان ریزہوں پر روانہ ہو گیا۔ خاں صاحب کی لائبریری کا سب سے زیادہ فکر تھا۔ تین ریزے اور رسالوں سے لدے تھے۔ محمد علی جو ”داستان گو“ سے ہمارے ساتھ تھا، ان ریزہوں کی نگرانی کے لیے سائیکل پر نہیں کس موٹر پر اور کیسے ایک ریزہ والا جس پر رسالے لدے تھے، محمد علی کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور سید حامد کے سامنے رڈی والوں کی جانے کس دکان پر سارے رسالے بیچ باج کر چھپت ہو گیا۔

سامان کی نگرانی خاں صاحب اور ریاض محمود کر رہے تھے۔ ریاض محمود تب ریڈیو سٹیشن میں سکرپٹ ڈیپارٹمنٹ میں تھے اور خاں صاحب کے ان چند عقیدت مندوں میں سے تھے جن کا رویہ ہمیشہ ایک سارہا۔ وہ خاں صاحب کے

تھے، لیکن پھر بن باس لینے والے جوگی کا دل لگانے شام کو راج گڑھ روڈ سے روز آتے۔ ایسی وفاداری بشرط
میں دیکھنے کو ملتی ہے، لیکن خاں صاحب میں کوئی عجیب سی گیدڑ سٹنگھی تھی۔ جو ایک بار ان کے دام محبت
پر نہ پھر وہ کبھی رہائی چاہتا نہ اسے رہائی ہی ملتی۔

خاں صاحب سمن آباد چھوڑنا نہ چاہتے تھے انہیں اس کی سڑکوں سے، مین بازار سے، باندرا درمی، سکول کی گراؤنڈ
سے ایک خاص قسم کی انسیت پیدا ہو چکی تھی۔ اسی گھر میں پہلی بار انہیں Norelco کا شپ ریکارڈر ملا تھا۔
اس بار ان کے پاس ذاتی ریڈیو آ گیا تھا۔ اس ریڈیو کی بھی ایک چھوٹی سی کہانی تھی۔ خاں صاحب کو ریڈیو کی
اپنے پروگرام کو مانیٹر کرنے کے لیے وہ کسی کے گھر جا کر اسے سننا گوارا نہ کرتے۔ کسی دکان پر باقاعدگی
کی فرمائش نہ کر سکتے تھے۔ اپنا ریڈیو وہ مزنگ روڈ سے چلتے وقت خالد آفتاب کو دے آئے تھے اور اسے
بھی کبھی انہیں آ نہیں سکتا تھا۔

پھر رب نے ان کی سن لی۔

ایک روز بھائی ابو الحسن آئے تو ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا ریڈیو تھا۔ جس پر میڈیم ویو بھی اس
تھا گویا کوئی پاس بیٹھا پاتیں کر رہا ہے۔ بھائی ابو الحسن پولیس میں تھے اور خاں صاحب کے بچے
سے ملاقات بہت بعد میں ہوئی۔ یہاں سمن آباد میں مجھے اس قدر معلوم تھا کہ ایک صاحب جو کھرج
اور ہر پولیس کی طرح دیر تک اپنی بات سمجھانے میں لگا دیتے ہیں، آیا کرتے ہیں۔ کئی بار خاں صاحب
سے آگے نہ بڑھتے۔ کھڑے کھڑے باتیں کرتے رہتے اور پھر اپنی جیب میں روانہ ہو جاتے۔ بعد
ان کی پولیس ہو گئے۔ ان کی بیگم سعیدہ جی سے بعد میں میری دوستی ہو گئی.... لیکن ابھی سب کچھ پردہ غیب میں
آئی جی پولیس بھی نہ تھے۔

خاں صاحب ابھی تو اس ماحول کا حصہ تھے جسے بھول جانا خاں صاحب کے بس کی بات نہ تھی۔ 36۔ جی پہنچ کر
میں باہر برآمدے میں چپ چاپ بیٹھ جاتے۔ ان کی نگاہیں سامنے والی نیم دائرہ سڑک پر ہوتیں۔ وہ یہاں سے
آئی سڑکوں پر چاٹکتے، کبھی دم کے اس راستے پر جو وایا کٹونی سے یونیورسٹی کی طرف جاتا تھا۔ کبھی 1۔ مزنگ روڈ
سڑک کی بجائی والی سڑک پر سائیکل لے کر چلے جاتے.... کبھی مری کی پہاڑیوں پر کھو جاتے۔ ان کے لیے ہر جگہ ہر
بن باس بن جاتے جس میں یادوں کے علاوہ کچھ زندہ نہیں ہوتا۔

ہاں ایک تشفی ریاض محمود کی شکل میں موجود تھی۔

وہ شام کے وقت آ جاتا۔ تب اس کی ساعت ٹھیک تھی اور وہ بآسانی خاں صاحب کے ساتھ وقت گزار سکتا تھا۔
اپنی دن بھر کی مصروفیات بیان کرتا۔ دونوں شعبہ بازوں کی طرح.... بازی گروں کی مانند کبھی ماضی
مستقبل میں چکا چوندا پیدا کرتے رہتے۔

کبھی کبھی خاں صاحب کی گہری چپ سے پریشان ہو کر ریاض سوال کرتا۔

”خاں صاحب! کیا بات ہے آپ خوش نہیں لگتے۔“

”یہ قدسیہ کا فیصلہ ہے شاید وہ خوش ہو؟“

ریاض ویسے ہی ایک کان کا آدمی ہے۔ ایک کان سے کم سننے کی وجہ سے وہ پوری انفرمیشن کئی بار مس کر بیٹھتا ہے۔ اسی لیے اس میں بچوں جیسی معصومیت ہمیشہ غالب رہتی ہے۔

”وہ..... وہ آ پاجی تو ہمیشہ خوش رہتی ہیں جی ان کی کیا بات ہے۔“

خاں صاحب لمحہ بھر کو ہولے سے کھنگارے۔ پھر بولے: ”خوش نصیب ہے نہ اس کو کوئی سوال ستاتا ہے۔ احساسِ جرم کی کبھی شکار ہوتی ہے..... کسی کو قتل کرنے کے بعد بھی وہ راضی خوش رہ سکتی ہے۔“



ایک سو سال
ڈاکٹر
کلام

مکتبہ سیرت نوکام

36۔ جی، ماڈل ٹاؤن

ماڈل ٹاؤن میں آمد خاں صاحب کے لیے بڑا بوجھل فیصلہ تھا۔ شامیں اُن کے لیے خاص طور پر لمبی اور نرم انگینز تھیں۔ جی سکھوں کا چھوڑا ہوا چھ کینال پر پھیلا ہوا قدرے بوسیدہ صورت بن گیا تھا۔ اس گھر کے دو بچا تک تھے۔ ایک بچہ ایک سکول کے رُخ پر تھا اور دوسرا ماڈل ٹاؤن کی لائبریری کی جانب۔ اس گھر کے سامنے ماڈل ٹاؤن کی دو رو یہ تھیں۔

اگر اس گھر کے برآمدے میں کھڑے ہو کر دیکھتے تو سامنے ایک Oval شپ کی Unkept لان تھی، جس میں کچھ کھجوریں تھیں۔ اس میں تالا ڈالنے کا رواج نہ تھا۔ دائیں جانب سے داخل ہو کر نیم دائرے سے چل کر پورچ آتی۔ اس کے سامنے ایک کن عہد کی یاد دلاتے۔

پھر تین سبزھیاں چڑھ کر برآمدہ تھا، جس میں پنگ پانگ کا میز دھرا تھا۔ جواد، بلال اور میرے بچے یہاں پنگ پانگ کھیلتے تھے۔ ایلچی کے درخت پر چڑھنا بھی ان کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ برآمدے کے دونوں پہلوؤں پر ایک کمرہ تھا۔ ایک میں جواد رہتا تھا۔ دوسرا ڈاکٹر ایوب کا کمرہ تھا، جواد جی کی تحویل میں چلا گیا لیکن خاں صاحب نے اسے استعمال نہ کیا۔ اسی کمرے سے ملحق ایک غسل خانہ تھا، جس میں سفید ٹائلیں لگی تھیں۔

اس کے ساتھ ایک بہت بڑا کمرہ تھا جس میں خاں صاحب، بچے اور میں رہتے تھے۔ نانا آ جاتیں تو وہ بھی کمرہ کرتیں۔ اس کمرے سے جڑی ہوئی چھوٹی سی پینٹری اور باورچی خانہ تھا۔ ایل شپ برآمدے سے گھر کے اندر کے لیے ایک لمبی گیلری تھی جس میں دائیں ہاتھ پر بیڈروم سے مشابہ بڑا سا ڈرائنگ روم اور اس کے ساتھ جڑا ہوا کمرہ تھا جس میں بلال رہتا تھا۔

جواد اور بلال کے کمروں میں ایک سانچا دروازہ تھا۔ گیلری ایک طرف تو پچھلے برآمدے میں کھلتی تھی۔ ایک شاخ ڈرائنگ روم کے ساتھ ساتھ ایک غسل خانے کی طرف جاتی تھی، جس میں سفید ٹائلز لگی تھیں اور ٹائلٹ Squating فلش لگا تھا۔ اس گیلری سے اوپر نیم چھتی کی سبزھیاں کھلتی تھیں۔

اس نیم چھتی میں خاں صاحب کی ساری کتابیں، رسالے، کاغذیں تہہ در تہہ ڈھیر کر دی گئیں اور تعجب کی یہ بات ہے کہ ان کو کبھی الماریوں میں لگانے کا خاں صاحب کو خیال نہ آیا۔ کتابیں عجب کمپرسی کی حالت میں پڑی رہیں اور طرح طرح ہر انسان کا ماضی اُسے پکارتا رہتا ہے، ایسے ہی وہ خاں صاحب کی منتظر رہتیں۔

عین ڈرائنگ روم کی پشت پر گیلری کے ساتھ ساتھ دو کمرے تھے۔ ایک تو ہم نے ڈائمنگ روم بنالیا اور ساتھ دوسرا کمرہ جو آفرخندہ کا تھا، یہ خاں صاحب کی تحویل میں چلا گیا۔ باورچی خانے کا دروازہ، کھانے کے کمرے کے کمرے اور آباچی کے کمرے کا دروازہ سمیت گیلری کے دروازے کے ایک بڑے کشادہ برآمدے میں کھلتے تھے، جس میں کون کون سفید پتھروں کی شطرنج چھپی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کھلا صحن تھا جس میں جو اداسائیکل پر بچوں کو ’ہوئے‘ دیا کرتا تھا۔ برآمدے کے بائیں طرف صحن کے پار ایک کھلا باورچی خانہ اور گودام تھا۔ ہم عموماً اسی باورچی خانے میں لے لے لے سے میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ صحن میں باورچی خانے کے باہر ایک بڑا سا ٹاہلی کا درخت تھا جہاں چوٹی کا تیلے چولہا جلتا۔ صحن کے پچھوڑے چاروں طرف اونچی دیوار تھی اور عین باورچی خانے سے دوسری سمت غسل خانہ تھا۔ چوٹی، رمضان کی تحویل میں تھا۔

صحن میں ٹاہلی کے علاوہ دو درخت بیری کے بھی تھے، جن کو نہ جانے کب پھل لگتا۔ کب بیر جھڑتے۔ کون کون کون توڑتا۔ اس غسل خانے کے علاوہ ایک پرانی وضو کا چھوٹا سا بغیر چھت کے نہانے کا غسل خانہ تھا، جس کے ساتھ باہر کی جانب ایک دروازہ کھلتا تھا۔ اس دروازے سے نکل کر کوٹھی کی دیوار سے ملحق تین سروٹ کوارٹر تھے، جن کے سروٹے دو پیڑ آموں کے تھے۔ یہ قلمی آم نہیں تھے۔ ایک اچاری آموں کے کام آتا تھا، دوسرا کھٹا میٹھا سب کھاتے۔ سستے سستے تھے۔ کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ یہ سائینڈکچن گاڑڈن سے مشابہت تھی۔

گھر کے ملازم رمضان، مالی اور چوٹی ماسی اس گھر کے کرتا دھرتا ایک قسم کے مالک ہی تھے۔ سروٹ کوارٹر کی طرف ایک ہتھی نکا تھا، جس سے رمضان بھائی اس کچن گاڑڈن کو پانی دیتے۔ اشیر خاں ابھی بھائیوں کے ساتھ ڈو پبلک سکول نہیں جاتے تھے۔ وہ چوٹی ماسی کے بیٹے ظلیل کے ساتھ یہاں ہی کھیلتے رہتے اور ہماری بے خبری کا یہ سہارا کہ ہم نے کبھی نہ اشیر کی نگرانی کی نہ اُسے کبھی ٹوکا ہی کہ وہ باہر کوارٹروں کی طرف نہ کھیلتے نہ کبھی یہ وہم ہی ہوا کہ وہ کبھی نہ سیکھ رہا ہے۔

میں عجب غفلت کی ماری ہوئی ماں تھی۔ مجھ پر ہندو سوچ کا گہرا اثر تھا۔ ہندو مسلمانوں کو پیچھے اور شودر سمجھتے تھے۔ میرا اپنا تجربہ ہے ہندوؤں کے ہمسائے میں رہ کر میں نے اُن کی برہمن جاتی سے کچھ تکبر بھی حاصل کر لیا تھا۔ میں ہندوئی کی طرح اپنے آپ کو ٹھیک سمجھتی اور اپنا کہا منوانے کے چکر میں رہتی۔ وقت Disillusionment کا تھا اور ارتقا اسلامی راستہ تھا لیکن میں اسلامی اخوت کا سبق سیکھی ہی نہ تھی۔

میری روح ہندو استری کی تھی۔ میں پتی دھرم اور پتی بھگتی کے مسلک پر کار بند تھی۔ میری ڈکشنری میں اسلامی شادی کا کوئی تصور نہ تھا۔ تعدد ازواج، طلاق، خلع، پسند کی شادی، برابری کا دعویٰ، منفرد حیثیت وغیرہ میرے نزدیک گالی تھی۔ میں گواہ و اگواہ کی تشریح کو بھی بخوبی نہ سمجھتی تھی لیکن میرے نزدیک ایک ہی شوہر سے جنم مرن کا ساتھ تھا۔

اس کے اس پہلو پر یقین رکھتے ہوئے میں کئی Monogamist تھی۔ ممتاز مفتی نے سب سے پہلے میری اس خوبی کو بھانپ کر مجھ پر مضمون لکھا تھا۔

جب تک خاں صاحب گھر رہتے، میں سائے کی طرح اُن کے پیچھے لگی رہتی۔ مجھے ہر لحظہ اُن سے چھڑ جانے کا خوف تھا۔ جونہی وہ مرکزی اردو بورڈ چلے جاتے میں لکھنے لکھانے میں مشغول ہو جاتی۔ بچے سکول سے لوٹتے، باورچی کے سامنے بیٹھ کر ہم کھانا کھاتے۔ پھر ہم چاروں سو جاتے۔ سر پر سے بلانا لے کر انداز میں مٹیں انہیں کھانے کی میز کے سامنے کر پڑھاتی۔ نہ مجھے اُن کی پڑھائی کا خاطر خواہ علم تھا نہ میں سائنس کے متعلق کچھ جانتی تھی۔ مجھے ان کی تربیت کی کوئی سمجھ بوجھ نہ تھی۔

1965ء کی جنگ میں جب بھارت کے طیارے گھر کے اوپر سے گزرتے تو میں بچوں کے لیے کبھی خوفزدہ نہ ہوتی۔ خاں صاحب نے اُن دنوں بچوں کو ساتھ سلانا شروع کر دیا اور جب نانا میری والدہ خوفزدہ ملتان سے آئیں اور یہیں کہستان زمینوں پر لے جانا چاہا تو خاں صاحب نے بخوشی اجازت دے دی۔

میرا حال اپنے لوزرڈل کلاس کے جہلا جیسا تھا جو ہوائی جہازوں کی Straffing دیکھنے چھتوں پر چڑھ کر نظارہ کرتے تھے۔ جو آج بھی بچوں کی گروپس کٹا دیتے ہیں، لیکن دھاتی تاریں پتنگ بازی میں استعمال کرنے سے نہیں ہکتے۔ اسی جہالت کے باعث میں نے اپنے بچوں میں خود اعتمادی کا وہ بیج نہ بویا، جو مثبت محنت کا ثمر ہوتا ہے۔ میں نے انہیں مسابقت، آگے بڑھنے اور اپنے کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی کوئی تربیت نہ دی۔ میں خود غافل، مست و بوجد اور اپنے شوہر کے بعد اپنی ذات میں مشغول رہنے والی عورت تھی۔ اسی لیے جب میرے بچوں پر ذمہ داریاں پڑیں تو وہ کھلا گئے اور گہرے حزن کا شکار ہو گئے۔

میں جب نئے گھر 36۔ جی میں پہنچی تو یہاں کے باسی میرے لیے مکمل طور پر اجنبی تھے۔ میں نے آپ کو بورڈ کی غرض سے نہیں بلکہ اس نیت سے گھر کا نقشہ بیان کیا ہے کہ مکان کا ٹیکس پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ محلوں میں رہنے والے کو کچھ اور طرح سوچتے ہیں اور جھونپڑیوں کے باسی اپنی سوچ میں کوئی اور زاویہ نگاہ رکھتے ہیں۔

آپ شاید اسے طبقاتی تفریق پر محمول کریں لیکن میرے نزدیک درو دیوار، کھڑکیاں، فرش، پردے، ہر وقت سے والی چھت، سرکنڈوں کی اُساری ہوئی دیواریں کچھ اور قسم کی سوچ پر مائل کرتی ہیں اور جب انسان مختلف موسم، کسی جگہ کسی ماحول میں رہتا چلا جاتا ہے تو اس کا رویہ، سوچ اور عمل میں عادت کا عنصر غالب آ جاتا ہے۔

سمن آباد اشفاق صاحب کی عادت بن چکی تھی۔ سمن آباد سے پھڑنے کے بعد دیر تک وہ راتوں کو جاگتے رہتے۔ وہ اپنے پرانے ماحول سے بچھڑ کرنے میں adjust نہیں ہو رہے تھے۔

مجھے خیال آ رہا ہے کہ اشفاق صاحب جب اپنے اصلی گھر رخصت ہو گئے تو سب سے زیادہ میری نیندوں پر اثر پڑا۔ سمن آباد کی بیماری کے دوران میں راتوں کو جاگنے اور بار بار جاگتے رہنے کی عادی ہو گئی تھی۔ بڑی برداشت والے اشفاق صاحب بھی ہتھیار ڈالتے جا رہے تھے۔ فجر کے قریب جب مریض، چور اور نمازی جاگنے کے عادی ہوتے ہیں میری بھی کچھ کھل جاتی۔

بستر پر کروٹیں لیتے میں نے کچھ عرصہ بعد نوٹ کیا کہ نماز سے کچھ عرصہ پہلے مسجد کی طرف سے تہجد گزری۔ گزاروں کے ذکر کی ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگیں۔ جونہی فجر سے کچھ پہلے نمازی مسجد کے راستے پر آتے۔ کھڑے جاتے اور بھونکننا شروع کر دیتے۔ سوئے ہوئے کتے عادت کے اس قدر عادی تھے کہ بھونکننا اُن کے شعور کا حصہ بن چکا۔ دن کی دوسری نمازوں کے وقت مسجد کی طرف سے کبھی کسی کتے کی آواز نہ آتی تھی۔

لیکن جب لاشعور کسی عادت میں مبتلا ہو جائے تو پھر اس عادت کا چھوٹنا محال ہے۔ میں یہ تو نہیں جانتی کہ کتے کا لاشعور کیا انسانوں کی طرح کام کرتا ہے، لیکن اُن کے بھونکنے کی عادت سے میں نے یہی اندازہ لگایا کہ گھر۔۔۔ ہوئے کا اچانک جاگ کر بھونکننا شعوری سطح پر تو ممکن نہیں۔

فجر کی اذان سے پہلے ایک دو ہوائی جہاز جو غالباً مغرب کی طرف عازم سفر ہوتے تھے، ہوا میں گونج چھینے لگی۔ ان کی آواز شیڈول کے تابع تھی لیکن مجھے لگتا جیسے یہ بے جان جہاز بھی گویا کسی عادت کے تحت سین ایسی وقت اڑتے ہوئے ہے۔ ہوائی جہاز، کتے، نمازی، اشفاق صاحب اور میں کسی ایک شیڈول کے عادی ہو چکے تھے اور عادت ہمیں ایک وقت ایک ہی سمت میں گھسیٹتے پھرتی تھی۔ اشفاق صاحب سن آہاد کے عادی ہو چکے تھے اور اس نئی جگہ میں وہ کمفر ٹیبل نہیں لے سکتے۔ اشفاق صاحب کی بڑی بہن آپا فرخندہ میرے لیے بالکل نامانوس تھیں کیونکہ کبھی اُن کے ساتھ رہنے کا ارادہ نہ ہوا تھا۔ ڈاکٹر ایوب احمد خاں ہمارے آنے پر موجود نہ تھے۔ وہ لیسیا جا چکے تھے۔ ان کے متعلق اتنی بات و ثوق سے گفتگو ہوں کہ وہ بڑے آدمی تھے۔ وہ نہ صرف ایک بڑے ڈاکٹر تھے بلکہ کردار اور سوچ کے اعتبار سے بھی بڑے آدمی کی صفات فائز تھے۔

مفتی جیسے ایسے معاملوں میں بڑی دور رس نگاہ رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت سے بڑے لوگوں کو جس دور بین نظروں سے دیکھ کر خاک کے لکھے تو ان خاکوں میں گہرائی بھی تھی اور گیرائی بھی۔ ایک روز داستان سرائے میں اشفاق صاحب اور پریکارڈنگ روم میں بیٹھے اپنی کتاب کی کتابت دیکھ رہے تھے تو اشیر اُن کے پاس چلا گیا۔ مفتی جی اور اشیر میں گفتگو تھی۔ کبھی وہ ان کے پاندان کو چھیڑتا۔ کبھی قلم دیکھنے لگتا۔ کبھی تو ام کی بوتل کھول کر سونگھنے لگتا۔ مفتی جی ہونے سے کہتے ہیں کہ وہ لیکن وہ بچوں کو جھڑکنا یا سختی سے منع کرنا گناہ سمجھتے تھے۔

”کیا لکھ رہے ہیں مفتی جی؟“ چھوٹے سے لڑکے نے سوال کیا۔

”یہ کتاب لکھ رہا ہوں۔ سب کا کام ہے سب اُگانا۔ میں اور کوئی کام نہیں کرتا، بس کتابیں لکھتا ہوں۔“

”یہ کام تو اب بھی کرتے ہیں۔ آپ کوئی اور کام سیکھ لیجیے۔“

”مثلاً؟“

”مثلاً کرکٹ۔ ہوائی جہاز چلانا۔“

اشیر کی خواہش تھی کہ وہ کرکٹ بنے اور ہوائی جہاز اڑائے۔ وہ اپنی خواہش مفتی جی کو بھی تفویض کرنا چاہتا تھا۔

”ناں یار۔ یہ نوجوانوں کے کام ہیں۔ میں اس عمر میں کچھ سیکھ نہیں سکتا۔ بس جو آتا ہے وہی کرتا چلا جاتا۔“

”بہت ہے۔“

”کیسی کتاب ہے مفتی جی؟“

”یار خا کے ہیں۔ مثلاً تمہارے باپ کا۔ شہاب صاحب کا۔ تمہاری ماں کا خاکہ۔“

”اچھا، یہ مشکل کام نہیں ہے مفتی جی؟ کیا نام رکھا ہے کتاب کا؟“

”یار ابھی نام سوچا نہیں۔ نام رکھنا ایک اور مشکل کام ہے۔“

”بڑا آسان کام ہے۔ آپ اس کتاب کا نام ”اوکھے لوگ“ رکھ دیں۔“

مفتی جی اٹھ کر تالیاں بجانے لگے۔

”پالیا..... پالیا۔ اوئے یار تو نے تو میری بڑی مشکل آسان کر دی۔ کیا نام ہے ”اوکھے لوگ.....“

ڈاکٹر ایوب احمد خاں ”اوکھے آدمی“ تھے۔ اوکھے آدمی کی طرح اُن کی توجہ اپنی خوبیوں، خرابیوں پر نہ تھی۔ وہ

تھوڑے سوچے کر گزرتے۔ انہوں نے کبھی نتائج پر غور کرنے کی زحمت نہ کی۔ انہوں نے کبھی یہ نہ سوچا کہ ان کی طبیعت

کے لیے مشکلات پیدا کر سکتی ہے۔ جب انہوں نے چاہا لندن چلے گئے۔ وہاں ایف آر سی کرنے کے بجائے اسپین

جنگ آزادی میں شامل ہو گئے۔ واپس آئے 36۔ جی میں منتقل ہو گئے۔ یہاں آٹھ بچوں کے مستقبل سے بے خبر لیبیا

چلا گیا۔ پھر ایک وقت آیا کہ کچھ بچے اٹھائے اور انگلستان میں ٹیم ور تھ چلے گئے۔

ٹیم ور تھ کے ہسپتال میں کام کیا۔ بڑی خوبصورت خیال آرا کتاب لکھی۔ اسرائیل کے جنگل سے مسلمانوں کو

بھانسی کے لیے بھائی ایوب اسپین کی جنگ میں شریک ہوئے۔ جا بجا خط بھیجے لیکن یہ فلسطین کے مسلمانوں اور اسرائیل کا

جنگ تھا۔ لائبل نظر آتا ہے۔ ہر اوکھے آدمی کے اندر ایک بے قرار سیلانی روح ضرور ہوتی ہے۔ وہ اطمینان قلب اور

سکون میں کئی راستوں کی خاک چھانتا ہے۔ بھائی ایوب نے بھی زندگی کے اصل مطالب کی تلاش میں عمر بسر کی۔

تھے۔ وہ ضرور پہنچ گئے کہ مسلمانوں کی پستی کی ایک وجہ اسرائیل کی تنگ نظری اور اسلام دشمنی ہے۔ وہ کسی طور پر بھی

اس کا دوست نہیں بن سکتا۔

بھائی ایوب کو علم نہ تھا کہ چھوٹے شہر میں اُن کی سوچ کے آدمی کی کھپت نہ تھی۔ جلد ہی انہوں نے ایک اور فیصلہ

لیا۔ Qualifications کو بہتر کرنے کے لیے لندن سدھارے۔ ڈاکٹر ایوب واقعی ایک بڑے آدمی تھے۔

Lone Wolf کی طرح راہ حیات میں کچھ اپنے وجدان، کچھ اپنے تفکر کے سہارے چل رہے تھے۔ منزل کا تعین

تھیں نے نہ کیا۔ ان کی نیت اس قدر شفاف تھی کہ غلط فیصلے کے باوجود انہیں کبھی نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

انگلستان میں بیرونی حالات نے کروٹ بدلی اور انگلستان دوسری جنگ عظیم کی لپیٹ میں آ گیا۔ بھائی ایوب

کے ساتھ پھڑکی اور وہ اسپین چلے گئے، جہاں وہ Fighting Force کا حصہ بن گئے۔ اس طرح چھ سال دونوں

بھائی نے بن باس سہا۔ آپا فرخندہ جو جی جان سے ایوب بھائی کی عاشق تھیں، مابھی بے آب کی طرح تقریباً چھ سال

تھیں۔

حتیٰ کہ جب قیام پاکستان کے وقت بابا جی محمد خاں مکتسر سے لاہور پہنچے تو آپا فرخندہ ساتھ تھیں۔ اسپین میں

بھائی کی بنا پر ایوب بھائی نے ایک کتاب یہودی لابی کے خلاف لکھی جو جرمنی کے ہولوکاسٹ کی گویا پیش گوئی تھی۔

آج جو کچھ فلسطین میں اسرائیل کے ہاتھوں West Bank میں ہو رہا ہے، اس کی واضح پیش بندی کے طور پر پیش
میں یہاں کتاب کے اقتباسات طوالت کے طور پر پیش نہیں کر سکتی۔

36۔ جی پنچ کر مجھے یہاں کی کئی پہیلیاں سلجھانا پڑیں۔

میں نے ایک دو مرتبہ آپا فرخندہ کے سب سے بڑے بیٹے سجاد کے متعلق پوچھا تو پتہ نہ مل سکا کہ وہ کہاں
اس کے اوقات کیا ہیں۔ بعد ازاں تابش سے پتہ چلا کہ سجاد تو کراچی میں رہتے ہیں اور کسی کے ساتھ مل کر کار
ہیں۔ اپنے بہن بھائیوں میں سجاد سب سے خوبصورت ہے۔ چھ فٹ سے کچھ تجاوز کرتا ہوا قد، چھریا بدن، تہ
نمین نقش۔ صاحب لوگوں کی طرح گورا چٹا۔ کچھ بھائی ایوب کی رعنائی اور دلکشی، کچھ آپا فرخندہ کا کھویا کھویا سا
وجاہت اور خوبصورتی پر طرہ یہ کہ اپنی خوبصورتی پر بظاہر کوئی گھمنڈ نہیں۔

وہاں رہتے ہوئے کچھ عرصہ گزر جانے پر مجھے تابش سے پتہ چلا کہ سجاد نے پڑھائی کو خیر باد کہہ کر کراچی
متمول گھرانے کی دراز قد صوفیہ سے شادی کر لی ہے اور وہاں اپنے سسرال میں رہتا ہے۔ اوکھے ڈاکٹر ایوب کا بچہ
بھی اوکھا نکلا اور روایات شکنی میں اُس نے پہل کی کیونکہ صوفیہ پٹھان بچی نہ تھی۔

بہت سالوں بعد جب میں 36۔ جی میں نہیں تھی تو سجاد اپنی بیوی لے کر 36۔ جی میں وارد ہوا۔ آپا فرخندہ
صوفیہ بظاہر بہت Cordial لیکن اندر ساس بہو کا رشتہ پالے ہوئے نہیں لیکن آفرین دونوں پر کہ کبھی کسی کو اندر
نہ لگندے۔

جب آپا انگلستان چلی گئیں تو سجاد اور صوفیہ ان کے ساتھ گئے۔ سجاد اور صوفیہ کو اللہ نے تین بچے دیے
ایمان احمد خاں، الطاف احمد خاں اور بیٹی عائشہ۔ میری ان بچوں سے کم کم ملاقات رہی کیونکہ جب ڈاکٹر ایوب خاں
میں ٹیم ورتھ میں مقیم تھے تو سجاد اور صوفیہ لندن میں تھے اور ہم یہاں 36۔ جی میں۔ سجاد بیکار تھا اور لندن کی ویٹنیر
وظیفہ خوار تھا۔ صوفیہ اور سجاد نے ہر چند ساتھ رہنے کی کوشش کی لیکن اوکھے سجاد میں حقیقت سے زیادہ خواب
اسے ایوب بھائی کی محنت تو نہ مل پائی، ہاں وہ ایسے ہوائی قلعے بنانے میں ماہر ہو گیا جن کی مادی تعبیر مشکل تھی۔

شادی میں طلاق کی وجوہات کو انگلی دھر کر بیان کرنا اور اعداد و شمار سے جانچنا ذرا مخدوش سا کام ہے۔
صوفیہ اور سجاد علیحدہ ہو گئے۔ جب بچے ہوں تو ملنا ملنا تو تقریبات پر ہوتا ہی ہے۔ اسی طرح یہ دونوں بھی بچوں کی
پراکٹھے ہوئے لیکن رجوع مستقل نہ ہو سکا۔

اب کچھ سال پرے سجاد نے ایک ہسپانوی خاتون ایما مارتینی سے بیاہ کر لیا ہے۔ بقول سجاد ہسپانوی
خاندانی نظام کے پیروکار ہیں اور ان کی روایات مسلمانوں سے ملتی ہیں۔ سجاد کی ایک بیٹی اور لایا خاند ہے جو پاکستان
ہی جواد کے بچوں سے گھل مل جاتی ہے اور کسی قسم کی غیریت محسوس نہیں کرتی۔ سجاد حسب عادت ابھی تک ہوائی تھے
ہے اور ان کے ٹوٹے پر آرام سے آگے نکل جاتا ہے۔

ناہید کا آخری بیٹا میمون اور اس کی بہو اذ کا میرے پیارے ملنے والے بچے ہیں۔ ناہید نے میمون کی
کے ہاتھوں بڑے دکھ اٹھائے لیکن بالآخر اب میمون صحت مند، خوبصورت اور خوب کام کا انسان ہے، لیکن ناہید

ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کا 36۔ جی سے اس وقت تعلق نہ تھا جب خاں صاحب اور میں نقل مکانی کر کے یہاں

حوصل ہمیں تو نبیلہ کی خاطر ناہید گھسیٹ لائی تھی۔ نبیلہ کا اصل نام تابندہ مجاہدہ تھا لیکن کوئی اس اصلی نام سے
 نہیں ہے۔ وہ بنیادی طور پر تھوڑی تھوڑی ماؤف دماغ کا شکار تھی لیکن بڑی ہنس مکھ، محبت کرنے والی روح ہے۔ اُسے
 سے بڑا شفیق شوہر محمد افضل خاں ملا، جو بھائی ایوب کی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور جو وقت بچ جاتا وہ وقت
 مانے رانے، کہہ کر اس کی دیکھ رکھ میں مصروف رہتا۔

جب ہم 36۔ جی میں شفٹ ہوئے یہاں ناہید اور سجاد نہ تھے۔ 36۔ جی میں اس وقت نبیلہ کی ساس، اس کا
 خاں اور افضل خاں بھی رہتے تھے جن کی دیکھ رکھ میری ذمہ داری تھی۔ میرے ہوتے ہوئے تو یہی کنبہ تھا۔ بعد
 کے عمر اللہ نے پانچ بچے دیئے۔ وجیہ، عثمان، فریحہ، عمران، سلمان اور رضوان۔ اس کے علاوہ غازیہ، جواد، بلال
 سے 36۔ جی بھرا ہوا تھا۔

آپا فرخندہ کی چوتھی بیٹی غازیہ بڑی جی دار ہے۔ اس کی پہلی شادی گھر والوں نے زبردستی خاں صاحب کی خالہ
 کے بیٹے انصار سے کر دی لیکن اس دُھن کی پکی نے اس بندھن کو قبول نہ کیا اور اسے چھوڑ کر نثار سے شادی کر لی۔ یہ
 نے پراس نے ماریں بھی سہیں، مظالم کا شکار بھی ہوئی لیکن اپنے سچ کو کسی سے چھپایا نہیں اور اس کی بھاری قیمت

نثار کے ساتھ تنوگ کے بعد غازیہ لندن شفٹ کر گئی جہاں اس کے تین بچے ہوئے۔ بڑی بیٹی سمیٹ ہے جس
 نے پہلے شوہر سے خلع لے کر نام بدل لیا ہے اور اب سحر ارمان کہلاتی ہے۔ جنید خاں جس کی رام کہانی یوں ہے کہ
 تے رائل فیملی کی ایک پرنس سے لندن میں شادی کر لی لیکن نباہ نہ ہو سکا اور اب لندن میں ایک بڑے لارڈ کی سی
 سر کرتے ہیں۔ جنید خاں جسے ہم سب جو جی کہتے ہیں۔ ان سے چھوٹے فیضی ہیں جن کا اصلی نام فیصل نثار ہے۔

نثار صاحب کی رام کہانی اب تک یہ ہے کہ وہ اپنی پہلی بیوی کے پاس لوٹ گئے ہیں اور اس طرح غازیہ کئی دکھ
 چھپائے لاہور آتی جاتی ہے، لیکن منہ سے کبھی ایک لفظ شکایت کا نہیں نکالتی۔

جواد کی چھوٹی بہن جو نبیر پانچ پر آتی ہے، آپا جی کی وہ بیٹی ہے جو اس وقت 36۔ جی میں موجود تھی۔
 تابش بڑی بھلی سی روح ہے۔ پتہ نہیں تابش، جواد اور بلال کس وقت جیوئی بہن کے پاس بیٹھ کر کھانا کھاتے

ہو جاتے اور کہاں کہاں پڑ کر سو جاتے۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنے پڑھنے لکھنے میں سرگرداں رہتے۔ ہمیں اپنی
 تھی ہم کسی کا کیا پتہ لیتے لیکن سردیوں میں جب پچھلے برآمدے میں دھوپ آ جاتی اور ہم وہاں بیٹھ کر کچھ غسل آفتابی
 ہو جاتے تو تابش چائے کا ٹرے اٹھا آتی لیکن کئی بار یا تو اُس سے چائے گر جاتی یا دودھ اوندھا ہو جاتا۔

ایک روز جیوئی نے مجھ سے کہا۔ ”مامی جی ایک دعا کر دیں۔“

”دعا، کیسی دعا؟“

”اس تابش کی شادی کسی ایسی جگہ ہو جائے جہاں آگے اسے خدمت کرنے والا بیٹ مین مل جائے۔ اسے کچھ

کام کرنا نہیں آتا۔“

”شادی سے پہلے کس کو کام آتا ہے حیوانی؟“

”ناں جی یہ سیکھ بھی نہیں سکتی۔ اس کا دماغ سیکھنے والا نہیں ہے۔ کوئی فوجی، جس کا کوئی بیٹ مین ہو۔“

خاں صاحب بھی کہا کرتے، کوئی عقل کا اندھا اور گانٹھ کا پورا بنی کوئل جائے تو نصیب کھل جاتا ہے۔

36۔ جی سے چلی گئی اور تابش سے رابط ٹوٹ گیا تو پتہ چلا کہ اس نے میجر جاوید اصغر سے شادی کر لی ہے۔ میجر صاحب صاحبہ نے اس کے ساتھ ہمیشہ ایک بیٹ مین تھی رہا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور حیرت انگیز بات ہوئی کہ تابش نے خوب کھانا پکانا سیکھا اور اپنے کھانے کو اپنے سلیقے سے اپنا مداح بنا لیا۔ تابش کو اللہ نے تین بچے عطا کیے۔ ایتھہ سب سے بڑی بیٹی جو اب جہانزیب کے نام سے مشہور ہے۔ (جیزی) کی بیوی ہے۔ اکرام خاں شتو جی کے خالہ زاد بھائی ہیں اور اسی انصار کے بھائی ہیں جن سے غازیہ کے چھٹکارا حاصل کیا تھا۔

ایتھہ سے چھوٹا عمیر انجینئر ہے۔ ان سے چھوٹا حسیب (گولن) ہے جس نے ملک چھوڑنے، واپس آکر از سر نو پڑھائی کرنے کے بعد ایم بی اے کر لیا۔ آج کل تابش شیر پاول کے نیچے عسکری فلیٹس میں رہتی ہے۔ شادی کے متعلق بھی محدوش خبریں گھوم پھر رہی ہیں۔

بلال بھی 36۔ جی کا باسی تھا، لیکن اس سے کم کم ملاقات رہتی تھی۔ جو اد اور بلال برآمدے کے بھائی کے پڑھنے میں مشغول رہتے اور کبھی کسی مصیبت یا جھمیل کا باعث نہ ہوئے۔ بلال نے بعد میں ناہید کی دوست خانہ سے شادی کر لی جو پٹھان نہیں تھی اور اس طرح بلال کے ہاتھوں بھی ایک پرانی روایت ٹوٹ گئی۔ اس کی بیوی کے بچے نہ ہو تو گھر والوں نے پکڑ پکڑ کو کے اس کی شادی ایک پٹھان لڑکی شیخ سے کر دی لیکن بلال اور فائزہ کی محبت کے نتیجے میں وہ لندن چلے گئے اور شیخ واپس اپنے گھر شیخ پورہ لوٹ گئی۔ اب خالدہ اور بلال کے گھر میں ایک بیٹا آ رہا ہے۔ بلال سے چھوٹا عمر کردار خاں ہے، جس نے ایک انگریز لڑکی Jane سے شادی کر لی ہے۔ ان کے گھر کے زینم لیا جس کا نام دایان نقش بند ہے اور وہ لندن کا شہری ہے۔

عمر سے چھوٹی مریم ہے جس سے 36۔ جی میں ملاقات نہ ہو سکی اور جب ہم دونوں لندن گئے اور محمد صاحب نے ایوب بھائی کے پاس ٹھہرے تو پہلی مرتبہ اس سے ملاقات ہوئی۔ مریم کا پورا نام مریم شبیہ ہے اور وہ صلاح الدین بزنس مین کی بیگم ہے۔ ان کے تین بچے سارہ فاطمہ خاں، مغیث الدین خاں اور زوحا خاں ابھی بننے کے عمل میں ہیں۔ اب جب میں 36۔ جی میں نہیں ہوں، مریم اور صلاح الدین قریباً روز جو اد کے گھر آتے ہیں۔ صلاح الدین کی بڑی شناخت یہ ہے کہ وہ عمران خاں کا رشتہ دار ہے اور زمان پارک میں عمران خاں کے گھر کے قریب ہی رہتا ہے۔

آپ کو شاید یہ ساری تفصیل ناگوار گزری ہو لیکن اس کو بیان کرنے سے میرا ایک مقصد ہے۔ جب پاکستان اور بھارت بھانت بھانت کے لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر اپنے نئے وطن پہنچے تو انہیں معلوم نہیں تھا کہ املاک کے ساتھ ساتھ کچھ اپنی آبائی روایات، شناختیں اور رسم و رواج بھی چھوڑ رہے ہیں۔ اللہ اسی طرح تہذیبیاں لاتا ہے۔ کبھی سیلاب

سے ہلا کر، کبھی چنگھاڑ سے تباہ کر کے۔ جب کوئی معاشرہ بہت جامد ہونے لگتا ہے تو اسے اللہ ہزار طریق سے تباہ کر دیتا ہے۔

خال صاحب کے گھرانے میں سب سے پہلی روایت شگنی خاں صاحب نے کی۔ پھر اشتیاق نے اعجاز بنا لوی کی روایت کی۔ پھر پٹھان در پٹھان شادویوں کی روایت ختم کی۔ اس کے بعد جاوید طارق خاں آپا فرحت کے بیٹے نے روایت کی، بیٹی صدیقہ بیگم (جو بعد میں مدیرہ ’’اوب لطیف‘‘ بنیں) سے شادی کی اور یہ سلسلہ چل نکلا۔

آپا فرخندہ اور بھائی ایوب کے گھرانے میں سجاد، غازیہ، تابش، بلال، عمر کردار خاں نے خاندان میں شادی کی روایت کو اتھل پتھل کر دیا۔ صرف جواد، ناہیدہ اور مریم ہی ایسے تین بچے تھے جنہوں نے باپ دادا کی روایات کا سہارا لیا اور ذاتی خواہشات کو کبھی خاندانی فیصلوں پر حاوی نہ ہونے دیا۔

ڈاکٹر جواد ساجد اپنے والد ایوب احمد خاں کے قریب تر ہے۔ وہ بڑا نامور ہارٹ سرجن ہے اور P.I.C ہسپتال کے سربراہ ہے۔ اس نے ستارہ امتیاز اور الہلال بھی حاصل کیا ہے اور ساتھ ساتھ وہ بڑی آدرشی روح ہے۔ اپنی والدہ سے جس نے لاہور سے بیس پچیس میل دور شیخوپورہ کے پاس ایک رفاہی ہسپتال کھول رکھا ہے۔ ہر اتوار کو وہ چند گھنٹے کی ٹولی لے کر یہاں چلا جاتا ہے اور قریبی دیہاتوں کے غریب کو بیہوشی دے کر جوق در جوق آتے ہیں اور اس سے جیتے اور ہسپتال میں ان ڈور مریم بن کر بھی رہتے ہیں۔

جواد کے ساتھ اس کی ہمت والی خوبصورت بیوی عظمیٰ بھی جاتی ہے اور ہر کام میں جواد کا ہاتھ بناتی ہے۔ جواد کے بیٹے ہیں جن کا بہرہ یارول ماڈل کیسے جواد ہے۔ مہرز جو آسٹریلیا میں ڈاکٹری پڑھ رہا ہے۔ پونگو (ماہم نقش بندی) بھی ڈاکٹر بن رہی ہے۔ شذرے (نقش بندی) جو لاہور میں میڈیسن کی تیاریاں کر رہی ہے۔ سب سے چھوٹا بھائی عظمیٰ بھی سکول تک پہنچا ہے اور صبح اٹھنے میں حیل و حجت کرنے کا عادی ہے۔

اپنے کام میں گہری دلچسپی، آدرشوں سے لگاؤ کے علاوہ جواد اپنے نقش بندی ہونے پر بہت فخر کرتا ہے۔ اسے یہ فخر ہونے پر مان نہیں بلکہ وہ بھائی ایوب خاں کے آباء پر فخر کرتا ہے جو بہت بڑے صوفی فقیر تھے۔ مشرقی پنجاب میں اس مزار کی آرائش از سر نو کی گئی۔ سکھوں نے جواد کو بلایا اور بڑی عزت و احترام سے اسے گدی نشینی عطا کی۔ لیکن یہ تب کی باتیں نہیں ہیں جب میں 36۔ جی میں آئی تھی۔ یہ تو 2007ء کی داستان ہے۔ تب جواد کی عمر نابالغ تھا۔ ابھی اس نے دسویں جماعت پاس کرنا تھی۔

میں نے آپ کا تعارف 36۔ جی کے مکینوں سے بڑی تفصیل سے کرایا ہے۔ ممکن ہے آپ کو یہ بڑا اضافی فخر ہو گا لیکن میں نے دانستہ کچھ وجوہات کی بنا پر اس تفصیل کو اپنایا ہے۔ حسن اتفاق سے آپا فرخندہ کے گھرانے میں سے فراد پیدا ہو گئے جو قابل ذکر ہیں جن کے متعلق معلومات جمع کرنا غالباً اتنا سہل بھی نہیں۔ ڈاکٹر حسنا احمد، ڈاکٹر سہرا ایوب اپنی اپنی جگہ پر اور عوامی مقبولیت کے اعتبار سے قابل توجہ ہیں۔

ناہیدہ کے بیٹے ڈاکٹر حسنا کو تو لیڈی ڈیانا کی حادثاتی موت انٹرنیشنل شہرت دے گئی۔ پرنس چارلس سے شادی کے بعد ڈیانا بیگم بڑے ذہنی انتشار کا شکار ہو گئی تھی۔ اسے دل کے دورے تو نہ پڑتے تھے لیکن احتمال غالب تھا کہ

ڈیانا کا دل متاثر ہو چکا تھا۔ اسی سلسلے میں ڈیانا ہیر سمٹھ ہسپتال میں داخل ہوئی جہاں ناتی ان دنوں دل کے عارضوں سے تھراور ڈاکٹر مگدی کی شاگردی میں دن دوئی رات چوگنی ترقی کر رہا تھا۔

ڈیانا کے دل کا عارضہ تو جاتا رہا لیکن ڈاکٹر اور مریض کا رشتہ کچھ عاشقی، ستاشی اور لگن مٹی کا انداز تھا۔ ڈیانا بیگم باقاعدگی سے حسنت ناتی کے گھر آنے جانے لگی۔ ڈاکٹر حسنت احمد جسے گھر والے ناتی پکارتے ہیں، نے اپنا رشتہ تبدیل کرنے کے چکر میں تھا۔ ڈیانا دوسری منزل کی کھڑکی کھول کر ناتی کی کتابیں، ٹیکے، چادریں اور مسلمانوں پر سے نیچے پھینکتی جاتی۔ نیچے ناتی اسے بازو پھیلائے کیج کرتا۔ حسنت کی زندگی میں محبت کیونکر آئی اور کیسے زندگی الجھا کر چلی گئی۔ اس پر کئی کتابیں رقم ہو چکی ہیں۔ ڈیانا کی سائیکو تھریسٹ کی کتاب اس سلسلے میں بڑی اہم مغربی میڈیا کی کسی مسلمان کو بخشا نہیں کرتا۔

کھیل کھیل میں، مدد کے چکر میں دونوں بہت قریب آ گئے، لیکن حسنت کے منہ سے اظہار کا یہ نکلنا۔ آپ ان پٹھان زادوں کو کمینہ یا از حد محتاط کہہ سکتے ہیں لیکن اتنی بات طے ہے کہ حسنت اپنے گھر والوں کے خاندانی روایات کو توڑنا نہ چاہتا تھا۔ ایسے میں ڈیانا نے پہل کی۔ اس نے آپا فرخندہ کو خط لکھنا شروع کر دیا۔ صاحب سے رابطہ قائم کیا۔

خاں صاحب نے ڈیانا سے متعلق اپنے ایک انٹرویو میں ڈیانا اور حسنت کے تعلق کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی۔ لیکن یہ نقاب کشائی کافی نہ تھی۔ حسنت کی وجہ سے میں نے اس کے خاندان کی تفصیلات جہاں تک مجھے معلوم ہو سکیں آپ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ کون جانے ڈاکٹر جواد جووان دنوں ہارٹ کے ہسپتال P.I.C کے چیف ایوب احمد خاں جو اپنی جگہ بے حد اہم انسان تھے، کب ان تفصیلات میں سے کونسی ٹکڑی ان بڑے لوگوں کی زندگی میں حاصل کرے اور ان لوگوں کی زندگی کی جگہ سول پزل میں مین گم شدہ مقام پر اہم Clue بن جائے۔

دوسری بڑی وجہ اس تفصیل بیان کی میرے نزدیک یہ ہے کہ میں آپ کو بتا سکوں، ہجرت کرنے والے ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ وہ اپنوں میں اس قدر گندھے ہوئے رہتے ہیں کہ ہر رشتہ چاہے وہ دور ہی کا کیوں نہ ہو انہیں کا حامل رہتا ہے اور اسے توڑنا یا گزند پہنچانا ان کو احساس جرم میں مبتلا کرتا ہے۔ حسنت نے بہت کرب گزاری لیکن اپنے گھر والوں کا دل نہ توڑا۔ خاندانی روایات کی پاسداری کی۔ خاں صاحب برسوں تضاد کا شکار رہے۔ پٹھانوں کی روایات ان کے ہاتھوں چکنا چور ہو گئیں۔ شاید جس کا رنج انہیں تاحیات رہا۔ شاید کبھی کسی مقام پر ان میں یہ تفصیلات اس لحاظ سے بھی اہم ہو جائیں اور آپ اُس بات کی تہ تک پہنچ پائیں جس تک میری رسائی نہ ہوگی۔ آپا فرخندہ خاندان کی ذمہ داری کے بعد جو پہلا ذہنی حادثہ ہمیں پیش آیا وہ 1965ء کی جنگ تھی۔ یہ نہ تھا کہ بھارت کے دل میں اس قدر پاکستان دشمنی ہے۔ وہ طاقت کا ازلی بھکنڈہ استعمال کر کے مسائل پاکستان کی بانہہ مروڈینا چاہتا تھا تا کہ از خود ہم اُس کے غلام بن جائیں اور خود ہاتھ جوڑے اُس کا اکھنڈ بھارت پورا کر دیں۔

جین بھارت کو نہ تب علم تھا اور نہ آج تک اُسے سمجھ آئی کہ اعمال ہمیشہ نیتوں کے ڈانڈوں پر تولے جاتے ہیں۔
وہ لے کی نیت میں کھوٹ نہ تھا۔ اسی لیے باوجودیکہ ہم نے بطور قوم اس نعمت کی حفاظت نہیں کی، لیکن اللہ
سے خیراں“ رکھے گا۔

میں آپ کو بتا رہی تھی کہ 1965ء کی جنگ جاری تھی۔ لاہور کے کلچرل باسی ہوائی حملوں کو بھی کوئی کلچرل شو سمجھ
تھا۔ جب اوپر سے جہاز گولیاں برساتے اڑتے، لاہور کے پتنگ باز جیلے کوٹھوں پر چڑھ کر نعرے لگاتے۔

یہ پیریشی ان دنوں بہت سرگرم عمل تھا۔ ساری میڈیا جنگ میں سے ہو رہی تھی۔ اشفاق صاحب کا
دور و شور سے چل رہا تھا۔ میں بھی کچھ شامل باجہ رہتی تھی۔ ان دنوں سٹوڈیوز میں ملکہ ترنم نور جہاں سے
وہ قومی ترانے باقاعدگی سے گایا کرتی تھیں۔ جس روز میری نور جہاں سے پہلی ملاقات ہوئی، وہ سٹوڈیو
میں گئی تھیں۔

میری رنگ رنگیلا ہائے نی کر نیل نی جرنیل نی۔“

اس کے بعد ”تلقین شاہ“ کی ریکارڈنگ تھی۔ خاں صاحب اور میں دروازہ کھول کر اندر گئے اور چپ چاپ
بٹھ گئے۔ سامنے سفید ساڑھی میں ملبوس برف پوش پہاڑ کی چوٹی کی طرح اللہ کا ایک خوبصورت منظر کھڑا تھا۔
یہ باوجود اُس کے حسن میں کہیں کمی نہ تھی۔ بالوں میں ایک سفید پھول، ہاتھوں میں ہیرے جڑی چوڑیاں، گلے
تھیں۔ نور جہاں مکمل طور پر سوانیت کی پوری طاقت سے لیس ترغیب کی ایک تصویر تھی۔

میری رنگ رنگیلا..... ہائے نی کر نیل نی جرنیل نی۔“

کچھ دیر بعد سازندوں کو چھڑکیاں عطا ہوئیں۔ سارنگی نواز تار تھیک کرنے لگا۔ طاہرہ تھوڑی لے کر طبلے کی جوڑی
میں مشغول ہو گیا۔ چائے آگئی۔

نور جہاں خاں صاحب کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

آغا جی یہ صوفی صاحب تو غضب کے قومی ترانے لکھ رہے ہیں۔“ نور جہاں نے کہا۔

”بھائی ہمارے استاد ہیں۔ وہ نہیں لکھیں گے تو اور کون لکھے گا۔“

میری نگاہوں میں کالج کا وہ زمانہ گھوم گیا جب صوفی صاحب ایم اے کی کلاس میں ہم شاگردوں سے غالب کی
کھڑے ہو کر باری باری باواز بلند پڑھوایا کرتے تھے۔

نور جہاں نے مجھ پر ایک ایسی نظر ڈالی جیسے کاٹھ کباڑ سے لدے گودام کو دیکھ رہی ہو۔

”یہ آپ کی بیگم ہیں آغا جی۔“ وہ خاں صاحب کو ہمیشہ آغا جی کہتی تھی۔

”بالکل۔ کوئی شک ہے؟“

میں نے ہمیشہ کی طرح سفید لباس پہن رکھا تھا۔ چہرے پر کوئی میک اپ نہ تھا اور جسم پر ایک شادی کی انگوٹھی
کئی زیور نہ تھا۔

”ہائے ہائے تنگی بچی..... اتنا سادہ بے رونق لباس اور بھائی! تم کچھ ڈھنگ کے کپڑے پہنو۔ میک اپ کرو تو

آغا جی کی جوڑی بھی ہے۔ اتنے خوبصورت آدمی کی بیوی۔“

وہ چپ ہوگئی جیسے میری دلا زاری کا خیال آ گیا ہو۔

”دیکھو بی بی، تمہارا شوہر پاکستانی تو لگتا نہیں۔ اطالوی لگے تو لگے۔ اس کے ساتھ تو.....“

وہ پھر خاموش ہو گئیں۔ میں نے دل ہی دل میں جملہ مکمل کر لیا۔ ایسے خوبصورت اطالوی مرد کے ساتھ

نظر بٹو بھی تو درکار ہے ورنہ اسے تو قدم قدم پر نظر لگنے کا خدشہ ہے۔ بہر کیف اپنی لائٹری نکل آنے پر میں خوش

واپس آئی۔

جنگ کے یہ دن ہر پاکستانی پر بھاری تھے۔ خاں صاحب رات کو سوتے وقت اینٹ اور اینٹیں کو دانتوں

اشیر کو سینے پر لٹا کر سوتے۔ انہیں اپنا خوف تو شاید نہ تھا لیکن سوچتے ہوں گے، ابھی 1947ء کو بھولے نہیں اور

پھر؟ نہ جانے اس جنگ میں کون کس سے بچھڑ جائے۔

پھر اچانک نانا آ گئیں۔ انہوں نے خاں صاحب سے کہا ”شقا! اب لاہور میں ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔ تم

میرے ساتھ ملتان کی زمین پر چلو گے۔ زمین ملتان سے بھی اتنی دور ہے کہ جنگ کے اثرات محسوس نہیں ہوں گے۔

”نانا جی! آپ قدر سید اور بچوں کو لے جائیں۔ میرا جانا تو مشکل ہے۔ میں تو ”تلقین شاہ“ سے بندھ

میں نے خاں صاحب کو چھوڑ کر جانا منظور نہ کیا اور نانا بچوں کو لے کر ملتان چلی گئیں، جہاں بچوں نے ٹیوب

ٹریکٹر پر بیٹھ کر، کھیتوں میں سے کچی سبزیاں توڑ کر ایک لمبی پلنگ منائی۔

اخلاق بھائی بھی جنگ کے دوران دو تین مرتبہ بڑے متوحش آئے اور مشورہ دیا کہ ہم واقعی گاؤں چھوڑ

لیکن خاں صاحب بڑے مؤدب طریقے سے خاموش ہو گئے۔ اخلاق بھائی ذکیہ اور بچوں کے ساتھ ہری پور چلے گئے۔

ان ہی دنوں جب ریڈیو سٹیشن سے رابطہ گہرا ہوا۔ مجھے صابرہ سلطانہ ریڈیو سٹیشن پر ہی ملیں۔ صابرہ

بہنا پا ہو گیا۔ صابرہ سلطانہ میاں عابدالحق کی دوسری بیگم تھیں۔ میاں صاحب بھاری بھرم گورے چنے سید تھے

میں بڑی برداشت تھی۔ اُن کے بیٹوں نے صابرہ آپا کی بیٹی راجی اور انہیں برداشت نہ کیا۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں

زمینوں میں اپنا حصہ بخیر نہ ثابت کر دیں۔ اس سلسلے میں ہمیشہ کی طرح انہوں نے میاں صاحب کو بڑے دباؤ میں

یہی شرط پیش کی کہ صابرہ آپا کبھی نہ لڑیں جائیں گی۔

میاں عابدالحق کا گاؤں کا کاخیل سوات کی سڑک پر مردان سے کوئی سولہ میل دور تھا۔ راجی کے بڑے

بھائی شمس کا کاخیل کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ صابرہ سلطانہ اُن کی جائیداد ہتھیانے کے لیے دوسری بیگم

حالات میں معاملے میں صابرہ بڑی درویش تھیں۔ میاں عابدالحق کے آباء میں کا کاخیل ایک بڑے صوفی بزرگ

ہیں۔ نوشہرہ کے قریب اُن کا مزار مرجع خلائق ہے۔ ہر سال عرس کے موقع پر میاں صاحب کے گھرانے کے

شمولیت کرتے ہیں۔

صابرہ سلطانہ بڑی گنوار عورت تھیں۔ باوجودیکہ وہ بھی پٹھان والد کی بیٹی تھیں اُن میں غصہ، طیش

بھڑک اٹھنا میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ اُن کی ساری کائنات راجی بیگم تھیں، جنہیں انہوں نے Jesus & Mary

میں تعلیم دلوا کر یونیورسٹی میں پہنچایا۔ اس ساری تگ و دو میں اُن کی ذاتی خواہشات راکھ ہو گئیں۔
 ان ہی دنوں جب آرٹسٹ لوگوں کی ریڈیو پاکستان پر گہما گہمی تھی، ایک روز خاں صاحب ”آج اور آج کا دن“
 کے لیے اس پروگرام میں وہ ہر روز بتایا کرتے تھے کہ آج کس بڑے آدمی کا جنم دن تھا۔ کس ملک کو آج کے روز
 خوشی تحریک کی بنیاد ڈالی گئی۔ تاریخ سے نوجوان سامعین کا رشتہ جوڑنے کا یہ انوکھا طریقہ بھی خاں صاحب کے
 ایک چکاری تھی۔

اب صابرہ کے ساتھ اُن کی بیٹی روجی موجود تھی۔ آپا صابرہ نے خاں صاحب سے تعارف کرایا۔

خاں صاحب! یہ کئی ہے۔ جیسس اینڈ میری سکول میں پڑھتی ہے۔ بڑی ذہین ہے۔“

”جھا۔ پھر تو تمہیں مبارک ہو۔ میں قد سید کو لے کر تمہارے گھر آؤں گا۔“

”آپ کہاں محلہ میں ہمارا گھر ڈھونڈتے پھریں گے، ہم ہی آ جائیں گے۔“

اب صابرہ نے اپنا اتہ پتہ بتایا تو اپنی طبعی فراست کے باعث خاں صاحب چند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔

”کسی کو مشورہ دینا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ روم میں میری لینڈ لیڈی کہا کرتی تھی۔ ہر انسان کو

کھنے کا اختیار ہے۔ یہی اصلی جمہوریت ہے لیکن میری رائے ہے کہ اتنی ماڈرن تعلیم کے ساتھ اس کو کسی کھلے

صاحب کی ضرورت ہے۔ جب اس کی سہیلیاں وزٹ کے لیے آئیں تو اُن پر کوئی، باغ کا اچھا اثر ہو۔“

خاں صاحب کو علم نہ تھا کہ وہ وقت سے بہت پہلے معیار زندگی کے حق میں ووٹ دے رہے تھے۔ مغربی ترقی

کا خطر یہ مثبت تھا۔ تو لیجیے کسی کسی گھڑی کی بات دل پر اثر کر جاتی ہے۔ صابرہ آپا پر بھی خاں صاحب کی بات کا

تجربہ ہو چکا تھا۔ بلکہ میں گھر لے کر آئی تھیں۔ روجی اور اُن کے پاس زیتونی رنگ کی فو کسی تھی جسے میاں صاحب کا ایک

بھائی نے نصیر چلایا کرتا تھا۔ مجھے اور خاں صاحب کو بالکل علم نہ ہوا کہ کب اور کس دن صابرہ آپا نے مکان بدلا۔ بس

تھی کسی بس صابرہ اور کئی آئیں۔ ہم دونوں کھانے کے کمرے میں 36۔ جی کی گیلری میں دائیں ہاتھ بیٹھے کھانا

کھاتے والے تھے۔ آپا صاحبہ بڑے میں بڑے اعلیٰ مرغی کے تھے، کباب، شوربہ مع سرویٹ، کانتے چھری کے لے کر

تھیں کی سروں اور صفائی قابل داوتھی۔

”بڑا اچھا ہوا۔ اشفاق بھائی! آپ نے کھانا شروع نہیں کیا۔ میں آپ کے لیے مرغی کے یہ بنگے بنا کر لائی

میں صاحب ہمیشہ کھاتے ہیں۔“

”اتنی دور سے کھانا لے کر آئی ہیں آپ۔ غضب کر دیا صابرہ۔“

”دور کہاں۔ میں تو کبھی کی ایچ بلاک میں شفٹ کر گئی ہوں۔“

”کیا؟..... کیا کہا؟“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”لو قد سید جی۔ اب تو ہم ایک طرح سے آپ کے پڑوسی ہو گئے۔“

”لیکن آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“

”کئی کبھی تھی کسی دن surprise دیں گے۔ انکل کو surprise اچھا لگتا ہے۔“

پتہ نہیں صابرہ اس تبدیلی سے خوش تھی کہ نہیں لیکن کئی کھلے درختوں والے ماڈل ٹاؤن میں ایک آزاد پرنسپل
 طرح لمبی اڑانوں کے لیے تیار ہو رہی تھی۔

جنگ اور آپا صابرہ کے بعد جوئی تبدیلی ہمارے نظام زندگی میں آئی، وہ خاں صاحب کی مرکزی اردو بورڈ
 تقرری تھی۔ عین 17 جون 1967ء کو خاں صاحب کو قدرت اللہ شہاب نے بیسویں گریڈ کا ڈائریکٹر بنا دیا۔ شہاب
 ان دنوں سیکرٹری ایجوکیشن تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے لندن میں انڈیا آفس کی میموریل لائبریری کا ڈائریکٹر
 کو بنا دیا۔ پتہ نہیں یہ اعزاز ان اداروں کا تھا کہ انشائی اور خاں صاحب کا لیکن ان دونوں جن حضرات نے خوب کام
 اتنی کتابیں خاں صاحب نے چھاپ دیں کہ آج تک اردو بورڈ ان کتابوں کی رائٹنگی کھا رہا ہے۔ خاں صاحب کی
 پوسٹنگ 1967ء سے 2 جولائی 1989ء تک بیسویں گریڈ میں رہی۔ پھر بینظیر صاحبہ تشریف لائیں۔ تلقین شاہ کے
 پروگرام سے ناخوش ہو کر انہوں نے خاں صاحب کو اردو بورڈ سے معطل کر دیا۔ ساتھ ہی تلقین شاہ بھی ریڈیو سے
 گیا۔ پھر 26 مارچ 1991ء کو دوبارہ اشفاق صاحب کو اردو بورڈ کا ڈائریکٹر جنرل بنا دیا گیا اور بائیسواں گریڈ بھی
 مہربانی جناب نواز شریف نے کی تھی اور بڑی معذرت کے ساتھ کہا تھا۔ ”مجھے افسوس ہے اشفاق صاحب! سیاسی لیڈر
 کے محسنوں کو نہیں جانتے۔ انہیں معلوم نہیں کہ آپ ایک Living Legend ہیں۔ آپ جیسے لوگ بار بار
 ہوتے۔ ہمیں ان لوگوں کی قدر کرنی چاہیے جو قوم کا رول ماڈل ہیں۔ چاہے ہمارا آپ کا مسلک ایک نہ بھی
 نواز شریف کی مہربانی سے خاں صاحب 26 مارچ 1991ء سے 12 جون 1993ء تک اردو بورڈ میں ڈائریکٹر جنرل
 اور بائیسویں گریڈ تک جا پہنچے۔ ہماری امانت کے لیے یہ ترقی بڑی ہی تسلی بخش تھی اور گوہم ایک دوسرے سے بھی اس کا
 کرتے تھے لیکن اندر ہی اندر اس جیت پر پھولے نہ مارتے تھے۔

آپا صابرہ، اردو بورڈ کے علاوہ ایک اور بھی تازہ پانی ہماری زندگی میں شامل ہوا۔ یہ ریاض محمود تھے
 تعارف ان ہی کی زبانی سنئے۔ ان کا ذاتی مضمون ملاحظہ کیجئے۔

جب میں نے ہوش سنبھالی تو ہم لوگ احاطہ فیروز دین فلمنگ روڈ میں رہتے تھے۔ ہمارے اور موصوف
 اختر شیرانی صاحب کے گھر کی دیوار مشترک تھی۔ میری والدہ ایک میز پر کھڑی ہو جاتیں اور دوسری جانب سے
 شیرانی بھی میز پر کھڑی ہوتیں۔ دونوں خواتین گھنٹوں باتیں کرتی رہتیں۔ اکثر میں دیکھتا کہ بیگم اختر شیرانی رو رہی
 میری والدہ انہیں تسلی دے رہی ہیں۔ میں والدہ سے بعد میں پوچھتا کہ بیگم اختر شیرانی کیوں رو رہی تھیں تو وہ بات
 ادھر کر جاتیں۔ اختر شیرانی صاحب کا ایک بیٹا میرا ہم عمر تھا۔ ہم اکثر ان کے گھر جاتے۔ وہاں جانے میں تم
 تھے۔ ایک تو دوست سے ملاقات۔ دوسرے دوست کی ٹرائی سائیکل چلانے کا مزہ اور تیسرے گرمی کے دنوں میں خوش
 بھرا صندل کا شربت جس کا ذائقہ مجھے آج بھی یاد ہے۔

احاطہ فیروز دین میں ایک کنواں تھا جس کا پانی بہت ٹھنڈا ہوا کرتا تھا۔ کنوئیں کے ساتھ ہی مسجد تھی
 نمازی اسی کنوئیں کے پانی سے وضو کیا کرتے تھے۔ بچپن سے لے کر جوانی کے آخری دنوں تک میں خواب دیکھتا

پانی نکالنے کے لیے ڈول ڈالا۔ ڈول بھر گیا، میں پانی نکال رہا ہوں کہ ڈول بھاری ہونے کی وجہ سے کونٹوں میں گر گیا ہوں۔ یہ خواب عرصے تک مجھے پریشان کرتا رہا لیکن اب کئی سالوں سے نہیں۔

میری پیدائش 2 جولائی 1936ء کی ہے۔ 1941-42ء میں جبکہ میں پانچ چھ سال کا تھا، دوسری جنگ عظیم چلی۔ احاطہ فیروز دین میں صرف فیروز دین صاحب کے گھر میں ہی ریڈیو تھا۔ شام کو احاطے کے سب لوگ حاجی صاحب کی بیٹھک میں جمع ہو جاتے اور ریڈیو پر خبریں سنا کرتے۔ میں بھی اپنے والد کے ساتھ حاجی صاحب کی بیٹھک میں جاتا، اس لیے نہیں کہ مجھے خبروں میں کوئی دلچسپی تھی، بلکہ اس لیے کہ حاجی صاحب گھر آئے مہمانوں کی تواضع سے فرحت یک سے کیا کرتے تھے۔

ان دنوں چائے سے تو کچھ ایسی دلچسپی نہ تھی البتہ فروٹ ایک میں بڑے شوق سے کھاتا۔ دوسرے وہاں جانے سے پہلے عرض یہ تھی کہ میں اس شخص کو دیکھنا چاہتا تھا جو ریڈیو کے اندر بیٹھ کے خبریں پڑھا کرتا تھا۔ میری وہ خواہش تو پوری ہوئی۔ پھر ایک دن ایسا آیا کہ میں خود ریڈیو کا حصہ بن گیا۔

میری والدہ کی بڑی خواہش تھی کہ وہ مجھے کئی انگریزی سکول سے تعلیم دلوائیں۔ اسی خواہش کے پیش نظر انہوں نے مجھے لندن کے ایک سکول میں داخل کروا دیا جس کی پرنسپل، مالک اور ٹیچر ایک بوڑھی سی یورپین لیڈی تھی۔ یہ سکول میرے والد کے اخبار کے ساتھ والی گلی کے آخر میں واقع تھا۔

سکول میں لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک ساتھ تعلیم دی جاتی تھی جبکہ وہاں پرنسپل صاحبہ کے خرگوش اور اُن کا بیٹا دن بھر کھاتے تھے اور ہم بچے کلاس روم میں سے انہیں دیکھا کرتے تھے۔ اچانک پرنسپل صاحبہ نے لندن واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ سکول بند ہو گیا اور مجھے میاں شاہ ابوالمعالی کے پرائمری سکول میں داخل کروا دیا گیا، جو لاہور ہونل کے عقب میں واقع تھا۔ اسی سکول میں ہمیں ایک دن کھانے کے لیے لڈو دیئے گئے اور بتایا گیا کہ اتحادیوں کو دوسری جنگ عظیم میں ہار ہوئی ہے۔

شاہ ابوالمعالی پرائمری سکول سے چار جماعتیں پاس کرنے کے بعد میں نے وطن اسلامیہ ہائی سکول میں جو کہ لاہور کے کالج سول لائنز سے ملحق تھا، پانچویں جماعت میں داخلہ لے لیا۔ اُن دنوں تحریک پاکستان زور و شور سے جاری تھی۔ لیکن ہم پانچویں جماعت کے طلباء کو علم ہوا کہ آج ایک جلوس اسمبلی ہال کے سامنے مظاہرہ کرے گا۔ میں اور میرا دوست سید فیاض بھی سکول سے بھاگ کر اس جلوس میں شرکت کے لیے جا پہنچے۔

ہمارے سامنے ایک شخص نے اسمبلی کی عمارت پر چڑھ کر یونین جیک کو نذر آتش کر دیا۔ پھر ایک بھگدڑی مچ گئی۔ ساری آنکھوں میں جلن ہونے لگی اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ ایک بھلے مانس نے ہم بچوں کو بھگدڑ میں دیکھا تو دو تھپتھپاتے ہوئے کہا کہ بچو! بس اب فوراً گھر کو بھاگ جاؤ۔

1947ء کے فسادات بڑے ہولناک تھے۔ اکثر سڑکوں پر لوگوں کی لاشیں پڑی نظر آتیں۔ عمارتوں کو آگ لگا دیتی اور ہم چھتوں پر چڑھ کر جلتی ہوئی عمارتوں سے نکلنے والا دھواں دیکھا کرتے تھے۔

میرے بڑے بھائی کی شادی فیروز پور کے ایک پٹھان خاندان میں ہوئی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد وہ لوگ

فیروز پور سے ہجرت کر کے لاہور آ گئے۔ میری بھابھی کے نام سے رحمان پورہ میں ایک کونٹری الاٹ کروالی گئی اور ستمبر 1947ء کے آخر میں رحمان پورہ منتقل ہو گئے۔

میرے والد ریلوے میں ملازم تھے لیکن بعد میں نوکری چھوڑ کر کاروبار کرنے لگے۔ ہم تین بھائی تھے۔ 1948ء میں میری بھابھی جن کا نام نسیمہ تھا، انتقال کر گئیں۔ انہیں تپ و رق تھی اور اس زمانے میں اس مہلک مرض کا سوائے موت کے کوئی علاج نہ تھا۔ بھابھی کے ساتھ میری بڑی دوستی تھی۔ ان کی وفات کے بعد میں اکثر خواہش دیکھتا کہ وہ مری نہیں ہیں بلکہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ قبر میں دبانے کے بعد وہ ہوش میں آ گئیں اور اپنے اوپر پڑی مٹی کو کرفن میں ملبوس ہمارے گھر کے دروازے پر پہنچ کر دستک دے رہی ہیں۔ خوف سے میری آنکھ کھل جاتی۔ دل فرسوسہ سے دھڑکتا اور رات کا باقی کا حصہ میں جاگ کر گزارتا۔

پڑھائی میں میں کچھ ایسا اچھا نہیں تھا لیکن جیسے تیسے کر کے میں نے 1953ء میں میٹرک کر لیا۔ اُنہی دنوں صاحب کو کاروبار میں پے در پے گھاٹوں اور کچھ کاروباری ساتھیوں کی بددیانتی کی وجہ سے کٹھن مالی مشکلات میں گرفتار رہا تھا۔ میرا داخلہ ایف سی کالج میں ہو گیا لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ داخلہ فیس دینے کے لیے والد صاحب کے پاس سے نہیں تھے۔ چنانچہ میں پڑھائی چھوڑ کر والد صاحب کے ساتھ کام کرنے لگا۔ ایم اے تک تعلیم میں نے بعد میں حاصل کیا۔ میرے ننھیال والے انارکلی میں رہتے تھے جہاں ان کی بہت جائیداد تھی، لیکن نسل در نسل بننے اور پھر بعد میں فروخت کر کے کھلے علاقوں میں رہائش اختیار کر لینے کے باعث اب وہاں کوئی بھی نہیں ہے۔ میں بہت چھوٹا تھا جب کہ انارکلی میں اپنی پڑنائی سے ملنے اپنی والدہ کے ہمراہ جایا کرتا تھا۔ ہم سب انہیں ماسی وڈی کہا کرتے تھے۔ وفات کے وقت حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار سے ملحق قبرستان میں دفن ہوئیں۔

میرے سگے ماموں اور دوسرے کئی رشتے دار قیام پاکستان سے قبل ہی رحمان پورہ، اچھرہ، مہراج بلنگہ اور فیروز پور روڈ پر جامعہ اشرفیہ کے سامنے آن بسے تھے۔ ہم لوگ فلمینگ روڈ سے انہیں ملنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ زمانے میں بسیں، رکشے یا وہنجیں تو ہوا نہیں کرتی تھیں۔ تاکے ہی لوگوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کا کام کرتے تھے۔ جب ہم فلمینگ روڈ سے فیروز پور روڈ یا رحمان پورہ آتے تو سالم تا نگہ بارہ آنے کا ملتا تھا۔

1960ء میں میں نے ریڈیو جوائن کیا اور یہیں میری ملاقات اشفاق احمد صاحب سے ہوئی۔ ”گڈ ریڈیو“ چکا تھا اور مصنف کے اندازِ بیاں کا معترف تھا۔ ریڈیو سٹیشن پر اشفاق احمد صاحب کا آنا جانا اکثر رہتا۔ وہ ان دنوں بہت روزہ ”لیل و نہار“ کے ایڈیٹر تھے، لیکن کچھ عرصہ بعد ہی ”لیل و نہار“ چھوڑ کر ریڈیو لاہور کے ساتھ بطور سکرپٹ رائٹر بہت ہو گئے۔ اُن دنوں ان کے پاس بھی سکوٹر تھا اور میرے پاس بھی۔ ہم لوگ دفتر سے نکلتے۔ سڑکوں پر رش بالکل نہیں ہوتی تھی۔ آہستہ آہستہ سکوٹر چلاتے مزنگ چوگی بیچتے۔ عثمان کی دکان سے ساچی پان خرید کر کھاتے۔ گیس لگاتے اور شام کے سگے گہرے ہونے کے بعد وہ سمن آباد اور میں رحمان پورہ کی راہ لیتا۔

1965ء میں اشفاق صاحب سمن آباد سے ماڈل ٹاؤن منتقل ہو گئے اور بعد میں انہوں نے ماڈل ٹاؤن میں اپنا گھر بنا لیا۔ 1966ء میں میری شادی ہوئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ شادی کے بعد میں علیحدہ رہوں گا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ

میں سسٹم میں بہت خرابیاں اور لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں بھی شادی کے بعد ماڈل ٹاؤن میں ہی کے مکان میں رہنے لگا جو اشفاق صاحب کے پڑوس میں تھا۔

ایک دن اشفاق صاحب بتانے لگے کہ میں کسی زمانے میں فلمی نگ روڈ میں رہتا تھا۔ بعد میں کچھ عرصہ اچھرہ سراج بلڈنگ میں رہا۔ بعد میں مزنگ روڈ، بمن آباد اور پھر ماڈل ٹاؤن۔ میں نے عرض کیا کہ فلمی نگ روڈ تو کبھی تھا۔ اچھرہ اوڈہ کے پاس معراج بلڈنگ میں میرے ایک رشتے دار رہتے تھے۔ ان سے ملنے جایا کرتے تھے۔ آپ کو یاد میں بھی اکثر جانا ہوتا تھا اور اب ماڈل ٹاؤن میں تو آپ کا پڑوسی ہوں ہی..... اشفاق صاحب مسکراتے تھے کہ تم نے بھی میرا ”کھیرا“ کبھی چھوڑا نہ۔

اس کی عنایتیں، محبتیں اور شفقتیں ہی اب زندگی کا سرمایہ ہیں۔ یادوں کے علاوہ اور کون سا اثاثہ انسان کے پاس ہی ”داستان گو“ کے متعلق ریاض محمود صاحب لکھتے ہیں۔

”داستان گو“ (داستان سرائے)

اشفاق احمد مرحوم..... آج بھی انہیں مرحوم لکھتے ہوئے قلم کا نب جاتا ہے۔ یہ بات تو ہر کوئی جانتا ہے کہ جو بھی آج سے ایک نیا دن جانا ہی ہے لیکن اشفاق احمد ایسا تندرست، زندگی سے بھرپور، ذہین اور دوسروں کے لئے انسان اس قدر جلد اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا۔ ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا۔

اشفاق صاحب سے میری پہلی ملاقات پرانے ریڈیوشیشن میں ہوئی۔ سردیوں کے دن تھے۔ چند روز پہلے میں اور تیز ہوانے سردی میں اضافہ کر دیا تھا۔ تاج الدین صاحب، اکرم بٹ صاحب، سعید مرزا صاحب اور میرے بیٹھے گپ شپ میں مصروف تھے کہ اتنے میں ایک صاحب ہاتھ میں مونگ پھلی کا لٹافہ لیے ہمارے درمیان سے گئے۔ لٹافہ کھل گیا۔ چائے آگئی اور ہم سب مونگ پھلی کھانے، چائے پینے اور ان صاحب کی باتیں سننے میں مصروف ہو گئے۔ میرے سوا سب ان سے واقف تھے اور خال صاحب کہہ کے مخاطب کرتے تھے۔

خال صاحب ایک خوبصورت انسان تھے لیکن ان کی سب سے بڑی خوبی ان کی خوش گفتاری تھی۔ بات کہنے کا فن ان کے پاس تھا۔ جس میں مزاح کی چاشنی، علم، مشاہدے اور تجربے کا ایسا اظہار کہ ہر سننے والے کی یہ خواہش ہوتی کہ وہ سننے جائیں اور وہ سنتا جائے۔

جب خال صاحب اس وعدے کے ساتھ رخصت ہوئے کہ جلد ہی پھر ملیں گے تو میں نے اکرم بٹ صاحب سے کہا کہ یہ خال صاحب کون ہیں۔ بٹ صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور پوچھا تم نہیں جانتے خال صاحب کو؟ میں نے کہا نہیں۔ میں نے تو آج پہلی بار انہیں دیکھا ہے۔ بٹ صاحب کہنے لگے، یار اشفاق احمد خال صاحب کا بھائی ہیں۔

”گڈ ریا والے؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل وہی۔“ بٹ صاحب نے جواب دیا۔

یہ غالباً 1960ء کی بات ہے۔ اشفاق صاحب ان دنوں ہفت روزہ ”لیل و نہار“ کے ایڈیٹر تھے۔ کچھ عرصے کے بعد وہ ”لیل و نہار“ کی ایڈیٹری چھوڑ کر ریڈیو پاکستان لاہور سے بہ حیثیت سکرپٹ رائٹر منسلک ہو گئے۔ میں شعبہ ری کنسٹرکشن میں کام کرتا تھا۔ اشفاق صاحب بھی اس شعبے سے وابستہ ہو گئے۔ میری نیاز مندی میں اضافہ ہوا۔ ان کی محبت اور شفقت بھی بڑھتی گئی اور یہ سلسلہ ان کے اس جہان فانی سے رخصت ہونے تک جاری رہا۔

اشفاق صاحب ہمیشہ نئی بات سوچتے، ریڈیو پروگراموں میں مختلف قسم کے تجربے کرتے اور لکیر کے تختے روینے کو ناپسند فرماتے۔ یوں تو انہوں نے ریڈیو کے لیے ہر نوعیت کے پروگرام پیش کیے جن میں فخر، دستاویزی، تقاریر اور انٹرویوز شامل ہیں لیکن ان کا اصل میدان ڈرامہ تھا۔ ریڈیو ڈرامہ نسبتاً ایک نئی چیز تھی اور اس کے لیے کئی کی تعداد بہت کم تھی۔ ریڈیو صرف اور صرف آواز کا میڈیم ہے، جس میں مصنف اور پروڈیوسر صرف صوتی ذریعے ہی ہر چیز اپنے سننے والے تک پہنچاتا ہے جبکہ ٹیلی ویژن اور فلم میں آواز کے ساتھ اداکاروں کی حرکات، میک اپ، لباس اور سیٹ مصنف کی بات کو مؤثر ترین انداز سے دیکھنے والے تک پہنچاتے ہیں۔ اس لیے ریڈیو کے لکھنا اور اسے پروڈیوس کرنا زیادہ مشکل ہے۔

لیکن جہاں ریڈیو صرف آواز تک ہی محدود ہے، وہیں اس کا ایک مضبوط پہلو بھی ہے کہ سننے والوں کا دل آواز کی لہروں سے موصوف ہونے والے سنگلز سے اس منظر کی ایک تصویر اپنے ذہن میں بنا لیتا ہے، جسے وہ سن رہا ہے۔ ظاہر ہے اپنے تصور کے زور پر بنائی تصویر ہر شخص کو پسند ہوتی ہے اور یہ ریڈیو کا وہ مضبوط پہلو ہے جو اسے نئی فلم پر سبقت دلواتا ہے۔

اشفاق صاحب کو تجربات کرنے کا بہت شوق تھا۔ گھر میں وہ مختلف قسم کے سر کے اور کریمیں بناتے جو کبھی باکمال بن جاتیں اور کبھی ناکام ہو جاتیں۔ اسی طرح وہ اپنے افسانوں، ریڈیو ڈراموں اور ٹیلی ویژن پروگراموں میں مختلف تجربات کرتے رہتے۔ ریڈیو ڈرامہ عام طور پر سٹوڈیو میں صوتی اثرات کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے لیکن اشفاق صاحب نے ”دس دسمبر“ کے نام سے ایک ایسا ڈرامہ لکھا جو تمام کا تمام سٹوڈیو سے باہر ریکارڈ کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے ریڈیو ڈرامے میں ایسی کوئی مثال موجود نہ تھی۔ اس ڈرامے کے فنکاروں میں جمیل اختر، آفتاب احمد، ڈاکٹر انور سجاد اور اشفاق احمد شامل تھے۔

اسی طرح جب پروگرام تلقین شاہ شروع ہوا تو اس میں بھی اشفاق صاحب نے بولنے کا وہ لہجہ اختیار کیا جو پنجابی اور اردو بولنے والے یکساں طور پر سمجھ سکتے تھے۔ یہ لہجہ پٹیالے کی بولی تھا۔ اشفاق صاحب نہ پٹیالے کے والے تھے اور نہ پٹیالے کی بولی ہی کے آشنا لیکن جس روانی سے وہ اس بولی میں بات کرتے اس کو سن کے یہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ پٹیالے ہی کے رہنے والے تھے۔

پٹیالے سے ہجرت کر کے پاکستان آنے والے اکثر حضرات ان سے پوچھا کرتے تھے کہ وہ پٹیالے میں کب رہتے تھے۔ اشفاق صاحب کہتے ”سنام میں گھر تھا اپنا۔“

وہ صاحب کہتے ”ہم بھی سنام کے رہنے والے ہیں۔ کبھی ملاقات نہ ہوئی آپ سے وہاں۔“

میں متعارف کروایا۔

ڈرامہ لکھنے کے بارے میں اشفاق صاحب بتایا کرتے تھے کہ میں جب مکالمے لکھتا ہوں تو پہلے میں شخص بولتا ہوں تاکہ اندازہ کر سکوں کہ کہیں بولنے والے کو وہ مکالمے ادا کرنے میں کوئی دشواری تو محسوس نہیں ہوگی۔ جب وہ کسی فنکار کو کوئی کردار ادا کرنے کے لیے کہتے تو فنکار کی صلاحیتوں کا اندازہ کر کے کردار لکھتے تاکہ اُس کے کرنے والے کو مشکل نہ پڑے۔

اشفاق صاحب کے ڈراموں میں مضبوط پلاٹ کے ساتھ ساتھ کردار بھی بڑے جاندار ہوتے تھے۔ ان میں انسانی نفسیات سے آگاہی، گہرا مشاہدہ اور مختلف طبقوں سے میل جول ان کا مددگار ثابت ہوتا تھا۔ ٹیلی ویژن تقریباً چالیس سال تک اشفاق صاحب کے زیر اثر رہا۔ نئے لکھنے والوں نے بھی اشفاق صاحب کے دیئے ہوئے کوئی اپنایا۔ لوگ آج بھی پوچھتے ہیں کہ اب ویسے ڈرامے کیوں نہیں ہوتے کیونکہ آج کے ٹی وی ڈرامے سوسائٹی اعتبار سے گراؤ کا شکار ہیں۔

ٹی وی کے ابتدائی دور میں اشفاق صاحب ڈرامہ لکھتے تو کرداروں کے سامنے ان فنکاروں کے نام بھی لکھتے جن فنکاروں کو وہ ان کرداروں کے لیے منتخب کرتے۔ پروڈیوسر بھی اشفاق صاحب کی خواہش کے مطابق انہیں منتخب کرتا۔ جب فنکاروں کو یہ علم ہوا کہ کاسٹنگ تو اشفاق صاحب ہی کرتے ہیں تو انہوں نے مرکزی اردو بولڈ لگانے شروع کر دیئے جہاں اشفاق صاحب ڈائریکٹر جنرل تھے۔

ہمارے ملک میں فنکار تو ہوتا ہی غریب ہے اور پھر اس دور میں تو فنکار تھے بھی بہت زیوں حالی کا شکار اپنی ضرورتیں اور مجبوریاں۔ ہر ایک چاہتا کہ اسے آنے والے Episode میں ضرور کام دیا جائے۔ ظاہر ہے فنکاروں کو صرف ایک ڈرامے میں تو نہیں سمویا جاسکتا تھا۔ جب کوئی ایسا فنکار جسے کام نہ ملا ہوتا اشفاق صاحب اشفاق صاحب کہتے کہ یا اس بار تو تم رہ گئے، اگلی بار تمہاری باری ضرور آئے گی۔ جب وہ فنکار وعدہ لے کر رخصت ہوتا تو اشفاق صاحب فون پر اپنے پی اے شریف صاحب سے کہتے۔ ”شریف الدین! یہ صاحب تمہارے پاس سے گزر رہے ہیں انہیں روکو اور ایک لفافہ دے دو۔“

ٹیلی ویژن کے ابتدائی دور میں فنکار کو پینتالیس روپے کا چیک ملا کرتا تھا۔ شریف الدین صاحب کے ہاں اس قدر رقم ہوتی کیونکہ اشفاق احمد فنکاروں کی مجبوریوں اور ضرورتوں سے آگاہ تھے۔ یہ بہت بعد کی بات ہے۔ داستان سرائے جا چکے تھے۔ اس دور میں اشفاق صاحب نے بہت سے باکمال سلسلہ وار کھیل لکھے جن میں ”تھوڑے حیرت کدہ“ ”ایک محبت سوانح“ ”تو تا کہانی“ ”اور ڈرامے“ ”ننگے پاؤں“ ”من چلے کا سودا“ کے ساتھ ساتھ شمار اور ڈرامے بھی لکھے۔ ہمارے معاشرے میں پارٹی بازی کی بہت اہمیت ہے۔ سیاست دانوں اور تاجروں سے ادیبوں تک سب گروہ بندی اور پارٹی بازی پر یقین رکھتے ہیں، لیکن اشفاق احمد خاں نے کبھی کوئی گروپ بنانے یا کسی میں شامل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ ان کا سب سے بڑا گروپ یا پارٹی ان کی محنت تھی۔

اشفاق صاحب سکرپٹ لکھ کر گھر کے اخراجات پورے کرتے۔

ایک دن میں نے دیکھا اشفاق صاحب کے بیڈروم کے ایک کونے میں ایک روسٹرم پڑا ہے۔ میں نے پوچھا صاحب یہ روسٹرم کیسے آ گیا بیڈروم میں۔ کہنے لگے کہ آج لکھنے کا کام بہت زیادہ ہے۔ دن بھر تو مہمانوں کا تانتا رہتا ہے۔ رات کو جب کرسی پر بیٹھ کر لکھنا شروع کرتا ہوں تو نیند آ جاتی ہے۔ اس لیے یہ ہی فیصلہ کیا کہ کھڑے ہو کر لکھ جائے۔ آخر گھر کے اخراجات بھی تو پورے کرنے ہیں۔

اشفاق صاحب کے کچھ مہربان یہ بھی کہتے ہیں کہ اشفاق احمد ایک بہت چالاک انسان تھا جس نے پاکستان کی حکومت سے فائدہ اٹھایا یا یہ کہ حکومتوں کی تبدیلیوں کے ساتھ اُن کے نظریات میں بھی تبدیلی آ جاتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ لوگ کرتے ہیں جنہوں نے اشفاق صاحب کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ جن لوگوں نے اشفاق احمد کو قریب سے دیکھا ہے وہ یقیناً ان باتوں سے متفق نہیں ہوں گے۔ حکومتوں کے ساتھ بدلنے والے تو کروڑوں میں کھیلتے ہیں، ان کے گم گم کر گھر کے اخراجات پورے نہیں کرتے۔ وہ ہمیشہ ایک بات کہا کرتے تھے کہ ”ٹھنڈا تپا پانی ملد ارہوے تے تھنڈاں دور وٹیاں ایس توں ودھ انسان دی ہور کی لوڑاے۔“

دو دفعہ وقت کے حاکموں نے انہیں وزیر بننے کی پیشکش کی لیکن انہوں نے دونوں مرتبہ انکار کر دیا۔ پہلی بار انہیں ۱۹۷۱ء کے دور میں اور دوسری بار نواز شریف صاحب کے دور حکومت میں۔ جنرل ضیاء الحق کے دور میں تو اخبارات میں بھی شائع ہو گئیں کہ اشفاق صاحب بہت جلد اپنے عہدے کا حلف اٹھانے والے ہیں۔ میں نے بھی خبر پڑھی تو صاحب کو ٹیلی فون کر کے مبارکباد دی۔ ”خاں صاحب کسی تے وزیر بن رہے ہے۔“

کہنے لگے ”توں تے دوست این تو کیوں بد دعائیں دے رہا ہے۔“

میں نے عرض کی ”لوگ تو وزیر بننے کی تمنا کرتے ہیں۔ آپ الٹ بات کر رہے ہیں۔“

کہنے لگے ”ریاض میاں! نہ تو میں نے مال بنانا ہے اور نہ شہرت کی کوئی تمنا ہے۔ شہرت اللہ نے پہلے ہی بہت سے لوگوں کو عطا کر دی ہے اور گزارے کے لیے ہم میاں بیوی کما ہی لیتے ہیں۔ پھر میں کیوں اپنی آزادی گنواؤں۔“

میں نے کہا ”بات تو آپ کی ٹھیک ہے لیکن وزارت، وزارت ہی ہوتی ہے۔ اُس کا اپنا چمکا ہے۔“

کہنے لگے ”میں اور تیری آپا کبھی کبھی شاہ عالمی جاتے ہیں۔ وہاں ایک بڑھیا سردیوں میں سرسوں کا ساگ پکا کر کھاتا ہے۔ ہم وہ ساگ اس بڑھیا کے پاس پیڑھیوں پر بیٹھ کر کھیتی کی روٹی کے ساتھ کھاتے ہیں۔ جو چمکا اس بڑھیا کے کھانے سے سرسوں کے ساگ کا ہے، وہ وزارتوں یا امارتوں میں نہیں ہے۔“

میں نے پوچھا ”آپ صدر صاحب کو کیسے انکار کریں گے؟“

کہنے لگے ”تیرے بچے جنیں۔ یہ ہی سب سے مشکل مرحلہ ہے۔ حاکم وقت کا اصرار ہے کہ اسلام آباد چلے آؤ۔“

میں نے طرف سے انکار ہے۔ دعا کرو کہ اس امتحان سے بخیر و خوبی نکل آؤں۔“

انتقال سے کچھ عرصہ پہلے حکومت پنجاب نے انہیں علاج کے لیے پانچ لاکھ روپے دینے کی پیشکش کی لیکن صاحب نے شکریے کے ساتھ اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شعیب بن عزیز سے کہنے لگے۔ ”بھائی اگر تم نے چوہدری پرویز الہی کی رقم وصول کر لی تو میرے بیٹوں کو رنج ہوگا۔ ابھی علاج کی وہی کفالت کر رہے ہیں۔“

اشفاق صاحب کے افسانے، ڈرامے اور مضامین تو بہت شائع ہوئے لیکن کم لوگوں کو اس بات کا علم ہے کہ ان کی شاعری کا ایک مجموعہ ”کھٹیا وٹیا“ کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ایک دن میں اشفاق صاحب کو ملنے ان کے گھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے ”لے بھی ریاض محمود! تینوں ایک نظم سنائیے۔“ وہ ہمیشہ مجھے پورے نام سے ہی مخاطب کرتے تھے۔ میں نے پوچھا ”کس کی نظم ہے؟“ کہنے لگے ”میری۔“

میں نے عرض کیا کہ ”یہ شاعری کب سے شروع کر دی؟“

کہنے لگے ”تینوں تے پتہ ای اے کہ میں کدی شاعری نہیں کہتی۔ پر پتہ نہیں کہاں پچھلے دنوں مینوں شاعری بھوت چڑھ گیا تے میں کوئی تی بہنتی نظماں لکھ چھڑیاں۔ اچھا گلاں بعد وچ کریں، پہلا ایہہ نظم سن لے۔“

چھاوٹی آ لے ہل توں

پہلاں ننگیاں منڈا

فیرنگی کڑی

فیرنگی چٹی کار

پٹھوں لنگی تیز گام

بندیاں نال بھری

ایڈھا سو ہنداں سی

میں چھٹی لے لئی۔

میں نے عرض کیا ”خاں صاحب ایہ تو کمال کی شاعری ہے۔ اسے جاری رہنا چاہیے۔“

کہنے لگے ”ریاض محمود! ایہہ ساریاں نظماں واہرو لے واگواک پاسیوں آئیاں تے مینوں بھوانیاں ڈوبے پاسیوں نکل گئیاں۔ مڈ میں بڑا چارالا یا بڑی کوشش کہتی پراک مصرعوں میرے نیڑے نہ ڈھکیا۔“

اشفاق صاحب کے ٹیلی ویژن ڈرامے اور ریڈیو پروگرام تلقین شاہ بھارت میں بھی اتنے شوق سے دیکھے سنے جاتے تھے جتنے پاکستان میں۔ ایک بار بھارت کے معروف گلوکار ہنس راج ہنس پاکستان تشریف لائے۔ ایک مرتبہ

میں ان سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنا تعارف کروایا اور کہا ”میں آپ کا انٹرویو کرنا چاہتا ہوں۔“

ہنس راج کہنے لگے ”میں آپ کو جانتا ہوں۔“

مجھے حیرت ہوئی، پوچھا ”کیسے؟“

کہنے لگا ”میں نے تو گانا سیکھا ہی لاہور ریڈیو سٹیشن کو سن کر ہے۔ مجھے کسی نے بتایا کہ لاہور ریڈیو سے نشر کرنے والے پروگرام ”پنجابی دربار“ میں تمہارے گانے نشر ہوتے ہیں۔ مجھے یقین نہ آیا لیکن جب میں نے لاہور ریڈیو سے

شروع کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صاحب سچ کہتے تھے۔“

میں نے کہا ”چلیے یہ تو اور بھی اچھا ہو گیا کہ آپ مجھ سے واقف ہیں۔ اب یہ فرمائیے کہ انٹرویو کے لیے

”کے؟“

”راج کہنے لگے ”اس بار تو مشکل ہے لیکن اگلی بار آؤں گا تو ضرور انٹرویو ریکارڈ کراؤں گا۔ ابھی پروگرام

کے لیے ہے۔ پھر گلوکار شوکت علی کے ہاں کھانا ہے اور صبح پانچ بجے میری واپسی ہے۔“

”میں نے کہا ”اگلی دفعہ جب آپ آئیں تو انٹرویو ضرور ہوگا۔“

”راج کہنے لگے ”ایک اور خواہش تھی جو میں ساتھ لے کر آیا تھا لیکن وہ بھی پوری نہ ہو سکی۔“

”وہ کیا خواہش تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”کہنے لگے۔ ”لاہور میں ایک بہت بڑا بدمعاش جیور ہوتا ہے۔ اُن کے ورثہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”میں نے کہا۔ ”آپ انہیں کیسے جانتے ہیں۔“

”کہنے لگے ”اُن کی ساری ڈیو، آڈیو کیشیشن میرے پاس محفوظ ہیں۔“

”میں نے کہا ”میں انہیں آپ کے بارے میں بتا دوں گا۔“

”راج کہنے لگے ”اُن سے کہیے گا کہ ایک پاگل بھارت سے آیا تھا اور آپ کے چرن چھونے کا خواہش مند

تھا۔ اس وقت نہ ہونے کے باعث حاضر نہ ہو سکا لیکن آؤں گا ضرور۔“

”راج اپنے وعدے کے مطابق اشفاق صاحب کو ملنے تو نہ آ سکا لیکن اس نے بمبئی سے اصغر ندیم سید

کے ساتھ ایک شال اور ایک ہزار روپیہ نذرانے کے طور پر ارسال کیا۔ اشفاق صاحب کے انتقال کے بعد ایک روز

راج سے گفتگو ہوئی تو اس نے اشفاق صاحب کی رحلت پر گہرے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”بڑا قیمتی بندہ

تھا۔“

”زاویہ“ پروگرام جسے اشفاق صاحب ہر ہفتے پی ٹی وی سے پیش کرتے تھے، ساری دنیا میں بسنے والے اردو

مجھے میں ایشیائی مقبول تھا۔ جب اشفاق صاحب نے یہ پروگرام ابھی شروع نہیں کیا تھا تو ایک دن اس خاکسار کو

”میں ٹیلی ویژن سے ایک پروگرام شروع کر رہا ہوں جس میں میں چند لوگوں کے سامنے پچیس منٹ گفتگو

کے لیے پھر اگر سامعین میں سے کوئی سوال پوچھنا چاہے تو اس کا جواب دوں گا۔“

میں نے عرض کی ”حضور یہ پروگرام کامیاب نہیں ہوگا کیونکہ کون پچیس منٹ تک صرف ایک ہی آدمی کو سن سکتا

ہے۔“

”راج نے کہا ”تجربہ کرنے میں کیا حرج ہے۔ میرا قریلی داستان گو بھی تو ساری ساری رات ہزاروں کے مجمع سے

گفتگو کرتا اور کوئی ایک آدمی بھی پنڈال چھوڑ کے نہ جاتا تھا۔“

جب پروگرام شروع ہوا تو میرا اندازہ بالکل غلط ثابت ہوا اور ”زاویہ“ نے مقبولیت کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اشفاق احمد بنیادی طور پر ایک داستان گو تھا۔ انہوں نے جب رسالہ شروع کیا تو اس کا نام

”داستان گو“ رکھا۔ اردو میں یہ پہلا رسالہ تھا جو ریڈرز ڈائجسٹ کے ماگزین پر چھپتا تھا۔ اس کا مواد، سرورق اور چھپائی نہایت

اعلیٰ درجے کی تھی۔ ادبی حلقوں میں اس رسالے نے دھوم مچا دی۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ نے محنت کر کے ایک ٹیبلٹ تو نکال دیا لیکن دونوں میاں بیوی اس کے تجارتی پہلو سے ناواقف تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ”داستان گو“ بند ہو گیا۔ اشفاق احمد نے ماڈل ٹاؤن میں گھر بنایا تو اس کا نام ”داستان سرانے“ رکھا۔

پروگرام ”زاویہ“ میں ان کی گفتگو کا انداز جس کے سب لوگ دیوانے تھے، داستان گو جیسا ہی تھا۔ صاحب پروگرام ”زاویہ“ کا اختتام اس جملے پر کیا کرتے تھے۔ ”اللہ تعالیٰ آپ سب کو آسانیاں عطا فرمائے۔“ تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔“ حقیقت یہ ہے کہ یہ وہ بات صرف کہتے ہی نہیں تھے بلکہ اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ ہمیشہ دوسروں کے کام آتے۔ ان کی پریشانیوں میں ان کی مدد کرتے لیکن انداز ایسا اپنائے رکھتے جیسے ان کا کسی سے تعلق ہی نہ ہو یا انہوں نے کسی کے لیے کچھ کیا ہی نہ ہو۔ جب کوئی خاں صاحب کے پاس اپنی کوئی پریشانی یا مشکل آتا تو وہ اسے اس انداز سے سنتے گویا ان پر کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا۔

اپنی پریشانی لے کر آنے والا مایوس ہو جاتا کہ لوجی میں سخت مشکل میں گرفتار ہوں لیکن اشفاق صاحب توجہ سے میری بات تک نہیں سنی لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔ جب کوئی پریشانی یا مشکل بیان کر چکے تو پھر اس کی نہ رہتی۔ خاں صاحب کی ہوجاتی اور وہ اس پریشان شخص کی امداد کے لیے کمر بستہ ہو جاتے۔ جب اس کا کھانا تب بھی ایسے ظاہر کرتے کہ سب اتفاق سے ہو گیا۔ اس کام کے ہونے میں میری کسی کوشش کا دخل نہ تھا۔ کسی کے بوجھ ڈالنا نہیں ناپسند تھا۔

ریڈیو کے ایک بڑے بہت فنکار کا انتقال ہو گیا۔ ہمارے معاشرے میں فنکار خواہ وہ کتنا ہی نامور ہو مشکل سے ہی گزر بسر کرتا ہے۔ اس فنکار کی موت کے بعد اس کی بیوی بچوں کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ خاں صاحب اس فنکار سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ مرحوم فنکار ریڈیو سے بحیثیت سٹاف آرٹسٹ منسلک تھے۔ آج کل تو ریڈیو ملازمین کی یہ کیلگری ہی ختم کر دی ہے لیکن ان دنوں میں سٹاف آرٹسٹ کو ایک مقررہ تنخواہ ملتی تھی۔ کوئی میڈیکل گریجویٹ یا پنشن اوانہ کی جاتی تھی۔

اشفاق صاحب نے کوشش کر کے اس فنکار کے گھر والوں کے لیے وظیفہ منظور کروایا۔ ہر ماہ خود بھی امداد کرتے۔ اس فنکار کی بچیوں کی شادیوں میں بھی اشفاق صاحب اور اس خاندان کی بھرپور اعانت کی۔

ایک اور نامور ڈرامہ نگار اور صداکار جن کا بہت شہرہ تھا، انتہائی مالی پریشانیوں کا شکار تھے۔ خاں صاحب نے ماہ ان کی مالی امداد فرماتے، لیکن امداد کا انداز یہ تھا کہ کسی دوسرے کو کونوں کان خبر نہ ہونے دیتے۔ اتفاق سے میری نظر اس خط پر پڑ گئی جو ان ڈرامہ نگار صاحب نے شکریے کے طور پر اشفاق صاحب کو لکھا تھا، جس سے حال معلوم ہوئی۔

بہت سے بچے اشفاق صاحب کے ہاں گھریلو ملازم کی حیثیت سے آئے تھے لیکن داستان سرانے میں ان کا سلوک ایسا ہوتا گویا وہ اسی گھر کے بچے ہیں۔ وہ گھر کے باقی افراد کے ساتھ میز پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ آپاقتی پڑھاتیں۔ پڑھائی کے سارے اخراجات ادا کرتیں۔ جب وہ پڑھ گئے تو ان کو مختلف جگہوں پر ملازمتیں دلوائیں۔

زندگی بسر کر رہے ہیں۔

خان صاحب مہمان نواز بہت تھے۔ خود بھی خوش خوراک تھے اور دوسروں کو بھی کھلا کے خوش ہوتے تھے۔ سیخ
بہت پسند فرماتے تھے۔ کھانے کے معاملے میں میرا بھی کچھ ایسا ہی حال تھا۔ غالباً ہمارے تعلقات کی
بھی خوش خوراک ہی تھی۔ کسی زمانے میں چونامنڈی میں خلیفہ کباب فروش کے ہاں پہنچے ہوتے اور کبھی موچی
کے ہاں اور کبھی چھاؤنی میں مانجھے کے کبابوں سے لطف اندوز ہوتے۔ بیماری کے دنوں میں
بہت کم تروروں کوششوں کے باوجود اشفاق صاحب کچھ کھانے پر آمادہ نہ ہوتے۔

میں نے ایک دن عرض کی ”خان صاحب! ایسے تو بہت کمزوری ہو جائے گی۔“

کہنے لگے ”میرے سامنے گوشت اور شور بار کھ دیا جاتا ہے۔ میں اسے کیا کھاؤں۔ کوئی کباب ہوں یا نکلے تو
یہ صحت کھانے پر آمادہ ہو جائے۔“

میں نے ان کی خواہش پر کئی جگہوں سے کباب لا کے انہیں کھلائے لیکن خان صاحب کو پسند نہ آئے۔

ایک دن کہنے لگے ”ریاض محمود! بڑے دکھ کی بات ہے کہ لاہور ایسا شہر ہو لیکن یہاں کوئی بھی اچھا کبابیہا نہیں

جو پرانے تھے وہ یا تو کام چھوڑ گئے یا ان کا معیار گر گیا اور جو نئے ہیں ان کا دوسرے سے کوئی معیار ہی نہیں۔

میں نے ان کو کوکلوں پر پکاتے۔ ایسے لذیذ کباب تیار ہوتے کہ جس نے بھی کھائے پھر کھانے کی تمنا کی۔

میر میں آٹھ مہمان آجائیں پادس۔ اگر کھانے کا وقت ہو گیا تو وہ کھانا کھائے بغیر نہیں جاسکتے تھے۔ آپاقدسیہ
چھوڑ کر ہانڈی روٹی سنبھال لیتیں۔ ایسے ایسے لذیذ کھانے تیار ہوتے کہ مہمان انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔

کبھی کبھی اشفاق صاحب کے ہاں مہمانوں کے درمیان کھانا پکانے کے مقابلے بھی ہوتے۔ جو سب سے لذیذ
کرت اشفاق صاحب اپنے دستخطوں والا سوروپے کا نوٹ دیتے۔ قلفے کا ساگ گوشت پکا کے ایک بار میں نے بھی

خان صاحب ایک انتہائی ذہین، پڑھے لکھے، جدید نظریات پر یقین رکھنے والے اور مغربی طرز زندگی سے متاثر

تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مشرقی علوم، تہذیب اور ثقافت سے بھی بے حد لگاؤ رکھتے تھے۔ یہی لگاؤ انہیں
ہماری حاش پھانسا تا رہتا۔ نور والوں کے ڈیرے میں جب ان کی ملاقات ایک باباجی سے ہوئی تو ان کے خیالات میں

تبدیلی آگئی اور بقول اشفاق صاحب ”نور والے ڈیرے کے باباجی سے مل کر مجھے احساس ہوا کہ اصل گیان، علم اور
سیدھا سیدھا راستہ دکھانے کا نسخہ تو ان بابوں کے پاس ہے۔“

یہ بابے مادی ترقی کے مخالف نہیں لیکن انسانی شخصیت کو سنوارنے اور روحانی ترقی کا جو درس ان کی باتوں میں

تھے وہ کہیں اور سے نہیں ملتا۔ باباجی کی باتوں اور اتوال کی جھلک اشفاق صاحب کی تحریروں میں بھی نظر آنے لگی اور
یہی ملاقاتوں اور باتوں نے انہیں ”من چلے کا سودا“ ایسا سیریل لکھنے پر راغب کیا۔

دوسروں کی تکلیف، پریشانی یا دکھ کا حال ضرور سنتے اور موقع محل کی نسبت سے اُسے مشورہ بھی دیتے تھے۔ دکھ یا پریشانی کا کسی سے ذکر نہ کرتے۔ اُن کے پتے کا آپریشن ہوا تو معلوم ہوا کہ پینکٹر یا پرگرو تھ ہے۔ سرجن نے احمد کے پٹھلے صاحبزادے کو بتایا کہ یہ ملکیٹھ ہے۔ زندگی اور موت کے درمیان صرف چند ماہ کا فاصلہ ہی رہ گیا ہے۔ انیس خاں نے پوچھا۔ ”ابو کو علم ہے۔“

سرجن نے کہا ”ہم نے تو نہیں بتایا لیکن اشفاق احمد جیسے ذہین انسان سے کوئی بات چھپ نہیں سکتی۔ بات سے آگاہ ہیں۔“

اور اشفاق صاحب یقیناً سب کچھ جانتے تھے لیکن کبھی کسی سے ذکر تک نہ کیا کہ میں کینسر ایسے موذی مرض کا شکار ہوں۔ ہمیشہ یہ ہی کہتے کہ یار لوگ تو پتے کا آپریشن کروا کے آٹھ دس دن میں بھلے چنگے ہو جاتے ہیں لیکن میرے ساتھ کچھ طویل ہی ہو گیا ہے۔ جب بھی کوئی پوچھتا ”اب طبیعت کیسی ہے؟“

تو یہی کہتے ”اب پہلے سے بہتر ہوں۔ بس کمزوری ہے، اللہ نے چاہا تو یہ بھی جاتی رہے گی۔“ بات صرف اتنی تھی کہ اپنے پیاروں، عزیزوں یا دوستوں کو اس موذی مرض کا بتا کے پریشان نہیں کرتے تھے۔ کبھی بلکہ آخری دن تک اپنے قریبی سے قریبی دوست سے بھی اپنے مرض کے متعلق کچھ نہ کہا۔

سات ستمبر کی صبح کو جب وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہوئے تو رخصتی سے ذرا پہلے آپا قدسیہ کے پاس پریشانی کے آثار دیکھ کر کہنے لگے۔ ”قدسیہ! گھبراتا یا پریشان مت ہونا۔ جو کچھ ہو رہا ہے ٹھیک ہی ہو رہا ہے۔“

میں اور اشفاق صاحب صبح کے وقت ڈی بلاک فٹ ہال گراؤنڈ ٹاؤن میں سیر کیا کرتے تھے۔ گراؤنڈ دونوں طرف پختہ سڑکیں تھیں اور لوگ پختہ سڑکوں پر ہی سیر کیا کرتے کیونکہ گراؤنڈ ایک دو جگہوں سے قدرے چھوٹی تھی۔ اشفاق احمد اس گراؤنڈ کو اپنی محبوب گراؤنڈ کہا کرتے تھے۔

میں نے کئی دفعہ عرض کی ”خاں صاحب! یہ گراؤنڈ ناہموار ہے۔ کیوں نہ ہم بھی سڑک پر چہل قدمی کیا کریں لیکن خاں صاحب نہ مانے۔ اب یہ اتفاق ہی ہے کہ خاں صاحب کی اسی محبوب گراؤنڈ میں اُن کا جنازہ ہونا ہو گیا ہوئے اور وہیں چالیسواں۔ اشفاق صاحب بنیادی طور پر ایک پُر امید انسان تھے اور ہر معاملے کا روشن پہلو دیکھتے لوگ جب ملکی حالات سے پریشان ہو جاتے تو ان سے پوچھتے ”خاں صاحب! اب کیا ہوگا؟“

اکثر اُن کا جواب یہ ہی ہوتا ”اس میں کوئی شک نہیں حالات بہت خراب ہیں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اس میں سے بہتری کی کونپل پھولے گی۔ انشاء اللہ پاکستان کا شمار دنیا کے امیر اور ترقی یافتہ ملکوں میں ہوگا۔ دولت تو پختہ میں بہت آجائے گی لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں ہم مادیت کی دوڑ میں پڑ کے اپنی روحانی اقدار سے منہ نہ موڑ لیں۔“

ایک دن بتانے لگے ”پرویز مشرف نے مجھے ایوان صدر میں بلوایا۔“ جب گفتگو شروع ہوئی تو مشرف نے کہا ”اشفاق صاحب! ملکی حالات کی بہتری کے لیے کوئی مشورہ دے۔“ اشفاق صاحب کہنے لگے ”خلق خدا دکھی ہے لیکن کوئی اُس کا دکھ سننے والا نہیں ہے۔ لوگ نہ روٹی مانگتے کپڑا نہ مکان۔ وہ صرف ایک کندھا چاہتے ہیں جس پر سر رکھ کے وہ دو آنسو بہا سکیں۔“

کسی زمانے میں ہمارے باپے دکھوں کی بات سنتے تھے۔ انہیں حوصلہ اور مشورہ دیتے تھے لیکن اب وہ باپے بھی

سات ستمبر 2004ء کی سوگوار شام کو جب ہم ماڈل ناؤن کے قبرستان میں خاں صاحب کو سپرد خاک کر کے
تھے تو رہ کر میرے دل میں خیال آ رہا تھا کہ آج آخری بابا بھی ہم سے رخصت ہو گیا۔ وہ کندھا بھی ہمارا
پر سر رکھ کے لوگ دو آنسو بہا لیا کرتے تھے۔

اسلم کولسری گو 36۔ جی کا حصہ نہ تھے لیکن وہ اردو بورڈ سے منسلک تھے۔ میں ان سے کبھی 36۔ جی میں نہ ملی۔
بن گیا تو کولسری صاحب، خاں صاحب سے وابستہ ہو گئے۔ اس کی داستان بعد میں رقم کروں گی۔
صاحب کا مضمون دیکھیے۔

اشفاق صاحب ڈائریکٹر جنرل اردو سائنس بورڈ

اشفاق صاحب کی رحلت کے بعد تین چار مواقع پر مجھے اپنے تاثرات بیان کرنے کو کہا گیا مگر ہمت نہ پڑی کہ
تے ہی ہونٹ ساکت ہو جاتے اور قلم گم۔ ٹیلی ویژن کے منفرد کمپیئر نور الحسن نے اسلام آباد میں اشفاق
کے لیے ہونے والے ریفرنس میں شرکت کی نہ صرف دعوت دی بلکہ ہوائی جہاز کی سیٹ بھی بک کروالی۔ نور الحسن کو
اشفاق صاحب کے جنازے میں آنسوؤں میں ڈوبے ہوئے دیکھا تھا۔ سوان کا کہنا میرے لیے بے حد اہمیت کا
بعد لاہور ٹیلی ویژن پر منعقدہ پروگرام میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ میں اپنے گوشہ تہائی میں چپ
اشفاق صاحب کی یاد میں شائع ہونے والی مختلف کتب اور میگزینز میں کچھ لکھنے کو کہا گیا۔ قلم اور زبان منجمد
میں بھی تک قلم چھوڑے توڑے ہوئے ہوں، آخر کیا لکھوں اور کیسے لکھوں۔

پہلی سن کالج کے پروفیسر عرفان علی شاد کے افسانوں کی کتاب ”دھوپ کی لکیر“ شائع ہوئی تو انہوں نے اترارہ
مجھے بھی عطا کیا۔ پہلا افسانہ ”دھوپ کی لکیر“ بے پناہ ڈرامائی کیفیات لیے ہوئے تھا، میں نے تجویز کیا کہ
وہ کہنے لگے کہ جناب اشفاق احمد بھی یہی فرما رہے تھے، ممکن ہو تو آپ ہی کوشش کریں۔ میں نے
اور پھر ہم وہ ڈرامائی تشکیل لے کر اشفاق صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ اشفاق صاحب سے
تھی جو عرفان بھائی کے توسط سے اردو سائنس بورڈ میں ان کے دفتر میں ہوئی۔ انہوں نے میز کے نیچے
بڑھا کر ہماری طرف بڑھایا جس میں بھنے ہوئے پننے تھے اور خود میرے لکھے ہوئے ”ڈرامے“ کو الٹ پلٹ کر

”کہاں کے رہنے والے ہو؟“ انہوں نے پہلا سوال کیا۔ میں نے بتایا کہ ”ساہیوال کا“۔ فرمانے لگے۔
میں بہت ٹیلنٹ ہے۔ منیر نیازی نے آ کر دھوم مچا دی۔ انہوں نے دو تین صفحے دیکھے اور پلندہ میز پر رکھ دیا۔ کچھ
موندے پننے چباتے رہے۔ پھر بولے ”بھائی تم نے تو ہالی وڈ کے لیے لکھ دیا۔ یار لوگوں کو کہا جاتا ہے کہ یہ سین
پر فلما یا جائے تو وہ سٹوڈیو میں بانس گاڑ لیتے ہیں۔ یہ ڈرامہ نہیں ہو سکے گا۔ بہر حال تمہاری کوشش اچھی

ہے۔“ پھر انہوں نے بیل بجائی یعنی ہمارا وقت ختم ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری کوشش مضحکہ خیز ہونے کی بجائے ناکام تھی مگر انہوں نے مجھے دل شکستہ نہیں ہونے دیا۔

کچھ مہینوں کے بعد مجھے اردو سائنس بورڈ میں ریسرچ آفیسر لسانیات کی نوکری مل گئی۔ وہ مسکرائے۔ ”تو تم نے تمہارے ڈرامے کا معاوضہ مل ہی گیا۔“ میں اندر ہی اندر بہت خوش تھا کہ ان کے قریب رہ کر ڈرامہ نویس کی کافن سیکھوں۔ تیسرے ہی روز وہ میری میز پر آئے اور یہ کہتے ہوئے کہ ”ڈرامے ورامے کا خط نکال ذہن سے اور دفتر کے کاموں کی طرف پوری توجہ دو۔“ آگے بڑھ گئے۔ مجھے دھچکا سا لگا مگر کھلا کہ دفتری امور میں کسی قسم کی کامیابی یا عدم دلچسپی کو مدنظر نہیں کر پاتے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ایک دن کے لیے شہر سے باہر گئے تھے۔ اگلے روز شاید کسی نے کہہ دیا کہ وہ اس وقت نے سستی کو سونپ دیا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مجھے طلب کیا۔ ”کل تم نے کیا کام کیا؟“ میں اس سوال پر حیران ہوا۔ میرے چہرے پر چھپ گئی، ساتھ ہی ناخوشی کی ہلکی سی لالی بھی تیر گئی۔ میں آئیں بائیں شائیں کر کے باہر اپنی میز پر اوکاڑہ سے آئے ہوئے کچھ دوست براجمان تھے اور اس کے ساتھ ہی دفتر میں چھٹی کا وقت بھی ہو گیا تھا۔ چنانچہ میں ہو گیا۔ رہ گئے میں اور میرے مہمان۔ میں نے چوکیدار سے چائے لانے کو کہا۔ چائے آئی تو اشفاق صاحب آگے کے ایک ہاتھ میں بسکٹ کی پلیٹ اور دوسرے ہاتھ والی پلیٹ میں نمک پارے اور اکبرز میں میں شدت حیرت سے دیکھ رہے تھے وہ مسکراتے ہوئے کہنے لگے ”یار کیا کروں میں ماں بھی بہت اچھی ہوں۔“ وہ پلیٹیں دھر کے چلے گئے۔ میں اور میرے مہمان کافی دیر تک کوئی بات نہ کر سکے۔

ان دنوں دفتر اڑھائی بجے بند ہو جاتا تھا، اڑھائی بجتے ہی لوگ باگ گھروں کی راہ لیتے۔ چوکیدار گیت پاس آ جاتا اور میں دفتر کے پچھواڑے چوکیدار کے کمرے میں گھس کر سو رہتا، البتہ اشفاق صاحب اپنے کمرے میں کام کرتے رہتے، کام نمٹا کر مطالعے میں مستغرق ہو جاتے، مطالعے سے قدرے تھک جاتے تو نیپ ریکارڈ آن کرتے ہیڈ فون کانوں سے لگا کر آنکھیں موند لیتے اور کوئی لیکچر سننے لگتے۔ پھر بیل بجاتے، چوکیدار بھاگا بھاگا آتا۔ پوچھتے جاگ گیا ہے۔ پٹھان چوکیدار طوطی مرجان تیزی دکھاتا۔ ”صاحب اٹھاؤں؟“ ”نہیں، جب جاگ جائے تو انہوں نے کبھی مجھے جگایا نہیں۔ میں اپنی مرضی سے پانچ بجے کے قریب بیدار ہوتا تو مرجان بتاتا کہ صاحب پوچھتے تھے۔ میں ان کے کمرے میں جاتا۔ تب وہ چوکیدار سے چائے لانے کو کہتے اور کمرے میں پھیلی روشنی میں شفقت کا شامل ہو جاتا۔ وہ کافی دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے۔ تب وہ میرے پاس نہیں بزرگ ہوتے اور میں دفتر پر خوردار، نیاز مند، عزیز مگر اگلی صبح جب دفتر لگتا تو اشفاق صاحب ڈائریکٹر جنرل ہوتے اور خاکسار محض ریسرچ آفیسر جیسا کہ میں نے عرض کیا اشفاق صاحب دفتری معاملات میں کسی قسم کی رورعایت نہ کرتے۔ ادھر کھینچ کر ہوئی ادھر ایک پیلے رنگ کا کاغذ میز پر آ جاتا جس پر ”ڈائریکٹر جنرل کی طرف سے سلام پہنچے“ تو چھپا ہوتا، باقی حوالے کے قلم سے لکھی ہوتیں اور خاصی ”حوصلہ افزا“ ہوتیں۔ سو دفتری اوقات میں دفتر میں مکمل طور پر خاموشی ہوتی، ہر شخص میز پر اپنے کام میں مستغرق ہوتا۔ کبھی کوئی مہمان آنکلتا تو ہال میں داخل ہوتے ہی گھبرا سا جاتا۔ پھر سرگوشی ہی میں حوالے احوال پوچھتا اور بھاگ نکلنے ہی میں عافیت سمجھتا۔ تاہم ایک انتظام پسند ڈائریکٹر جنرل ہونے کے باوجود انہیں

میں کو ایک خاندان بھی بنا رکھا تھا جس کی بزرگ ترین ہستی وہ خود تھے۔ انہوں نے یہ کیسے manage کر رکھا ہے مجھے کانہ سمجھانے کا۔

صبح دفتر آتے تو سارے دفتر کا راؤنڈ لیتے، یہ موٹر سائیکلیں سیدھی قطار میں کیوں نہیں، میز ذرا آگے کھسک کر آواز کیوں دیتا ہے۔ وہ ذرا ذرا سی باتوں پر نظر رکھتے تھے حتیٰ کہ اگر ڈاک کلرک کسی لفافے پر نکت چسپاں سے میز ہا کر بیٹھتا تو بھی پکڑا جاتا "اسے اتارو اور ٹھیک سے چسپاں کرو۔"

یہ روز وہ علی الصبح دفتر آ گئے۔ سیدھے چوکیدار کے کمرے میں گئے جو چائے بنا رہا تھا۔ "ارے خان، بیوی بیوی نہیں؟" مرجان کھسیانا سا مسکرایا۔ وہ اگلے روز بھی علی الصبح دفتر آئے، ان کے ہاتھ میں ایک ایک کبلی۔ چوکیدار نہیں دیکھتا ہی رہ گیا اور وہ چیزیں تھا کر تیزی سے آگے بڑھ گئے۔

یہ سلسلہ دفتر کے ملازمین تک محدود نہ تھا۔ میں ایک ایسی تنگ و تاریک گلی سے بھی واقف ہوں جس کے ایک کونے کے مکان میں ایک نایاب بزرگ رہتے تھے جن کی اپنی اولاد نہ تھی، ضعیف بیوی ان کی خدمت کرتی تھی، سے محروم ہو گئیں۔ آمدنی کا واحد ذریعہ اشفاق صاحب تھے۔ وہ ہر مہینے انہیں اتنی رقم پہنچا دیتے کہ مکان کے کچھ کھانے پینے اور ادویات وغیرہ کا بندوبست ہو جاتا۔ وہ خود بھی ان کی خبر گیری کے لیے کبھی کبھی اس تنگ و تاریک گلی میں پہنچتے اور کانی دیران کے پاس بیٹھے رہتے۔ چونکہ یہ بستی میری رہائش گاہ کے قریب تھی، اس لیے میں ان سے واقف تھا۔ اور بھی کئی تاریک گوشے ہوں گے جہاں ان کی مروت کا چراغ روشنی پھیلاتا تھا، مگر میں ان سے کبھی اپنے ایسے وظائف کا ذکر تک نہیں کرتے تھے۔

شام کی محفل میں ہمیں اکثر خاموش رہتا، مگر ان کے مہربان رویے کی بنا پر آہستہ آہستہ کھلنے لگا۔ ایک شام یونہی سے دیا کہ "یہ جو آپ کا جملہ ہے کہ پاکستان کو کسی ان پڑھ نے نقصان نہیں پہنچایا اور جس کا یار لوگ یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ آپ تعلیم کے خلاف ہیں تو....." میں ذرا سا جھجکا۔ انہوں نے چائے کی بھرپور چسکی لی تو میں نے کہا "تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے یہاں کے نظام تعلیم پر طنز ہے کہ وہ کیا مال پروڈیوس کر رہا ہے نہ کہ علم کی شمع کے چہرے پر بھرپور مسکراہٹ پھیل گئی۔ فرمانے لگے "لو سا ہیوال کا پینڈو بات کو سمجھ گیا ہے اور ہمارے یہاں ہی برساتے چلے جاتے ہیں۔" ایک بار میں نے شہاب صاحب کی مخالفت میں شائع ہونے والی کسی کتاب کے بارے میں اشفاق صاحب خود مان گئے ہیں شہاب نامے کے کچھ اوراق انہوں نے سپرد قلم کیے، کچھ ممتاز مفتی نے اور کچھ ادیبوں نے۔" "حیرت ہے۔" وہ کہنے لگے "یار اچھے بھلے پروفیسر لوگ بھی طنز کو نہیں سمجھتے۔"

تاہم ایسے موقعوں پر ایک آدھ جملے ہی پراکتفا کرتے تھے، بات بڑھاتے نہیں تھے۔ انہوں نے کبھی کسی ہم عصر کے بارے میں کسی مخالفانہ تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ کبھی کوئی ایسا ذکر چھیڑا بھی تو انہوں نے ٹوک دیا۔ البتہ اپنے بابا فضل کی باتیں خوب لطف لے لے کر بیان کرتے۔ فیصل آباد میں مقیم ایک بابا جی کا ذکر بھی کیا کرتے کہ میں ان دنوں کبھی تھرٹ پہنتا اور اکثر ان سے ملنے جایا کرتا تھا۔ انہوں نے اپنے حجرے میں میرے لیے ایک تہ بند اور گرتر رکھا ہوا تھا، سے تبدیل کر کے ان کے پاس بیٹھ جاتا۔ ایک دن میں ابھی پہنچا ہی تھا کہ ایک زمیندار قسم کا شخص داخل ہوا۔ لمبا گرتر

شرل شرل کرتا تہہ بند اور سر پر بڑا سا پگڑ، موچھیں تلوار مار کہ۔ آتے ہی باباجی کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا اور بڑی خوش گویا ہوا۔ ”حضرت جی بس توبہ کر لی۔ قصہ ختم۔“ باباجی نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا اور مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”رہا؟“ اس شخص نے بات کاٹ دی۔ ”قبلہ آپ نے غور نہیں فرمایا۔ مکمل توبہ قبلہ مکمل۔“ باباجی نے پھر توجہ نہ دی مخاطب ہونے لگے۔ وہ شخص پھر چرکا ”حضور واقعی، آپ کو غالباً یقین نہیں آتا، یقین مانیں۔ چھوڑ دیا۔ سب دیا۔“

باباجی بے زاری سے بولے ”یہ بھی چھوڑ دو۔“ اور وہ شخص ایک لچلے کے لیے پریشان ہوا، پھر کچھ کے میں نے اپنی بات بڑھادی۔ ”حضور کیسے گری کیا ہے، کیا مٹی واقعی سونا بن جاتی ہے؟“ ”بن سکتی ہے، کیوں نہیں سکتی۔“ باباجی نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ایک منٹ۔“ وہ شخص اچھلا۔ لپک کر دروازے کو اندر سے چٹختی لگائی کے انداز میں مجھ سے کہنے لگا۔ ”باؤ جی کوئی کاغذ قلم نکالو، نسخہ لکھ لو۔ میں اور آپ بھائی وال۔ نہ آپ نسخہ کسی کو بتائے میں۔ شاہباش، شاہباش کاغذ قلم.....“ پھر اونچی آواز میں..... ”جی باباجی حضور وہ کیسے؟“ اس کا منہ بے گواہی سے طرح کھلا تھا اور پلکیں جھپکنے تو جیسے اس کی فطرت میں ہی نہ تھا، سانپ کی طرح کہ اسی لیے تو وہ خزانے پہ بیٹھتا ہے نے فرمایا ”ایسے کہ..... سونے کو مٹی سمجھا جائے۔“ اور اس کے ساتھ ہی زمیندار صاحب گویا پتھر کے ہو گئے۔

اشفاق صاحب اکثر بڑی پر معنی باتیں کرتے مگر قدرت نے انہیں یہ ملکہ عطا کر رکھا تھا کہ وہ عام سی بات اپنے سحرانہ انداز سے انتہائی پر لطف اور فکر انگیز بنا دیتے مگر یہ سحری دفتری اوقات میں نہ ہوتی۔ وہاں صرف پوائنٹ بات کرتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے اردو سائنس بورڈ کی مطبوعات کی فروخت سے دفتر کے لیے بلڈنگ تعمیر کی جو بلاشبہ ایک مثال ہے۔ کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں بھی وہ کافی ذہانت اور محنت سے کام لیتے ایسی کتب شائع کرتے جو فروخت کے ریکارڈ قائم کر سکیں اور ان کی آمدنی سے کوئی ایسی کتاب شائع کرتے جو اپنے اور مواد کے اعتبار سے نام آور ہو جیسے ”ریگستانی نڈی کا ہضمی نظام“۔

بظاہر لگتا تھا کہ انہیں کسی کا دست طلب دراز کرنا پسند نہیں۔ میں نے ایک بار دبا دبا سا احتجاج کیا اور ہوا کہ آپ کا انداز کچھ میں نہیں آتا، کبھی آپ بن مانگے چیز دیتے ہیں، کبھی مانگے پر نہیں دیتے اور کبھی مانگے پر نہیں دیتے ہیں، آدمی کیا کرے؟ انہوں نے مسکرا کر بات بدلی اور کافی دنوں کے بعد اس بات کی وضاحت کی جس کی وضاحت نے اشارہ کیا تھا۔ تب کھلا کہ ایک چیز کے دبانے اور دوسری سوپنے میں حکمت تھی۔ یا رلوگ اس تقسیم پر ناخوش تھے کہ ان کی وضاحت کی ضرورت محسوس نہ کرتے۔ جو صحیح سمجھتے وہی کرتے۔ دوستوں کو بہر حال بہت بعد میں احساس ہوتا کہ میں فیصلے ہی میں بھلائی تھی۔

مجھے کبھی کبھی ان کے دولت کدے مگر نہیں دولت کدے نہیں، گھر میں جانے کا اتفاق ہوتا رہتا۔ گھر میں لیے کہا کہ وہاں جو گھر بنا دیکھا، وہ اپنے گھر میں کبھی محسوس نہ کیا۔ مہمان جو بھی ہوں، جتنے بھی ہوں ان کی یوں کی جاتی کہ وہ مہمان نہ رہتے، گھر والے ہی بن کے رہ جاتے۔ پھر ان کا دسترخوان بھی عجیب ہوتا، پرانے دیہات کے لیے ہوئے۔ کبھی چڑی روٹی پہ چٹنی، کبھی باجرے کی روٹی دہی کے ساتھ، کبھی مکئی کی روٹی پر ساگ اور لسی۔ جدید

تے تو ہوتے ہیں۔ یقیناً اس جمال میں بانو آ پا کے مزاج اور سکھڑ پنے کا کمال بھی شامل ہوتا۔ تاہم یہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ ہر شخص جاؤ کیونکہ وہ کام، کام اور کام کو بہر حال اہمیت دیتے تھے۔ اگر ایسا نہ کرتے تو انہوں نے جس قدر تخلیقی کام کیے تھے، کئی ملامتیں نہ ہو پاتا۔ کئی الماریاں تو تلقین شاہ کے مسودات سے بھری پڑی تھیں۔ ناول، افسانے، ٹیلی ویژن کے سکرپٹس اور تقریریں جدا۔ ان مسودات سے جو جگہ بچتی اور وہ بھی کافی تھی، اس میں فرش سے چھت تک الماریاں ہی بھری ہوئی تھیں۔ ان ملامتیں نہایت اہم کتب سے بھری پڑی اور یہ کتب سجانے دکھانے کے لیے نہیں ہضم کرنے کے لیے تھیں۔ اس پر قدرت حاصل تھی۔

جب وہ اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر جنرل کے منصب سے سبکدوش ہو گئے تو زیادہ وقت گھر پر گزارتے تھے۔ ان کے معمولات میں فرق نہ آیا، صبح آٹھ بجے گھر کے پچھواڑے قائم ریکارڈنگ سٹوڈیو میں جا بیٹھتے اور وہیں تک کہنے پڑھنے میں مصروف رہتے۔ ان کے شہرہ آفاق ریڈیائی فیچر ”تلقین شاہ“ کی ریکارڈنگ یہیں پر ہوتی۔ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ان کی بھی آرزو ہوتی کہ میں گاہے بگاہے آ جایا کروں، مگر اس کا انہوں نے حکم نہ دیا۔ بلکہ یوں کیا کہ ”تلقین شاہ“ میں میرے لیے ایک کردار تخلیق کیا۔ ماسٹر خوشی محمد کا۔ ظاہر ہے کہ مجھے صداکاری سے کچھ تعلق نہ تھا۔ مگر وہ ریکارڈنگ کے دوران میرا کندھا تھپتھپاتے جاتے۔ سو آہستہ آہستہ میں رواں ہو گیا۔ ”تلقین شاہ“ کے مختلف پروگراموں میں مختلف لوگ حصہ لیتے، میں نے محسوس کیا کہ تلقین شاہ کے حوالے سے مختلف لوگوں کی پُر وقار آوازیں سے مدد کرنے کا جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ وہ اپنے صداکاروں کے نجی مسائل پہ گفتگو کرتے اور حتی الامکان ان کی کوشش کرتے۔ اس کے علاوہ ان کے یہاں جو بچے کام کرتے تھے، وہ اشفاق صاحب کو ابوجی کہہ کر مخاطب کرتے اور گھر میں بھاگے پھرتے جیسے وہ ان کا اپنا ہی گھر ہو۔

اشفاق صاحب اپنے غموں اور بیماریوں کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ اکثر کسی ملازم ہی سے پتہ چلتا کہ ان کا آپریشن ہو گیا۔ وہ ہسپتال میں داخل رہے ہیں۔ آخری بار وہ آپریشن کے بعد گھر آئے تو چار پائی سے لگ کے رہ گئے۔ اس وقت میں بھی مطالعہ ان کا معمول رہا۔ میں گاہے بگاہے ان کی عیادت کو جاتا رہا۔ بس چند منٹ کے لیے ہی بیٹھتا کہ انہیں کچھ ہلکا سا تھکنائی رہتی تھی۔ ایک شام مجھے شادی کی تقریب میں شرکت کا ایک کارڈ ملا۔ دولہا دلہن کے ناموں سے میں آشنا تھا۔ بہت بارات داستان سرائے سے روانہ ہونا تھی۔ میں نے ان کے خادم خاص محمد رفیق جو یہ کارڈ لائے تھے، سے پوچھا کہ یہ کیا سلسلہ ہے؟ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو مجھے سخت حیرت ہوئی۔ اچانک ایک خیال نے ذہن میں چھید کر دیا۔ کیا یہ آخری ملاقات کا اہتمام تو نہیں!!

شادی کی شام میں ان کے یہاں پہنچا تو ہر طرف قہقہے روشن تھے، بارات تیار تھی۔ بڑی رونق تھی، دو آدمی صاحب کو سہارا دے کر باہر لائے۔ وہ دولہا کے ساتھ بیٹھ گئے۔ مٹھائی اور کوک سے مہمانوں کی تواضع کی گئی۔ میں کچھ دیر کے بعد ہونڈ نے لگا مگر کوئی شاعر، ادیب یا صحافی بارات میں شریک نہ تھا۔ ان کے رشتہ داروں اور عزیزوں کا ہونا تھا۔ پھر بارات ایک شادی گھر کے لیے روانہ ہوئی۔ میں گیٹ پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ کوئی واقف ہے نہیں، کس گاڑی میں بیٹھوں۔ ساتھ ہی بانو آ پا کی آواز آئی۔ ”اسلم تم میرے ساتھ چلو گے۔“ اور پھر گاڑی میں بانو آ پانے بتایا کہ دولہا کی

والدہ خاں صاحب کی نیاز مند ہے، انہیں مالی پریشانی نہیں ہے مگر عزیز کوئی نہیں۔ انہوں نے اس پریشانی کا اظہار صاحب سے کیا تو انہوں نے یہ سارا اہتمام کرنے کا حکم دیا۔ بانو آ پاپوں مصروف اور خوش تھیں جیسے ان کے اپنے بچے شادی ہو۔ تقریب کے اختتام پر پھر پریشانی کہ واپس کیسے جایا جائے۔ پلٹ کے دیکھا تو اشفاق صاحب دو آدمیوں سے ہمارا لے کر میری طرف آرہے تھے، ساتھ بانو آ پاتھیں۔ بانو آ پانے گاڑی منگوائی۔ اشفاق صاحب نے مجھ سے ملا یا۔ آخری بار اور رخصت کر دیا..... ہمیشہ کے لیے۔

چند ہی دنوں کے بعد داستاں سرائے کے آس پاس سڑکوں پر لوگوں کا جھوم تھا اور اشفاق صاحب اپنے کپڑوں میں سفید چادر اوڑھے ابدی نیند سو رہے تھے۔ پھر وہ اسی نیند میں ڈوبے، آنسوؤں سے لبریز آنکھوں والے لوگوں کے کندھوں پر تیرتے ہوئے آخری آرام گاہ میں چلے گئے۔ ہزاروں لوگ تھے اور ہر طبقے کے لوگ۔ دانشور، شاعر، صحافی، فقیر، مسکین، صداکار، گلوکار اور عام آدمی، ریڑھی والے، تانگے والے، رکشے والے۔ ان میں سے کچھ اشفاق صاحب خاں کو، کچھ اشفاق صاحب کو، کچھ ڈائریکٹر جنرل کو، کچھ ایک بڑے صوفی کو، کچھ ایک بڑے مقرر کو، کچھ تلقین شاہ کو رخصت کرنے آئے تھے۔ ایک شخص کے ساتھ بہت سی شخصیات رخصت ہو گئیں۔

مجھے بطور ڈائریکٹر جنرل اشفاق صاحب کے بارے میں تاثرات بیان کرنا تھے مگر میں ادھر ادھر بھٹک گیا تھے آپ کے سامنے ہے نہ ان کی افسری کے سائل سے انصاف ہو سکا اور نہ ہی کسی اور پہلو پر ٹھیک سے بات ہو سکی۔ مزاج یہی ہے اور یقیناً آپ بھی مجھ سے متفق ہوں گے کہ فی الوقت میں کچھ لکھنے کا ارادہ ترک ہی کر دوں اور اس وقت کا کھانا کروں جب میں کچھ لکھنے کے قابل ہوں۔ وہ بھی اگر ہو سکا تو.....

”بابا وہ ہوتا ہے جو لینے کے نہیں دینے کے مقام پر ہو۔ یہ اس کی موٹی سی نشانی ہے۔ جب بھی آپ کسی ایسے مقام پر دیکھیں تو پھر سمجھیں کہ یہ بابا ہے، اور یہ داتا ہے، عطا کرنے والا آدمی ہے۔“

(اشفاق احمد، زاویہ، بابا بھٹک)

ریاض محمود کے نام

21-12-1990

عزیز سلامت!

اس سے پہلے تم کو ایک خط لکھا تھا۔ امید ہے مل گیا ہوگا۔ یہ خط اس کے جواب کی یاد دہانی نہیں ہے۔ بس یہی لکھ رہا ہوں۔ محض اس قسم کو test کرنے کے لیے اور اس پرانے air bath کو دیکھنے کے لیے کہ اس میں کتنی جان ہے۔ او کہاں تک پہنچتا ہے اور اگر پہنچ جاتا ہے تو پھٹتا تو نہیں۔ تم اس کا جواب لکھنے کی کوشش نہ کرنا اور مزے سے پتے وغیرہ کھاتے۔ افسوس کہ اس قلم کی سیاہی دوسری جانب نکل رہی ہے۔ اس لیے اب ایک اور استعمال کرتا ہوں۔ کل انکل آئے تھے، پوچھنے لگے کہ چند مہینوں سے ریاض نظر نہیں آتا۔ میں نے منہ پکا کر کے کہا کہ اس کے ساتھ کچھ ناراضگی ہے۔ میں نے چند الفاظ فحشی اور کا کے کے خلاف کہہ دیئے۔ اس نے تو برداشت کر لیے لیکن بانو آ آگے سے بولنے لگی کہ میں نے کبھی آپ کے بچوں پر تنقید کی ہے جو آپ ہمارے بچوں پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ اس پر بات بڑھ گئی اور انہوں نے

گھر آنا جانا ترک کر دیا۔

اکل ظفر اس وقت سے پریشان ہے اور ٹنڈ کھجا کر ہر ملاقات پر یہ کہتا ہے کہ ایسا ہونہیں سکتا لیکن جب میں اسے
 دیکھتا ہوں تو وہ تمہاری بے وقوفی پر بہت ناراض ہوتا ہے کہ اس گدھے کو سوچنا چاہیے تھا کہ اتنے سالوں کی تو دشمنی بھی
 کتنی عرصہ وستی گنوار ہا ہے۔ مجھ سے انہوں نے تمہارے مکان کا پتہ پوچھا تو میں نے انکار کر دیا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اب
 یہ شخص وغیرہ جا کر خود تمہارے گھر کا پتہ معلوم کر رہا ہے اور کافی پریشان ہے۔

بھئی یہ سیاہی تو بہت تنگ کر رہی ہے، اس لیے ختم کرتا ہوں۔ ویسے تو اور بھی بہت سی باتیں ہیں۔

دعا گو

اشفاق احمد

تہران (ایران)

2-6-1991

عزیزم سلامت باشید!

برگاہ کہ من ارادہ کردہ بودم کہ حاضر فروش گاہ جناب عالی شدم بعد از خیال من مبدل گرد کہ من بجائے تربت ایجا
 کے از زائر من حضرت امام خمینی روح اللہ شدم۔ خیلے خوش قسمت ہستم کہ وہی شب زیارت روضہ حضرت امام خمینی
 کے ہوتے رہے۔ معافی چاہتا ہوں کہ ڈیڑھ دو دن کے مسلسل استعمال سے اب زبان اور قلم فارسی ہی کی طرف مائل
 ہو گیا ہے اور انہی ہواؤں سے لطف لیتے ہیں۔ ابھی کوئی ہفتہ بھر ادھر ہی قیام ہوگا اور پھر انشاء اللہ جمعہ کے روز واپسی
 کے لیے تیار ہو جاؤں گا۔

جب ہم مشہد جائیں گے تو آپ کا علاقہ بالکل ہماری آنکھوں کے سامنے ہوگا اور وہ جو کہتے ہیں کہ رات کے
 وقت آسمان کی بتیاں سیالکوٹ سے نظر آتی ہیں، ایسا ہی حال تمہاری بتیوں کا ہوگا اور جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہوں گی
 ان میں سے کئی شرط ایک ہی ہے کہ تربت میں روشنی کا انتظام ہو۔ بتیاں جلتی ہوں۔ لوڈ شیڈنگ کا معاملہ نہ ہو۔

اس وقت کا ایران میرے زمانے کے ایران سے بالکل مختلف ہے۔ واضح فرق بیسیوں میں نظر آیا ہے جو اب
 ہوں پر رومال باندھ کر ٹخنوں تک کا لہا کوٹ پہن کر باہر نکلتی ہیں، خریداری کرتی ہیں، سکولوں کالجوں میں جاتی ہیں اور
 کھیل میں کام کرتی ہیں لیکن وہ اس لباس سے خوش نہیں ہیں کہ ایک تو ساری شو ماری گئی۔ دوسرے وہ تڑپ جوراہ چلتوں
 سے تھکام کرنے والوں کے دلوں میں خواہ مخواہ پیدا کر دیتی تھیں، وہ تڑپ پیدا نہیں ہوتی۔

اور جو یہ نہ ہو تو پھر زندگی بیکار ہے۔ اس کے علاوہ وہ کتابیں، رسالے اور گانے بجانے جو شاہ کے زمانے میں
 کتب خانہ بازار کے ہر موڑ پر بکتے تھے اور جن کی صورتیں ہم بھی پاکستان سے آ کر بڑے شوق سے دیکھا کرتے تھے، ان کا نام و
 نشان بھی باقی نہیں۔ عمومی حالت یہ ہے کہ فی الحال لوگوں کو اور حکومت کو یہ معلوم نہیں کہ آگے کیا کرنا ہے۔ انقلاب کے بعد
 کتنی ہستی امام خمینی سے 1/4 طاقت کی بھی ہوتی یا 1/10 بلکہ 1/100 طاقت کی بھی ہوتی تو کام آگے چل سکتا تھا مگر مجھے
 کئی کوئی نظر نہیں آتا۔ اس سے معاملہ رکا ہوا ہے۔ پورا انجمن سٹیم سے بھرا ہوا اور کونکوں سے بھٹکا ہوا شیشین پر کھڑا ہے ار

ڈرائیور کا پتہ نہیں کہ کدھر گیا۔ ایک امید یہ بھی بندھی ہے کہ ابھی آجائے گا۔ ایک خوف یہ بھی دامن گیر ہے کہ کدھر سے آئے گا۔

اچھا تم اس کالے پانی کی ابھی کتنی قید اور کالو گے۔ اگر تم کو مستقلاً اگست میں آنا ہو تو پھر درمیان میں کوئی پتہ لگاے کہ نہیں۔ پچھلی مرتبہ کا تمہارا آنا بالکل بے کار گیا۔ ایک بھی مفصل ملاقات نہ ہو سکی۔ اکیلا میں ہی نہیں اس شکوے سے انکل ظفر بھی بڑی شدت سے شریک ہیں۔ تمہاری آپا کا پرانا فلسفہ ہے کہ جوں جوں بچے جوان ہوتے جاتے ہیں، وہ بے چوہا بنتے جاتے ہیں۔

شیر خواری میں ان کی اتنی فکر نہیں ہوتی جس قدر ان کے جوان ہو جانے پر ہوتی ہے۔ میں ٹھیک ہوں لیکن تم ٹھیک نہیں ہوں کہ ایسے لمبے لمبے سفر کر سکوں اور اتنی بڑی بھیڑوں میں خود کو سہار سکوں۔ اب اندر سے ہی معاملہ کھٹکھٹا ہونے لگا ہے اور یہ تجربہ بھی خوب ہے۔ اپنے سارے دوستوں کو میرا سلام مسنون پہنچا دینا اور ان سے کہنا کہ گرمی سے بچیں۔ باہر کی گرمی سے بھی اور اندر کی گرمی سے بھی بلکہ اندر کی گرمی سے زیادہ بچیں۔ یہ انا کا ایک خوفناک روپ ہے جو ہماری راہ میں حائل ہوتا رہتا ہے۔

ان دنوں تمہارے تربت میں کون سا پھل چل رہا ہے؟
دعائیں اور مزید دعائیں۔

دعا گو

اشفاق احمد

داستان سرائے

121/C ماڈل ٹاؤن

لاہور

24-3-1991

عزیزی ریاض میاں! سلامت رہو، خوش رہو۔ کل 23 مارچ تھی مگر ہمارا یہ دن بھی روتے پینتے اور آنسو بہتے گزرا۔ اشتیاق کے بڑے بیٹے صائل کی موت کی خبر تم کو مل چکی ہوگی۔ ہمارے سارے خاندان میں اور پورے پاکستان میں ایک کھرام مچا ہے۔ کسی ظالم نے صائل کو اس کے گھر کے گیٹ پر چودہ گولیاں مار کر ختم کر دیا۔ اس کی بیٹی (جسے وہ سائل لایا تھا) یہ سارا منظر دیکھتی رہی۔ اب تک قاتل کا یا قاتلوں کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ اشتیاق غم کی صورت بنا، کمروں میں گھومتا خانہ میں گھومتا رہتا ہے۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ بس اس کو ہونی کہتے ہیں اور اس کے آگے کوئی بات نہیں کہتی۔ کوئی تدبیر کوئی تجویز کارگر نہیں ہوتی۔

جس روز مجھے تمہارا خط ملا ہے اس سے دو دن بعد یہ سانحہ عمل میں آیا۔ ذہن ماؤف اور جسم شل ہے۔ میں نے بانو کو فون کیا تھا، وہ بھی تھیر اور غم میں ڈوبی بیٹھی ہے۔ فون پر ٹھیک سے بات بھی نہیں کر سکی۔ اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ اس کی صحت اب اچھی ہے۔

کسی میاں واپس اپنی Post پر چلے گئے ہیں اور انہوں نے اسلام آباد میں اپنی کرسی سنبھال لی ہے اور فراز نے غیر ہی چلا گیا ہے اور کسی اور منصب کی تلاش میں ہے۔ میرے آرڈر بھی آگئے ہیں لیکن ان میں سقم ہے یعنی ڈائریکٹر کر دیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہ سب غلط فہمی کی بنا پر ہوا ہے اور پرائم منسٹر سیکرٹریٹ کو اصل حقیقت میں نے ابھی تک چارج نہیں لیا لیکن سیانے کہتے ہیں کہ چارج لے لو، اس کے بعد اپنے دعوے کا حکم

عجیب سی دنیا ہے اور عجیب سے حالات میں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ اب کوئی خاص مزاجی نہیں رہا۔ تم یہاں سے جی ڈھارس بندھتی لیکن اب یہی حکم ہے کہ تم دور دور ہو اور یہی حکم درست ہے۔
 اپنے دوستوں کو میرا سلام دینا اور بتانا کہ ان سب کے لیے میرے پاس ڈھیر ساری دعائیں ہیں۔
 ہندو سب کو خوش رکھے اور آسانیاں عطا فرمائے۔

دعا گو

اشفاق احمد

2-9-1967

قدسیہ جان سلامت رہو۔

میں کل دوپہر کراچی پہنچ گیا اور خالو سرور کے جنازے میں شرکت کی۔ قبرستان گئے اور اپنے ہاتھ سے مٹی دی جس میں گھر پہنچے۔ یہاں دو گھڑی ماسی جی سے باتیں کرنے کے بعد اجازت چاہی اور اپنے ہونٹ چلا آیا۔
 لاہور ایئر پورٹ پر افتخار بھائی، اقبال بھائی، شیر آغا، انسا رخان، باجی اور گڈی موجود تھی۔ وہ بھی میرے ساتھ تھے۔ میں آئے تھے اور یہ امر مجبوری سمجھوں کہ پاس فرسٹ کلاس کے ٹکٹ تھے۔ باجی میرے اس وتیرے پر بہت تڑپے۔ کراچی والوں کو میری صورت دیکھ کر یقین نہ آیا۔ نن نے کہا ماموں کوئی ہمارے رشتہ دار نہیں تھے، میرے دوست تھے اس لیے چلا آیا۔ سب لوگ شکر گزار اور ممنون تھے۔

شام کو جب میں اپنا بیٹی اور تھیلا اٹھا کر چلنے لگا تو دکا گیا۔ میں نے کہا جہاں لواحقین پر اتنا بوجھ ہو وہاں میں جس تک نہیں کرتا، یہ میرا اصول ہے۔ ایک دو دوست کے پاس ٹھہروں گا۔ سب نے میرے اس اصول کو بہت سراہا۔
 سب نے سویرے کے کہنے لگی اپنے کسی کام سے آئے ہو گے آپ۔ وہ کرنے جا رہے ہیں۔ میرے تو ہوش اڑ گئے۔ ملاحظہ فرمائیے اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے!

آج مجھے اپنی میننگ کا تکلیف دہ کام ہے۔ سارا دن اس میں گزرے گا۔ کل اتوار کے روز صبح آٹھ بجے رسمِ قل سے شریک ہوں گا۔ تم سب کو بوسے! بچوں کو ساتھ پیار بھی۔

تمہارا

اشفاق



75۔ جی ماڈل ٹاؤن

اصل وجہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن بظاہر لھاں صاحب اس بات سے پریشان تھے کہ ہم لوگ آپا جی کے گھر کو جانے کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ وجہ جو بھی تھی اب گھر کی تلاش ہوئی۔ 36۔ جی کی بغلی گلی میں مطلوبہ گھر مل گیا، لیکن یہ گھر ضروریات کے لیے بہت بڑا تھا۔ اس کا علاج یہ سوچا گیا کہ آپا صابرہ گھر کی مین بندنگ میں آدھے گھر میں ٹھکانے جائیں۔ گھر کے پچھلے آنگن میں بائیں ہاتھ ایک تین کمروں کا گیسٹ ہاؤس تھا۔ اس میں ریاض محمود، بانو باجی نے ڈال لیا۔ بائیں ہاتھ آنگن میں کھلنے والے دروازے سے منہ قہرہ کمرے تھے۔ ایک میں جیونی کا باورچی خانہ اور ساتھ کشادہ کمرہ گھریلو کاتھ کباڑ اور گودام کی شکل اختیار کر گیا۔

اس طرح کے بننے والے ٹاؤن میں عام ہیں۔ گھر کے دو پھاٹک تھے۔ یہ نیم دائرے کی شکل میں ایک طرف سے داخلے کے لیے استعمال ہوتا اور دوسری جانب سے اخراج کی صورت نکلتی۔

آپا صابرہ کی سائیڈ پر بڑے بیٹھے آموں کے بیڑے تھے اور ہماری طرف اپچی کے دو تین درخت بڑے بیٹھے سے لد جاتے۔ برآمدے کے سامنے کشادہ پورچ تھی جس میں آسانی سے دو کرسیں پارک کی جا سکتی تھیں۔

ہماری سائیڈ پر ایک ڈونگی گراؤنڈ تھی جسے اینٹوں سے پختہ بنا دیا گیا تھا۔ اسی ڈونگی گراؤنڈ کے مین مقابل ہمیں پہلا کمرہ ڈرائنگ روم بنا لیا۔ اس کے اوپر دو لمبے سے چھوٹے کمرے تھے جن میں لاکر خاں صاحب کی کتابیں اور طرح بے سرو سامانی کے عالم میں ڈھیر کر دی گئیں جیسے وہ 36۔ جی میں گیلری کے اوپر ڈھیر تھیں۔

برآمدے میں سے اندر ایک بڑا کمرہ ڈرائنگ روم بنا لیا گیا، جس کا مصرف کم کم تھا۔ باہر کی سڑک کی طرف کھڑے والا کمرہ مہمان خانہ ٹھہرا، جس کا استعمال اور بھی کم تھا۔ پھر ہمارا سونے کا کمرہ تھا۔ یہ کافی کشادہ اور ہوادار تھا۔ اس کے ساتھ ہی پھر برآمدہ شروع ہو جاتا اور برآمدے اور خواب گاہ کے درمیان ایک کافی بڑا کمرہ تھا جو خاں صاحب کی سٹڈی، آرٹ گیلری، تنہائی طلب لمحات میں گھسنا تھی۔ جب کبھی اس کمرے میں داخل ہوتے، غمناک سے ہو کر جانا پڑتا۔

پچھلا برآمدہ کم و بیش استعمال میں آتا لیکن پچھلے آنگن میں خوب ریل پیل رہتی۔ یہاں ایک پرانا بڑا تختہ

تھا، جس پر دو رسیاں مضبوطی سے باندھ کر ان میں آدھے ٹائر جتنے لوہے کے Rings باندھے گئے اور خاں سے نکلنے سے ناگھٹیں اٹھا کر کبھی دائیں کبھی بائیں ورزش کرنے لگے۔ ان کی ورزش کے اوقات میں بڑی توجہ تھی۔ بچے ابھی چھوٹے تھے ورنہ وہ نقل میں زور آزمائی کرتے۔

ہم لوگ بہت کم آپا صابروہ کی طرف جاتے۔ وہ عام طور پر اپنا کھانا بڑے سلیقے سے ٹرے میں سجا کر ہماری طرف لے کر آتا تھا۔ ایک ہی میز پر اپنا اپنا کھانا کھاتے۔ اسی طرح روجی بیگم بھی کانٹے، چچ اور سرویٹ سے لیس اپنا ٹرے لاتی تھی۔ پاس بیٹھ کر کھاتی۔ نہ کبھی انہیں share کرنے کا خیال آیا نہ کبھی ہم نے انہیں کچھ پاس کرنے کی جسارت ہی کی تھی۔ یہی وال چپاتی سبزی بھات کھانے والے تھے، انہیں کچھ آفر کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔

آپا صابروہ اپنی چائے کی پیالی لے کر باہر والے برآمدے میں بیٹھتیں لیکن ہماری طرف سے کبھی ادھر کوئی نہ دیکھا۔ والدہ بی بی جی اپنے اندر ہی رہتیں۔ ان کا ہمارے پیئرن سے کوئی تعلق نہ تھا۔

اس گھر سے دو تین اہم واقعات وابستہ ہیں۔

فیض صاحب کا آنا جانا

تو کسی کار کا خریدنا جانا

”دھوپ سائے“ فلم کی شوٹنگ

فیض صاحب ایچ بلاک کے میوز پر رہتے تھے۔ سلیمہ اور میزور روجی کی ہم عمر تھیں، لیکن یہ ایک دوسرے کی سہیلی نہ جانے کیوں نہ بن سکیں۔

جب ہم 75۔76 میں آئے تو سب سے پہلی واقفیت فیض صاحب سے ہوئی۔ ان کا گھر ایچ بلاک میں ایک موڑ پر تھا۔ یہاں وہ اپنی دونوں بیٹیوں کے ساتھ رہتے تھے۔ سلیمہ تو شاید ہماری طرف کبھی نہیں آئی لیکن میزور بڑی محنت کے ساتھ کبھی کبھی اکیلی ہی ہمارے گھر آ جاتی رہی۔

پہلی بار مجھے کپڑا بیچنے والی افغان عورتوں سے پالا بھی پڑا۔ ان دنوں پھانک کھلے رہتے تھے۔ بلا روک ٹوک سر پہنے کے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائے وہ دندناتی اندر آتیں۔ ان کا محاورہ تھا کہ وہ ہماری کچی ڈوگنی گراؤنڈ کے کنارے کھینچے رکھ دیتیں۔ یہ اب خواتین کی اکثریت کا گھر تھا۔ آپا صابروہ، روجی اس کی آواز سن کر بھاگی آتیں۔ بانو باجی کو بھی یاد ہی جاتی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر آگن والی سائیڈ سے برآمد ہو جاتی۔ میزور کو بھی عموماً خبر دی جاتی۔ وہ بھی بھاگ بھاگ جاتی تھی۔

اب رنگوں پر تبصرہ، میٹر میل کی جانچ پڑتال، قیمت پر جھگڑا جاری ہو جاتا۔ اول تو نہ جانے انہوں نے کہاں پیسے جمع کر رکھے ہوتے۔ بے دریغ خرچ کر لیا جاتا۔ کبھی کبھی میزور کے پیسے کم پڑ جاتے تو وہ خاں صاحب کی لاڈلی آن سے پھر لے لیتی۔

مردوں کا اس خرید و فروخت سے کوئی تعلق نہ تھا۔

فیض صاحب ان سے علیحدہ مجھے اور خاں صاحب سے ملنے آتے۔ وہ کبھی گھر کے اندر داخل نہ ہوتے۔ انہیں

ہمارے کھانے کے کمرے میں بھی کبھی جانے کا اتفاق نہ ہوا۔ وہ ڈوونگی گراؤنڈ کی کسی کرسی پر آرام سے بیٹھ جاتے۔ والوں کی فراغت کا انتظار کرتے۔

خاں صاحب عام طور پر اردو بورڈ میں ہوتے یا ریڈیو سٹیشن۔ فیض صاحب بڑے صبر سے میرا انتظار کرتے۔ جب میں اُن تک پہنچتی وہ چپ چاپ چیری کے درختوں کو اُن پر چھپانے والے پرندوں سے ملاقات کرتے۔ شہر میں جواز لی سنگیت موجود ہوتا ہے، اُس کے ساز اُن کے اندر بچتے۔ اُن کے چہرے پر کوئی بوریٹ نہ ہوتی۔ جب کبھی خاں صاحب موجود ہوتے، وہ بڑی عقیدت سے پاس بیٹھتے۔ شاید اُن ہی ملاقاتوں میں صاحب نے اندازہ لگایا کہ فیض صاحب ملامتیہ فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی لیے اُنہوں نے فیض صاحب پر ”صوفی“ کے نکتہ نظر سے مضمون قلمبند فرمایا۔

ایک روز فیض صاحب میرے پاس بیٹھے تھے تو انہوں نے مجھے بتایا ”بھئی! ہم ایک وفد مغربی پاکستان مشرقی پاکستان لے کر جا رہے ہیں۔ لاہور سے جمیلہ ہاشمی، اسلام آباد سے خاطر غزنوی ہمارے ساتھ ہوں گے۔ ان کے ہم سفر ابھی نامزد نہیں ہوئے۔“

میں نے سوچا کہ بڑے بڑے ادیب جا رہے ہیں۔ کچھ ادبی مجلسیں ہوں گی۔ معرکے کی تقریریں ہوں گی۔ 1200 میل کے فاصلے کے باوجود ایک جتنی کا اعادہ کیا جائے گا۔

”اور وہاں جا کر کیا پروگرام ہے فیض صاحب؟“

”کچھ نہیں بس سنڈر بن دیکھیں گے۔ پہاڑوں پر جا کر کچھ لطف اٹھائیں گے۔ موٹر بوٹ کی سیر کریں گے۔ میں خاموش رہ گئی۔ میرا خیال تھا سلیکشن میرٹ پر ہوئی ہے۔ جمیلہ ہاشمی کی ”آتشِ رفتہ“ نے چونکہ دھوم مچائی تھی۔ اس لیے ان کا حق فائق تھا لیکن ہمیشہ کی طرح دل میں حسد، لالچ اور کینے نے حملہ کر دیا۔ جب فیض صاحب آئے اور کچھ عرصہ ملتے رہے تو میں نے اسی حسد کے تحت کہا ”فیض صاحب! اگر آپ جمیلہ کو میرٹ پر لے جاتے تو کوئی افسوس نہ ہوتا لیکن آپ نے حق ہمسائیگی بھی ادا نہ کیا۔“

یہ بات کہیں فیض صاحب نے پلے باندھ لی اور جب دوبارہ سونا روئیس جانے کا اتفاق ہوا تو وہ مجھے بھی لے لے گئے۔ اس ٹرپ کا مجھے بڑا فائدہ ہوا۔ فیض صاحب کے پاس ایک ہی ہوائی جہاز ایک ہی ٹیبل پر بیٹھ کر کھانے کا وقت ہوا۔ سفر میں عموماً انسان اپنے ہم سفروں سے بہت کچھ سیکھتا ہے جو اس کی بنیادی خصلت ہوتی ہے۔ وہ بار بار دکھنے والی شخصیت سے جھانکنے لگتی ہے۔

فیض صاحب کو کسی بات کی جلدی نہ تھی۔ وہ اپنی ضرورت کو اُجاگر کرنے کے عادی نہ تھے۔ غسل خانے میں گندے تولیے پڑے مل گئے، اُن ہی سے نہا لیتے۔ میز پر پسند کی ڈش دوسروں نے کھالی اور اُن کو ہاتھ روکنا پڑا تو خوشی سے کچھ اور کھا کر اٹھ گئے۔ کپڑے لانڈری میں بھیجے۔ واپس آنے میں تاخیر ہوئی۔ پرانے کپڑے ہی اٹھا کر چڑھائے۔ جو تولوں کو پالش کرنے پر اصرار نہیں۔ فرنٹ سیٹ پر معتبر بن کر بیٹھنے کی خواہش ندارد۔

فیض صاحب کی جھکی جھکی آنکھیں، نرم لہجے، ترنم بھری آواز سب مجھ پر اثر انداز ہوئی۔ ان جیسا بننے پر میں۔

میں جانتی تھی ہر شخص اپنی صلاحیتوں کے مطابق سیکھتا ہے اور بسا اوقات بڑے لوگوں کی شناسائی اسے
کرتی ہے لیکن وہ اس شخصیت سے کچھ بھی سیکھ نہیں سکتا۔

کچھ عرصہ بعد فیض صاحب 75۔ جی نہ آتے۔ بس اردو بورڈ چلے جاتے۔ کبھی خاں صاحب نے ان ملاقاتوں
میں کبھی کیا۔ بس اتنا بتاتے۔ ”فیض صاحب آج آئے تھے۔“
میں نے کبھی ان ملاقاتوں کی تفصیل نہ پوچھی۔

باب ہم 121۔ سی میں منتقل ہو گئے تو فیض صاحب نے ہمیں بھلایا نہیں۔ وہ کبھی کبھی بلا تکلف چلے آتے۔
میں بغیر دکھلاوے اور Show off کیے ٹھہرتے اور چلے جاتے۔ میری ان سے ملاقات کم کم ہوتی۔
کب میری کتاب ”امرئیل“ چھپی تو اس کا فنکشن درپیش تھا۔ ہمارا معیار زندگی بڑھ چکا تھا۔ ایک روز ہم فیض
صاحب کے گھر چھوڑنے جا رہے تھے تو میں نے بڑی جرأت رندانہ سے کہا ”فیض صاحب! میری کتاب کا فنکشن ہو
یا آپ اس کی صدارت کر دیں گے؟“

”کر دیں گے۔“ انہوں نے سادگی سے کہا۔ ”کارڈ بھجوادینا۔“
پہلی پر خاں صاحب کہنے لگے..... ”بھی اتنے بڑے شاعر کو صدارت کے لیے کہتے ہوئے تمہیں خوف نہیں

تھا ان کی بڑائی کا مجھ پر اس وقت کوئی تہور موجود نہ تھا۔
فنکشن ہوا۔ اس میں باب ہیز نے مجھ پر مضمون پڑھا۔ خاں صاحب، احسان اکبر، سہیل عمر اور اصغر ندیم سید
صاحب نے مضمون پڑھے اور وہ خوبیاں بیان کیں جو نہ کتاب میں تھیں نہ صاحب کتاب میں۔

فیض صاحب وقت سے کچھ پہلے پہنچے۔ بڑی توجہ سے مضمون سنتے رہے۔ فنکشن کے اختتام پر اٹھے۔ رومزم پر
تقریر کی۔ افسوس ان کی تقریر زبانی تھی اور تب ابھی ٹیپ ریکارڈ کا رواج نہ تھا، اس لیے وہ سنہری الفاظ ضائع

انسانوں سے ذرا دور اشیاء کی فراہمی انسان کے اندر جو فرحت پیدا کرتی ہے، اس کا گہرا تعلق ہر انسان کی ذاتی
ہے۔ کئی بار ہمیں کوئی ایسی چیز مل جاتی ہے جو نہ ہماری ضرورت ہوتی ہے نہ خواہش۔ ایسی صورت میں اشیاء کا
تعلق خیال بن جاتا ہے۔

75۔ جی میں تھوڑی دیر کے بعد خاں صاحب نے فوکسی کا خریدی۔ 7262 نمبر کی یہ فوکسی گویا ہم سب کے
بیمار اضافہ تھی۔ بچے تو کار پر لٹو تھے لیکن باپ کی طرح وہ جذبات کو ابھی سے چھپا جانے والے تھے۔ سکول
جاتے جاتے چوری چوری اس کے پاس رکتے، نظر بھر دیکھتے جیسے کوئی نوجوان محبوبہ کو غٹ غٹ پی جانے کے
لہجے میں کھا کرتا ہے۔

اس فوکسی نے ہماری زندگی میں بڑی آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ دن کے وقت تو خاں صاحب کام پر اور بچے
میں لیکن شام کو اس پر عموماً باہر جانے کا اتفاق ہوتا۔ کبھی کبھی وہ چوری چوری آپس میں اس کی باتیں بھی

کرتے، لیکن ہمیں خبر نہ لگتی۔

75۔ جی میں سب سے بڑا واقعہ ”دھوپ سائے“ فلم تھی۔ پتہ نہیں انہیں فلم بنانے کی کیونکر سوچھی۔ اندر ہی اندر سوچتے رہتے کہ پاکستان میں جاگرتی کرانا اور عوام کو پاکستان سے محبت کے لیے تیار کرنا ہر ادیب کا کام ہے۔ اس فلم کی بنیادی تھیم بھی یہی تھی کہ یہاں منافع خوروں کے خود غرض طبقے نے دولت کمانے کے لیے کیسے ہتھکنڈے اور راستے تلاش کر لیے ہیں۔ آفتاب احمد جعلی ادویات بناتا ہے اور اُس کے ہاتھوں کئی مریض مر جاتے۔ آخر میں جب انجام کار وہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے تو اُس کے ہونٹوں پر یہ الفاظ رہ جاتے ہیں ”کوئی گولی کوئی ٹکڑا نہیں۔ یہ تو کبھی کر دار تک پہنچنے کی پاداش میں ہے۔“

اس فلم میں قوی نے شرابی، منور تو مفتی نے تائب طوائف، عطیہ نے بیمار بچے کی ماں کا رول کیا تھا۔ ان ایکٹروں سے ضرور واقف ہوں گے کیونکہ انہوں نے اپنے عہد میں بڑی شہرت حاصل کی۔ نیکی اور بدی کا جو گہرا تعلق ہے اور معاشرہ ان کے زرخے میں جس طرح آیا رہتا ہے ”دھوپ سائے“ بڑی اچھی مثال تھی۔ قوی شرابی اور منور تو مفتی تائب طوائف ہے جو بچوں کو قرآن شریف پڑھاتی ہے۔ یہ دونوں کے راندہ ورگاہ ہیں۔ دوسری جانب آفتاب احمد جو سوسائٹی میں دولت کی وجہ سے بہت عزت دار ہے۔ ہماری اپنائیں۔ یہاں خاں صاحب نے منور اور مفتی جی کی طرح طوائف اور شرابی کی بڑی طرف داری کی ہے۔

اسی فلم میں جب زہرہ تائب ایک درخت تلے بیٹھی گارہی ہے۔

”شام شہر ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تو“

تو کٹڑی کا ایک بزم خود شریف آدمی خضر وا سے پوچھتا ہے ”بول ری آواز ہرہ کون ہے تو؟“

جب آواز ہرہ کی بے عزتی عروج کو پہنچتی ہے تو شرابی کہیں سے آ نکلتا ہے اور کہتا ہے..... ”چل آئیے“

ایک شرابی ایک طوائف، ہم دونوں اس کٹڑی میں رہنے کے قابل نہیں۔“

خاں صاحب نے فیروز پور روڈ کی مین سڑک سے بہت کراہیکٹری کراہی پر لے رکھی تھی اور اسی میں

شروع کر دی تھی، لیکن اردو بورڈ کا ٹکٹا بھی ساتھ تھا۔ وہ بیچارے بڑی مشکل میں تھے۔ ایک روز میرے پاس

اور بولے۔

”کیا کر رہی ہو قدسیہ؟“

”بس جی بچے آئے ہیں۔ کھانا تیار کر رہی ہوں۔“

”فضول جھنجھٹ چھوڑو اور میرے ساتھ چلو۔“

”اور جی بچے؟“

”اُنہیں بھی ساتھ لو..... شفٹ کا کراہیہ پڑ رہا ہے۔ کیمہ مین بڑے نخرے والا آدمی ہے۔“

میں اور بچے فوکسی میں سوار ہو گئے۔

کٹڑی کا عجب سماں تھا۔ ایک جانب بوسیدہ سے تین چار کمرے، پھر گھلا اُجاڑ آنگن اور سامنے تنور اور

مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھ پر خاں صاحب ایک اضافی ذمہ داری ڈالنا چاہ رہے ہیں۔ انہوں نے جس طرح مجھے ساتھ رکھا۔ اب بھی وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے۔ ایک کمرے میں اس وقت سلیم خواجہ اپنے کمرے کے سامان سجائے بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھ کر کچھ ڈھارس بندھی۔

بسح کی طرح خواجہ جی نے اٹھ کر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

باقی سب کچھ تمہیں خواجہ جی سمجھا دیں گے۔“

مجھے سچ وریا کے چھوڑ کر خاں صاحب اردو بورڈ میں بیٹھ گئے۔ اس وقت ”شام شہر ہوں“ کی شوٹنگ ہونے والی تھی۔

یہ صبحی قوی سے پہلی ملاقات تھی۔ اس وقت ریپرسل جاری تھی۔ قوی کا چوہا بارہ شاہدہ کے تنور کے ساتھ ساتھ بیٹھ گیا۔ قوی کو ان سیڑھیوں سے تھکا ہارا اترنا تھا۔ گانے کا ٹیپ جاری تھا۔ منیر نیازی کے بول ساری صبح گونج رہے تھے۔ کیسرہ مین تصویر بنا رہا تھا۔ کچھ تو بیٹھے یہ اتھارنی سر کو چڑھ گئی۔ پھر قوی کی سعادت مندی نے قوی کی مدد کی۔ میں فرعون صفت آرڈر دینے پر مامور ہوئی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے یہ ٹیک پوری بارہ مرتبہ Re-take ہونے کے بعد مکمل ہوئی۔ پندرہ مرتبہ اوپر نیچے کی شکل حاصل ہو کر اتر تو واقعی وہ منیر نیازی کا ہیرو لگ رہا تھا۔

یہ ٹیک قوی کے ساتھ مراسم جاری ہیں۔ قوی خاں میں جو پٹھانی لہو ہے، اس میں وہی اظہار کی کمی ہے جو کسی کو گنگے پن اور منیر کے موسموں کی چپ میں چسپا ہوا تھا۔ قوی نے ناہید سے شادی کی تو بھی اس نے ہمیں نہیں سمجھا۔ اس شادی کا ذکر اتنے دے لفظوں میں کیا گیا کہ کسی دوسرے کی بیوی کے ساتھ بھاگ گیا ہو۔ قوی کی شخصیت میں اور دوسرے مردوں پر شاید فرعونیت کا پڑنا ہو لیکن تمام عورتوں کو قوی کی شرم و حیا نے ہمیشہ متاثر کیا۔ نگاہیں گت کرنے والے قوی سے کبھی کسی ایکسٹریٹس کو گلہ نہ ہوا۔

حاجہ سید اپنے اندر ایک خاص قسم کے نظریے کو پالتا ہے۔ اشفاق صاحب نے ایسا ادب پیدا کیا جو پاکستان کی تاریخ کا ایک اور بات پر وہ مُصر نظر آتے تھے۔ وہ چوہا اور جینے دو کے پرچارک تھے۔ کہانی ”گڈ ریا“ سے لے کر ”سنگ“ تک وہ اس سلوگن کا شکار ہے۔ انہوں نے مفتی جی کی طرح ادب میں کئی گرو میں لیں۔ بس وہ اسی مسلک کے پیروار تھے۔ لیکن ہر انسان میں توازن کی کمی ہوا کرتی ہے۔ وہ اپنے مسلک میں بھی کبھی توازن قائم نہیں کر سکتے تھے۔ اس قدر محنت میں گم ہو جاتا ہے کہ اسے آرام، خوشی اور خاندان کی پروا نہیں رہتی۔ اسے جو راحت اور خوشی ملتی ہے، اسے توازن کے باعث اسی محنت میں ملتی ہے۔ جو آدمی دولت کو بے دریغ استعمال کرنے کا عادی ہو اسے کبھی سے بچنے، کفایت کا ہاتھ پکڑنے اور ضرورت بھر چرنے کی توفیق نہیں ہوتی۔ سوشل آدمی اگر اس درجہ ملنسار ہو جائے تو پتہ چلتا ہے کہ صرف یار باشی میں نظر آنے لگے تو اسے پھر نکما، کھٹوا اور دوسروں سے مانگنے والا بن کر گزارہ کرنا

خاں صاحب میں بھی کسی حد تک توازن کی کمی تھی۔ وہ جیو کی حد تک تو اپنے مسلک پر قائم تھے، جینے سے پروا تھی۔ اپنے لیے اور گھر والوں کے لیے ”جینے دو“ کا مطلب انہیں سے سمجھ میں آیا کہ ان کو آزادی دی جائے۔ چاہیں کریں۔ وقت اور مداخلت ان پر ضائع نہ کریں۔ اگر جینے دو اور جیو میں توازن ہوتا تو انہیں بچوں سے مخصوص دلجوئی اور مشکلات کا باہمی حل مل جل کر نکالنا پڑتا۔ اپنے لیے بھی انہیں جینے دو کی کبھی سمجھ نہ آئی۔ وہ زیادہ کام کرتے سوتے، اپنی صحت کی طرف سے بے توجہی برتتے رہے۔ زندگی کے کئی خانے ہیں لیکن ان میں پیشہ، خاندان، اور تعلیم ان سب میں وقت کی بانٹ اور توازن نہ ہو تو کسی نہ کسی کے ساتھ نا انصافی کا انسان مرتکب ہو ہی جاتا ہے۔

جب ہم 75۔ جی میں تھے تو ٹیلی ویژن کی آمد نے خاں صاحب کو یقین دلا دیا تھا کہ اب ناظرین کے کتابوں سے نہیں ٹیلی ویژن سے اخذ کریں گے۔ نئے راستوں کی تلاش ”اُج“ سوچ کی نئی منزلوں نے انہیں غم سے اُکسایا۔

”دھوپ سائے“ ایک آرٹ فلم تھی۔ اس کی بنیادی تھیم یہی تھی۔ ”جیو اور جینے دو“۔ اس کی کہانی کھانا پکانے میں رہنے والوں کی کہانی تھی۔ اس محلے میں رکشا ڈرائیور، ایک بیمار بچے کی ماں، ان پڑھ پھیری والا۔ ایک حقوق کی جنگی اور ہڈی میں ہاتھ میں ہاتھ دیئے پھرتی تھی۔

خاں صاحب جن دنوں ”دھوپ سائے“ کے سکرپٹ کی ذہنی تیاری میں مبتلا تھے۔ ہوائی جہاز ٹیک آؤٹ سے پہلے تیل پانی چیک ہو رہا تھا۔ انجن اور پہیوں کی ہوا کو جانچا جا رہا تھا۔ خاں صاحب گولگو کے عالم میں برآمد ہوئے۔ بڑے کمرے میں کچھ کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ جاتے۔ وہ ہر قلم کو ٹیسٹ کرتے اور دیکھنا چاہتے کہ ”دھوپ سائے“ کے سکرپٹ کس پن سے لکھیں گے۔ کونسی سیاہی موزوں ہے۔ کونسا کاغذ محبوبہ کی جلد جیسا ملائم جان پڑتا ہے۔

مختلف شیفر، پارکر، ڈالر، سے قیمتی قلموں کی ٹرائی جن کاغذوں پر کی گئی میرے پاس ان کاغذوں اور پنوں کی انبار ہے..... پن منتخب کرنے کے بعد کاغذوں کی باری آتی۔ کھلی لائنوں والے تنگ لائنوں والے۔ فل سکیپ والے۔ ہر قسم کی ڈائریاں غرضیکہ اشفاق احمد صاحب جب بھی لکھنے کا عمل جاری کرتے، ان کے لیے تیاری، ہیشیاری اور کھینچنے کا عمل ساتھ ہی شروع ہو جاتا۔ انہیں سٹارٹ لینے میں دقت پیش آتی۔ اپنے تخلیقی گھوڑے کو سائنما مار کر ریس کے پلے کرنے میں مرحلہ وار تیاری کرنی پڑتی۔ جا بجا مختلف کاغذوں پر رنگ پر رنگ کے پنوں سے بے ربط، بار بار پیرا گراف کے بعد ناک کے بالوں کو دائیں ہاتھ کی انگلیت شہادت سے کھینچتے ہوئے ابروؤں کے بے بال جز سے اُکھاڑنے کے دوران وہ اپنے ناپک، کہانی، مضمون کے متعلق سوچتے چلے جاتے۔

عام طور پر وہ قلم testing کرتے وقت ”اس کے علاوہ“ سے شروع کرتے تھے۔ کبھی کبھی قلم کے حوالے سے اظہار خیال کر دیتے۔ ان کے برعکس مجھے کاغذ، کاپی، پن میسر آ جاتا، وقت ملنے پر میں لکھنے پر آمادہ ہو جاتی۔ مجھے لوگوں نے لکھتے دیکھا ہوگا کیونکہ میں عموماً خاں صاحب کے دفتر جانے کے بعد بچوں کے سکول، کالج سے واپس آتا تھا جو کچھ بھی دماغ میں ہوتا، کاغذوں پر اتار لیتی۔

میرے ایگل کے پن میں سیاہی ہمیشہ شفق بھرتے۔ میری میز پر کامن پینیں، کلپ، ڈائریاں وہی تھیں۔

میں نہیں بھی وہی ڈالتے۔ ابھی تک مجھے پن میں سیاہی بھرنا نہیں آیا۔ نہ قلم کو لکھ کر چیک کرنے کی صلاحیت ہی ہے کہ قلم وہی چیک کرنے کے عادی تھے۔

قلم اور کاغذ کی آمادگی دیکھ چکنے کے بعد وہ تخلیقی علم کی انگینت کے لیے تھوڑا تھوڑا کئی کتابوں سے چرچک لیتے۔ پڑا مادہ ہو جاتا، قلب اپنی بات پیش کرنے پر motivate ہو جاتا۔ ایسے میں مطالعہ رنگا رنگ ہوتا۔ فکشن وہ ہے۔ شاعری کی کتابیں بھی، اقبال، غالب، فیض، فراز، ناصر کاظمی کی زیر مطالعہ رہتیں۔ میرا اُن سے یہاں اختلاف رہتا۔ مجھے اقبال کی نسبت غالب پڑھنے کا زیادہ شوق تھا۔ خاں صاحب سوچ سے وابستہ انسان تھا۔ پڑھ کر دیر تک سوچتے رہتے۔ پچھلے بیس پچیس سال میں اُن کا مطالعہ Comparative Religions کی سیاق میں ہو گیا تھا۔ وہ رنگ رنگ کی انفرمیشن، مختلف مذاہب کا انداز فکر سمجھتے ہوئے کبھی کبھی لکھنے سے پہلے اُن کے کلمے لکھتے۔

انیس کی کلاس

اس طرح ایق کے شاگرد مفت ٹیوشن حاصل کرنے ماڈل ٹاؤن آتے تھے۔ اسی طرح جب انیس ایم بی اے کے لئے تو داستان سرائے میں اس کے ہم جماعت، ہم درسوں کی رونق بڑھ گئی۔ انیس کے ساتھ پڑھنے والے قلم صحابان سے پڑھ چکے اور اُن کے پلے کچھ نہ پڑتا تو سب سائیکلوں پر، کاروں پر، موٹر سائیکلوں پر سوار ہوتے آجاتے۔ لان کی طرف کھلنے والے بڑے کمرے میں اب اصلی جماعت شروع ہو جاتی۔ یہاں کوئی بلیک بورڈ تھا نہ کوئی نقشہ جات، صرف غسل خانے کے ساتھ والی دیوار تھی جس پر گہرا نارنجی پینٹ کیے شاہد افضل تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چاک اور ڈسٹر ہوتا۔ وہ کئی کئی گھنٹے ہم جماعتوں کو پڑھاتا رہتا۔ اسی خیال سے کمرے کے کالی میز اُن دنوں برآمدے میں کھلنے والے دروازے کے ساتھ تھی۔ دس بارہ لڑکے اس کمرے میں آتے۔

فصل پیدائشی گر تھا۔ وہ نہ سوال جواب سے گھبراتا نہ مناظرے سے بھاگ جانے کی صورت پیدا کرتا۔ سچ تو ہے کہ فصل کی محنتوں کا شکر تھا کہ سارے لڑکے اچھے نمبروں سے ایم بی اے کر گئے۔ کلاس میں کچھ شاگرد قابل ذکر تھے۔ عظیم، خمیں اور انیس خاں۔ طالبات میں عاصمہ، شگفتہ اور نغمہ پیش پیش تھیں۔ شگفتہ کے ذمے کلاس کے لیے تھوڑے تھوڑے غریب الطبع تھی۔ درمیانی شکل اور ذہانت کے ساتھ اُس نے خدمت کو اپنا شعار بنا رکھا تھا۔ جب وہ کلاس پر پانی ختم ہو گیا ہے تو فوراً اندر باورچی خانے میں پہنچ جاتی۔ یہاں اُن دنوں پانی فلٹر کرنے والی مشین لگی تھی۔ پہنچ کر وہ پانی بھرتی، جیونی بہن سے دو چار باتیں کرتی۔

”آج کیا پکایا ہے انیس کے مہمانوں کے لیے جیونی بہن۔“

”آج تو ثابت سر ہیں اور کڑھی۔“

پھر دوسرے دن جواب ہوتا۔ ”آج شگفتہ بی بی توے والا قیمہ اور آلو گوشت۔“

یہ خاں صاحب کے ڈیرے کا ازلی Menu تھا۔ نہ جیونی بہن اس کے علاوہ کچھ پکاتی تھیں نہ کبھی کسی سے آتا۔ ان دنوں ٹیلی ویژن تو گھر پر تھا لیکن اس پر وہ کھانے پکانے کی ترکیبیں نہ دکھائی جاتی تھیں۔ ابھی ہونٹوں کے گھروں میں نہیں گھسے تھے۔

نغمہ اپنے نوٹس بخوشی اُدھار دے دیتی اور عاصمہ کلاس کا حسن تھی۔ جس طرح ڈریس ڈیزائنر کے خاص ماڈل کی وجہ سے مقبول ہوتے ہیں۔ اسی طرح عاصمہ اپنی اداؤں، طرح دار یوں کے باعث مقبول تھی۔ تحسین ان دنوں کلاس کی چھوٹی موٹی ضرورتیں پوری کرتا۔ شاہد افضل اپنی موٹر سائیکل کی چابی تحسین دیتا۔ پھر جب تک وہ اپنے گھر نہیں جاتا، چابی تحسین کے پاس رہتی۔ شاہد افضل میں حیا کوٹ کوٹ کر بھرتی تھی سے کچھ دور ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا لیکن اس کی ڈینگیں مارنا شاہد افضل کے مزاج کا حصہ نہ تھا۔ اس نے کبھی جماعت کو اپنے بچھلے Status سے مرعوب نہ کیا۔ خاں صاحب کی طرح پٹھان بچے نے کبھی اپنے نام کے ساتھ کلمہ لکھا۔ وہ ہر جگہ اپنے میرٹ کا سہارا لیتا۔

اب 2007ء ہے۔ شاہد افضل امریکہ میں پنی آئی اے کا C.E.O مقرر ہے لیکن وہاں بھی وہ سب سے آگے کے سر پر کھڑا ہے اور اپنی کارکردگی کا دیا کھاتا ہے۔ اُس کی پہلی بیوی سعدیہ اُس کی جھینپو طبیعت سے عاجز آ کر گھسے



داؤد

مذہب و ملت

بچگان اور ان کے دوست

سے گھر میں آ کر ماحول کی تبدیلی، حالات کی تبدیلی، کام کے اوقات میں نیا پن پیدا ہو گیا۔ فراغت کے ملتے جلتے ماحول یعنی سوچیں لے کر کھل گئیں۔ تعلیم و تربیت کی جہت بھی نئی تبدیلی سے آشکار ہوئی۔

اسکی ہی ایک کھڑکی جب کھلی تو میں نے خاندانی نظام کے متعلق کچھ زیادہ ہی توجہ سے سوچنا شروع کر دیا۔ مغربی اور مشرقی نظام میں کتنی مماثلت اور کتنا بعد ہے؟ کیا مشرقی معاشرے کی تنظیم مکمل طور پر خاندان کی مرہون ہے؟ مغرب کو سیکولر سوچ اور جمہوریت نے تو خاندانی نظام کی افادیت سے منکر نہیں کر دیا؟ کیا ہمارے ملک میں ترقی کی راہ میں مذہب اور خاندانی نظام سب سے بڑی رکاوٹ ہے؟ 75۔ جی تک ایسی سوچ اور ایسے نئے نئے مجھے کبھی زیادہ سوچنے پر مجبور نہ کیا تھا۔ اب بھی میں نے کسی سے مشورہ کر کے اپنی سوچ کو مناظرے کی شکل نہ دی تھی۔ سوچ میں فار اینڈ آگینسٹ دونوں طرف سے دلائل مجھے خود دینا ہوتے تھے۔

میں سوچنے پر مجبور تھی کہ معاشرتی نظام میں شادی سب سے بڑا نظام ہے۔ اس ادارے کی بقا میں مستقبل کا تحفظ و سلامت میں محفوظ ہے۔ میں محسوس کر رہی تھی کہ مغربی تعلیم اور کلچر کی قدم قدم پذیرائی سے مشرقی Idealism مر رہا ہے۔ نظام کو بھی دھچکے لگ رہے تھے۔ بنیادی طور پر کوئی نظام یا ادارہ آدرشوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

ان ہی آدرشوں کی ایک جہتی جماعت نظام اور ادارے کو مضبوطی اور استقامت بخشتی ہے۔ ان ہی آدرشوں کی مدد و وجود میں آتی ہے، لیکن یہاں پھر ایک خطرہ موجود رہتا ہے۔ اس قدر جڑے رہنے کے باعث مرد اور عورتوں کی عموماً آزادی بھی مجروح ہونے لگتی ہے۔ مغربی معاشرے نے فرد کی آزادی کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی ہے۔ وہاں ہر شخص کو یہ زعم ہو گیا ہے کہ وہ قانون کی پابندی کے بعد فرد کی سطح پر مکمل طور پر آزاد ہے۔ وہ کسی کی دخل گیری کرنے کو تیار نہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ اکیلا کافی ہے۔ شخصی آزادی کی آرزو میں مبتلا مرد اور عورت اپنے فیصلے کو کسی لیے جنس اور محبت کی جب تک ذاتی طلب رہے شادی برقرار رہتی ہے۔ جب اندر کے جذبے ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں تو دونوں ضرورتوں کی کفالت کرتی ہے، اسے برقرار رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ شخصی آزادی میں حقوق

اور فرائض کی مانگ برابر ہوتی ہے لیکن خاندانی نظام میں بات انسانی حقوق (Human Rights) کی نہیں ہوتی ہے۔ اپنے حقوق چھوڑ کر بنتا ہے۔

کبھی کبھی بچوں کی معصومیت اور بے بسی کے حوالے سے ماں باپ کو مکمل طور پر اپنی آزادی، خوشی اور توجہ کو توجہ کر مستقبل کی سنہری کنجی ملتی ہے۔ اتنا ایثار قربانی اور انتظار آج کی عورت کے بس کا نہیں۔ راستہ کہیں میں ہے جس کا علم ہر فرد کی سمجھ اور صلاحیتوں پر ہے۔

بھلا کوئی شخص شادی کیوں کرتا ہے؟

آپ شادی سے کیا توقع رکھتے ہیں؟

کچھ لوگ ابھی سوچنے کے قابل بھی نہیں ہوتے جب ان کی شادی ماں باپ کی مرضی سے کر دی جاتی ہے۔ لوگ بڑی تابعداری سے ماں باپ کی خاطر مذہب کی انگلی پکڑ کر شادی کو کامیاب بنانے میں لگن رہتے ہیں۔ نزدیک بچوں کو سرے چڑھانے کا عمل ہی شادی ہے۔ پرانے زمانے میں ایسی شادی ڈولی سے لحد تک ایسے ہی سہارے بھرتی تھی۔

مغرب میں بھی پہلے یہی مسلک تھا۔ رابرٹ براؤنگ کے اشعار دیکھئے۔

Grow old along with me

The best is yet to be

The last of life for which

The first was made

Our lives are in his hand

لیکن وقت بدل چکا ہے۔

Elizabeth Barret Browning کے ساتھ تو رابرٹ کی بھگتی..... لیکن اب مغرب اس جہت سے

چکا ہے۔

شاید آج کا مرد اس لیے شادی کرتا ہے کہ وہ عورت کی کفالت کر کے اس پر اپنی برتری ثابت کرے۔ کفالت کرنا پیسوں کی حد تک محدود نہیں اور پہلے زمانے میں مرد اس ذمہ داری کو محسوس تک نہ کرتے تھے۔ اس فاتح قسم کے مردوں کا رویہ کرخت ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف آج کی عورت شادی کے بعد مرد کی خدمت کے بجائے اسے تبدیل کرنے کی موٹو گائیڈوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں مفاہمت کے بجائے مسابقت کا احتمال رہتا ہے۔ انسان محبت بھی کرے اور سیانا بھی ہونا ممکن ہے۔ ایسی عورت سے محبت کرنا جو آپ کو ڈر لگے۔ کانٹوں سے شہد چاٹنا ہے، لیکن یہ خوف کی رنگ برنگی شکلیں ہیں۔

آج کا ماڈرن مرد اور عورت بھی بچوں پر بہت زور لگاتے ہیں لیکن اس کی وجہ خوف ہے خوف خدا ہے۔ باپ بچے کو خدائی مہمان نہیں اپنی ذات کی پروجیکشن سمجھتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کا سارا زور بچے کی تعلیم پر ہے۔

حیثیت کو ثانوی حیثیت مل گئی ہے۔ یہ عہد دولت، دولت کے حصول اور دولت کے بل بوتے پر اپنی حیثیت کو بچانے کی خواہش کی آگ میں جھونکا جاسکے اس سے آج کا ماڈرن انسان دریغ نہیں کرتا۔

تشریح کا خوف جب معاشرے کا دائرہ بن کر پھیلتا ہے تو پھر ایک دوسرے کے حالات سے سرد مہری بن کر محض خود کی سطح پر اور معاشرے کے مجموعی مزاج کے اعتبار سے رزق حرام کی یا پھر خودکشی یا خودکشی حملے کی شکل میں صورت اختیار کر لیتا ہے۔

آج کل کے نوجوان کسی خاص آدرش کے تحت شادی نہیں کرتے۔ عموماً وہ اپنی تنہائی سے خوفزدہ ہوتے ہیں۔ شادی کے لیے کچھ کرنا پھرنا سنا سنا کر اپنا عکس سنا سنا کر دیکھنے کے آرزو مند ہوتے ہیں۔ کچھ فقط مسابقت سے خوفزدہ فقط اپنا کمال دکھانے کا سوچ کر شادی کر بیٹھتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ ہر انسان کو نکلے کی طرح ہے۔ یہ گریفٹس بھی ہے اور ہیرا بھی..... دباؤ سہہ جائے تو ہیرا ہے ورنہ معمولی کوئلہ..... اسے ہدی سے نیکی اور متعصب ہدی کا شکر دینا نہیں گئی۔ اسی لیے ہر انسان اپنی سوچ، عمل، رویے کے مطابق شادی کو فرحت بخش ٹھنڈا پانی یا کھولتا ہوا

شادی کی شراکت داری میں شامل ہو کر شخصی آزادی کا خواہاں نوجوان Privacy کی تلاش میں مارا مارا پھرتا ہے۔ جذبات، خیالات، حالات، اشیاء کی Sharing ختم ہوتی ہے، تو خاندان کا نقل گزرتا ہے۔ جہاں کہیں خاندان کے رہنے کے مقام پر فائز ہو کر لینے کا تقاضا شروع کر دیتے ہیں۔ جہاں ادارے یا نظام یا جماعت کو مضبوط کرنے کی ضرورت ہے بلکہ افراد چالاکی، خود فریبی اور انا کے چکر میں خدمت کرتے ہیں۔ وہاں آہستہ آہستہ ذاتی طاقت کا سفر شروع ہوتا ہے۔ پھر مرد ہو یا عورت وہ پرورش کا فن بھول جاتا ہے اور اپنی پرورش میں لگ جاتا ہے۔ یہیں سے معاشرے کی صورت میں آمریت کا بیج بویا جاتا ہے۔

یہ انسان صرف اپنے حواس خمسہ کی روشنی میں اپنی جسمانی زندگی کی ضروریات کو مد نظر رکھ کر سوچتا اور زندگی گزارتا ہے۔ اپنی روحانی تلاش کا ادراک تک نہیں ہوتا۔ وہ خدا، ماورائے مذہب سے وابستگی اور اس سے پیدا ہونے والی قوت سے بے خبر ہوا کرتا ہے، اسی لیے اسے نہ شادی کی سمت، نہ اس کی ذمہ داری ہی کا کوئی احساس ہوتا ہے لیکن یہ مت کوئی چیز نہیں جس کی اپنی ضروریات سے ہٹ کر بے لوث خدمت کا تصور پیدا ہوتا ہے، خطرہ وہاں بھی موجود ہوتا ہے، کیونکہ اس خدمت کا اجر بھی مانگتے ہیں۔ یہاں پھر جماعت کی خدمت بے معنی ہو جاتی ہے۔ انسان جب اندر ہی اندر سے سبکدوش ہوتا ہے تو وہ اپنے متعلق سوچتا ہے۔ وہاں پھر Power کا تصور پیدا ہو جاتا ہے اور وہ رفتہ رفتہ اپنے چکر میں پھنس جاتا ہے۔

ان دونوں صورتوں سے بچنے کے لیے اگر انسان کو صرف اپنا کردار، اخلاق اور اندرونی بالیدگی کے سفر کا خیال ہے تو اللہ کو قرض حسنہ دینے کے چکر میں ہو تو شاید اس کے مثبت نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔ کسی کو مرعوب کرنے کے لیے اس کو ٹھیک کرنے کا جنون ہو تو شادی اور زندگی دونوں کا سفر ایساں جاتا ہے۔

اگر اپنے آپ کو درست کرنے کے ارادے سے انسان کو ایسے تخلیے کی ضرورت ہو جس میں بیٹھ کر وہ عرفان

ذات اور اس سوچ بچار کے نتیجے میں اپنی غلطیاں ٹھیک کرنے کے لیے وقت درکار ہو تو اس عزت نشینی کے لیے جسے ذیل میں درج ہیں:

- 1- ملنے والے بار بار گھر آنے والے افسران سے اپنے لیے نوکری میں 'Extension' بیٹے کے لیے درخواست دینے کی بٹی کی ترقی کے لیے اصرار شروع کر دیں..... بھینٹ چھٹ جائے گی۔
- 2- امیر رشتہ داروں سے قرض کی درخواست کریں۔
- 3- طبقہ اناس کی نوجوان عورتوں، لڑکیوں سے پردے کی خوبیاں شوہر کی اطاعت اور ہر طرف سے بچنے کی بات بیان کریں۔
- 4- بوڑھی عورتوں کو اپنی اور گھر والوں کی خدمت پر اکسائیں۔ وہ بھاگ جائیں گی۔
- 5- ملازمین کو ڈسپلن سکھائیں۔ ملازم حضرات اپنی مصیبتوں کو لے کر آپ کے گرد جمع نہیں ہوں گے۔
- 6- مہمان سے تقاضا کریں کہ وہ گھر آنے سے پہلے اطلاع ضرور دے اور کتنی دیر ٹھہرے گا اس کا تعین کر دے۔

اس ہدایت نامے پر عمل کرنے سے آپ کو وہ تنہائی نصیب ہوگی جو عرفان ذات کے لیے وقف کی جاتی ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس ہدایت نامے پر عمل کر کے تنہائی کے اوقات کسی اور منفی عمل کے لیے بھی استعمال میں لاسکتے ہیں۔ انسان کو سمجھنا ویسے ہی بہت مشکل ہے کیونکہ کسی کی نیت کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے علم غیب کی رہنمائی کر سکتا ہے۔ کبھی کبھی تو انسان اپنی نیت کو بھی واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا۔ اسی نیت کی بدولت بڑے گھپے ہوتے ہیں۔ خاص کر وہ لوگ جو لمبے سفر میں ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے کا عزم کرتے ہیں، کبھی شوہر ہیرے کا ہار بھی بری لے لے آتا ہے اور کبھی آپ ہی گا دوپٹہ اچھی نیت سے آپ کے حوالے کر دیتا ہے۔ کبھی راتوں کو جاگ کر اندر لہن لہن والی ماں بھی اپنے عمل کو کھونا کر دیتی ہے اور بعض اوقات اچھی نیت سے چائنا رسید کرنے والی کسی کی عاقبت سزا کا موجب بن جاتی ہے۔

اسی سلسلہ میں یقیناً آپ نے مجھ سے زیادہ سوچا ہوگا لیکن میں ایک نتیجے پر پہنچی ہوں کہ انسان کے سائیکل کے ہب کی مانند ہے۔ ساری خوبیوں، خرابیوں کی سپوکیں اسی ہب یا ڈھرے سے جڑی ہیں۔ سپوک ہب سے اکھڑ جاتی ہے، اسی لمحے سائیکل کی رفتار متاثر ہو جاتی ہے۔ نیت کی خرابی کے باعث جو خوبی کسی پر نازاں ہونے لگتا ہے، وہ گھائے کی طرف بڑھنے لگتا ہے اور کسی کو نقصان پہنچے نہ پہنچے اس کی اپنی ذات سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔

میں چوری چوری خاں صاحب کے اعمال اور اقوال کا جائزہ لیا کرتی تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کبھی اپنے دست سوال دراز نہیں کرتے تھے۔ یہاں ان کی ازلی غیرت ان کی نیت کو قبلہ رو رکھتی۔ انہیں بارہا دیکھا، بڑی بڑی آئیں لیکن انہوں نے کبھی اپنے کسی بھانجے، بھتیجے، بھائی یا اپنے بیٹے تک کو ٹیلی فون ملا کر یہ نہیں کہا کہ مجھ پر یا تم پر ہے۔ میری اعانت کو آؤ۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اگر کسی اور کی چھوٹی سی تکلیف بھی پتہ چلی، فوراً کاسہ گدائی اٹھایا۔ دفنوں کے باہر بیٹھے
 لوگوں کا بھرم رکھنے کے لیے ان کی عزت نفس کا تحفظ کرنے کے لیے انہوں نے سفارشیں
 مانگا اپنا خرچ کم کیا لیکن میری اتنی ذلت ہوئی، کبھی کسی پراحسان نہ دھرا، کسی انسان کی کمر میں مکا مار کر
 تیری وجہ سے نیت تو دور کی بات ہے، وہ تو پشتی اور موروثی غیرت مند تھے۔ ایک ہب سے ان کی
 خرابیاں اور خرابیاں جزی تھیں۔“

لیکن کیا کیا جائے انسان تو ہمیشہ تضاد کا شکار رہتا ہے۔ یہی ایک خوبی جو ان گنت خوبیوں کا باعث ہوتی ہے، یہی
 خرابی کی وجہ بھی ہوتی ہے۔

میں صاحب بھی اپنے نسلی گروپ کی بنیادی خوبی ”غیرت“ سے آراستہ تھے۔ یوں وہ اپنی Genetics سے
 شاید اسی بنیادی وصف کا ذکر قرآن میں ملتا ہے کہ تم قبیلوں میں بٹ جاؤ تا کہ یہ قبیلے تمہاری
 ایک اور مثال سے بات آگے بڑھائی جاسکتی ہے۔ سفید قام قوتوں کی بنیادی خوبی خلق خدا کی
 خدمت کے جذبے کے تحت محبت کا جھنڈا اٹھا کر بڑے جوش و خروش سے رفاہی کام کرتے ہیں۔ اس موقع
 پہلے بمباری کر کے کسی معاشرے کو تباہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ وہ بڑے جوش سے کسی بستی کو تباہ کر کے پھر اس
 ہسپتال کھولیں گے اور بے دریغ مدد کریں گے۔ اسی خدمت کا تجربہ کریں تو واضح ہوتا ہے کہ
 اور محنت کا خم البدل نہیں اور محنت کسی بھی طور خدمت کے درجے کو نہیں پہنچتی۔

خاں صاحب بھی پنچانوں کی طرح غیرت مند تھے۔ اسی خوبی نے انہیں بہادر بنایا۔ آدرشوں کی مشکل زندگی کو
 انہوں نے سنبھالا لیکن اسی خوبی نے ان کے اندر گہری چپ کو جنم دیا۔ وہ اپنے غم اپنی خوشی کو اندر ہی اندر چھپو گم کی طرح
 پر اندر کے موسم کا حال نہ کہتے۔ ممتاز مفتی خاں صاحب کو گونگا کہتے تھے۔ مسلسل کرید کے
 لیکن ان کے لب تک کوئی حرف شکایت نہ آتا۔

میں نے خاں صاحب کی اس خرابی کے ساتھ رہنا سیکھ لیا تھا۔ میں جانتی تھی اس رازداری کے باعث ہم نفسی ان
 وہ غیرت کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ غیرت مند طبقہ اداس آدمی ہوا کرتا ہے۔ دوسروں کو آسائیاں بخشنے والا
 چپ اداس آدمی تھا۔

مجھے اسی غیرت نے بہت نفع پہنچایا۔ اسی خوبی نے خاں صاحب کو میری پوری کفالت کرنے پر آمادہ کیا۔ انہوں
 بگری سینٹ لانے کو نہیں کہا۔ آپ کو یقین تو نہیں آئے گا لیکن 121- سی میں جب ہم آئے تو مجھے
 وہ گھر تعمیر ہوا، کیسے ہوا، کیسے اس کا نقشہ پاس کرایا گیا؟ ٹھیکے دار خدام کہاں
 کیسے آئی؟ سر یا شیشہ کنڈے چھیکے کون خریدنے گیا؟ میں تو آرام سے بچوں سمیت اس
 جب گھر پینٹ پالش سے چمکتا دلہن کی طرح جگمگاتا کھڑا تھا۔

ایک روز اس گھر کی بنیادیں کھودنے کا دن تھا، ایک روز صبح سویرے خاں صاحب اپنی فوکسی میں آئے۔
 میں کھانے کے کمرے میں آنند سے بیٹھی لکھ رہی تھی۔

”قدسیہ.....!“

”جی آپ کہاں؟“

”جلدی چلو اماں جی کار میں بیٹھی ہیں۔“

”تو انہیں اندر لے آئیے ناں۔“

میں نے سوال نہ کیا کہ اماں جی کار میں کیوں بیٹھی ہیں۔ کار تک پہنچنے میں انہوں نے صرف ایک

کیا: ”بچے کہاں ہیں؟“

”سکول جی۔“

”اچھا۔“

اماں جی سردار بیگم فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہی گورا چٹا خوبصورت خوش مزاج وجود۔ بڑی خوش

میرے سلام کا جواب دیا..... فونسی روانہ ہو گئی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں؟

جہاں اب 121۔ سی ہے اس گھر کے پائین ہاتھ سکھوں کے زمانے کی ایک پرانی کوٹھی تھی۔ باقی سا

حد تک اجازت تھا۔ کار سین اسی جگہ آ کر رکی جہاں اب داستان سرائے کا بورڈ نصب ہے۔ باوای رنگ کی فونسی سے

صاحب اترے۔ میں بھی ان کی دیکھا دیکھی اتر گئی۔ اماں جی کسی سہارے لٹھی کے بغیر آرام سے اتر کر خاں صاحب

ساتھ ہو گئیں۔

فضا میں تازہ مٹی اور اماں جی کے عطر کی خوشبو تھی۔ شاید آپ کو خیال آئے کہ اتنے برس گزر جانے کے

میرے اصلی جذبات میرے ذہن میں دھندلا گئے ہیں لیکن سچ بات یہ ہے کہ مجھے اس وقت بھی خاں صاحب اور

کے تعلق پر حسد نہیں آیا۔ میں اس وقت بھی اپنے آپ کو غائب سمجھتی تھی۔ آج بھی میرا خیال ہے جو نو جوان بہو پائے

کے حقوق کو اپنے حقوق پر نافرمان نہیں سمجھتی وہ بڑی غلطی پر ہے۔

مجھے علم نہ تھا کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ اجاڑی جگہ پر سڑک پار ایک نالہ بہہ رہا تھا۔ یہ ٹیوب ویل کا خنقاہ

تھا جو ماڈل ناؤن میں پانی کی ترسیل کا کام تھا۔ برساتوں میں پانی نالے سے نکل کر آہستہ آہستہ دور تک رسنے لگتا۔

زمین کے دائیں طرف سر ظفر اللہ خاں کا پرانا سکھوں کے عہد کا بنا ہوا گھر تھا۔

پائین جانب بھی سکھوں کے عہد کی ایک پرانی کوٹھی تھی۔ سر ظفر اللہ کی کوٹھی ہمارے آنے تک ان کی

ملکیت بن گئی..... لیکن وہ لندن میں رہتی تھی۔ کبھی کبھی جب وہ پاکستان آتی اور ربوہ جاتی تو ان کی طرف سے محبت

چارے کا بھر پور مظاہرہ ہوتا۔ ایک بار وہ مجھے ربوہ بھی لے گئی جہاں میں نے کالج کے ایک بڑے فنکشن میں شمولیت کی۔

ہماری زمین پر دو تین مزدور صورت آدی کھڑے تھے۔ پھر ایک جھگی سے محمد علی ہمارا پرانا خدمت گار

ٹھیکیدار خادم برآمد ہوئے۔ ہم وہاں پہنچے جہاں بچوں کا بیڈروم بنا۔ خادم نے آتے ہی خاں صاحب اور اماں جی کو

اور اماں جی سے دعا کی است دعا کی۔ اماں جی نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ہم سب نے تقلید کی۔

پھر اماں جی کے ہاتھ میں گینتی پکڑا کر کہا: ”اماں جی! یہاں تک لگا دیجیے۔ کھدائی ہم خود کر لیں گے۔“

تندرست تھیں۔ ایک ہی ہلے میں کافی گہرا ٹک لگا دیا۔ لیجیے داستان سرائے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اس کے بعد کیونکر بنا۔ اس میں کیا کیا کبھیڑے تھے۔ کیا کیا از چینیں تھیں؛ مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ میں صرف یہ جانتی تھی کہ حساب کتاب رکھتا تھا اور عبدالرزاق رات کو دفتر کے بعد جھگی میں سامان کی نگرانی کے لیے ہوتا تھا۔ جس روز

میں یوں خاں صاحب مجھے لے کر یہاں پہنچے۔

میرا منہ جیسے کھل جاسم سم سن کر ایک بنا بنا پختہ گھر پلک جھپکے وارد ہو گیا۔ خادم ٹھیکیدار برآمدے میں کھڑا تھا۔ مرمرا کے فرش فیشن میں ہیں۔ کچھ وی آئی پی فرشوں کو ٹیک کی لکڑی سے ونیر کر رہے ہیں لیکن 1970ء میں فرش انتہائی۔ جوں جوں وقت بدلتا ہے ایجادات نئی چکا چونڈ لے کر در آتی ہیں۔ فیشن بھی تبدیلی کے آشنا ہو گیا۔ اب مرمرا اور لکڑی سے آبنوی فرش چمکائے جاتے ہیں۔ آگے جانے کیا ہوگا۔

خادم کے ہاتھ میں گھر کے مین دروازے کی چابیاں تھیں۔ ہم دونوں کے آنے پر اس نے بڑے فخریہ انداز میں کھل دیا۔ خاں صاحب کو چابی دینا چاہتی۔

”مجھے کیوں چابی دے رہے ہو۔ بھائی مالکن کو دو۔۔۔۔۔ یہ جانے اور اس کی چابیاں۔۔۔۔۔“

میں کچھ مجھوب، کچھ دنگ، کچھ پریشان لہے برآمدے میں چلنے لگی۔ ساتھ ساتھ خادم نے پہلے گیٹ روم پھر بچوں کے کمروں کے تالے کھولے۔۔۔۔۔ اوپر جانے والی میزھیاں دکھائیں۔

”بی بی جی او پر ابھی صرف خاں صاحب کی لائبریری ہی بنی ہے۔“

”بہت ہے خادم بہت ہے۔ ہماری ضرورت کے لیے بہت ہے۔“

”یہ نہیں جی کیا بات ہے آج محمد علی اور عبدالرزاق نہیں آئے۔“

یوں لگتا ہے کہ محمد علی و قاراوی کا سہیل بن کر ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا۔ اس نے سارے گھر کا حساب کتاب لکھا اور تحویلی لکھی ہوئی یہ کاپی ابھی تک موجود ہے جس میں پائی پائی کا حساب ہے۔ عبدالرزاق رات کو گھر میں سویا کرنا

کے لیے کی خوب نگرانی کرتا تھا۔

”میرید کام کر رہا ہے خاں صاحب اس سے مل کر جائے گا۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ لیکن انہوں نے میرے ساتھ گیراج کا چکر نہیں لگایا۔ میرید گیراج میں لکڑی کا کام کیا کرتا تھا۔ کوٹھی

نے کے بعد اس نے گھر کے لیے پنگ، پنچیں، شیلف، کتابوں کی الماریاں بھی تیار کیں۔ ہم اپنے ساتھ وہ تخت

سٹیٹ کھانے کی میز کرسیاں لائے جو کچھ سامان تو شیخوپورہ میں مہاجرین کا سامان نیلام ہونے کے وقت خریدا گیا

تھا اور اوھر سے اکٹھا ہو گیا تھا۔

جس طرح بنا بنایا گھر مجھے ملا، اسی طرح سامان ڈھونڈنے، اس کو فرنیچر سے سجانے، اس میں پرانے پردے ٹانگنے،

میں نے ان امور خانہ داری میں نہ کوئی دلچسپی لی نہ یہ سمجھا کہ مجھے کسی قسم کے

ضرورت ہے۔

اس گھر کے پہلے مین خاں صاحب، انیق، انیس اور اشیر اور بانو قدسیہ مقرر ہوئے۔ 75۔ جی کا گھر بڑی لاتعلقی

سے چھوڑ کر ہم لوگ ایک نئے دور میں داخل ہو گئے۔ ابھی بچگان ڈویژن ماڈل سکول میں رمضان بھائی کے ساتھ تھے، لیکن یہاں سے سکول کا فاصلہ کافی تھا۔ فوراً ہی سائیکلوں کی ضرورت محسوس کی گئی۔

تینوں بچے ماسٹر بیڈروم کے ساتھ والے کمرے میں Discussion کرتے۔

”بھئی لینا ہے تو ریلے کا سائیکل ہی لینا ہے۔“

”ابو کی ہو پر مل گئی ہے۔ اب وہ نیا سائیکل لے کر نہیں دیں گے۔“

”ہم تینوں کیسے ایک ہو پر پر جا سکتے ہیں سکول؟“

اینق بہادر بن کر کہتا..... ”تم اشیر ڈنڈے پر لالہ کیریز پر اور میں سائیکل چلاؤں گا۔“

”اور بستے؟“

”وہ بھی ہوں گے تمہاری گود میں۔“

یہ مباحثے ضرور ہوتے لیکن جونہی میں کمرے میں پہنچتی، وہ تینوں چپ ہو جاتے۔ یہ بات یہاں اس لیے تھی کہ میں آپ کو کچھ بچوں کی طبیعت کے متعلق اور کچھ اپنی اور خاں صاحب کی تربیت کے متعلق عرض کر سکوں۔ اسے میرے بچوں کی جہلتی کمزوری یا پیدائشی گونگا پن کہہ سکتے ہیں۔ وہ اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کا کبھی ہر ملا کر کرتے۔

شاید اسی لیے ان میں مسابقت کا جذبہ کم ہے۔ ہو سکتا ہے اسی گونگے پن نے ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے میں رکاوٹ ڈالی ہو۔ وہ کیونکہ منوانے والا عموماً لیڈر صفات کا حامل ہوا کرتا ہے۔ وہ مکا دکھا کر، میز بجا کر، انگلی اٹھا کر دوسروں کی بات کو دیتا ہے۔ آج کے عہد کے بچے مانتے والے عہد سے نکل کر منوانے والے عہد کے نمائندہ ہیں۔ وہ ماں باپ کے استاد کو بے وقعت اور اپنے سے عمر میں بڑے کی بے عزتی کرنے کو گناہ نہیں سمجھتے۔

121- سی میں آئے تو ہمارے بچے بکریاں تھے۔ شاید انہیں مجھ سے محبت زیادہ تھی یا خوف کا عنصر غالب تھا۔ انہوں نے کبھی دو بدو بحث کر کے اپنی منوانے کی کوشش نہیں کی۔ اپنی خواہشات کے بیان میں بھی غالباً یہی دو جذبے تھے۔ انہوں نے کبھی دھونس کے ساتھ کچھ نہیں مانگا۔ اینق احمد صاحب جب سکول میں فٹ بال ٹیم کے کھلاڑی بنے تو فٹ بال کے جو توتوں کی اشد ضرورت تھی۔ استاد کی جھڑکیوں سے عاجز آ کر بڑی لجاجت سے ایک روز انہوں نے کہا..... ”امی وہ فٹ بال کے ٹیچر ناراض ہوتے ہیں.....“

”کیوں؟“

”جب فٹ بال کی ہٹ ٹھیک نہیں لگتی۔“

”کہاں کھیلتے ہو فٹ بال۔“

”یہ جی..... جو سکول کے سامنے گراؤنڈ ہے اس میں۔“

پہلے تو میرا جی چاہا کہ میں اسے فٹ بال کھیلنے سے منع کر دوں، پر وہ میرے منع کرنے سے پہلے بولا..... ”جی انہوں نے مجھے تھپڑ بھی مارا۔ کہتے ہیں اگر بوٹ نہ لائے تو اور ماروں گا۔“

میں ہمیشہ سے مار پیٹ کے خلاف ہوں۔ اس میں کچھ دخل میری خوفزدہ ذہنیت کا بھی ہے۔ خوف زدگی کئی اور صورتیں بنا کرتی ہے۔ خوف بزدلی اور جھوٹ کو جنم دیتا ہے۔ سراسیمگی اور اداسی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ میں نے ڈاکٹر مشاق سے ملوں گی اور ان ٹیچر صاحبان کے خلاف مقدمہ دائر کروں گی جو میرے بچوں کو مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔

”کون کون مارتا ہے تمہیں؟“

”میں تو سبھی ہیں لیکن سب سے زیادہ اردو کے ٹیچر ہاتھ اٹھاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں یہ اردو کے اتنے بچے ہیں؟ خاک باپ کا نام روشن کرو گے؟“

خاک باپ کے بوٹوں کے لیے میں نے بیس روپے مارے باندھے اینٹ کو دے دیئے۔ اس وقت یہ بہت بڑی رقم تھی۔

پندرہ دنوں میں طیش میں بھری سکول پہنچی۔ ڈاکٹر مشاق ایک بڑے ہی سلجھے ہوئے صحبت سے ڈسپلن کرنے لگے تھے۔ ان کا کیریئر دوسری کے ایک ماڈل سکول کو سنبھالنے میں منقطع ہوا۔

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہی کہا..... ”اگر میرے بچوں کو کسی نے ہاتھ لگایا تو میں اسی دن انہیں سکول سے اٹھا لوں گی۔“

میرے بچوں نے واقعتاً تعلیم کی طرف توجہ نہ دی۔ مجھے اس کی تین وجوہات نظر آتی ہیں۔ خاں صاحب مکمل طور پر سست کرتے تھے۔ اس اعتماد کی غالباً وجہ ان کی اردو بورڈ میں مصروفیات اور پھر ریڈیو پاکستان اور ٹیلی ویژن کی سرگرمی اور کام بھی ایسا تھا کہ انہیں بچوں کی طرف سے غفلت برتنا پڑی۔ وہ اپنے بچوں کو سوئمنگ سکھانے لگی تھی۔

سوئمنگ پول پر ضرور لے جاتے۔ اگر وہ کسی گاؤں میں رہتے تو یقیناً وہ اپنے بچوں کو گھڑ سواری بھی سکھاتے لیکن وہ اس وقت لاہور میں تھے۔

یہ تینوں اپنے اپنے کوائف پین میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ اینٹ جب گورنمنٹ کالج میں پڑھتا تھا تو اسے اپنے پیسے نہ دے سکتی جو اکثر ہوتا، وہ واپسی پر گورنمنٹ کالج سے پیدل گھر آ جاتا..... یہ ایک بہت لمبا فاصلہ تھا۔

میں نے کبھی شکایت نہیں کی..... انہیں کار ریکارڈ ہے کہ اس نے کبھی کوئی فرمائش نہیں کی۔ کالج میں جانے کے بعد اسے کبھی بازار لے بھی جاتی تو بھی وہ خالی ہاتھ ہی لوٹ آتا۔ آج تک اس کی لمبکی عادت ہے۔ وہ دوسروں کی شکایتیں نہ کرتا تھا۔

تیسرے صاحب کو انہیں پوری کرنے میں سردھڑکی بازی لگا دیتا ہے، لیکن اپنی خواہش کا کسی کو علم نہیں ہونے دیتا۔

تیسرا خاں ان دونوں سے قدرے مختلف ہے۔ وہ قدرے اپنی منوانے والا بچہ ہے۔ بچپن میں اسے جگر کا پتھر لگا تھا۔ اس بیماری کا چکر لمبا تھا اور اسی کی وجہ سے ہم اسے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

پندرہ تہمتی سے استادوں نے ان سے رویہ سخت رکھا۔ ان میں وہ شفقت اور شاگرد نوازی نہ تھی جس کی بدولت ماسٹر صاحب صاحب کی زندگی میں گڈ ریا بن گئے۔ پھر جب خاں صاحب دھرم پورہ میں بابا فضل شاہ کے ڈیرے پر گئے تو ایک اور سمت کے مسافر بن گئے۔ اب ان کا فلسفہ حیات بدل گیا۔ ہمارے گھر میں برآمدے ہی میں دو بورڈ

نصب تھے۔ ان پر باباجی نوروالوں کے اقوال زڑیں لگائے جاتے تھے۔ ان میں جا بجا تعلیم کے منافی اقوال تھے صاحب گفتگو میں بھی عام طور پر یہ کہتے نظر آتے کہ:

”ان پڑھ انسان نے پاکستان کو اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا کہ پڑھے لکھوں نے پہنچایا ہے۔“

انہوں نے اس بات کا غالباً اندازہ نہ لگایا کہ مغرب اپنی تمام قوت Strategy اور علم کے ساتھ بہت دور رس نتائج کی سیکموں کے ہمراہ اسلامی ریاستوں کو رومانیت دین داری بھائی چارہ اور اخوت کی قدروں سے دنیاوی اور مادی ترقی کا عادی بنا رہا تھا۔ ہم دونوں نے بچوں کی مسابقت پر اعتبار نہ کیا۔ بچوں میں وہ خود اعتمادی ہو سکی جو مسابقت کی فضا میں جنم لینے والوں کی عادت بن جاتی ہے۔

سب سے بڑا نقص جو میرے بچوں کی تعلیم کا ہوا وہ میرا رویہ تھا۔ مجھے کام کو جانے بغیر اس سمندر میں کھنکھانے کی عادت ہے۔ میں پڑھانے کا فن نہیں جانتی تھی لیکن مصرتھی کہ انہیں میں ہی پڑھاؤں گی۔ مجھے سائنس نامی کسی نہیں تھا لیکن میں بضد تھی کہ فزکس کیسٹری بھی میں ہی پڑھاؤں گی۔ میرے پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ میں کتاب پڑھتی جاتی اور انہیں سناتی تھی۔

جتنی سمجھ مجھے آ جاتی وہ تعلیم ناکافی تھی۔ میرے ساتھ اینق بیٹھے۔ وہ غالباً اس لیے کتاب پر توجہ دیتے تھے سعادت مند طبیعت میں میری محبت موجزن تھی۔ اس کے بعد انہیں بیٹھا کرتا۔ وہ عموماً کتاب سے کچھ نقل کر کے مشغول رہتا۔ اخیر خاں بہت چھوٹا تھا۔ وہ دیا تو چھٹی کر لیتا یا قاعدہ کا پی دیکھ کر وقت نالتا رہتا۔

اینق خاں کو بھی تعلیم کا شوق کم تھا لیکن اس نے بھی کہیں اندر آفتاب بھائی کا مقولہ مانگ رکھا تھا۔ بھائی ”اپنے والد کی خاطر“ وکیل بن گئے۔ اینق بھی اپنی ماں کی خاطر پی ایچ ڈی کر گئے اور ایم۔ ایس۔ سی (سایینس) میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔

یہاں مجھے ایک واقعہ یاد آ گیا۔ جس روز اینق بیٹے کو گولڈ میڈل ملا۔ وہ پھولوں کے ہاروں سے لدا گھر آیا تو اس کا خیال تھا سارے افراد میری والدہ نانا کی طرح خوشی سے چیخیں ماریں گے۔ تا لیاں گونجیں گی اور اسے اپنی محنت کا صلہ مل جائے گا۔ گولڈ میڈل ہاتھ میں لیے ہاروں سے لدا پھندا وہ ہمارے بیدروم میں آیا۔ خاں صاحب حسب عادت مخصوص ٹیبل کے آگے کرسی کھینچے کتابوں کی ورق گردانی میں مشغول تھے۔

”ایکسیکوزمی ابو.....“ اینق بولے۔

ابو نے نظریں کتاب سے اٹھائے بغیر آہستہ سے ”ہوں“ کہا۔

”ابو مجھے گولڈ میڈل ملا ہے۔ میں ایم ایس سی میں فرسٹ آیا ہوں۔“

اب بھی انہوں نے اینق پر نظر نہ کی اور اپنے خیالوں میں مشغول لائق سے بولے ”اچھی بات ہے“

”ہوا“

میں نے اشارے سے اینق صاحب کو بلایا: ”میرے پیچھے آؤ اور یہ ہار گلے سے نہ اتارو..... ہم تمہارے“

ہے۔“ سڑک پر پہنچ کر میں نے ایک رکشہ رکوا یا۔ اس میں ہم دونوں سوار ہوئے اور ڈویژنل پبلک سکول پہنچے۔
 اسحاق صاحب کے دفتر کا دروازہ کھلا تھا۔ ہم دونوں اندر گئے تو وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

”یہ آپ کا ہونہار انیق ہے سر۔ اسے ایم ایس سی میں گولڈ میڈل ملا ہے۔ میں سمجھتی ہوں آپ سے زیادہ کسی کو
 امت کی خوشی نہیں ہو سکتی۔“ انہوں نے انیق کی طرف بڑھتے ہوئے دعاؤں کی ایک قطار لگا دی۔

”آپ دیکھیں گی یہ ملک و قوم کا نام روشن کرے گا۔ اسے نوٹل پرائز ملے گا۔ سکول کا نام تو روشن ہو گا ہی۔“
 انیق نے اپنے ہاران کے گلے میں ڈال دیے۔ وہ ہاروں سمیت اس سے بغلیں ہو گئے۔ ہم تینوں کی آنکھیں
 سے نم ہو گئیں۔ نہ کوئی پارٹی نہ مٹھائی بانٹی گئی۔ لیکن انیق اسی محبت پر خوش ہو گیا۔ اس نے اس رول آف آنر کو فریم میں
 لٹا کر دیوار پر نہانا لگا۔ صرف اپنے دل کی تختی پر کہیں چوری چوری آویزاں کر لیا اور بس!

سر دھری کا ایک واقعہ اشیر خاں کے ساتھ بھی پیش آیا۔ وہ بنیادی طور پر کرکٹ کا کھلاڑی تھا۔ این ڈی ایف سی
 اسکول سے بیٹکوں کے درمیان کرکٹ میچ کھیلے گئے۔ یہ اپنے بینک میں کرکٹ ٹیم کا کپتان تھا۔ حسن اتفاق سے این ڈی
 ایف سی ٹیم سارے بیٹکوں سے مقابلہ جیت گئی۔ اشیر احمد خاں کو مین آف دی میچ کی ٹرافی ملی..... ایک بار وہ بھی ہاتھ میں
 کرکٹ بچھا تو خاں صاحب تلقین شاہ لکھنے میں مصروف تھے.....

”ٹرافی ابو..... میں آف دی میچ“ لیکن ابو لکھتے رہے۔ نظر اٹھائی نہ ٹرافی دیکھی۔ نہ مین آف دی میچ پر نظر ڈالی۔
 ”کتابوں کی الماری کے اوپر سجا دو۔“ اشیر دل برداشتہ ٹرافی لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور ٹرافی کو اپنے
 گالے کے نیچے چھپا دیا.....

ہم اپنی Genes سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھی ہمارے باپ دادا ہم میں سے اچانک برآمد ہو
 جاتے ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے ہمارا بس نہیں چلتا۔ خوشی کے موقعوں پر اسی طرح کہیں سے باباجی محمد خاں اشفاق
 صاحب کی شخصیت کو Take over کر لیتے تھے۔

خاں صاحب بتایا کرتے تھے کہ باباجی میں ڈھکا چھپا غصہ بمقدار وافر تھا۔ کوئی انہیں خوشی کا اظہار کرتا نظر آتا تو
 ان میں آجاتے۔ ایک روز خاں صاحب کے بڑے بھائی اسحاق احمد خاں سکول سے انعام لے کر آئے۔ باباجی
 ان کے ڈیپاں پیک کر وارہے تھے۔

”یہ دیکھئے باباجی! سکول سے مجھے فرسٹ آنے پر انعام ملا ہے۔“
 باباجی نے آنکھ اٹھا کر بھی انعام پر نظر نہ ڈالی اور بولے: ”ججو! مجھے افسوس ہے تم انعام لینے والے ہو..... کاش تم
 میرے جیسے والے ہوتے تو مجھے خوشی ہوتی.....“

انیق پی ایچ۔ ڈی کر گئے اور ایم۔ ایس۔ سی (سایکالوجی) میں گولڈ میڈل حاصل کیا لیکن اس کی اصلی توجہ طلسم
 کتب خانہ کی طرف تھی۔ الف لیلی جیسی کتابوں پر مرکوز ہو گئی۔ وہ انجانے میں معلوم سے زیادہ نامعلوم شعور سے آگے لاشعور
 میں ترقی سے نکل کر روحانیت کی طرف مائل ہو گیا۔ پھر سونے پر سہاگہ وہ محفلیں ہوئیں جب خاں صاحب واصف علی

واصف کی محفلوں میں جانے لگے۔ تین سال انیق ہرات اپنے ابو جی کے ساتھ رات گئے تو واصف صاحب کی شرکت میں شرکت کرتا رہا۔ اس کا وہ شوق جو Para- Psychology پر منتج ہوا ان راتوں سے ہی شروع ہوا۔

انیس کے لیے تعلیم بہت مشکل تھی۔ وہ گورنمنٹ کالج میں کلاسوں کے بجائے باہر Oval میں بیٹھا رہتا۔ جب گھر لوٹنے کا وقت آتا تو عمو چپ چاپ بس لے کر گھر لوٹ آتا۔ اس کی سعادت مندی کا یہ عالم تھا کہ اس نے رات کو کسی سے کوئی مدد مانگی نہ ہی اعانت چاہی۔ وہ بچپن سے باپ پرست تھا۔ ان کے سارے کام کر کے راحت محسوس کرتا۔ میرے بچوں میں ایک وہی ہے جو بازار سے سودا سلف بھی لے آتا۔ ابو کے پروگرام ”تلقین شاہ“ کی ریکارڈنگ بھی اس کے ذمہ داری تھی۔

اشیر نے سکول سے ہی کلاسوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ بمشکل تمام دسویں جماعت کی اور ماڈل ٹائون کے کالج سے ہی داخلہ لے لیا، لیکن ایف اے کے امتحان سے چند مہینے پہلے اس نے کالج بھی چھوڑ دیا اور پرائیویٹ ایف اے کے لیے آرٹس میں ٹیوشن رکھ لی۔

ٹیوٹر بھی وہ اپنی پسند سے گھر لے آیا۔ امجد ٹیوٹر کم تھا اور دوست زیادہ۔ ہمارے گھر ہی منتقل ہو گیا اور اشیر کو لایا۔ لائبریری میں بیٹھ کر پڑھانے لگا۔ بد قسمتی سے اسے ابھی اپنے مستقبل کی فکر اشیر کی پڑھائی سے زیادہ تھی۔ اس نے ہاں ہاں کر Luims کے کمپیوٹر کورس کیے۔ اپنے لیے ایک مشین بنائی جو انٹرنیٹ کی کاپی تھی اور اس پر زیادہ توجہ دینے لگا۔ گورنمنٹ کالج میں میرے کسی بیٹے کو میرٹ پر داخلہ نہ مل سکا، لیکن ان میں موسیقی کا شغف قدرتی تھا۔ توسط سے انہیں داخلے ملے اور تینوں نے بی اے گورنمنٹ کالج سے کیا۔

طلبہ بجائے کے لیے انیق کو ایک ماسٹر رکھ کر دیا تو وہ ماسٹر بھی قریباً سارا دن گھر پر گزارنے لگا۔ انیق تو حیلہ چھانچھانچھتے ہی تھے لیکن اشیر بیٹے نے سن سن کر ہی اس میں مہارت حاصل کر لی۔ جب انیق امریکہ سدھارے تو جب محمد کے ساتھ نیویارک میں ایک سٹیج شو میں ان کی سنگت کی تھی اور انہیں خوب سراہا گیا تھا۔

بی اے میں انیق نے اشیر کی ایک طرح سے ٹیوشن اختیار کر لی اور چونکہ اس کا مضمون بھی نفسیات تھا اس لیے اشیر میاں کو اس مضمون میں دلچسپی پیدا ہو گئی۔ بی اے کے بعد اشیر نے G.R.E کا امتحان دیا۔ پرچے خوب ہوئے اور اس کا خیال تھا کہ وہ کسی فارن یونیورسٹی میں پڑھنے چلا جائے گا لیکن جی آرای کے پرچے کم ہو گئے اور اس طرح ایک بار تعلیم سے متنفر ہوا۔

اگر انیق اپنی صلاحیتوں کے مطابق ڈاکٹر بن جاتا تو اس انسانیت پسند کا کیریئر مختلف ہوتا۔ یا اگر وہ موسیقی سے وابستہ ہو جاتا تو شاید؟

انیس انجینئر تھا۔ اسے عمارتیں اسارنے کا شوق تھا، لیکن اس نے باپ کے فیصلے سے مارے باندھے اور اے اے کر لیا..... برس برس Frustration کا ذکر میں تفصیل سے اس لیے نہیں کر سکتی کیونکہ پھر یہ کتاب ایک دوسری قسم کا ہو جائے گی۔ مجھے تو یہاں صرف اپنی اور خاں صاحب کی غفلت کے باعث جو نتائج نکلے ان کا ذکر کرنا ہے۔

اشیر نے بھی مارے باندھے فنانس میں ماسٹر کر لیا۔ اس کے علاوہ اس نے ہمیں خوش کرنے کے لیے بیکنگ

میں بھی اعلیٰ ڈگریاں حاصل کر لیں، لیکن اشری سپورٹس میں تھا، اگر وہ کرکٹ میں چلا جاتا یا فلائنگ جس کا اختیار کرتا تو شاید اس میں پروفیشن کا درست چناؤ تحریک اور خود اعتمادی کا باعث بنتا۔ ہم دونوں نے ان کے لیے یہی راستہ کیے لیکن ان کی اصل مدد نہ کی۔

آج کے عہد کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ ماں باپ بچوں کو دھونس سے اپنی مرضی کی ڈگریاں دلوار ہے ہیں لیکن کچھ عرصے میں انجینئروں کی ایک پوری کھیپ راستہ بدل کر کبھی ایم بی اے کرنے نکل جاتی ہے، کسی کو بزنس کلاس اپنی صلاحیت سے بچتی ہے۔ ماں باپ میں وہ وسعت قلب یا وسعت نظر نہیں ہوتی جو بچوں کے رجحان، صلاحیت اور ارادوں کو سمجھ کر بچے کو جس پر چڑھ کر بچا اپنے خوابوں تک پہنچ سکے۔

بچوں نے بظاہر دنیا جیت لی لیکن وہ اپنے اندر گپ چپ اور اداس رہتے چلے گئے۔ میں بھی ایک ایسی کھیپ تھی جس کی تربیت اور تعلیم دونوں ٹھگ بازی تھیں۔ میں صرف pamper کرنے کو خوبی سمجھتی تھی۔ میں ان کو ہوم ٹیوٹل کے بجائے ان کا ہوم ورک کرنے کی عادی تھی۔ یہ تینوں اپنے آبائی لوگوں کی طرح بے حد شریف اور غیرت مند تھے۔ ہم نے نہ کبھی ہم سے گلہ کیا نہ کبھی دست سوال ہی دراز کر کے اپنے آپ کو شرمندہ کیا۔

یہاں کچھ دیر توقف کر کے ایک نتیجہ اخذ کرنے کی اجازت دیجیے۔

میں اب جو تجزیہ پیش کرنے لگی ہوں وہ علم کی بنا پر نہیں، تجربے کے طور پر میں نے زندگی سے سیکھا ہے۔

آپ کو سائیکالوجی کی کتابوں میں دانا اور دانشور لوگوں کے علم سے انسان کے متعلق صحیح العقول، انکشافات مل سکتی ہیں، یہ خیال ہے کہ انسان کو یقیناً اس کی جبلت اور بچپن کا ماحول پر واں چڑھانے اور شخصیت ڈھالنے میں بہت سے ہیں، لیکن اس سے بڑی ایک اور بارش بھی ہے جو اللہ کی توفیق کی صورت میں اس پر برسی ہے، لیکن اس توفیق سے سوائے سوائے کا ایک ٹونا ہے۔

میں اپنی مرضی سے نہ کسی شخص کا فیصلہ بدلتا ہے نہ اس کی تجویز میں حارج ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ انسان اور اللہ کے درمیان حضرت آدم نے جنت سے نکلنے وقت حضرت انسان کی طرف سے کر لیا تھا۔ اگر فرد دعا کا سہارا لے کر اللہ سے دعا کرے تو پھر اس کے ماحول، جبلت، سوچ، عمل اور رویے میں تبدیلی آنے لگتی ہے۔ شاید اسی لیے لوگ ماں کی رحمت سے آرزو کرتے ہیں۔ اپنا آپ اللہ کی رحمت کے حوالے کرنے کے بعد دنیا کو بدلنے کے لیے تیار ہوتے ہی ہیں، انسان خود بھی تبدیل ہونے لگتا ہے۔

تعمیرات دان، Analyst اور Psychiatrist جہاں پہنچ کر بے بس ہو جاتا ہے، دعا سے وہی مقام مل چھپکتے ہیں، یہاں بن جاتا ہے۔ غزنی کے اپنے بکھیڑے ہیں، لیکن امیری بھی کچھ پھولوں کی بیج نہیں۔ یہاں وہاں مسائل ملتے ہیں۔ مسائل ختم نہیں ہوتے۔ انسان کو جس اطمینان قلب کی ضرورت ہے، اپنی ذات کی جس تبدیلی سے اسے رحمت عطا کر سکتی ہے۔ وہ سوائے اوپر والے کے اور کہیں سے نہیں مل سکتی اور اللہ بھی آرزو مند ہے کہ ہم اس سے دعا کریں۔ اس کے کوئی اور روزہ نہ کھکھائیں۔

تعمیرات سے نکل جانے والے کے لیے دونوں جہاں میں پناہ ہے۔ وہ نہ صرف اداسی، بددلی اور بدحوصلگی

سے نکل جاتا ہے، بلکہ صرف اللہ سے مانگنے والے اس درجہ مضبوط، خود کفیل اور استقامت پسند ہوتے ہیں کہ پھر انہیں سے خوف نہیں آتا اور اس کی اس تبدیلی سے کئی بدنی، ذہنی، عقلی تبدیلیاں خود بخود اس کا نصیب بن جاتی ہیں۔

لیکن یہاں پہنچ کر پھر توقف کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کبھی کبھی دعا بھی کارگر نہیں ہوتی اور لوگ برس اس ریاضت کا سہارا لے کر بدل ہو جاتے ہیں۔ کبھی ایک مرتبہ مانگی دعا قبول ہو جاتی ہے اور سارے دلہے جاتے ہیں۔ انسان کا علم قلیل ہے اور جتنے نفوس ہیں، اتنے راستے اللہ کی طرف جانے اور اطمینان پانے کے ہیں۔ کم مجھے یہی راستہ سمجھ میں آیا ہے یعنی ہاتھ باندھ کر یقین محکم کے ساتھ اللہ کے حضور دعا مانگنے والا عموماً خالی ہوتا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

خاں صاحب کا خاندان موروثی اور جملتی طور پر گونگا ہے۔ یہ غم کا اظہار واویلا ڈال کر نہیں کرتے نہ محبت ہی کو ظاہر کرنے کے لیے تالیوں، قہقہوں یا چیخوں کا سہارا لیتے ہیں۔ بد قسمتی سے ان کو عموماً ایسے جیون ساتھی ملے جو جذبہات کا برملا اظہار کرتے تھے۔

جب اسحاق بھائی ایئر فورس چھوڑ کر مزننگ روڈ میں آئے تو پہلا شمدیر ڈائل ذکیہ اور اماں جی میں اسی طرح بدولت پیدا ہوا۔ ذکیہ جی نے واصف کی سالگرہ منانے کا پروگرام بنایا۔ یہ سالگرہ کچھ آج جیسی پُر بہار دعوت نہ تھی۔ منانے اور سجانے کا اہتمام کچھ کم نہ تھا۔ ہم بھی ایک معمولی سا تحفہ لے کر پہنچ گئے۔ باباجی کے ملحق لمبے کمرے میں میز پر ایک پر موم بتیاں روشن تھیں۔ گھر کے دوسرے افراد باباجی ضیا بالو بھائی اور بچے موجود تھے۔

آفتاب بھائی اور خالد میاں بھی کچھ پریشان کچھ محبوب سے کھڑے تھے۔ اماں جی بار بار چہرہ پونچھتی تھیں اپنی ناخوشی کو چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ججو بھائی بھی At ease نہ تھے..... لیکن سب سے بڑی بات کہ ذکیہ کی انفریشن کے باوجود باباجی محمد خاں عین بروقت گھر سے نکل گئے..... اس کا مال ذکیہ جی کو برسوں رہا لیکن میں نے اس کی حالت دیکھ کر نصیحت پکڑی کہ پھر کبھی بچوں کی سالگرہ منانے کی کوشش نہ کی۔

میری بیچاری بڑی بہو غزل کو بھی ایک تجربے سے گزرنا پڑا۔ اس نے اپنی بیٹی ارشیا کی سالگرہ بڑی دلچسپی سے منانے کی کوشش کی۔ دیکھیں پکوائیں، بڑا سا ایک بیوں سمیت میز پر حاضر تھا۔ کھانے اور چائے دونوں کا اہتمام (غزالہ) غزل ایک زندہ دل ہنستے کھیلتے گھر آنے کا فرد تھی۔ وہ ہند مٹھی کا فلسفہ نہ جانتی تھی۔ محبت کا اظہار اور گرم چٹائی کے لیے نیچرل تھی۔

جب میز جگ گئی۔ بستیاں روشن ہو گئیں۔ سب تالیاں بجانے اور پپی برتھ ڈے گانے کے لیے میز کے گرد گئے تو انیق کو جانا، جانا کہہ کر غزل تلاش کرنے لگی..... کمروں میں لان پر سب جگہ تلاش کیا گیا..... لیکن جاناں جاناں انیق اس وقت لوٹے جب برتن واپس باورچی خانے میں جا رہے تھے۔

انیس بیٹا اپنی کارکردگی دکھانے اور اس پر داد حاصل کرنے میں نہیں پڑتا تھا۔ کام بھی اس طرح کرتا کہ شرمندہ کرنے کی نوبت نہ آئے۔ اسی کے گرد ہولے ہولے 121- سی میں دوستوں کا مجمع اکٹھا ہونے لگا، لیکن دوست اس گھر میں وہ بھائیوں کے ساتھ شیمز کرتا۔

ڈویژنل پبلک سکول سے اس کے ساتھ قاسم اور لیس اور وسیم قاضی آنے لگے۔ یہ بچوں کی سعادت مندی ہے۔ کھیل کود اور گپ شپ کو ماں باپ کے ضروری کاموں میں مخل نہیں ہونے دیتے تھے۔ کبھی کبھی راتوں کو یہ گھر پر باہر نکل جاتے۔ تب ہی انہوں نے روجی کی فوکسی کار چلانی سیکھی۔ جب روجی باجی ان کے کمرے میں سو جاتی ہے تو اسے نکلتے۔ کار چراتے اور باہر نکل جاتے۔ ان دنوں شہر میں امن تھا۔ گیٹ کو تالا لگانے کا رواج نہ تھا۔

سب سے پہلے انیس نے ڈرائیونگ سیکھی۔ اس کے بعد باری باری سب کا جھا کا کھلا۔ جب کبھی ثاقب شہاب کی قیام کرتا تو رات کو یا تو آموں کی بیٹیوں سے آم چرائے جاتے یا باورچی خانے کا دروازہ بند کر کے ان سے کھانا کھا جاتا۔ نیبل اشتیاق کو انڈوں کا شوق تھا۔ جب بھی وہ ہمارے گھر شب ب سری کرتا خوب خوب انڈے تلے تھے۔ گھر نہ ہوتے تو پیسے ڈچ کر کے انڈے لائے جاتے۔

میں تصدیق کرتی ہوں عمو ماں باپ اولاد کے حق میں جو کچھ بھی کرتے ہیں اس کے متعلق بچے اچھی رائے نہیں دیتے۔ اس سلسلہ میں خاں صاحب نے اپنی سی کوشش ضرور کی۔ جب اینیق پروفیسر ہوئے تو فوکسی کا ڈبہ اسے دے دیا۔ اینیق کو شوق تھا۔ اسی ڈبے پر اینیق اپنے شاگرد بنھا کر گھراتے۔ ان کی مفت یوشن کرتے۔ گھر پر کھانا کھلاتے اور پھر شاگردی پر اوڈ کر کے واپس کالج چھوڑ آتے۔ گرو چیلے کی ایک اچھی مثال اینیق بیٹے نے اپنے شاگرد کو پیش کی اور ابھی تک اینیق خاں کو امریکہ ہجرت کیے پندرہ سال ہو گئے ہیں ان کے بعض شاگرد ان کے ساتھ رابلے کیے ہوئے ہیں۔

انیس جب پی آئی اے میں ملازم ہو کر کراچی سدھارے تو ابو نے اپنی فوکسی اسے بھجوا دی۔ یہ ضرور ہے کہ وہ ملازم کے ملازم تھے اور انہیں سرکاری گاڑی ملی ہوئی تھی، لیکن وہ چاہتے تو فوکسی کو گھر یلو استعمال میں رکھ سکتے تھے۔

گھلاڑی ائیر نے جب بی اے کے بعد ایک "میڈاس" (Midas) نامی ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں ملازمت کر لی تو صاحب نے اس کی عزت نفس کو بھائیوں کے مقابلے میں قائم رکھنے کے لیے ایک سیکنڈ ہینڈ مورس خرید کر دی اور اسے اس پر اپنے کام پر جانے لگا۔ اس زمانے میں ایسی فراخ دلی ہمارے عزیزوں میں کسی نے بھی اولاد کے متعلق نہیں کی تھی۔ خاندان میں چرچے ہوتے کہ شوق غلط مثال قائم کر رہا ہے اور اپنے بچوں کو بوگاڑ رہا ہے۔

بہر کیف اسی فوکسی ڈبے پر ان بچوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ جادوئی سفر بھی کیے۔ یہ پروگرام ہم سے یہ عیب کر بنایا گیا۔ لیکن آخراجازت طلب کرنے کے لیے اینیق کو ابو کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ رات کے وقت خاں نے مجھ سے کہا..... "قد سہ ایک مشکل ہے" میں گھبرا گئی۔

"جی؟"

"بچے فوکسی ڈبے پر خیر اگلی جانا چاہتے ہیں۔"

"تو جانے دیں..... جی" میں نے ہمیشہ کی طرح بے گجھی سے کہا۔

"خیر ٹھہرنے کا انتظام تو ہو جائے گا۔ وہاں اپنا چھوٹا سا بیرک نما گھر ہے..... ٹھیکیداران کا خیال بھی رکھے گا....."

"جی لیکن کیا؟"

”آخر بچے ہیں..... نا تجربہ کار..... بے سمجھ..... سفر چھوٹا ہو یا بڑا..... اس میں Hazards تو ہوتے ہیں۔ وہ رات ہم نے الگ الگ سوچنے میں کاٹی..... پھر ہمیشہ کی طرح ناشتے کے وقت ایک حل مجھے سوچو۔“

”خاں جی! اگر ریزی بھائی ان کے ساتھ چلے جائیں تو کیسا؟“

کچھ دیر تامل کے بعد خاں صاحب نے کہا..... ”ٹھیک ہے..... پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

بچوں کو اطلاع دے دی گئی۔ وہ خوشی سے ماموں کو منانے چلے گئے۔

ریزی میں ایک کھلنڈرے بچے کی روح بسی ہے۔ دھرم سالہ کے پہاڑوں کا عاشق، بچوں کا بچوں کے بے تکلف دوست، فوراریڈی سٹیڈی (Ready Steady) ہو گیا اور جادوئی سفر کی تیاریاں جن میں ہم دونوں تھے کر لی گئیں۔ ان کے دوستوں میں قاسم اور لیس، وسیم قاضی، شاہد خاں لسٹ پر تھے۔ تو صیف احمد خاں نے فوراً اجازت مل گئی۔ جادو تو ازل سے ایڈوانسڈ ہے، تجربہ نیا ہو اس میں کیسی مشکلات کیوں نہ ہوں۔ اس سے باز نہیں آتا۔

ہمارے پڑوس میں ہی اور لیس صاحب رہتے تھے۔ انہوں نے دو ٹوک قاسم کو اجازت نہ دی۔ بچے واپس آ گیا۔ اب انیق اور انیس اسل کے پاپا کے پاس پہنچے۔ انہیں بتایا کہ سارا کام ماں باپ کی آشیر باد کے ہے۔ ماموں کی مہربانی بھی ہو گئی ہے اور وہاں خیراگلی میں ہمارا اپنا تین کمرے کا گھر ہے۔ اس میں رہنا ہوگا۔ قاسم کو بھی اجازت مل گئی اور بچے فوکسی کے ڈبے پر روانہ ہو گئے۔

جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے غالباً سب نے برابر جوڑ کر رقم مہیا کی۔ زیادہ وقت گزاری تو چلائی۔ راستے میں اونچے اونچے گائے گائے گئے۔ جگہ جگہ رک کر کھانا اور چائے نوش جان کی گئی۔ خیراگلی میں چابی لے کر اندر سامان اتارا۔

خاں صاحب نے کبھی منہ سے اظہار نہیں کیا لیکن مجھے علم ہے کہ انہوں نے خیراگلی کا گھر میری سیٹھا تھا۔ انہیں علم تھا کہ میرا پہاڑوں سے کتنا پرانا ناٹھ ہے۔ جب ہم 121- سی میں آئے تو خاں صاحب کو پتہ چلا کہ فوجیوں کی بیرکیں بک رہی ہیں۔ انہوں نے پتہ نہیں کب اور کیسے کتنے پاپر بیٹل کر پیسے اٹھائے کر کے یہ بیرک خریدیں۔ یہ ساتھ ساتھ جڑی ہوئی بیرکیں تھیں جو اب فوج کے استعمال میں نہ تھیں۔ مین بازار سے اوپر کی طرف چڑھ کر آگے تھوڑا سا کھلا احاطہ تھا۔ تین میڑھیاں چڑھ کر اوپر ایک سادہ سادہ سا دروازہ کھلتا تھا۔ پھر تین کمرے سا کمرہ۔ سامنے والے کمرے کو خاں صاحب نے مہمانوں کے لیے مختص کر دیا۔ اس کے بعد والے کمرے کو کھانا بنا دیا اور اس کے ساتھ والے کمرے کو ہمارا بیڈروم قرار دیا۔

یہاں پر چار پائیاں، تیل کا چولہا، دودھ، مکھن رکھنے کے لیے ڈوولی خاں صاحب نے لوڈر میں رکھی تھیں۔ ساتھ سامنے بٹھایا اور ہم راہر پلنڈی سے ہو کر خیراگلی پہنچے۔ ایک بار پھر انہوں نے ٹھیکیدار محمد حسین سے چابی مانگ لی۔ میرے سپرد کر دیں اور مجھے گھر کے اندر داخل ہونے کی دعوت دی۔ بچے اپنے ”جادوئی سفر“ پر اسی خیراگلی کی ٹھہرے۔ یہاں وہ خود ہی پکاتے رہے۔ روٹیاں حسب توفیق انیق احمد کی ذمے داری ٹھہری..... نہ پکا سکتے تو پتھر

تھے اسی جادوئی سفر کے دوران انہوں نے ایبٹ آباد، جھیل سیف الملوک اور اردگرد کی پہاڑیوں کی سیر کی۔ ان بچوں کے ساتھ سچ کا اندازہ آپ اس معاہدے سے کر سکتے ہیں جس پر سفر سے پہلے تمام ممبران کے دستخط کرائے گئے۔

”کنٹریکٹ جادوئی سفر“

شاید آپ اسے توضیح اوقات سمجھیں لیکن میں آپ کو صرف ایک نظریہ سمجھانے کی خاطر بار بار ایک ہی طرف تکرار کرتی ہوں۔ انسان اپنے Genes کا مجموعہ ہے۔ جو کچھ باپ دادا وراثت میں دے جاتے ہیں اس کا ذکر مذہب سے گنہگار بار آتا ہے کہ ہم تمہارے باپ دادا کے گناہوں کو وراثت میں تم تک پہنچاتے ہیں۔ نیک اعمال پر آمادہ کرنے کے لیے کاروائی روکنے کا یہ بھی ایک طرح کا روحانی طریقہ ہے..... Genetic انجینئرنگ اسی سلسلے میں کئی قسم کے معجزے ممکن ہیں۔ دوسری طرف ماحول کی تربیت انسان کی شخصیت ڈھالنے میں کچھ کم کارگرتا بت نہیں ہوتی.....

ضیاء الحق

ایبق احمد کے دوست ضیاء الحق ہر وقت کے ساتھ رہنے والے نہ جانے اس سفر پر اس کے ساتھ کیوں نہ گئے۔ ایک دن پچھلی گلی 65- سی میں رہتے تھے۔ یہ کٹھی ان کے والد اور ان کے بھائیوں کی سانجھی ملکیت تھی۔ رات کے وقت دوست سائیکلوں پر نکلنے اور پیسے چندا کر کے نان چھوٹے کھانے جاتے تو ضیاء ساتھ ہوتا۔

روحانی باجی کی ہنز فو کسی عموماً ہمارے گھر میں ہوتی۔ روحی تو مزے سے اندر سوراہتی لیکن یہ سچے اس کی گاڑی نکال کر بیٹھ سکتے۔ ضیاء اور ایبق اس عمل کو چوری سمجھتے تھے اور اس کڑوت میں شمولیت نہ کرتے لیکن انیس تو صیف اور سید وسیم نے اسی گاڑی پر ہاتھ سیدھا کیا۔

ہوتے ہوتے جب ایبق پروفیسر بن گئے اور اپنے شاگردوں کی تعلیم و تربیت میں بہت سر دھڑکی بازی لگا رہا تھا تو ضیاء نے ایک اور روپ دھارا۔ ضیاء کے گھر میں نیولپ روز پھولوں کی کھاریاں لگی تھیں۔ اس کے ہاتھوں میں ان کے پھولوں کا گلہ دستہ ہوتا اور وہ یہ گلہ دستہ مجھے پیش کرتا۔ پتہ نہیں اسے کس کشف سے علم ہوا کہ میں اس پھول کو بے حد پسند کرتا ہوں۔ کچھ وقت اسی طرح گزارا۔ پھر مجھے ضیاء ہی سے علم ہوا کہ وہ ایکٹرنیٹ کی شدید خواہش رکھتا ہے۔ اسی سلسلے میں ایک ڈیڑھ گھنٹہ بھی جا چکا تھا، لیکن ڈائریکٹر اس کی پہنچ سے باہر رہے۔

دونوں زین العابدین ”سدرہاں“ کی تشکیل دینے میں مشغول تھے۔ میں نے زین سے التجا کی کہ وہ ضیاء کو ہمیں ایک اہم رول عطا کریں۔ زین ازل کا مروتی فوراً رضامند ہو گیا اور اس طرح ضیاء کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔

لیکن کچھ عرصہ بعد ضیاء نے ایک نیا پروگرام بنا لیا۔ ایکٹرنیٹ کچھ اس کے مطلب کا پروفیشن نہ بن سکی۔ ضیاء نے کینیڈا کے لیے ہجرت کی اور وہیں ایک مسلمان خاتون سے شادی کر لی۔ چھ سات بعد ضیاء اپنی بیوی اور بچہ کا مران کو لے کر پاکستان لوٹا۔ ڈور تھی مجھ سے ایسے ہیجے واقعی میں کا مران کی دادی تھی۔

ابھی خاں صاحب کی تیسری برسی کے بعد دسمبر کے مہینے میں ضیاء الحق اپنی بیٹی ”سوزاں“ کے ساتھ ہمسایہ کے گھر سے اتر آتی پرانی واقفیت کے باوجود ضیاء الحق کو اچھی طرح جاننے کا موقع پہلی بار ملا۔

کینیڈا میں ضیاء کے پاس گیارہ بارہ بیکریاں تھیں جنہیں بیچ کر کئی دکانیں ویڈیو شاپ کی وائنڈ اپ کے بیس سال بعد وطن اس امید پر لوٹا تھا کہ بالآخر یہیں اپنے بیوی بچوں کو سیٹل کر لے۔ اتنی دیر بعد جب کوئی شخص مغرب لوٹتا ہے تو اس کے پاس معاشرے کو ناپنے کے دو معیار ہوتے ہیں۔ وہ ایک طرف ہو کر سوچ نہیں سکتا اور عموماً تذبذب سے رہتا ہے۔ غالباً ضیاء بھی یہی سوچتا رہا تھا کہ کہاں رہنے میں اس کا گھر انہ بہتر زندگی بسر کر سکتا ہے۔

پتہ نہیں وہ کس فیصلے پر پہنچے لیکن میں ایک سوچ میں مستحکم ہو گئی ہوں۔ مغرب نے ضیاء میں بڑی خوبیوں کو پیدا کیا ہے۔ پہلے بھی وہ دینے والوں میں سے تھا فقط اس کے پاس دینے کے لیے پھول تھے۔ اب جب اس کے ہاتھوں میں روپے پیسے کی ریل پیل تھی وہ دائیں بائیں یہ نعمت بانٹنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔

ہم بھی خوب لوگ ہیں۔ موقع تازہ اور خود غرض۔ غالباً اسی لیے ہماری غریبی سے نجات ہو نہیں پاتی۔ سنا ہے کہ کسی بادشاہ نے خانہ بدوشوں کے پاس پڑاؤ کیا۔ ان غریب لوگوں کی بد حالی دیکھ کر شاہ نے ان سے کام لیا۔ کھلے دل سے ان پر اپنی دولت نچھاور کر تا رہا حتیٰ کہ جس صبح بادشاہ نے کوچ کا اعلان کیا راتوں رات غریب بستی نے بادشاہ کے خیموں پر شب خون مارا۔ سارے اونٹ کھول لیے۔ خدمت گاروں کو ختم کر دیا۔ خیمے ساتھ ساتھ کر چھت ہو گئے۔ جب صبح بادشاہ کی آنکھ کھلی تو ہر طرف اجازت نظر آیا۔ حتیٰ کہ خانہ بدوش اس کے بال تک کاٹ کر ہٹ لے گئے۔ بادشاہ خاک چھانتا پاؤں پیدل اپنی منزل کو روانہ ہوا۔

ضیاء کے ساتھ بھی یہاں ہم سب نے یہی سلوک کیا۔ دائیں بائیں ہر طرف سے لوٹ کھسوٹ مچ رہی تھی۔ کیا کیجیے کہ ہم اپنی غریبی کا مدد اسی طرح کرنے کے عادی ہیں۔

ضیاء کے تین بچے ہیں کامران، سوزاں اور کیمرا۔۔۔۔۔ سوزاں کا نام فرانسیسی اور اسلامی ہے۔ وہ اسلامی عقائد کو کرتی ہے اور اپنا دوسرا نام آسیہ کم ہی استعمال کرتی ہے۔ خاموش، خوبصورت اور پڑھا کو ”سوزاں“ اس وقت تک مارکیٹنگ میں بی بی اے کر چکی ہے۔ یہاں اس نے انیس بیٹے کے پاس رہ کر ایک Orientation کورس بھی کیا جو اس کی تعلیم کا حصہ ہے۔

میں سوزاں کے متعلق اس لیے تفصیل سے لکھ رہی ہوں کہ اس نے یہاں رہ کر مجھے ایک لمحے کے لیے اجنبیت کا احساس نہیں دلایا۔ وہ اس محبت سے مجھے ”داوی“ پکارتی رہی کہ واقعی سچ لگتا۔ ہر جگہ مجھے سہارا دینے کے ہاتھ پکڑ کر چلتی۔ کھانا ڈال کر دیتی، رضائی اوڑھ دیتی۔ انیس اور اشیر سے کچھ ایسا ”چاچو چاچو“ کہہ کر پیار کرتی کہ گتے تھے سگی بھتیجی ہو۔

میں چونکہ خوشامد پسند ہوں اس لیے مجھ پر اس کی ان اداؤں کا گہرا اثر پڑا ہے۔ سوچتی ہوں کہ سوزاں کو اتنی محبت کیا اس کی مغربی ماں سے ملی کہ اس میں ضیاء کے لہو کی تاثیر ہے۔۔۔۔۔ شاید کچھ کچھ دونوں طرف سے یا شاید ساری کی ساری اس کی اپنی کوشش ہو۔

صرف اللہ ہی جانتا ہے۔

تخلیقی کام کی میرے تینوں بیٹوں میں اُنچ تھی۔ وہ اپنے Genes کے ہاتھوں مجبور تھے۔
اشیر احمد کی کچھ تحریریں ملاحظہ ہوں:

تقسیمیں

تحریر پیش از تخلیقی کام

اے اللہ ہم پر تو ہمیشہ
اپنا فضل قائم رکھیں تاکہ ہم
اس دنیا میں کامیاب ہوں
ہماری دعا جزی پر ہو
نہ کہ خوف پر ہو

تو سب سے بڑا اور نہایت ہی مہربان ہے
اللہ تیرا سایہ مجھ پر
اور میرے گھر والوں پر ہمیشہ
قائم و دائم رکھ۔
آمین

(1)

آج میری وجہ سے بالکل نہیں
بس جو بھی ہے وہ اوپر کی ذات ہے
باقی سب ایک دم سب جھوٹ
کیا لکھوں بس دعا ہی دعا ہے
کہ سب کچھ اس کی اور میری
خوشی سے ہو جائے
کوئی ایک خیال ہی انسان کی نجات کا سبب
بن سکتا ہے

اللہ کا ذکر ہی وہ نجات ہے جو ایک خیال ہے
 باقی سب مسئلے ہیں
 کہ کیا ہے اور کیا نہیں۔ یا اللہ
 بہت دنیا کا رنگ دیکھ لیا
 اب کچھ اپنا بھی رنگ
 تو دکھا

(2)

یہ خیال کیوں کب اور کیسے
 ایک غیر اختیاری سوچ دماغ میں آئی جو
 آپ کے محبوب کے خلاف تھی
 آپ نے دن رات اسی سوچ میں گزار دیئے
 کہ یہ کیوں آئی جب کہ
 یہ تو ایک بہت نادر مل ساقنہ ہے
 تمہہ ہے..... تمہہ در تمہہ

(3)

ڈرنقہ جیسی چیز ہوتی ہے
 اس کو ایک دفعہ میں
 جسم سے نکلنا چاہیے..... ورنہ
 اس کے ہاتھوں ہم پھر تنگ رہیں گے
 مضبوطی اور پھر مضبوطی پھر
 قوی پھر قوی پھر ایک دم قوت
 اور پھر قوت..... صرف ایک اس
 کو کہنا یا آج سے ختم تو ہمارا
 دوست سہی لیکن ہم تمہارے نہیں
 اگر ساتھ چلنا ہے تو
 اس کی مان؛ جس نے مجھے

اور تجھے پیدا کیا
 اور پھر بس ایک دم چھٹی
 نہ کوئی بندہ نہ کوئی فقیر بس
 سب ولی ہی ولی
 ایک دفعہ بس صرف
 ایک دفعہ..... ورنہ ہمیشہ
 کی ناکامی ہی ناکامی

یہ نہیں کب اور کیسے اینق بھی لکھنے کی طرف مائل ہو گئے۔ یہ نظمیں کچھ انگریزی میں تھیں کچھ اردو میں۔ بعد ازاں وہ ٹیلی ویژن ڈرامے کی طرف بھی جھک گئے، لیکن یہ سارے کام جزوقتی تھے۔ ان پر وہ توجہ نہ دی گئی جو اس حدت آڈٹ کی طرف متوجہ کر دیتا۔ انہیں ٹیلی ویژن کے ڈراموں پر ایوارڈ بھی ملا لیکن ایوارڈ ہمارے گھر میں جس سے ہمیں سے دوچار ہوتے تھے وہ آپ کو معلوم ہی ہے۔

اینق کے ڈراموں کی کتاب سنگ میل پبلشرز نے ”آب و دانہ“ کے نام سے چھاپ دی ہے لیکن نظموں کی کتاب بھی کسی سے رجوع نہیں کیا گیا۔ یہ نظمیں آپ کی تفریح طبع کے لیے درج ذیل ہیں۔ اس کے علاوہ وہ تحریر جو انہیں آپ کے جانوروں سے محبت کے حصے میں ملاحظہ کریں گے۔

ان تحریروں، نظموں کا ذکر اس لیے کیا کہ اشفاق صاحب کے بیٹے ان کے بہن بھائی سب کی تحریروں میں شامت ہے اور یہ مماثلت ان کی وراثت سے Genes کی شکل میں پہنچی۔ صرف ان سب نے خاں صاحب کی طرح اس حدت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔

جو بھائی نے ارشیا کے متعلق جو نظم لکھی تھی، وہ بھی Genes کے ضمن میں ایک پروف ہے۔
 یہ نظم اسحاق بھائی نے اینق کی بیٹی ارشیا کی پیدائش پر لکھی۔

ارشوبابا

بابا کا ارشوبابا کا ارشوبابا

داوی کی یہ جان ہے کہاں سے آئی ہے

یہ پھولوں جیسا چہرہ پاکیزہ بھولا

یہ پریوں کی شہزادی ہے کہاں سے آئی ہے

ماموں کا یہ کھلونا ایک خواب سا سہانا

ماما کے دل کی جان ہے کہاں سے آئی ہے

بشی کو وہ بلائے شامیوں کو وہ ستائے
 دونوں کی وہ جان ہے کہاں سے آئی ہے
 نانا نانی سے پوچھو پڑ نانی سے بھی پوچھو
 اس چڑیا پر قربان کہاں سے آئی ہے

(غزل کی ہمیں بشریٰ اور شہناز)

انیق احمد کی چند انگریزی نظمیں

Aneeq ahmed

1. Me and You

I walk alone in rain,

Keeping your image warm in my heart.

Making sure of what remains and what's lost.

There you stand in the middle of the painted blue fog,

Clear and unpredictable.

Hissing winds charge and bruise

My hands are clutched to the frame

Frame of my mind,

Gripped

I see a star and a flower floating near you

Stemless, breathless.

Newness is now an illusion,

A suffering of my own

A pain I wanted to disown.

2. A weak heart have I.

A weaker throb it has.

A few things to share,

And even fewer to bare.
I have a deep seated soul,
And even deeper is its hole.

Let me predict fortune,
That God sends me.
I hope to be humble
And for no one else to see.

3. A drum to tune
The sum immune
The long felt pain
Of a song in rain,
On a picturesque plain,
You may find a lane
In this world profane
Driving lane in lane

Noki

شاید کل کی اچھی گزرے
شاید موسم اچھا ہو
شاید ہند کے پردے میں سے
چڑھتا سورج پورا ہو
شاید بے کل کل نہ ہووے
شاید چھوٹا رستہ ہو
شاید باغ درتچے میں اک
جانا جانا چہرہ ہو
شاید رت رنگین ہو جائے

شاید بادل چھایا ہو
 شاید میرے شور کے اندر
 اک سناٹا غالب ہو
 شاید سب کو وہمہ گزرے
 شاید پاگل راضی ہو
 شاید خود سے باتیں کر کے
 اپنا خواب ہی سچا ہو

Noki

جن دنوں گھر پر نوکی اور خاں صاحب کی وجہ سے شاعری کی فضا قائم تھی۔ یہ تخلیقی اعتبار سے ایک نیا تجربہ تھا۔ خاں صاحب میڈیا میں قدم جما چکے تھے۔ رسالے نکالنے کی حسرت نہ رہی تھی۔ کہانی کار تو وہ ازل سے تھے لیکن اسے فیلڈ میں نہ تو وہ اپنا لوہا منوانا چاہتے تھے نہ انہیں اس کی ضرورت ہی محسوس ہوتی تھی۔ ان کی کہانی "گڈ ریا" نے وہ دھوم مچا رکھی تھی جو دس بارہ افسانوی مجموعے چھاپ کر بھی کسی ادیب کو محسوس نہیں آتی۔ شاعری کے میدان میں ابھی انہوں نے قدم نہ رکھا تھا۔ پھر غالباً 1974ء میں ان پر پنجابی کی نظمیں موسلا دھارے کی طرح برسیں۔ "کھٹیا ونیا" میں ان نظموں کو یکجا کر کے سنگ میل پبلی کیشنز نے فوراً چھاپ دیا۔ انیق بیٹے کی نظمیں گوجھپ تو نہ سکیں لیکن اکٹھی ہوتی رہیں۔ اس میں بھی ہماری ہی غفلت رہی کہ ہم نے اس کے اس کام کی طرف توجہ نہ دی۔ عموماً والدین بچوں کی کارکردگی کو کاٹا اور لے دوڑی کے تحت فوراً ترقی کے زینے میں دھکی دیتے ہیں لیکن ہمارے گھریلو ماحول میں اس طرح کی توجہ پنپ نہ سکی۔ یہ کام الہیہ ضرور ہوا کہ میں ہمیشہ کی طرح خاں صاحب اور انیق سے متاثر ہو کر نظمیں لکھنے لگی۔ اردو اور پنجابی میں بیشتر نظمیں تو ضائع ہو گئیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ کچھ انگریزی کی نظمیں ابھی زمانے کی دست برد سے بچ گئی ہیں۔ آپ کی خدمت میں دو ہرائے دیتی ہوں۔ چونکہ یہ نقل کا کام تھا۔ اس میں اُچھ اور صلاحیت نہ تھی اس لیے جلد ہی یہ نسخہ سوکھ گیا۔

ریفری سیٹی و جا کے

کورواں تے پانڈواں نوں وردی پوا کے

یدھ کراوے

فاؤل دساوے

جت ہارتے مہر لگاوے

گی جی گیندوں کسے وی نہ پھیا!

کہوڑے پاسے بوتاماریا

تے کہوڑا پاسا جتیا؟

☆☆☆

آجڑے گھراگے کتاروے

توین مکان اگے

نوئی کرلاوے

سینہ وچ بھگی لان نوں

پانی دیندی جاوے

سجی اوتے پے پے کے رون آلیا

تاپ جے نہ چڑھدا؟

تے علاج کنویں ہندا

☆☆☆

گھردا بڑا ای چاسی

گندھے کوٹھے باریاں

رنگ برنگے شیشے

باہر جان وے راہ بڑے سن

پر گھردا ملیا نہ راہ

گھردا بڑا چاسی

☆☆☆

کیویں اسی دکھ ہوئے ایدا کی تارنا

کھریا اسی بھل گئے تیتھوں چندوارنا

ڈٹی ہوئی بیڑی نوں ربا کج تارنا

ہنجواں دی کھیڈ وچ جتنا وی ہارنا

ٹٹی ہوئی منجی اوتے

☆☆☆

کب چھٹی ہوگی اس جگ سے

کب اپنے گھر کو جائیں گے

کب اپنی جان بچائیں گے
اور سب سے جان بچا کر پھر
ہم روئیں گے
ہم گائیں گے
مکھی، مچھر اور چیونٹی کا

جب بکس بدلنا جائے گا
چھلی مینڈک اور لدھر سے
جب سارے ناتے ٹوٹیں گے
جب لمبی تان کے سونیں گے
اور لمبی تان کے سو کر پھر
ہم روئیں گے
ہم گائیں گے
کب چھٹی ہوگی اس در سے
کب اپنے گھر کو جائیں گے
☆☆☆

پتی دھرم نوں پالنا
بن چھیکا دے ریکٹ وچوں
چیوتندوں پارنا
چلگا جت جتا کے
پہلے بھوگ اچ ہارنا
پتی دھرم نوں پالنا
☆☆☆

انت دا کھردا بولنا
تے روح دی دینی مار
کہندے نے اوہ میرا سی
پر کدی نہ لکھیا یار
☆☆☆

ٹٹی ہوئی منجی اوتے بیٹھی آں سرہانے

دل بھیڑا آج میرا آؤندا نہیں ٹھکانے
 جدوں جدوں آوے میری جنڈری تے چھاں جی
 نکاں ہتھاں پیراں نوں تے جاوے جند جان جی
 یہ کنی داو یلا آ یا سبھے نہ کوئی تھاں جی
 کھڑے پاسے جاواں تے میں پچھاں تیراناں جی
 نئی ہوئی منجی اوتے

If all my life was not so
 Pledged,
 Pawned
 Or sold not,
 If I could wriggle out a complete moment of paper
 Vellum,
 Or clean dust
 If it was possible to adorn that movement with a kiss,
 Name,
 Or a tear
 It would be easy to leave this quagmire life like a king,
 Lover
 Or a saint
 Bano

Last night,
 A shivering moon turned from my window
 To your door.
 Shamefacedly knocking,
 Begging for a little warmth.
 Did you in all austerity
 Close the door on his face too?

Poor runaway from universe!

Bano

I love small flowers,
 Songs that last
 Only on house
 And seasonal lore.
 All recess
 In festive dress
 Into oblivion
 Never do they vie or dream
 of eternity
 Yet leave a place for
 More flowers
 More love
 Shining stepping stones to walk on
 Through a long journey.

Bano

A Lament

There is a tawny patch
 That smears the lush green turf
 It will not heal
 It will not heal.

Sane tunes like an eagle
 Just ready to fly
 In the morning light.
 Shapes into a receding triangle
 In dusty eyes
 Closing its desert ache.

Sometimes in hoary twilight

It melts into a wooden cross

Forsaken

It will not heal

Though watered by my tears

It will not heal

This tawny patch of green

That smears the lush green heart

It will not heal

It will not heal

It will not heal

I caress your memory

Like a little girl cuddles a dead kitten

Gone for ever

Yet not buried deep

It is feckless to love:

Broken tumblers

Men in air flights

And flowers of Leningrad

Loitering on a soldier's grave.

Bano

Rolling from east

Rolling from west

Fog rolls fast into the rest

Doors and windows clench their teeth

Hoping and fearing night hide
 That other side of the street
 May not be lost for ever
 Who is she?

Ah! Who is she?

Who came like the fog?
 But stayed like the rock
 Barring all view
 To windows to doors
 Open but blind
 To the other side of the street.

Bano

If I were allowed
 To comfort love or cherish you

By people around
 Who abound

The world at large
 Like elves or archers

If I were allowed

To comfort love or cherish you

By myself

Who cheats

And lures to desires anew

Life's gasoline

If I were allowed

To comfort love or cherish you

By providence

Who likes to paint every door
 With wash and wear sane bows to synthetic tears
 It I were allowed

To comfort love or cherish you

I would decide

Life had been on my side

As I'd bang along

Through dreary life waving to all

Bano

For you to me

To erk the dark

Not for each other

But for the late rising morn

Wither is day's celestial light

Wither is yester-morn's glory fled

Your tears flow over my cheek

Mine unknown

Follow yours into

Nothingness

We simmer in Ice droplets

Not for each other

But what has been once

Is no more

And never shall be

Bano

Let a moment come nude to me

Curved
 Arched
 Throbbing with light
 A vision of you
 A vision of you
 Let the moment speak
 Only of you
 Stay, wink, lean then depart
 Un-touched
 To lie on the couch of time
 Copulating with eternity

Bano

Days back I saw your spectacles
 Tainted with dust of me
 Last night I heard your
 Bare feet
 Followed by a smothered cough
 Today I perceived
 A patch of green
 Un-tended
 Not watered
 Hopefully wailing
 For the pigeon in the sky

Bano



خاں صاحب کا سیاسی مسلک

بڑے آدمی کا نصیب یا فیصلہ یا مجبوری ہمیشہ ایک رہتی ہے۔ یہ روایت مسلمانوں میں چودہ سو سال پرانی ہے۔ گھر تو دوستوں اور خاندان دونوں کو حرز جاں سمجھتے لیکن اُن کے وصال کے بعد دوستوں اور گھروالوں میں محبت کی تفرقہ بیدار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے شیعہ اور سنی کے قابلوں میں ڈھل گیا۔

برصغیر میں قائد اعظم کی زندگی بھی اسی ڈویژن کا شکار ہوئی۔ گھروالے کہیں رہ گئے، فردا کیلا اپنی تلاش کا شکار ہوا۔ قائد اعظم نے پاکستان تعمیر کیا تو اُن کے گھروالوں میں سے کوئی اُن کے ساتھ نہ تھا۔ ویسے تو قائد اعظم کی ساری زندگی سخت دور ہے ہیں جنہوں نے اُنہیں اہم فیصلوں پر مجبور کیا۔ انہوں نے بڑی نیک نیتی سے کانگریس جو اُن کے لیے شہر شہر گھومے اور انہوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ ہندو اکثریت اپنے صدیوں پرانے مسلک میں موجود اچھوتوں کو سامنے نہ لے سکتے تھے اور انہوں نے انہیں (Complex) سے نکل نہیں پائی۔

اس کا علاج بھی انہوں نے نیک نیتی سے تلاش کیا اور کانگریس میں ایک نامور فارمولا پیش کیا جس کے تحت مسلمان اکثریت ہو وہاں سے نیشنل اسمبلی کے لیے مسلمان نمائندہ منتخب کیا جائے اور جہاں کی آبادی ہندو جاتی پر مشتمل ہو وہاں ہندو نمائندہ چن کر ممبر اسمبلی بنایا جائے۔ پہلے تو پنڈت نہرو مان گئے لیکن بعد ازاں وہ اس وعدے سے بھی گریختی سے ہندو لیڈر شپ کبھی مفاد سے علیحدہ ہو کر سوچ نہیں سکتی، اسی لیے وعدے کی پابندی نہیں کی جاسکتی۔

جب کشمیر میں شکست سے آشنا ہوئے تو بھاگ کر سیکورٹی کونسل میں جا کر دم لیا اور جنگ بندی کی شرائط قبول کر لیں۔ چھ مہینے سانس برابر ہوئے سارے وعدے وعید بھول گئے اور پھر اکھنڈ بھارت کے نعرے لگانے لگے۔

خاں صاحب کی زندگی میں پاکستان کے لیے جدوجہد میں شمولیت کے بعد انہیں اپنے ذاتی مسلک تہ دینے سے روک دیا، بھائی بہن، دوست، چاہنے والیاں سب سے محبت تو کرتے رہے۔ اُن کے لیے جان تک دینے سے انہیں روک دیا لیکن ان محبتوں سے پہلے عملی طور پر انہیں پاکستان کے عشق نے تمام تر چوس لیا۔ اُن کی Priorities تبدیل ہو گئیں۔ چودہ سو سال پرانی روایت کو نبھایا اور پاکستان دوستی اور ذاتی خاندان میں پہلے مسلک کو اپنایا۔

جب قائد اعظم نے کام کام کام کا نعرہ ہمیں دیا تو خاں صاحب نے ”کام کام کام“ کا سلوگن اپنے حصہ بنا لیا۔ وہ سمجھتے تھے کہ تعمیر کیے بغیر ملین کو گھر کا سکھ نہیں مل سکتا اور کام کے بغیر گھر تعمیر نہیں ہوتے۔ اللہ کے نام پر یہ کیا ہوا ملک اب اللہ کی حاکمیت مانے بغیر چلایا نہیں جاسکتا۔ ملک کی محبت کو پکڑ کر وطن دوستی اور جانثاری کے ثبوت انہوں نے کئی پروگرام ریڈیو سے کیے، کیونکہ انہیں علم تھا کہ انسان پرنٹ میڈیا کے سحر سے نکل کر آہستہ آہستہ ایسٹرن میڈیا کی حوالگی میں جا رہا ہے۔ ”آج اور آج کا دن“ ”گھر گھر خوشیاں لایاں“ ”ضابطے خاں کی کارروائی“ ”جی جی“ اور ”ہم آگئے“ لکھ کر انہوں نے عام گھروں کی سوچ میں راہداری بنائی۔

”مانو منگولیا“ تو سات قسطوں کے بعد بند ہو گیا لیکن اس کی بدولت کئی خوبصورت آوازیں ریڈیو کو مل گئیں۔ اکرم زبیر، میمونہ سلطانہ، منور کاظمی، غیور اختر، صدف ملک کے علاوہ ریاض محمود جو اس وقت بھی مشہور آرٹس تھے پروگراموں کی روح رواں تھے۔

اشفاق صاحب ہی نہیں وہ تمام سرکردہ پود جنہوں نے پاکستان بنایا، پوری اہلیت، استقامت اور مستقل جدوجہد سے نئے وطن کے مسائل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بغیر ڈنڈی مارے اپنے چنکار دکھانے میں مشغول تھی۔ مہمانوں کے گھر بساؤ مسائل ان گنت تھے۔ پھڑے ہوؤں کی جدائی، راہ میں مارے جانے والوں کی بے کسی کی داستانیں، پریکیمپوں میں ٹھنڈی آہوں، گرم آنسوؤں کی گویا ایک بوجھاڑ تھی، جو کسی وقت نہ ٹھمتی تھی۔

خوشی کی اس کساد بازاری میں کچھ جی دار ایسے تھے، جو بڑے عزم کے ساتھ پرانی یادوں کو بچکیوں کے ساتھ بار دوہرانے اور سینہ کو بلی کرنے کے بجائے راضی برضا اور صبر کے ساتھ نصیب کے مرحلوں سے گزر رہے تھے۔ ان کے نزدیک دنیا میں بلا قیمت کوئی جنت حاصل کرنا ناممکن تھی۔ اس ارض پاک کی قیمت وہ چکا آئے تھے۔ اب نئی دھرتی آبیاری، پھول کھلائی، تراوش و زیبائش کے وہ خود ضامن تھے۔

انہوں نے گویا سمجھ لیا تھا کہ پیچھے پلٹ کر دیکھنے والا کفرانِ نعمت کا مرتکب ہو کر پتھر کا بن جاتا ہے۔ ان پاک لوگوں نے بیلچہ کدال اٹھایا اور مسائل کی دھرتی کو اتھل پھل کر کے رواں کر دیا۔ ان کے دماغوں میں اقبال کے آئینے سانسوں میں قائد اعظم کا عزم اور دل میں ایک امت بنانے کا معجزہ گھر کر گیا۔

چلتے فرو اتنے راستے، جس قدر لوگ اتنی ہی رنگارنگی۔ زندگی کے کارزار میں کچھ خوش نصیب شہید ہوئے۔ راضی، کچھ غازی بن کر لوٹنے پر شاداں و فرحان، کچھ اپنے نفع و نقصان کے عادی مال غنیمت سمیٹنے والے، کچھ مرنے پر بین صورت منڈلانے والے، کچھ راضی برضا، کچھ طوعاً و کرہاً دوسروں کے ساتھ چلنے پر آمادہ..... غرضیکہ پاکستان میں ایک سیلاب صورت لوگوں کا ہجوم اپنی اپنی آرزوؤں کی چابک تلے دوڑ رہا تھا۔ اسی دوڑ میں گھروں کے قفل ٹوٹنے سے منٹ سٹم کی ڈولیدہ سری ابھری، نفا نفسی کا آئین بھی لاگو ہو گیا۔

شہر بہ شہر گھوم پھر کر اپنے لیے ٹھکانے کی تلاش نے نئے دوست نئے دشمن سامنے لا کھڑے کیے۔ دھندلکے میں روشنی کی تلاش تھی لیکن چند ہی جی دار تھے جو جنگل کے گھنا ٹوپ اندھیرے میں نور کی تلاش میں نہیں روشنی تھے۔ ایسے میں جو بے غرض انصار کی روایات پر چلے، گھر کے بوہے باریاں کھول کر مجسم مہمان نواز بن گئے۔

سے آدرش راستے بھی مل گئے اور چلتے رہنے کی توفیق بھی میسر آ گئی۔

کچھ نے اپنے وجود کو کمپیوں کی نذر کر دیا۔ کچھ مختیر حضرات دیکھیں پکا کر ریزہوں پر لا دکر کمپیوں میں لاتے۔ کچھ تک پہنچ جاتے۔ وہ روٹی، کپڑا اور مکان کا نعرہ نہیں لگا رہے تھے بلکہ ان چیزوں پر Have not کے لیے کام کرتے تھے اپنی جیب سے بساط بھر۔

پاکستان کے مسائل اور حب الوطنی کے مظاہروں کا عجب دور تھا۔

کچھ سیانے سوچ بچار کا ایندھن جلا کر برصغیر کے بنیادی مسئلے کو سمجھنے میں گم تھے۔ ان میں سے ایک اشفاق احمد تھے جن کا رویہ، سوچ اور عمل تینوں مثبت تھے۔ وہ دوسروں کو سمجھانا جان گئے تھے۔

برصغیر کی دو مشکلات ایسی ہیں جن کی آمیزش سے یہاں کی سوانحی شناخت متاثر ہوتی رہی ہے۔ گروہ کی اہمیت اور شناخت ان ہی داڑھوں میں کہیں گڈمڈ ہو کر رہ گئی ہے۔ آپ بھی جانتے ہیں کہ برصغیر کے حملہ آوروں میں پہلے تو وہ تھے جو شمال سے آئے اور جنہوں نے اپنی برتری قائم کرنے اور رکھنے کی خاطر یہاں کے مقامی کول، دراوڑ، سندھی، پنجابیوں کے کم رو، غیر متدن، اچھوت لوگوں کو اپنے میں مدغم ہونے کی اجازت نہ دی۔ رفتہ رفتہ ان ہی آریاؤں نے فلسفہ حیات کی تشکیل دی جس کے دارکان سارے معاشرے اور فرد کے اندر لہوا اور ارادہ بن کر موجزن ہو گئے۔

ایک تو آواگون کا فلسفہ تھا اور دوسرے معاشرے کو براہمن، کھشتری، ویش اور شوہر میں تقسیم کرنے کی بانٹ تھی۔ اصل بنیادی وجہ ایک ہی تھی۔ وہ مقامی لوگوں میں گھل مل کر رہنا نہیں چاہتے تھے۔ ہندو مذہب میں آواگون کا فلسفہ ہی بانٹ کو تقویت دینے کے لیے تھا۔ فرد کی توجہ سوسائٹی کی تفریق سے ہٹا کر اس بات پر مرکوز کر دی گئی تھی کہ بابا جی جیسے کرم ہوں گے وہیابی دوسرا جنم ہوگا۔ تم جو ن بدلتے پھر گے اور کبھی کہیں کسی خوش نصیب کو اعلیٰ عمل کے نتیجے میں حاصل ہو جائے گا ورنہ باقی خلق اسی چکر میں رہے گی۔

دوسروں کو اپنے سے بلا وجہ کمتر سمجھنے سے جو احساس جرم پیدا ہوتا اسے نیک عمل کی ترغیب سے فوراً بھسم کر دیا جاتا ہے۔ سچ بھی حکومتیں اپنے ذاتی مفاد حاصل کرنے کے لیے کمزور عوام کو اسی طرح Side track کیا کرتی ہیں۔

آریاؤں نے اس زہر کو سوسائٹی میں بظاہر امرت رس بنا کر اس کی سہیل چلا دی۔ اسے مسلمان حملہ آوروں نے کھینچ لیا۔ شمالی علاقوں سے جو حملہ آور وقتاً فوقتاً وارد ہوئے وہ بھی احساس برتری کی دولت سے مالا مال تھے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو رواداری، توحید پرستی، انصاف پسندی کا پرچم لے کر ساحلوں پر اترایا۔ اس کی عمر ایسی تھی کہ وہ آدرش پرستی کو مٹاتا تھا لیکن اونچ نیچ والے معاشرے میں آسانی سے انصاف قائم نہیں کیا جاسکتا۔

اگر فرد یا گروہ اس فریب میں مبتلا ہو کہ وہ کسی سے ارفع یا اعلیٰ ہے تو وہاں انصاف کا آدرش پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ شہید محمد بن قاسم بھی اس بنیادی اونچ نیچ کا شکار نہ ہوتا لیکن اسے مہلت نہ ملی۔

ایسے اکثریتی معاشرے میں جہاں عمل کو تولنے والا کوئی معیار، توازن یا بنیادی اصول نہ ہو، عمل کی آڑ میں کئی Self Motivation لوگ آنکھوں میں دھول جھونک سکتے ہیں۔ برصغیر کی مسلم اقلیت بھی ایک عرصہ سے انفعالیات کا شکار رہی۔ اسلام میں جو بنیادی اہمیت نیت کی ہے، وہ اسی رکاوٹ کو عبور کرنے کے لیے پیش کی گئی۔ ایک طرف نیت،

دوسری جانب معاشرے میں برابری اور تیسری طرف رزقِ حلال کا حصول ایسے معیاری اور مشکل اصول ہیں جسے اسلامی معاشرے میں انصاف کو روح رواں بننے نہیں دیا۔

اس معاملے میں مغرب والے ہم لوگوں پر سبقت لے گئے۔ وہاں گروہی شناخت اور فرد کی اہمیت کے تحت Ethnic Group، ذات، نسل، قبیلے کی مرہونِ منت نہیں۔ رنگ کا مسئلہ انہیں درپیش تو ضرور ہے لیکن بظاہر ہماری نسل اور قانون کا احترام آسان کر دیا اور سچ بولنے اور حق دینے میں کچھ ایسی دشواری پیش نہیں آتی۔ شمال کی جانب سے آنے والے مسلمان حملہ آور آریائی قوموں سے کچھ مختلف نہ تھے۔ انہیں کچھ قدروں کی پاسداری ملحوظ نہ تھی۔ ساسانی، ایرانی، افغانی، یونانی سارے احساسِ برتری سے سرشار تھے، لیکن وہ متذکرہ میں گھل مل کر اپنی شناخت کھونا نہیں چاہتے تھے۔ رنگ و نسل کا تفاخر، رسم و رواج سے وابستگی، اسلام کے نام پر جس سے جواز ڈھونڈ لیے گئے اور مقامی لوگوں سے شادی بیاہ، ملنا جلنا قریب قریب ناممکن ہو گیا۔

حملہ آور ویسے بھی فاتح کہلانے کے لیے دشوار گزار راستوں سے آئے تھے۔ وہ چاہے سکندر یا عظیم دوست یا محمود غزنوی اور نادر شاہ کے روپ میں ہلا کو بن کر تہس نہس کرنے آیا تھا۔ وہ مقامی لوگوں میں ظلم کی کہانیاں سناتا گیا، لیکن انصاف کے لیے ہلکتی رعایا کو کوئی علاج نہ پیش کر سکا۔

پنجاب کی سرزمین میں حملہ آوروں کے ساتھ ساتھ اور کبھی کبھی دور دراز سے علی ہجویری داتا گنج بخش جیسے بلیک پکارتے اس مقام پر آنکے جسے لاہور کہتے ہیں۔ بادشاہوں، حملہ آوروں، اونچی جاتی کے مہا پدشوں کے ساتھ مرہم کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ وہ ان ڈیروں میں پناہ گزین ہونے لگے، جہاں مفت روٹی ملتی تھی اور دکھڑا سنا۔ رحم دل بابا ملتا تھا۔

لیکن سچ کا راستہ پھر مسدود ہونے لگا۔ لوگ دنیا کے ستارے ہوئے ڈیرے پر آتے تھے، لیکن انہیں تلاش تھی، نہ معرفتِ حق۔ صوفی کے پاس دینے کو دنیا نہ تھی۔ وہ تو خود بہت کچھ تیاگ کے، دنیا کی راحتوں سے منہ پھرتے، کو خواہشات کے چنگل سے نکالنے کا خواب دیکھتا آیا تھا۔

مہا تہابدھ سے لے کر ماڈرن عہد تک یہی کچھ سکھانے کے لیے کچھ اللہ کے لوگ گھروں سے نکلے تھے۔ کچھ صوفی ایک غریب کے کا سے میں ڈال رہا تھا، اس کی حاجت مند کو ضرورت نہ تھی۔ اس طرح عوام اور پیر کے مریدین اور خلیفہ حضرات کی دروغ گوئی کا ایک انوکھا سلسلہ چل نکلا اور غریب کو پھر صرف احساسِ کمتری ملا۔ انصاف نہ مل پایا۔

سچ کو خوشامد کی خوبصورت چادر اوڑھا کر دفن کر دیا گیا۔ بے لہجے نسب نامے عرب کے مقتدر قبیلوں سے جانے لگے۔ شجرہ لکھنے اور پڑھنے کا رواج ہوا۔ عام آدمی ایک بار پھر اتنی شان و شوکت کے سامنے ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے اپنے ارد گرد جھوٹ کے شامیانے گاڑھے لیے اور ان میں استراحت کرنے لگا۔ اپنی چوری سینہ زوری کے لیے گردی، عزت کی خاطر مرٹھے یا مار ڈالنے کا جواز اس نے مذہب اور رسم و رواج میں تلاش کر لیا۔

اس طرح مشرق میں انصاف اور قانون کا تصور باقی تو رہا لیکن اضافی شکل میں اس پر عمل مفقود تھا۔ مغرب

حیات کے سوالوں میں کبھی رہے نہ تھے۔ انہیں حملہ آوروں سے بھی اتنا پالا نہ پڑا تھا۔ انہیں مختلف رنگوں سے بھی نپٹنے کی سہولت نہ تھی۔ گورا، گندمی، گندم گوں، پیازی، سانولا، کالا ایسے الفاظ ان کی لغت میں نہ تھے۔ قدرت نے انہیں اس حد تک برابر ہی عطا کر کے بڑی سہولت پیدا کر دی تھی۔

ان کے دو اوصاف

مغرب میں انسان کی شناخت کے لیے دو چیزیں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ یا تو انسان کے آداب (Manners) اس کی پہچان ہیں یا اس کا کام اور سوسائٹی کا عطا کردہ مقام اس کے Identity Card میں شمار ہوتا ہے۔ ان سے ایک بہت بڑی خوبی اُن میں پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ قانون کے پابند رہتے ہیں۔ ان کے لیے بار بار آئین سے رجوع نہیں ہوتا اور انصاف جو اسلام کا روح رواں ہے، ان کے لیے آسان ہو جاتا ہے اور ان کے معاشرے کی پہچان بن جاتی ہے۔

طبقات وہاں بھی ہیں۔ وہاں بھی ناہمواری ہے۔ انسانی معاشرے میں مکمل برابری ممکن نہیں لیکن وہاں ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں خروج قدرے آسان ہے اور انصاف کی شرائط پوری کرنا کارے دار دنیست۔ خاں صاحب نے خود ذہنیت کو سمجھنے کے لیے بڑے پاپڑ پیلے، بہت ساری کتابوں کی چھان بین کی۔ اُن کے کاغذات میں یہ تحریریں ملی

”ہندو یو مالا میں ایک عجیب و غریب پرندے کا ذکر ہے جس کو داملیک اپنی رامائن میں جٹایو کے نام سے پکارتا ہے۔ بن کے بیٹوں بیچ جٹایو گہری نیند سو یا کرتا تھا۔ یہ پنجھی ساٹھ ہزار سال تک گدھوں کا راجہ بن کر رہا اور ان کے

ان گدھوں کے پر یوار میں جٹایو کا بڑا بھائی سمپاتی بھی رہتا تھا، جس نے اپنے چھوٹے بھائی جٹایو کا جیون بچانے کے لیے اسے اپنے پر نوج کر دے دیئے تھے کہ وہ دھوپ اور گرمی سے بچا رہے۔ جٹایو اپنے بڑے بھائی کے اس

جب سری رام چندر جی، لکشمن جی اور سیتا جی بنوں میں مارے مارے پھرتے تھے تو ان کی مدد بھڑپنچھیوں کے جٹایو سے ہوئی۔ وہ اسے دیکھ کر گھبرا گئے، پر جٹایو نے سیس نوا کر کہا، میں تمہارا مڑ ہوں اور تمہارے باپ شری دشر تھ کا

جب راون سیتا جی کو اٹھا کر لے چلا تو سیتا نے غل مچا کر جٹایو کو جگایا۔ جٹایو نے کہا ”ہے راکھشش! تیرے

پر راکھشش نہ مانا اور اس نے اپنے بھالے سے جٹایو پر بلہ بول دیا۔ جٹایو نے اپنے پنکھ مار مار کر راون کی

دھنش کو توڑ دیا اور اس کے اڑن کھٹولے کو دھرتی پر گرا دیا۔ سینا اور راوان اڑن کھٹولے سے اس روپ میں گرے گئے۔
 راوان کی گودی میں آگنی۔ گھڑی دو گھڑی راوان جنایو کے ساتھ لڑتا رہا اور پھر بتیا چاری راکشش نے اُچھل کر جنایو کے
 دونوں پنکھ کنار سے کاٹ دیئے۔ جنایو دھرتی پر لوٹنے لگا۔ سینا نے جنایو کو اٹھا کر اپنی نزل چھاتی سے لگا لیا، پر وہ تو
 بجلائی آگ کی طرح ٹھنڈا ہو چکا تھا۔“

والمیک کی رامائن پڑھ کر اشفاق صاحب کو بڑا دکھ ہوا کہ اس نے جنایو کے کارنامے کو تو بہت بڑھا چڑھا کر دکھا
 ہے لیکن اس کے برادر اکبر سہپاتی کا کہیں اور تذکرہ نہیں کیا جس غریب نے اپنے پر جنایو کو دے کر اتنی بڑی قربانی کی تھی
 جنایو پر اے پھڑے میں ٹانگ اڑا کر راہی ملک عدم ہو گیا تھا۔ آج میرا جی چاہ رہا ہے کہ رامائن کا تہہ لکھ کر سہپاتی کی خدمت
 پر مزیروشنی ڈالوں کہ بعد میں اس کا کیا بنا۔

مہا بھارت

گمہر شر دارشی مہاراج جیجے کے شرب یکیہ سے ہو کر ایک رشیوں کی منڈلی میں پہنچتا ہے اور وہاں اُن روایات
 مہا بھارت کے قصے اور واقعات بیان کرتا ہے جو یکیہ کے دوران میں متفرق رشیوں نے بیان کیے۔

شرپ یکیہ کی وجہ

چندریشی خاندان جس کے چند مشہور افراد میں کرشن جی، راجہ شانتو (جس کے فرزند بھیشم بتامہ تھے) دھرت
 بھرت (راجہ دھنت کا لڑکا) اور پاندوؤں کا نام قابل ذکر ہے۔ اسی خاندان کا ایک مشہور بادشاہ پرتھوتھ تھا۔ ایک
 پرتھوتھ سیروشکار کی غرض سے تپوہن میں گیا۔ اچانک ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ مارا مارا پھربا تھا کہ ایک رشی نظر آیا۔
 مون بھرت (چپ سادھے) رکھے مالک سے لو لگائے بیٹھا تھا۔

راجہ نے لاکھ بلایا لیکن اُس کی زبان کو جنبش نہ ہوئی۔ آخر تک آ کر راجہ نے ایک مراہو سانپ سمیک رشی کے
 گلے میں ڈال دیا اور آپ رخصت ہوا۔ راستہ میں شرنگی رشی سے ملاقات ہوئی۔ اسے تمام حالات بتائے۔ اتفاق سے
 شرنگی رشی سمیک کا بیٹا تھا۔ جھٹ سراپ دیا کہ جاتھے آج سے سات دن کے اندر اندر تلشک ناگ ڈس لے۔

باوجودیکہ ہر طرح سے حفاظت کی گئی لیکن تلشک ایک سیب میں داخل ہو کر راجہ کے پاس پہنچا اور جوئی
 نے سیب تراشا، ڈس کر چلتا بنا۔

اسی راجہ کا بیٹا جیجے جب بڑا ہوا تو اُس نے سرپ یکیہ کیا۔ تمام رشیوں منیوں کو اکٹھا کیا۔ ہون جلا یا جس
 زمانے بھر کے سانپ اڑا کر آتے اور بھسم ہوتے رہے۔ آخر تلشک جو راجہ اندر کے ہاں پناہ گزیں ہو چکا تھا، آیا اور
 ہو گیا۔ رشی آستک کے کہے پر راجہ نے سرپ یکیہ بند کر دیا۔

ویاس جی کی پیدائش (اٹھارہ پُران اور وید تصنیف کی)

چندر بنسی راجاؤں میں ایک راجہ ہو گا۔ اس کے ہاں ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئے۔ لڑکا تو اُس
تھوڑا سا اور لڑکی کو ایک ملاح کے سپرد کیا۔ لڑکی کے ذمے یہ کام تھا کہ ریشیوں کو ایک کنارے سے دوسرے کنارے
سے لے آئے۔ بارہ برس کا سن تھا۔ جب ایک دن یا راجہ جی جو ایک پتھر ہوئے بزرگ تھے، اس کی معیت میں پار جانے
کے لیے تھے۔ چونکہ ملاحوں کی لڑکی تھی، اس لیے اُس کے جسم سے مچھلی کی بساندا اٹھتی تھی، جس کا اُسے بہت خیال تھا۔
ایک دن اُس پر آ گیا اور اسی ترنگ میں دعا دی کہ آج سے تیرے جسم سے صندل کی خوشبو آ کرے گی اور اگر حمل ہو
تو یہ بچہ اور جہاں پیدا ہوگا کہ باید وشاید..... ویاس جی پیدا ہوئے اور پیدا ہوتے ہی جنگلوں کی راہ لی، جہاں ساری زندگی
تھی۔

راجہ دشنٹ و شکنتلا

راجہ جی اپنے خاندان کے حالات سن رہا تھا اور جانتا چاہتا تھا کہ ہندوستان کا نام بھارت ورش کیونکر پڑ گیا۔ سو
اپنے بیٹے نے بیان کیا کہ شکنتلا دراصل وشوامتر رشی کی لڑکی تھی۔ رشی کا چپ تپ اس قدر بڑھ چکا تھا کہ مہاراج اندر کو اپنے
تھوڑے سے لالے پڑ گئے۔ اس پر منیکا کو طلب کیا اور حکم صادر فرمایا کہ جا کر رنگ بھنگ کرو۔ منیکا نے کام دیا اور
پیدا ہوا۔ کوسا تھ لیا کہ مدد کریں اور حکم حاکم نبجالاتی۔ وشوامتر اور منیکا کے میل سے شکنتلا پیدا ہوئی۔ رشی مہاراج پھر چپ
تپ میں مشغول ہوئے۔ منیکا نے سوگ کی راہ لی۔ شکنتلا کو کورش نے بیٹی بنا کر پال لیا۔

ایک دن راجہ دشنٹ جنگل میں آئے۔ شکنتلا کا روپ دیکھ کر دل آ گیا۔ گندھرب واہ کیا۔ شکنتلا نے بردان
کا روپ لیا اور بچہ پیدا ہوا تو وہی تخت وتاج کا وارث ہوگا۔ دشنٹ نے بردان دیا اور گھر کی راہ لی۔ کورش واپس
آئے تو دیکھا کہ شکنتلا یہاں جا چکی ہے۔

کچھ عرصہ بعد راجہ بھرت پیدا ہوئے۔ ماں نے بچہ کو راجہ دشنٹ کے پاس بھیجا، جس نے پہچاننے سے اس لیے
بھرت کی کہ زمانے کی طعنہ زنی سے ڈرتا تھا۔ بالآخر آکاش سے آواز آئی کہ یہی فرزند تخت وتاج کا مالک ہوگا۔ سو شکنتلا
بھرت رانی بنایا اور یوں بھرت کے نام پر ہندوستان کا نام بھارت ورش ہوا۔

بھیشم پتاماہ کی پیدائش

ایک روز برہم سجا کا اجلاس ہوا۔ اس میں مہابھک راجہ بھی آئے اور دیوتاؤں کی استریاں بھی تشریف لائیں۔
گنگا جی کا حسن و جمال افروز ایسا تھا کہ مہابھک عاشق ہو گئے۔ برہما جی برافروختہ ہوئے کہ ایسی مجلس میں یہ ایسی بدگواہی۔
دعا دی کہ جاؤ زمین پر ایک جنم بھوگ کر آؤ۔ یہی راجہ شانٹو کے روپ میں پیدا ہوئے۔ گنگا جی کے دل میں بھی آگ
بھڑک رہی تھی۔

مہابھک کی وجہ سے اپنے باپ برہما سے اجازت لی اور دنیا کا رخ کیا۔ راستے میں آٹھ سو ملے کہ جنہیں دنیا
میں زندگی کاٹنے کا سراپ ملا تھا۔ گنگا جی نے وعدہ کیا کہ انہیں اپنے بطن سے پیدا کر کے جلد از جلد دنیا سے رخصت کر دے

گی لیکن ایک بچہ دنیا میں باقی رہے گا۔ ایک سیو جس کا نام دیوتھاراضی ہو گیا لیکن یہ شرط پیش کی کہ جب تک جیوں گا تو دنیاوی جھنجھٹ میں نہ پڑوں گا۔ یعنی شادی بیاہ نہ کروں گا۔

گنگا کی شادی شانتو سے ہوئی تو اس نے راجہ سے برا مانگا کہ جو کچھ میں کروں مجھے ٹوکنا نہیں۔ سات برس کے ہاں لڑکے پیدا ہوئے۔ وہ بچہ پیدا ہوتے ہی گنگا کے سپرد کر دیتی تھی۔ جب آٹھویں بار حمل ہوا تو شانتو ناراض ہو گیا کہ اس بار بچہ میرا ہوگا۔ بچہ (دیو برت) پیدا ہوا تو گنگا رخصت ہوئی کیونکہ راجہ نے اسے ٹوک دیا تھا۔ اس طرح دیو برت جس کا نام بعد کو بھیشم پتامہ ہوا اور جس نے ساری زندگی برہم چاری کی زندگی بسر کی۔

راجہ شانتو کی متسودری سے شادی

متسودری جس کا نام اس کی خوشبو کے باعث جو جن گندھا پڑ گیا تھا، ایک دریا پر ملاحی کرنے جاتی تھی۔ شانتو کو خوشبو کشاں کشاں کھینچے لائی۔ دیکھا تو صورت بھی بلا کی نظر آئی۔ ملاح سے لڑکی کا مدعی ہوا لیکن ملاح ٹال گیا۔ گھر پہنچا تو حالت غیر دیکھ کر بھیشم پتامہ نے وجہ پوچھی۔ جب علم ہوا کہ یوں جو جن گندھا کے لیے پریشان ہیں تو ملاح کے پاس پہنچا اور ہر ممکن شرط ماننے کو تیار ہو کھڑا ہوا۔ ملاح نے کہا کہ میری بیٹی کے بطن سے جو بچہ پیدا ہو وہی بادشاہ بنے۔ پتامہ نے وعدہ کیا کہ جیتے جی شادی ہی نہ کرے گا تا کہ متسودری کا بچہ راج گدی کا وارث ہو سکے۔ اپنے باپ کے لیے متسودری کو لے کر روانہ ہوا۔ یاد رہے اسی متسودری کے بطن سے ویاس جی بھی پیدا ہوئے تھے اور اسی رانی کا نام راجہ بھیشم نے رانی ستوتی رکھا۔

متسوتی کے بطن سے دو فرزند تولد ہوئے۔ چترانگد اور پختر بیرج۔ ابھی دونوں کمسن تھے کہ راجہ شانتو کا انتقال ہو گیا۔ بھیشم پتامہ نے بڑے لڑکے کو گدی پر بٹھا کر نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لیا، لیکن بڑا لڑکا نالائق ثابت ہوا اور ایک لڑکی میں مارا گیا اور یوں پختر بیرج راجا ہوا۔ وہ بڑا نیک چلن اور راست باز تھا۔ بھیشم کی باتیں من و عن مانتا تھا۔ جب پختر بیرج سن بلوغ کو پہنچا تو ان ہی دنوں راجا کاشی نے اپنی تین راجبھاریوں اینا، انبالکا اور ابھیکا کا سونہرے رچایا۔ بھیشم پتامہ پختر بیرج کو لے کر پہنچے اور سونہرے اصول جملہ امیدواروں کے گوش گزار کیے۔

- 1- برہم وواہ: دفتر کو آراستہ کر کے ہاتھ میں پانی دے کر کنیا دان کیا جائے۔
- 2- اُسروواہ: دولت کا لالچ دے کر عزیز و اقارب کو پھانس لیا جائے اور یوں لڑکی سے وواہ کیا جائے۔
- 3- راکھش وواہ: زبردستی اور ظلم سے لڑکی کے والدین کو رضامند کیا جائے اور پھر لڑکی کی رضامندی کے خلاف شادی کی جائے۔

4- گندھرب وواہ: عورت اور مرد جوشِ محبت میں بیاہ کر لیں۔ افضل مانا گیا ہے۔

5- آرش وواہ: یہ افضل تو نہیں لیکن رائج ہے۔ دو گائیں خاوند سے وصول کر کے لڑکی سپرد کر دی جائے۔

6- دیو وواہ: اعلیٰ درجے کا مانا گیا ہے۔ سونہرے اصول پر ہوتے ہیں۔

7- پر جابت وواہ: افضل مانا گیا ہے۔ جہیز دے کر لائق لڑکا ڈھونڈ کر لڑکی بیاہ دی جائے۔

پتہ جی وواہ: حد درجہ کا ناقص اور داخل گناہ ہے۔ لڑکی کو حواس باختہ پا کر یا نشہ پلا کر اڑالے جانا۔
 بھیشم پتامہ نے اپنے زور بازو سے تینوں راجکماریاں سنبھالیں اور چلتے بنے۔ راہ میں کئی ایک راجوں سے
 لڑائی ہوئی لیکن سبھی ہار گئے اور بھیشم پتامہ تینوں لڑکیوں کو لے ہستنا پور پہنچے۔ ابنانے موقع پا کر گزارش کی کہ چونکہ
 تینوں لڑکیاں مگتیر ہوں اس لیے مجھے معاف کیجیے اور اس کے پاس بھجوائیے۔

بھیشم مان گئے اور یوں پختہ بیرج کی دور انیاں ہوئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد راجا لاولد ہی مر گیا اور مہارانی ستوتی
 کی فکر میں ویاس جی کو بلایا کہ اب انتظام فرمائیے۔ جائز وارث کوئی نہیں اور رانیاں گھلی مرتی ہیں۔ ویاس جی
 نے کہا کہ بن بھن کر میرے پاس آئیں اور نہ گھبرائیں۔ پہلے ابنا کا گئی۔ پچاری ویاس جی کو دیکھ کر ایسی گھبرائی کہ
 اسے اندھے دھراشتر پیدا ہوئے۔ پھر ابنا کا گئی۔ دیکھتے ہی رنگ اڑ گیا۔ اس کے بطن سے پانڈو پیدا
 اس کے بعد ابنا لے چالا کی سے ایک خواص بھیجی۔ اس کے ہاں بُرجی پیدا ہوئے۔

پختہ بیرج

(ماروی کے بطن سے)

بُرجی

پانڈو

پانڈو

ابنا کا (کنتی) کے بطن سے

جد ہشتر

بھیم سن

ارجن

نکل

سہد یو

دھرتراشتر

ابنا کا (گندھاری کے بطن سے)

دریودھن

شمنی

دوشاسن

اور

(موبھائی)

دھرتراشتر کی بیوی گندھاری کو ایک جوگی کا بردان تھا کہ سو بیٹے کھلائے گی۔ ابھی اس کو حمل باقی تھا جب اسے خبر
 پانڈو کو خدا نے پانچ لڑکے عطا کیے تو مارے حسد کے پیٹ پیٹنے لگی۔ حمل گر گیا۔ اب اس نے جوگی کی وہائی دی کہ واہ
 رشی جی کا نزول ہوا۔ حکم ہوا کہ گوشت کے توہڑے کو سوجھوں میں تقسیم کر کے سوگھی کے منکوں میں بند کرو اور
 کھانے کے بعد سوکورو پیدا ہوں۔

مہارانی کنتی جب چھوٹی تھی دربار ساراش نے اسے ایک منتر سکھایا کہ جب چاہو گی کسی دیوتا کو بلا سکو گی۔ جب
 وہ بچی تو ایک دن اس منتر کی آزمائش کی اور سرج نارائن کو بلایا۔ وہ حاضر ہوئے تو آتے ہی عاشق ہو گئے۔ حمل ٹھہر
 گیا۔ بردان دیا کہ بچے کی کسی کو خبر نہ ہوگی۔ وقت معین پر کرن پیدا ہوا اور کنتی نے پانی میں ڈال کر خدا کے حوالے کیا اور
 چاندراشتر کے رہبان نے بیٹا بنا کر پرورش کی۔

راجہ پانڈو ایک دن شکار کو گئے تو ایک ہرن ہرنی کو عین جنسی فعل کے وقت مارا جس رشی کا ہرن تھا اس نے
 یہ دیکھا کہ تو بھی عین لطف زندگی کے وقت جان دے گا۔ راجہ پانڈو کا جی راج پاٹ سے بھر گیا۔ وہ اپنی دونوں رانیوں کو

لے کر جنگل میں رہنے لگا۔ اولاد کی اُمنگ دن پردن بڑھی اور آخر میں یوں دیوتاؤں کو لدولدی کا داغ مٹانے کے لئے لے کر جنگل میں رہنے لگا۔

مہارانی کنتی اور سری دھرم راج (یم دوت) راجہ جد ہشتر
 کنتی اور پون جی بھیم سین
 کنتی اور راجا اندر ارجن
 ماروی اور اسونی کمار نکل اور سہد یو

لیکن ایک دن پانڈو ماروی کے روپ سے بہت ہی متاثر ہو گئے اور موت کی پرواہ بھی نہ کی تو عین لختہ کے وقت جان نکل گئی۔ ماروی نے سستی ہونا قبول کیا اور کئی پانڈوں کو لے کر ہستنا پور آ گئی۔

دریودھن شروع سے ہی حاسد تھا اس لیے بھیم سین کو زہر دے دیا لیکن باسکی ناگ نے سارا زہر کھینچ لیا اور بھیم سین بخیر و عافیت واپس لوٹا۔

درونا چاریہ کو ان کی تعلیم و تربیت کے لیے مقرر کیا گیا اور جب دونوں لائق ہو گئے تو ایک دن دریودھن نے بھیم سین کو زہر دیا۔ اس نے بارہا ملک ناگ کی دختر ایل متھی سے شادی کر لی۔

حسد نے رفتہ رفتہ یہ صورت پکڑی کہ اکتھے رہنا ناممکن ہو گیا اور فیصلہ ہوا کہ برناوہ میں پانڈو رہیں اور ہستنا میں کورو۔ ادھر دریودھن نے سکیم لڑائی اور ایک لاکھ سجد کا عمدہ مکان تعمیر کروایا۔ تدبیر یہ تھی کہ سوتے میں مکان بن جائے۔ حسن اتفاق سے راجہ جد ہشتر کو علم ہو گیا اور جس رات مکان جلنا تھا اس رات وہ خاموشی سے اپنی ماں کنتی سے برا گئے اور ان کی جگہ پانچ فقیروں اور ان کی ماں بھسم ہو کر رہ گئے۔ اب دریودھن خوش ہوا۔

اب یہ پانچوں بھائی آوارہ پھرنے لگے۔ راہ میں بھیم سین پر ہڈ مہارا کشنی فریفتہ ہو گئی اور بھیم سین نے اسے ساتھ گندھرب دواہ کر لیا۔ اس کیب طن سے گھوٹ کچ پیدا ہوا۔ ان ہی دنوں میں مہاراجہ دروپدی کی بہن دروپدی کا ہوا۔ شرط یہ تھی کہ ایک بھڑکتی چمکتی جو اہرات کی مچھلی کو ایک تیل کے کڑا ہے میں دیکھ کر نشانہ لگایا جائے۔ چکرشن ٹھن تھا۔ مچھلی پر نظر نہ جمی تھی۔ سب راج ہار گئے۔ ارجن جو برہمنوں کے بھیس میں تھا، اٹھا اور شرط جیت لی۔

جب دروپدی کو لے کر کنیا میں آئے تو ماں سے کہا کہ ایک مال لائے ہیں بہت ہی عمدہ۔ ماں نے کہا۔ بھائی ہانٹ لو۔ دروپدی پانچوں کی بیوی ہو گئی۔ پورا ایک سال ایک بھائی کے ساتھ رہتی تھی اور شرط تھی کہ اگر غلطی ہو تو دوسرا بھائی خواب گاہ میں آ جائے تو اسے بارہ برس کا بن باس۔ ارجن ایک دن ایک برہمن کی رکشا کے لیے اٹھا اور دوسرا بھائی اندر چلا گیا تو پھر اسے بارہ برس بن باس نصیب ہوا۔

راجہ دھرتراشتر نے سلطنت کے حصے بخرے کر دیئے۔ ہستنا پور کوروں کو ملا اور اندر پرست پانڈوں کو۔ ارجن نے اپنے بارہ برس کے دوران میں باسک ناگ کی لڑکی الوپی سے گندھرب دواہ کیا۔ پھر مٹی سے راجکمار کی چندا لنگد اور اس کی بہن کو عقد میں لایا اور آخر میں کرشن جی کی بہن سو بھدرا سے شادی کی جس کے بعد اہنمبو پیدا ہوا۔

راجہ جد ہشتر کو سری کرشن نے صلاح کی کہ راج سو یہ یکیہ کرو اس میں اس نے پانڈؤں کو بھی مدعو کیا جو اس جگہ کی خدمت کو دیکھ کر ایسے جلے کہ انتقام کا موقع ڈھونڈنے لگے۔ آخر جد ہشتر وغیرہ کو اپنے ہاں مدعو کیا اور جوئے میں شگنی سے قریب سے اس کا سب کچھ جیت لیا۔ حتیٰ کہ وہ پانچوں بھائی غلام اور درو پدی کنیز ہو گئی۔ اس پر بھی در یودھن کا کلیجہ ٹھنک گیا۔ اس نے درو پدی کو سرد در بار برہنہ کرنا چاہا لیکن جوں جوں وہ شاسن چادر کھینچتا تھا، ستر لہبا ہوتا جاتا حتیٰ کہ در بار سے بھر گیا۔ پھر در یودھن نے راننگی کی اور درو پدی کو دعوت دی کہ کوروؤں میں سے کسی کی رانی بن جائے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ لڑائی میں کرن کی جان لے گا اور در یودھن کی ران توڑے گا۔ جب رانی گاندھاری کو اس کے پاس بلا کر لایا تو وہ دوڑی آئی اور دھرا شتر کو شرمندہ کیا اور جد ہشتر کو راج پاٹ دلایا۔

درو یودھن کے دل میں دکھ تھا۔ اس نے دوبارہ جد ہشتر کے ساتھ جو اکھیلا اور اس بار شرط یہ رکھی کہ جو بارے اس کے ہاتھ کو بارہ برس بن باس۔ اس کے بعد ایک سال گپت رہنا۔ اگر اس سال کے دوران میں دوسرا فریق پہچان لے تو اس کا بن باس۔ جد ہشتر ہار گیا اور یوں پانڈؤں کا بن باس شروع ہوا۔ پانڈؤں کے ہاتھ برہمنوں کا ایک لکڑاٹھ لکڑاٹھ لیکن سورج نارائن کے بردان کے باعث جد ہشتر ان سب کی تواضع کرتا ہی رہا۔

ارجن نے بہت دن تپسیا کی تو ایک دن مہادیوجی بنفس نفیس آئے اور اسے آزمایا۔ دوران جنگ مہادیو کا جسم اس سے چھو گیا اور اس طرح ارجن میں یہ قوت پیدا ہو گئی کہ وہ اسی جسم سمیت بہشت جا سکتا تھا۔ دھرم راج اندرو وغیرہ سے اس نے گئے اور ہر قسم کا علم و فن سکھایا۔ جب شسترو دیا (علم جنگ و جدل) بہت سیکھ گیا تو اندر نے چتر سین کے پاس گیا کہ گندھرب و دیا (موسیقی) بھی سیکھ لو۔ اس طرح جب ارجن اسپروؤں کے ساتھ ناچ گانے کی مشق میں مشغول تھا تو اسی اسپر اس پر عاشق ہو گئی لیکن ارجن نے ٹالا۔ اس پر ارجن کی خوشگلیں ہوئی اور بددعا دی کہ جا ایک سال بیچرا بن کر رہے۔ یہ سراپ اس وقت کام آیا جب ارجن کو کوروؤں سے چھپنے کے لیے راجا برات کے ہاں پناہ لینا پڑی۔

راجہ جد ہشتر نے اس دوران میں تمام تیرتھوں کی زیارت کی اور رشیوں سے اپنے اسلاف کی کہانیاں سنیں جن سے کل دہنتی کی داستان آج کل زبان زد عام ہے۔

کل دہنتی

راجنل دہنتی پر عاشق تھا لیکن اس تک رسائی نہ تھی۔ ایک دن ایک ہنس قابو آ گیا۔ ہنس نے رہائی چاہی تو راجہ نے ایک شرط پر۔ دہنتی سے جا کر میری محبت کا چرچا کرو۔ دہنتی نے جب راج ہنس کی زبانی راجہ کا احوال سنا تو ہزار ہنسنے لگی۔ دہنتی کے باپ ”بھیم سین“ (پانڈوؤں) نے سوئمبر کی ٹھہرائی۔ اس سوئمبر میں شریک ہونے کو اندر، دھرم راج، گن اور برن دیوتا بھی جا رہے تھے۔ راہ میں راجہ اندر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ راجنل ہمارا ایک پیام لے کر آیا ہے کہ ہم چاروں میں سے کسی کو شہر بنانا قبول کر لے۔

راجنل نے الوپ انجن لگایا اور دہنتی کے حضور پہنچا لیکن وہاں تو اور ہی گل کھلا۔ دہنتی الٹے راجنل جی پر سو جان سے تھہرنے لگی۔ دوسرے دن جب سوئمبر میں دہنتی نے بے مالا ڈالنے کی غرض سے راجنل کو ڈھونڈا تو پتہ لگا راجنل کی سمت کے چار اور بھی بیٹھے ہیں۔ شپٹائی اور دعا مانگنے لگی۔ آخر خیال آیا کہ ہونہ ہو یہ چار اگن، دھرم، اندر اور برن ہیں۔

سوچا تو دیوتا کی پہچان صاف نظر آئی نہ تو سایہ تھا نہ آنکھیں جھپکتی تھیں اور ان کے پاؤں تخت سے کچھ اونچے تھے۔ جب راجہ نکل کے گلے میں بے مالا ڈال دی۔ اس موقع پر دیوتاؤں نے نل کو بردان دیئے۔

1- تمہارے یک میں تمام دیوتا اصلی صورتوں میں رونق افروز ہوں گے۔

2- عمدہ طور پر نجات ہوگی۔

اگنی دیوتا بولے

1- جب یاد کرو گے آؤں گا۔

2- مرنے کے بعد اس سے روشن جگہ ہو گے جہاں میں ہوں۔

دھرم راج بولے

1- تمہارے ہاتھ کی پکائی ہوئی چیز ذائقہ میں بے نظیر ہوگی۔

2- اور بار عنایت کیا جس کی خوشبو کبھی نہیں جاسکتی۔

برن نے کہا۔

جب یاد کرو گے پانی مل جائے گا اور جس خالی برتن کو دیکھو گے بھرا ہوا پائے گا۔

کلجگ جود مینتی کا خواہاں تھا۔ وقت پر سوئمیر میں نہ پہنچا۔ اب عرصہ کے بعد اس نے انتقام کی سوچی اور راجہ کے بھائی پشکر کو جوئے پر اکسایا۔ نل نے تخت و تاج ہار کر دینتی کے ساتھ جنگل کی راہ لی اور اپنے لڑکے، لڑکی کو اپنے پاس کے پاس کندن پور بھیج دیا۔

رانی نے بہت کہا کہ چلو میرے میسے چلو لیکن نل کو منظور نہ ہوا اور ایک رات جب اس نے موقع پایا تو دینتی کے آدھی چادر پھاڑ کر چلتا بنا۔ اب دینتی روتی چلاتی بھٹکتی بھٹکتی راجہ چند ہری کے ہاں پہنچی۔ راجہ نل جب جنگلوں میں رہا تھا تو کرکونک ناگ آگ میں جل رہا تھا۔ راجہ نے اس کی جان بچائی لیکن اس نے موقع پاتے ہی کاٹ کھایا۔ جس سے راجہ کی ہیئت کڈائی ہی بدل گئی۔

اب ناگ بولا، یہ میری کینچلی لو، جب اصلی روپ میں آنا چاہو گے اسی کی بدولت آؤ گے۔ دینتی کو آخرباب نے ڈھونڈ نکالا اور پھر نل کی تلاش جاری ہوئی۔ راجہ نل راجہ رتو برن کا رتھ بان ہو گیا۔ رانی نے کچھ برہمن چار دناگ بھیجے کہ چار اشلوک ہر جگہ سنائیں جہاں سے ٹھیک جواب ملے وہیں نل ہوگا۔ رتو برن کے رتھ بان یعنی راجہ نل نے اشلوک پڑھے اور جواب دیئے۔ اب دینتی نے رتو برن کے پاس پیام بھجوایا کہ چونکہ راجہ نل لاپتہ ہے اس لیے دوبارہ سوئمیر چار رہی ہوں۔ ایک دن میں پہنچو۔

رتو برن اور نل رتھ پر روانہ ہوئے تو گھوڑے ہوا ہو گئے۔ راجہ میں راجہ رتو برن نے ایک چھتھنار درخت کے ترپے پتے اور پھل گن لیے۔ نل متعجب ہوا کہ اتنی تھوڑی دیر میں ایسا حساب۔ سو فیصلہ ہوا کہ نل راجہ کو رتھ بان سکاٹے جس کے عوض راجہ رتو برن اُسے یہ فن سکھائے گا۔ جب دربار میں پہنچے تو رانی پہچان نہ سکی کہ نل کون ہے۔ سو اُس نے اپنی خواص کشتی کو نل کے پاس دو خالی مشکینز دے کر بھیجا۔ جونہی نل کی نظر پڑی وہ پانی سے بھر گے۔ پھر نل کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھایا تو

بغیر آگ کی چنگاری کے آگ جلائی تو دہشتی کو اعتبار آ گیا کہ ہونہ ہو یہی راجنل ہے۔
 اس نے اپنے بچوں کو نل کی خدمت میں بھیجا۔ راجنل نہیں دیکھ کر رونے لگا۔ سو تصدیق ہوئی کہ یہی نل ہے۔
 اس کے بعد پھر لشکر سے جو بازی کھیلی۔ اس بار چونکہ نل ایک بیہوش کے درخت کو ڈھا چکا تھا۔
 اس درخت میں رہتا تھا اور یوں نل کے تابع ہو گیا تھا) اس لیے لشکر کی کوئی پیش نہ گئی اور یوں راجنل نے پھر

ایک دن جنگل میں درو پدی پیش تھی کہ ایک خوبصورت کنول کا پھول اس کے پاس آ کر گرا۔ اس نے بھیم سین
 کو کہا کہ اگر ایسے ہی چھ اور پھول میں تو کیا بات ہو۔ بھیم سین روانہ ہوا تو گندھ ماون پر بت میں گزر ہوا۔ یہاں
 سے پھول لینے سے روکا کیونکہ یہ باغ گندھریوں کا تھا اور وہ ہی پھولوں کے جائز حقدار تھے۔ ہنومان اور
 جنگ ہوئی لیکن بھیم سین اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا اور جب اسے علم ہوا کہ یہی ہنومان ہیں تو اسے استعجاب کی کہ
 پھر حال اسے بھی بتائے جائیں۔

ہنومان نے رمان کے واقعات سنانے کے ضمن میں کہا کہ جگ مندر جذیل ہیں:
 دھرم کی پوری عملداری کا زمانہ۔ وید ایک ہی تھے۔ شام۔ بجز اتھرو اور رگ وید کی تخصیص نہ تھی۔
 است جگ سے کم لیکن انسانی راستی پسند اور عبادت سے نافل نہ تھے۔
 دھرم میں کمی وید کے بدلے چاروید بنے۔

جس میں ادھرم زوروں پر ہوگا۔

جن دنوں جد ہشڑ اور اس کے چاروں بھائی (ارجن بہشت میں تھا) بن باس کا رہے تھے، ہری کشن بھگوان
 کے ان کے پاس آئے۔ درو پدی اور ست بھاماں میں پتی برتا عورتوں کے متعلق باتیں ہوئیں اور درو پدی
 کی عورت کی فضیلت بیان کی۔ مارکنڈ جے جی جو درو پدی سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے راجنل جد ہشڑ کو سیتاوان
 کی کہانی سنائی جس میں ایک پتی برتا عورت کا اتہاس ہے۔

”اموپت“ اندرویش کا راجنل وار تھا۔ اس نے گلہ کیا اور ساوتری سے اولاد کی خواہش کی۔ جب لڑکی پیدا ہوئی
 اس کا نام بھی ساوتری رکھا۔ جب بڑی تو اموپت نے اسے گلہ اختیار کیا کہ جس کے ساتھ چاہے شادی کرے۔
 جب جنگل میں ساوتری کی پاکلی جا رہی تھی۔ سیتاوان نظر پڑا۔ اس کا باپ اندھا تھا اور راجنل پاٹ کھو کر جنگل میں
 ساوتری نے جب اس کے ساتھ شادی کی تمنا کی۔ نارو جی نے کہا کہ لڑکا تو اچھا ہے لیکن عمر فقط ایک سال باقی
 رہی ہے۔ پھر اسی سے شادی کی۔ جب ایک سال گزرا تو ایک دن سیتاوان کلہاڑ لے کر پھول نیل اور کڑیاں لینے
 ساوتری بھی ساتھ ہوئی۔ کچھ دیر بعد سیتاوان اس کے زانو پر سر دھر کر سویا تو سوتا ہی رہ گیا۔ نگاہ اٹھائی تو سامنے
 سیتاوان کے قالب کو انگوٹھے بھر کا بنا کر جانے والا تھا۔

اب ساوتری میراج کے ساتھ ہوئی۔ میراج نے کہا کہ تو چونکہ پتی برتا عورت ہے سو مانگ کیا مانگتی ہے۔ فقط
 کے جان نہ مانگنا۔ ساوتری نے کہا تو سسر کی آنکھیں دے دیجیے اور اقبال کے آفتاب کو گہن سے نکال کر

چکائے۔ استدعا قبول ہوئی مگر اب بھی ساوتری پیچھے پیچھے چلتی رہی۔ میراج نے دیکھا تو پھر بردان دیا۔ ساتھ ساتھ سر کوراج پاٹ دلوایئے اور دھر ماتما بنائے۔

یہ بھی بات میراج نے مان لی لیکن اب بھی ساوتری ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور دھرم کی باتیں کیے جاتے جاتے میراج نے کہا، اب کیا چاہیے؟ کہنے لگی کہ میرے بھائی نہیں ہے، ایسا بردان دیتے کہ ماں کے سو بٹے ہوں۔ یہ سنیے منظور ہوئی لیکن پھر جب میراج نے مڑ کر دیکھا تو ساوتری ساتھ بولے، مانگ کیا مانگتی ہے؟ ساوتری نے کہا کہ تھوڑے سے ہے سوطا تورا، دھرم واں اور سعادت مند لڑکوں کی ماں بنائے میراج نے کہا، مانا۔ اب ساوتری نے کہا، مہیا کھانے کے لیے سنانے ہیں، جب ستیا وان ہی آپ کے ساتھ ہے تو میں ماں کیسے بنوں گی۔ سوستیہ وان کی روح واپس کی گئی اور سوسہ خوشی رہنے لگے۔

رام سیتا کا ذکر مارکنڈے جی کی زبانی

جب رام چندر وغیرہ بن میں تھے تو راوان ایک دن سیتا جی کو اڑالے جانے بن میں آیا۔ راوان نہایت دنیا کے تمام شہزوروں کا سرتاج تھا۔

برہما جی

پولست
(بیوی گدھا)

سیوا میمھو
(واپس بلا لیا گیا)

بے برون

بے شر + تین رکھشش لڑکیاں
(راکا + ہانی + پستھو تکھا)

راوان

کبھ کرن

بھیکسن

برہما جی نے جہاں تمام خلقت بنائی وہاں دوفرزند بھی پیدا کیے۔ پولست رشی اور سوامی مھو۔ پولست کی بیوی گوتھا تھا۔ اس کے بطن سے بے برون کی پیدائش ہوئی لیکن اسے بچپن سے ہی برہما جی نے سنبھال لیا۔ اب بے برون کی پیدائش ہوئی۔ اس نے ایسی چپ تپ کی کہ کویر جی نے سوچا جانے یہ عبادت کیا رنگ لائے۔ رکھششوں کی تہہ سے جمیل لڑکیاں اس کے پاس بھیج دیں۔ (راکا۔ ہانی۔ پستھو تکھا) وغیرہ نے ان چار بچوں کو جنم دیا۔ بھیکسن (دھرم کی تہہ) راوان۔ کبھ کرن (مہیب صورت) اور مہروپ نکھا (دھر ماتما لوگوں کی دشمن)

راوان نے ایسی تپیا کی کہ برہما جی اور مہا یوجی آئے اور کہا، دائمی زندگی کے علاوہ جو مانگنا ہے مانگو۔ دس مرتبہ سر کاٹ کاٹ کر چڑھایا تو بردان منظور ملا۔ جب چاہو گے دس سر ہو جائیں گے اور پھر لطف یہ کہ خوبصورتی سے

پھر دوسرا بردان یہ دیا کہ سوائے انسان، ریچھ اور بندروں کے کوئی تمہیں مار نہ سکے گا۔ جب راون کو یہ بردان مل گیا تو اسے مزہ ہو گیا کہ دیتا بھی اس سے پناہ مانگنے لگے۔ اب انہیں فکر ہوئی کہ آخر راون سے کیونکر نجات ملے۔ صلاح یہ ہوئی کہ سدا یوتا بندرا اور ریچھ بن کر دھرتی پر چلیں۔

جائی جی کے سوئمیر میں رام چندر نے رشوکا، دھنش توڑ اور ستیا جی کو بیاہ لائے۔ جب راجہ دشرتھ بوڑھا ہوا تو اس کو راج دے کر جپ تپ میں لگے لیکن منتر اخواص نے ایسی لگائی بھائی کی کہ رانی کیکئی نے اپنے دو سابقہ شوہروں کو مٹا کر چھوڑے۔ اولاً یہ کہ بھرت کو راج گدی ملے اور دہم رام کو چودہ برس بن باس۔

راجہ دشرتھ تو رام کے بن جاتے ہی جاں بحق ہوئے۔ ادھر بھرت اور شترگھن نابال سے واپس آئے تو رنگ ہی رنگ میں رام اور سیتا بن باس کو جا چکے تھے اور بھرت راجا تھا بھرت نے رام کا پیچھا کیا۔ چتر کوٹ کے مقام پر بھرت نے لوٹ جانے پر اصرار کیا۔ رام نے باپ کے وعدے کا پاس کیا۔ آخر بھرت رام چندر کی کھڑاویں لگا کر چودہ برس راج کرتا رہا۔

جن دنوں رام چندر جی پنج وئی میں مقیم تھے، اُن دنوں اس علاقے پر کھڑو کھن کا راج تھا۔ سروپ نکھا اپنے بھائی کھن کے بن میں آئی۔ پہلے رام کو بھایا پھر لکشمن کے سر ہوئی۔ اس نے غصے میں آ کر ناک کاٹ دی۔ کھڑو کھن کے چوتھے بیٹے جئی۔ سب راکھشش لڑنے آئے لیکن مارے گئے۔ اب سروپ نکھا راون کے پاس گئی اور اسے غیرت سے کہنے لگی کہ تم نے سحر کھائے بہن بن کر "مارتیج" کو بیچ وئی بھیجا۔ چھلاوے پر چھلاوے دکھائے۔ رام چندر سیتا جی کی بھونڈی کو نکلے۔ تھوڑی دیر کے بعد آواز آئی، دوڑو لکشمن رام کی جان پر بنی ہے۔

پھن گوی سیتا کو تنہا چھوڑ کر جانا نہ چاہتا تھا لیکن سیتا جی بھنر ہوئیں کہ رام کی کمک کو پہنچو۔ چلتے چلتے پھن سیتا جی کو کھن میں بٹھا گیا۔ راون آیا تو سیتا جی نے کندلی کے اندر سے پھل پھول پیش کیے لیکن راون جو برہمن کے بھیس میں تھا کہ دکھنا باہر نکل کر دی جائے۔

جب سیتا جی باہر نکلیں تو لے اڑا۔ راستے میں گدھ جٹا یونے روکا لیکن راون سے پیش نہ گئی۔ سیتا جی راستے میں پہنچتی جاتی تھیں تاکہ رام چندر کو ڈھونڈنے میں سہولت ہو۔ لڑکا پہنچ کر سیتا جی کو اشوک باغ میں رکھ کر راکھششوں کا حکم دیا۔ جب رام لکشمن ڈھونڈتے ہوئے نکلے تو گدھ جٹا لونے تمام کیفیت بیان کی اور جاں بحق ہو گیا۔ پھر راہ میں کھن ملا۔ اس نے کہا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ کچھ دور پینا سر تالاب کے پاس سگریو اور ہنومان جی ملیں گے۔ وہ سدا سے واقف ہیں۔

سگریو (بندروں کا بادشاہ) اپنے بھائی بالی کے خوف سے روپوش تھا۔ جب رام چندر جی کو آتے دیکھا، سمجھا کہ اسے کسے ہیں۔ ہنومان جی کو بھیجا کہ حال معلوم کریں۔ وہ برہمن کا روپ دھار کر پہنچا۔ پتہ لیا تو رام چندر جی تھے۔ سگریو نے فرمایا کہ چلیے سگریو کے پاس چلیے۔ بالی بڑا بھائی ہے سگریو چھوٹا۔ اس نے چھوٹے بھائی کو مار بھگایا ہے۔ رام چندر جی سے مدد سے بالی کو شکست ہوئی اور سگریو پھر بادشاہ بنا۔

اب بندر چارواںگ جاگئی جی کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ آخر مہابیر جی لنکا میں پہنچے۔ بھٹکن جو رام کی سہیلی تھی، اس سے (سیتا) جاگئی جی کا سراغ ملا۔ رام چندر کی انگوٹھی ان کو دی اور ڈھارس بندھائی۔ پہریداروں کو خبر ہوئی تو کراواں کے پاس لے گئے۔ راواں نے حکم دیا کہ دم میں آگ لگا کر بھسم کر دو۔ مہابیر جی نے لنکن میں آگ لگا کر اشوک بانکا اور بھٹکن کا گھر سلامت رہا۔

جب رام بھٹکن پل باندھ کر لنکا میں اترے اور پالا ان کے ساتھ پڑا تو آکاش سے برہما جی، اگنی دھرتھ وغیرہ اترے اور جاگئی جی کی پاکدامنی کی تصدیق کی۔ بھٹکن کو لنکا راج دیا۔ بھرت نے استقبال کیا اور رام کو گیارہ ہزار برس حکومت کی اور ان کے بطن سے دو فرزند نوا اور کش پیدا ہوئے۔

جب بارہ سال مکمل ہو گئے اور گپت رہنے کا وقت آیا تو پانچوں بھائی مندرجہ ذیل کاموں پر راجہ برات کے مع دور پردہ کے نوکر ہو گئے اور نام بدل لیے۔

(کنک نام)	قمار بازی	راجہ جد ہشرد:
(بلو)	رسویا	بھیم سین:
(ہرنبند)	بیچرانا چگانا پر مقرر	ارجن:
(گرشک)	اصطبل کا مالک	نکل:
(اوشٹ یی)	گوشالہ میں گایوں کی دیکھ بھال	سہد یو:
(سرزہری)	سودیشا رانی کی مشاطہ	درو پدی:

ابھی کچھ عرصہ گزرا تھا کہ سو دیشا کا بھائی کچک درو پدی پر فریفتہ ہو گیا۔ لاکھ درو پدی نے سمجھایا، کہ سنائی۔ کہا کہ پانچ گندھرب میرے محافظ ہیں لیکن وہ باز نہ آیا۔ بھیم سین سے مشورہ کیا کہ اسی دن میں جہاں کچک ہے رات کے وقت کچک کو درو پدی بلائے اور بھیم سین اسے قتل کر دے۔ یوں ہی کیا گیا۔ محل میں کہرام مچ گیا۔ کچک بھائیوں نے صلاح کی کہ درو پدی کو زندہ جلا دینا چاہیے لیکن عین موقع پر بھیم سین کے روپ میں آیا اور سب کو مارنے کو بچالایا۔

جب کچک کے مرنے کی خبر پھیلی تو در یودھن خوب خوش ہوا اور اسے خیال ہوا کہ اب راجہ برات کا مانتا ہے۔ حملہ کر دیا لیکن ارجن نے تھ بانی کی اور وہ وہ جو ہر دکھائے کہ در یودھن کا سارا لشکر نا کام پلٹا۔

اب تیرہ سال پورے ہوئے تو جد ہشرد وغیرہ نے اپنی اصلیت راجہ برات پر ظاہر کی۔ اس نے ارجن سے لڑکی اوترا سے شادی کرنا چاہی۔ ارجن نے اپنے لڑکے اہنمو سے اس کا وواہ کر دیا۔ اب راجہ برات نے در یودھن سے پاس ادھے راج کے سفارت بھیجی لیکن وہاں تو در یودھن بھرا بیٹھا تھا۔ نکا سا جواب دے دیا۔ راجہ دھرت راشر کا دو نوں جانب گھومتا پھرتا تھا لیکن صلح کی سبیل نہ بنتی تھی۔ انخرف سے راج گھر کے راجہ برات اور راجہ در یودھن کے رہے تھے اور لڑائی کی ٹھن رہی تھی۔

اس سلسلے میں در یودھن اور ارجن دو ارکا پہنچے۔ اس وقت مہاراج کرشن جی سور ہے تھے۔ ارجن پانچ

سرمہ بنے بیٹھ گیا۔ جب آنکھ کھلی تو ارجن سے پہلے پوچھا کہ کیوں آئے۔ اس نے کہا کہ میدان جنگ میں آپ کی
 حالت کا حتمی ہوں۔ پھر در یودھن سے سوال ہوا۔ اس نے کہا، آپ کی مدد کا میں بھی خواہاں ہوں، جواب ملا..... ارجن
 سے تھری ہوں گا اور در یودھن کے ساتھ میری فوج اور خزانہ لیکن میں ہتھیار کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔

در یودھن کو سب نے سمجھایا لیکن وہ غصے کا بھوت تھا۔ اپنی طاقت کے گھمنڈ میں فوج لے کر وکشیتر کے میدان
 سے نکلے۔ ادھر پانڈو بھی پہنچے اور جنگ شروع ہوئی جس میں راووں کو شکست اور پانڈوؤں کو فتح نصیب ہوئی۔
 (یہ سب کچھ مشکل محاورے، الفاظ بھی خالصی نے اپنی رہنمائی کے لیے لکھے ہیں)

مولفہ: افتخار

اونٹ کی چوری نہوڑے نہوڑے ہو گئی: چوری چھپے بڑی بات کا طے پانا (مہا بھارت)

چنے کا چبانا اور شہنائی کا بجانا ممکن نہیں: کام کا آسان نہ ہونا

دھجائیں: بھنڈا کشان پتا کاٹیں: جھنڈا

چڑی مار کا ٹولا بھانت بھانت کا پیچھی بولا اپنی اپنی ہانگنا

بھوت منڈنی چوہا بیاں ہونا: پور بھی زور آور ہونا

لکھوری تنکیا لیا: پاس ایک گھنٹی نہ رہنا

ایک ایک پولے میں کام تمام: ایک ہی وار میں ترکی تمام

ٹوکنی: اوکھیاں سنانا

ہوا اور بڑھنا: حوصلہ دینا

آنکھوں پر پھیکری رکھنا: شرح بالائے طاق

چھوکارا: گھوڑے ہانگنا

اشوبدیا: اسپ دانی

استی: ستائش

پرائے بچے پہ چھینگر چڑھ بیٹھنا: ہرایا مال ہتھیانا

غزے ڈبے: دھمکیاں

سنکلیپ: ارادہ، خیال

ہنکار: ٹھوک بجا کر

دل اوچھا کرنا: دل گھٹانا

بردی مار مارنا: بہت مارنا

اکشونی: لاکھوں

چھتارے: خوب پتوں والا

اوبدے منڈے انج جوان ہوئے جیویں دودھ تے ملائی آؤندی اے کھٹو کھٹ لٹھاں کھلو گنیاں۔

ما تھا	متھ:
عنايات کيس	چھین نکلے بھنادیئے:
مینڈک کو بھی زکام	خوب رنگ لائی گلہری:
مل کر کام کرنا بے عزتی کا باعث	سانجھے کی ہانڈی چورا ہے پہ پھوٹی:
حصے بخرے	سرتا بھرتا کرنا:
خوف	کیلے میں تھر تھری پڑ گئی:
ناراض	چرانڈے ہوئے:
فوجیں آ راستہ ہوئیں	بندیاں بندھ گئیں:
پکی بات	کبھی بدی بات:
بہت مینہ برسا	وہ دو گنزا برسواہ جھڑی لگی:
علم موسیقی	گندھرب:
ستھم گتھا	گھتاؤ ہو رہا ہے:
سواری	باہیں:
پیسہ گرہ میں باندھو	دولت ڈب میں کرو:
طلاق	تلا نجلی:
ہوا	ہوان:
کچھ نہ بچا	ایک بھٹکا بھی نہ بچا:
آسان کام	سہل سا لٹکا:
چار کوس	جو جن:
چپ تپ	سمرن:

ان تحریروں کا مقصد یہ ہے کہ خاں صاحب انتہائی سوچ بچار کے بعد، گہرے مطالعہ سے استفادہ کر کے نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندو اپنی اتہاس کا حصہ ہے۔ یہاں دیوتا زمین پر آ کر شادیاں کرتے ہیں۔ راکھشش انسانوں کے درپے ہیں۔ اُن کے دھرماتما لوگ گندھرب شادی کر کے اولاد کے مالک بن جاتے ہیں اور پھر اپنی ہوس مٹانے کے اولاد کی پروا نہیں کرتے اور اپنے چپ تپ میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اس ہسٹری میں ایفائے وعدہ، استقامت اور حدود کی پہچان کم ہے۔ اسی لیے خاں صاحب ہندو کی طرف سے بہت Disillusion ہوئے لیکن اس سے بھی زیادہ کوفت انہیں پاکستان میں ساٹھ سال گزار کر رہی۔

تہہ پہنچا کہ مسلمان بھی اونچ نیچ کا شکار ہیں۔ سید، پنہان، جاٹ اور دیگر ذاتیں مٹھی بند مقبض ہیں اور کسی طرح کسی غم ہونے کو تیار نہیں۔ جس اخوت، بھائی چارے، مساوات کا خواب وہ دیکھ رہے تھے، اس کو بہت دھچکا لگا۔ یہ غالباً انسان کی تقدیر ہے کہ وہ آدرشوں کو ہمیشہ کے لیے اپنا نہیں سکتا۔ اپنی نیت کے ہاتھوں خوار ہوتا ہے۔

سختی سرحدوں میں آر پار جانے پر مجبور ہے۔

ظاہر ہے پچھلے ساٹھ سال سے صورتحال ہولے ہولے بدل رہی ہے۔ بلی کا نرم و نازک بچہ آنکھیں کھول کر کچھ دیکھ رہا ہے۔ اختر شیرانی کی سلیٹی پر نظمیں ایک عرصہ سے اب طاق پر سجا کر علمی ادبی سطح پر خاص کر انگریزی سے خوشہ کشی کی جا رہی تھی۔ ”مدوجذرا سلام“ کے حالی، حفیظ جالندھری، علامہ اقبال، ظفر علی خاں اور دوسرے حساس لوگوں نے کلام کو اظہار خیال کیا تھا اور وہ جانتے تھے کہ اصلی سمت کونسی ہے۔

لیکن ہولے ہولے ادیب کی نظروں سے نوعیہ ملک کی منزل بھی دھندلا رہی تھی۔ کشمیر میں لبو کی ندیاں بہہ کسے کوئی قابل ذکر کہانی لکھی نہیں جاسکی۔ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو کر اندھیرے میں ڈوب گیا۔ بڑے ادیب افسردہ تھے۔ ان کے دل میں شکاف نہ پڑتا۔ یہ مت کھیلے کہ میں اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھ رہی ہوں، بلکہ صرف یہ بات کہنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ ہم لکھنے والوں نے اپنے لوگوں کے شعور کی تہذیب کرنے میں کیوں خاص مدد نہیں کی۔

ہمارے عہد کے ادیب ان پڑیچ گیوں کو تو سمجھتے ہیں جن میں محبوبہ کے نقش پالتے ہیں لیکن ہم نے اس ایک سمت پر اتنی تمام محبتیں قربان کر دی تھیں۔ وطن پر نظمیں لکھنے والا دوئم درجہ کا شاعر کہلاتا ہے۔ ماں، بھائی، دوست پر نظم لکھنے والا محسیم شاعر نہیں بن سکتا جتنا رومانی شاعر۔ ہم اختر شیرانی کی نظموں کو تو پھر یاد رکھتے ہیں حالی، حفیظ، اقبال اور ظفر علی خاں کی جو سولتے جا رہے ہیں۔

ہندو مسلک کو سمجھ کر اب ایک بار پھر خاں صاحب سوچ رہے تھے کہ اب جو افتاد مسلمانوں پر پڑی ہے، ہو سکتا ہے اس دینے میں ہمارا سب کچھ بہہ جائے اور وہ محبوبہ بھی نمک کی پتلی سمندر کی اتھاہ لگانے نکل جائے اور کہنے کو کچھ باقی نہ رہے گی لیے انہوں نے اپنی تحریر میں نئی سمت تلاش کی۔

پاکستان اور صرف پاکستان کی بقا کا خواب!
بیسویں صدی کی آخری دہائی مسلمانوں کے لیے بڑی اہم فیصلہ کن اور تھیرا میز ثابت ہوئی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ دنیا میں صرف وہ خطے انتشار کا شکار ہیں جہاں ابھی اسلام میں دم خم ہے۔

افغانستان میں کیسی ہنڈیا پک رہی تھی۔
ایران اور عراق کس طاقت کے ہتھے چڑھ کر آپس میں گتھم گتھا ہونے والے تھے۔
کشمیر میں آزادی کی کیا کچھ قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔
روس کی اسلامی ریاستوں پر کیا کچھ ہو گزرا؟

ہندوستان میں جہاں جہاں مسلمانوں کی آبادی ہے وہاں وقتاً فوقتاً بظاہر ایک سیکولرٹیٹ میں کیسے کیسے فسادات ہوتے ہیں؟ بابر کی مسجد شہید کرنے کے لیے پانچ لاکھ ہندو مختلف مقامات سے کیوں اکٹھے ہوتے ہیں؟

سعودی عرب کی حفاظت کے بہانے تیسری عالمی جنگ کے لیے عین وہی دھرتی کیوں چنی جا رہی ہے۔ مسلمانوں کے لیے دنیا میں اہم ترین جگہ ہے۔

یہ اور ایسے ہی بہت سے اور سوالات وقت سے بہت پہلے خاں صاحب کے ذہن میں جاگ اٹھے تھے۔ لوگ ان سارے مقامات پر صورتحال کو اقتصادی مسئلہ سمجھتے، کچھ ذہین لوگوں کا خیال ہے کہ جب کوئی چیز ایجاد ہو جاتی ہے پھر اُس کے استعمال کی وجہ بھی خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ چونکہ ترقی یافتہ ممالک میں ہتھیاروں کی پروڈکشن اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب ان کا اپنے انڈسٹریل ملکوں میں ذخیرہ اندوز رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اسی لیے وہ اپنی فلاحی مسئلہ سے دوران ہتھیاروں کو رکھنا، استعمال کرنا اور نیست و نابود کرنا چاہتے ہیں۔

ہتھیاروں کو ٹیسٹ کرنے کے لیے وہ چاہے سمندر اور ریگستانوں کا رخ کریں لیکن اپنے پروڈکٹ کے استعمال کے لیے انہیں ہری بھری بستیاں درکار ہوں گی جہاں سیاہ اور براؤن جانداروں کو مکھیوں کی طرح مار کر ان کا خمیر ملامت نہ کرے۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلامی ملک میں اپنے اندرونی انتشاروں کی وجہ سے غیر کے ہتھے چڑھ رہی ہیں۔ مسلمانوں کا مسلمان سے اس درجہ نفاق ہے کہ بھائی بھائی ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور مردہ گوشت کھانے سے انہیں نہیں کرتے۔ ایسے میں جب اندرونی خلفشار نے ملکوں میں بد امنی پھیلا رکھی ہے، راجہ گدھ ہر طرف منڈلاتے نظر آتے ہیں۔

ہم ادیب لوگ ہیں۔ چاندنی، گیت اور ساز سے محبت کرنا ہمارے خمیر میں ہے۔ ادیب لوگ دراصل جذبات، حساس طبیعت اور اندر رہنے والی برسات کے سہارے زندگی بسر کرتے ہیں اور خاص طور پر برصغیر کا شاعر اس سماج ہی کی بے انصافیوں سے چھپتا پھرتا ہے اور اس کے نزدیک آفاتِ ارضی و سماوی میں سب سے بڑا جان لیوا غم جاننا ہے لیکن یہ خاں صاحب کا کشف سمجھئے، ان کی بصیرت جانیے، وہ پاکستان پر وارد ہونے والی بلاؤں سے ہی واقف تھے بلکہ تمام عالم اسلام پر چھائے اندھیرے بادلوں کو بھانپ سکتے تھے۔ انہوں نے ذاتی مسلکوں کو طاق پر رکھ دیا تھا۔

سنا ہے کہ وہ انسان جسے ایک محبت بھی مل جائے زندگی کی لہروں پر اپنی ناؤ کھینچنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کروڑھ، لاکھ اسے ڈمگ ڈمگ کرتے رہیں۔ ڈبونے کی کوشش کریں لیکن محبت کا چپو ڈوبنے نہیں دیتا۔ زندگی پیاپا ہو تو کشتی سے اتر کر وہ اسے دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ پانی اتھاہ ہو تو وہی بے لوث محبت سمت قائم رکھتی ہے اور لاکھ کشتی آئیں کشتی کنارے لگ ہی جاتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ خاں صاحب کو پاکستان سے کچھ ایسی ہی بے لوث محبت ملی کہ پھر سفر نہ بے سمت رہا نہ ڈمگ گیا۔ انہیں کسی اور راستے کی تلاش بھی نہ رہی۔

خاں صاحب کے پیتل کو چکانے والی ایک ماں سردار بیگم کی شخصیت تھی۔ دوسرے وہ داؤ جی تھے جنہوں نے خاں صاحب کی تربیت کی۔ تیسرے یہ وطن کی ان سے محبت تھی یا ان کی وطن سے رغبت جس کے باعث ان میں کیمپ میں ریفریجی لوگوں کے درمیان کام کرنے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ وہ صبح سویرے اپنے ساتھ کھانے کی پوٹلی باندھ کر چلتے والٹن پہنچتے اور پھر سارا دن مہاجروں کے مسائل سلجھاتے۔

ممتاز مفتی کے ہمراہ کام کرتے پھر پیدل گھر پہنچتے۔ شاید اسی پیدل سفر کے دوران ان پر کھلا ہو کہ انسان دراصل کے ہاتھوں روحانی گراوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ مہاجر بڑے شوق سے لاتعداد قربانیاں دے کر اس وطن پر نثار میہاں تھے لیکن یہاں پہنچ کر اسی دل نے دیگر خواہشات کو جنم دینا شروع کر دیا۔

اب سبھی کو چھوڑی ہوئی پراپرٹی درکار تھی۔ مال و دولت کی خواہش تھی۔ رتبہ، عزت اپنی تعریف سننے کی چاہ نے تھی۔ یہ سب بڑا کر دیا تھا۔ ہم پر جو احسان قائد اعظم نے کیا، وہ بھولنے لگا۔ انسان بھی عجب ہے کہ جو شخص آپ پر احسان کرتا ہے، اس کا دشمن ہو جاتا ہے۔ یہی روحانی گراوٹ دیکھ کر اشفاق احمد نے اپنا راستہ بدل لیا۔ ان کے افسانوں میں عجب قسم کی سنجیدگی لگی اور وہ جب گورنمنٹ کالج میں ایم اے اردو کرنے کے لیے پہنچے تو وہ ”ایک محبت سوانسے“ کے لکھاری بن گئے۔ ان کے اندر وہ دھندلی شاہراہ بھی کہیں اندر نظر آنے لگی تھی جس کے سنگ میل ابھی واضح نہ تھے۔

یہ دور پاکستان میں نووارد لوگوں کی Insecurity کا تھا۔ مسکوں اور آدرشوں کی خاطر قربانیاں دینا بڑا مشکل ہے۔ پاکستان ایک آدرشی ملک تھا۔ اس کے آدرش دنیاوی حصول سے وابستہ نہ تھے بلکہ روح کی افزائش کی تلاش میں تھے۔ رفتہ رفتہ مہاجر لوگ اپنے مسائل کا حل دنیاوی حصول میں تلاش کرنے کے لیے رنگ رنگ کے جرم کرنے لگے۔ یہ حالت منوانے کی خاطر ہر طرح کی شیخیاں ماری گئیں۔ اپنے آپ کو برتر ثابت کرنے کے لیے نسل، رنگ، زبان نہ سمجھ کر کین باتوں کا سہارا لیا گیا۔

گھروں کے تالے توڑے گئے۔ مال غنیمت ہاتھ آیا تو الٹ منٹ کے چکروں میں لوگ نیزھے ہو گئے۔ یہی دور تھا جب قائد اعظم کا آدرش دھندلا گیا۔ ذاتی اقدار مار کھا گئیں اور لوگ مادہ پرست ہو کر بھانت بھانت کی باتوں میں لپٹنے لگے۔

تمام مسکوں سے گزر کر ”کام کام کام“ کی حدت سے بھی نکل کر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ کبھی کبھی کام بھی سمت سے نہیں رکھ سکتا۔ کام کی سمت اگر مثبت نہ ہو تو نفع کے بجائے نقصان پہنچ جانے کا احتمال ہے۔ انہوں نے خلق کے ساتھ جس بڑھانے کے لیے ان کے دکھ درد میں شریک ہو کر یہ نتیجہ نکالا کہ پاکستان کے غریب عوام کا بالخصوص اور مسلم امہ کا عوامی عجز و عزت نفس کا ہے۔ ضیاء الحق کا زمانہ تھا۔ انہیں کسی تقریب کے سلسلے میں اسلام آباد جانا ہوا۔ وہاں بالآخر لوگوں کی محبت میں پہلی بار خاں صاحب نے عزت نفس کا جھنڈا بلند کیا۔ انہوں نے وثوق سے کہا کہ ہماری ضرورت ہرگز ”روٹی کی طرف مٹکان“ نہیں ہے۔ یہ چیزیں ہمیں ہندوستان میں بھی جیسی جیسی میسر تھیں لیکن اقلیت ہونے کے ناطے ہماری عزت کے لیے لڑنا مجروح ہوتی تھی۔ اسی لیے یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ۔

خاں صاحب نے شعوری اور لاشعوری طور پر پاکستان کے لیے اس وقت جدوجہد شروع کی جب قائد اعظم کے بغیر جیل میں قید ہونے کی بجائے انگریزوں کو آئین کی پابندی میں گھیر کر پاکستان کا مطالبہ کر رہے تھے۔

یہ جدوجہد شروع سے آخر تک خاں صاحب کا بنیادی مسلک رہی اور بالآخر ”عزت نفس“ کے مطالبے میں بدل گئی۔ جھنڈا انہوں نے اپنے بیٹوں جیسے عمران خاں کو دے دیا۔ اسی جھنڈے کی سر بلندی کے لیے آج بھی عمران سرتوڑ کر رہا ہے اور آج 2007ء میں جب تمام جماعتیں اپنے مفاد کے لیے لڑ رہی ہیں اور بظاہر اسے خلق کی خدمت کا

نعرہ عطا کر رہی ہیں، عمران خاں اپنی نامزدگی کے کاغذات پھاڑ کر دعویٰ کر رہے ہیں۔

خاں صاحب کے کچھ کاغذات ایسے ملے ہیں جو ان کی خلق کی طرف مراجعت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ صاحب کی تحریر کے اقتباس (

1- 28000 روپے واپس کرنے والا تانگہ بان اور اس کی خبر اخبار میں لگانے کا قصہ۔

2- زندہ دل زندگی سے بھرپور سلطان میر پور ماسٹر کا بیٹا اور میر منٹو کا دوست اور بمبئی جا کر داد عیش دینے والے ناولٹ۔

3- ریاض پاڈا جو پہلے بیجروں کے ساتھ ملا۔ پھر دو ایٹیاں اور طلا بیچنے لگا۔ آخر میں تقریریں کر کے اسمبلی کا لیڈر گیا۔

4- اصولوں کا ٹوٹنا اور قدروں کا فقدان اس کی وجہ۔ میکنا لوجی اور مذہب۔

5- کلچر کیا ہے اور اس کو کس طرح سے دوسرے کلچر سے الگ مانا جاتا ہے۔

6- سلیم بونگا ایم کے بارے میں تھیوری پیش کرتا ہے۔

7- Olga کے نام Varek کے خطوط۔ اسی طرح Malina کے نام کا فکا کے خطوط!

8- ملا صبغت اللہ کی لڑکی اور اس کی کالج کی زندگی۔ اپنی سہیلی شازیہ کے ساتھ دوستی۔ اس کے کزن سے محبت۔ کزن کے والدین کو یہ خبر ہونے پر کہ وہ ایک مٹا کی لڑکی ہے اس کا مشتعل ہو کر باپ کو خفیہ طور پر قتل کرنے شازیہ سلیم بونگا کی کزن ہے۔

9- مٹا لوگوں سے سلیم بونگے کا انٹرویو۔ کمال اتاترک کی تعریف و توصیف کہ اس نے مٹاؤں کا قلع قمع کیا۔ سیاسی مٹاؤں میں فرق (کیا سارے مٹا مل کر اسلام کا ضابطہ حیات چھپوا کر دے سکتے ہیں۔)

10- سیکولر اور مذہبی میں فرق۔ سیکولر قوم اور سیکولر حکومت میں فرق۔ قوم ہمیشہ Tolerant ہوگی لیکن حکومت ہوگی۔

11- پیٹرول پمپ کے پاس خوشی محمد کے گیراج میں شیطان سے ملاقات۔

12- دولتانی کی صوباں جس سے برکی نے شادی کی اور وہ دیہاتی لڑکی بیجم کے ایلوٹیم سٹور کی مالک بنی۔

13- بابا احسن کا قصہ جو شرافت نوشاہی صاحب نے سنایا۔

14- ایک ڈرامہ جو سلیم بونگے نے T.V. کے لیے لکھا اور جو reject ہو گیا۔

جائزہ کا ذکر: سمندر اور دریا کا بیٹا۔ منہ جو الاکھی پر ہے اور پاؤں ملتان میں دفن ہیں۔

بھومی چند: Founder of Kangra

جنم پتری: Vansavali

(نسب نامہ) طاقتور راجپوتانہ کے خاندان سے پرانے راجپوت ہیں اور کٹوچ راجپوت سب سے پرانے ہیں۔

سکندر بیاس کنارے رکا تو Ptolemy نے جالندھر کے ملک کا ذکر کیا لیکن سنسکرت کے ادب میں اس کا سراغ
 بہت کم ہے۔ البتہ تری گارتا کا ذکر موجود ہے اور راجہ سسار من کا ذکر بھی ملتا ہے جس نے کانگڑے کا قلعہ تعمیر کیا۔
 ہیون تسانگ نے جس جالندھر کا ذکر کیا ہے اور جو اس کا علاقہ بیان کیا ہے۔ اس اعتبار سے چمبہ کی ریاست
 سوکیت اور ساتادرو کی ریاستیں جالندھر کی ریاست میں شامل ہیں۔

سورکرافٹ جب 1820ء میں نداؤں کے علاقے میں آیا تو اس نے لکھا کہ کانگڑے کی ریاست میں تین

شہر تھے۔

کنوچ چھنگار

کانگڑہ کان کی شکل سا

نگرکوٹ یا کوٹ کانگڑہ بھی دارالخلافہ کے نام ہیں۔

نگرکوٹ میں درگاہ کا مندر۔ یہ مورتی مرد کی لگتی ہے۔ سب اسے ماتا کہتے ہیں۔ مندر کی چھت اور فرش چاندی
 سے بنے ہیں۔ اسے ابوالفضل نے مہامایا لکھا ہے جو یہاں کی رانی تھی۔ لیکن دنیا میں بدی دیکھ کر آتم ہتھیا کر لی۔ کچھ
 عرصے بعد یہاں بدی کی شکتی بھی سمجھتے ہیں۔

جوالا مکھی: بالاگھاٹ پہاڑ کے ٹھنڈے پانیوں میں سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں۔ چندر منی کنوچ آبائی راجہ
 کے قلعے کا نام فرشتہ بھیم کا قلعہ لکھتا ہے جس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ قلعہ غالباً راجہ بھیم چندر نے

کانگڑہ نہ صرف جالندھر کا حصہ رہا ہے بلکہ یہ علاقہ کشمیر کے راجہ شنکرورما نے بھی ختم کیا تھا۔ راجہ شنکرورما نولا کھ
 میں سوا تھی لے کر گجرات فتح کرنے لگا۔ تری گارتا کا راجہ پرتھوی چندر پہلے ہی اپنا بیٹا ریغمال کے طور پر راجہ شنکرورما
 کے چکا تھا لیکن جب اس نے سمندری فوج بڑھتے دیکھی تو فیصلہ نہ کر پایا اور قلعے سے اٹھ بھاگا۔
 (ایسے کاغذات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ خاں صاحب پران کے سیاسی مسلک کا گہرا اثر تھا اور اسی نے
 اس کے ذاتی مسلک کو ڈھانپ لیا تھا۔)

اشفاق احمد کی بطور براڈ کاسٹر قومی خدمات

محمد جاوید پاشا

23 مارچ کی قیام پاکستان کے حوالے سے بہت اہمیت ہے۔ یہ قرارداد لاہور کا اہم دن ہے، وہ قرارداد جو قیام
 پاکستان کی دستاویزی شکل میں وجود میں آنے کا باعث بنی جس نے مسلمانوں کو باقاعدہ ایک قوم کی حیثیت سے ایک ملک
 بنانے کی بنیاد فراہم کی۔ قرارداد لاہور جو 23 مارچ 1940ء کو لاہور میں منظور کی گئی، میں واضح طور پر کہا گیا کہ کوئی
 ایسا منصوبہ اس وقت تک قابل عمل اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا تا وقتیکہ وہ ایسے اصولوں پر وضع نہ کیا گیا ہو
 جس میں جغرافیائی طور پر مستقل وحدتوں کی حد بندی ایسے خطوط میں کی جائے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت

ہے۔ ایسی آزاد ریاستوں کی صورت میں کی جائے جن کی مشمولہ وحدتیں خود مختار اور مقتدر ہوں اور انہیں کئی اختیارات حاصل ہوں۔ یہ صدیوں پرانا خواب تھا جس کی تعمیر کے لیے محمد علی جناح کی ذات کو اللہ تعالیٰ نے اس کی تشکیل کے لیے کیا تھا۔ قائد اعظم کی دورانِ اندیش نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ برصغیر سے انگریزوں کے نکل جانے کے بعد مسلمان حکومتیں جائیں گے۔ اسی لیے انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی کوششیں ترک کر کے مسلمانوں کے حقوق کی جدوجہد شروع کر دی۔ کوششوں کے نتیجے میں ایک فیصلہ کن موڑ 23 مارچ 1940ء کا منٹو پارک کا جلسہ ثابت ہوا جس نے واضح طور پر پاکستان کی بنیاد رکھ دی۔ قائد اعظم اور ان کے ساتھیوں کی مدد اور قربانی سے 14 اگست 1947ء کو مملکتِ خداداد پاکستان وجود میں آ گئی۔

قیام پاکستان کے بعد بھی اس کی تعمیر اور ترقی کے لیے ملک کے بہت سے سپوتوں نے کام کیا اور اس کے نظریے کی حفاظت کے لیے روپے پیسے، محنت، علم اور قلم سے اس کی آبیاری کرتے رہے۔ ابلاغِ عامہ نے خصوصی طور پر نظریہ پاکستان اور دو قومی نظریے کی وکالت اور فروغ کا ذمہ تادم تحریر اٹھائے رکھا ہے۔ اخبارات اور دیگر نشریاتی ادارے اس سلسلے میں اہم خدمات انجام دیتے آئے ہیں۔ بعض شخصیات نے اس مہم میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ان میں ایک بڑا نام اشفاق احمد کا ہے جو اپنی ذات میں مکمل نشریاتی ادارہ تھے۔ وہ ادیب، افسانہ نگار، ناول نگار، ڈراما نگار، صدا کار اور دانشور کی حیثیت سے نصف صدی تک ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ادبی دنیا پر حکمرانی کرتے رہے۔ ان کی تحریریں نمایاں موضوع اخلاقیات، وطن سے محبت اور نیکی کا پرچار رہا۔ تاہم اس کے لیے جو اسلوب اور ذرائع اور طرزِ تحریر اختیار کیے وہ نہ صرف نیا، انوکھا، دلچسپ تھا بلکہ لوگوں کے لیے بہت پرکشش بھی تھا۔ اگر کہا جائے کہ انہوں نے وعظ کو جدید شکل دی تو غلط نہ ہوگا۔ بالخصوص آخری عمر میں ان کا پروگرام ”زاویہ“ ایک جدید سٹائل کی دانشورانہ گفتگو کا حسین گل دستار تھا۔ تاہم اشفاق احمد کی بطور براؤڈ کاسٹر قومی خدمات سب سے زیادہ قابلِ تحسین ہیں۔ ریڈیو سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ ان کے لیے لکھنے کا جوفن اشفاق احمد کے پاس تھا، وہ کسی اور کے حصے میں نہ آسکا۔ ریڈیو ڈرامہ اور نیچر پروگرام کے لیے لکھنے مانے جاتے ہیں۔ ایک ”تلقین شاہ“ کی مثال دینا ہی کافی ہے۔ چالیس سال کے طویل عرصہ پر محیط یہ نیچر پروگرام پاکستان لاہور سے ہر ہفتے باقاعدگی سے چلتا رہا اور ان کی وفات تک جاری رہا۔ اس پروگرام کو وہ نہ صرف لکھتے تھے بلکہ اس کے اصل ہیرو اور روح رواں ”تلقین شاہ“ کا کردار بھی خود ادا کرتے تھے۔ وہ ایک طویل عرصہ تک اسے خود پروڈیوسنگ کرتے رہے۔ ”تلقین شاہ“ نے بطور پاکستان کی آواز جو خدمات انجام دی ہیں، شاید ہی کسی اور پروگرام کے حصے میں آسکیں ہوں۔ یہ اشفاق احمد کی قومی خدمات کی معراج تھی۔ گو انہوں نے پاکستان کے حوالے سے لاتعداد کھیل لکھے۔ تاہم شاہ شاہ ایک شاہکار ہے جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ”تلقین شاہ“ کا موضوع پاکستان تھا۔ پاکستان کی سیاست، معاشرتی، معیشت، معاشرتی ترقی، ادب، تاریخ، نظریات، اخلاقیات، عالمی مسائل، مسلمانوں کی پسماندگی کے سبب قوموں کے عروج و زوال، عالمی سیاست و معیشت، غربت، علاقائی کشمکش، پاک بھارت تعلقات، کشمیر، فلسطین، مذہب و سائنس ترقی..... الغرض کوئی ایسا شعبہ، ایشو، شخصیات اور علاقائی، قومی اور عالمی مسئلہ نہ تھا جو اس میں ایک خوبصورت اور پرکشش ڈرامائی انداز میں discuss نہ ہوتا۔ ”تلقین شاہ“ نے پاکستان کے نظریات کو نشریاتی دفاع سے مضبوط

ہر دور میں، ہر حکومت میں، ہر حالات میں پاکستان کے داخلی علاقائی اور عالمی خلفشار کو نہایت خوبصورت طریقے سے دور دنیا کے سامنے رکھا اور اس کی وضاحت اور وکالت کی۔ اشفاق صاحب نے تلقین شاہ کے کردار میں تمام تر کوتاہیوں اور منفی رویوں کو اپنی ذات پر لے لیا اور اس کے ذریعے اصلاح کی راہیں بھی نکالیں۔ بالخصوص کشمیر کے اشفاق صاحب نے ”تلقین شاہ“ میں تسلسل سے پیش کیا اور اس مسئلے کو اپنے پروگرام کے حوالے سے ہمیشہ زندہ رکھا۔ کشمیر میں کشمیر کو ایک گلدان کے سہل کے طور پر پیش کیا گیا۔ ایک گلدان جو اس پڑوسی کی ملکیت ہے جس کو اس نے اپنے سر میں زبردستی سجا رکھا ہے اور واپسی کے لیے ہر مرتبہ نت نئے حیلے بہانوں سے انکار کر دیتا ہے۔ یہ پڑوسی ہاشمی صاحب ہیں اور کشمیر کو گلدان کی شکل میں پیش کیا۔ تلقین شاہ کے معاون کرداروں میں ہدایت اللہ، زہرہ، سلیمان، رقیہ، بنو، سید محمد، مستقل کردار تھے۔ ”تلقین شاہ“ پاکستان کی خارجہ پالیسی کی تشریح، حمایت اور وکالت کا ایک اہم ذریعہ تھا۔

پاک بھارت جنگ 1965ء اور 1971ء میں یہ پروگرام حکومت پاکستان اور مسلمانوں کی نمائندہ آواز رہا ہے۔ فوجی جوان سرحدوں کی حفاظت میں جان کی بازی لگا رہے تھے تو تلقین شاہ ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کرتا تھا۔ 1971ء کی جنگ میں ”تلقین شاہ“ از خود سرحدوں پر پہنچ گیا اور اس کے عنوان اور کرداروں نے ایک نیا روپ اختیار کیا۔ اشفاق احمد دادو لوہار بن گئے اور پروگرام یوں شروع ہوتا ”دادو لوہار ولد شہک لوہار، سکشن کومٹری لوہاراں حال مقیم پل کھنڈ۔ آپ سے مخاطب ہے۔“

”تلقین شاہ“ پاکستان بلکہ برصغیر میں سب سے طویل عرصہ تک چلنے والا ریڈیو پروگرام ہے۔ اشفاق احمد نے اس فنکاری سے ادا کیا، لکھا اور پیش کیا۔ ان کی ذات براڈ کاسٹنگ کے شعبہ کی ایک جامع اور ماہر ترین مثال تھی کہ کتنی نثریات کے ہر شعبے کو سمجھتی تھی اور اس پر مہارت رکھتی تھی۔ اشفاق صاحب نے ”تلقین شاہ“ کے ذریعے جو قومی خدمت کی طویل عرصہ تک کی ہے اس کی مثال شاید ہی کوئی دوسرا شخص دے سکے گا۔ ریڈیو یوں بھی از خود ملکی خدمات میں حثیت رکھتا ہے اور اس شعبے میں اشفاق صاحب کی حثیت ایک رہنما کی سی تھی۔ ریڈیو پاکستان کے لیے ”تلقین شاہ“ پاکستان کے مختلف ایڈیٹرز پر اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا موثر ذریعہ ثابت ہوتا رہا ہے۔

پاکستان نہیں ویرن کے آجانے سے اشفاق احمد وہاں بھی بانی لکھناری کے طور پر آئے اور اپنی وفات تک چلے رہے۔ یہاں بھی ان کے ڈراموں کے موضوعات میں ملک سے محبت، اخلاقیات اور عالمگیر سچائی فرنٹ پر نظر آتی ہے۔ یہ پاکستان، قیام پاکستان، پیدائش قائد اعظم اور دیگر اہم قومی دنوں، امور و واقعات اور معاملات پر اشفاق صاحب نے موثر طریقے سے حب الوطنی کے جذبات سے بھرپور ڈرامے پیش کیے۔ ان میں ان کا ”برگ آرزو“ اور ”ننگے پاؤں“ طویل دورانیے کے کھیل شاہکار حثیت کے حامل ہوں گے۔ ”ننگے پاؤں“ میں انہوں نے دو بڑی طاقتوں امریکہ اور سوویت یونین کی عالمی بالادستی اور اس کے نتیجے میں چھوٹے ملکوں میں پیدا ہونے والے مسائل اور ان طاقتوں پر انحصار حثیت دلچسپ اور ڈرامائی انداز میں پیش کیا تھا۔ اسی طرح ”برگ آرزو“ پاکستان کے حوالے سے ایک جذباتی کھیل تھا جسک سے محبت کے جذبات پیدا کرنے میں کمال مہارت سے لکھا گیا تھا۔

اشفاق صاحب کی توجہ انفرادی اور کردار سازی پر بھی گہری تھی، معاشرتی برائیوں کو اس انوکھے انداز سے پیش

کرتے کہ دیکھنے والا یوں تو ایک دلچسپ ڈرامہ دیکھ رہا ہوتا تھا مگر در پردہ وہ اپنے اندر از خود تبدیلی محسوس کرتا اور غیر معمولی طور پر مثبت رویوں کی طرف مائل ہونا شروع ہوتا جس کی ایک مثال ”فہمیدہ کی کہانی۔ استانی راحت کی زبانی“ ہے۔ کھیل میں بیجا نمود و نمائش، شو بازی اور دکھاوے کو جس پُراثر انداز میں دکھایا گیا ہے، اس کی مثال ملنا محال ہے۔

اشفاق صاحب کی زندگی کے آخری پانچ سات سالوں نے ایک نئے اشفاق احمد کو دریافت کیا۔ یہ ایک نئے اشفاق احمد تھے۔ اپنے ٹی وی پروگرام ”زاویہ“ میں وہ اپنی ذہانت، بصیرت اور دانشوری کی بہت اونچی منزل پر نھرتے ہیں۔ انسانی معاملات، انسان سے انسان کا تعلق، رویے اور زندگی کے دیگر اہم پہلو پر ان کی سیر حاصل، پُراثر اور دلچسپ گفتگو ہر عمر کے لوگوں کے لیے مشعل راہ رہی ہے۔ قومی اور ذاتی اہمیت کے موضوعات کو ذاتی تجربات اور واقعات سے جس پُراثر کشش طریقے سے سجاتے تھے، اس سے ایک گل و گلزار کھل اٹھتا تھا۔

اشفاق احمد کو ہم ایک افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار کی حیثیت سے تو خوب جانتے ہیں مگر ان کی تحریروں کے موضوعات کو اگر دیکھیں تو اس میں زندگی کے دیگر مسائل و معاملات کے علاوہ ایک قومی رنگ بھی نظر آتا ہے جو ان کے موضوعات میں نمایاں اور چھپایا ہوا ہے۔ یوں اگر ہم ایسی شخصیات کا ذکر کریں جنہوں نے پاکستان کی بھرپور خدمت کی تو ان میں اشفاق احمد نمایاں شخصیت کے طور پر نظر آتے ہیں جنہوں نے بطور لکھاری اور براڈ کاسٹر قوم کی غیر معمولی خدمت کی ہے۔ یوم پاکستان کے موقع پر ہم ان کی خدمات کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں جو آنے والی نسلوں کے لیے کردارِ نمونہ کے لیے ایک عمدہ مثال ہے۔

آسمان تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے

”تلقین شاہ“ کا پروگرام ریڈیو پاکستان کا منظر پر ڈراما رہا۔ گنیز بک آف انفارمیشن میں اسے دنیا میں ہونے والے دوسرے درجے پر رکھا گیا ہے۔ یہ پروگرام 1965ء میں شروع ہوا۔ پھر جب 1989ء میں بے نتیجہ آج میں تو دو سال کے لیے تلقین شاہ بند کر دیا تھا۔ شاید اس کی تحریک ہندوستان دوستی یا پھر کوئی اور وجہ؟ ان ہی دو سالوں کے لیے خاں صاحب کی سروس اردو بورڈ میں بطور ڈائریکٹر بھی معطل کر دی گئی۔ اس وقت خاں صاحب کو کل آٹھ سو روپے ماہوار ملتے تھے لیکن یہ ماہانہ رقم ہماری ضرورت کے لیے بہت کافی تھی۔

جب نواز شریف تشریف لائے اور انہیں اطلاع ملی تو انہوں نے کمال شفقت کا مظاہرہ کیا اور خاں صاحب کو پروگرام ”تلقین شاہ“ بحال کر دیا۔ پھر نواز شریف نے اردو بورڈ میں بائیسویں گریڈ میں تقرری کر دی اور اس کے ساتھ ان کا Designation بھی ڈائریکٹر جنرل کا کر دیا۔ ان دنوں سارے صاحب لوگ اپنے رتبے کو اونچا کرنے کے سلسلے میں ڈائریکٹر جنرل بننے، کھلوانے میں سر دھڑکی بازی لگا رہے تھے۔ یقین جانیے انہوں نے اپنے نام کی تختی کے ساتھ کبھی اپنے رتبے کا اضافہ نہ کیا بلکہ گھر والوں پر بھی اس رتبے کا رعب ڈالنے کے لیے کبھی گریڈ کا انکشاف تک نہ کیا۔ تلقین شاہ ان کے آخری ایام تک جاری رہا۔ کام کے سلسلے میں جو Passion یا جذبہ کہہ لیں، وہ تلقین شاہ کے لیے رکھتے تھے، اس کا مقابلہ کوئی اور پروگرام نہیں کر سکتا۔ تلقین شاہ پورے 39 سال چلتا رہا۔ اب تو تلقین شاہ پروگرام

تھیں بھی چھپ چکی ہیں اور اس کے ٹیپ بازار اور میوزک کی دکانوں پر دستیاب ہیں۔ گوان ٹیپوں کی مارکیٹ کو
کے لیے سنگ میل پبلشرز سے کوئی اجازت نہیں لی گئی لیکن اس ضمن میں سرتہ اور چوری غالباً اب پوری دنیا کی بدلتی
شکل میں ہے۔ اس لیے اس کے متعلق میں اپنی رائے محفوظ رکھتی ہوں۔

تلقین شاہ کی بنیادی تقسیم ہمیشہ ایک رہی۔ اس میں خاں صاحب کی ایک ہی کوشش رہی کہ بھارت کو اس بات کا
تعلق دیا جائے کہ سکیورٹی کونسل میں کشمیر کے لیے جس رائے عامہ پر بھارت نے اتفاق کیا تھا، اس وعدے کو ایفا
کے پہلے بھی ایک وعدہ کیا جا چکا تھا کہ جن ریاستوں میں مسلمانوں اکثریت ہوگی وہ پاکستان سے الحاق
کے اور جن ریاستوں میں ہندو اکثریت ہوگی وہ پاکستان کا حصہ بنیں گے لیکن حیدرآباد وکن کی ریاست کا جو حال
تعلق نے کیا، آپ کو معلوم ہی ہے۔

اسی فارمولے کے تحت پاکستان وجود میں آیا۔ ان وعدوں کو یاد دلانے کے لیے خاں صاحب نے 39 برس
کے بنیادی طور پر تو یہ جذبہ پاکستان سے والہانہ عشق تھا۔ انہوں نے قیام پاکستان سے بہت پہلے اس کے لیے
تعمیر کی تھی۔ جگہ جگہ تقریریں اور پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللہ کے نعرے لگائے تھے۔

اس پروگرام میں انہوں نے گلڈان کو کشمیر کی علامت کے طور پر استعمال کیا۔ ہمسائے سے ہر وقت اس گلڈان کا
تعلق جس طرح بھارت "اکھنڈ بھارت" کے خواب میں کشمیر کے سب وعدے بھول گیا، ایسے ہی خاں صاحب کا یہ
تعلق پورا نہ ہو سکا۔

اس پروگرام ایک ایک بڑی خوبی یہ رہی کہ خاں صاحب نے اس پروگرام میں طنز کو ہتھیار بنایا۔ اپنے آپ کو
تعمیر کے روپ میں پیش کیا جو ایک منفی کردار تھا اور نذر حسینی کو تمام تر مثبت اقدار کا حامل بنا کر پیش کیا۔ نذر حسینی کو تلقین
تعمیر اور بے دام غلام رہا۔ آقا اور مالک کے علاوہ اس کے منہ سے کبھی کوئی اور لفظ مخاطب کا نہ نکلا لیکن اس نے تلقین
تعمیر کی اقدار کو بڑی مصومیت اور سادگی کے ساتھ ماننے سے ہمیشہ انکار کیا۔

یہ دو کردار اور تقسیم ہمیشہ قائم رہے۔ باقی کردار آتے جاتے رہے لیکن ان کی ساخت اور تراش خراش بھی خاں
صاحب کے آدرش سے جڑی رہی۔ ان میں ایک کردار (شیم) ہمسائی کا تھا، جو تلقین شاہ سے لڑنے بھگڑنے اور اس کی
تعمیر دوسری خاصیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے لایا گیا تھا۔ یہ شیم فاطمہ صاحبہ مشہور و معروف مصنف فضل الرحمن کی
تعمیر تھیں جنہوں نے "ادھ کھایا امرود" جیسی معرکے کی کتاب لکھی۔ گونقاہوں نے ان افسانوں پر زیادہ توجہ نہیں دی
تھی مگر پران افسانوں کو اردو کے سنجیدہ قاری کی نظروں سے اوجھل نہیں کیا جاسکتا۔

شیم بیگم اچھی آواز ہونے کے ساتھ ساتھ اچھا کھانا پکاتی تھیں۔ پروگرام کے دوران خاں صاحب کی عادت
تھی کہ کچھ کچھ کیوں سے نوازا کرتے لیکن پروگرام ختم ہو جاتا۔ وہ ریشم کی طرح نرم ہو جاتے۔ چائے کا دور
تعمیر بیگم سے فرمائش کرتے فلاں چیز پکا کر لاؤ۔ شیم یہ فرمائش پوری کرتی بلکہ فرمائشوں سے علیحدہ بھی بہت کچھ پکا
تعمیراتی۔

شیم کے علاوہ بیگم خورشید حفیظ نے تلقین شاہ میں ایک مدت رقیہ کارول ادا کیا۔ بیگم خورشید حفیظ مشہور زمانہ

پاکستانی حفیظ جالندھری کی بیگم تھیں جنہوں نے پاکستان کا قومی ترانہ لکھا تھا۔ خورشید ہماری ہمسائی بھی رہی تھیں۔ ان سے بڑے تعلقات رہے۔ حتیٰ کہ جب ہم آخری بار عمرہ کرنے لگے تو ان کی بیٹی رضا کے ہی پاس جدہ میں ٹھہرے۔ مشہور و معروف شاعر مرتضیٰ برلاس کی بیگم فریدہ بھی آخری سالوں میں تلقین شاہ کی زینت بنی رہیں۔ صاحب کے جانے کے بعد میری بہت دلجوئی کی۔ اپنے ہاتھ سے پھول بوٹے کاڑھ کر میرے لیے اوڑھنے والی چھان لے کر آتی۔

ریاض محمود بہت جلد تلقین شاہ کا حصہ بن گئے۔ ان کا کردار صاحبزادہ صاحب کا تھا، جو تئیر کا سہیل تھا۔ شاہ کی خوشامد اور طنز کے درمیان اصلی سچ کو تلاش کرنے میں لگے رہتے۔ آخر آخر میں اکرم زبیر بھی اس پروگرام کا حصہ بن گئے۔ اکرم زبیر سیاحت کے محکمہ میں اعلیٰ افسر بن گئے ہیں۔ لاہور میں کچھ بسیس Tourism کو پروموٹ (promote) کرنے کے لیے چلائی جاتیں۔ ان بسوں میں شاہ اور بیرونی ممالک سے آنے والے سیاحت کے شائقین کو لاہور کی وہ تمام عمارتیں جو قہر بل ذکر ہیں اور جو امتداد زمانہ سے ماضی کی آب و تاب قائم نہیں رکھ سکیں، سیاحوں کی دلچسپی کا موجب بنیں۔ ان بسوں کا سارا چارج اکرم زبیر ہی ہے۔ وہی ان میں فر فر بولنے والے گائیڈ مقرر کرتے ہیں۔ راستے میں Refreshment کا انتظام ان ہی کی ذمہ داری ہے۔ Tourism کے ڈائریکٹر لاشاری صاحب اسلام آباد رخصت ہو گئے تو اکرم زبیر کی ذمہ داریاں اور بھی بڑھ گئیں۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد اکرم زبیر اور ان کی بیگم انجم ابھی تک میری Rehabilitation میں لگے ہوئے ہیں۔ انجم جب کوئی مزے دار نعمت پکاتی ہیں تو مجھے ضرور بھجواتی یا لے کر آتی ہیں۔

لے پروگراموں میں وقت کی تبدیلی کے باعث کاسٹ میں رد و بدل ناگزیر ہے۔ کچھ دیر کے لیے اینق با نو قد سید نے بھی اس میں شمولیت کی۔ اینق بیٹا اس میں نفسیاتی مسائل، ان کا الجھاؤ اور سلجھاؤ سمجھانے کی کوشش کرتے ایک پروفیسر کا رول دیا گیا تھا، لیکن بہت جلد خاں صاحب سمجھ گئے کہ یہ ہمارے ڈھب کا کام نہیں۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہماری وجہ سے خاں صاحب کی ریکارڈنگ کے دوران جو بے تکلفی اور جھڑکا جھڑکا خاں صاحب اس سے اجتناب کرنے لگے تھے اور باقی کاسٹ خاص طور پر نذیر حسینی بندھ کر رہ گئے تھے۔ خاں صاحب کچھ دیر کے بعد ہم سے رخصت چاہی اور ہم دونوں بڑے ادب سے تلقین شاہ کی سرحد سے نکل گئے۔

”تلقین شاہ“ کی ریکارڈنگ کے متعلق تھوڑا سا اور بتاتی چلوں۔

اولاً یہ پروگرام ریڈیو پاکستان میں ریکارڈ کیا جاتا لیکن اس میں کچھ اڑچسپ تھیں۔ کبھی سنوڈیو وقت ملتا۔ کبھی مل جاتا تو ریکارڈنگ انجینئر مصروف ملتے۔ کبھی کبھی کاسٹ انتظار کر کے تھک جاتی یا انہیں کچھ اور مصروفی کے پیش نظر جانا پڑتا۔ خاں صاحب کے لیے اتنی گڑبڑ قابل قبول نہ تھی۔ اسی لیے انہیں حل تلاش کرنا پڑا۔ سرائے میں سنوڈیو بنا لیا گیا۔

داستان سرائے میں ریکارڈنگ کا پھر ایک مسئلہ پڑ گیا۔ انجینئر صاحب ریڈیو پاکستان ہی سے آتے تھے۔ ان کی مصروفیات کا کچھ ٹھیک پتہ نہ تھا۔ انیس ان دنوں ٹیپ ریکارڈوں میں بہت گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ ”نور الکوثر“

تھا۔ صاف تھا کہ بگزی ہوئی مشین فوراً درست کر لیتے۔ خاں صاحب نے ریکارڈنگ کا چارج انیس کو دے دیا۔
تھا کہ جس طرح انیق بیٹا اور میں خاں صاحب کے ساتھ چل نہ سکے شاید انیس بھی کچھ دیر بعد پروگرام سے علیحدہ

عجب اتفاق ہے کہ بے حد خوش اسلوبی اور توازن سے انیس ریکارڈنگ کرتے رہے۔ کئی بار وہ خاں صاحب کو
کہہ کر ریکارڈنگ دوبارہ کرتے لیکن خاں صاحب کی عادت تھی وہ صاحب علم و ہنر کے آگے جھک جاتے تھے۔
میں اس وقت دقت پیش آئی جب یونیورسٹی میں انیس بیٹا ایم بی اے کر رہا تھا۔ گھر پر ان کے دوست شاہد
کو پڑھاتے تھے۔

تعمیرات پر تھا۔ یونیورسٹی میں ایم بی اے کا کورس نیا بنایا تھا لیکن انیس خاں میں کام اور پھر کام کی گھڑتی،
Genes سے ملی تھی۔ وہ ماٹھے پر بل ڈالے بغیر تلقین شاہ کی ریکارڈنگ کراتا رہا لیکن جب اس کی
میں ہوگی تو پھر وہ بھی مجبور ہو گیا لیکن جانے سے پہلے ایک خوشگوار معجزہ ہو گیا۔

خیر احمد خاں کو قدرتی طور پر کرکٹ، ہوائی جہاز اور مشین سے لگاؤ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کرکٹ اور پائلٹ
میں پڑ گیا لیکن ریکارڈنگ کا کام سنبھالتے اسے دیر نہ لگی۔ انیس کے جاتے ہی اس نے تلقین شاہ کی
ذمہ داری سے سنبھال لیا لیکن جب وہ این ڈی ایف سی میں ملازم ہو گئے، انیس بینک میں دیر سویر ہونے
رہا۔ رینق محمد کو ریکارڈنگ کے لیے تیار کیا گیا۔ وہ چیک وغیرہ نہیں بنا سکتا تھا لیکن ریکارڈنگ
میں مشاق ہو گیا۔

اسی دوران تلقین شاہ کے سارے اکاؤنٹ میری تحویل میں آ گئے۔ کاسٹ کے چیک، ٹیکس ایٹ Source کی
کتاب میرے ذمے تھے۔ شکر ہے مجھے عزیز الرحمن جیسے ٹیکس وکیل مل گئے۔ وہ خود ہی پیش ہوتے اور رسید
اس طرح تلقین شاہ کے پروگرام بغیر کسی التوا کے چلتے رہے۔

تلقین شاہ سے گزر کر اب انہوں نے کئی اور ریڈیائی اور نیلی ویژن پروگرام لکھے لیکن سب میں پاکستان اور
ذاتی محبت سرایت کر گئی۔ جب وہ کفالت کے سلسلے میں روزی کمانے کے لیے سکرپٹ لکھتے تو بھی ان کی یہ
Inner Connection کسی نہ کسی سطر میں تقسیم میں ظاہر ہو جاتی۔ اس کی ایک بڑی اچھی مثال پیش کرتی ہوں۔

جب اشیر احمد خاں نے اپنی ذاتی ایڈورٹائزنگ ایجنسی "بوناسیرا" کے نام سے کھولی تو اس نے "روز پیل" کے
پروگرام تشکیل دیا۔ یہ پروگرام عورتوں کے استعمال کے لیے پیڈوں کی مارکیٹنگ تھی۔ اشفاق صاحب شاید اپنے
پروگرام نہ لکھتے نہ اشیر بیٹا ہی ایسا پروگرام پیش کرتا لیکن باپ نے بیٹے کی خاطر اور بیٹے نے حلال روزی کے حصول
یہ پروگرام بھی تیار کیے۔ اس پروگرام کا نام "مانومنگویا" تھا۔ یہ سٹ کام تھا اور اس کا کلوزنگ انٹیم کچھ یوں تھا۔
سٹ کام کے لفظ سے بھی میڈیا آشنا نہ تھا۔

مانومنگویا..... مانومنگویا

سٹ کام سٹ کام

کالی قوم گوری قوم

ڈاٹ قوم ڈاٹ قوم

اسی طور ان کے تمام پروگرام تھے۔ اس میں بھی کالی قوم گوری قوم کی طرف اشارہ اس بات کو ظاہر کرتے

سوچنے والے انسان تھے۔

ہر ادیب میں ایک بات بہر کیف ساجھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے تجربات، مشاہدات تخیلات قاری کے

share کرنا چاہتا ہے۔ جس طرح فطرت انسان کے ساتھ اپنے اشجار، پھول، جھرنوں کی کن من، ہواؤں کا

صحراؤں کی وسعت، پہاڑوں کی سربفلک اونچائیاں اور موسموں کی تبدیلیوں کو بھی شامل رکھتی ہے۔ آرٹسٹ اپنے

سفر میں قاری کو ہم شریک مسافر بنا کر شامل کرتا ہے تو قاری اندر کے کپارٹمنٹ کی کھڑکیاں کھول کر وہ مناظر دیکھتا

ہے جو دوران سفر ادیب کی نظر سے گزرتے ہیں لیکن میری کوشش ہوتی ہے کہ کبھی بھیا تک تعفن بھرے، تکلیف دہ

سے زیادہ عریانی کے منظر آنے پر کچھ کھڑکیاں بند کر دوں۔ کچھ ادیب اس قدر سچ بولنے کے عادی ہوتے ہیں

رات کے مناظر اور غسل خانوں کے دروازے کھول کر جنسی بھوک اور جسمانی غلاظت کو بھی قاری کے ساتھ share

پر یضد رہتے ہیں۔ یہ مناظر لاکھ سچ سچ سہمی لیکن کسی کسی نفس طبع حیا دار قاری کے لیے بیزاری اور تعفن کا باعث بن جاتے

خاں صاحب کی یہی کوشش رہی کہ اسی قدر سچ بولیں جس قدر قاری ہضم کر سکے۔ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے

نے کبھی قاری کے کندھے پر بوجھ نہیں ڈالا۔

ٹیلی ویژن کے لیے جب انہوں نے ”اور ڈرائے“ تحریر کیے تو اس میں صابرہ آ پا کو سیکو جی اور جمیل بیکل

بنایا۔ یہ ہمارے بگڑے معاشرے کی قدروں کو بے نقاب کیا کرتے۔ اسی میں ریاض محمود نے بابو علم دین کا رول

دولتے بابو علم دین کی بہن بن کر سامنے آئیں۔ یہ دونوں پھر خاں صاحب کے سیاسی منسلک کی جھلکیاں دکھاتے

تھے۔ اس کے علاوہ انہوں نے ”ناہلی تھلے“ ”ہم آگئے“ ”ڈھول کا پول“ اور ایسے ہی کئی پروگرام لکھے جن کے

خاں صاحب کی یہی سوچ تھی۔ خود بتائیے ایسے معمار پاکستان کی خوش نصیبی نہیں تو اور کیا ہیں۔

ریڈیو سکریپٹ

مہندے دے گھر (پنجابی)

سیریل (دیہاتی پروگرام)

مسکن (اردو)

سیریل (عورتوں کا پروگرام)

مجنون مرکب (اردو)

1

2

3

(بادلوں سے پرے) افسانہ

مشورہ (اردو)

دیہاتی پروگرام

چچ (پنجابی)

دیہاتی پروگرام
سیریل۔ دیہاتی پروگرام
جنرل پروگرام
جنرل پروگرام
جنرل پروگرام

پھلیاں (پنجابی)
ناہلی دے تھلے (پنجابی)
کٹھ پتلی (اردو ڈرامہ)
امی (اردو ڈرامہ)
پناہیں (اردو ڈرامہ)

نہریں

مرد راہ دان

ناہلی دے تھلے

حیرت کدہ

آج اور آج کا دن

وستت سہنا

شابطہ کارروائی

9.15 رات-25 دسمبر 1956ء

دیہاتی پروگرام-27 دسمبر 1956ء

بطور ریڈیو Voice

" " "

" " "

" " "



فنون
ادبیات
ادبیات

121-سی ماڈل ٹاؤن

”ذاتی مسلک“

یقین جانیے کہ جو کچھ بیرون میں ہوتا ہے، اس پر میں نے بہت کم نگاہ ڈالی ہے۔ یوں سمجھیے میری زندگی سے گریز، سنی سنائی، بنی بنائی، محسوس کی گئی، اندازہ لگائی گئی تحقیق سے بہت دور ہوتی ہے۔ ڈیٹا کو بنیاد بنا کر، سائنس کر کے تاریخ و احسابی شکل کے گوشوارے تیار کر کے لکھی گئی تصدیق شدہ کتابیں سائنسی طریق کار کے قریب ہوتی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ میں نے کچھ واقعات غلط، کچھ حادثات بے ربط، کچھ بیانات افراط و تفریط کے ساتھ تحریر کی ہوں۔ میں ابتداً معافی کی خواستگار ہوں کہ میں اشفاق احمد کو آپ کے ساتھ ساتھ سمجھنے کی کوشش میں برسرِ پیکار ہوں۔ اشفاق احمد کون تھے؟ میں یہ بھی وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ ان کا مسلک کیا تھا؟

کیا اشفاق احمد دنیا دار تھے کہ صوفی؟

نرم دل تھے کہ پتھر پٹی چٹان؟

کام آنے والے کہ کام لینے والے؟

ان کے اندر کا شہر بے مثال کیسا تھا؟

اشفاق احمد کیا احساسات کے غلام تھے؟

کیا ان پر عقلی، ذہنی، اعصابی، نفسیاتی دورے پڑتے تھے؟

کیا ایسا تو نہیں کہ نظر آنے والا اشفاق احمد اور تھا اور اندر چھپ کر سادھی لگانے والا، مراقبہ کرنے والا بھگت

اور قسم کا چھلا وہ تھا؟

غرضیکہ سوالوں کی ایک ٹیلی فون ڈائریکٹری میرے سامنے کھلی ہے اور عجیب معاملہ ہے کہ اب نمبر ملتا ہے فون مصروف ہوتا ہے یا گھنٹی بجنے پر answering مشین چل پڑتی ہے۔ کیا کیجیے زندگی میں بھی وہ کھل کر اپنے سمجھانے والے نہیں تھے! بعد ازاں تو اور بھی مشکل ہے!!

میں نے کچھ تو یہ تحریر اپنی صفائی میں پیش کی ہے۔ کچھ ان لوگوں سے دستہ بستہ عرض کرنے کے سلسلے میں

تاریخی زاپچوں، بادشاہوں کی تزکوں سے سچ کو چھان پھنک کرنے کی عادت ہو کرتی ہے۔ یہ کتاب تریب کی قیاس آرائی، تخیل آزائی، ارادت کے سلسلے میں محاذ آرائی کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔

میں فقط یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں نے احمقوں کی طرح محبت کی پُر خار وادی میں قدم رکھا۔ قدم قدم پر ٹھوکر محبت پانی، نصیحت حاصل کی اور پھر ہولے ہولے اس نتیجے پر پہنچی کہ محبت کا دعویٰ دار بر خود غلط انسان کی طرح کھتا رہتا ہے۔ وہ ہر وقت صرف اپنی محبت کی عینک لگا کر بیرونی حالات کی رائے قائم کرتا رہتا ہے۔

اپنی محبت کے آگے ماں باپ اور خاندان کی عزت کا کوئی بھرم قائم نہیں رکھ سکتا۔ عزت کی خاطر بھاگ جانے کوئی نہیں کرنا ایک نقطہ نظر ہے اور جب تک سچ کے دونوں پہلو نظر کے سامنے نہ ہوں، پورا سچ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ جس کے دونوں طرف مختلف ٹھپے ہوتا ہے اور دونوں کا اپنی عزت اور محبت کا دو پلڑا ترازو سچ ہوتا ہے۔

اشفاق احمد خاں صاحب کے متعلق کچھ تحریر کرنے کا فیصلہ میں نے اس وقت کیا جب وہ میری رائے پر اثر انداز کیے درمیان میں نہ رہے۔ اگر وہ حیات ہوتے اور اشارتا بھی مجھے منع کر دیتے کہ میں ان کو مستہ نہ کروں تو مجھے جس کا احترام کرنا پڑتا لیکن آج جب وہ ہمارے سچ نہیں رہے تو ہولے ہولے دھند چھٹ رہی ہے۔ کسی فرد کی ایک بیان نہ ہے جس میں زندگی کو ناپنے کی صلاحیت ہے۔ ممکن ہے یہ بیانہ معیاری نہ ہو لیکن اندازے اور پڑتے لیے اس سے رہنمائی لی جاسکتی ہے۔ اس فرد نے کہاں ٹھوکر کھائی، کہاں ٹکرایا، کس کھائی میں گرا، کیسے کیسے بدل میں پھنس کر اپنا اور دوسروں کے زریاں کا موجب ہوا۔

میں نے طفیل کیا سنورا کیا بگڑا۔ یہ سب مواد متنا ہوتا ہے۔ چھوٹے انسان کے تجربات سے بہت کچھ عبرت حاصل ہو جاتا ہے۔ خاں صاحب کی زندگی تو پھر بہت سارے حیرت انگیز واقعات سے بھری پڑی رہتی تھی۔ ایسی باتوں سے چھپانا نا نظر خانی مجھے اخلاقی بددیانتی لگتا ہے۔

خاں صاحب کو میں نے تھکے تھکے، چوری چوری، ہونٹوں کو دانتوں تلے دباتے ہوئے زندگی گزارتے دیکھا تھا۔ جو اپنے خاندان کی محبت میں اس درجہ محو تھا۔ انہوں نے ایک اجنبی راہی کی خاطر اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں سے بے وفائی کی۔ اسے بالآخر بانو قدسیہ اور خاندان کے درمیان جب فیصلہ کرنا پڑا تو ان دیکھے کی محبت میں پرانی محبتوں کے زخم رستے رہے۔ ان پر کھر نڈا آ جاتا تو خاں صاحب خود ہی تہائی میں انہیں کھرچ کر ہرا کر لے جاتی ماندہ زندگی اس احساس جرم سے شفا یاب نہ ہو سکی۔

غم کے متعلق میرا اندازہ ہے کہ ہر شخص کو بقدر ضرورت غم سے شفا بھی ملتی ہے۔ خدا کسی کو بلاوجہ آزار میں مبتلا نہیں کرتا۔ فرد کا غم ایک کشتی کی مانند ہے جو زندگی کے بہتے دریا میں بہا دی جاتی ہے۔ ہر شخص اپنی صلاحیت، توفیق اور طاقت کے مطابق اس کشتی کو ڈبوئے سے بچاتا ہے۔ خوش نصیب وہ ہیں جن کی نیا انہیں ہدایت کے سفر پر چلاتی ہے۔ دوسرے کنارے پہنچ کر اللہ کی ہدایت کو پہنچ جاتی ہے اور وہ راضی برضا ہو کر اللہ کے فضل میں غرق ہو جاتے ہیں، جسے غم ستانے کی اہلیت کھو دیتا ہے۔

پھر اس بجزے کی افادیت بھی ختم ہو جاتی ہے اور اسے ایک ایسی تلوار بنا دیا جاتا ہے، جو دوسروں کی حفاظت، درد

اور رہائی کے کام آتی ہے۔ غم کے بحرے میں سوار دلگیر مسافر کو اپنا کوئی ذاتی غم نہیں رہتا۔ وہ اب دوسروں کے غم سے بن کر خود اپنے غموں سے مکمل چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ کچھ بدنصیب غم غلط کرنے کے لیے تجویز کرتے ہیں۔ لیے زندگی کی رنگینیاں بازو کھول کر منتظر رہتی ہیں۔ وہ طوائف کا عشق ہو۔ شام غم اجالنے کے لیے مینے پلانے کا عشق ہو۔ جوئے خانے کی Excitement ان کا غم ہدایت آشا ہو کر انسانی سطح سے اٹھنے نہیں پاتا۔ وہ غم کو بہلانے کا فن تو سیکھتے ہیں لیکن ہدایت کی تلوار نہیں بن سکتے۔

خاں صاحب کی زندگی میں اپنے خاندان سے چھٹڑنے کا غم تھا۔ پھر جا بجا رنگین زندگی سے بچنے کے لیے لیکن ان کی کشتی کسی کی دعا سے اللہ کی ہدایت سے ہمسکنا ہو گئی۔ ان کی کشتی ایک ہی کا یا پلٹ میں تلوار بن گئی۔ وہ رکشاکر کرنے والی ظلم کے خلاف لہرانے والی، یتیم بیوہ، مظلوم کے لیے انصاف طلب کرنے والی تلوار بن گئے۔ میرا خیال ہے اسی کا یا پلٹ میں ان کی زندگی برائی اور سبق آموزی ہے۔ شہاب صاحب کہا کرتے تھے صوفی اور عام آدمی میں بنیادی فرق یہی ہے۔ واقعات دونوں کو ایک سے پیش آتے ہیں لیکن رد عمل دونوں کا مختلف ہے۔ صوفی بھی عشق کرتا ہے، ناکام ہوتا ہے، اسے بھی لالچ خود غرضی، حرص ستاتی ہے۔ اسے بھی قرض کی سختی ہے۔ بی کلاس رزق کا خیال آتا رہتا ہے۔ وہ گرنا ہے اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ معافی مانگتا ہے اور تائب ہو جاتا ہے۔ اُس کی روح پہلے سے زیادہ تابناک ہو جاتی ہے۔

میں نے تین لوگوں کو اسی طرح گرتے، اٹھتے اور پھر ہدایت پاتے دیکھا ہے۔ مفتی جی، شہاب صاحب صاحب..... لیکن راستہ تینوں کا مختلف تھا۔ کشتی غم تینوں کی مختلف ساخت اور رنگ کی تھی۔ مستول ہر ایک کا مختلف شخصیتیں مختلف ہونے کے باعث انہوں نے زاو راہ کا دانہ دکانا بھی اپنی مرضی سے جمع کیا۔

شہاب صاحب نبی پاک کا نام بہت کم اپنے منہ سے لیتے تھے۔ شاید یہ ان کی عقیدت کی شدت تھی۔ تقاضا تھا۔ میں نے کبھی انہیں لہک لہک کر اپنی وابستگی کا اظہار کرتے نہیں دیکھا لیکن میں جانتی ہوں کہ وہ انسان معیار، پیمانہ انسانیت نبی پاک کو ہی سمجھتے تھے۔ ان کے نزدیک سنت پرنسپل ہی انسانی کوشش کی معراج ہے۔ ایک نے انہیں اشیر بیٹے سے کہتے سنا..... ”آج جب ہم جمعہ کی نماز پڑھنے جائیں گے تو مسجد سے نکلتے وقت اپنے دائرے میں پہلے پاؤں دھرنا۔“

اشیر نے نو بالغ لڑکے کی ترنگ کے ساتھ پوچھا..... ”وہ کیوں شہاب چچا؟“

”وہ اس لیے بیٹے کہ میں نبی پاک کی ایک ہی سنت اپنا سکا ہوں۔ اصل کام اس دنیا میں سنت نبوی کی ہی تو ہے..... اور آدمی یہاں کیا کرنے آیا ہے بھلا۔“

کہنے کو تو شہاب صاحب کہہ گئے۔ سننے کو تو اشیر خاں نے سن لیا لیکن اس کے بعد شہاب بھائی کچھ ایسے ہوئے کہ پھر اس ناپک پر کوئی بات نہ ہو سکی۔

مفتی جی وہ دوسرے درویش تھے جنہوں نے مادہ سے روح کی طرف فلا بازی کھائی۔ مفتی جی کے شہاب صاحب کہا کرتے تھے کہ وہ جنت کے مجذوب ہیں۔ وہ دنیا میں بھی مجذوبیت کے لشکارے دکھاتے ہیں۔

جب ترقی پسند تحریک کے شیدائی ہو رہے تھے۔ مفتی جی سگمنڈ فرائیڈ کے نکتہ نظر سے وابستہ جنسی میلان کی

ترقی پسند پیٹ کی بھوک کے ستائے ہوئے لوگوں پر متوجہ تھے۔ مفتی جی جنسی بھوک کو انسانی بیچارگی کا اصل
کھار کی کہانیاں لکھ رہے تھے جن میں دبے ہوئے جنسی رجحانات کی باتیں آزادانہ در آتی تھیں۔ مفتی جی جنسی
کھانیاں بڑے درد و کرب سے قلمبند کر رہے تھے۔ پھر مفتی جی کی کشتی غم کو یکدم ہدایت کا ساحل مل گیا۔
کے کسی لمحے میں وہ کا یا کلپ کا شکار ہو گئے۔ انہیں نظر آیا کہ یہ ایک جہت ہے جس پر میں کہانی لکھتا آیا ہوں،

یک چیز مابعد الطبیعیات بھی ہے۔ ایک سفر روح کا بھی ہے۔ ایک انتشار و ہاں بھی منتظر ہے جس کا جواب مادی
میں نہیں دیا جاسکتا۔ جس کا کوئی منطقی تجرباتی Analysis نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ایک مدت فرائیڈ کے تتبع
کے ذہنوں کا مداوا تلاش کرتے کرتے یونگ نے بھی بڑی تھکاوٹ محسوس کی تھی۔ وہ بھی Sub-Conscious
کے پانیوں پر تیرتا Cosmic-Consciousness کی آگے تک جا پہنچا تھا۔

مفتی جی نے جب پلٹنا کھایا تو وہ بابوں کی تلاش میں نکلے۔ انہیں ”تلاش“ لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہیں
عملی پرکاشا ایل“ کی نئی Interpretation کرنے کا خیال آیا اور انہوں نے ”الکھ نگری“ تحریر کی جس میں
شباب کو بے نقاب کرنے کی جرأت کی گئی۔ یوں ممتاز مفتی کو جو تلوار ملی، وہ اپنی نوعیت کی مختلف تلوار تھی۔ وہ مابعد کا
کی تصویر کے متلاشی ہو گئے۔

مفتی کی اس ترشول کا تیسرا نوکدار حصہ اشفاق صاحب تھے۔ وہ (اندر کی تلاش چھپانے) بابوں کے
رہنے، ان سوالوں کا جواب ڈھونڈنے میں مصروف رہے جن کی غالباً خود انہیں بھی سمجھ نہیں تھی۔ انہیں کیا
وہ دراصل اپنے اور صرف اپنے لیے کیا چاہتے تھے؟ اس کا سراغ لگانے کے لیے انہوں نے بابوں کے
تک چھانی۔

مجھے اور تو کچھ علم نہ ہو سکا۔ میں یہاں تک سمجھ پائی ہوں کہ انہوں نے نہ سنت رسول کی پیروی کی نہ مابعد ہی کا
میں مصروف ہوئے بلکہ انہوں نے اپنے آپ کو مطلق خدا کے حوالے کر دیا۔ اس طرح انہوں نے اللہ کو قرض
کے کی رسم ڈال لی اور میں سمجھتی ہوں اسی قرض حسنہ کو اللہ نے وہ شہرت اور قبولیت بخشی جس کا فائدہ وہ آج بھی
انہیں ہدایت کی کشتی مل گئی اور وہ تلوار ملی جو خلق کے آگے چلتی تھی۔

انہوں نے اپنے فرانسیسی اور اطالوی سوٹ، سیک لیڈر کی جوتیاں، مہنگی خوشبوئیں ترک کر دیں۔ شلوار قمیض
کے گرانڈ کی مخلوق کا حصہ بن گئے۔ اشفاق صاحب عموماً چھوٹی بات سے بڑا نتیجہ اخذ کیا کرتے تھے۔ وہ عجیب و
یہ وہی مواد سے اندرونی ذاتی مسلک کی تراش خراش کرتے رہتے۔ ایک ایسی ہی تحریر ملاحظہ ہو۔

تھام ازل حساب کتاب کے معاملے میں کچھ اپنے جیسا ہی ہے۔ اس نے بہت سے لوگوں کو بہت سی چیزیں

دی ہیں۔ پر ان کے استعمال کا شعور نہیں دیا۔ بہت سوں کو اس نے شعور دے رکھا ہے اور چیزیں مرحمت نہیں فرمائی۔
 ”سپ اور“ پہننے کے لیے بھی شعور کی ضرورت ہے لیکن میرے اکثر دوستوں کے پاس سویٹر تو ہیں پر شعور نہیں۔

وہ ”سپ اور“ کو بھی اسی طرح پہنتے ہیں جیسے قمیض یا بنیان پہنی جاتی ہے۔ سویٹر پہننے کے لیے ذوق ہمارا
 اونگھنے کی حس کے لطیف ہونے کی بڑی ضرورت ہے۔ آپ کو اس وقت ”سپ اور“ پہننے سے گریز کرنا چاہیے جب تک
 آپ کو رنگوں کے خواص کا علم نہ ہو۔ گہرے اور بھڑکیلے رنگ ہمیشہ غیر سنجیدہ نہیں ہوتے اور صوفیانہ رنگ مستقل طور پر
 نہیں کہلائے جاسکتے۔

اگر کوئی بوڑھا سفید ٹول کی قمیض اور لٹھے کی براق شلوار پر گہرے بنستی رنگ کا سویٹر پہن لے تو اس کی
 میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی بشرطیکہ اس کی چند یا بلور کی طرح ملائم اور شفاف ہے اور اس کے کانوں پر سیاہ رنگ کے نرم
 اگے ہوئے ہیں۔ وہ تو بنستی رنگ کے سویٹر میں انگریزی کے اس رسالے کی طرح دکھائی دے گا جو ملکہ وکٹوریہ کے
 شائع ہوا کرتا تھا اور جس میں گھڑسواروں کے کارناموں سے متعلق کہانیاں چھپا کرتی تھیں۔

اسی طرح اگر ستواں ناک اور گھنگھریالے ہاؤں والی کوئی نوخیز لڑکی صوفیانہ رنگ کا ”سپ اور“ پہن لے
 کی دلکشی اور موہنی میں ذرہ بھر کی بھی واقع نہ ہو سکے گی اور ہلکے بادامی رنگ کے سویٹر میں وہ ہمیشہ فرانسسی صابن
 طرح دکھائی دیتی رہے گی۔ دیدنی! بوسیدنی! پھر پینتہ نہیں لوگوں نے یہ قاعدہ کیا کیوں اور کیسے وضع کر لیا
 صوفیانہ رنگ سنجیدہ اور شوخ اور بھڑکیلے رنگ غیر سنجیدہ ہوتے ہیں۔

”سپ اور“ پہننے میں قوت شامہ کے غیر معمولی ہونے پر میں اس لیے زور دیتا ہوں کہ سویٹر آپ کے
 آپ کے قریب رہنے والے جسم کے علاوہ چند ایسے غیر مرئی اجسام کی خوشبو کو بھی اپنے اندر سموئے رہتا ہے جس کا
 آپ کو یوں نہیں ہوتا۔ رات کے وقت جب آپ اپنے بازوؤں کو علامت ضرب بنا کر سویٹر کا گھیرا ہاتھوں میں پکڑتے
 اور اسے آہستہ آہستہ اوپر کھینچتے ہیں تو سب سے پہلے جس چیز کا احساس آپ کو ہوتا ہے وہ اس دوست کی جدائی ہے
 ابھی آپ کی ملاقات نہیں ہوئی۔

جونہی سویٹر کا گھیرا آپ کی ناک کے نزدیک پہنچتا ہے۔ آپ کو اس میں سے مٹی کے ذروں کی خوشبو آتی ہے
 ایک صاف ستھرے سلپنگ روم میں ذرات کی خوشبو سحرانے کالا ہاری میں ٹھنڈے چشمے کا درچہ رکھتی ہے اور جب
 آپ کی ناک سے آدھا گزر چکنا ہے تو اس میں دن بھر کی دھوپ کی خوشبو آئے لگتی ہے۔ خدا لگتی کہیے ایک نئی
 رات میں دھوپ کی مشام طرب انگیز ہے کہ نہیں؟ جونہی اس میں سے دھوپ کی خوشبو آتی ہے آپ کا وہ دوست
 آتا ہے جس سے ابھی آپ کی شناسائی نہیں ہوئی اور جونہی اس کا گریبان الٹ کر ناک کی پھنگ پر سے پھسے
 احساس ہونے لگتا ہے کہ آپ اپنے آپ سے گلے مل رہے ہیں اور آپ نے اپنے وجودہ کا بوسہ لے لیا ہے۔

”سپ اور“ پہننے کے شعور کا سب سے بڑا تقاضا یہ کہ ”پل اور“ کبھی نہ پہنا جائے۔ پل اور پہن کر
 یہی محسوس کرتا رہتا ہے کہ وہ اپنے تاجر باپ کے ساتھ بازار کے بھاؤ اور مندی اور تیزی کی باتیں کر رہا ہے اور
 میں ملبوس ہو کر آپ کو یوں لگتا ہے کہ آپ اپنی ماں کی گود میں سر رکھے پڑے ہیں اور وہ ان میں سے سفید بال چمن

تنگ اور کوتاہ ”سِلپ اوور“ پہننے سے نہ پہننا بہتر! تنگ ”سِلپ اوور“ پہن کر بہت ممکن ہے آپ جسمانی طور پر
 صحت مند ہو جائیں، پر روحانی طور پر آپ گھٹ کے رہ جائیں گے۔ تنگ ”سِلپ اوور“ پہن کر آپ کی حالت یقیناً وہی
 حالت کو بغیر جتنی کے سائیکل چلاتے ہوئے سپاہی کی سیٹی سن کر ہوا کرتی ہے۔ ”سِلپ اوور“ پہن کر بھی اگر آپ کے
 جسم سے کوئی ملبوس سے مستور نہ ہوئے تو اس کا استعمال بے جا ہے۔ کندھے پر سے گزرنے والی پٹی اگر زیادہ نہیں تو
 ہٹا کر ہٹائی ضرور ہونی چاہیے کہ آپ کے بازو پر چیک کے ٹیکے کا سب سے اوپر کا نشان اس کے نیچے رہے۔

جہاں تک اس کی پٹی کا تعلق ہے۔ ”سِلپ اوور“ کے کوئی خاص بندوبست بھی نہ ہونے چاہئے ہے لیکن ایسے پٹی کے جسم
 پر استعمالی اساتین اشکال ہوں، کسی طرح بھی قابل قبول نہیں لیکن اگر آپ پٹواری ہیں تو ایسی اشکال کا سویٹر بھی پہنا
 سکتے ہیں۔

”سِلپ اوور“ کو تہہ کر کے رکھنا یا اس کو کھونٹی پر ٹانگنا اس کا اپمان ہے۔ کرسی کی پشت پر، کرسی کے بازو پر ڈالنا
 بھی بد تمیزی ہے۔ اسے ہمیشہ کرسی کی سیٹ پر یا کتابوں کے اوپر رکھنا چاہیے۔ اگر آپ کو ”سِلپ اوور“ کے گریبان
 سے کسی چیز لگانے کی عادت ہے تو بہتر ہے کہ یا تو آپ سِلپ اوور نہ پہنیں یا پن نہ خریدیں۔

”سِلپ اوور“ کے پھٹ جانے، کہنہ ہو جانے یا تنگ ہو جانے پر اسے کسی مستحق، فقیر، غریب آدمی یا اپنے
 عزیز کو دینے کو دینے کی بجائے پتھر کے گرد لپیٹ کر دریا میں ڈال دیں۔ بیسویں صدی کے پہناؤوں کی دیومالا کے
 لیے یہاں گرنے سے اگلے موسم پر آپ کو اس سے بڑھیا ”سِلپ اوور“ ملے گا۔

یہ تمام باتیں عام ”سِلپ اوور“ پہننے والوں کے لیے ہیں کیونکہ اگر آپ سرکس میں ملازم ہیں تو آپ پر کوئی
 خاص پٹی نہیں ملے گی۔

میں صاحب نے میرے رشتہ داروں کے ساتھ مجھے ایسے مابین رکھا کہ شرم و حیا دونوں طرفین کی قائم رہے۔
 دوستوں اور بہن خواہوں کے درمیان جب میں ہوتی تو وہ درمیان میں ایک ریشمی پردہ بن جاتے۔ اشفاق احمد
 کے بعد مجھے کئی باتیں سمجھ میں آئی ہیں۔ اب میرے سامنے ہٹو بچو کہتا ہوا ہوشیار بابا اب ملاحظہ کہتا ہوا اور مجھ سے
 تہہ مہم کے چلنے والا آدمی نہیں ہے۔ اب میں ٹھوکر کھا جاؤں، مگر جاؤں، کسی کے کندھے سے بھڑ جاؤں، اب وہ شخص
 مجھ سے آگے چلتا تھا اور مجھے بچاتا جاتا تھا۔ وہ شخص اب موجود نہیں۔

آج مجھے پتہ چل گیا جب میرے گھر ٹیکس کے کاغذات آتے ہیں۔ کبھی کبھی وارنٹ یا قانونی قسم کا سن بھی
 آتا ہے۔ پھر میرے پاس وہ بل آ جاتے ہیں جو بجلی کے زائد بل ہوتے ہیں۔ میرے پاس وہ منی آرڈر بھی آتے ہیں جن
 سے ”اشفاق احمد“ مجھے معلوم نہیں منی آرڈر کیسے بھرا جاتا ہے۔ چیک بھرنے کی باریکیاں بھی میرے علم کا حصہ
 نہیں تھیں۔ اب مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ ڈیڑھ گنا کام کرتے تھے اور میرے لیے آدھا چھوڑ دیتے تھے اور کہتے تھے ”گواہی دینے
 سے تم میرے پاس آ جاؤں گا۔ یہ کام میرے ہیں، باہر کے تمام کام میں سنبھالوں گا۔ تم بس گھر اور لکھنے پڑھنے پر توجہ دو۔“

اس حفاظت میں رہنے کے بعد، اس چادر اور چادر پٹواری میں رہنے کے بعد اب زندگی میرے لیے اچانک

بہت مشکل ہو گئی ہے۔ اب مجھے ان چیزوں کو دیکھنا اور ان کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے کہ جن کی مجھے سمجھ تک نہیں۔ اگر غلطی سے کھڑکی کھلی رہ جائے اور اس میں سے ہلکا سا ہوا کا جھونکا آئے تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ وہ Tornado داخل ہوتے ہوئے ہے۔

آپ یقین کیجیے اشفاق احمد کا یہ طریقہ کار تھا۔ ان میں خصوصیت تھی اور اس خوبی کا ان کو بھی احساس نہیں تھا۔ بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کا بنیادی مسلک موروثی اور پشتینی غیرت تھی۔

اشفاق احمد ایک غیرت مند آدمی تھے۔ وہ اپنے اور لوگوں کے درمیان بھی ایک حجاب رکھتے تھے۔ داروں اور اپنے درمیان بھی ایک پردہ حائل رکھتے تھے۔ ایسا حجاب جو غیرت مند لوگ ہی رکھ سکتے ہیں لیکن عینت تھے اشفاق احمد کو اپنی اس خوبی کا علم نہیں تھا۔ ان کے اور ان کے دوستوں کے درمیان کبھی ایسی باتیں نہیں ہوئیں جو اندر کی بات ہوتی ہیں۔

ممتاز مفتی کہا کرتے تھے ”اشفاق احمد گونگا ہے، اس نے اپنے اوپر صرف باتوں کے خول چڑھا رکھے ہیں۔“ کی اصلی بات کو کوئی نہیں جانتا تھا اور یہ سب ان کی موروثی اور پشتینی خوبی کی وجہ سے تھا۔ میں آپ سے عرض کروں گا بار عرض کروں کہ اشفاق احمد کو اپنی اس خوبی کا علم نہیں تھا۔ ہر قوم اور فرد میں ایک خوبی ایسی ہوتی ہے، جس سے اور بہتر خوبیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں لیکن بنیادی طور پر خوبی ایک رہتی ہے۔

بتائیے ایسے انسان کو کیا اپنی خوبی پر کبھی فخر ہو سکتا تھا؟ ان کا ذاتی مسلک غیرت اور صرف غیرت تھا اور مجھے شادی کر کے اس ذاتی مسلک کو بڑی ٹھیس پہنچی تھی! ایسے لوگ گلی گلی کہاں، ایسے لوگ ہر عہد اور دور کی قسمت میں کہاں۔ مجھ جیسی بھاگوان عورت بھی کہاں جس کی چادر اور چادر پواری اس کا شوہر ہو۔

جانوروں سے محبت

جانوروں سے محبت بھی خاں صاحب کے ذاتی مسلک کا حصہ تھا۔ جس طرح وہ غیرت اپنے موروثی مسلک سے لے کر آئے تھے۔ اسی طرح دیہاتی زندگی نے انہیں قدرتی طور پر جانوروں کی محبت عطا کی تھی۔ وہ اس محبت سے کچھ کارا حاصل نہ کر سکے۔

مہن آباد کے بعد برسوں ہمارے گھر میں کسی Pet نے قدم نہ رکھا لیکن جب ہم ”داستان سرائے“ میں منتقل ہوئے تو یہاں ایک دن کھٹھو ڈیڈی یعنی خاں صاحب کے بڑے بھائی تشریف لائے۔ اُن کے ساتھ ایک چھوٹا کتا تھا، جس کا چہرہ خوفناک، جسم مضبوط، انداز بے حد مضطرب تھا۔ اس کا سارا جسم کہہ رہا تھا ”مجھے چھوڑ دو، پھر دیکھو میں کرتا ہوں۔“

خاں صاحب نے بڑی محبت سے اُس کے سر پر پیار دیا۔

”کھٹھو بھائی اسے کیا کھلانا پلانا ہے؟“ خاں صاحب نے سوال کیا۔

”وہ تو ایسا کچھ مسئلہ نہیں۔ اسے دن میں دو بار میر ضرور کرانا ہے۔ میر کے بغیر یہ مر جائے گا۔“

ہمارے گھر میں گیٹ سے گھستے ہی سیدھا چلتے جائیں تو آپ کو گیراج کا ایک سیاہ پھانک والا گیٹ نظر آئے گا۔
 گیٹ کے اندر پوائنٹر کو رکھا گیا۔ اس کی صورت ایسی خطرناک تھی کہ بچوں کو میں نے اس سے بالکل پرے رکھا۔
 پس ان دنوں سوات کا تاجدار ملازم تھا۔ یہ نوجوان سیر کے لیے مامور کیا گیا۔

دو چار دن تو خاں صاحب پوائنٹر کو سیر پر لے گئے۔ ساتھ تاجدار کو بھی ٹریننگ دی گئی کہ کیسے زنجیر ڈھیلی بھی رکھنی
 سکتی ہے۔ لیکن تاجدار کا چہرہ سیر کے وقت فق ہو جاتا۔ کتا اُسے بڑی تندہی سے گھسیتا لے جاتا اور گھسیتا ہی
 رہتا۔ اس وحشی سے ویسے بھی گھر بھر میں کسی کی دوستی نہ ہو سکی۔ شہری زندگی میں ایسے چونچلوں کے لیے کسی کے
 ہاتھ نہ تھا۔

ڈال ٹاؤن سے ملحق ان دنوں کھیت ہی کھیت تھے اور افتخار بھائی نے یہاں ٹھیکے پر زمینیں لے رکھی تھیں۔ ایک
 دن جی آئے۔ مجھے گیراج میں ساتھ لے گئے۔ پوائنٹر کو دیکھ کر انہیں مایوسی ہوئی۔ ”کا کی! یہ تو بہت ماڑا ہو گیا ہے۔“
 ”جی ڈیڈی جی۔ ڈبلا تو ہو گیا ہے۔“
 ”اسے سیر کون کراتا ہے؟“

میں نے کمزور تاجدار کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”یہ لڑکا لے جاتا ہے جی لیکن کتا شدہ زور ہے۔ اس کے بس کی
 ”تو شوق سیر کرانے لے جایا کرے۔“ کھکو ڈیڈی بولے۔

”وہ تو شوق سے لے جائیں لیکن دفتر پہنچنا ہوتا ہے۔ شام کو وہ دیر سے آتے ہیں۔“
 ”اچھا کتا میں واپس لے جا رہا ہوں۔ شوق کو تادینا۔ یہ نعمت تمہارے بس کی نہیں۔“
 کھکو ڈیڈی مسٹر پوائنٹر کو لے گئے۔ تاجدار کی جان میں جان آئی۔ اس نے مجھے اپنے ہاتھ دکھا کر کہا ”دیکھو آ پا
 جب کھینچتا تھا تو ہم بھی ساتھ ہی گھسٹتا جاتا تھا۔“ اس کے خراشی ہاتھ دیکھ کر مجھے بڑا رنج ہوا۔ میں نے کتا رکھنے
 کی اور ایک طرح کی تسکین محسوس کی لیکن جب خاں صاحب گھر لوٹے اور گیراج کی طرف جانے لگے تو مجھے
 تیرہ ہوا۔

میں نے حقت سے کہا ”وہ جی کھکو ڈیڈی آئے تھے، وہ لے گئے۔“
 ”مجھے تو پوچھ لینا تھا قد سیہ۔“ انہوں نے مجھے جھڑکے بغیر کہا۔
 ”وہ جی تاجدار کے ہاتھ بھی بالکل زخمی ہو گئے ہیں۔ آپ دیکھ لیجیے۔ بڑا شدہ زور تھا پوائنٹر۔ یہ غریب اسے کیا

انہوں نے اپنی براؤن آنکھوں میں تھوڑا سا دکھ بھر کر کہا ”میں سیر کے لیے کوئی اور انتظام کر دیتا۔ بڑی اچھی نسل
 تھا۔ تم نے ایسے ہی جانے دیا۔“

ساری تشبیہ شکایت بس اتنی تھی۔ اس کے بعد نہ کبھی پوائنٹر کا ذکر انہوں نے کیا اور نہ میں نے اس کی بات ہی کی
 دن جب تاجدار بیٹھا پڑھ رہا تھا تو اس نے آہستہ سے کہا۔ ”آپا جی آپ کا شکر یہ۔ اگر وہ کتا رہتا تو مجھے سوات

جانا پڑتا اور آپ کو معلوم ہے میرا باپ فوت ہو گیا ہے۔ ماں نے اور شادی بنا لیا ہے۔ ہمارا دونوں بھائی بہت پریشان ہیں۔ ہم بھی پریشان ہو جاتا۔“

لیکن خاں صاحب بھلا جانوروں اور پرندوں کے بغیر کیسے خوش رہ سکتے تھے۔ پوانیٹر کے کچھ عرصہ بعد وہ آگئیں۔

گھر کی آخری دیوار کے ساتھ چھوٹا سا گودام چار فٹ چوڑا اور قریباً آٹھ فٹ لمبا تھا۔ اس میں ہر قسم کا سامان دھونے والی بالٹی، فرشوں پر پھیرنے والی ٹاکیاں، گندے جھاڑن، جھاڑو، یکدم اس میں مرغیوں، بچرے بن گئے اور ان میں انڈے دینے والی مرغیاں آگئیں۔ ہم میں سے کسی کو مرغیوں سے تو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ انڈے گننے، پکانے، چرانے میں سبھی ماہر تھے۔

انڈوں کی زیادتی ہوئی تو اب آمیت، کیک، بسکٹ بڑی خوشی سے پکنے لگے۔ انڈوں کی ڈشیں تیار ہونے لگیں۔ پھر آہستہ آہستہ کچھ ایسا ہو گیا کہ انڈے گم ہونے لگے۔ گودام کا دروازہ کھولتے تو کبھی انڈے پلٹے کبھی بچرے خالی نظر آتے۔ ان کی فیڈ تلاش کر کے لانا، اسے سٹور کرنا، مرغیوں کے پاس کھڑے ہو کر ان سے باتیں کرنا، چال پوچھنا خاں صاحب کا کام تھا۔ انیس اور خاں صاحب کی جانوروں سے محبت ساٹھی تھی۔ ان دونوں کو بطنیں، مرغیاں بھلی لگتی تھیں۔

فیڈ اور بو کے باوجود انیس لالہ اور خاں صاحب ادھر کا رخ کر ہی لیتے تھے۔ البتہ نوکی اور چیری میرے ساتھ تھے۔ انہوں نے کبھی نہ مرغیوں کی پذیرائی کی نہ کبھی انڈے اٹھا کر لائے۔ جب کبھی نیمل اشتیاق آ جاتا تو پھر کھانے کے لیے انڈوں کا ہنگامہ چلتا۔ اشتیاق کے بیٹے بنی کو وحشت کی حد تک انڈوں کا شوق تھا۔ وہ اس شوق میں سب کو شام کی اور بڑی رونق رہتی۔

انڈے پک رہے تھے۔ انڈوں پر تبصرہ، تنقید، تعریف جاری ہے لیکن اس شغل میں صرف بچہ پکھڑا ہوتی۔ اشتیاق کے بچے، صدیقہ جاوید کے تو صیغ، ٹولید، بیلا اور ہمارے بچے کبھی کبھی اگر ثابت شہاب آ جاتا تو وہ گیمیلے میں شامل ہو جاتا۔ آموں کی پیٹیاں، انڈوں کا دھڑن تھتہ۔ یہ آدھی رات کو رہنے والے مشغلے تھے۔ صبح اس کے غائب۔ نہ کوئی انڈے کا چھلکا نہ کسی آم کی گھٹلی نہ تریجھے میزھے گول چوکور بچوں کے پکائے ہوئے پراٹھے۔ ہر شے ہوتی اور پختہ ہی نہ چلتا رات کیا ندر مچا، ہوا تھا۔

لیکن مرغیاں اور ان کے انڈے جب چوری ہونے لگے اور فیڈ لانے کی دقت بڑھ گئی تو شہری زندگی میں مشغلے کو بند کرو یا گیا۔ مرغیاں چونکہ گھر کی پالتو تھیں، اس لیے خاں صاحب نے انہیں زنج ہونے سے بچا لیا۔ نہ کس کے نصیب کی تھیں اور کہاں چلی گئیں۔ بہر کیف بچرے خالی ہو گئے۔ گھر سے دیہات کی خوشبو ایک بار پھر گھس گئی لیکن پچھلے گودام کی قسمت پھر جاگ اٹھی۔

اس بار خاں صاحب کہیں سے بطنیں لے کر آ گئے۔ داستان سرائے کے سامنے کچی سڑک کے پار ان دنوں ایک نالا بہتا تھا۔ اگر پہاڑوں پر یہ چشمہ دنگ

سے گول کہتے۔ اس کا پانی گہرا اور لمبی گھاس سے دونوں جانب گہرا ہوا تھا۔ ابھی ہماری سڑک کے پاس اُم عمّارہ۔ سڑک تک کوئی گھر نہ تھا۔ بطنیں آئیں تو انیس صاحب جن کو سب لالہ کہتے تھے، ان کا گوڈا در بن گیا۔ اس میں نہ۔ یہ ستر، علم یا جادوئی بولی ہے کہ جانور اور بچے اس پائینڈی پائیر کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ پندرہ بیس بطنیں پچھلے۔ ریت بن گئیں۔ آگے آگے لالہ ہاتھ میں شہوت کی چھڑی پیچھے پیچھے قیس قیس کرتی بطنیں۔ یہ ٹولہ بڑے آرام۔ کہ اس کرتا۔ کبھی کسی کار کے نیچے بطن کے کچلے جانے کا حادثہ پیش نہ آیا۔

نالے کے قریب ایک چار پائی پڑی رہتی۔ لالہ اور دوسرے بچے کبھی چار پائی پر کبھی نالے کے پانی میں غوطہ زن۔ پندرہ بیس نہیں وقت کا کیا اندازہ تھا یا بطن بان اور بطنوں میں کیسے اور کیا طے تھا؟ وقت مقررہ پر آرام سے لالہ گھر کا رخ۔ بطنیں اس کے پیچھے پیچھے بڑی ریت پر ریت کے ساتھ چلی آتیں۔ کبھی لالہ نے کسی کو شہوت کی چھڑی نہ ماری نہ۔ اس میں بولا۔ بس گھر لوٹتے وقت قیس قیس کی آواز کم ہوتی گویا سکول سے بچے لوٹ رہے ہوں۔

میں آپ سے پہلے بھی عرض کر چکی ہوں کہ میری تربیت اور سرشت میں جانوروں اور پرندوں کی دیکھ رکھیہ پر۔ پندرہ بیس دیا گیا۔ میں نے ایک مرتبہ ایک کوکر سپنل پہاڑوں پر پلایا تھا۔ اس بد نصیب کو ایک رات پہاڑی چیتا برآمد۔ اس کا لے گیا۔ میں نے صبح عہد کیا کہ اب میں کبھی ایسا بیوپار نہ کروں گی جس میں پوچھے بغیر سامان کو اٹھائے جانے کا۔

اس قسم کے باوجود سن 1948ء میں جب میری والدہ لیڈی میکلیکن کالج کی پرنسپل تھیں، انہیں کسی نے ایک۔ کبھی کبھار دیا۔ بد قسمتی سے اس کتے کی ساری حواگی میرے ذمے ٹھہری۔ کچھ عرصہ بعد نہ جانے کسی آفتِ نبی نے کتے کو۔ اور وہ ایک دن میرے پاس آیا۔ بے بسی سے اپنا سر میری گود میں رکھا اور جان دے دی۔ غم کے ساتھ اس روز میں۔ اور سبق سیکھا کہ زندہ جان کا بیوپار دراصل اپنا آپ مفت بیچنا ہے۔

کبھی کبھی جانور اٹھایا نہیں جاتا وہ خود بخود رخصت ہو جاتا ہے۔ نہ کسی کو الزام دے سکتے ہیں، نہ جانور کو واپس۔ کوئی تدبیر کی جاسکتی ہے۔ بس ان ہی دو تجربوں کے بعد میں کچھ تو طبعاً جانوروں سے محبت کرنے والی نہ تھی۔ اوپر۔ وہ واقعات نے دل میں اور فاصلہ ڈال دیا۔

ابھی بھی کہیں اندر خاں صاحب کے دل میں کتے کی محبت کھلبلا رہی تھی۔ وہ اس محبت سے مکمل طور پر فارغ نہیں۔ کتوں کے بعد خاں صاحب نے ملی پالنے کا تجربہ کیا۔ انہیں کی زبانی ملاحظہ ہو کہ ”یوگی“ بلا ہمارے گھر کا فرد۔ کیسے بن گیا۔

تحریر: انیس احمد خاں

بڑے لوگوں کے گھر پیدا ہونا بھی مشکل مسئلہ ہے کیونکہ ہر شخص یہ توقع کرتا ہے کہ شاید اولاد بھی اسی طرح کی۔ نہ میرا ادب سے کوئی خاص تعلق ہے نہ تصوف کو میں سمجھتا ہوں۔ میں صرف ایک باپ کے رشتے کے حوالے سے ہی۔

ابو بہت مصروف زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ ہر وقت کسی نہ کسی Activity میں پڑے رہتے تھے۔ اندر مغربی حصے کی گلی میں بے بہا منگے رکھے ہوتے، جس میں وہ طرح طرح کے سر کے بنا تے رہتے تھے۔ کبھی کبھی بنا دیا، کبھی کبھوروں کا سر کہ بنا دیا، لیکن ایک بات عجیب سی ہے۔ جیسا کہ اصغر ندیم سید نے کہا کہ وہ انسان کی عزت تھے اور احترام انسانیت ان کی ہر بات کا موضوع ہوتا تھا۔ ان کی یہ بات خالی کہنے تک نہیں تھی۔

1980ء کی بات ہے۔ میں اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھا کرتا تھا۔ یہ ان سردیوں کی بات ہے۔ لاہور میں دھند کی چاندنی اتر آیا کرتی تھی اور کالج کے گیٹ بند نہیں کیے جاتے تھے بلکہ کھلے ہی رہتے تھے۔ جب میں گھر کر کے کالج کے لیے نکلتا تو اکثر امی ابوجی کی سیر پر گئے ہوتے تھے اور ہماری نانی ہی ہمیں الوداع کہتی تھی۔ ایک دن صبح میں صبح کالج جا رہا تھا تو ابو براؤن کوٹ پہننے ہوئے امی کے ساتھ آ رہے تھے تو انہوں نے مجھے دور سے اشارہ کیا میں گھبرا گیا۔

کہنے لگے ”تسی کالج جا رہے او۔“

میں نے کہا ”جی۔“

میں نے دیکھا کہ ابو کا پیلا ڈریسنگ گاؤن آگے کی طرف سے کافی پھولا ہوا تھا۔ اسی اثناء میں ایک چھتیا جو کافی غلیظ حالت میں تھا، وہ ان کے کوٹ سے باہر نکل آیا۔ میری نانی جو میرے پیچھے ہی کھڑی تھی، کتے کو دیکھ کر کتے کی ”شقاوت گے مصیبتاں گھٹ نیں جبرہ اتوں کتا چک لے آیا میں۔“

(اشفاق کیا پہلے مصیبتیں کم تھیں جو تم ایک کتا اٹھا کر لے آئے ہو۔)

ابو کہنے لگے ”امی یہ کتا نہیں ہے، یہ جوگی ہے۔ تھوڑی دیر کا مہمان ہے چلا جائے گا۔ یہ آپ کو زیادہ عرصہ کرے گا۔ بس دس بارہ دن ہی رہے گا۔“

ابو نے خیر اس کتے کی اتنی سیوا نہیں کی۔ البتہ اماں کی ڈیوٹی ضرور بڑھ گئی۔ ظاہر ہے اسے نہلا ناپڑا تو تھوڑے وقت پر دو دھ وغیرہ پلانا۔ ایک روز جب اس کتے کی حالت خراب ہو گئی تو ابو کہنے لگے، اسے کسی ویٹرنری ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں اور ہم ڈاکٹر کے پاس چلے گئے۔ ڈاکٹر نے کہا، اشفاق صاحب اسے ٹھیک ہونے میں کچھ دیر لگے گی۔

اس پر ابو کہنے لگے ”ڈاکٹر صاحب! اسے کوئی بیماری نہیں ہے۔ یہ عزت نفس کا مارا ہوا ہے۔ یہ اپنے کتے علیحدہ ہو گیا ہے۔ یہ اس لیے اس طرح کا ہو گیا ہے۔“

آپ لوگ یقین کریں کہ ٹھیک دس بارہ دن کے بعد وہ بلا جوگی تھا اور جو واقعی ابو کا لاڈلا بھی ہو گیا تھا، وہ دس دن کے بعد نہ ہمارے گھر رہا اور وہ تندرست ہو کر خود ہی چلا گیا۔ شاید وہ بلا ابو کی بات سن کر سمجھ گیا تھا اور اسے جتنا دقت گیا تھا، وہ پورا ہونے پر وفاداری سے چلا گیا۔

اب نہ وہ جوگی ہے نہ جوگی کا رکھنے والا۔ بہر حال یہ زندگی کا دستور ہے۔ یہ Creative لوگ خدا کے ہونے لوگوں میں سے ہیں۔ یہ خود ہی لکھ لیتے ہیں۔ خود ہی گالیتے ہیں۔ یہ روشن آراء بیگم کے اندر سے خود بخود ہی سر نکالتے ہیں۔ یہ سکھائے نہیں جاتے۔

میں خوش قسمت ہوں کہ میرے والدین دونوں ہی خدا کے چنے ہوئے لوگوں میں سے ہیں۔ خدا میری والدہ کو صحت عطا کرے لیکن ابو کی جو کمی ہے، وہ ہر وقت رہتی ہے۔

آج بھی جب میں ان کی الماری کھولتا ہوں تو مجھے اس میں سے ابو کے بالوں کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ میں سے ابوکا نیلا سویٹر مانگ کر لے گیا ہوں اور اس میں اب بھی ابو کی تھوڑی تھوڑی خوشبو رہ گئی ہے، خدا کرے وہ ہمیشہ

بظاہر گھر جوگی سے خالی ہو گیا۔ مجھے کچھ فراغت مل گئی۔ میں اپنے کام یک طرف ہو کر کرنے لگی لیکن خاں صاحب نے معاملے میں مجھ سے مختلف تھے۔ وہ تلخ و شیریں کے الگ الگ خانے نہ بناتے۔ انہیں لاشعوری طور پر علم تھا کہ میں نے کتنا بیٹھا دونوں ہی شامل ہوا کرتے ہیں۔ مصیبت اور راحت تو بچوں عام بچوں کی طرح ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ بیٹھا بیٹھا ہڑپ اور کڑوا کڑوا اٹھتا الگ الگ نہیں ہوا کرتے۔ کبھی حلق میں بیٹھا اتر جاتا ہے، کبھی بوند بوند سے نکلے گا۔ کبھی سے آجاتے ہیں۔ اسی لیے انہیں نئے تجربات کرنے آسان تھے۔ کھانے پینے میں بھی وہ کافی، کبھی بچہ کھائے، گل گھوٹو پیر اور ساتھ ساتھ کھٹے میٹھے چونس آم بہت شوق سے کھاتے۔ قلمی آم، بیٹھا خربوزہ، کیلے، مسمی سے شکران کی پسند تھی۔ شرا میں جو شرابوں سے ملیں تو مزہ کس قدر بڑھتا ہے۔ اس کا اندازہ تو کسی شرابی ہی کو ہوگا لیکن بیٹھا ساتھ ساتھ چلیں تو اس کی گرائمر صرف خاں صاحب خوب سمجھتے تھے۔

شہری زندگی میں جانوروں کا پالنا کس طرح بوجھ بنتا ہے۔ اس کے لیے غالباً میں تیار نہ تھی لیکن میرا رویہ غیر متعارف تھا۔ مجھے لگتا کہ اتنے سارے اور کاموں کے ساتھ یہ اضافی عیاشی گھر پر نہیں کی جاسکتی لیکن اس بار خاں صاحب پر کبھی غصہ نہیں۔

اچانک ایک روز صبح باہر نکلی تو علی کھڑا تھا۔ اس کے پاس چھوٹی ٹوکری تھی اور اس ٹوکری میں کوئی چیز بل رہی تھی۔ یہ نہیں خاں صاحب کے پاس سحر القلوب کا کوئی تعویذ تھا یا ان کی مسکراہٹ میں ایسی کوئی موہنی تھی کہ ہر شخص ان کے ساتھ کرنے کو دڑتا۔ میں نے کچھ پوچھنا چاہا تو علی بولا.....

”میں خاں صاحب کے لیے سیامی بلا لایا ہوں۔ کل جب ”تلقین شاہ“ کی ریکارڈنگ ہو رہی تھی تو یہ ہرسل کت نہوں نے بتایا تھا کہ انہیں سیامی بلیاں پسند ہیں۔“

لیجے گھوڑا گھر سال میں پہنچ گیا۔

سیامی بلا خاں صاحب کی گود میں پڑھ بیٹھا۔ کچھ بچکانے، ماتھے پر کھینچے، ہاتھ چٹوانے میں دقت لگا ہو تو لگا کھینچے دیر نہیں لگتی۔ یہ پہلی نظر کا عشق تھا۔ شام کو بچوں سے تعارف کراتے ہوئے خاں صاحب بولے..... ”بھئی یہ

بچہ ذرا سا بڑا ہوگا تو دیکھنا کتنا خوبصورت نکلے گا۔ ابھی تو چھوٹا سا روٹی کا پھنبہ ہے۔“

سامبا سے اینق خاں کو محبت ہو گئی۔ وہ کالج جاتے ہوئے اور واپسی پر ضرور سامبا سے دست پنچ کرتا لیکن سامبا

میں آ کر خری تریج خاں صاحب تھے۔ صبح جب وہ ناشتے کے لیے آتے تو اپنی کرسی ذرا سی میز سے پیچھے رکھتے اور جھولی

کو پیارے سامبا کا انتظار کرتے۔ پھر کہیں سے سامبا صاحب کی بارگی بلہ بول کر ان کی گود میں آ کر بیٹھ جاتا۔

خاں صاحب گود میں براجمان سامبا سے کوئی بات نہ کرتے نہ اسے پچکارتے۔ صرف جسم کی گرمائی سے دوسرے کی بات خوب سمجھتی تھی۔ وہ شانتی پرانتی ناشتہ کرتے رہتے۔ سامبا گود میں خرخر کرتا اپنی محبت کا اظہار کیے جا رہا تھا۔ یاد ہے ایک دن شہاب بھائی آئے اور غلطی سے خاں صاحب والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کے بعد مسٹر سامبا نے جھٹکا لگائی اور شہاب بھائی کی گود میں چڑھ گیا۔ اس وقت شہاب بھائی کا چہرہ دیکھنے والا تھا۔ وہ تمام تر گھبراہٹ، ناگوارگی اور بھاگ جانے کے موڈ میں تھے۔ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر بڑی لجاجت سے کہا۔

”اے اٹھا لو اشفاق۔ اٹھا لو جلدی۔“

میں نے شہاب بھائی کو کبھی اس قدر گھبرائے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کی ناگواری ساری کی ساری اُن کے سینے میں بھگی ہوئی تھی۔ خاں صاحب نے بلا صاحب کو اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا۔ پھر خرخر کرنے کی آواز آئی۔ شہاب صاحب کے رد عمل پر کسی قسم کا تبصرہ نہ ہوا اور چائے کا دور بڑی ہمواری سے جاری ہو گیا۔ یہ صرف خاں صاحب کے ساتھ ہی ممکن تھا ورنہ کچھ اور قسم کے لوگ ہوتے تو بڑے آرام سے بحث کر سکتا تھا کہ بلی مکروہ ہے کہ حلال ہے۔ اسے گود میں بٹھانا چاہیے کہ نہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی نور والے باباجی کی صورت میں وہ بڑے عجیب انداز میں نوٹ کہہ کر ایک ایسا جملہ کہہ دیتے کہ تربیت چاہنے والے کی زندگی بدل جاتی اور عام زندگی خوشی اپنی سادہ زندگی گزارے چلا جاتا۔

باباجی فرمایا کرتے تھے..... ”بیٹا نوٹ! ہمیشہ برائی سے نفرت کرنا ہے۔ برائی کرنے والے سے نفرت کرنے اور نہ آپ میں وہ برائی پیدا ہو جائے گی اور اس پر توبہ کا دروازہ بند ہو جائے گا۔“

گھر میں سامبا کا راج تھا۔ وہ دن میں دو مرتبہ کچا قیمہ کھاتا۔ مونا تازہ شیر بہر سا اپنی مرضی سے جب سے باہر بھاگ جاتا۔ اس کی زندگی من مانی پلاننگ پر چلتی تھی۔ نہ وہ کسی ڈسپلن کا دست نگر تھا۔ نہ کوئی قانون ہوتا۔ ایک روز جب میں سامبا کو قیمہ ڈال رہی تھی تو رمضان بھائی جو پیدائشی بزرگ ہیں، بولے ”آپاجی دن میں پورے بیالیس روپے کا قیمہ کھا جاتا ہے۔ اس کا کیا فائدہ! اتنا قیمہ تو کسی غریب آدمی کا سارا خاندان پالنے کو کافی ہے۔ میں چپ ہو گئی۔ رمضان بھائی وہ قناعت پسند شخص تھے جو بیچپی میں روٹی پونچھ کر گزر بسر کر لیتے تھے۔ نے کسی پھل کی رغبت ظاہر کی نہ کسی بوٹی شور بے پران کا دل لچلایا۔ مونکی سبزیاں، پھل ان کی ڈکٹری میں موجود تھے۔ اپنی خواہشات اپنے نفس کے اندر بند رکھنے پر قادر تھے۔ نیا خوبصورت لباس عید بقرعید پر پہنتے۔ پھر وہی بے رنگ دھلے ہوئے کپڑے ان کے تن پر ہوتے۔ جھاڑو ہوتا۔ لان کی گھاس ہوتی۔ سائیکل ہوتا اور بازاروں کے سودے۔ جون کے مہینے میں وہ لان میں لگے انار کے درخت تلے گھاس پر نماز پڑھتے نظر آتے۔ رمضان کا مہینہ والا تھا۔ جب ایک روز شہاب صاحب نے خاں صاحب سے کہا۔ ”اشفاق یار! تم اس مہینے رمضان بھائی سے قرضے کچن کا دھندا چلایا کرو۔ اس سے زیادہ حلال کی پاک کمائی میں نے کہیں نہیں دیکھی۔“

حلال کی کمائی کھانے والے سامبا کے قیے پر اعتراض کر رہے تھے اور میں مجبوراً سوچ رہی تھی۔

کے کو پھر میں بھی روزی دیتا ہے۔ اگر..... اگر سامبا کو روز ایک کلو قیمہ کھانے کو دلو اور باہے تو یہ اس کی حکمت ہے۔ غالباً یہ اس وقت ہوگا جب میں اپنے لیے روزیہ قیمہ بھون کر کھاؤں اور ڈنکے کی چوٹ اسے اپنا حق سمجھوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ رمضان بھائی کی طرح سمجھ نہیں سکتی۔ وہ سارے کے سارے ایک اور طرح کے آدمی تھے۔ میں ساری کی ساری تیر اور کبھی بیس اس لیے جلد ہی میں نے ان کی بات بھلا دی۔

کچھ لوگ مذہب، مسلک، مقولے، سب اپنے آرام، سہولت اور آسانی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ جو نبی کی تعلیم کا جواز پیش کرنا ہوان کے پاس بڑی ٹھوس، من چاہی دلیل ہوتی ہے۔ میرا شمار ایسے ہی مطلبی خدا پرستوں میں ہے۔ اس لیے رمضان بھائی کی بات کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا۔

سامبارات کے وقت غائب ہو جاتا۔ مجھے تو کچھ ایسا فرق نہ پڑتا کیونکہ ان دنوں گھروں کے دروازے رات کو بند ہوتے اور دن نہ تھا۔ سامبا صاحب صبح کے وقت گھوم پھر کر آ جاتے اور کسی کسی کرسی صوفے پر گھوک سورتے۔

ایک روز جب ہم ناشتے کی میز پر تھے تو حسب معمول سامبا نے چھلانگ لگائی اور خاں صاحب کی گود میں چلے گئے۔ اُس کے تن پر اتنے خوبصورت بال تھے کہ پتہ نہ چلا کہ سامبا کا تو سارا پیٹ چاک تھا اور انتڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ خاں صاحب کی جھولی لہو آلود ہو گئی۔ اس تکلیف کے باوجود سامبا نے محبت میں آ کر خرخر کرنا نہ چھوڑا۔

”اس کا کیا کریں؟ دیکھو تو سہی کیا ڈوئل لڑ کر آیا ہے کسی رقیب کے ساتھ۔“ خاں صاحب بولے۔
 ”آپ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جائیں، نائے نکلے لگیں گے چھ سات ٹھیک ہو جائے گا۔ فکر نہ کریں۔“
 خاں صاحب خود ڈنگر ڈاکٹر محمد خاں کے بیٹے تھے اور جانتے تھے کہ جانوروں کو بھی ایسی حالت میں محبت کی کتنی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے چہرے پر تھوڑا سا ملال آ گیا۔ ”لیکن ڈاکٹر تو ہے نہیں آج کل۔“

”کیا مطلب؟“
 ”تم دن ہوئے ڈنگر ڈاکٹر مجھے فاروقی کی دکان پر ملا تھا۔ وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔ اب کیا کریں؟“

قیام پاکستان کے وقت ایک مہاجر کو ہمارے گھر کے سامنے کرپان لگی تھی۔ نانا اس زخمی کو گھر کے اندر لے آئی تھی۔ میں نے سادہ سنٹ ایڈ کی تھی۔ کچھ دن کے بعد وہ چل کر پتھن چلا گیا تھا۔ ابھی کچھ دن ہوئے وہی آدمی مجھے انارکلی میں لے گیا۔ ”بی بی جی! آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میری مہم پٹی کی تھی آپ نے، گرد اسپور میں۔“
 ”خاں صاحب! آپ کہیں تو میں سامبا کا علاج کروں۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”لیکن یہ وحشی تمہیں ہاتھ لگانے دے گا؟ دیکھو ناں ساری انتڑیاں نظر آ رہی ہیں۔“

مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ خاں صاحب کی گود میں سے میرے پاس آ جائے گا لیکن باقاعدگی سے قیمہ کھلانے کی سہولت اس وقت کام آئی۔ میں نے سامبا کو اٹھایا تو اس نے خاں صاحب کا ہاتھ چاٹا لیکن مزاحمت نہیں کی۔ اسے اٹھا کر کمرے کے کمرے میں لے گئی۔ پہلے گرم پانی میں تھوڑا سا ڈیوئل ملا کر سارے زخم کو دھویا۔ عجب بات ہے کہ میں نے اس کو دھو کر رکھا۔ خون دھویا لیکن اس نے ایک بار بھی اعتراض نہ کیا۔ پھر اینٹ خاں نے دوائی کے پھاہے تیار کیے۔

اس وقت سپورٹ جاری رکھی۔

میں نے تین چار انچ لمبے زخم پر پٹی باندھی اور تعجب اس بات پر کہ نہ وہ کسمایا، نہ غریبانہ کسی قسم کا ڈر دکھایا۔ پٹی بندھ گئی تو وہ آرام سے انیق خاں کے پلنگ پر چڑھ کر سو گیا۔ اس طرح کچھ دن پنیاں بدلنے کے بعد ایک سالہ سارا زخم مندمل ہو چکا تھا۔ محسوس بھی نہ ہوتا کہ کسی بلے نے اپنے دانتوں سے چیر پھاڑ کی ہوگی۔ مشکل یہ آن پڑتی کہ سامبا صاحب تندرست ہوئے ادھر انہوں نے رات کی آوارہ گردی جاری کر دی۔ اب خاں صاحب کا چہرہ منظر کی

ایک دن پریشان باپ کی طرح صبح ناشتے کی میز پر بولے۔ ”رات یہ پھر غائب تھا۔“

”یہ راتوں کو جا گئے والا ہے۔ آوارہ گرد ہے، اسے گھر پر کیسے قید کریں؟“

”اس کا علاج شادی ہے۔“

”شادی۔“

”جب کسی کو قید کرنا ہو، اسے آوارگی سے بچانا ہو تو اس کی شادی کر دینی چاہیے۔ انسان کی ضرورت ہے کہ ہو جائے تو وہ آوارگی سے بچ جاتا ہے۔“

شادی کا فلسفہ جانوروں پر لاگو ہوتے ہیں نے پہلی بار سنا۔

”آپ کا مطلب ہے.....“

”اس کے لیے بلی تلاش کریں۔ اس کی نسل کی نہ ملے تو جنگلی سہی۔ زیادہ دیر نہ کریں۔ غصہ و رنج نہ ہو۔“

بھولا ہے۔ پھر کسی دن چیر پھاڑ کر کے آ جائے گا۔“

خواہشات میں عجب قسم کی کھیچ ہوتی ہے۔ اگر کبھی کسی کے لیے بے غرض و غایت معصوم اور اچھی خواہش ہو جائے تو نہ جانے وہ کس طرح پوری ہو جاتی ہے۔ ابھی خاں صاحب لڑکی تلاش کرنے نکلے بھی نہ تھے کہ ایک دن گھر کی دیوار پر ایک سیامی بلی بیٹھی نظر آئی۔ سر نظر اللہ خاں کی بیٹی مسز اولیس ہمارے ہمسائے میں رہتی تھیں۔ ان کے ہمارے گھر کی دیوار ساٹھی تھی۔

چھوٹی سی بلی اسی دیوار پر بیٹھی آنکھیں موندے دھوپ سینک رہی تھی۔ خاں صاحب نے بڑی پریت سے بڑھایا تو وہ بلا جوں و چرا اُن کے ساتھ آئی۔ سامبا کے ساتھ کٹوری میں قیمہ ڈال کر دیا تو دونوں یوں کھانے لگے گویا بھوکا ساتھ ہو۔

نہ جانے یہ آوارہ بلی تھی کہ خاں صاحب کی خواہش مجسم ہو گئی تھی لیکن بلی کامل جانا معجزے سے کم نہ تھا۔ اعتبار سے سیامی، دہلی تپلی، نیلی آنکھیں، بادامی بال اور سیاہ کان۔ کچھ حصہ کالا سیاہ بھی تھا۔ غالباً اسی کی رعایت سے صاحب نے اس کا نام نیرا رکھ دیا۔ اب گھر میں بڑی رونق تھی۔ سامبا صاحب کی بڑی شو ہو گئی۔ جہاں جاتا پھیلتا ہو جاتا۔ پہلے جگہ سوگھتا، دیکھتا اور پھر نیرا کو وہاں بیٹھنے، لیٹنے، سونے کی اجازت دیتا۔

وہ بھی ایسی کام چور، جاہل آرام طلب تھی کہ جب تک سامبا اس کے قیمے کو چیک کر کے پاؤں سے ٹھوکر اُس کی طرف نہ بڑھاتا، مہارانی جی قیمے کو منہ نہ لگاتی۔ کالجوں سے واپس پر بچے ان دونوں میں مشغول ہو جاتے۔ اب راتوں کو آوارہ گردی کے لیے نہ نکلتا اور دونوں برآمدے میں کھیلتے کودتے، ہنسی خوشی رہنے کے عادی ہو گئے۔

پھر نیرا خانم نے اٹھلا کر چلنا شروع کر دیا۔ اب وہ پہروں بیٹھی اپنے ناخن چاٹتی رہتی۔ چلتی تو اترا تہی ہوئی۔
 جلسے میں اب اسے پسند نہ تھیں۔ وہ اپنے آپ کو سامبا سے کچھ کچھ بہتر سمجھنے لگی تھی۔ ایسے میں اس کا قیام بھی بڑھا دیا
 سے ہر کمرہ میں زچہ بچہ کی جگہ تلاش کرنے کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔

پھر عجیب سی بات ہے کہ نیرا سارے گھر میں ڈھونڈتی رہی۔ ہر کونے کھد رے میں اس نے آنے والے سیامی
 کے لیے کنسویاں لیں۔ اوپر لائبریری سے لے کر باورچی خانے تک سب طرف ڈھنڈیا ڈالی لیکن
 نسل خانے کے ساتھ والے ڈریسنگ روم میں میرے کپڑوں والی الماری کو چن لیا۔

یہ الماری بیڈ روم اور ڈریسنگ روم کے درمیان کھلنے والے دروازے کے پیچھے ہے۔ عجیب سی بات ہے کہ
 میں یہی ایک دروازہ ہے جس کے پیچھے کسی الماری کا پتہ بھی کھلتا ہے۔ یوں سمجھیے اگر کوئی شخص الماری کھولے
 بیڈ روم کا دروازہ کھول کر کوئی دوسرا اندر آنا چاہے تو دروازہ الماری کھولنے والے کو زور سے لگ بھی سکتا ہے۔

گھر والے تو کبھی دستک دے کر اندر آتے لیکن بی صاحبہ نے اس بے آرامی کا خیال نہ کیا اور الماری میں اس
 کے لیے کہ شیلڈ میں کپڑے نکالنا بھی مشکل ہو گیا۔ چھوٹے چھوٹے روٹی کے بادامی گلابی بچا ہے۔ شلواریوں
 سے۔ انہیں دیکھ کر جی خوش ہو گیا۔

عجیب سی بات ہے کہ نیرا بھی قیام کھلانے والے کو پہچانتی تھی اور انسانوں کی طرح احسان فراموش نہ تھی۔ میں
 کھول کر دیکھتی، قیام کھلاتی، جگہ صاف کرتی تو نیرا کو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اگر کوئی اجنبی بندہ ذرا سی آہٹ بھی
 پہنچا تو کرا کر غرانے لگتی۔

بچے بڑے ہو گئے تو انہیں نیرا بڑے میں لے آئی لیکن سامبا بچوں سے بے نیاز تھا۔ نہ کبھی
 ان سے کھیلتے دیکھا نہ کبھی وہ ان کے ساتھ ہی چلا۔ اب یہ ہر شہر بس اتنی نگرانی کرتا کہ جدھر بچے کھیلتے اُدھر کمر
 سے کس بیٹھا رہتا۔ ذرا کوئی قریب سے گزرتا تو اس کے پتے نکل آتے اور ماتھے پر غصہ آمیز شکن پڑ جاتی۔

نیرا کے بچے بڑے ہی خوبصورت، کھلندے اور تماش بین قسم کے تھے۔ ذرا سا اخبار کا گلہزا، روٹی کا گولا،
 کوئی گری پڑی چیز مل جاتی تو چاروں سب کچھ بھول بھال کر اس کے ساتھ کھیل تماشے میں مشغول ہو
 جاتے۔ میں میز پر فون پڑا رہتا۔ اس کی تار اوپر جاتی تھی۔ اس پر چڑھنا، لڑھکنا اور گر کر دوبارہ چڑھنا ان کا
 شوق تھا۔

اب ان بچوں کے دان دکشنا کی باری آئی۔ آہستہ آہستہ ان کو ہم ٹھکانے لگانے کی سوچنے لگے۔ ایک بچہ چھوٹی
 ہو گیا۔ ایک فہیم اچھی لے گیا۔ دو بچے اینق خاں نے کسی دوست کو دلوادے۔ نیرا کروں میں ان کو تلاش کرتی رہی
 میں موت کے ساتھ سمجھوتہ کرنا اور جیتی جان کی بے وفائی برداشت کرنے کا عجب ملکہ ہوتا ہے۔

وہ بہت جلد جدائی کو زندگی کا حصہ سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں۔ نیرا اور سامبا نے بھی جانے والوں کی تلاش میں کچھ
 پھر راضی برضا ہو گئے۔ اس واقعے کے بعد نیرا نے ایک بار پھر بچے دیئے۔ ان تین بچوں کو ٹھکانے لگانے
 میں خوش تھے کہ ایک رات نیرا جہاں سے آئی تھی جس طرح آئی تھی ویسے ہی غائب ہو گئی۔

سامبا پھر اپنی تنہائی اور آوارہ گردی کی نذر ہو گیا۔

ایک صبح سامبا کو دیکھا کہ بے طورے پر قے کیے جا رہا تھا۔ خاں صاحب اسے ڈاکٹر کے پاس لے گئے واپس آئے تو سامبا کی طبیعت پہلے سے بھی خراب تھی۔ منہ سے جھاگ نکل رہی تھی اور بار بار وہ غش کی حالت میں چلا تھا۔ اسے پریم سے لٹاتے ہوئے خاں صاحب بولے۔ ”ڈاکٹر کہتا ہے اس نے کوئی زہریلی چیز کھالی ہے۔“

”کون سی زہریلی چیز؟“

”کوئی مری ہوئی چھپکلی، سانپ۔ پتہ نہیں کیا۔“

جس وقت اینق خاں کالج سے لوٹا، اس نے جلدی جلدی سامبا کو کچھ ہومیوپیتھک پڑیاں چٹائیں لیکن کھانے کی ہمت بھی نہ رکھتا تھا۔ تھوڑی سی جدوجہد کے بعد اس نے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے اور جان آفریں کے اپنی جان کر دی۔ آخری لمحہ بھی وہ شیر صفت نہ بیزار ہوانہ بلبلایا۔ موت اسے ساتھ تو لے گئی لیکن پسپا نہ کر سکی۔ اینق خاں نے گیٹ کے ساتھ ہی جہاں بعد میں پوسٹ کے لیے لال ڈبہ لگایا گیا، عین اس کے نیچے کھودا۔ بچوں نے اسے سفید کپڑے میں لپیٹا اور قبر میں ڈال دیا۔ کئی دن اس کی قبر پر پھول نظر آتے رہے۔ جب گھر سے نکلتا یا واپس آتا اس کا چہرہ اُدھر ضرور ہو جاتا۔

سامبا کے جانے کے بعد خاں صاحب نے بھی گویا جانور پالنے سے توبہ کر لی تھی۔ شہری زندگی میں بوجھل بھی تھے اور تکلیف دہ بھی۔

کوئی بھی جانوروں کو وقت نہ دے سکتا ہے۔ کوالٹی ٹائم سے کسی جاندار کا دل نہیں بھرتا۔ سورج کی روشنی حاصل دور کار ہوتی ہے۔ محبت کی مسلسل یقین دہانی کے بغیر سانس رکنے لگتا ہے۔ دیہاتی زندگی میں کتار یوڈ کے ساتھ ساتھ چرواہا بھی قریب ہی دونوں کی نگرانی کرتا ہے۔ سورج کی روشنی ملتی رہتی ہے نہ کتے کی طرف سے اور نہ چرواہے کی جانب سے اقرار کیا جاتا۔

اب چونکہ زندگی نے فاصلے پیدا کر دیئے ہیں۔ وقت اہم ہو گیا ہے۔ اس لیے کوالٹی ٹائم بھی اہم ہو گیا۔ جانور کو سیر پر لے جانا اسے پیار کرنا ضروری ہے۔ سارا دن کا ترسا ترسا زیادہ مانگتا ہے۔ دوسری طرف انسان کے سارے دن کی دوڑ دھوپ کے بعد اظہار ایک بوجھ بن جاتا ہے۔ خوشی کے بجائے ذمہ داری کی پھانسی لگ جاتی ہے۔ صنعتی انقلاب سے پہلے ماں آنگن کی زینت تھی۔ وہیں وہی بلوئی جاتی، چارہ کاٹنے والی مشین ہوتی پکتیں، بچے آنگن میں کبھی مرغیوں کے پیچھے کبھی بلیوں کے ساتھ کھیلتے۔ پلٹ پلٹ کر ماں کو دیکھ لیتے، شانت کھیلنے لگتے۔ ماں کی مثال دائی کی سی تھی جسے چھونے کے بعد کوئی چور نہ بنتا۔ دائی ہر وقت نگاہ میں تھی۔ گر گئے تو ماں کے سے لگ کر تسلی حاصل کر لی۔ بھوک لگی کنوری میں مکھن، سالن، دہی جو میسر آ یا ڈلوا کر باسی روٹی کے ساتھ کھا لیا۔ خیر سلا۔

کوئی Privacy نہیں، کوئی ذاتی ملکیت کا تصور نہیں۔ گرمیوں میں قطار در قطار چار پائیاں بچھی تھیں بچے اکٹھے سو رہے ہیں۔ سکیورٹی اور خوشی بغیر پوچھے مانگے ملتی ہے۔

شاہد خاں صاحب نے محسوس کر لیا تھا کہ ان کے پاس پالتو جانوروں کے لیے نہ وقت ہے نہ استطاعت، نہ
لیکن پھر ایک واقعہ ہوا۔ صبح کے وقت سردیوں کے دن تھے۔ ہم دونوں نے ایک ایک کبیل کا گاؤن سلوا لیا
اور ڈرینگ گاؤن کا رنگ کیسری مائل تھا۔ خاں صاحب کا گاؤن چوکیٹ اور بادامی مکڑیوں کے تانے بانے

ہم دونوں اپنا اپنا ڈرینگ گاؤن چڑھا کر کمر میں Tassle والی ڈوری باندھ کر سیر کو جایا کرتے۔ عجیب لطف تھا
کیونکہ یہ لباس سوزوں نہیں۔ ابھی لباس اور کھانے میں مدل کلاس کے لوگ آزاد تھے۔ وہ کسی کو مرعوب
تھا۔ اور حسد دلانے کے لیے لباس کا استعمال نہ کرتے تھے۔ ایک روز ہم سیر سے لوٹے تو ہمیں باہر انیس متشکر
پھر چپ چاپ لوٹ گیا۔

ان دنوں اشیر بیٹا پانچویں جماعت میں تھا۔ اسے بخار وقتاً فوقتاً گھیر لیتا۔ یہ بخار کبھی کبھی 106 ڈگری تک پہنچ
تھا۔ سارے بدن پر کھنی پڑتیں۔ ہماری تشویش تو ایک عرصہ پہلے 75۔ جی میں ہی شروع ہو گئی تھی لیکن ابھی
نہ ہو پائی تھی۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر طوسی، پارسی ڈاکٹر جن کا کلینک نکلسن روڈ پر تھا اور میوہسپتال کے ڈاکٹر اختر
بلکہ کیا گیا۔

ایسی ہی ایک رات جب ہم بیماری فوکسی میں گھر لوٹ رہے تھے تو انیس اور اشیر ہمارے ساتھ تھے۔
کچھ دیر بعد انیس بولے ”ابو..... چیری کو تو پھر تیز بخار ہے۔“

”آپ کے سامنے ڈاکٹر کو دکھا کر لارہے ہیں۔ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مجھے اس فوکسی کی خوشی نہیں ہوتی ابو۔ یہ کسی طرح ٹھیک ہو جائے گا۔“

سب خاموشی سے اتر گئے لیکن مجھے علم ہے کہ انیس کے دل کا بوجھ ہلکا نہ ہوا۔

”داستان سرائے“ میں جب اشیر پانچویں میں تھا تو کچھ ٹسٹ کروانے کے بعد بعد پتہ چلا کہ اشیر بیٹے کے جگر
Abscess ہے۔ خوف یہ تھا کہ اگر اس کا آپریشن نہ کرایا گیا تو کہیں یہ کینسر میں بدل کر لا علاج نہ ہو جائے۔

مقررہ وقت پر ہم دونوں اشیر کو لے کر میوہسپتال پہنچے۔ اس آپریشن کے دوران ڈیڈی جی کے بڑے بیٹے ڈاکٹر
میں انخار نے ہماری بہت مدد کی۔ اشیر کو آپریشن سے پہلے باہر گیلری میں سسٹرنے بے ہوشی کا ٹیکہ لگا دیا۔ میں تھوڑی
دیر باہر تھی۔ میں نے بے ہوش اشیر بیٹے کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ خاں صاحب کا ہاتھ میرے کندھے پر تھا۔

اتنے میں وارد قلی باہر نکلے اور اشیر خاں کو تھیمڑ میں لے گئے۔ میں نے بڑی مشکل سے آنسو ضبط کر رکھے تھے۔

بعد (طارق) لکھو نکلا، اس نے پچھا سے کہا۔ ”چاچا جی! یہ کوٹ پہن لیں اور اندر چلے آئیں۔“ ہم دونوں ڈاکٹروں

پھر کراس کے ساتھ اندر چلے گئے۔ ڈاکٹروں نے ہمیں مبارکباد دی۔ Abscess کو سرنج سے خالی کر دیا گیا تھا۔

ہم خوشی خوشی فارغ ہو کر گھر آئے لیکن بخار کو ساتھ لائے۔

پتہ نہیں Abscess کے کچھ اثرات باقی تھے کہ اس کے لہو میں ایسا کوئی مادہ تھا جو ایسا مواد بناتا تھا جو اس ساری

بابت کا باعث تھا۔ بہر کیف میں نے تو اپنی زندگی سے یہی سیکھا ہے کہ جب اللہ کو انسان کی مدد کرنا مقصود ہوتی ہے تو امداد

غیبی معجزے کی شکل میں آتی ہے۔ ایک روز دن چڑھے مجھے اطلاع ملی کہ ڈاکٹر احمد خاں آئے ہیں۔ یہ وہی ڈاکٹر صاحب تھے جو ملتان میں سرکاری زمینوں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے اور جنہوں نے میری والدہ کے ساتھ بھائیوں کا سلوک کیا تھا۔ میں باہر گئی۔ ڈاکٹر صاحب برآمدے سے نیچے کھڑے تھے۔

”اندر آ جائیے ڈاکٹر صاحب۔“

”نہیں بیٹا۔ میرا کلینک کا وقت ہو گیا ہے۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ گھر پر کون بیمار ہے؟“

میں نے اشیر کے متعلق تفصیل سے بات کی۔

”رات میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی مجھے بتا رہا ہے کہ قد سیدھے گھر میں خیر نہیں، تم علاج کرو۔“

”کل تم اشیر کو لے کر کلینک آ جانا۔ میں مشین میں اس کا تھوک لگا کر دیکھوں گا اور پھر دوائی بھی درست

جائے گی۔“

ہم بچے کو لے کر موہنی روڈ ڈاکٹر صاحب کے کلینک پہنچے۔ وہ گویا منتظر بیٹھے تھے۔ ہمیں ذرا انتظار کیا

اپنے دفتر میں لے گئے۔

میں نے ایسی کوئی ہو میو پیٹھک مشین یا ٹیسٹ پہلے نہ دیکھا تھا۔ اس پر گول دائرے میں دوائیوں کے

تھے۔ مریض کا لعاب مشین پر رکھ کر اسے آن کر دیا جاتا۔ جلد ہی ایسے ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹر احمد خاں نے کہا۔ ”قد سیدھے

بگڑا ہوا ملیہر یا ہے جس سے جگر متاثر ہو گیا ہے۔ چائنا دینا پڑے گا اور وہ بھی باقاعدگی سے۔“

علاج شروع ہو گیا۔ بخار ٹوٹ گیا لیکن اشیر ایک اور مشکل میں پھنس گیا۔ اس کے پرچے اچھے نہ ہو سکے

پانچویں جماعت میں رہ گیا۔ اسے اپنی بیماری سے زیادہ نفل ہو جانے کا رخ تھا۔ اس کے بعد اس کا سکول تبدیل کیا گیا

اسے چھٹی جماعت میں داخل کرایا گیا لیکن پڑھائی میں کمزوری کا دھچکا اس کے ساتھ رہا۔

خاں صاحب کو ریجنس بک سوسائٹی کے سامنے کتابیں بیچنے والے نے ایک ٹونکا بتایا..... ”خاں صاحب

کبھی کوئی آپ کے گھر میں بیمار پڑ جائے تو کچھ سرنے خرید کر کچھ دن بیچرے میں رکھ کر اڑادیں۔ جب گھر کے کسی

سرنے پسند آ جائیں تو پھر یہ سرنے آزاد کر دیں۔“

اس روز خاں صاحب نے کتابیں نہ خریدیں بلکہ سرنے خرید کر گھر آ گئے۔ پرندوں سے گہرے تعلق کو ایک

راستہ مل گیا۔ سرنے پالنے اور پھر ان کو راہ فرار دکھاتے وقت سب سے زیادہ رنج اشفاق صاحب کو ہوتا۔ خاں صاحب

اپنی ایک تحریر انیس کے بیٹے بلال کو مخاطب کر کے لکھی ہے۔ اس میں سرخوں سے متعلق ان کے جذبات کا ذکر ہے۔

خاں صاحب کی باتوں سے متاثر ہو کر ٹولید نے بھی ایک سُر خاں لیا لیکن اس سے بلال خاں کچھ ایسا نہیں

گیا کہ اسے چھوڑنے کی جرأت ماں باپ نہ کر سکے۔ اس واردات کو خاں صاحب کی تحریر میں پڑھیے۔

سُر خا

زندگی کا مزاج بھی بڑا شاہی مزاج ہے۔ آپ اس کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ نہ اس کے

کے بارے میں یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ دشنام ملے گی یا خلعت عطا ہوگی۔ رکنے کا عمل ہو گا یا جلنے کا۔ دکھ ہو گا یا

عمل میں زندگی اتنی بڑی ہے کہ اس کے سامنے رُخ رحمان، عملِ نقل، ارادے تجویزیں اس کی ذیل میں آ جاتی ہیں۔ یہ واقعہ کوئی ایسا غیر معمولی نہیں اور نہ اس کا زندگی کے لیے کوئی گہرا تعلق ہے لیکن چونکہ اس نے مجھے حد درجہ متاثر کیا ہے اس لیے میں یہ آپ کو سنانے پر مجبور ہو گیا

یہ بات ہے تو بلال کی لیکن اس کا پورے انسان سے تعلق ہے۔ مجھ سے، آپ سے، بلال کے والد سے، اس کی

بلال میرے ہتھلے بیٹے کا بیٹا ہے اور اس نے حال ہی میں سکول جانا شروع کیا ہے۔ چونکہ سکول میں یہ ابتدائی ایام ہیں اور بلال ابھی تک حصولِ علم پر ٹھیک سے نہیں لگا۔ اس لیے ہمیں اسے طرح طرح کے توجیہ دینی ترغیبیں دے کر سکول بھیجنا پڑتا ہے۔ سب سے اچھی ترغیب اس کی والدہ کی فراہم کردہ ہے جو کہ محراب میں پنجرے کے اندر محفوظ ہتھیل کے کندھے سے لٹک رہی ہے۔ یہ ایک سُرخا ہے جو باجرے اور چھوٹے چھوٹے کوزوں کے درمیان پھدکتا رہتا ہے اور صبح سویرے بیدار گھر والوں کو اپنی چکا چکی سنانا

بلال کا کام صبح سویرے اٹھ کر اس پنجرے میں انگلی ڈال کر لال کو بیلو کہنا ہے۔ پھر آدھے کپڑے بدل کر اس کے سامنے کھڑے ہو کر سیٹی بجانا اور پھر بھاگ کر باقی کے کپڑے پہننا اور آخر میں سکول جاتے ہوئے سُرنے کو سننے کی مہارت سنا کر جانا ہے۔ واپسی پر گاڑی کا دروازہ کھلا چھوڑ کے بھاگ کے سُرنے کے پنجرے کے پاس جانا۔ اسے تمس کرنا۔ اس کے احوال پوچھنا اور اپنا بیچ اٹھا کر اس کے پاس آ کر کھانا اور کوزوں میں چھیس اور برگر کے ٹکڑے لگاتار بھی شامل ہے۔ بلال جب تک گھر پر ہوتا ہے اس کا سارا وقت سُرنے کے پاس گزرتا ہے اور جب نہیں ہوتا تو کھانا یا دوسرے کچھ لے جاتا ہے اور جس گھر میں بلال پہنچتا ہے، وہاں اسے سب سے پہلے سنا کر اپنے سُرنے کی عافیت ضرور معلوم کرتا ہے اور فون سننے والے کو سُرنے کے بارے میں ہدایات دیتا ہے۔

ایک روز جب وہ سکول سے آیا تو اس کا سُرخا اپنے پنجرے میں کمر کے بل لیٹا تھا۔ دونوں ناگئیں آسمان کی طرف تھیں اور دونوں پر ادھڑے ہوئے چیتھڑوں کی طرح پنجرے کے فرش سے چمپے تھے۔ بلال نے رورور کرنا اور دیکھا۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کو چپ کرانے کی اہل نہ تھی۔ گھر کے سب لوگ اپنی اپنی طرز کا زور لگا رہے تھے لیکن

میں نے پہلے اسے اپنے ساتھ لپٹا لیا، پھر گود میں اٹھا کر ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ ماحول کی تبدیلی سے فائدہ

افسوس ہے لیکن چلے جانے والے کے لیے یوں تو جان ہلکان نہیں کیا کرتے۔ اللہ نے صبر کا بھی تو حکم دیا ہے اور ہم کو حکم ہر حال میں اور ہر رنگ میں تسلیم کرنا ہے۔“

بلال غور سے میرے چہرے کو دیکھنے لگا تو میں نے کہا۔ ”اب ہم یوں کریں گے کہ تمہارے اس سرے کا چھ جنازہ تیار کریں گے اور اسے دھوم دھام سے دفن کریں گے۔“

وہ میری بات اور غور سے سننے لگا تو میں نے کہا ”میرے پاس ایک چھوٹا سا ریشم کا رومال ہے جس کے کونے نرگس کا پھول بنا ہوا ہے۔ ہم سرے کو اس ریشمی کفن میں لپیٹیں گے اور تمہاری امی سے سینٹ کا وہ خوبصورت ڈبہ لیں گے جو اس کی سنگار میز پر رکھا ہے۔ اس کو ہم سرے کا تابوت بنائیں گے۔ اس کے بعد گھر کے سارے لوگ اور تمہارے سارے دوست اور سارے ملازم بڑی دھوم دھام سے یہ جنازہ لے کر سامنے باغ میں جائیں گے۔ وہاں ہم تم کے تیلے اس کی قبر بنائیں گے اور سرے کو دفن کرنے سے پہلے ہم سب مل کر اس کا مرثیہ پڑھیں گے۔ پھر تم لوگ اس کی قبر میں تقریریں کرو گے اور ہم بگل بجا کر اس کا تابوت قبر میں اتاریں گے۔“

بلال نے کہا ”دادا ابا! ہم اس کو نیم کے پیرتے دفن نہیں کریں گے۔ سمبل کے درخت نیچے کریں گے۔ درخت زیادہ خوبصورت ہے اور بہت بڑا ہے۔“

میں نے کہا ”بالکل ٹھیک ہے، سمبل کا درخت بہتر رہے گا اور جب ہم اسے دفن کر کے گھر جائیں گے تو یہ ہی اس کا سوئم کریں گے۔“

بلال نے میری بات کاٹ کر کہا ”سوئم اسی دن تھوڑی ہوتا ہے دادا ابا۔ وہ تو تیسرے روز ہوتا ہے۔“

میں نے کہا ”ہم اس کا سوئم اسی روز اور اسی وقت کریں گے کیونکہ تمہارے دوست روز کیسے آئیں گے۔“

بلال نے خوش ہو کر کہا ”بالکل ٹھیک ہے۔“

پھر میں نے کہا ”سرے کے سوئم پر میں تمہارے دوستوں کے لیے آئس کریم اور پیسٹری منگواؤں گا۔“

بلال نے بات کاٹ کر کہا ”اور برگر بھی دادا ابا۔“

میں نے کہا ”کیوں نہیں برگر بھی۔“

بلال نے کہا ”میرے لیے پائپل جوس اور میرے دوستوں کے لیے جینکو جوس۔“

میں نے کہا ”بالکل ٹھیک ہے۔“

”اور شام کو ہم میوزیکل چیئرز بھی کھیلیں گے۔“

میں نے کہا ”بالکل ٹھیک ہے اور جب ہم سوئم سے فارغ ہو جائیں گے تو میں تم سب کو اپنے ڈبے میں لے

جوائے لینڈ لے جاؤں گا۔“

بلال نے جوش میں آ کر تالی بجائی۔ صوفے سے اٹھ کر تین چار مرتبہ قالین پر ابھرا اور میرا ہاتھ کھینچنے لگا۔

میں ابھی اٹھ ہی رہا تھا کہ ساتھ والے برآمدے میں کچھ گڑ بڑ بڑ بڑ ہوئی اور مجھے مالی کی آواز سنائی دی۔

دونوں بھاگ کر برآمدے میں گئے تو ہمارے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ پنجرے کے اندر ہمارا پیارا سُر خاموت کی آواز

کے یہ مف پھنس گئے تھے۔ سائنسی اور عقلی نکتہ نظر لے کر ڈیرے پر آئے تھے۔ قلبی اور وجدانی علم نافع کی نذر ہو گئی۔ ایک عرصہ قول سے وابستہ سننے کے مقام پر رہے۔ پھر ماننے کی صورت حال پیدا ہوئی۔ باباجی نوروالے فرمایا کرتے تھے صاحب! یہ ہمارے ڈاکٹر اشرف فاضلی بڑے بگڑے دل کے آدمی تھے۔ بڑی مشکل سے مانے ہیں۔“

یہی کی صحبت ان کے قول سے فعل تک مطابقت ایک مدت بعد ڈاکٹر فاضلی میں پیدا ہوئی۔ اسی میل جول نے حقیقت کے چلے جانے کے بعد ”تفسیر فاضلی“ کا روپ دھار لیا۔ مجھے فقط اتنی بات اس قیام میں سمجھ میں آئی کہ کسی نہ کسی صورت پہلے ملتی ہے، کسب بعد میں ہاتھ لگتا ہے۔ ہر ڈاکٹر ایک مدت پڑھتا چلا جاتا ہے۔ پھر مرلیضوں تک اس کی خدمت پہنچتی ہے۔

سارے لوہار، کسان، صنعت و حرفت کے تمام شعبے، فنون لطیفہ کے سارے امکانات کبھی اعلانیہ، کبھی گپ چپ، کبھی سے بھی نظر غائر سے دیر تک زیر تربیت رہتے ہیں۔ پھر ان کی پریکٹس شروع ہوتی ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ ان کی کائناتی رنگارنگی کو مختلف طبقوں، تربیتوں اور حیثیتوں سے تشکیل دیتا رہتا ہے۔ خاں صاحب کو بھی علم نہ ہو سکا۔ ان کے ڈیرے سے ہو کر واصف علی واصف، سخی رازی اور کئی دوسرے بابے انہیں زاویے کے لیے تیار کرتے تھے۔ ان کے مشاہدے نے کہانیوں کا سٹور ہاؤس، Anecdotes کی انتھالوجی، واقعاتی مواد، Archives کی شکل میں محفوظ تھا لیکن انہیں علم نافع بنانے کا سارا علم اور تربیت انہیں باپوں سے ہی نصیب ہوئی۔ تربیت، عادت کرنے میں ایک مدت لگتی ہے۔

یہ خاں صاحب کی اس وقت کی حالت کا بیان ہے جب ابتدائی دور پنڈولم کا سفر تھا۔ کبھی خاں صاحب شانت تھے کبھی غریب قسم کے تذبذب میں چلے جاتے جیسے وہ ہر وقت موجود اور ناموجود کے درمیان رہتے۔ کبھی انہیں شبہ تھا کہ وہ کبھی پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ خواب ہے۔ وہ جاگتے گئے تو شعوری زندگی پھر با معنی ہو جائے گی۔ کبھی سوچتے تھے کہ اصل ہو چکے ہیں۔ ان دنوں اردو سائنس بورڈ میں بہت کام ہو رہا تھا۔ دھڑا دھڑا کتابیں ترجمہ، تالیف اور تصدیق کی تھیں۔

ان کا دفتر، فائلیں، میٹنگیں، دفتر سے لانے لے جانے والی کار کے پھیرے، کار کا دروازہ کھولنے والے کے ہاتھ، پھر پورچ سے دفتر کی کرسی تک پہنچانے والے افسر کی اہمیت جگانے والے کلرک، سیکرٹری، سپرنٹنڈنٹ، سٹریٹ لائٹس والی نفری، دفتری کائنات کے چھوٹے بڑے پرزے بے وقعت نہیں تھے۔ یہ سارے ایک بڑی مشینری کے حصے تھے۔

اس ساری مشغولیت میں خاں صاحب کا اپنا وجود، ان کا انداز نشست و برخاست، بھگم دوڑ، چھوٹی چھوٹی باتیں، ہنسیاں، تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی تنگ و دو۔ مصیبت یہ تھی کہ وہ اندر کی بات بتانے کے قائل نہ تھے۔ کبھی حاجزی، ناراضگی، حیرانگی، بددلی، بے دلی انہوں نے دل کے لاکر میں بند کر رکھی تھی۔ دفتری تنگ و دو اور اس تنگ و دو کے پھیرے میرے خیال میں واضح طور پر ان کے لیے انجانا کا اسباب پیدا کر رہے تھے۔ مجھے فکر رہنے لگی کہ میرے چہرے پر کسی بیماری کی چھاپ بھی واضح تھی۔

دراصل ڈیرے سے میری وابستگی عفت کی وجہ سے ہوئی۔

شہاب صاحب کا خاں صاحب سے ملنا جلنا میری شادی سے پہلے کا تھا۔ سن پچاس سے پہلے ہی شہاب صاحب نے 1- مزنگ روڈ میں آیا کرتے تھے۔ وہ مفتی جی کی طرح خاں صاحب کے پاس تو نہ ٹھہرتے لیکن اس تاریخی چوہدرے ان کا پھیرا ضرور ہوتا۔ یہاں جدت پسند، شتو جی نے مٹی کے مٹکے میں پیتل کی ٹوٹی فٹ کر رکھی تھی اور اسی میں پانی کرتے تھے۔

شہاب صاحب اسی ٹوٹی کو کھول کر ہاتھ دھوتے، کافی کے رسیا خاں صاحب کیو لیٹر میں کافی بناتے۔ دوست مزے سے فرش پر پچھی چٹائی یا فرش پر بیٹھ جاتے اور کافی کی چسکیاں لگاتے۔ تکلفات دراصل تعلقات تھے۔ جناب بن جاتے ہیں۔ جب درمیان میں یہ جنابا ت نہ ہوں تو کسی کی اصلیت تک پہنچنا آسان ہوتا ہے۔ ان دونوں میں ایک دوسرے پر چڑھے پرت اتارنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ وہ دونوں جلد سمجھ گئے کہ دونوں کے مزاج میں کتنی مماثلت ہے جس پر واضح طور پر انگلی نہیں رکھی جاسکتی۔

خاں صاحب کو مفتی جی نیچے پہنچ کر آوازیں دیا کرتے تھے اور اپنی آمد کا ڈنکا بجاتے تھے۔ شہاب بھائی کبھی آواز دی نہ کسی کے ہاتھ اپنی آمد کی اطلاع دی۔ وہ کسی راہب کی طرح ہولے ہولے اوپر چڑھتے۔ اشفاق صاحب بھی نہ اٹھتے نہ سلام کا نعرہ لگاتے۔ دونوں طرف سے مدہم آوازوں میں سلام اور سلامتی کا پیغام پہنچتا۔ دونوں میں گفتگو جاری رہتی۔ پھر بلا تکلف شہاب بھائی اٹھ کر چلے جاتے۔ خاں صاحب کبھی انہیں نیچے تک الوداع کہنے نہ دیتے۔ شہاب صاحب نے کبھی ان کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ ان کے رویے میں یہ دونوں باتیں پنہاں تھیں۔

1- مزنگ روڈ کے اشفاق چوہدرے میں کوئی صوفہ کاؤچ نہیں تھا۔ پھر بھی ملنے والوں کی ریل تیل رہتی تھی۔ دیال سنگھ میں ان سے پڑھنے والے طالب علم، ساتھ پڑھانے والے پروفیسر جن میں جناب غلام علی خاص طور پر تھے ہیں۔ ریڈیو سٹیشن کے آرٹسٹ، کافی ہاؤس کے ملاقاتی ادیب آتے رہتے۔

جب کوئی ملنے والا اپنی نینک، رومال یا چابیاں اوپر بھول جاتا تو نیچے پہنچ کر خاں صاحب کو آواز دیتے۔ صاحب متعلقہ چیز لے کر نیچے نہ جاتے۔ کوٹھے سے چیز کو پھینک دیتے اور متعلقہ چیز مالک بڑی اچھی فیلڈنگ کا ہوتے دیتے ہوئے کیچ کر لیتا۔

جب ہم 479- این شفٹ ہوئے تو ہمارے حساب سے یہ گھر کافی کھلا ڈالا تھا۔ اس میں مہمان رکھنے کی جگہ تھی۔ شہاب آتے جاتے رہے لیکن طعام کے علاوہ انہوں نے کبھی قیام نہ کیا۔ اس گھر میں عفت کبھی کبھی ساتھ آیا کرتے لیکن وہ ان دنوں اپنی بڑی بہن جمیلہ اور کبھی اپنی چھوٹی بہن کشور حبیب کے پاس رہتی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ اور حسن کے بدولت انسانی مدافعت کی سرحدیں توڑنے کی عادی تھی۔

خاں صاحب کی طرح اس میں کھل جاسم سم قسم کا جادو تھا۔ وہ جلد ہی ملنے والے کو ease at کر دیتی۔ موڑوں پر بیٹھ کر وہ ہمارے ساتھ باورچی خانے میں آلوکی پوریاں، تازہ تازہ پھلکے، سادہ ساکن یوں کھاتی گویا میں ہو۔ جب صدر ایوب کا دور دورہ تھا۔ ان دنوں شہاب صاحب کی جمرل یکھی خاں سے ان بن ہو گئی اور انہیں ایسی

یہ کیا گیا۔ اسی لیے 75۔ جی اور 36۔ جی میں ان سے رابطہ ٹوٹ گیا۔

جب 121۔ سی میں ہمارا قیام ہوا تو شہاب صاحب واپس اسلام آباد آچکے تھے۔ عمو ماہ وداستان سرانے میں بیٹے تھے اور کاسنی کمرے میں ہی ٹھہرتے۔ میری ان سے ملاقاتیں سرسری تھیں۔ ناشتے کی میز پر وہ شوق سے پراٹھے کھاتے۔ پھر خاں صاحب کے ساتھ دفتر روانہ ہو جاتے۔

قدسیہ! میں اشفاق کے دفتر میں اوپر والے کمرے میں بیٹھ کر خط لکھ لیتا ہوں۔ اخبار بھی توجہ سے پڑھی جاتی ہے۔ سید محمد رپوش اور اشفاق علی خاں سے ملاقات کا سبب بن جاتا ہے۔ ”کبھی کبھی عفت بھی ساتھ ہوتی لیکن ان دنوں عفت ہمارے پاس نہ ٹھہرتی۔ وہ شہاب صاحب کے بڑے بھائی کی بیٹی شریا شہاب کے گھر قیام کرتی۔

میں عفت اور شہاب صاحب کے اندرونی حالات سے واقف نہ تھی۔ عفت کب لندن میں اپنے بھتیجے ڈاکٹر شہاب کے پاس بیمار ہو کر پہنچی اور کب بیمار ہی اسلام آباد واپس آئی۔ مجھے اتنی خبر لگتی کہ عفت کے گردے جواب دے گئے۔ سمورڈاکٹروں نے ٹاک ٹوئیاں مار کر کئی نتائج نکالے۔ کسی نے کہا دماغ کا کوئی Gland فنکشن نہیں کر رہا۔

آخر آخری میں سپیشلسٹ کے ایک گروپ نے حتمی فیصلہ سنایا کہ سارا غذاب گردوں کا ہے۔ انہوں نے کام کرنا شروع کیا۔ ڈاکٹروں کے نزدیک یہ مرض لاعلاج تھا۔ ہفتے میں ایک دن اس کا Dialysis ہوتا تھا۔ اسے ہسپتال میں رکھنا پڑتا۔ وہاں پانی کی بوتلیں اسی طرح لگائی جاتیں جیسے عام طور پر ہونکی بوتلیں لگتی ہیں۔ گردے دھوئے جاتے، یورک کے کلینر دیے جاتے۔ ان آلائشوں کے نکل جانے کے بعد ہفتہ بھر شائق رہتی۔ پھر وہی Dialysis دہری دھویا جاتا۔ سخت کئی سالوں سے ڈاکٹروں کا چوبابانی رہی جس پر تجربات کیے جاتے ہیں۔

ہر جسم کی بلڈ رپورٹ

ہر جسم کا ایکس رے

ہر طرح کی کیس ہسٹری

اور ان سب کے بعد ایک بڑا سا سوالیہ نشان..... ابہام کا دائرہ..... سائنس کی بیچارگی۔ انسان کا سائنسی علم اپنے وجود کی حدود اور Precision کے باوجود کتنا محدود اور مجبور تھا۔ کچھ بھی حتمی نہ تھا۔ جو تھیوری آج جو ان ہوتی..... نئے نئے کھنڈے پاتھوں کچھ عرصہ بعد ٹوٹی ہوئی بیساکھی بن جاتی ہے۔ پہلے ماں کا دودھ چھڑا کر بچوں کو بوتل پر لگایا گیا۔ پھر پلانے ثابت کیا کہ ماں کے دودھ میں کچھ ایسے اجزا ہوتے ہیں جن سے بچہ بیماری سے محفوظ رہتا ہے۔ دوبارہ بچے کو

کے سینے سے لگا کر دودھ پلانے کی تحریک جاری ہوگئی۔ انسان کی امان اور کہاں تک مانے؟

کیا خدا اور سائنس میں مقابلہ تھا کہ مفاہمت..... کیا یہ دونوں رقیب تھے کہ جنم؟ سائنس تو پھر نظر آتی تھی لیکن

تھے تھے تو انسان کیسے مان لے؟

کیا ضعیف الاعتقادی جہاں سے شروع ہوتی ہے وہاں سے ایک نئے علم کا آغاز ہو سکتا ہے۔ ایسے لوگ جو

بہتے ہیں کس Frequency پر کون سی web-site پر انفرمیشن لیتے ہیں۔ اوپر والے بڑے کل کے علم میں کتنے

ان جانے جزو تھے جن تک ہماری رسائی ان ہی بابوں کے وسیلوں سے ممکن ہے یا ایسے تھے کہ بابے بھی روحانیت کے سفر میں ٹانگ ٹونیاں مار رہے تھے؟

ایک روز خاں صاحب شہاب بھائی کو ایئر پورٹ سے سیدھا ہمارے گھر لے آئے۔ عفت ہمیشہ خوش ہوتی رہتی تھی۔ اس بار بھی اس نے بہادری کا مظاہرہ کیا لیکن ڈیڑھ فٹ اونچے برآمدے تک وہ چڑھ نہ سکی۔ میں نے عفت اٹھا کر برآمدے میں کھڑا کیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کسی دس بارہ برس کی بچی کو اٹھا کر کھڑا کیا ہو۔ ان کا وزن بہت کم تھا۔ رنگ ہلکی مائل، ناک کا پانسہ ذرا سا نیڑھا، آنکھیں اندر کو دھسنی ہوئی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح اس نے ”اے سے“ میں نے اپنے اندر چھپی ہوئی قدسیہ کو باہر نکالا۔ ہم گلے ملیں لیکن اس کی چھٹی میں زور نہ تھا، آواز میں ترانہ نہ گونجتا تھا۔ تانا نانا تو مہم بن کر کھلتا رہا تھا۔ ہم دونوں نے ایسے ظاہر کیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اس بار عفت بھی اپنے اندر گھس گئی۔

”میں اب تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی عفت۔ نہ جمیلہ کے پاس نہ کشور کے پاس۔ تمہاری بہنیں ناموس جائیں، مجھے پروا نہیں۔“

”اور اقبال شہاب کے پاس وہاں تو جانے دو گی ناں؟“ اس نے خوشدلی سے پوچھا۔

”کبھی نہیں..... اور کہیں نہیں۔“

”عفت ہمارے پاس رہے گی قدسیہ۔ اسے بابا جی نور والوں کے پاس لے جانا ہے۔“

میں نے خاں صاحب کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ مجھے عفت کی بیماری کا سنجیدگی سے کوئی علم نہ تھا۔ صاحب نے وضاحت کی نہ خاں صاحب نے کوئی انفرمیشن فیڈ کی۔ شہاب صاحب دو چار دن کا سنی کمرے میں بیٹھ کر پھر اسلام آباد چلے گئے۔ عفت ہمارے پاس رہ گئی۔ وہ سارا دن کا سنی کمرے میں گزارتی لیکن جونہی بچے آ جاتے کے کمرے میں چلی جاتی۔ کبھی نوکی میاں کو کیکسٹری پڑھاتی، کبھی ایلے سے باتیں کرتی، کبھی چیری کو ساتھ لٹا لیتی۔ وہ میرے بیڈروم میں شاذ ہی آتی تھی۔ بس ہم دونوں برآمدے میں دھری مشین کے آس پاس باورچی خانے میں، لان میں بیٹھ کر باتیں کیا کرتے۔ اس نے کبھی اپنی بیماری کی تفصیلات، اپنی نکالینف کا کچا چٹھا بیان نہ کیا۔ اس نے میرے دوران خاں صاحب مجھے اور عفت کو بابا جی نور والے کے پاس لے گئے۔

جس روز ہمیں ڈیرے سے پاک پر جانا تھا خاں صاحب باورچی خانے میں تشریف لائے۔ گیارہ بجے کا تھا۔ دونوں بچے اپنی اپنی سائیکل پر سکول جا چکے تھے۔ گھر معمول کے مطابق پُرسکون تھا۔ عفت پوری تیار خاں صاحب سے پیچھے سے جھانک رہی تھی۔ خاں صاحب نے کہا: ”قدسیہ! سب کام جیونی رمضان پر چھوڑو، ہم ڈیرہ پاک جا رہے ہیں۔ جب خاں صاحب عفت اور مجھے لے کر پہنچے تو اس وقت سدا سہا گئیں ڈیرے کے باورچی خانے کے ناچ رہی تھیں۔ یہ مرد حضرات کی ایسی ملامتی ٹولی تھی جو عورتوں کے لباس میں ملبوس بڑی بڑی ننھے ناک میں ڈالے گئے۔ نکالے اپنے روٹھے یار کو ناچ ناچ کر منانے میں مشغول تھیں۔ خاں صاحب کو اس وقت علم نہ تھا کہ عفت کا علاج کیسے ممکن ہوگا۔

اس کی Mechanics کیا ہوگی۔ علاج بالغذا کا کیا طریقہ ہے اور کس طرح اس کے کوائف پورے

بہت بعد میں عفت نے مجھے بتایا کہ وہ اس وقت سدا سہاگنوں کو ناپتے دیکھ کر ڈیرے کے علاج بالغذا سے مایوس تھی لیکن پتہ نہیں کیوں وہ لوٹ نہ سکی اور اپنے آپ کو باباجی کے حوالے کر دیا۔

حسب معمول ڈیرے پر لوگوں کی بھڑکی تھی۔ چھوٹی سی پٹری پر لوگ آ جا رہے تھے۔ بائیں ہاتھ کچھ لوگ مٹی کے برتن لیے وضو کر رہے تھے۔ باباجی اپنے تخت پوش پر بیٹھے تھے۔ سہاگنوں کا طائفہ جو حضرت میاں میر کے عرس پر حاضر دینے آیا تھا، وہاں سے باباجی کاسن کر ادھر آ نکلا۔

سب نے عورتوں جیسے رنگدار بھڑکیلے لباس پہن رکھے تھے۔ سر پر خوبصورت دوپٹے تھے۔ چہروں پر داڑھیاں تھیں۔ مردوں کے ناک بھی چھدے ہوئے تھے اور چھوٹی بڑی ٹھنڈیاں چہرے پر لگی تھیں۔ ان کے ناپنے کے انداز میں کھانسی، بے حیائی یا دلنوازی نہ تھی۔ وہ منٹ طائفوں کی یاد بھی نہ دلاتے تھے جو شادی بیاہ کے موقع پر ”جیوے جیسے سہرے گانے کے لیے ذفی تا شے کے ساتھ آ جایا کرتے ہیں۔“

ڈھول کا ارتعاش، سدا سہاگنوں کے گھنگھروؤں کی آواز فضا میں جادوئی ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ سدا سہاگنیں خاص فرقہ ملائیم سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ اپنی انا کی مہینج کوٹ کوٹ کر چھوٹی کر رہے تھے۔ جوان تو انامرد عورت کی سی تھی فروتنی اور بے بسی سے یار کو منانے میں مصروف تھے۔ انہیں یہ علم بھی نہ تھا کہ انہیں کوئی دیکھ رہا ہے۔ عفت نے بابا کے قریب ہو کر پوچھا۔ ”باباجی اس کا فائدہ؟“

خاں صاحب غالباً باباجی سے عفت کی بیماری کا ذکر کر چکے تھے۔ آہستہ سے یاد دہانی کے طور پر بولے۔

”باباجی یہ ڈاکٹر عفت ہیں۔ شہاب صاحب کی بیگم صاحبہ۔“

”چلو چلو پتہ..... ان کو نیچے لے چلو۔ سب خیراں ہیں۔ بیٹا ستے خیراں۔“

پہلی نظر میں ہی باباجی نے عفت کو مکمل طور پر اپنا لیا۔ اتنی دیر بالینڈ، لندن میں رہنے والی ڈاکٹر عفت اندر ہی اندر سوچ رہی تھی کہ میرے علم میں تو ایسے لوگوں کا کہیں ذکر نہیں۔ کیا واقعی یہ سب جہالت ہے۔ کیا انسانی روح کی کوئی ایسی صفت ہے جہاں دنیاوی علم بیکار ہو جاتا ہے؟ کتاب کا علم گفت و شنید کا علم..... تجربات کا علم۔

بابا جلال ہمیں تہہ خانے والی کونھری میں لے گیا۔ یہ نشیبی کمرہ کچی اینٹوں سے بنا تھا۔ اس کی چھت پر پرانے لے اور پھوس کی چھت تھی۔ طاقتوں میں باسی ہار اور تیل سے سنے دھومیں سے میلے دیئے تھے۔

فرش پر صف بچھی تھی اور پشت ٹیکنے والی دیوار پر سر کندوں کی چھتیں تھیں۔ عفت کے چہرے پر تھکاوٹ تھی اور صحت کی حس اس کا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔ غالباً وہ اپنی روشن خیالی اور تعلیم کے پیش نظر بڑے شہات میں گھری ہوئی تھی۔

آہستہ سے عفت بولی ”انسان اپنی مشکلات کے سامنے کتنا بے بس ہے؟ ہم اپنی ضروریات کے سامنے کیا کیا کھوتے نہیں کر لیتے۔ میں نے اپنی صحت کی خاطر وہ سائنسی نظریات بھی چھوڑ دیئے جن پر میرا اگلی اعتماد تھا۔ میں نے بھی خیم کے ناطے کیسے کیسے لات و منات پال رکھے تھے؟ کیا وہ بت جھوٹے تھے اشفاق بھائی! کہ میری ضرورت کی بے

تھی جی تھی کہ اس کی خاطر میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔ کچھ بھی کر سکتی ہوں۔“

پھر وہ گاؤں کے سہارا لے کر قریباً نیم دراز حالت میں بیٹھ گئی۔

خاموشی کا ایک لمبا وقفہ کوٹھڑی میں ابا بیل کی طرح چکر لگانے لگا۔

”اشفاق بھائی..... میں نے رات باباجی کو خواب میں دیکھا تھا۔ وہ مجھے بتانے لگے، آپ کو پتہ نہیں کہ

سمجھانا بھی آئے گا کہ نہیں۔“

”ہاں ہاں ٹرائے کرو..... میں زیادہ کودن نہیں ہیں۔“ خاں صاحب بولے۔

”باباجی نے میرے خواب میں فرمایا۔ مجھے..... یوں لگتا ہے کہ سارا انگلستان بالآخر ہندو ہو جائے گا۔

ہرے راما ہرے کرشنا کی صدا کہیں گونجیں گی۔ ہر طرف کھڑتالیں بجیں گی۔ گھنٹیوں کی صدائیں آئیں گی۔ گرجا گھر میں بدل جائیں گے۔ سفید فام لوگ ہال منڈوا کر لمبی لمبی بودیاں پال کر گلے میں جینو پہن کر قشتے کھینچے کھڑتالیں پلٹے دان دکھنا مانگتے پھریں گے۔ لندن کے گھروں میں گھر گھر گائے بندھی ہوگی۔ انگریز لڑکیاں کیسری ساڑھیاں پہنے۔ قصور میں دیپ لیے بڑے بڑے گرجوں کی طرف جائیں گی۔ جہاں حضرت عیسیٰ کی بھی مورتی بن جائے گی۔ وہاں آرتی لگائی جائے گی۔ بگجن گائے جائیں گے۔ بس خواب تو اتنا ہے لیکن مجھ میں بڑی تبدیلی آگئی ہے۔“

خاں صاحب مسکرائے..... ”تبدیلی تو آتی رہتی ہے عفت۔ تبدیلی ارتقاء کا ایک ضروری عنصر ہے۔“

”تبدیلی پتہ نہیں کیوں آتی ہے اشفاق بھائی؟“ عفت ایسی فلسفیانہ باتیں کرنے کی عادی نہ تھی۔ پتہ نہیں

نشینی کنیا کا اثر تھا کہ سدا سہانگوں نے سوچ کی کوئی رنگ پڑکاری فضا میں چھوڑ دی تھی۔

”پتہ ہے اشفاق بھائی! عموماً تبدیلی نفرت سے جنم لیتی ہے۔ جب کسی انسان، معاشرے، کسی زمین کو

اعتقاد سے نفرت کی جاتی ہے تو یہی نفرت ہمارا مقدر رہ جاتی ہے۔ اس نفرت کی یہ سزا ہے کہ ہم میں بڑی تبدیلی آجائے۔ ہم جس انسان، معاشرے، مسلک سے نفرت کرتے ہیں، اسی میں ڈھل جائیں۔ نفرت کی سزا ہمیں اسی طرح ملتی ہے۔ سرتاپا ہم اس جیسے ہو جاتے ہیں جس سے ہم نفرت کرتے ہیں۔ میں سوچتی رہی ہوں کہ انگریز جب شروع شروع میں ہندوستان میں آئے اور ہندو دھرم کے مرتکب ہوئے تھے، ان کی بت پرستی، رسم و رواج سے چڑتے تھے۔ مجھے یاد ہے شہاب نے کہا تھا کہ اشرف علی تھانوی کہا کرتے تھے کسی کا مسلک چھیڑو نہیں اور اپنا مسلک چھوڑو نہیں۔ یہ Liberalism ہے۔ اللہ ہماری نفرتوں کی سزا اسی طرح دیا کرتا ہے۔ ہمیں نفرت سے محبت کرنے کی یہی سزا ملتی ہے۔ تبدیلی اسی طرح آتی ہے۔“

عفت ہم سے بات نہیں کر رہی تھی۔ وہ خود کھامی میں مشغول تھی۔ وہ یہ بتانے کی کوشش کر رہی تھی کہ

ڈیرے جیسی جگہ سے کیسی نفرت تھی، وہی نفرت اب محبت میں بدل رہی تھی۔

اور شاید امریکہ میں بالآخر اسلام ہی حاوی ہو جائے گا۔ شاید سفید فام نفرتوں کو ان کی اس نفرت کی سزا

رہے گی جو وہ مسلمانوں سے کرتے ہیں۔ میں نے سوچا۔

عیسائیت جو محبت کا پرچار کرتی ہے۔ اس کے پیروکاروں نے جس قدر نفرت سیاہ فام لوگوں سے کی ہے

ساری دنیا جانتی ہے..... حضرت بلالؓ ہر طرح کا ظلم و تشدد برداشت کرتے رہے ہیں۔ کیا جنگل کاٹنے والے، برکتیں

بنانے والے، امریکہ کو موسیقی سکھانے والوں سیاہ فام افریقی لوگوں سے نفرت کا بدلہ نہ لیا جائے گا؟

کیا جو اس نمسہ کی لاشی میکی بغیر، عقل کی بیساکھی چھوڑ کر اللہ کا تجربہ کیا جا سکتا ہے؟
اس وقت بابا جلال داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں خمیری روٹیوں سے لدا چھابا کٹوروں میں شلغم کا شور بہ تھا۔ اس
قرینے سے سب کچھ لگا دیا۔

”کھاؤ باباجی..... بسم اللہ کرو، دیکھو حال پر کیا عطا ہو رہا ہے۔“ بابا جلال نے پرتپاک لہجے میں کہا۔

خاں صاحب نے بلا چون و چرا کھانا شروع کر دیا۔ اس وقت امریکن نژاد شمس اندر آیا۔ وہ ہم سے کچھ دور بیٹھ
نے لگا۔ اس نے آگے کٹورہ اور روٹی رکھ دی اور وہ خاموشی سے کھانے لگا۔ شمس نے سفید شلواری قمیض پہن رکھی تھی
کے دراز قد پر بہت سج رہی تھی۔ اس کے پیروں میں کھڑاویں اور گلے میں گیندے کا ہار تھا۔ عفت کو پہلے ہی دن سدا
کے بعد دوسرا چوکا شمس کا لگا۔

”اس وقت تو میں شور بہ روٹی نہیں کھا سکتی پلیز، ابھی تو ناشتہ کیا ہے۔“ بابا جلال کے پیش نظر عفت نے انگریزی
صاحب سے کہا۔

”نعمتوں میں سے کچھ اٹھا لینا چاہیے ورنہ کفران نعمت ہوتا ہے۔“ خاں صاحب نے انگریزی میں عفت سے

”کھاؤ جی کھاؤ، بسم اللہ۔“ بابا جلال نے پھر کہا۔

بابا جلال سکون بھری مسکراہٹ کے ساتھ قرینے سے چیزیں لگانے میں مصروف تھا۔

”آپ کو بڑی تکلیف ہوتی ہوگی۔ اتنے سارے لوگ آتے جاتے ہیں۔ بڑی مصیبت ہے۔“ عفت نے

صاحب سے کہا۔

”ناں بیٹا جی مصیبت نہیں۔ ہمارے بابا جی نور والے فرماتے ہیں۔ نماز کی قضا ہے پر خدمت کی کوئی قضا

ہم تینوں کو انگریزی بولتے دیکھ کر شمس ہماری طرف متوجہ ہو گیا۔

کھانا کھانے کے بعد لال چائے آگئی۔ کیکر کی چھال کی سوندھی سوندھی خوشبو کے ساتھ کمرہ مہکنے لگا۔

بابا جلال اپنی خدمت کے دوران بابا جی نور والے کے زریں اقوال بیان کرتا رہا۔ ہماری تواضع میں طعام بھی تھا

تھا۔ شمس اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا..... ”میں فارسی بھی سمجھ لیتا ہوں اور بول بھی لیتا ہوں لیکن اردو اور پنجابی ابھی

بس کی نہیں اور صوفیائے کرام کا جو خزانہ اس دھرتی میں دفن ہے اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔“

شمس دہلا پتلا دراز قد امریکن تھا۔ اس کے مسلمان ہونے کی داستان بھی بڑی دلچسپ تھی۔ وہ تونیہ میں رہا۔

سین اولیاء کے مزار پر بھی حاضری دیتا رہا لیکن نور والوں کے ڈیرے پر آ کر وہ مسلمان ہو گیا۔

”میں یہاں آیا کرتا تھا۔ بابا جی بس ایک ہی بات پر زور دیتے تھے کہ میل جول رکھو۔ بابا جی کبھی قول سے مجھے

شمس کرتے تھے۔ وہ فرماتے بھئی مثال دیکھ کر ڈیرے کی زندگی میں ریج بس کر خود ہی کچھ تبدیلیاں آجائیں گی۔ صوفیا

شمس کرتے، متاثر کرتے ہیں۔ جس روز میں نے مسلمان ہونے کی خواہش ظاہر کی تو بابا جی فرط جذبات سے مغلوب

ہو گئے۔ گویا اپنی حیثیت سے بڑھ کر اعزاز ان پر تھوپا گیا ہو۔ باباجی نے دونوں بازو اٹھا کر فرمایا، ”ناں جانی جان بھائی ناں..... یہ بڑا کام ہے..... یہ مسجد میں ہوگا..... ہم مجذب لوگ۔ یہاں یہ کام نہیں ہوتا۔“ ڈاکٹر اشرف فاضلی کہنے لگا۔ شمس کا Jenkins امریکن نام بدل کر باباجی نے وضو کرایا اور شمس کو مسجد بھیج دیا جہاں مولوی صاحب نے اسے مشرف بہ اسلام کیا۔

شمس امریکی انگریزی بولتا بولتا چپ ہو گیا۔ جب بھی وہ جذبات سے مغلوب ہو کر بات کرتا اس کی گروہوں کی لویس سرخا سرخ ہو جاتیں۔ سبزی ماکن نیلی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے۔ جب بھی وہ اندر کے احساسات کی بات کرتا اس کی آنکھیں، ہونٹ، نتھنے تاثیر میں بھیک بھیک جاتے اور یوں لگتا کہ اس کی گفتگو دراصل اس کی آنکھوں، نتھنوں اور ہونٹوں میں تشکیل پا رہی ہے۔ عفت نے ابھی تک کھانے کو ہاتھ نہ لگایا تھا۔

”کھائیے..... شاید میں نخل ہوا ہوں۔“ شمس نے اصرار کیا۔

”جی مجھے بھوک نہیں۔“ عفت بولی۔

عفت نے پنجابی میں خاں صاحب سے کہا۔ ”کل رات اشفاق! بھائی زیرو کا بلب میرے کمرے میں بج رہا تھا۔ سارے کمرے میں کاسنی روشنی پھیلی تھی۔ باباجی کے بعد یہ شمس بھی میرے کمرے میں آیا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ کس طرح براڈ لاف میں ایک لڑکی نے اس کے سینے پر ٹکے مار کر کہا تھا کہ اسلام ایسا مذہب نہیں جس پر توجہ دینی چاہیے۔ جس نبی نے اتنی ازواج کا دل توڑا ہو..... جہاد بھی کیے ہوں..... اتنا سخت پروگرام دنیا کو پیش کیا ہو تم اس کو سن کر کھنکھناتے ہو۔“

شمس نے برجی کو ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا کہ میرے لیے اپنے سے مخالف رائے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس نے بھی سمجھنا ضروری ہے۔ Ideas are not for ever۔ یہ شمس کل رات میرے کمرے میں آیا تھا۔ اشفاق بھائی نے مجھ سے یہ ساری باتیں کی تھیں جو اب یہ کر رہا ہے۔ پتہ نہیں خواب تھا کہ..... کیا۔“

خاں صاحب نے ہولے سے کہا۔ ”خواب بھی عجب شے ہے عفت۔ کبھی کبھی روپائے صادقہ بھی نصیب ہوتی ہے۔ یہ کچھ اور طرح کے معاملات ہیں۔ انہیں سائنسی، منطقی، تجزیاتی یا تجرباتی انداز میں سمجھنا نہیں جاسکتا۔ ابھی تک کا علم نا پختہ اور قلیل ہے۔“

یکدم شمس نے کہا ”آپ کچھ میرے متعلق بات کر رہے ہیں..... یہ زبان کا بھی عجب حجاب ہے۔“

ہمارے درمیان کئی قسم کے حجابات تھے۔ نسل، رنگ، جغرافیائی فاصلے، ثقافتی بُعد، رسم و رواج، رہن سہن لیکن ان پردوں کے باوجود شمس اپنا ہونے کا احساس دے رہا تھا۔

”کل رات میں نے آپ کا خواب دیکھا..... ہو بہو یہی باتیں..... براڈ لاف کا ذکر۔“

اس نے ابرو اٹھائے..... ”واقعی میں براڈ لاف سے آیا ہوں۔ میں آپ سے پہلے کبھی نہیں ملا لیکن مجھے لگتا ہے..... لگتا ہے جیسے میں آپ سے پہلے بھی مل چکا ہوں۔“

”لیکن میرا خواب تو ہو بہو.....“

شمس نے بڑے عالمانہ انداز میں کہا..... ”جب نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے تو اس وقت حواسِ خمسہ ظاہری طور پر تعطل ہو جاتے ہیں۔ جو سفلی، ناسوتی دھواں دن بھر انسان کے گرد رہتا ہے، پھٹنے لگتا ہے۔ ہر انسان مسافر ہے اور جسم کے ساتھ بیخبرے سے نکلنے کی خواہش رکھتا ہے۔ جب نیند کا غلبہ ہو اور انسان آزاد ہو جانے کی شدید خواہش بھی رکھتا ہو تو یہ حالت اٹھتے ہیں اور بسا اوقات انکشافات ہونے لگتے ہیں۔“ بڑی آسانی اور روانی سے وہ انگریزی میں سمجھاتا گیا۔

”یعنی ہر خواب انکشافات کا درجہ رکھتا ہے شمس؟“ میں نے نا سمجھوں کی طرح سوال کیا۔

”یہ آپ کی خواہش پر منحصر ہے۔ آزادی طلب روحوں کے تجربات جب اٹھ جائیں تو جن امور کو وہ خواب میں دیکھتے ہیں، جاننے پر انہیں نہیں بھولتا اور اگر خواہش کمزور ہو تو قوت مدد کہ جاننے پر خواب کو منتشر کر دیتی ہے۔“ شمس نے جواب دیا۔

”اور یہ رویائے صادقہ کیا چیز ہے اشفاق بھائی؟“ عفت نے پوچھا۔

خاں صاحب رک رک کر بولے..... ”میرے قلیل علم کے مطابق عفت رویا کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی نعمت اس قسم کی ہے جو نفس مطمئنہ کا مالک ہو۔ اس کا خواب اسے ایسے مقامات کی سیر کرا دیتا ہے جو عقلِ انسانی کے حاکم میں بھی ممکن نہیں۔ دوسری قسم خواب کی وہ ہے جس سے نفسِ لوامہ کو سابقہ پڑتا ہے یعنی ایسی روح جو ابھی خواہش سے محبت نہیں پاسکی۔ اس لیے اسے ایسے خواب آتے ہیں جو دنیا سے وابستگی ظاہر کرتے ہیں۔ آنے والے واقعات کچھ Premonitions، کچھ Forebodings، کچھ پیش گوئیاں..... لیکن تیسری قسم خواب کی وہ ہے جو نفسِ امارہ کو دکھائی دیتے ہیں۔ یہ سب شیطانی ترغیبات سے تعلق رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی سچے ہو جاتے ہیں لیکن ان سے انسان کی روح کو کچھ نہیں ہوتا۔ کیوں کیا میں کچھ ٹھیک سمجھ پایا ہوں شمس؟“

”ول ڈن ول ڈن..... کچھ کچھ میں سمجھ گیا۔“ وہ نیچے کی سی معصومیت سے بولا۔

شمس سرخ گردن کیے بڑے اٹھماک سے خاں صاحب کی باتیں سن رہا تھا۔

چند لمبے ہم خاموش رہے اور عفت نے چائے کے پیالے کو منہ لگا لیا۔

”اشفاق صاحب! کیا آپ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ انسان ایک وقت میں دو جگہ موجود ہوتا ہے۔ تو نہی میں ایک درویش نے مجھے بتایا کہ ہر انسان کی چھ Duplicate کاربن کاپیاں دنیا میں ایک وقت پر موجود ہوتی ہیں۔ کیا حتمات پر ایک وقت میں ہونا ایسی Phenomena کا حصہ تو نہیں؟“ شمس نے بات کی۔

کچھ دیر سر میں انگلی پھیرنے کے بعد خاں صاحب نے بولے..... ”جو لوگ حظِ نفس کو چھوڑتے ہیں اور نعمتوں سے بچھڑتے ہیں۔ ان کے لیے بہت کچھ ممکن ہے۔ وہ Levitation بھی کر سکتے ہیں اور Linear travel بھی ان کے لیے ممکن ہے۔“

عفت کی طرف دیکھ کر شمس بولا۔ ”کل رات مجھے لگا کہ میں براڈ لاف میں ہوں۔ چھ سال پہلے میرے باپ نے مجھے وہاں بھیجا تھا۔ وہاں ادیبوں کی ایک انٹرنیشنل کانفرنس تھی۔ باپ نہ جانے کیوں بیٹوں سے اتنی امیدیں وابستہ کر رہے ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں فاکنر (Faulkner) کی طرح ایک بڑا ناول نگار بنوں۔ پتہ نہیں کیوں اولاد ماں باپ کی

آرزو پر کم و بیش کبھی پوری نہیں اتر سکتی۔“

عفت کا نوالہ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے شمس کا چہرہ غور سے دیکھا۔ عفت کا چہرہ بخار میں تپا ہوا تھا۔
ہے اشفاق بھائی وہی ہے..... میں بھی کل رات اسے دیکھ چکی ہوں۔“ عفت نے اردو میں کہا۔ ایک ہی وقت میں
مقامات پر موجود ہونے کی کیفیت کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”یوں سمجھیے براڈ لاف میرا قبلہ اول ہے۔ وہاں میں داؤد سے ملا۔ وہ افریقی سیاہ فام اتنا طاقتور تھا کہ کسی
بڑے میں انسان کو جز سے اتار پھینکتا اور..... اور..... اس نے اپنی یہ طاقت ہمیشہ لوگوں کو بچانے کے لیے استعمال کی۔
نے اپنی ساری طاقت استعمال کر کے مجھے کہا..... شمس..... تو نیہ چلے جاؤ..... یہ براڈ لاف تمہارے مطلب کی جگہ نہیں ہے۔
یہ کہہ کر وہ یونیورسٹی سے غائب ہو گیا۔ نہ جانے کہاں چلا گیا لیکن میری سمت مقرر کر گیا۔ اس نے کوئی مشورہ نہیں دیا۔
بحث مباحثہ نہیں کیا لیکن باباجی کی طرح ایک نظر سے میری منزل مقرر کر دی۔ سیاہ آدمی میں کسی کو بچانے کی کتنی قوت
ہے۔ پتہ نہیں کیوں وہ یہ طاقت دنیا حاصل کرنے کے لیے استعمال نہیں کرتا۔

اللہ نے سفید فام اور سیاہ جلد والوں کی سعی مقرر کر دی ہے۔ سفید آدمی ہمیشہ دنیا سیدھی کرتا ہے۔ وہ سراسر
ہاتھ پکڑ کر ساری قوت مجتمع کر کے حال کو درست کرتا ہے لیکن سیاہ انسان کو اس دنیا کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ روح کو گائیڈ
مابعد کے لیے کوشش کرتا رہتا ہے۔ کبھی آپ نے سوچا کہ سفید قوموں میں نبی کیوں نہیں آئے؟ انہیں اللہ کی رضا سے
دنیا سنوارنی ہے۔ وہ اسی دنیا کے لیے بنائے گئے ہیں۔ جب کبھی کسی سفید آدمی کو میری طرح مابعد کی تلاش ہوگی
کی آرزو ہوگی، اسے مشرق کی طرف دیکھنا پڑے گا۔ پھر چاہے وہ صیب اٹھالے، چاہے اس کے بیٹے مارے جائیں
بیٹیاں زندہ رہیں۔ چاہے وہ جہاد میں شہید ہوں..... انتخاب اس کا اپنا ہوگا لیکن راستہ مشرق والے دکھائیں گے۔“
باہر سے اذان کی آواز آنے لگی۔ دھمال والوں کے گھنٹھر وسمٹ کر چپ ہو گئے۔ ڈھول تاشے بجنے بند ہو گئے۔
شمس نے اپنے گلے سے گیندے کا ہار اتار اور عفت کے گلے میں ڈال کر بولا۔ ”یہ ہار بڑی چیز ہے جی، اسے پہن لیں۔
باباجی فرماتے ہیں۔ ہر پھول کی بھی آرزو ہوتی ہے کہ وہ بالآخر محبوب کے گلے کا ہار بنے۔“

”عفت مجھے دیکھئے۔“ شمس نے عفت پر نظر ڈالی اور اس کا دل بہلانے کی غرض سے بتانے لگا کہ براڈ لاف
میں اسے وہی برجی ملی تھی جو عفت کے خواب میں آئی تھی۔ وہیں اسرائیل کی نائے قدر کی شاعرہ، گھانا کا جوشیلا جرنلسٹ تھا۔
ہندوستان سے آیا ہوا، نائی سوٹ پہننے والا ہری بھوشن تھا۔ ہری بھوشن اور شمس اکٹھے ایک کمرے میں رہتے تھے اور یہ
آدرشوں پر گتھم گتھا بھی ہو جاتے تھے۔ ”میں ادیب تو نہیں تھا لیکن میرے سکول ماسٹر باپ کی آرزو تھی کہ میں ایک
فاکٹر بن جاؤں اور نوٹیل پرائز پاؤں۔ مجھے اندر سے معلوم تھا کہ فاکٹر بننا کسی انسان کے اپنے بس کی بات نہیں لیکن
اپنے سکول ماسٹر باپ کی آرزو کو بھی پس پشت نہیں ڈال سکتا تھا۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ کینسر کا مریض میرا باپ زیادہ
نہیں رہے گا۔ اسی لیے میں براڈ لاف چلا گیا تھا۔“

اسرائیلی برجی کا قد چار فٹ گیا رہا انچ تھا۔ جب ہم دونوں براڈ لاف کی خوبصورت لانوں پر گھومتے تو وہ
میرے سینے تک آتی۔ برجی نے مجھے شہد کھانا سکھایا۔ وہ ناشتے پر، دو پہر لنچ کے وقت، شام کی چائے میں، رات کے کھانے

بابا نور والے اور دیگر

”نور والوں کا ڈیرہ“

جب خاں صاحب اردو بورڈ میں بطور ڈائریکٹر کام کر رہے تھے، ان کی کل تنخواہ آٹھ سو روپے کے قریب تھی لیکن ہمیں کوئی مالی پریشانی نہ تھی۔ البتہ خاں صاحب کچھ بچھے بچھے، بے زار سے، کچھ روپائے سے نظر آتے۔ یوں لگتا تھا گویا ان کے اندر کوئی مدھانی پھر رہی ہو لیکن کسی قسم کا گھصن اوپر نہ آ رہا تھا۔ میں نے اسے کام کی زیادتی پر مہمبول کیا۔

خاں صاحب گلبرگ کے دفتر سے بوریا بستر اٹھا کر 299۔ لہڑ مال میں شفٹ کر گئے تھے۔ یہ زمین خاں صاحب نے اپنے نام سے خریدی تھی کیونکہ مالک مکان شکی قسم کا آدمی تھا اور کسی صورت حکومت کو زمین بیچنے پر اسے راضی نہ تھا کہ کون جانے کس وقت کسی نئے افسر کے آنے پر حکومت یہ زمین واپس نکلیں کرے۔

خاں صاحب نے بلڈنگ میں اردو بورڈ کی کتابیں بیچ کر جو دس لاکھ جمع کیا تھا، اس سے تعمیر کی تھی۔ حکومت نے کسی قسم کی اعانت لیے بغیر غالباً یہ پہلی عمارت تھی جو کسی ادارے نے بنائی تھی۔ کچھ بار دوستوں نے خاں صاحب کو یہ سنبھال بھی دیا کہ بلڈنگ تمہاری ہے اب حکومت سے کرایہ وصول کرو لیکن خاں صاحب ایسی باتوں پر ہنس دیا کرتے تھے لیکن یہ دنوں تو انہیں کسی بات پر ہنسی آتی ہی نہ تھی۔

میں نے حسب عادت نہ تجسس کوراہ دی، نہ ان کے اندر کے موسم کی کنسوٹی لی۔ ان کے اندر کی چوکیوں کا میں نے کوئی اندازہ نہ لگایا۔ دفتر میں حنیف رائے خاں صاحب کے نیچے کام کرتے تھے۔ حنیف رائے غالباً وہ اداسی کے دور سے خود بھی گزرتے رہتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی رشید احمد چوہدری جب بھی دفتر آتے تو خاں صاحب سے ضرور ملتے۔ ایک بار باتوں باتوں میں نور والوں کے ڈیرے کا ذکر ہوا۔ اس لیے وہ خاں صاحب کو دفتر والوں کے ڈیرے پر لے گئے۔

ڈپریشن کی بیماری ازل سے انسان کے تعاقب میں رہی ہے لیکن انسان جب زرعی دور سے گزر رہا تھا، نیچے کے قریب تھا۔ کچی سبزیاں، فصلیں، پھل، جڑی بوٹیاں استعمال میں تھیں۔ اصطبل میں گھوڑے، گھروں پر بھینس، بکریاں گائے، بچھڑے اس کی زندگی کو تصنع اور نمائش سے دور رکھتے تھے۔ تب بھی ڈپریشن ہوتا ضرور تھا لیکن یہ مرض موہی زکام

تھی۔ سرور کی طرح جلد صحت سے آشنا ہو جاتا۔ تب ڈپریشن کا تعلق پیدائشی معذوری کی شکل میں ابھرتا تھا۔ پاگل پن،
 نفس اور ڈپریشن کا زیادہ تعلق ماحول اور تربیت سے نہیں تھا بلکہ کہیں وراثت میں Genetics کی کارستانی ہو کرتی

لیکن آج کے عہد میں ڈپریشن کی بیماری نے وہائی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس کی بظاہر وجہ یہی لگتی ہے کہ اب
 ترقی کو صرف مادی ترقی سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ دنوں میں امیر ہونے کا خواب ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کونھی، کار،
 عین کے لیے بڑھیا انگریزی سکولوں کی تعلیم (صرف پرائیویٹ سکولوں کی تعلیم ہی اصل تعلیم سمجھی جاتی ہے) ہر انسان کی
 جان چکا ہے۔

پے در پے کوشش کے باوجود جب نوجوانوں کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا تو نوجوان اپنے آپ کو کھنڈ اور نا اہل
 سمجھ لگتا ہے۔ اس میں مسابقت کی روح ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا شعور اسے سمجھاتا ہے کہ وہ دنیا اور دنیاوی زندگی کے لیے
 بھول جاتا ہے کہ اللہ بعض کو بعض پر فوقیت دیتا ہے۔ کسی کو رزق، کسی کو حسن، کسی کو دانشوری سے نوازتا ہے
 عیب و حاج اور حسد کے زخموں میں پھنس کر آج کا نوجوان نا کارہ ہو جاتا ہے۔ اس کا ہاتھ جو اس خسہ کی عطا کردہ حالیہ نعمتوں
 سے کچھ لگتا ہے۔

وہ ایسی مسرتوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے جو جسم کو لذت دیتی ہے۔ روح کی پالیدگی کا تو سرے سے اسے علم ہی
 نہیں پھیلتا۔ جب دونوں پاؤں اکھڑنے لگتے ہیں تو ڈپریشن کا مریض موت کی خواہش کرتا۔ دنیاوی زندگی وہ حاصل نہیں
 کر سکتا۔ روح کے سفر کا علم اسے نہیں ہوتا۔ ایسے میں جو توڑ پھوڑ ہوتی ہے، وہ مکمل مایوسی کو جنم دیتی ہے۔ ڈپریشن کا مریض
 کبھی کے خواب ایسے دیکھتا ہے گویا کسی محبوبہ کے خیالوں میں غرق ہو۔ آج کے عہد میں خود کش حملے اور خود کشی کے
 تحفے عموماً اسی ڈپریشن کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کرائم کی دنیا اسی ڈپریشن نے آباد کر رکھی ہے۔

کچھ خوش نصیب ہر دور میں ایسے ہو گزرے ہیں جو ڈپریشن میں جانے کے بجائے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ روح کے
 سفر میں دنیاوی یافت ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ وہ دنیا کو اپنے ارادے اور اختیار سے پس پشت ڈال کر فقیری چال اختیار کر
 لیتے ہیں۔ نیوں کا راستہ، مہا تما بدھ، مہاراجہ رام چندر، ابراہیم ادہم اور بڑے بڑے قطب ولی اسی راہ کے مسافر ہیں۔ وہ
 یہ کوہِ واجب سمجھ کر دنیا کے لیے تنگ و دو نہیں کرتے اور عجب اتفاق ہے زمانوں پر اپنی مہر لگا کر چلے جاتے ہیں۔

دھرم پورہ میں بابا افضل شاہ صاحب کا ڈیرہ تھا۔ بابا جی اپنے بچوں سے غافل، دولت کی خواہش سے تہی، حب
 سے متنفر ایک ایسی اجتماعی زندگی گزار رہے تھے جہاں وہ نا امید لوگوں کے دیئے میں امید کا تیل ڈالتے اور اسے روشن
 کرتے۔

مجھے نہ ڈیرے کا علم تھا نہ رشید احمد چوہدری یا حنیف رامے کی رہبری کا۔ پھر چانک ایک دن خاں صاحب نے
 مجھے ناشتے کے وقت کہا ”قدسیہ حنیف رامے مجھے بابا جی نوروالے کے ڈیرے پر لے جاتے رہے ہیں۔ وہاں کا عجب
 محل ہے۔ ہر طبقے کا آدمی گھومتا پھرتا نظر آتا ہے۔ سارا دن ٹیکر کی چھال کی گڑ والی چائے ملتی ہے۔ آپ جب جائیں
 آپ کے آگے کھانا لگا دیتے ہیں۔ پیالے میں سالن چھابے میں روٹیاں۔“

”کوئی لٹچ ٹائم، ٹی ٹائم نہیں؟“

”نہیں بابا کے ڈیرے پر لٹچ ٹائم یا ٹی ٹائم نہیں ہوتا۔ جونہی کوئی داخل ہوتا ہے۔ بابا جی کہتے ہیں لو بھی غصے طواف کرو، جانی جان آئے ہیں۔ اتنی خوشدلی سے کسی کا سواگت کرتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔..... چلو گی دیکھو خاں صاحب نے ڈرے ہوئے اشتیاق سے کہا۔

”ضروری ضرور۔“

خاں صاحب کی عادت تھی وہ ہمیشہ کسی نئے خیال، جگہ، جمن، سہیلی سے پہلے خود ملتے۔ سارے حدود درہم حدود واقف ہوتے۔ پھر جہاں کہیں پھسلن ہوتی وہ اس مقام کو گول کر جاتے ورنہ مجھے اس فونو گرافر کی طرح جو آپ کے کلا کپڑا ڈال کر کہتا ہے ”دیکھو دیکھو یہ قطب صاحب کی لاٹ ہے..... بارہ من کی دھوبن کو سلام کرو..... دیکھو دیکھو..... آیا.....“ مجھے ایسے ہی وہ ہر تماشا دکھا دیتے۔

آپ نے بھی شاید کبھی بچپن میں یہ شعبہ باز فونو گرافر دیکھا ہو جو اپنا کیمرو، سلائیڈز، تین ناگلوں والے سے پر رکھ کر کنٹری جاری رکھتے ہوئے دنیا جہاں کے عجائبات دکھایا کرتے تھے۔ خاں صاحب میں بھی ایسے شعبہ باز کی تھی۔ وہ ایک مرتبہ لندن سے جادو کا سامان بھی لائے تھے جس میں رنگ بدلنے والے رومال، جادو کی تاش، رنگت گیندیں شامل تھیں۔ ایک دو مرتبہ انہوں نے خود Jugglery بھی کرنے کی کوشش کی لیکن گھر والے ہمیشہ کی طرح غروش خروش کے ساتھ متوجہ نہ ہوئے۔

خاں صاحب کو حیران ہونے اور حیران کرنے کی عادت تھی۔ اسی میں ان کی ساری نشوونما تھی۔ مجھے انہیں حیران یاد ہے کہ وہ خود تو جادو گر نہ بن سکے لیکن ایک شام انہوں نے بہت سارے ادیبوں کی دعوت کی اور مجھ سے کہا..... ”تو اس دعوت پر نہ ادبی باتیں ہوں گی نہ غیبت ہی چلے گی۔ ہو سکے تو آپس میں جو شہرت کی ہوس اور حسد ہے اس پر بھی غصے چڑھا رہے۔ بتاؤ کیا کریں کہ ادیب حضرات ایک دوسرے کی غیبت میں کھسر پھسر نہ کریں اور ان کا دل بھی لگا رہے۔“ میں نے کچھ سوچنا چاہا لیکن وہ سر ہلا کر بولے..... ”پالیا..... پالیا.....“

جب کبھی انہیں کوئی نئی بات سوجھتی تو وہ ارشیدس بن جاتے جو ٹب میں بیٹھا سوچتا تھا کہ کسی چیز کی Bouncy کیسے معلوم کی جائے اور ٹب میں اس پر انکشاف ہوا کہ جس قدر پانی کوئی مادی چیز displace کرتی ہے وہی Bouncy ہے۔ ارشیدس ٹب میں سے برہنہ نکلا اور روم کی گلیوں میں چلا تا گیا..... ”پالیا..... پالیا.....“ خاں صاحب اور مجھ میں بھی ”پالیا..... پالیا.....“ کی ایک پوری روایت موجود تھی۔ ”اس بار میں ماسٹر جگلر بلاؤں گا وہی ان ادیب بھائیوں کی سٹی گم کرے گا۔“ خاں صاحب جذبے سے بولے۔

اس دعوت میں احمد ندیم قاسمی، شہزاد احمد، امجد اسلام امجد، عطاء الحق قاسمی، سلیم اختر، مشکور حسین یاد، سائید احمد اور بہت سے اہم ادیبوں نے ہماری حوصلہ افزائی کی۔ چائے کے بعد ساری ادیب برادری باہر لان میں جمع ہوئی۔ خاں صاحب نے اپنی جادوگری تو نہ دکھائی البتہ ایک پروفیشنل جادو گر کو بلوایا۔ اس نے کچھ ایسے کرتب اور شعبہ دے دکھائے کہ ادیبوں کو آپس میں باتیں کرنے کا وقت نہ ملا بلکہ انہیں عام انسانوں کی طرح خوش ہونے کا موقع ملا۔

ایک اور مرتبہ یوں ہوا۔ ہاجرہ مسرور تب حیات تھیں اور کراچی سے آئی ہوئی تھیں۔ خدیجہ نے خاں صاحب کو
 ”لیکن کیا؟“ خدیجہ نے پوچھا۔

”اس خوشی کے موقع پر کچھ ہو جائے۔“

”کیا ہو جائے اشفاق بھائی؟“

”کوئی دعوت، کوئی ٹی پارٹی.....؟“

تو طے پایا کہ ادیبوں کو چائے پر مدعو کیا جائے۔ مجھے بلا کر خاں صاحب نے کہا ”کیا تم ان حضرات کو کچھ پارٹی
 (Games) کھلا سکتی ہو۔ کوئی Pillow Fight، رسہ کشی، آنکھ چھوٹی قسم کا کھیل؟“

اس دن سب سے کامیاب کھیل وہ تھا جب سب ادیب دائرے میں بیٹھے تھے۔ ایک ادیب کو میں ایک پرچی
 اور ہدایت دیتی کہ اسے کھولنا نہیں اور دوسرے ادیب کو جلدی سے پکڑا دینا ہے۔ سیکڑوں پر موسیقی جاری ہو گئی۔
 جسے موسیقی رکتی جس ادیب کے ہاتھ میں جو پرچی لگتی اسے کھول کر اسے پڑھنا پڑتا اور پھر جو سزا اس پر لکھی ہوتی اسے
 پڑھنا ہوتی۔ احمد ندیم قاسمی کے ہاتھ میں جب پرچی پکڑی گئی تو اس پر لکھا تھا ”گانا سنائیے۔“ بیچارے کھیل کی ہدایات
 کے پتہ نہ تھے اور درمیان میں کھڑے ہو کر انہوں نے اپنے دو تین اشعار جن کے ساتھ سنائے۔ خوب تالیاں بکسیں۔
 میری سٹی گم کرنے کے لیے خاں صاحب مجھے ڈیرہ پاک لے گئے۔

اس سے پہلے بابوں کا مجھے تھوڑا سا تجربہ تھا۔ یہ قیام پاکستان سے پہلے کا واقعہ ہے۔ اُن دنوں میری خالہ
 یونانی کے گورنمنٹ سکول میں ہیڈ ماسٹر تھیں۔ میانوالی میں نیازی پٹھانوں اور صوفی حضرات کا ان دنوں زور تھا۔ خالہ
 ایک جاٹا چڑا سی جو بنیادی طور پر حلوائی تھا، خالہ کے پاس آیا۔

”جی آپ سے ایک عرض کرنی ہے۔“

امیر محمد قریشی خاموش آدمی تھا۔ وہ کبھی ذاتی غرض لے کر ان کے پاس نہیں آیا تھا۔

”کیا بات ہے قریشی؟“

”یہاں سے کچھ دور دے والی ہے۔ وہاں ایک شاہ صاحب رہتے ہیں۔ بڑے کرنی والے ہیں۔ کیا پتہ آپ

کو؟“ امیر صاحب لہور ہو جائے۔ ان سے ملے بغیر یہاں سے چلے جانا.....“ باقی بات امیری خالہ سمجھ گئیں اور شاہ صاحب

سے ملنے کی ٹھانی۔

خالہ کے ماتحت آپا مبارک کام کرتی تھیں۔ اُن کا آبائی گھر لاہور میں کلکتہ روڈ پر حسین لاج میں تھا۔ باپ ڈاکٹر

تھے اور انہیں انگریز حکمرانوں کی طرف سے خان بہادری کا تمغہ ملا تھا۔ آپا مبارک کو نوکری کی ضرورت نہ تھی۔ وہ فقط شادی

سے پہلے وقت کٹی کے لیے کام کر رہی تھی۔ آپا مبارک کی دو بہنیں اور ایک ڈاکٹر بھائی تھا۔

خالہ فیروزہ نے شاہ صاحب کے ایڈونچر میں آپا مبارک کو بھی شامل کر لیا لیکن اس مشغلے کو سکول کے ڈسپلن کے

خلاف سمجھتے ہوئے خالہ نے یہ تجسس آگے نہ بڑھنے دیا۔ چھٹیوں میں جب خالہ حسین لاج آپا مبارک کے ساتھ گئیں تو

دے والی کے شاہ صاحب بھی وہاں پہنچے۔

آپا مبارک، عزیز آپا اور سعید روزے کے دنوں میں ہمارے پاس دھر مسالے آتے۔ ہمیں جب بھی دھرتے ہوتا ہم حسین لاج ٹھہرتے۔ سعید کے ساتھ میری گہری دوستی ہو گئی جو اب تک قائم ہے۔ مجھے بابوں کا پہلا تجربہ شہر جیسی سعید کے حسین لاج میں ہی ہوا۔ دے والی کے بابا جی نواب کا لا باغ کے بھی پیر تھے۔ ان کی شہرت دور دور تک ہوئی تھی۔ حفیظ اللہ شاہ صاحب کی نیلی آنکھیں، تیکھے نقوش اور ایرانیوں جیسی رنگت تھی۔ وہ نگاہیں نیچی رکھنے اور جھٹکے کے پلو سے چھپانے والے بزرگ تھے۔ ان میں کچھ تصرفات ضرور تھے لیکن وہ اعلیٰ کبھی ان کا اظہار نہ کرتے۔ کبھی بند مٹھی ہوا میں لہراتے۔ پھر اسے کھول کر ہمیں ایسے میوے پیش کر دیتے جو بے موسمی ہوتے۔

حفیظ اللہ شاہ صاحب کی معیت میں ایک پنواری صاحب بھی ہمارے گھر آیا کرتے جو سورۃ المزمل کے تھے اور سنا ہے کچھ جنات ان کے قبضے میں تھے۔ وہ باواز بند سورۃ المزمل پڑھتے۔ پھر اللہ ہوا کبر کا نعرہ لگاتے۔ ایک فرس پر مارنے کے انداز میں آگے کرتے اور عالم غیب سے موسیٰ پھل سفید پکھی ہوئی چادروں کے گرنے لگتے۔ حیرت سے انہیں دیکھتے اور فرمائشیں کرتے۔

”مچھلی تو منگوا دیں شاہ جی۔“

”کھا جو کھانے کو جی چاہتا ہے۔“

”پان..... پان“ میری منہ بولی بہن سعیدہ کہتیں۔

وہ اونچے اونچے سورۃ المزمل پڑھتے پھر مٹھی بند کر کے سفید چاندنی پر اشارہ کرتے۔ گرم گرم مچھلی، پان، چلیسیاں، گلاب جاسن فرس پر ہوتے۔ میری والدہ نے بھی ان سے سورۃ المزمل کا وظیفہ لیا تھا اور وہ تاحیات پڑھتی رہیں لیکن کسی قسم کی شہدہ بازی یا تصرف ان کے ہاتھ نہ آیا۔ میں نے اپنے تجربات کا ذکر ان سے نہ کیا۔

ایک مرتبہ ہم سب کلکتہ روڈ پر حسین لاج کے اوپر والے مہمان خانے میں بیٹھے تھے۔ پنواری صاحب جاری تھا۔ پھر یکدم پنواری صاحب بولے۔ ”کوئی جا کر تار پر سے نیلی گرام اتار لائے۔“

میں باہر گئی، کپڑے سکھانے والی تار پر واقعی ایک تار لگی ہوئی ہوا میں ڈول رہی تھی۔

خاں صاحب نے پھر تصدیق کے طور پر میری سستی گم کرنے کے انداز میں پوچھا۔

”قد سید ڈیرہ پاک چلو گی۔“

”ہاں جی ضرور۔“

”تم کبھی پہلے کسی ڈیرے پر گئی ہو؟“

”نہیں خاں جی..... مجھے معلوم نہیں ڈیرہ کیا ہوتا ہے۔“

”بڑی آئیڈیل جگہ ہے۔ بڑا آئند ملتا ہے۔ آدمی ہلکا پھلکا ہو جاتا ہے۔“

میں جی میں سوچتی رہتی۔ پتہ نہیں بابا جی نور والے کیسے ہوں گے؟ دے والی کے حفیظ اللہ شاہ صاحب

تعمیریں چمکی ہوئی، نمی نمی مسکراہٹ..... جمال ہی جمال..... کہ پیواری صاحب کی طرح عقل دنگ کرنے والے کسی شخص کی طرح حیرت کے حوالے کر دینے والے۔

دھرم پورہ میں انفنٹری روڈ پر بائیں ہاتھ باباجی کا ڈیرہ تھا۔ ہم اس پٹری پر چل دیے جو باباجی کے باورچی کے کمرے کی طرف جاتی تھی۔

ہم دونوں ایسے داخل ہوئے کہ خاں صاحب دو فٹ آگے تھے اور میں کچھ خوفزدہ سی اچنتی سی نگاہ ماحول پر ڈالتی رہتی تھی۔ بائیں ہاتھ چٹائیاں بچھی تھیں، جن پر کچھ لوگ عبادت میں مشغول تھے۔ دائیں ہاتھ کے چھدرے سے رختوں سے بکریاں بندھی تھیں۔ ہر چارہ ڈالنے والے اپنا کام کیے جا رہے تھے۔ ایک پکا کمرہ دائیں ہاتھ تھا، جس کا دروازہ کھلا تھا اور دائیں ہاتھ کھانے پینے کے انتظام میں محمد علی صاحب اور باباجی بیٹھے تھے۔ چھوٹا سا راستہ چھدرے کی طرف جاتا تھا جہاں عموماً باباجی اپنے مکالمات سے تعلیم فرمایا کرتے تھے۔

ڈیرے کے راستے پر سب سے پہلے بابا جلال سے ٹاکرا ہوا۔

بابا جلال دبلے پتلے سے سبز توب میں لبلبوس ملے۔ وہ انسان سے زیادہ پرندہ لگتے تھے۔ غالباً باباجی ان کی شکل سے زیادہ خوش نہ تھے لیکن مودی خانے کا سارا آنا، تیل، چینی ان کی تحویل میں ہوتا اور وہ پھدکنے کے انداز میں سب کو بھرتا توں میں لگے رہتے۔

ڈیرے کے پیچھے بہت آگے ”علاج بالغذا“ کا ہسپتال زیر تعمیر نظر آ رہا تھا۔ وہاں مزدور، راج، مستری بڑے بڑے کمرے اور کھانا کھانے کے ساتھ خوش دلی کے ہمراہ دیواریں اُسارنے، پلستر کرنے میں مشغول تھے۔ محمد علی صاحب اور باباجی بیٹھے تھے۔ سامنے چولہے جل رہے تھے، دو گچے چڑھے تھے اور باباجی کفگیر چلا رہے تھے۔ لنگر تیار ہو رہا تھا۔ باباجی فضل شاہ نے عمل دے والی کے شاہ صاحب جیسی نورانی، خوبصورت ڈائری اور پلوچرے پر لیے بغیر ہارہ چہرہ..... میں نے کبھی بابا جی کی صورت کو بڑے غور سے نہیں دیکھا..... لیکن اس امی بزرگ کے چہرے پر بڑی شائستگی، شائستگی اور نمی نمی چھاؤں جیسی شگفتگی تھی۔

”آؤ جی آؤ جانی جان آگے..... جانی جان آگے۔“

باباجی کی آواز نے سواگت کیا۔

”میں جی قدسیہ کو لایا ہوں باباجی۔“

”لو جی..... ہماری بیٹی آگئی..... سب خیراں ہو گئیاں..... نیچے چل کر بیٹھو جی..... نیچے چل کر، جی رانی آئی

آج تو۔“

ہمیں بابا جلال نشیبی تہہ خانہ نما کمرے میں لے گئے۔ اوپر کی سطح سے یہ کمرہ دس بارہ فٹ نیچے تھا۔ لیپ کی ہوئی فرش پر بچھی دریاں، چٹائیاں، عجب سماں، عجب روشنی..... ابھی ہم نیچے ہی تھے کہ بابا جلال چائے لے کر آگئے۔ آجخوہ نما روغنی پیالوں میں گرم گرم لذیذ چائے تھی۔ یہ چائے کیکر کی چھال ابال کر اس میں وافر دودھ اور گڑ ملا کر بنائی جاتی تھی۔ میں نے اسے گھر پر بنانے کی ناکام کوشش کی لیکن اس کی لذت غالباً باباجی کی محبت سے کشیدگی جاتی

تھی۔ وہ اپنے مستی پہرے میں ایسی نادر چیزیں سیکھ آئے تھے جن کی نقل کرنا ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔

چائے پینے کے دوران مجھے خاں صاحب نے بتایا تھا کہ چودہ برس کی عمر میں باباجی پر جذب کی کیفیت ہو گئی تھی۔ باباجی پر غلبہ حال ہوا تو آپ آبادی سے دور جنگلوں میں نکل گئے۔ اس عالم میں یا تو باباجی گریہ و زاری کرتے خود کو بلی کرتے۔ اس حالت میں منہ سے جو کچھ دیتے پورا ہو جاتا۔ پورے بارہ سال یہی جذب و مستی کا عہد رہا۔ پھر یہ جذبہ جالندھر میں میاں خدابخش سلسلہ قادر یہ کے حضور حاضر ہو گئے۔ جو کچھ مرشد نے کھلایا بابا افضل شاہ نے کھایا جو یہ تین دن کیا۔ سنا ہے چودہ سال زیر تربیت رہ کر چار مقامات پر تصرف ہو گیا۔ پہلا قول..... دوسرا عمل، تیسرا علم..... اخلاص یعنی تصوف کا بی۔ اے پاس کر لیا اور میاں خدابخش سے لوگوں سے میل جول کی اجازت مل گئی۔

کچھ دیر بعد باباجی تشریف لائے۔

”ناں ناں وحی رانی نے نہیں اٹھنا۔“

باباجی نے اس وقت ڈھیلا ڈھالا کھدرا کر گرتا، کھد رہی کا تہہ اور موٹی ٹمل کا صافہ پہن رکھا تھا۔ چائے شکر میں نے دیکھا کچھ کھیاں، بھنسنی تھیں اور بارہا ہار پیالے کی مٹھاس پر اُٹھ آتی تھیں۔ میں نے پہلے تو رومال سے ہٹانے کی کوشش کی، لیکن پھر ان سے اچھٹکارا پانے کے لیے پیالہ پرچ میں اُوندھا رکھ دیا۔

”ناں ناں وحی رائے۔ سیدھے کو کبھی اُٹھنا نہیں کرتے۔“

یہ تربیت کا پہلا جملہ تھا۔ میں دورگی دنیا کی باسی تھی۔ جہاں اُٹھا کر نا اپنی ذہانت اور برتری کا ثبوت تھا۔ دوسرے کے نقص بیان کرنے سے اپنی برتری ثابت کی جاتی تھی۔ مجھے یوں ڈائریک انداز میں کسی نے نہ ٹوکا تھا۔ خیال تھا کہ بابا لوگ یا تو خواہشیں پوری کرتے ہیں یا پھر چپ تپ، ورد و وظیفہ آپ کی حواگی میں دے دیتے ہیں۔ اُلٹے کو سیدھا کرنے کی ترفیب کبھی نہیں دیتے۔

اس روز کے بعد عموماً میں خاں صاحب کے ساتھ ڈیرہ پاک جانے لگی لیکن میرا رویہ محتاط ہو گیا۔ اچھے عرصہ وہاں جاتے نہ گزرا تھا کہ باباجی نے ایک روز مجھ سے ڈیرے پر کڑا ہی گوشت پکوا یا۔ میں گھر سے اپنی کڑا ہی ساز و سامان لے کر گئی۔ جب کڑا ہی تیار ہو گئی تو باباجی نے ذرا سا چکھ کر کہا ”کھری ہے کھری..... لیں میں خاں صاحب..... لنگر میں بانٹ دیں۔“

اس وقت خوش ہو کر خاں صاحب نے باباجی کو دعا دی۔ ”بیان اور بڑھ جائے گا۔ بیان اور بڑھ جائے گا۔ نوٹ! بیان اور بڑھ جائے گا۔“

غالباً یہی وہ لمحہ تھا جب ”زاویہ“ پروگرام کی نیورکھی گئی۔ ”معلقین شاہ“ کو قبولیت کا شرف عطا ہوا۔ سنا ہے کہ روہیں جو اپنے لیے کچھ نہیں مانگتیں، ہر صورت راضی برضا رہتی ہیں۔ ان کی آرزو کو حق تعالیٰ فوراً مان لیتے ہیں اور وہ مستجاب الدعوات بن جاتے ہیں۔ منہ سے جو کچھ لوگوں کے لیے مانگتے ہیں، پورا ہوتا ہے۔

جس طرح مجھے ڈیرہ پاک لے جا کر خاں صاحب نے محو حیرت کیا اسی طرح ہولے ہولے بچوں کو بھی دنیا کے مختلف رنگ دکھانے کے لیے ساتھ لے جانے لگے۔ ہم شام کے وقت پی ڈی بیو آر کی کلب میں سوئمنگ کے لیے

تھے۔ خاں صاحب بڑے اچھے تیراک تھے اور وہ بڑے آرزو مند تھے کہ بچے اس طرح تیرنا سیکھیں گویا مچھلی ہیں۔ پانی کے چھینٹے اڑاتا شپ شپ پاؤں چلاتا تو ان کی رومن ناک پر تھوڑی سی ناخوشگوار سی آٹار پیدا ہوتی ہے۔ کہتے چاہے برفلائی سائل ہو چاہے فری سائل تیرنے کی شرط ہے شور شرابہ نہ ہو..... نہ پانی میں نہ اپنے اندر۔ پی ڈبلیو آر کی یہ کلب نہر سے کچھ ہٹ کر اندر کی طرف تھی۔ نہانے کے بعد بچوں کو بھوک لگ جاتی۔ میں گھر سے لے کر لے جاتی تھی۔ اشتیاق منزہ بھی آ جاتے۔ ہم اپنے ساتھ کبھی کبھی آ پا صابرو اور روجی کو بھی لے جاتے۔ اچھی لگتی تھی۔ کاساں بن جاتا۔

ایک روز پی ڈبلیو آر کے سوئمنگ پول کے بعد اچانک خاں صاحب بچوں کو ڈیرہ پاک لے گئے۔ ہم نے تہہ سے تہہ کر لنگر کیا۔ اینق، اینس اور اشیر جیرانی سے چاروں کھونٹ دیکھ رہے تھے۔ پتہ نہیں ان ناپخت ذہنوں نے اس سے کیا اثر لیا ہوگا؟ اتنا ضرور لگتا تھا کہ اس Exposure سے وہ خوفزدہ سے تھے۔ جب ہم گھر جانے کے لیے تہہ خانے سے نکلے تو اچانک باباجی کنگیر دیکھ چھوڑ کر باہر آ گئے۔ اینق احمد خاں کی طرف دیکھ کر انہوں نے سوال کیا..... ”بیٹے کا بیٹا ہے؟“

”اینق..... باباجی اینق۔“ خاں صاحب نے جواب دیا۔

”نیک سے نیک..... تمہارا یہ بیٹا مغرب میں چلا جائے گا اور بہت سرفراز ہوگا۔..... نیک سے نیک.....“

نیک سے نیک.....“ کہتے ہوئے وہ لنگر والے اڈے پر واپس چلے گئے اور چوکی پر بیٹھ کر کنگیر سے روغنی پیالے میں شوربہ لے گئے۔ یوں لگتا تھا گویا انہیں علم ہی نہیں کہ وہ کیا کہہ گئے ہیں؟ عجب سی بات ہے لیکن 1989ء میں اینق بیٹا امریکہ چلا گیا۔

یہ سب 2008ء تک وہیں ہے۔

باباجی کے ڈیرے پر جانا، وہیں لنگر کرنا، مزے اڑانا، خالی الذہن ہونا، فکر فاقے سے اپنے آپ کو آزاد کرنا میرا مقصد ہے۔ کرنے کا نیا طریق تھا۔ نہ کبھی ان کے درجات کے متعلق سوچا نہ کبھی اس طرف دھیان گیا کہ ان کے کشف و کسب سے کچھ مجھ میں تبدیلی آ رہی ہے۔ یہ خاں صاحب کا ڈیپارٹمنٹ تھا۔ وہ پتہ نہیں کس تلاش میں تھے۔ انہیں باباجی کے قول زریں مرہم بن کر لگ رہے تھے۔ وہ ایمان کی نیچ درست کرنے کے درپے تھے یا انہیں واقعی خدا کی تلاش تھی؟ یہ بات کا راز کبھی مجھ پر نہ کھلا۔ اتنا مجھ پر واضح تھا کہ باباجی چند ذومعنی با معنی اور معنی در معنی جملے بول کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتے اور ہمیں ڈاکٹر اشرف فاضلی کے سپرد کر دیتے جو ان کی وصیت کے مطابق قول کے بھی بادشاہ ہیں اور یہ بھی بادشاہ ہیں۔ ڈاکٹر اشرف فاضلی صاحب سے ہماری پہلی ملاقات جھپٹے کے قریب ہوئی۔ دبلے پتلے، صاف تھے سفید شلوار قمیض میں ملبوس ڈاکٹر صاحب ہم سے دور کھڑے تھے۔ باباجی نے انہیں آواز دیئے بغیر بلایا۔

”سرکار مجھے بلایا؟“ ڈاکٹر صاحب نے پاس آ کر استفسار کیا۔

”یہ ہمارے جانی جان آئے ہیں۔ انہیں اپنے حجرے میں لے جائیے۔“

ڈاکٹر صاحب بہت ذہین، نکتہ بین، باباجی سے تھوڑی بہت Liberty لیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہم سے ملے۔ جب پہلی بار میں ڈیرہ پاک گئی تھی ڈیرے کے راستے پر دائیں ہاتھ مجھے ایک ماڈرن قسم کا پارٹمنٹ نظر آیا تھا،

جس کے دروازے پر براؤن پینٹ تھا اور دروازہ کھلا تھا۔ صاف ستھرائی، نفاست اور آرائش میں یہ حصہ ڈیرے کا حصہ تھا۔ ہم اندر گئے، نشست گوفرش تھی لیکن فرش پر قالین اور آرام دہ گدیاں، گاؤتیکے دھرے تھے۔ قریب ہی پلنگ تھا۔ محفل کی رضائی تھی۔ کمرے میں ہر طرف کتابیں آراستہ تھیں۔

یہاں سے ایک اور Association شروع ہوگئی۔ باباجی گفتگو، تبادلہ خیال کے مجلسی آدمی نہ تھے۔

کبھی کوئی تعلیم دینے پر آمادہ ہوتے انگلی اٹھا کر فرماتے۔ نوٹ

”عمل کو فضیلت نہیں رخ کو فضیلت ہے۔“

”ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔“

”درد سے مرد بنتا ہے درد نہ ہو تو مرد نہیں۔“

”عمل سے علم حاصل ہوتا ہے۔“

”سوال نہیں جواب بنو۔“

باباجی اپنی دانشمندی، تجربہ، فضیلت، احساس حق کوزے میں بند کر کے پیش کر دیتے اور پھر مصروف ہو جاتے۔

چودہ برس سستی پہرہ میں رہنے والا مجذوب بابا اپنی بولی بول کر آجاتا۔ اسے تشریح، تعزیر، غرض و غایت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بس سمت درست کرتا اور باقی سب کچھ آپ کی ذات کے انتخاب کے لیے چھوڑ جاتا۔

ڈاکٹر اشرف فاضلی بڑے خوش گفتار تھے۔ اب ہم جب ڈیرے پاک جاتے ان کے پاس حجرے میں

لنگر کرنے لگتے۔ مزید ارچائے بار بار آتی۔ جو کچھ نہ کھا سکتے، ساتھ چیک کر دیا جاتا۔ یہاں کے کھانوں کا بھی عجیب

تھا۔ سارے سالن لذیذ ہوتے۔ ڈیرے پاک کی کوئی بانڈی کبھی ایسی ندلی جیسے بد مزہ کہہ سکیں۔ وہ موسمی سبزی ہوتی۔

پرانی دال ہو یا یکجا کیے ہوئے کئی سالن، ویسی گھی کا تازہ بگھار گرم گرم تندوری روٹیاں اشتہا تیز کرنے والے یہ کھاتے

کسی فائوسٹار ہوٹل میں ملے نہ کبھی اپنے گھر میں نصیب ہوئے۔

طوائف کے ڈیرے پر تماش بین کے لیے دو ضرورتوں کا اہتمام ہوا کرتا ہے۔ وہاں جنس اور اشتہا

انسانی کمزوری سمجھ کر ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ ڈیرے پر صرف اس بات کا دھیان رکھا جاتا ہے کہ بھوکا آدمی درنگی سے

سکتا۔ پہلے بھوکے کی بھوک مٹاؤ پھر اس سے اس کی فہم و فراست کے مطابق جانچ تول کر بات کرو یعنی جس قدر کہیں

کیو ہے۔ بات بھی اس کی سمجھ سے بالائے ہونی چاہیے ورنہ قول ہے اثر ہوگا اور عمل بھی تبدیل نہ ہو سکے گا۔ جو بات

پلے نہ پڑی اس پر عمل کیسا؟

ڈاکٹر صاحب خود کبھی کچھ نہ کھاتے۔ ہمیں ہی کھلائے جاتے۔ ایک روز میں نے پوچھا..... ”ڈاکٹر صاحب

جی کیا شوق سے کھاتے ہیں؟“

ڈاکٹر صاحب نے کہا ”کبھی کبھی کوئی ہڈی چوس کر رکھ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں ہڈیوں کا چورا سا کھانا

چاہیے۔ یہ تو کتوں کی خوراک ہے، ہڈیاں ان تک پہنچنی چاہئیں۔ ہڈیوں کو دانوں تلے دبانے والا عموماً خود غرض ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب باریک بین ہیں۔ بال کی کھال اتارنا ان کے جینز میں ہے۔ وہ فضل شاہ کے نوری جال میں

تھوڑے وقت شہد استعمال کرتی تھی۔ اسے Honey mania تھا۔ وہ اس کی تاثیر، اس کے اجزاء، افادیت سے بہت متحہ تھی۔

یوں لگتا تھا وہ شہد آمیزی کے گڑ حاصل کر کے نجات حاصل کرنا چاہتی ہے۔ شہد کے علاوہ اس نے مجھے اسلام کی کئی چیزیں گھونٹ ہو لے ہو لے پینا سکھایا۔ میں ہر مسلمان کو کروڑھ کی نظر سے دیکھتا، اُس کے ہر عمل کو دیر تک پرکھتا جاچتا تھا۔ شہد کے قائم کر لیتا تھا۔ شروع شروع میں جب میں برجی کی محبت میں سر کے بل نہیں گرا تھا تو وہ مجھ پر توجہ صرف کیے کرتی تھی۔

”Jen Kius“ کبھی کسی ختنہ شدہ مسلمان کے بچے سے دوستی نہ کرنا۔ وہ تمہیں دغا دے گا لامحالہ.....“

”لیکن ختنے تو حضرت موسیٰ کی امت بھی کرتی ہے برجی۔“

”ہماری اور بات ہے..... لیکن یہ ختنے شدہ کتے بڑے فتنے ہیں فتنے۔“

یہ نہیں انسان کی یہ کیا کمزوری ہے۔ اپنے میں وہی بات بری نہیں لگتی، دوسرے میں عین عین وہی عیب ناقابلِ ترمیم نظر آتا ہے۔ نو آغاز محبوبہ سے چھیڑ چھاڑ میں بڑا لطف ملتا ہے۔ میں برجی سے کہتا..... ”بڑے افسوس کی بات ہے تم نے تمہیں قسطنطنیہ کا جو حال کر دیا پھر بھی تمہارے دل میں ان کے خلاف بغض بھرا ہوا ہے۔“

”یہ ہماری سر زمین ہے۔“

”کیسے بھی کیسے..... زمین تو غالباً ساری خدا کی ہے۔“

”اس لیے کہ حضرت موسیٰ اسی ریگستان میں میرے آباؤ اجداد کو لائے تھے۔“ برجی طرارہ بھرتی۔

”اور تم لوگوں نے یہاں آباد رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ تم من و سلوئی کھاتے کھاتے تھک گئے تھے۔ یکدم تم نے یہاں سے نکل کر اور مسور کی وال مانگے تھے۔ یاد ہے.....“ میں نے اسے محض گرم کرنے کے لیے کہا۔

برجی نے میرے سینے پر دو ہتھوڑا مارے اور چلا کر کہا..... ”کرچین کرچین!“

”میں نہیں میری ماں کرچین ہے اور وہ بھی رومن کیتھولک..... میں تو کچھ بھی نہیں..... کہو تو یہودی ہو جاؤں۔“

”یہودی ہوتے نہیں..... یہودی پیدا ہوتے ہیں۔ اب پتہ چلا کہ تم یہودیوں کے لیے اتنی سخت باتیں کیوں

کہتے ہو؟“

میں اب منانے کے انداز میں کہتا..... ”پیاری برجی! جس قوم میں برجی پیدا ہو جائے اس کے متعلق کوئی سخت بات کہی نہیں جاسکتی ہے۔“

”چلو خوشامدی جھوٹے!“

”اگر ایک بات کہوں تو برا تو نہ مانو گی۔“ میں نے کہا۔

”کہو۔“

”یہ جو اسرائیل کا خطہ ہے جس کے ارد گرد تمہاری گولڈاما نیر کسی کو قدم دھرنے نہیں دیتی۔ یہ جنت تمہیں

دلائی ہے۔“

”ناں نان نان۔ کوئی یہودیوں کی وجہ سے نہیں منکر..... یہ عیسائیوں کی یہود پرستی نے نہیں اسلام دشمنی نے یہ

خطہ دلویا ہے۔ عیسائیوں کو ہم سے محبت نہیں لیکن انہیں مسلمانوں سے نفرت ہے۔ اتنی نفرت اتنی نفرت کہ وہ مسلمانوں کو مارنے کے لیے یہودیوں سے محبت کرنے کو بھی برائے نہیں جانتے۔ ہم تو سانچے دشمن کی محبت میں ایک ہوئے ہیں۔

”عیسائیوں کو یہودیوں سے نفرت.....؟ توبہ کرو توبہ۔“

”تو جرمی سے ہمیں نکالنے والے کون تھے؟“

”ہم امریکن تو نہیں تھے۔ ہمیں تو یہودیوں سے عشق ہے عشق۔“

میں اسے منانے کی کوشش کرتا لیکن وہ چپ ہو جاتی، اندر سے اُبلتی رہتی۔ برجی میں اس قدر جوش و خروش عزم، ایسی تیز استدلالی قوت تھی کہ وہ کچھ دیر خاموش رہ کر پھر اسی موضوع پر ختم گتھا ہو جاتی۔

ایک روز ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی۔ براڈ لاف کی لان پر پانی کی بوندیں، برجی کے براؤن بالوں میں قطرے تھے۔ ہم چوری چوری تخلیقی ادب کی کلاس سے نکل کر چھوٹے سے ریستوران میں جا بیٹھے۔ کافی کے ساتھ سکونز پر شہد لگا کر کھاتے رہے۔ اس روز برجی نے مجھے ایک خوبصورت ماؤتھ ہارمونیکا دیا۔ میں نے اس پر بڑے سے بجایا۔

Should old acquaintance be for God

And never brought to mind

جھپ کر برجی نے مجھ سے ہارمونیکا چھین لیا اور سختی سے بولی۔ ”اس لیے کر دیا ہے کہ تم ابھی سے مجھے واقف کار بنا لو..... اچھا شکریہ ہے۔“

ہم دونوں نے کافی ختم کر کے پھر لمبی گھاس گا ہوں کا رخ کیا۔ بے مصرف ادھر ادھر..... کبھی مشرق کی جانب مغرب کی جانب۔ پھر برجی نے یورپ کے پناہ گزینوں کی باتیں شروع کر دیں۔ ”میری ماں برلن سے بھاگ کر گئی۔ فرانس میں بھی نازیوں کا راج تھا۔ اس نے تین دن انڈر گراؤنڈ گٹر میں چھپ کر بسر کیے۔ پھر وہ ایک نازی کے چڑھ گئی۔ اس نے پورا ایک ماہ میری ماں کو وحشیوں کی طرح استعمال کیا اور بعد ازاں فوجیوں کے حوالے کر دیا۔ پھر میری ماں کا کیا قصور تھا۔ بتاؤ اس میں میرا کیا جرم ہے کہ میں یہودی ہوں۔“

میں نے اس کے آنسو اپنے رومال میں جذب کیے اور زہناک گفتگو جاری رکھی۔ ”برجی! تمہاری صدیوں سے اصل مسکن کی تلاش میں ہے۔ یقیناً تم لوگوں نے ظلم تو سہے ہیں۔ تمہیں تو مظلوموں سے محبت ہونا چاہیے ہے۔“

”ہے..... ہے ہم ظلم کو کسی روپ میں برداشت نہیں کرتے۔“

”پھر ان فلسطینیوں کے متعلق کیا حکم ہے جنہیں اپنے ہی ملک میں تمہاری وجہ سے جلا وطنی نصیب ہوئی ہے۔ برسوں سے غاروں میں رہتے ہیں اور اسرائیل کی طرف چہرہ اٹھا کر یوں دیکھتے ہیں جیسے زمین سورج کی طرف ہے..... ہر صبح۔“

برجی کا سر میرے سینے تک آتا تھا، اس نے بازو اٹھا کر میرے سینے پر ٹکوں کی بارش کر دی۔

”تم بھی Philistine ہو..... فلسٹین..... فلسٹین۔“

جب برجی بھڑک اٹھی تو میرے مسام کھل جاتے۔ میرے لبوں کی گردش تیز ہو جاتی۔ میں مکمل طور پر اس کا شکار بن جاتا۔ جوں جوں برجی بھڑکتی، مجھ میں شہوت کی زیادتی کچھ ایسی ہو جاتی کہ میرا جی چاہتا میں برجی کو پلیٹ میں لے کر اس کے جسم کے نازک مقامات کو چھری کانٹے سے کاٹ کاٹ کر کھا جاؤں۔

ان ہی دنوں جب برجی نے مجھے ہتھیلی پر شہد ڈال کر چاٹنا سکھایا، میں نے اسلام دشمنی کا سبق بھی ورق ورق سے پڑھا۔ میں نے اسی کی دور بین لگا کر ہر مسلمان کو جانچنے، پرکھنے اور دھتکارنے کا عمل سیکھ لیا۔ ایسی ہی گریڈ سکول میں مجھے سوڈان کا سیاہ فام داؤد نظر پڑا۔ اس ادیب کی جلد اتنی سیاہ تھی کہ ترچھی روشنی میں اس کی جلد تھوڑی تھوڑی نیلی بھی نظر آنے لگتی۔ اس کا قد مجھ سے دو انچ چھوٹا تھا۔ اسے چلتے پھرتے دیکھ کر کبھی احساس نہ ہوتا کہ وہ کسی عورت کا آدمی ہے۔

اس کی چال میں وقار، چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ، آواز میں مدہم آرگن کا سوز تھا۔ وہ بات سننے سے پہلے بات سننے شروع دیتا۔ ہر مناظرے میں آپ کو جیت جانے کے موقعے بہم پہنچاتا۔ اپنی چیزیں دوسروں میں بانٹ کر راحت دینا شروع کرتا۔ لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کر کے بڑا Honored محسوس کرتا۔ بس میں ہم جماعتوں کی ٹکٹیں خرید کر کبھی کسی سے مل نہ کرتا۔ جب کبھی کسی کے ساتھ کھانا یا چائے کافی پیتا کبھی ڈچ (Dutch) کرنے پر اصرار نہ کرتا بلکہ سارا بل خود ادا کرتا۔ کسی کے ساتھ چلتا تو سارا راستہ چھوڑ کر ذرا سا پیچھے رہ کر ہم سفری اختیار کرتا۔ اپنے لائبریری کارڈ پر دوسروں کو کھانا شکر لینے دیتا۔ اپنے کو پن دوسروں کو مستعار دے دیتا۔ داؤد ساری کلاس سے مختلف تھا۔ شاید اسی اختلاف کے باعث وہ ہم سب میں نمایاں بھی تھا۔

”برجی! تم داؤد کے رنگ کی وجہ سے اس سے نفرت کرتی ہو؟“

”نہیں..... میرے کئی سیاہ فام لوگ اچھے دوست ہیں۔“

”پھر اس کی آنکھیں، بال..... وہ تم سے مختلف ہے اس لیے۔“

”نہیں۔“

”پھر اس نفرت کی وجہ کیا اس کا اخلاق ہے؟“

”خاک اچھا اخلاق ہے۔ سارا ڈرامہ ہے ڈرامہ..... وہ ساری کلاس سے اپنے احساس کمتری کو چھپا کر اپنے

سب کو بے تر ثابت کرنے کی مصیبت میں پڑا ہوا ہے۔ مسلمانوں کا خاص اخلاقی طریقہ..... ہینگ اٹ۔“

”شاید یہی انسانی عمل کی معراج ہے۔ اخلاق کی جیت۔“

”بھاڑ میں جائے داؤد، اس کا اخلاق غارت ہو، برباد ہو۔“

”اتنا غصہ، اتنا غصہ..... اس نے کبھی آنکھ اٹھا کر بھی تمہیں نہیں دیکھا۔ شاید سڑک پر وہ تمہیں پہچان بھی نہ

تھے۔ میں نے اسے چھیڑنے کی غرض سے کہا۔

”ہاں نہیں دیکھتا۔ یہ کمبخت مسلمان یہ تعدد ازدواج کے بھوکے..... شہوت خورے۔ یہ ہر عورت کو دیکھتے

تھے۔ جی ماں بیٹی بہن کسی کو نہیں چھوڑتے حرامی۔ اپنی کزن سے شادی کر لیتے ہیں۔ چوری چوری دیکھتا ہوگا مجھے۔ جانتا

ہے میں اسے قتل کر دوں گی اگر اس نے سیدھا دیکھا۔“

”غالباً تمہاری خواہش ہے کہ وہ تمہیں دیکھے، جب نہیں دیکھتا تو تمہاری ہیٹی ہوتی ہے۔“

پہلی مرتبہ برجی مجھ سے سنجیدہ طور پر ناراض ہو گئی۔ اس نے کلاس میں میرے ساتھ بیٹھنا چھوڑ دیا۔ براڈ لاف کی خوبصورت لانوں پر ٹہلنے کے لیے ہم اکٹھے نہ نکلتے۔ مجھے معافی نامہ لکھ کر اسے منانا پڑا۔

اس واقعے کے قریب اوس روز بعد ہم سارے نو آموز ادیب رات کو دس بجے ہوٹل کے کامن روم میں گئے ہوئے۔ ہمیں برجی کی سا لگرہ میں شریک ہونا تھا۔ سا لگرہ میں شمولیت کے لیے سب کو اپنے اپنے کمرے سے کھانے کی چیز لے کر پہنچنا تھا۔ میں نے شراب کی دو بوتلیں پھولوں کی ٹوکری میں سجائیں اور لکٹا مٹکتا پہنچا۔ داؤد مجھے دروازے میں ملا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے راستہ چھوڑ دیا اور بڑے سے کیک کو سنبھالتا ہوا دیوار کے سر تک کرکھڑا ہو گیا۔

سارا ہنگامہ اس خوبصورت کیک کی وجہ سے ہوا۔ دو فٹے چوڑے اور چھ فٹ لمبے کیک پر ایک نخلستان بنا ہوا تھا۔ ہم سب نے اونچے اونچے پی پی برتھ ڈے ٹوپوگانا شروع کیا۔ سب سے خوبصورت آواز داؤد کی تھی۔ کسی نے برجی کو کیک کاٹنے والی چھری پکڑائی۔ کیک پر چلنے والی چھوٹی چھوٹی موم بتیاں جگمگ جل رہی تھیں۔ برجی اپنی جگہ سے ہنس نہ ہوئی۔ آوازیں رک گئیں۔ کمرے میں خاموشی چھانے لگی۔

”چلو برجی اتنی تنگ نظر نہ بنو۔ کیک کاٹو۔“

”میں کسی مسلمان آدمی کا تحفہ قبول نہیں کر سکتی۔ یہ کیک داؤد لایا تھا۔“

داؤد نے آہستہ سے کیک اٹھایا اور غالباً وہ اس وقت محفل سے چلا جاتا، اگر کچھ لوگ اسے پکڑ نہ لیتے۔

”نہیں بھی نہیں تم ہرگز ہرگز نہیں جا سکتے۔“

برجی بڑی ہرولہو یز لڑکی تھی لیکن چار فٹ گیارہ انچ میں سارا پارو وہی بھرا تھا۔

”جانے دو جانے دو۔۔۔ میں ایک کالے آدمی کی خاطر اپنی پارٹی خراب نہیں کر سکتی۔“

داؤد جواب دروازے سے تھوڑی ہی دور تھا، یکدم رک گیا۔ جیسے قلموں کے ہیروں کا کرتے ہیں۔ پھر وہ

آواز میں بولا۔۔۔ ”کالا آدمی؟ کیا حضرت آدم سفید تھے۔۔۔ کیا حضرت موسیٰ کی جلد حضرت عیسیٰ کا وجود سفید تھا۔

لوگوں نے انہیں اپنے جیسا بنا لیا ہے لیکن وہ صحرائی تم جیسا نہ تھا، ہم جیسا سیاہ آدمی تھا۔“

اب فضا میں قہقہے ابھرنے لگے۔

”یہ ہے مسلمانوں کی ذہنیت، یہ ہے ان کی عقل اور پھر کہتے ہیں Dark Ages میں ان کی تہذیب۔“

سائنس عروج پر تھی۔ یہ تو ان کا علم ہے اب۔“ برجی نے اونچی آواز میں کہا۔

کہیں سے ایک کریم رول اڑ کر داؤد کے ماتھے پر لگ کر کی پرگرا۔

”مسلمان Barbarians تو ہوتے ہی ہیں۔ آج پتہ چلا احمق بھی بلا کے ہیں۔ کیک لے آیا ہے۔“

وقوف۔“ برجی کی ایک دوست بولی۔

کہیں سے ایک اور آواز آئی۔ ”بھی تم لوگ توحید پرست کہلاتے ہو تو پھر مکہ میں جا کر حجرا سود کیوں چومتے
 یہ بت پرستی نہیں ہے؟“

”Idolatry..... بت پرستی..... بت پرستی.....“ کچھ کورس میں کہنے لگے۔ اب عیسائی اور یہودی اسلام دشمنی

میں شرب بن گئے۔ کہیں سے ایک سینڈوچ داؤد کے سر کو چھو کر دیوار سے ٹکرائی۔

”شیم شیم اتنی شادیاں۔ عورتوں کے حقوق نہیں جانتے تم مسلمان لوگ۔“

اب جیلی کا ایک تودہ داؤد پر آگرا۔ اس کے خوبصورت سوٹ پر جا بجا گوشت کے لوتھڑے سے چپک گئے۔

چاپ ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے سامنے دھری چھوٹی سی میز پر ایک دھردیا۔ اسے نہ نخلستان کی پروا تھی نہ اپنے

سینے کے والی چیزوں کی۔ وہ آسانی سے اسی ذلت سے بھاگ بھی سکتا تھا لیکن نہ جانے وہ صبر کی کونسی کیل تھی جس

سے بچ گیا۔

کسی کسی لمحے میں بڑا جادو ہوتا ہے۔ موقع فراہم کیا جاتا ہے آپ کی جہت سمت بدلی جاتی ہے۔ میں پتہ نہیں

تھی کہ وہ کس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ بر جی بھاگ کر میرے پاس آئی۔ اس نے ہمیشہ کی طرح میرے سینے پر ملنے مارتے

تھے۔ ”اس کے سامنے سے ہٹ جاؤ، جھکنو۔“

پتہ نہیں کیوں میری ساری محبت کہیں کا فور ہو چکی تھی۔ میں نے بر جی کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کہا۔ ”اپنے سارے

تھکے کو لے کر باہر چلی جاؤ ورنہ تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔“

محفل خاموش ہو گئی۔

میں نے پلٹ کر داؤد کی طرف دیکھا۔ اُس کے آنسوئی چہرے پر آنسو تیزی سے بہ رہے تھے۔ وہ اپنے سامنے

کھائے کے نخلستان کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

”داؤد.....“ میں نے اس کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”مجھے رحم کی ضرورت نہیں ہے دوست۔ میں ان کی ہر بات کا جواب دے سکتا ہوں لیکن میں..... طائف پہنچ

گیا تھا۔ میں نے اس لمحے صلح نامہ حدیبیہ کو اپنے پر وارد ہوتے پہچان لیا۔ میں کوزا بھینسنے والی مائی بر جی کو کچھ نہیں کہہ سکتا۔

آپ لوگوں کے نبی نے تو دوسرا گال پیش کرنے کا حکم دے رکھا ہے..... پھر..... پھر یہ سب کیا ہے؟“

وہ چپ چاپ کیک وہیں چھوڑ کر بڑے بڑے قدم دھرتا چلا گیا۔

اس وقت باباجی نور والے اندر آئے۔ پتہ نہیں وہ بروقت آنے کا علم کیسے جانتے تھے۔ شمس نے اپنی رام کہانی

بھائی سے سرف قد کھڑا ہو گیا اور باباجی سے کہنے لگا۔ ”باباجی! میرے وطن میں اتنا علم ہے، اتنا عمل ہے۔ ہم علم میں اس قدر

تعمیر ہیں کہ کامن پن کا سرا کہیں اور بنتا ہے اور اس کی سوئی کہیں اور تیار ہوتی ہے۔ ہم میں specialize

کے کارواج ہے۔ ہم Communication کے دور سے گزر رہے ہیں۔ یہ کیا چیز ہے Specialization اور

Communicate۔ ہم وہ تمام جنسی خیالات جو چار سال کی عمر میں ہم پر سکول سے وارد ہوئے۔ سب دوسروں سے

communicate کرنا چاہتے ہیں۔ پوچھیے پوچھیے ہولی مین سے کیا افہام و تفہیم اس قدر ضروری ہے۔ کیا بر جی کی طرح

مجروح کرنے والا سچ بولنا ضروری ہے؟“

باباجی نے فرمایا۔ ”پت شمس! سچ اپنے متعلق بولا جاتا ہے اور اس وقت بولا جاتا ہے جب آپ کو ضرورت ہو۔“

ضرورت ہو اور آپ لوگوں کی نظر میں اپنا قد گھٹانا چاہتے ہوں۔“

خاں صاحب نے باباجی کی طرف دیکھ کر پرچھا۔ ”اور باباجی افہام و تفہیم کے لیے بولنا۔“

”یعنی مناظرہ کرنا۔ بحث مباحثے میں داخل ہونا۔“

”جی ہمس تو Discussions کا بہت شوق ہے۔“ خاں صاحب نے اعتراف کیا۔

”جان لو صاحبو! مناظرہ جب بھی ہوتا ہے کم علمی کی وجہ سے ہوتا ہے اور شوکتِ نفس کے لیے کیا جاتا ہے۔“

ساری محفل کو ایک اُمی نے چپ کرادیا۔

جب ترجمہ کر کے شمس کو معنی سمجھائے گئے تو اس کی نیلی آنکھیں جیسے وجد میں بھر آئیں اور پھر ہونٹوں سے

کہنے لگا۔ ”داؤد سچا تھا..... داؤد سچا تھا..... ایک اور بھی علمِ نافع ہے نبیوں کا علم..... جسے آج کا پڑھا لکھا Secular

بھولتا جا رہا ہے۔ بھولتا جا رہا ہے۔ بدنصیب۔“

باباجی گویا شمس کے سوال کا جواب دینے آئے تھے۔ ترنت ہی وہ واپس چلے گئے اور اس سے آگے کوئی

کی۔

شمس کی باتیں سن کر میں سوچنے پر مجبور ہو گئی۔ کیا شمس مغرب کے ایسے والدین کا بیٹا تھا جو دنیا بھر کی

کم عمری میں بچوں کو پیش کر کے زندہ رہنے کی Excitement بچوں سے چھین لیتے ہیں، جو سات برس سے جسم

شکار ہو کر تیس برس کی عمر میں گڑھست آشرم میں داخل ہو جاتے ہیں اور چند سال یہاں بسر کر کے جنگوں میں

شہروں میں، نئے پتروں میں اپنا آپ گنوانے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں۔ کیا یہی تحریک ایسے ہی سرچشموں

باری تحریک تھی؟

یاشمس کسی ایسے گھرانے کا چشم و چراغ تھا جہاں ماں باپ بچے کو کوالٹی ٹائم دے کر بری الذمہ ہو جاتے

جہاں ماں باپ کو علم نہیں کہ دھرتی تو ہمہ وقت سورج چاہتی ہے۔ بچہ تو ہمیشہ ماں باپ کی توجہ کا طالب ہوتا ہے۔

ہو کر اپنی ذات کو کھو بیٹھتا ہے۔ اسے کسی کوالٹی ٹائم سے سیر نہیں کیا جاسکتا۔

کیا شمس مہاتما بدھ کا پیروکار تھا..... سب کچھ تیاگ چکا تھا۔

کیا شمس صائین میں سے تھا؟ ایسا پرہیزگار جو ہستی ہستی تلاش حق میں نکلا کرتے ہیں؟

ہو سکتا ہے وہ سی آئی اے یا کسی اور فارن ایجنسی کا ایجنٹ ہو جو ہمیں بدل کر جیبوں میں نفعی ٹیپ ریٹ

کر جگہ جگہ کی رپورٹ پیچھے کرتے ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ وطن واپسی پر شمس ہمارے لوک ریت میں ڈوبے پسیمانہ مک

کتاب لکھنے والا ہو جیسی مارگریٹ میڈ، روٹھ Benedict نے لکھی۔ رسم و رواج، لوک ریت، دھرم راج کی گنجگ

مجھے بھی ہمیشہ کی طرح شمس کی اسلام قبولی پر پورا اعتماد نہ تھا۔ میں بھی سونے میں کھوٹ کی تلاش میں تھی۔

شمس خاں صاحب کے قریب بیٹھا تھا اور بڑی رازداری سے کہہ رہا تھا..... ”پتہ نہیں کیوں میں آپ

تھکنے پر مجبور ہوں لیکن کوئی چیز مجھے اکساتی ہے کہ میں سب کچھ بناؤں۔ چھوٹی چھوٹی تفصیل۔ شاید میں اپنے اوپر کسی پیمانے ہوں۔ سینے اشفاق صاحب! میں ایک مرتبہ زبردست اسلام دشمنی کا شکار بھی ہو گیا تھا۔ اس وقت مجھے معلوم تھا کہ جب نفرت کا چکر پورا مکمل ہو جاتا ہے تو پھر محبت کا دائرہ شروع ہو جاتا ہے۔ پنڈولم بھی ایک ہی سمت میں

یہ جملہ بول کر شمس خاموش ہو گیا۔ اس نے اپنا سر زانو پر دھر لیا۔ اس وقت نہ جانے وہ قونیہ میں تھا کہ براڈ لاف افغانستان کے کسی زاویے میں بیٹھا تھا کہ عراق کی گلیوں میں۔ ہم نے اسے واپس لانے کی کوشش نہ کی اور چپ چاپ آئے۔

خاں صاحب بہت آہستہ آہستہ کھانا کھاتے تھے۔ خاص کر جب ان کے سامنے والے دانت اور پھیلی داڑھیوں کے درمیان تیز می سے کھانا چبا نہیں سکتے تھے لیکن سن آباد میں ہی جب ان کا وزن بڑھنے لگا اور وہ پہلی بار ڈائٹنگ کی مشق کرنے ہوئے تو وہ ایک ٹفن دان خرید لائے۔ اس کے تین ڈبوں میں سبزیاں اور نچلے ڈبے میں پانی ڈالا جاتا تھا۔ پھر صبح کے پھر رکھ کر پکاتے۔ نچلے پانی میں بھاپ پیدا ہوتی اور سبزیاں اسی بھاپ میں پک جاتیں۔ پھر احتیاط سے ڈبے

عموماً یہ ٹفن کیریر یا تو محمد علی کھولتا یا پھر خاں صاحب خود دھیان سے اسے نکالتے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں صبح کے ہوں۔ میں ڈبہ کھولتے ہوئے گرم پانی اپنے پرائیڈیل سکتی ہوں۔ خود گر کر ڈبے کو اپنے اوپر گرانے کی اہل ہوں۔ صبح کے دھیان، اپنے خیال میں مگن قسم کی روح تھی کہ تو تھ برش پر پیسٹ لگانے کے بعد ٹیوب کو ڈھکنا لگانا بھی بھول جاتا تھا۔ ٹیوب بند کرتے اور پھر اپنی مونچھوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے کہتے ”حرام دینے ڈھکنا تو لگا دیا۔ ٹیوب سوکھ جاتی ہے۔“

ان کے مونا پے کا مجھے تب کم احساس تھا اور انہیں زیادہ۔ جب ان کے دانت نہیں ٹوٹے تھے لیکن تب بھی وہ صبح آہستہ آہستہ چبا کر اور مزے مزے سے کھاتے تھے۔ جیسے اللہ کی نعمت کو انجوائے کر رہے ہوں۔ اس کے برعکس صبح سے ایسے کھانا کھاتی ہوں جیسے کتے پیچھے بھاگ رہے ہوں۔ ہر نوالے کے ساتھ میرے دماغ پر ان کاموں کی یادیں جاتی ہے جو پینانے سے رہ گئے۔ خطوں کے جواب، نون کال، سفارشی خط، استری والے کپڑے وغیرہ وغیرہ۔ صبح ہاتس مجھے آرام سے بیٹھے نہیں دیتیں۔

عمر کے ساتھ ساتھ زندگی کو لیمن ڈراپ کی طرح چوسنے کا فن خاں صاحب کی عادت بن گئی۔ وہ بات کرتے تو کامیابی پر سن کرنے کے لیے، کھانا کھاتے تو کام و دہن کو خوش کرنے کے لیے۔ لباس پہنتے چاہے وہ کھدر کا کرتہ ہی کیسے نہ ہو، بڑے اہتمام سے۔ سوچتے تو ایک ٹانگ زانو کھڑا کر کے دوسری ٹانگ کو آدھی چوکڑی کی شکل میں اس طرح رکھتے کہ دوسرے پاؤں کو ہاتھ سے پٹانے کے لیے خالی رکھتے۔ انہیں اس طرح نیم دراز آسن میں دیکھ کر لگتا جیسے آنند پور میں سادھو کسی مٹھ میں سادھی لگائے براجمان ہے۔

وہ ہر کام کو پورا وقت دے کر اس کا احترام کر کے اس پر پوری توجہ صرف کر کے کیا کرتے تھے۔ سر کہ ڈالنا ہو،

کے لیے رقم کرتی ہوں۔

1- ہونٹوں میں نیشکر بونا۔

2- بھیڑ کو بھیڑیوں کی حمایت میں جانے کی ترغیب دینا۔

3- کسی سوئی کی دو تیز نوکیں نہیں ہوتیں۔

4- وہ شیر کی طرح نچے سکیڑ کر بیٹھا ہے۔

5- ایسی آری کی طرح جس کے دونوں طرف دندانے ہوں۔

6- مٹر کا دانہ اپنی پھلی کو بھول جاتا ہے۔

7- جو تک سانپ بننا چاہتی ہے۔

8- آگ لگ جانے پر کواں کھودنا۔

9- ایک گونگے آدمی کے خواب کی طرح۔

10- وہ چوتھڑوں کی آگ ہے۔

11- قند کا بنا ہوا تیل۔

12- مردہ گھوڑے کو نعل بندھوانا۔

13- جو درخت پر چڑھتا ہے وہ دو گنا دیکھتا ہے۔

14- شکر میٹھی ہوتی ہے خواہ اندھیرے میں ہی ملے۔

15- درمیان سے کئے ہوئے درخت تلے لیٹنا۔

16- کیا سینگ بیل کے لیے بہت بھاری ہیں۔

17- گدھے کے لیے کنگھی۔

18- بیوہ سے شوہر مانگنا۔

19- نہ میں شہد مانگتا ہوں اور نہ ڈنگ چاہتا ہوں۔

20- ایسا گاؤں ایسا نا جہاں پانی نہ ملتا ہو۔

21- جب جھاڑی ہی کھیت کھانے لگے تو پھر حفاظت کون کرے گا۔

22- کیا تم اس درخت سے پھانس لے مرو گے جسے تمہارے باپ نے لگایا تھا۔

23- تیل کا پیانا ہمیشہ چکنا ہوتا ہے۔

24- غصے والی عورت سے منکنے والا گھر بہتر ہے۔

25- بیٹکن کے تخم سے کدو پیدا نہ ہوں گے۔

26- اگر کپڑا کسی خاردار جھاڑی پر پھیلا ہو تو اسے احتیاط سے اتارنا چاہیے۔

27- تمر ہندی خشک ہو کر بھی املی ہی رہتی ہے۔

28- جو محبت کرتا ہے محنت کرتا ہے۔ (پشتو)

29- چا تو اپنے دستے کو نہیں کاٹتا۔

30- ریچھ پہاڑ میں بولعی سینا بنا پھرتا ہے۔

نور والوں کے ڈیرے پر بھی خاں صاحب ایسی ہی بصیرت، ایسے ہی اقوال زریں کی تلاش کرنے جاتے تھے وہاں میں اور خاں صاحب تو ڈاکٹر اشرف فاضلی سے مل چکے تھے لیکن عفت کی ملاقات چند دنوں بعد ڈاکٹر اشرف سے ہوئی۔ ہم دونوں جانتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کے متعلق باباجی پیش گوئی بہت پہلے کر چکے تھے کہ ڈاکٹر صاحب تو بھی بادشاہ ہیں اور ویسے بھی بادشاہ ہیں۔

یہ ایک اور علم تھا، اس تک ہماری رسائی نہ تھی۔ اس سے پہلے سدا سہاگنوں اور شمس کی ملاقاتوں نے صحت تذبذب میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ اپنی مغربی تعلیم اور ڈاکٹری کی تعلیم کے باعث ایسے نہیں علم کے متعلق بڑے شکوک رکھتے تھے۔ اسے غالباً کسی علم پر یقین محکم باقی نہ رہا تھا۔

اس روز ہم حسب عادت دھرم پورہ کی طرف روانہ ہوئے۔ ریل کا پھانک گزرتے ہی کوئی آدمی فریاد کرتا اور خانہ بدوشوں کی جھگلیاں تھیں۔ ان کے بچے اور بچوں ہی جیسے پیارے پالتو کتے کبھی کبھی ریل کی پٹری تک بھی آ کر کرتے تھے۔ دوسری طرف کائی جے جو ہڑ کے کنارے پکے نیم خستہ بغل در بغل آباد گھروں میں کھراک نما لوگوں کا گھنٹا تھا۔ جو ہڑ کنارے اُگنے والے نرسلوں کے باعث یہ گھر پکی سڑک سے بڑی دور دور لگتے تھے۔

لیکن خانہ بدوشوں کی گھری..... اپنی شیلی عورتوں، تنگ دھڑنگ بچوں، سلور کے برتنوں اور ڈبوکتوں کی سب سے کافی نزدیک محسوس ہوتی ہے۔ ریل کے پھانک سے بازار تک کوئی آدھ فرلانگ راستہ تھا۔ بازار سے گزر کر مڑنے والے دونوں جانب مڈل کلاس شرفاء کے مکانات بھی تھے۔ ان لوگوں نے مکانات کو پختہ بنانے کی کوشش میں چوتے پتے سرے، پکے قفل، کنڈیاں زنجیروں سے یوں گھر ٹھونس رکھے تھے کہ گرمیوں میں یہ تین پانچ مرلے کے مکانات کھلے جاتے۔

اسی گرمی کے بچاؤ کے لیے چار پائیاں باہر نکل آتیں۔ لوگوں نے نیم، دھریک اور کیکر کے درخت پالتو رکھے تھے۔ صرف دو ایک امتاس کا درخت اس ساری سڑک کی زینت اور باباجی کا سہل تھا۔ جب ہم ریل کے پونچھ پہنچے تو بجلی سے چلنے والی ریل ٹھک ٹھک کھٹا کھٹ گزر رہی تھی۔

خاں صاحب نے بریک لگائی۔ گاڑی کے گزرنے کا انتظار کیا اور پیچھے مڑ کر پوچھا ”تھک تو نہیں گئیں صحت تھکی ہوئی غنودگی کا شکار عفت بولی.....“ ”نہیں اشفاق بھائی ٹھیک ہوں۔“

”بس اب پہنچے ہی سمجھو۔“

پھانک کھلا۔ نرسلوں سے ڈھکی آبادی میں کوئی کوئی جتی روشن ہو چکی تھی۔ ہم جلد ہی ڈیرہ پاک کے خانہ بدوشوں کے درخت تلے پہنچ گئے۔ اس درخت سے ڈیرے کی چوکھٹ تک ستراسی فٹ کا فاصلہ تھا لیکن یہ راستہ مجھے سمجھنے میں ہونے میں نہ آ رہا تھا۔ ہم چبوترے کے پاس سے گزرے تو بائیں طرف چٹائیوں پر ابھی کچھ لوگ وردو خٹیفے میں

دوسری طرف چار پائیوں پر دنیا کے روگی، راندہ درگاہ جسم اور دل کے داغوں سے بے زار، شفا اور شفا عت کی
تھے والے مایوس صورت بیٹھے تھے۔

ڈیرے پاک پر بھی دنیا کا ہر وہ رنگ موجود تھا جو اللہ کی مخلوق کا نظام ہے۔ دنیا دار، سیانے، عاشق، دیوانے، فقیر
موسوڑ، رقت سے لبریز، چور اور چوری سے بیزار چور، خیرات میں سب کچھ بانٹ ڈالنے والے، اپنی بچی کوچی کر
کے بچی کا نکاح کروانے والے، راست باز دروغ گو..... ایک اللہ کا رنگ وحدت کی سفید روشنی، املتاس کے درخت
کے پتوں میں ان گنت رنگوں میں بٹ گئی تھی۔ املتاس کا درخت مخطوط مستوی (Prism) تھا جس میں سے وحدت کی ایک
رنگ نکلتا ہے اور دوسری جانب کثرت کے رنگوں میں بدل گئی تھی۔ تھڑے پر چٹانوں کے اوپر، دہلیزوں پر، چار پائیوں پر
اللہ کی وحدت نے کثرت کا روپ دھار لیا تھا۔

اس دن سدا سہاگنیں تھکی ہاری روٹی کھانے میں مشغول تھیں۔ دو بھرائی خوب سروسوں کا تیل لگائے بالوں کی
پٹے چسکے لے رہے تھے۔ ایک درمیانی عمر کا فریبہ جسم، عیاش صورت بڈی سے گودا نکالنے کی غرض سے اسے ہتھیلی
پر رکھ کر روٹی کھا رہا تھا۔ اگر وہ سدا سہاگن نہ ہوتا تو ضرور کامیاب ٹرک ڈرائیور ہوتا۔ اس کی ناک چھدی ہوئی تھی جس میں چاندی کی
سر پریشی پٹکا تھا۔ جب وہ ناچتا تو اسی پٹکے کا گھونگھٹ بنا لیتا۔

ہم آہستہ آہستہ چلتے باباجی کے پاس پہنچے۔ وہ اس وقت ایک روگی کوچینی کے ساتھ روٹی کھا رہے تھے۔ ہر نوالہ
تے منہ میں بھی خود ڈالتے اور ہر بار مسکرا کر اسے کھانے پر آمادہ کرتے۔

”لو جی بڑی خیر ہو گئی..... یہ دو بڑیاں اور..... بس۔“

روگی لڑکے نے بیزار ہو کر کہا..... ”باباجی یہاں رولا بہت ہے..... مجھے رولے سے قے آتی ہے۔“

”ناں پت ناں..... یہاں کوئی رولا نہیں..... رولا تو وہاں ہوتا ہے جہاں مولا نہ ہو۔ یہاں تو مولا ہی مولا

حسب عادت ہمیں بابا جلال نیچے تہ خانے میں لے گیا۔ وہی منظر۔ فرش پر سندھی اجرک کا فرش، نیچے روٹی
سرکنڈوں کی چتوں کے ساتھ ساتھ چھینٹوں کے پرنٹ کے گاؤٹیکے، دیواروں پر چابجا عقیدت مندوں کی
پاجامے، تمہیں کھونٹیوں سے لگی ہوئیں۔ سارے میں بھونے ہوئے پھول کھانوں کی خوشبو۔ تھوڑی دیر بعد بابا
تھوڑے ہو سکتے ہوئے آ گئے۔

”بڑی تکلیف ہے باباجی۔“ عفت بولی۔

”بڑی خیر ہو گئی..... بیٹھو بیٹھو..... بیٹا! تکلیف سواری ہوتی ہے۔ جب تک تکلیف سواری نہ بنے یہاں تک

سہیں سکتا۔“

”پتہ نہیں مجھ سے کیا خطا ہو گئی ہے باباجی! جس کی اتنی بڑی سزا ملی ہے۔“ عفت نے دکھ سے کہا۔

”جب تک انسان سے خطا نہ ہو، رب کی طرف سے عطا نہیں ہوتی۔ صاحبو جان لو، جتنی بڑی خطا ہوگی اتنی

عطا ہونے والی ہے۔ بشرطیکہ انسان سچے دل سے توبہ کر لے۔“ حجرے میں سے بے شک بے شک کی آوازیں

آئیں۔ اس سے پہلے مجھے احساس نہ ہوا تھا کہ یہاں کوئی اور بھی موجود ہے۔ ڈاکٹر فاضلی اور شمس تہہ خانے میں بیٹھے تھے۔

بابا جلال ہمیشہ کی طرح دسترخوان بچھانے میں مشغول تھا۔ عفت نے شمس کی طرف دیکھا۔ پھر حیرانی سے جی طرف نظر اٹھائی۔

”ٹھیک ہو جائے گی بی بی۔ آپ فکر نہ کریں اشفاق صاحب۔“ بابا جی مسکرا کر بولے۔

”کیوں پت بھوک لگتی ہے۔“

”نہیں بابا جی۔“

”لگے گی لگے گی انشاء اللہ۔ ہم دوائی دیں گے۔ رب اس میں شفا شامل کر دے گا۔“

بابا جی پھر تھبو تھبو کر کے چلے گئے۔ کمرے میں سے سانسٹا کلوز چلا گیا۔ چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کو کھلونوں میں پیک کر کے لمبی لمبی جرابوں میں گھر گھر لے جانے والا سانسٹا کلوز جو ہمیشہ چمنی کے راستے، آدھی رات کو کمرے میں آیا کرتا ہے اور ہر گھر میں رات کے اندھیرے میں پینگ کے ساتھ جراب باندھ کر رخصت ہو جاتا ہے۔ چپ مسکراتا ہوا بابا۔

بچوں کے لیے کھلونے، عورتوں کے لیے ملبوسات، سینٹ کی شیشیاں، میک اپ کا سامان۔ مردوں کے اخروٹ کی لکڑی کے پائپ، گھڑیاں، شمپین کی بوتلیں وغیرہ وغیرہ۔ سانسٹا کلوز نے اپنے لیے کبھی کچھ نہیں مانگا۔ گھروں پر آہستہ آہستہ گرتی ہے اور فضا میں حمد یہ گانوں (Card Singing) کی آواز مدہم پڑ جاتی ہے تو سانسٹا کلوز ہے۔ رات کے پچھلے پہر۔

مغرب کا سانسٹا کلوز ایک خوبصورت Ritual کی روایت تھی۔ اس نے کمرے کے تہواروں کو انسانوں کے قابل تقلید بنا دیا ہے۔

ڈیرے کا بابا ایک اور قسم کا سانسٹا کلوز تھا، جس نے حال کی گھڑی پر ایک اور قسم کا سماں باندھ رکھا تھا۔ بابا جی کے جانے کے بعد ہم اٹھ کر شمس اور ڈاکٹر فاضلی کے پاس جا بیٹھے۔ شمس نے اگر عینک نہ پہن رکھی ہوتی تو اس کا سینا ہوا چہرہ حضرت عیسیٰ کی ان شبیہوں سے ملتا جو بیرونی کے آرٹسٹ بنایا کرتے ہیں۔

دراز قد سانولے ڈاکٹر فاضلی نے بڑی رواں انگریزی میں شمس سے باتیں شروع کر رکھی تھیں۔ عفت تھوڑی دیر کے بعد غنودگی کا شکار ہو جاتی، ان باتوں کی ٹوہ میں چوکس بیٹھی تھی۔ یہ ساری مخلوق کیسی تھی؟

شمس مکمل عقیدت بنا بیٹھا تھا۔ دراز قد ڈاکٹر فاضلی نفس کشی کے باوجود اپنے اندر کہیں انا کا ست رنگ صحت نظر آتا تھا۔ وہ دونوں بے تکان انگریزی میں ”سکینتہ الاولیاء“ کی باتیں کیے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب انسان کی تفسیر بیان کر رہے تھے۔ مسئلہ جبر و قدر کو آسان مثالوں سے بیان کر رہے تھے۔ شمس مجسم حیرت بنان کی عادت باندھے، کلیچہ شق کیے حاضر خدمت تھا۔ اس وقت سارا علم نگاہوں سے کانوں سے اندر اتارنے کی گھڑی تھی۔

بالآخر شمس نے کہا۔ ”ہم مغرب والے بہت بیمار ہو چکے ہیں ڈاکٹر صاحب! ہماری روح کو کئی قسم کے کیڑے لگے ہیں۔ ہم ڈارون کی طرح صرف بگ بینک پر یقین رکھتے ہیں۔ ہم یہ جان ہی نہیں سکے کہ زندگی کسی خدا نے بھی بخش کی ہوگی۔ ہم نے Sex کو فرائیڈ کی طرح اپنے اوپر سوار کر لیا ہے۔ اب جنس کی آرزو پوری کرنا ہی اہم ہے۔ جنس کا یہ کتنا نفسیاتی امراض کو دعوت دینے کے برابر ہے۔“

کارل مارکس نے بھوک اور غربی کا جو علاج کیا ہے۔ اس کے نزدیک یہ واحد علاج ہے۔ ہم کارل مارکس کو جانے جان ہی نہیں سکتے کہ خدا رزق دیتا ہے۔ کسی کو زیادہ کسی کو کم۔ اسی امتحان میں وہ انسان کو جتلا کرتا ہے کہ کون جتنی رزق سے حضرت عثمان کی طرح آخرت خریدتا ہے اور کون نہ ہونے کے مقام پر چھپر باندھ کر سوتا ہے اور جھٹ نہیں کرتا۔

دراز قد ڈاکٹر نے بڑی ملامت سے کہا۔ ”ناں صاحب نانا۔ سائنس بھی اللہ کی عطا کردہ نعمت ہے لیکن افسوس کہ کئی دور تک نہیں جاتی۔ اوپر والے کی مرضی، ایک وقت پر وہ کس قدر علم عطا کرے۔“

شمس نے روہائی آواز میں کہا۔ ”ہم بکھر رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! کبھی آپ نے سوچا کہ سفید فام قوموں میں کبھی جنس پیدا ہوتے؟ کبھی نہیں سوچا ہوگا۔ یہ ساری عطا براؤن سیاہ قوموں پر کیوں؟ میں بتاؤں سفید لوگوں میں کبھی جنس کی کمی ہے۔ وہ Humble ہونا نہیں جانتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ جانتے ہیں اور کوئی نہیں جان سکتا۔ ہماری خود پسندی کا یہ عالم ہے کہ ہم اگر حضرت عیسیٰ کی تصویر بنائیں گے تو وہ گورا ہوگا۔ ہم یہ بھی نہیں مان سکتے کہ شاید حضرت عیسیٰ رحیم نے ہوں گے۔ ڈارون، فرائیڈ اور کارل مارکس نے تو مغربی سوچ کا بھٹے ہی بٹھا دیا ہے۔“

”ناں جی نانا ایسا نہ کہیں۔ یہ علم بھی اسی کا عطا کردہ ہے۔“

”بسم اللہ کیجیے۔“ بابا جلال نے دسترخوان لگانے کے بعد کہا۔

شمس اور ڈاکٹر صاحب نے اپنے اپنے پیالوں میں شور بہ ڈال لیا اور آہستہ آہستہ کھانے لگے۔

”آپ بھی لیں اشفاق صاحب۔“

خاں صاحب نے تھوڑا سا سالن ڈال لیا اور مہذب انداز میں کھانے لگے۔

”کھاؤ بی بی.....“ ڈاکٹر صاحب نے فاصلے سے کہا۔

”آپ کھائیے مجھے بھوک نہیں۔“ عفت بولی۔

”دولتے سہی، ہمارا کھانا پاک ہو جائے گا۔“

”پاک ہو جائے گا..... یہ کیا منطق ہے؟“

”بابا جی کا کہنا ہے جو آدمی اپنے کھانے میں سے کسی کو کھلاتا ہے، وہ اپنا کھانا پاک کر لیتا ہے۔ بڑے بڑے

تعلیم گرام، قطب اولیاء کا یہی مسلک ہے۔ حضرت ابراہیم کی روایت ہے جی کھانا کھلانا۔“ شمس کھاتے ہوئے کہنے لگا۔

ہم سب کھانے میں مشغول ہو گئے۔

شمس نے کہا ”ڈاکٹر صاحب! ہمارے معاشرے میں چھوٹی چھوٹی کئی قسم کی بغاوتیں ہو رہی ہیں۔ ہماری

عورتیں اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔ انہوں نے Wilt اور Red Stocking Liberation کی تحریکیں چلائی ہیں۔ انہوں نے صدیوں کی غلامی کا طوق اتار پھینکا ہے۔ صدیوں کی غلامی کے عوض انہیں کیا ملا۔ مرد نے ہمیشہ انہیں اپنے سے کمتر ہی سمجھا اور احساس کمتری میں مبتلا کر دیا۔“

وہ کسی خبریں پڑھنے والے کی طرح کھنک دار آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”سینے ڈاکٹر صاحب! مغرب نے دین کے علیحدہ ہو کر نبیوں کے علم پر Secular تعلیم کو ترجیح دے کر اپنے لیے بہت سی مشکلات پیدا کر لی ہیں۔ میں نے مشرق کے زاویے، ڈیرے، عبادت گاہوں میں رہ کر سیکھا ہے کہ عورت عارفِ دنیا ہے اور مرد عارفِ مولا ہے۔ دونوں کا سفر حقیقی ہے، متقابل نہیں۔ دونوں کی سعی مختلف ہے۔ عورت پرورش کے لیے بنی ہے اور مرد کفالت کے لیے۔ چونکہ اسی دنیا کھلی بنا ہے۔ اس لیے مرد کو عارفِ دنیا کو خوش کر کے دین کا کندن اسی سونے سے تیار کرنا پڑتا ہے۔ عورت چونکہ اللہ کی طرف پرورش کرتی ہے، اس لیے مختلف قسم کی مصروفیت کے باعث اسے دین عارفِ مولا کے بغیر مل نہیں سکتا۔

دونوں قدم بہ قدم متوازی چلتے ہیں لیکن مغرب میں ایسا وقت آ گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے مد مقابل ہو گئے ہیں۔ مغرب کا مرد عورت کو یہ احساس دلانا چاہتا ہے کہ عورت جب بھی اس کا مقابلہ کرے گی، منہ کی کھائے گی۔ چونکہ وہ فطرتاً کمزور اور ناقص ہے۔ مسابقت کی بھیٹ چڑھ جائے گی۔ ادھر عورت پرورش میں خدا کا ساتھی بننے کے بجائے سہارا نینچا دکھانے پر تلی ہوئی ہے۔ بھلا جب معاون مد مقابل بن جائیں گے تو انتشار کے علاوہ کیا ملے گا۔“ شمس بلا مکان امریکی انگریزی میں بولے جا رہا تھا۔

عفت نے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا اور مہوت اس کی صورت دیکھ رہی تھی۔

”ہمارے سکول، کالج، ہمارا تعلیمی نظام جس پر ہمیں اس درجہ فخر ہے۔ کیسے بچے بنا رہا ہے؟ ہمارے بچے کتنے belong نہیں کرتے۔ وہ خالی گھروں میں اپنی چابی سے دروازہ کھولتے ہیں۔ اپنا سیریل بنا کر خود کھاتے پھر عارف کھول کر ایک لا تعلق Information oriented دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ ٹی وی پر کارٹون دیکھتے ہیں اور سب سروں والے Giants بن جاتے ہیں۔ ان کا سراتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ کسی دروازے سے نکلنا ممکن نہیں رہتا اور کتنے صرف دروازوں سے نکلنے کا نام ہے۔“

ڈاکٹر صاحب بولے ”جان من! گھبرا نہیں۔ یہ سارا علم بھی اوپر سے عطا ہو رہا ہے۔ آپ جھگڑا نہ کریں۔ اس وقت سفید لوگوں پر اللہ کی طرف سے نئے تجربات ہو رہے ہیں۔ Empirical evidence سے تجربات کر کے سیکھ رہے ہیں۔ بیچارے اللہ کے سفید چوہے بنے ہوئے ہیں۔ اگر اپنے نئی کوگھٹ کے پکڑے رہتے تو زیادہ خواہش اٹھانی پڑتی لیکن جیسی اوپر والے کی مرضی۔ جس طرح چاہے وہ جیسا رکھے۔“

جس وقت یہ دونوں بے تکان بول رہے تھے، باباجی پھر اچانک آ گئے۔ باتیں انگریزی میں ہو رہی تھیں۔ جی انگریزی نہیں جانتے تھے۔ پتہ نہیں یہ ٹیلی پیٹھی کا کون سا مقام تھا کہ باباجی نے مباحثہ کو یوں ختم کر دیا۔ آپ نے بچوں کو علم کی اہمیت ضرور بتا دی ہے لیکن یہ نہیں سمجھایا کہ عقل چراغِ راہ نہیں ہے۔ صداقت چراغِ راہ ہے۔ صداقت ہمیشہ نئی سے ملتی ہے۔ وہ صداقت کا معجزہ ساتھ لاتا ہے۔“

باباجی کے ہاتھ میں بادام روغن کی بوتل، سونف کا عرق اور مروارید کی مجون تھی۔
 ”کو پت خیر ہو جائے گی۔ اللہ نے چاہا تو بیماری ٹل جائے گی۔ جب پیاس لگے انار کارس پینا ہے۔ چاہے دو

پھر انہوں نے ہاتھ میں پکڑی تلبیس خاں صاحب کے سپرد کرویں اور ان کے استعمال کا طریقہ بھی ان ہی کو

”میں نے تو سنا ہے باباجی موت کا وقت معین ہے۔ یہ ٹل نہیں سکتی۔“ عفت نے پوچھا۔

”ٹلتی ہے ٹلتی ہے، وہ کسی بات کا پابند تھوڑی ہے۔ وہ اپنے ولیوں کو کرامت اور اپنے نبی کو معجزہ عطا کرتا ہے۔

موت کی برکت سے بہت کچھ ملتا ہے۔ زندگی کا وقت لمبا ہوتا ہے۔ موت کی گھڑی ٹلتی ہے۔“

”لیکن کیسے حضور؟ کیسے؟“ عفت نے سوال کیا۔

”پت! ہمارا قصائی موت کے شکنجے میں آیا ہوا تھا۔ گھر والے اسے روپیٹ چکے تھے۔ پھر اس کا جوان بیٹا ہاتھ

ہمارے پاس آیا اور کہنے لگا..... باباجی! حریص ہوں، حرص کی بات کرنے آیا ہوں۔ جانتا ہوں میرا باپ کافی

سستی چکا ہے لیکن دل اس کی موت پر راضی نہیں ہوتا۔ اگر آپ کا کوئی چارہ لگتا ہے تو لگا لیجیے۔ ہمارے بس سے تو بات

کرتی۔ موت اللہ کا حکم ہو گیا مانگو، ہم قصائی کے گھر پہنچے۔ بڑھے قصائی کے زخروں سے موت کی آواز آرہی تھی۔ چہرے

پتھرا گیا تھا۔ آنکھوں کی جوت ختم ہو چکی تھی۔ ہم نے اپنے رب سے دعا کی، ربا سے بخش دے تو آخری حکم، آخری

حکم ہے۔ تجھے کسی نے پوچھنا نہیں۔ تجھے کون سوال جواب کرے۔ ڈیرے پر تیری خلق روٹی کھاتی ہے۔ یہ قصائی اچھا

گھست رہا ہے۔ ابھی اس کی ضرورت ہے۔ تیری داڑھی ہتھ لگایا..... جانے دے ہمارا مان رکھ لے۔ لو بی بی دوسرے دن

تسک آ گیا دوکان پر..... ابھی تک اسی کی دوکان سے گوشت آتا ہے۔“

”جب سے یہاں آئی ہوں مجھے ہر وقت ٹینڈا آتی رہتی ہے باباجی..... کیا کروں؟“

”خیر ہوگئی پت خیر ہوگئی۔ اب ہمیشہ آرام سے سوئے گی دھی رانی۔ انار کے رس سے غفلت نہیں برتنی۔ پت جو

کھاتا ہے اس نے موت کا ڈانقہ چکھنا تو ضرور ہے۔ ہم تو مہلت مانگتے ہیں۔ وقت ٹالنے کو کہتے ہیں۔ وہ ضدی

ہیں کی مان لیتا ہے بس۔“

کمرے میں جو بھی موجود تھا اس بات کا آرزو مند تھا کہ عفت آرام سے بیٹھے، صحت مند ہو جائے۔ میں تھوڑی

بے تحاشیک کا شکار تھی۔ بھلا انار کارس، بادام روغن اور ایک معمولی سی مروارید کی مجون فیمل ہوتے گردوں کا کیسے علاج ہو سکتے

ہیں۔ ہو سکتا ہے کہیں یہ مرید پھانسنے کا طریقہ نہ ہو۔ عین ممکن ہے خاں صاحب کی پوزیشن کا ڈیرے پر اثر ہو گیا ہو۔ اتنی

سخت فطری محبت سے مجھے عجیب قسم کی وحشت ہو رہی تھی۔ کیا یہ خوشامد تھی؟ کیا خیر خواہی اسی طرح مفت بھی مل سکتی ہے؟

ڈاکٹر صاحب بولے۔ ”اپنے باباجی کہا کرتے ہیں کہ اگر آپ طیب خوراک کھانا چاہتے ہیں تو اس میں تھوڑا سا

کسی اور کو بھی کھلائیے۔ اگر اپنی روزی پاک کرنا چاہتے ہیں تو اپنی کمائی میں کسی اور کو بھی شریک کیجیے۔ جب اپنے گھر کے

لیے سودا خریدو تو کسی بیوہ، کسی سفید پوش، ضرورت مند کے لیے بھی اسی قدر سودا سلف بھجوادیا کریں۔ اپنے بچوں کی تعلیم

پاک کرنی ہو تو ویسے ہی کسی یتیم، نادار کے بچے کی تعلیم مکمل کروادی۔ اس کی کتابوں، فیس، یونیفارم کے ذمہ دار ہو گئے
لباس پاک کرنا ہو تو پہلے دو جوڑے سلوا کر دے دیئے۔ پھر اپنے جوڑے بنوائے۔“

”پتہ ہے ایک دھویا ایک پہن لیا۔“ ایک مرید کو نے میں سے بولا۔

”ناں جان من ناں..... ایک خود پہن لیا، ایک کسی ایسے شخص کو دے دیا جو سوائی بھی نہیں دے سکتا۔ مجھے سب سے
اس کی عید ہو گئی۔ آپ کا جوڑا پاک ہو گیا۔“

یہ تو میں جان گئی تھی کہ ڈیرے کا قاعدہ تھا کہ جو نبی کوئی حاجت مند تکلیف کی سواری پر سوار ادھر آتا اس کے
مرض کی تشخیص سے پہلے دسترخوان بچھ جاتا ہے۔ اس دسترخوان پر ہر چیز کا لطف، رنگ، لذت موجود ہوتی جیسے ماں کے
دودھ میں کسی آمیزش کا گمان نہیں ہوتا۔ یہ کھانے بھی شیر مادر کی طرح محبت کی چاشنی سے بھرے ہوتے۔ کھانے کے
کھانے سے پہلے ہر وقت گجراتی روغنی پیالوں میں کیکر کی چھال سے بنی گڑ کی چائے آتی۔

”آپ کے ڈیرے نے مجھے حیران کر دیا ہے ڈاکٹر صاحب۔ تو اضع کا یہ معیار بیسویں صدی میں کہیں
نہیں۔“ عفت بولی۔

”بی بی یہاں سب کچھ صداقت پر مبنی ہے۔ ہر قول کا فعل شاہد ہے اور ہر فعل پر کسی شاہد کی نظر ہے۔“

خاں صاحب تو ایک عرصہ سے یہاں آتے رہتے تھے۔ وہ یہاں کی Terminology سے خوب واقف تھے
لیکن میرے لیے فعل، شاہد، صداقت..... اور ایسے ہی دوسرے الفاظ بالکل نئے تھے اور میں نے انہیں ان معنوں میں
استعمال نہ کیا تھا۔

”کیا یہاں ڈاکٹر صاحب ہر طرف خیر ہی خیر ہے؟“ عفت نے حیران سا ہو کر پوچھا۔

”جی نہیں.....“ ڈاکٹر صاحب نے قطعیت سے جواب دیا۔

اشفاق صاحب یوں مسکرائے جیسے جواب پہلے سے جانتے ہوں۔

”کیا مطلب؟“ عفت نے سوال کیا۔

”کبھی آپ نے مقناطیس کا چھوٹا سا ٹکڑا دیکھا ہے۔ اس ٹکڑے کے دو حصے ہوتے ہیں شمالی قطب
قطب..... مقناطیس کو درمیان میں سے کاٹ کر دیکھیے اور کوشش کیجیے شمالی اور جنوبی قطب علیحدہ ہو جائیں، آپ دیکھیں
گے کہ نئے دو ٹکڑوں میں پھر شمالی اور جنوبی قطب پیدا ہو جائیں گے۔ آپ مقناطیس کو کاٹنے کے عمل سے چھوٹا کرتے ہیں
جائیں تو مقناطیس کے آخری مولی کیول میں بھی ایک سر شمالی اور دوسرا جنوبی قطب ہوگا۔“

انسان کا بھی یہی حال ہے بی بی۔ اسے خیر اور شر دونوں سے بنایا گیا ہے۔ اس میں آگ اور پانی بیک وقت
موجود ہوتے ہیں۔ گو ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن چراغ اندھیرے کے بغیر روشن نہیں ہو سکتا نہ خوشنما ہی گلتا ہے۔
ایک بات ہے کچھ اللہ کے بزرگان دین اپنے شر کو اپنے نفس کو شیطان کی ترغیب کو اپنے اندر کے خیر کے تابع کر لیتے ہیں۔
یہی سب سے بڑی کرامت انسانی ہے۔ کتا موجود ہو لیکن زنجیر سے بندھا رہے۔ بھونکے تو ضرور صرف کاٹ نہ کھائے۔

شمس نے اپنے گرتے سے ہاتھ پونچھ کر سوال کیا۔ ”میرے لیے کوئی راستہ؟“

”ہر تلاش کرنے والے کے لیے راہ ہوتی ہے۔“

شمس نے آہ بھر کر کہا۔ ”ہاں بشرطیکہ وہ جانتا ہو کہ وہ کیا تلاش کر رہا ہے؟“

”آرزو ہو تو راستہ خود بخود دکھائی دے جاتا ہے برادر.....“ ڈاکٹر صاحب نے جواب دیا۔

”میں نیویارک کا رہنے والا ہوں۔ میری ماں اوپرائسنگ تھی۔ میرا باپ سکول ماسٹر تھا۔ بچوں کو تعلیم دیتا، ڈسپلن

کرتے بڑے بڑے لوگوں کی مثالیں دیتا۔ ان کے علم کی خوشہ چینی کرتا۔ وہ ایک معمولی Clergyman کی طرح اندر سے

سیدھا تھا۔ دوسروں کو سیدھا کرتے کرتے وہ خود کبڑا ہو گیا تھا۔ گھر، باغ، غسانخانہ ہر جگہ اس کی جماعت کا کمرہ تھا لیکن

بہت کم وقت کے گلے میں ایک آزاد پرندہ تھا۔ کبھی کبھی وہ باورچی خانے میں برتن اٹھاتے، سہزی کاٹنے کے وقت گانے لگتی تو

بھرتی پاتا میں اس کی آواز کے ساتھ سُروں سے ارتعاش کے ساتھ فضاؤں میں گم ہو جاؤں۔ کیا خیال ہے آپ کا۔ کیا

اس قسم کے ساتھ کائنات کا سفر کر سکتا ہے؟ کیا وہ کسی بلیک ہول میں تو ختم نہیں ہو جائے گا؟“

”آپ کے پاس شب معراج کی شہادت موجود ہے۔ ویسے تو اب لوگ Levitation کو بھی سائنس بنانے

کے لیے سوئے ہیں لیکن کبھی کبھی میں اپنی تعلیم کی وجہ سے تشکیک کا شکار ہو جاتا ہوں۔ جس Data کو لیبارٹری میں نہیں لے

سکتے اس پر کبھی ایمان نہیں لایا جاسکتا، ہم جیسے لوگوں سے۔“ شمس بولا۔

میں نے دل میں ڈاکٹر صاحب کی بات سے اتفاق نہ کیا۔

”میں بھی اس ڈیرے پر تشکیک کا تیزاب لے کر آیا تھا۔ بڑے بڑے دل کا آدمی تھا میں..... لیکن..... بابا جی

کے عقائد نے میری سٹی گم کر دی۔ میرا تیزاب شہد بن گیا۔ اخلاق ہی معیار ہے۔ اسی کی انجی ٹیپ سے فٹ بھی ناپے

جاتے ہیں اور گز بھی۔ سیدھا کرنے کے لیے ہمیشہ اخلاق کی داب کام آتی ہے۔ معیار کامیاب آدمی نہیں۔ معیار اچھے

عقائد والا انسان ہے۔“

”آپ کون ہیں ڈاکٹر صاحب؟“ عفت نے سوال کیا۔

”میں ضلع فیصل آباد کا رہنے والا ہوں۔ میرے آباؤ اجداد پشت پاشت سے مل جوتے، فصلیں بوتے،

شمس کاٹتے آئے ہیں۔ ان کسان لوگوں کو اللہ کی رحمت بادلوں میں نظر آتی رہی ہے۔ وہ رحمت کی تلاش میں اوپر

بکھے آئے ہیں۔“

”عفت پوچھتی ہے ڈاکٹر صاحب! پھر سوچ کر جواب دیجیے، آپ کون ہیں؟“ شمس نے سوال کیا۔

شمس کی نیلی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”تو آپ اتباع رسول کے پیروکار ہیں۔ واقف منزل ہیں آپ؟ آپ

جاتے ہیں کس راستے پر چل کر انسان معراج کو پہنچ سکتا ہے؟“

”ہاں چلتے رہنا شرط ہے۔ یہاں وہاں منزل کا تعین نہیں۔ بس اس راستے پر سبھی Pedestrian (راہ رو)

ہیں۔ کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس نے منزل پالی۔“

شمس نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر کہا۔ ”بس ڈگگنا نہیں۔ چلتے رہنا اپنی رہنمائی کرتے رہنا۔ اپنے آپ کو حوصلہ

کے کر چلنے پر آمادہ کرتے رہنا ڈاکٹر صاحب۔ ابھی مجھ سے میرے ہم شکل میرے کئی ہم وطن ادھر تلاش میں آئیں گے۔

میرے ہم وطن نہیں جانتے کہ روشنی کدھر سے آرہی ہے۔ وہ صرف اس قدر جانتے ہیں کہ جدرہ وہ ہیں، ادھر گھپ رہا ہے۔ مایوسی ہے۔ آنے والے ضرور سوال کریں گے پلیز انہیں جواب دینے کے لیے، ان کی رہبری کے لیے چلتے ہیں ڈاکٹر صاحب۔ انہیں مایوس نہ کرنا۔ مایوسی سے بچانا ڈاکٹر صاحب!“

شمس اور ڈاکٹر صاحب کی آنکھیں بگلگیر ہو کر عہد و پیمان کرنے لگیں۔ عفت نے جو نوالہ اٹھا رکھا تھا پیالے میں ڈال دیا۔ خاں صاحب نے بڑی میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ پیالے میں نظریں گاڑ دیں۔ گویا شمس اور صاحب کے لیگل کاغذوں پر گواہ بن کر دستخط کر رہے ہوں۔

اس وقت تہہ خانے کا دروازہ کھول کر ایک بھاری بھر کم سفید فام بڑا ہی تنومند آدمی داخل ہوا۔ اس کی چال چلن فلمی ولن جیسی، جسم پر دو شالا، رئیس ابن رئیس جیسے ہاتھ پاؤں خود اعتمادی میں بھگی ہوئی آواز میں گھڑیاں سی گرج۔ اس نے گلے میں ایک بڑا سا گیندے کا ہار پہن رکھا تھا، جس کے پھول نوج نوج کر وہ ادھر ادھر پھینک رہا تھا۔

”فراڈ ہے بابا..... چکر ہے..... جال پھیلا رکھا ہے بابے نے..... بادام روغن کی بوتلیں بیچی جا رہا ہے..... معجونیں گھوٹ گھوٹ کر پکڑا رہا ہے سب کو..... آلو شورے کھلا کھلا کرتا ہر کدی خلق خدا..... لُچا بد معاش..... پوتی بتا دیا..... کو..... جہالت سکھا دی سب کو، پاکھنڈی ہے بابا..... بیٹا خلق خدا کا فائدہ کرو..... خلوت جلوت ایک کرو..... یہ خلوت جلوت کیا ہوتی ہے؟..... کیا ہوتی ہے خلوت جلوت؟ خلوت جلوت..... خلوت جلوت۔“

اس نے دھمال ڈالنے والوں کی طرح خلوت جلوت کی تھاپ پر ناچنا شروع کر دیا۔ پھر یکدم ایک ستون سے لپٹ کر وہ زار زار رونے لگا۔

عفت خوفزدہ ہو کر بولی..... ”گھر نہ چلیں اشفاق بھائی۔ مجھے..... میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“
ہم تینوں خاموشی سے اٹھ آئے۔ نہ کسی نے ہمیں روکا نہ کسی قسم کا اصرار کیا۔
اشفاق صاحب کے ہاتھ میں بادام روغن کی بوتل اور معجون تھی جسے وہ بڑی احتیاط سے اٹھائے ہم سے آگے چل رہے تھے۔

نوارونے ڈیرے کا تمشخراڑا کر ایک بار پھر عفت کے ارادے کو متزلزل کر دیا۔ اس کے چہرے سے سیدھی روشنی کم ہو گئی۔ شک اور گمان نے چھاپہ مار کر اسے جھنجھوڑ دیا۔ واپسی پر خاں صاحب اوپر اپنے خلوت خانے یعنی لائبریری میں چلے گئے۔ ابھی ”تلقین شاہ“ کا سنوڈیو انہیں خاں کی تحویل میں تھا۔ وہی اس کی ریکارڈنگ کرتا، اس کا حساب رکھتا اور تلقین شاہ کی ریکارڈنگ کے دوران ”کٹ اٹ“ مؤدب زبان میں بولتا اور ساتھ ساتھ ایم بی اے کی تیار کرنا۔

سنوڈیو سے ملحق ریکارڈنگ روم، غسل خانہ اور اس کے بعد اوپر چڑھنے والی گول *Spiral* سیڑھیاں منزل کا حصہ تھیں۔ یہیں سے خاں صاحب کی باہر والی لائبریری شروع ہو جاتی تھی۔ تینوں طرف الماریاں اور ایک مرتبہ ٹیبرس پر کھلنے والی کھڑکی اور دروازہ تھا۔ اس لینڈنگ پر وہ میز بھی دھری تھی جس پر بیٹھ کر خاں صاحب سوچتے، لکھتے پڑھنے میں مشغول ہو جاتے۔

اسی لائبریری میں ایک اگلی تھی جو سسل خانے سے ملحق دیوار میں جڑی تھی۔ اس میں چپ بورڈ کے تختے تھے جن پر ہر کتاب کی مال نمینت، لوگوں کے عقیدت سے بھیجے تھے، خاں صاحب کی دل رکھنے کے ضمن میں کی ہوئی تھی۔ لندن، امریکہ سے لائے گئے پن، بال پوائنٹ، مارکر، ہائی لائزر، ربو، سیاہی مٹانے والے آلے، سٹاپر، ڈائریاں، نوٹ بکس، ان پر لکھے ہوئے نوٹس، کافی کے ڈبے، جن سنگ اور قسما قسم کے قہوے، لٹریچر، چائیاں، سے کھنے والے چھوٹے بڑے تالے، ہر ساڑھ قماش کی قینچی، گھڑیاں، ہیلتھ چیز، نیل کٹر، فائلیں..... یہاں ایک کائنات

ان تمام چیزوں کو زیر استعمال لانے کا خاں صاحب کو شوق نہ تھا۔ یہ تو ایک Memory Box تھا۔ جب وہ ایک پن اٹھا کر ایک گھڑی دیکھ کر کسی واقعہ، شخص، وقت کو حاضر کر لیتے۔ وقت اور مقام میں یوں آسانی سے سفر کرنا کے لیے آسان ہو جاتا۔ اس بازوچھ اطفال سے گزر کر وہ اپنی کتابوں میں گم ہو جاتے۔

ان کتابوں کا سلسلہ کسی محبوبہ کی داستان تھی۔ کچھ کتابیں ان کے ساتھ مکتبہ سے آئی تھیں۔ کچھ 1- مزنگ روڈ سے بھی ہو گئی تھیں۔ وہ کسی شکاری کتے کی طرح سونگھ کر کتاب تلاش کر لیتے۔ امریکہ، اطالیہ، لندن سے کتابوں کے پتے آتے۔ انارکلی کے فٹ پاتھیے، ان کے یار تھے۔ جونہی ہم دونوں کسی کسی اتوار کو انارکلی میں داخل ہوتے۔ پیراٹمنٹ سے ملحق دیوار کے آگے فٹ پاتھ پر کتابیں پھیلانے کباڑیے ہمیں لہیک کہتے۔ انارکلی کے دہانے پر ایک پرائی کتابیں سرعام منتظر ہوتیں۔ خاں صاحب چنتے رہتے۔ وہ کتابوں کو ٹھونکتے رہتے۔ مطلب کی سیکنڈ ہینڈ کتاڈیر لگ جاتا۔ وہ ہر کباڑی کے ساتھ عورتوں کے انداز میں بھاؤ تاؤ کرتے۔ یہ ان کا کباڑیے کے ساتھ قائم کرنے کا طریقہ تھا۔ کار پارکنگ کرنے والوں سے ضرور پوچھتے کہ کار کا کرایہ کس قدر ہے اور یہ ریٹ کیا ہے یا کم..... یہ بھی دوسرے کو گفتگو میں گھسیٹنے کا سر بندھ تھا۔

یوں کباڑیے کے ساتھ بحث مباحثے کے بعد بغیر گنے اسے پیسے دے دیتے اور واپسی پر جو کچھ بچ رہتا کسی لے فٹ پاتھ پر ڈھیر فقیر کے سر ہانے رکھ کر گھر لوٹ آتے۔ جتنی دیر خاں صاحب اور کباڑیوں میں نوک جھونک، حساب ہوتا میں کوئی ایک کتاب اٹھا کر فٹ پاتھ کنارے بیٹھ جاتی اور اچھی خاصی کتاب پڑھ لیتی۔ رفتہ رفتہ مجھے دیکھ کر کباڑیوں کے مالک مجھے کوئی کرسی لادیا کرتے۔ میں سہولت سے پڑھتی رہتی۔ خاں صاحب پنگ پانگ کی بازی میں کبھی کبھی ہار جیتے رہتے۔

واپسی پر ان کتابوں کی چھان پھنک ہوتی۔ وہ ان پر چڑھانے کے لیے سینٹ کے خالی براؤن کاغذ سے بنے تھیلے لاتے۔ یہ تھیلے عموماً میوہ ہسپتال کے سامنے والے کباڑیوں سے حاصل کیے جاتے۔ گھرا کر انہیں وزن تلے رکھ کر ہاکیا جاتا۔ کچھ دنوں بعد کھول کر کاغذ سیدھا کر کے انہیں کتابوں پر چڑھایا جاتا۔ کتابوں کی پشت پر موٹے مارکر سے کچھ کرا سے بڑے سلیقے اور ترتیب سے سجایا جاتا۔

یہ سارا Ritual خاں صاحب کے لیے کسی تہوار کی طرح دلچسپ تھا۔ انہوں نے کتابوں کو انسانوں کا روپ دیا تھا۔ ہر کتاب کو خاکی لباس پہنا کر وہ اسے اپنی الماریوں کی رجمنٹ میں رکروٹ کر لیتے۔ ایک بار جب امجد

اسلام امجد اور فردوس ہمارے گھر آئے تو امجد نے کہا۔

”خاں صاحب..... یہ کتابوں کو کاغذ کون چڑھاتا ہے؟“

”میں اور کون؟“

”اور ان کے پتے پر کون نام لکھتا ہے کتاب کا؟“

”بھائی میں..... اور کون؟“

امجد ابھی حیران ہونے میں مشغول تھا کہ فردوس بولی۔ ”اور امجد آپ نے اپنی کتابیں گیراج میں یوں رکھے

رکھی ہیں جیسے عید کے دن اوڑھیاں پڑی ہوتی ہیں سڑکوں پر۔“

بیچاری فردوس کو علم نہ تھا کہ خاں صاحب ہر کام کا پراجیکٹ بنا لیتے ہیں۔ اسے مرغی کے انڈے کی طرح

ہیں اور جب اس میں سے چوزہ نکلتا ہے..... یاد کا ہلکا زرد چوزہ..... تو پھر خاں صاحب کو عجیب سی خوشی ہوتی ہے۔

خواہشات کو ترجیح کرنے والے جھکشو کو اپنے کا سے میں پڑے باسی کھانے کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ خواہشات کو فی الفور

میں جو آئند تھا۔ اس علم کو خاں صاحب سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ وہ گھر آ کر کتابیں پڑھنا شروع نہیں کرتے تھے۔

خواہش پر التواء کا ڈھکنا لگاتے۔ کتاب کی عزت افزائی میں مشغول رہ کر اسے ایک تہوار میں بدل کر وہ اپنی تربیت

رہتے تھے۔ کتابوں سے نکل کر خاں صاحب کو عفت کی فکر سمیت ملتی۔

لیکن باباجی کا تسخراڑانے والا عفت کو ایک بار پھر متزلزل کر گیا تھا۔

گھر پہنچ کر خاں صاحب نے عفت کے تذبذب کو بھانپ لیا لیکن وہ اسے کسی نتیجے پر جبراً پہنچانا نہیں

تھے۔ گھر کا بڑا پھانک نما دروازہ کھول کر اندر داخل ہو کر خاں صاحب Spiral سیڑھیوں پر گول گول چڑھتے اپنی

میں چلے گئے۔ میں عفت کے لیے انار کارس نکالنے باورچی خانے میں پہنچ گئی۔ عفت کا سنی مہمان خانے میں

تھوڑی دیر کے بعد میں اُس کے لیے دیسی اناروں کا رس نکال کر کمرے میں گئی تو وہ پینگ پر نیم دراز کشور سے بات

تھی۔

”ہاں ہاں..... بابا ہاں۔“

”ادھر سے کشور سے غالباً کہا.....“ کہاں تھیں تم۔ میں نے تمہیں تین فون کیے ہیں۔“

”میں نے کہاں جانا ہے۔ باباجی کے علاوہ اور کہاں؟“

”ایک ڈاکٹر ہو کر تم کس جہالت میں پڑی ہو عفت؟“ کشور بولی۔

”وہ بڑی اچھی جگہ ہے۔ وہاں رنگ رنگ کے آدمی ہیں۔ مجھ جیسے جسمانی مریض، کچھ ذہنی مریض

گزار، اڑب، چور، غنڈے، اُچکے۔“

”میں حیران ہوں لندن، ہالینڈ، فرانس کے بعد تمہیں یہی جگہ سوچھی ہے۔“

”باباجی کہا کرتے ہیں چونکہ اب جہالت انتہا کو پہنچ گئی ہے، اس لیے رحمت بھی انتہائی جوش پر آ گئی ہے۔“

”آخر یہ بابا ہے کون؟“ کشور نے سوال کیا۔

”سیدھے سے بزرگ ہیں۔ اُن کے مرید باباجی کو نوے سالہا کا بتاتے ہیں۔ بڑے خوبصورت، گورے چہرے، سیدھی جی ہے۔ کہتے ہیں اُمی ہیں۔ مستی پہرہ گزار چکے ہیں۔“ عفت بولی۔

”مستی پہرہ؟ وہ کیا ہوتا ہے؟“ کشور نے پوچھا۔

”جنگلوں میں نکل جاتے تھے۔ جانوروں سے باتیں کرتے تھے۔ بس درختوں سے پھل توڑ کر کھا لیتے۔

کبھی کیفیت رہی۔ پورے چودہ برس پھر بزرگانِ دین میں سے ایک سائیں خدا بخش کے حضور پہنچ گئے۔ برسوں

تعمیرت کی۔ تعلیم کیے گئے اور پھرتے پھرتے اب انصطری روڈ پر ڈیرہ ہے۔ کہتے ہیں..... ایک لفظ پڑھنا نہیں آتا۔

سے زائد ایک لفظ نہیں بولتے۔“

”لے یہ کیوں؟“

”کیوں اس لیے کہ فرماتے ہیں مناظرہ ہمیشہ شوکتِ نفس کے لیے ہوتا ہے۔“

”کیا ٹھی ٹھی باتیں سیکھ آئی ہے ڈیرے سے..... ہسپتال گئی تھی؟“ عفت کی چھوٹی بہن کشور نے کہا۔

”رس پی لو عفت، باباجی نے فرمایا تھا۔“

”یہ تو کھٹا ہوگا، اس کا گلا پکڑا جائے گا قدسیہ، انار کارس مت پلاؤ۔“ کشور نے مجھ سے کہا۔

”نہیں ویسی اناروں کا رس ہے، کھٹا نہیں ہے۔“

عفت کورس کا پینا اچھا تو نہ لگا لیکن وہ چپ رہی..... ”ہسپتال گئی تھیں؟ بول۔“

”نہیں۔“

”بلڈ ٹسٹ کروایا تھا؟“

”نہیں۔“

”ایکس رے؟“

عفت نے نفی میں سر دائیں بائیں ہلادیا۔

”یورن ٹیسٹ؟“

”اوائے بابا نہیں نہیں نہیں۔“ عفت نے چڑ کر کشور سے کہا۔

”شہاب بھائی کو فون کرتی ہو۔ وہ بات کریں گے تیری اس نہیں نہیں نہیں کی۔“

عفت مسکرائی اور بولی..... ”وہ فون کرتے رہتے ہیں۔“

”لندن کب جاؤ گی چیک اپ کے لیے؟“

”شاید کبھی نہیں۔“

”لیکن یہ تو خطرناک ہے عفت۔ شہاب بھائی منع نہیں کرتے؟“

”انہوں نے قدسیہ کو منع کیا ہے۔ مجھے تو کچھ نہیں..... میں جو مرضی کروں۔“

”کیا منع کیا تھا قدسیہ؟“ مجھ سے کشور نے پوچھا۔

”شہاب صاحب نے مجھے منع کیا تھا کہ میں باباجی کی بیعت نہ کروں۔ یہ زمانہ بیعت کا نہیں ہے۔“

”یہ قدسیہ بڑی وہمی ہے۔ باباجی بیعت تھوڑی کرتے ہیں۔ وہ تو وضو کراتے ہیں۔ پاک کرتے ہیں۔“

انہوں نے مجھے وضو کرانا تھا، یہ وہاں گئی ہی نہیں کھوتے کا سر..... بڑی جاہل ہے۔“ عفت بولی۔

”لیکن بیعت کیوں نہیں کرنی قدسیہ..... کیا وجہ؟“ کشور بہت پریشان تھی۔

میں نے جھٹ سے جواب دیا ”شہاب بھائی کہتے ہیں بیعت کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ اگر آپ...

ماننے کا عہد کر لے تو پھر شیخ کی حکم عدولی نہیں کر سکتا۔ اگر باباجی نے تینوں سپوت ڈیرے پر رکھ لیے تو کیا میں...

کر لوں گی۔“

”ایویں..... باباجی کیوں ایسا کریں گے؟“ عفت نے کہا۔

”اگر باباجی ثاقب کا بیاہ کسی اندھی لڑکی سے کر دیں تو مان جاؤ گی عفت؟“ کشور نے سوال کیا۔

میں شہاب بھائی۔ اب اتنا پڑھ لکھ کر تو آدمی بیعت شیت نہیں کر سکتا۔“ کشور نے بیعت کا ناپک بند کر دیا۔

ہم دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ کمرے میں دھند لکا چھا گیا تو عفت نے وہ بیڈ لیپ روشن کر دیا جس پر...

کا بلب روشن تھا۔ زیرو کے بلب میں یہ خاصیت ہوا کرتی ہے کہ وہ دوسرے بلبوں کے مقابلے میں تو بے حیثیت...

عطا کرتا ہے لیکن اگر آدھی رات کو اندھیرے میں روشن ہو تو اس کی نرمل روشنی میں ہر چیز کی جسامت، ساخت...

بڑی ہو جاتی ہے۔

عفت کی چھوٹی بہن کشور بڑی مایوس ہو گئی تھی۔ عفت تازہ مغرب پلٹ تھی۔ میرے خیال میں اس...

سے مانوس کرنے والے ان پڑھ جاہل نالائق پیروکار نہ تھے۔ یہاں بھی ڈاکٹر صاحب اور شمس کی روشن باتوں...

حصار میں لے لیا تھا۔ یہاں بھی مغربی چمک، سچائی، روشن خیالی ہی کام آئی۔ مغرب نے ہی عفت کو مشرقی...

سے روشناس کرایا۔

چند دنوں کے بعد عفت اور میں ڈیرے پر پہنچیں تو باباجی ڈیرے پر موجود نہ تھے۔ ہم باہر ہی چھ...

بیٹھ گئیں۔ علی محمد صاحب حسب معمول کھانا تیار کر رہے تھے۔ بابا جلال نے پہنچتے ہی لال چائے کے کٹورے...

دھر دیئے۔

”ابھی باباجی آ جائیں گے۔ آپ چائے پیئیں۔“

اس وقت شمس کہیں سے آ گیا اور بے تکلفی سے ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے دل میں سوچا، یہ بھی...

ہے کہ باباجی جیسے بزرگ کو شہرت سفید فام شمس سے مل رہی ہے۔ ان پر ایمان کو مضبوطی بخشنے والا مغربی تھا۔ میں...

باتیں سوچنے کی عادی تھی۔

گھر پہنچ کر عفت سے اشفاق صاحب نے پوچھا۔ ”طبیعت کیسی ہے عفت؟“

”ٹھیک ہے اشفاق بھائی۔“

”انار کارس بیاتھا؟“

”جی۔“

”قدسیہ کو یاد دلاتی رہنا۔ دن میں کم از کم تین بار..... ویسی انار..... قندھاری نہیں۔ اس کے کئی اور بکھیرے

بھول نہ جائے۔“

”نہیں جی یہ بھولتی نہیں۔“

”عرق..... معجون؟“

”جاری ہے، آپ فکر نہ کریں۔“

”عفت میں سوچ رہا تھا.....“

”وچند لمحوں کے لیے خاموش ہو گئے۔“

”میں سوچتا رہتا ہوں کہ تمہیں ڈیرے پر لے جانا تو چاہیے تھا لیکن وہاں کے علاج کے سپرد کرنا زیادتی نہ ہو

تھی۔“

”ہونے دیں..... مجھے رسک پسند ہے۔“

”بڑی خطا ہو جانے کا احتمال ہے۔“ خاں صاحب بولے۔

”آپ نے سنا نہیں تھا اشفاق بھائی۔ باباجی فرماتے تھے جہاں خطا ہے، وہیں عطا ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے پھر بھی..... اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو شہاب مجھے کیا کہے گا۔“

عفت کھڑی رہی۔ اس کی مزاح کی جس اس وقت ماند پڑ گئی تھی۔ نہ اس نے ”اے ہے“ کہا نہ مسکرائی۔ خاں

صاحب نے کہا کہ خاں صاحب کا دل کسی سر ہنگ زادے کا دل تھا۔

”نیا تجربہ ان کے تو سن تخیل کو بھاگنے پر مجبور کرتا۔ مشکل سے مشکل امتحان میں بھی کبھی ان کا پٹھا

تھا۔“

وہ ہر بڑے امتحان میں خم شونک کر زندگی کو مات دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ

خاں صاحب کے والد بابا محمد خاں فوت ہوئے تو میت گھر پر تھی۔ لوگوں کا انتظار ہو رہا تھا اور اسی کمرے میں بیٹھے خاں

صاحب نے شاہ لکھ رہے تھے کیونکہ دوسرے دن ریکارڈنگ تھی اور وہ کبھی ذمہ داری سے بھاگنے والے نہ تھے۔

وہ غالباً اس احساس جرم میں مبتلا تھے کہ عفت کو باباجی کے حوالے کر کے وہ کہیں کوئی بڑی غلطی تو نہیں کر رہے۔

عفت کی دانش پرکھی ایمان تھا۔ وہ اس خطے کی موروثی Wisdom کے دل سے قائل تھے لیکن مغربی تعلیم اور سائنس کے

تعمیراتی اثرات ان کے سامنے تھے۔ وہ ہر روز سائنسی کتابوں کی ورق گردانی اور ان کے ترجموں کی رسائی میں وقت صرف

تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی خاموشی کی اصل وجہ یہی تضاد تھا۔ میں نے کبھی سوال تو نہ کیا لیکن اندر ہی اندر

خوفزدہ تھے کہ کہیں عفت کا علاج غلط تو نہیں ہو رہا۔ کہیں اس طرف کا چسکا لگا کر میں شہاب سے زیادتی کا تو

سک ہو رہا۔

راتیں سرد ہو چکی تھیں۔ عفت کے لیے یہ سردی قیامت کی تھی۔ اس کا جسم خاطر خواہ حد تک لہو بنانے سے قاصر

تھا۔ وہ سارا دن ہیٹر چلائے کمرے میں بند رہتی۔ جب دھوپ تیز ہو جاتی تو لان میں جا بیٹھتی۔ بچوں کی واپسی کے ہمارے کمرے سے ملحق بچوں کے کمرے میں چلی جاتی۔ بچے اپنی سکھی سہیلی عفت سے باتیں کرتے۔ کیمسٹری کے سکول کی باتیں سناتے اور ان کے سونے پر عفت پھر کاسنی کمرے میں چلی جاتی۔

ایک روز خاں صاحب ہمارے ساتھ ڈیرے نہ جا سکے۔ پتہ نہیں ان کے اندر کے احساس جرم نے یہ کھڑا ڈالی کہ دفتری کاموں کا الجھاؤ تھا۔ بہر کیف ہم دونوں ڈرائیور کے ساتھ اکیلی ہی ڈیرہ پاک پہنچیں۔ راستے میں عفت طرح میں نے اسے سمجھانے کے سلسلے میں سعی شروع کر دی۔

”عفت تھوڑی سی عقل کرو، جرمنی چلی جاؤ..... پلیز۔“

عفت نے سر جھکا کر کہا۔ ”ساری بات Faith کی ہے قد سیر۔“

”چلو یہ دل لگی بھی جاری رکھو لیکن Dialysis سے غفلت نہ برتو۔“

اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی سے اپنی صحت کے متعلق بات نہیں کرنا چاہتی۔ شاید مرنے کا خوف نہیں تھا لیکن شہاب بھائی کا فکر تھا۔ ہو سکتا ہے چھوٹے ثاقب کے متعلق کچھ اندیشے ہوں لیکن چہرے پر دوسوے، سوچیں، امید ناامیدی عیاں ہو رہی تھی۔

یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اپنی ضعیف الاعتقادی پر پچھتاری ہو لیکن ڈوبنے سے پہلے تنکے کا سہارا بھی اس کے حیران کن تھا۔ ڈیرے کے متنوع لوگ، بابا جلال، ڈاکٹر اشرف فاضلی، شمس اور ان سب میں ”جلوت خلوت“ بھاری بھر کم شخص۔

”عفت سوچ لو۔ سوچ لو، آخری بار یہ سودا مہنگا نہ پڑے۔“

عفت نے المتاس کے درخت کے پاس پہنچتے ہوئے جواب دیا۔ ”ضرور یہ کم عقلی ہے، جہالت ہے اپنی مرضی کی موت کیوں مرنے نہیں دیتیں۔ تم چاہتی ہو میں ٹیکوں سے چھلنی کسی سرجری کی میز پر لہوا اور گھونڈ کی ہوئی مر جاؤں۔ میرا سانس کسی آکسیجن ٹینٹ میں گھٹ کے بند ہو جائے۔ تم لوگ نہیں چاہتے کہ جب میں حوریں لینے آئیں۔ نہروں اور باغوں میں میرا ٹھکانہ ہوا۔“

اس کے بعد میں نے کچھ نہ کہا۔

ہمیشہ کی طرح بابا جلال ہمیں تہہ خانے میں لے گیا۔

عجب اتفاق تھا کہ اس روز تہہ خانے میں کوئی موجود نہ تھا۔ بابا جلال چائے لے کر آ گئے۔ ہم دونوں تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد بابا جی ہاتھ میں بادام روغن کی بوتل لے آ گئے۔

”لوجی بڑی خیر ہوگئی پُت..... آج تو ہم نے خود بادام روغن نکالا ہے صاف ستھرا۔“

بابا جی ابھی بیٹھے بھی نہ تھے کہ عفت بولی۔ ”بابا جی! سارے لوگ مجھے اس علاج سے مایوس کراتے ہیں۔“

کروں؟“

”ناں ناں پُت۔ مسلمان کو مایوس ہونے کا حکم نہیں۔ شیطان کا اور کیا کام ہے پُت۔ وہ انسان کو تھکاتا ہے۔“

سچ کراتا ہے۔ آدمی کا معجزے پر اعتماد ختم کرتا ہے۔ ناں ناں پُت مایوسی گناہ ہے گناہ۔“

”پر باباجی۔“

”پر..... ور کوئی نہیں پُت۔ اوپر والے پر کھٹی ایمان رکھو۔ جن کا ایمان مضبوط ہوتا ہے ان کے لیے ستم

ان کے لیے معجزے ہوتے ہیں۔“

یکدم انہوں نے تہہ خانے میں نظر دوڑائی۔ پھر حیران ہو کر بولے۔ ”اشفاق صاحب ہمارے جانی جان

کے ہیں۔“

”خال صاحب تو آج نہیں آسکے باباجی۔“

باباجی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”ناں بیٹا ناں محرم کے بغیر کہیں نہیں آنا جانا۔ حج اور عمرے پر بھی نہیں۔ جہاں محرم

تحت ہو وہاں شیطان تیرا فریق بن بیٹھ جاتا ہے۔ پھر خطرہ تو ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ شاباش پُت۔ واپس جاؤ۔ محرم کو

تھلاؤ۔ تھلاؤ..... نہ آسکے تو پھر سہی۔ شاباش پُت۔“

ہم آزادی پسند پُر اعتماد اپنے راستے اور فیصلے خود کرنے والی عورتیں تھیں۔ اس بات سے ہم دونوں کو ٹھیس سی

تھی۔ جب ہم گھر پہنچے تو عفت کی بڑی بہن جمیلہ اور کشور کو اپنے انتظار میں پایا۔ وہ تینوں لان میں کرسیاں ڈالے چپ

پسے جو جس انداز میں بیٹھے تھے۔ لان ہی میں ایک چار پائی کچھی تھی جس پر عفت کا بستر لگا تھا۔ ہم نے سرد مہری سے ایک

کرسی کا استقبال کیا۔ عفت چپ چپ بستر پر نیم دراز ہو گئی۔ شہاب صاحب کے بھانجے اقبال شہاب کا چہرہ ایسے لگتا تھا

جیسے اپنے آپ کو اس بیماری کا ذمہ دار سمجھتا ہو۔

”پتہ نہیں ماموں جان کو کیا ہو گیا ہے؟“ اقبال شہاب یہ کہہ کر چپ ہو گئے۔

”کیا ہو گیا ہے شہاب کو؟“ عفت ابرو اٹھا کر بولی۔

”میں خط لکھتا ہوں۔ جواب نہیں دیتے۔ شریا فون پر بات کرنا چاہتی ہے۔ وہ آئیں بائیں شائیں کرتے

تھے۔ مگر وہ تمہیں جرنی لے کر کیوں نہیں جاتے۔ مجھے معلوم ہے وہاں تمہاری بیماری کا پکا پکا علاج ہے۔“

”پھر؟“

”وہ خود تو فیصلہ نہیں کرتے اور ہم سب کو مفت میں پریشان کر رکھا ہے۔ آخر ہمارا بھی تو تم پر حق ہے۔ خود تو

ہم سے اسلام آباد میں بیٹھے ہیں۔ کشور نے مجھے بتایا ہے کہ یہاں کوئی بڈھا (Quack) تمہارا علاج بالغذا کر رہا ہے اور

total ان پڑھ ہے بابا بیچارہ۔“

عفت نے ہمت سے جواب دیا..... ”نبی سہمی ان پڑھ تھے اقبال۔ کسی نبی کے پاس پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری نہ تھی

تھی سارے پڑھے لکھے لوگوں سے افضل تھے۔ کیا حضرت ابراہیمؑ، کیا حضرت موسیٰؑ، کیا حضرت عیسیٰؑ۔“

کشور اس وقت اقبال کی کمک کو پہنچی۔

”پلیز عفت understand۔ میں Faith-healing کے خلاف نہیں ہوں لیکن اس وقت تمہاری حالت

سے جس کا اتنا بڑا Risk لیا جاسکے۔ ہم تمہارے ساتھ بحث کرنے نہیں آئے عفت پلیز..... پلیز پلیز۔“

عفت نے کسی کی بات کا جواب نہ دیا اور پیٹھ موڑ کر لیٹی رہی۔ وہ تینوں چپ چاپ چلے گئے۔ اتنی بات نہ ہوئی کہ دوسرے دن اچانک شہاب بھائی آ گئے۔ میرا خیال ہے انہیں اقبال شہاب نے فون کیا ہوگا۔

جب سے عفت ہمارے پاس تھی شہاب بھائی کم کم اسلام آباد سے آتے۔ کبھی کبھی ثاقب ان کے ساتھ۔ ان دنوں ثاقب کے ساتھ مل کر رات کو بچے بڑا اودھم مچاتے۔ سب مل جل کر کھانے پکاتے۔ سب اپنی اپنی ترکیبیں لیتے اور ہیڈ لک اینٹ میاں سب کی مان لیتا۔ اس ہیڈ باورچی کی ماننے کی خصلت کے باعث کبھی لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ تک عفت کی بیماری، ڈیرہ پاک کا علاج، ہم سب بڑوں کے وسوسے کبھی ٹرانسمٹ نہ ہوئے۔ وہ رات کو سائیکلوں پر نکل جاتے۔ نہ ہمارے کالے پھانک کو کبھی تالا نصیب ہوا۔ نہ ماڈل ٹاؤن کے گھروں ہی میں ابھی دروازے پھاٹک کرنے کا رواج تھا۔

شہاب بھائی جب بھی ہمارے پاس آتے وہ بہت کم ہمارے ساتھ ڈیرہ پاک جاتے۔ انہوں نے عفت اس فیصلے کی آزادی دے رکھی تھی لیکن اس بار جب وہ آئے تو ان کے چہرے پر تشویش تھی۔ ہم نے ایسی فکر منڈائی ان کے چہرے پر نہ دیکھی تھی۔ عفت ڈیرے پر جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ ہمارے دروازے پر دستک ہوئی۔ نے دروازہ کھولا۔

”کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟“ اتنے برسوں بعد بھی وہ عام لوگوں کی طرح ہم سے بے تکلف نہ ہوئے تھے۔
 ”آئیے آئیے۔“ میں نے خوش دلی کے ساتھ خوش آمدید کہا۔ خاں صاحب کتاب چھوڑ کر ان کے ساتھ بیچ پر آ بیٹھے۔

”تم سے ایک بات کرنا تھی اشفاق۔“
 خاں صاحب مکمل توجہ تھے..... ”فرمائیے، حکم دیجیے۔“
 ”انسان میں توازن سب سے بڑی خوبی ہے۔ یہ باقی رہے تو انصاف قائم رہتا ہے۔ انسان گھڑی کے ہونے کی طرح کبھی ادھر کبھی ادھر نہیں ہوتا۔ بہر حال تم خود دینی کتب کا مطالعہ کرتے رہتے ہو..... مجھے..... عفت کے لیے تو اتنا اندیشہ نہیں ہے لیکن ڈیرہ پاک اور ہسپتالی علاج کے درمیان پنڈولم کی طرح چکر لگاتے لگاتے وہ الجھ گئی ہے۔ ڈر ہے کہ کہیں ڈیرے پاک پر اس قدر اندھے اعتقاد کے باعث اس کی عاقبت برباد نہ ہو جائے۔“
 ہم دونوں مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے۔

”تم جانتے ہو شرک اسلام میں سب سے بڑا گناہ ہے۔ خدا کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک کرنا بہت گستاخی ہے۔ اگر عفت یہ سمجھ رہی ہے کہ کوئی آدمی وہ کچھ کر سکتا ہے جو خدا نہیں چاہتا تو اس کی بڑی بھول ہے۔“
 میں عفت کی طرف داری میں بولی۔ ”لیکن وہ اپنے پاک بندوں کی سُن تو سکتا ہے۔ عفت بھی ڈیرے پر برکت کے لیے جاتی ہے۔ بابا جی کی دعا پر اسے بھروسہ ہے۔“

”یہاں ہی قدسیہ تھوڑی سی غلطی ہو جاتی ہے۔ کسی شخص کو جب یہ گمان ہو جاتا ہے کہ وہ پاک ہے تو خود شہادت کہیں وہ غلط فہمی کا شکار نہ ہو..... نیکی کا راستہ بھی پیدل سفر کا راستہ ہے۔ آدمی چلتا رہے، چلتا رہے..... اور بس۔“

”جی وہاں خطرہ تو ہر وقت موجود ہوتا ہے۔ باباجی بھی یہی فرماتے ہیں۔“ میں نے جھٹ علیت بگھارنے کی

”اگر وہ یہ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن مجھے ڈر ہے کہ کہیں عفت ان سے کسی معجزے کی توقع نہ لگا بیٹھے۔ دل

سے حد تک تو ٹھیک ہے لیکن.....“

وہ چپ اٹھ کر چلے گئے۔

ہم تینوں ڈیرے پاک جانے کے لیے تیار ہوئے تو شہاب بھائی باہر نکلے اور ہمارے ساتھ ہو لیے۔ کچھ کہے

میں نے کھولا..... اور بیٹھے ہوئے کہا۔ ”کیا اجازت ہے اشفاق؟“

سارا راستہ خاموشی رہی۔ ہم نے گاڑی باہر پارک کی اور اندر کی طرف چلے۔ اللہ کی وحدت کثرت میں بی

ٹھے میں پھیلی تھی۔ کچھ لوگ چھپکی کی کٹی ہوئی دم کی طرح تڑپ رہے تھے، کچھ راضی برضا ہونے کی کوشش میں ابکائی

کتے جی صورت بیٹھے تھے۔ کچھ مجسم سوال اور کچھ مکمل جواب صورت تھے۔ ہم باباجی کے پاس لنگر والی جگہ جا بیٹھے۔

سب معمول دیکھے چڑھے تھے۔ علی محمد صاحب ان میں مصروف تھے۔ باباجی روغنی پیالوں میں لنگر بانٹ رہے تھے۔

گڑ والی چائے کا دور چل رہا تھا۔

”آگے ہمارے جانی جان..... چلو پت نیچے چلو۔“

”آج نہیں باباجی۔ آج ہمیں جلدی واپس جانا ہے۔ شہاب نے اسلام آباد واپس جانا ہے۔“

باباجی چپ ہو گئے۔ ہمیں چائے کے کٹورے تازہ دم کرنے کے لیے دے دیئے۔

شہاب بھائی نہ ڈیرہ پاک دیکھ رہے تھے نہ ان کی توجہ باباجی پر تھی۔ وہ بار بار چور نظروں سے عفت کی طرف

دیکھ رہے تھے۔ عفت بار بار جھوک کھا جاتی اور پھر قوت ارادی کے بل بوتے پر اپنے آپ کو متوجہ کرتی۔ شہاب صاحب کسی

بے حد شہس کر اس کے راز معلوم کرنے والے نہ تھے۔ پورے تین سال لندن میں رہ کر عفت کے ساتھ ہسپتالوں کی

تعمیراتی میں انہوں نے کچھ ایسے سبق سیکھ لیے جن کا ذکر ان کی تحریر میں تھا نہ لہوں پر۔

کچھ دیر کے بعد خود ہی عفت اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا باباجی اجازت دیں۔“

اتنی لافلتی سے ہم کبھی ڈیرہ پاک نہ گئے تھے۔

پتہ نہیں عفت نے شہاب بھائی کی تشویش بھانپ لی تھی یا اسے ثاقب کی کچھ فکر تھی۔ ہو سکتا ہے وہ اقبال شہاب،

شہاب اور جمیلہ کی وجہ سے گڑ بڑا گئی ہو۔ وجہ جو بھی تھی ہمیں معلوم نہ ہوئی۔ اس بار شہاب بھائی نے کاسنی کرہ چھوڑا تو عفت

مجھ ساتھ چلی گئی۔

اس کے بعد ہمیں اس وقت پتہ چلا جب اقبال شہاب نے انہیں میوہ ہسپتال میں داخل کروا دیا۔ کچھ ماہ بعد جب

شہاب بھائی ہمارے گھر آئے۔ میں نے عفت کے متعلق کچھ نہ پوچھا۔ پتہ نہیں کیا حجاب تھا۔

”عفت منہ سے تو کچھ نہیں کہتی..... لیکن مجھے لگتا ہے وہ تمہیں یاد کرتی ہے۔“

”میں آؤں گی اسلام آباد اس سے ملنے۔“

”نہیں۔ وہ اسلام آباد میں نہیں ہے۔“

”پھر کہاں ہے جی؟“

”یہاں لاہور..... میوہسپتال میں۔“

”تو اس کے پاس ہسپتال میں کون ہے شہاب بھائی؟“

”فوزیہ ہے۔“

”آپ مجھے کہتے شہاب بھائی میں اس کے پاس رہ لیتی۔“

میں نے اشفاق کی طرف دیکھا۔ پتہ نہیں انہیں کیا چیز ستارہی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ پچھلی مرتبہ عفت اور شہاب بھائی لندن گئے تھے تو عفت اپنی ایک غریب رشتہ دار کو ساتھ لے

تھی۔ عابدہ کا کام عفت کی نگہداری تھا۔ شہاب بھائی کی عدم موجودگی میں اسے ہسپتال سے لانا لے جانا پڑتا تھا۔ لندن

کر جب تھوڑی دیر کے بعد عابدہ کو ایک ایسی فرم سے کام مل گیا جو کپڑوں میں بنن ٹانگنے کی اچھلی بھلی اجرت دیتی تھی۔

فرم کی دین پر سلعے سلائے کپڑے گھر آ جاتے۔

عابدہ گنتی کر کے بنن دھاگہ، سوئی اگشتا نہ کپڑ لیتی اور دن بھر بنن ٹانگنے میں مشغول رہتی۔ صوفے کرسیاں

عفت کے پلنگ پر بھی کپڑوں کا ڈھیر لگنے لگا۔ ہسپتال جانے میں بھی ناخن ہونے لگے۔ دوایاں بھی عابدہ کو بھول

جاتیں۔ عفت نے منہ سے تو عابدہ کو کچھ نہ کہا لیکن جب وہ لاہور لوٹی تو پھر عابدہ کو یہیں چھوڑ گئی۔

مجھے پتہ نہیں کیوں اس خوف نے گھیر لیا کہ شاید شوق جی اور مجھ سے بھی عابدہ جیسی کوئی بھول نہ ہوگی۔

اپنے کاموں میں گم، بچوں میں گھرے، عفت کو وہ توجہ نہ دے سکے ہوں جس کی اسے ضرورت تھی۔ ہم نے بھی کبھی

کے ساتھ عابدہ کا سا سلوک نہ کیا ہو۔

”کیا سوچ رہی ہو قادیان؟“

”کچھ نہیں جی۔ جب آپ جائیں گے تو میں..... ساتھ چلوں گی۔“

شام گہری ہو گئی تھی۔ شہاب بھائی اور میں میوہسپتال پہنچے۔ گاڑی سے اترے تو شہاب بھائی کے پاؤں

تھے۔ انہوں نے ایک ٹانگ ہلکے سے جھٹکی پھر تھوڑا سا لنگڑا کر چلے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے Intensive Care

پہنچی۔ عفت آکسیجن منٹ میں تھی۔ نیچے بید کے ساتھ پیشاب کی تھیلی منگنی تھی۔ اوپر بلڈ اور خالص شوگر کی کمی کے باعث

کی شفاف تھیلی نالی کے ذریعے سے عفت تک پہنچ رہی تھی۔

میں نے بغیر کسی سے پوچھے اپنا ہاتھ آکسیجن منٹ میں ڈالا اور عفت کا بازو پکڑ لیا۔ اس نے لمبے بھر کو

کھولیں جیسے مجھے پہچان لیا ہو۔ ایک نرس ٹیبل کی سی تیزی سے ہماری طرف آئی..... ”پلیز آپ ہاتھ منٹ کے

ڈالیں۔“

میں نے اس جھڑکی سے مرعوب ہو کر ہاتھ کھینچ لیا۔

”آپ دونوں باہر چلے جائیں۔ ڈاکٹر صاحب راؤنڈ پر آنے والے ہیں۔ ویسے بھی اس مریض کو کسی سے ملنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

ہم دونوں اپنا سامنے لے کر واپس کار میں پہنچ گئے۔ شہاب صاحب میرے ساتھ پیچھے بیٹھ گئے۔ مال روڈ تک پہنچنے کے بعد ہم نے اپنی اپنی کھڑکی کا رخ کر کے باہر بیٹوں کی طرف دیکھنے میں وقت صرف کیا۔ میرے آنسو بلا تکلف گر رہے تھے۔ تم کے پل سے کچھ پہلے مجھ سسکیاں ہی سنائی دیں۔ میں نے پلٹ کر شہاب بھائی کی طرف دیکھا۔ زندگی میں غالباً یہ پہلی بار تھا کہ ان کا جسم جھکولے کھار ہا تھا۔

”شہاب بھائی۔ اب کیا ہوگا؟“

وہ سسکیوں سمیت بولے۔ ”بس ازدی اینڈ قدسیہ۔“ ”This is the End.“

ہم دونوں نے ایک دوسرے کو کسی قسم کی تسلی نہ دی۔ ہم نہ انجام کے لیے تیار تھے نہ اس انجام کے آگے ہتھیار اٹھانے کی ہمت تھی۔

شہاب بھائی مجھے چھوڑ کر اقبال شہاب کے گھر چلے گئے۔ پھر عفت اپنے اصلی گھر چلی گئی۔ اس کا جنازہ اس کے خاندان والے لے کر اسلام آباد چلے گئے۔ شاید خاں صاحب کو سارے حالات کا علم تھا لیکن مجھ سے انہوں نے کسی قسم کا ذکر نہیں کیا۔ اس کے بابا جی نے جیسے عفت کا تعاقب کیا۔ عفت اور بابا جی نور والے دونوں ہم سے جدا ہو گئے۔ ڈیرے پر بابا جی کے بڑے بیٹے خلیفہ ہو گئے۔ اب ڈیرہ پاک یہاں کی نذر ہو گیا۔ ڈاکٹر فاضلی بھی ڈیرے سے جدا ہو گئے۔

پتہ نہیں یہ ہر بڑے آدمی کا نصیب ہے۔ اس کے جاتے ہی خاندان اور دوست دونوں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر بن جاتے ہیں۔ حالانکہ دودھ اور پانی دونوں طیب ہیں لیکن دونوں ایک دوسرے میں ضم ہونے سے انکار کر دیتے ہیں۔ عفت اور بیگانگی کی بجائے حسد اور مقابلے کی ہوا میں چلے گئی ہیں لیکن کیا کیا جائے شاید یہ وہ قیمت ہے جو ہر بڑے آدمی کو اپنی شہرت، ناموری اور بڑائی کی اپنے رب کے حضور پیش کرنے کا حکم ہے۔

خاں صاحب بھی ڈیرے پاک سے جدائی کے بعد کچھ دیر ستائے۔ ان کی تلاش کسی معمولی آدمی کی نہ تھی۔ ان کا رخ سخی رازی کی طرف ہو گیا۔ وہ نہ جانے کتنی دیر ان کے ڈیرے پر جاتے رہے۔ آخر ایک دن مجھ سے کہنے لگے۔

”قدسیہ..... سخی رازی صاحب کا ڈیرہ لاہور سے قریباً بیس میل دور نہر سے کچھ دور ہے۔ سخی رازی صاحب یہاں ہی ہیں۔ ان کی آواز میں جو سدھی لب ولہجہ ہے، وہ بہت خوبصورت لگتا ہے۔ خاص کر جب وہ پنجابی بولتے ہیں۔ ارد گرد کے لوگ ان کے پاس آتے جاتے ہیں۔ باقی تم خود چل کر دیکھ لو..... یعنی اگر جانا چاہو تو..... میں مجبور نہیں کرتا۔“

ہم دونوں نہر سے ہو کر سخی رازی صاحب کے ڈیرے پر پہنچے۔ بابا جی نور والے جیسے انتظام تو نہ تھے نہ ویسے مخلوق تھی۔ ڈیرے پر سخی رازی صاحب کی دانش رس رہی تھی۔ بیاسی زمین جیسے لوگ میرا بھور ہے تھے۔

سائیں سخی رازی سے ہوتے ہواتے خاں صاحب واصف علی واصف صاحب تک پہنچے۔ واصف صاحب ان

کے پاس اپنی کتاب ”شب چراغ“ کا دیباچہ لکھوانے اردو بورڈ آئے تھے۔ خاں صاحب نے جلد ہی ان کی وسعت و بھانپ لیا۔ پورے تین ساڑھے تین سال خاں صاحب اور انیق بیٹا ان کی رات کی محفلوں میں جاتے رہے۔ یہ محفل والٹن کی جانب ایک سکول میں منعقد ہوتی تھیں۔

خاں صاحب قریباً گیارہ بجے ساتھ والے کمرے سے انیق کو جگاتے۔ دونوں دبے پاؤں باہر نکلتے۔ لاک کرنے کا تب رواج نہ تھا۔ عام لوگوں کے شکوک رفع کرنے اور انہیں تشریح اور تسلی کا پھاہا لگانے کے لیے واصف صاحب اپنا بیان جاری رکھتے۔ رات کو یہ محفل ٹوٹی اور جس طرح دبے پاؤں باپ بیٹا جایا کرتے ویسے ہی خاموشی سے آتے۔

یہ ڈیرہ ذرا اپنی نوعیت کا تھا۔ یہاں ایک سکول ٹیچر براجمان تھا۔ سارے بیان ٹیپ پر ریکارڈ کیے جاتے تھے۔ کار ریکارڈ رکھا جاتا۔ جب واصف صاحب کی مصروفیات ان بیانات کو تحریر میں لانے کی طرف مائل ہو گئیں تو یہ سلسلہ ختم کیا لیکن خاں صاحب سے تعلق ہمیشہ برقرار رہا۔

سید سرفراز شاہ صاحب کا تعارف ممتاز مفتی کی وجہ سے ہوا۔ مفتی جی خود تلاش کے آدمی تھے۔ ان کے علمی زندگی کا مقصد سمجھنے کی ہوس تھی۔ انہوں نے خاں صاحب کو سرفراز صاحب کے ڈیرے کا پتہ دیا۔ شاہ صاحب اقبال کے محفل میں رہتے تھے۔ پیچھے رہائش تھی اور سامنے ڈرائنگ روم کو انہوں نے خلق کے بیٹھنے کے لیے مختص کر رکھا تھا۔ دیواروں کے ساتھ معذور اور بوڑھوں کے لیے صوفے تھے۔ درمیان میں قالین بچھا تھا۔

اس ڈرائنگ روم کے دو حصے تھے۔ ایک بنیادی طور پر ڈرائنگ روم تھا جس میں بیضوی میز کے گرد کرسیاں تھیں۔ پھر ڈرائنگ روم تھا۔ دونوں کے درمیان جالی کا پردہ تھا۔ سرفراز شاہ صاحب کا طریقہ واردات بالکل مختلف تھا۔ وہ شام مردوں سے ملتے اور جمعرات کی شام عورتوں کے مسائل سلجھاتے۔ ان محفلوں میں پہلے تو کچھ دیروہ دنیاوی مسائل کے متعلق جنرل باتیں کرتے۔ پھر اندر بیضوی میز کے سرے پر جا بیٹھتے۔

ان کی خلیفہ ایک خاتون تھیں۔ وہ ہر آنے والے کو پہلے آئیے پہلے پائیے کے اصول پر ایک نمبر پکڑاتی تھیں۔ کمرے سے جونہی شاہ صاحب ریٹائر ہو کر اندر جاتے۔ مسائل پوچھنے والوں کو نمبر وار اندر بھیج دیا جاتا۔ گھر کے پیچھے میں شاہ جی، ان کی والدہ، بیگم ساجدہ، بیٹیاں اور بیٹے رہتے تھے۔

خاں صاحب جب تک ہم لوگوں میں رہے۔ سرفراز شاہ صاحب کا رشتہ خاں صاحب سے نہیں ٹوٹا۔ سدھارے تو وہاں سے خاں صاحب کے نام شاہ جی کے خط آتے رہے۔ سرفراز شاہ صاحب چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ تھے۔ بڑی فرموں میں پورے طور پر ان کا فنانس ڈیپارٹمنٹ سنبھالتے تھے لیکن کہیں ان کے اندر ایک ایسی تڑپ محسوس نہ آئی۔ نا آسودگی ضرور تھی جو انہیں ایک ان پڑھ مرشد کے پاس لے گئی۔

یہ مرشد انارکلی کی دہانے پر مسجد کے پیچھے گلی میں رہتے تھے۔ ان ہی مرشد صاحب نے شاہ جی کی تربیت کی۔ انہیں کشف کے دہانے پر لا کر کھڑا کر دیا اور خلق کی خدمت کی پڑیا چٹادی۔ یہی علم شاہ جی کے اس وقت کام آیا جب انہوں نے اقبال ناؤن میں لوگوں کے سوالوں کا جواب علیحدگی میں دینا شروع کیا۔ یہاں بیضوی میز کی سرے والی کرسی پر بیٹھتے

حسرت سنتے۔ پھر آنکھیں بند کر لیتے۔

تھوڑا سا لرزہ ان پر طاری ہو جاتا۔ وہ جیسے مستقبل کے پانیوں میں ڈوب کر موتی اور مونگے نکالتے۔ کبھی کبھی
ہاتھ آجاتی۔ عموماً دنیا داروں کو دولت، عزت، نوکری، تبدیلی، صحت کے مسائل درپیش ہوتے۔
ہر بابے کی طرح ہمیشہ یہی کوشش کی کہ انسان مایوسی کی طرف قدم نہ بڑھائے۔

میرے تینوں بچوں کی ایک بڑی مشکل یہ تھی کہ چھوٹی عمر میں انہیں بابوں اور ڈیروں سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ زیادہ
کیوں اور کم محنت کے باعث وہ اس طرح دنیا حاصل نہ کر پائے جس کی وجہ سے ان کا دین اور دنیا دونوں گنڈھ ہو
گئے۔ شروع میں تین بار خاں صاحب اشیر خاں کو شاہ جی کے ڈیرے پر ساتھ لے گئے لیکن پھر سرفراز صاحب نے اشیر میاں
شاہ صاحب کی انتہائی مہربانی کہ وہ چیری کو اپنی کار میں بٹھا کر ڈرائیو پر لے جاتے اور اس طرح
بستوں کی طرح سلجھاتے۔

یکدم شاہ جی اور خاں صاحب کا رشتہ سمر سالٹ کھا گیا۔ کہاں تو شاہ جی مرشد کے درجے پر تھے۔ اب وہ خاں
صاحب کو اپنا والد سمجھنے لگے۔ یہ رشتہ کچھ ایسا گہرا اور خفیہ تھا کہ جب شاہ جی لندن سدھارے اور وہاں جوق در جوق لوگ ان
سے غفلت حاصل کرنے لگے تب بھی خاں صاحب اور ان میں خط و کتابت جاری رہی۔ فون پر رابطہ رہا۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد یہ رشتہ کچھ دیر تو جوش و خروش سے جاری رہا لیکن جب وہ کیولری گراؤنڈ میں
موت ہو گئے اور ان کے عقیدت مندوں کی زیادہ یورش ہو گئی تو میں اکیلی یہ رشتہ نبھانہ سکی۔ ان کی بیگم ساجدہ نے البتہ مجھ
سے رابطہ رکھا۔ بنیادی طور پر ساجدہ ایک ادیبہ ہے۔ شاہ صاحب کی خواتین مرید نیاں جس ذوق و شوق سے ان کی طرف
موجھ کرتی ہیں، یہ رویہ ایک عام عورت کے لیے تکلیف دہ ہو سکتا ہے لیکن ساجدہ ادیب ہونے کے ناطے جلتی تو شاید
صحت کی طرح ہو لیکن سمجھوتہ کرنے کی اس میں صلاحیت تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ زندگی بہت سے رنگوں کی قوس قزح ہے۔
میں خاص اسے اپنی مرضی سے یک رنگی نہیں کر سکتا۔ سر جھکانے میں ہی عافیت ہے۔

ہر رمضان کی ستائیسویں کے دن ان کے چاہنے والے اقبال ناؤن میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں روزہ
کھانا کرایا جاتا ہے۔ دیکھیں پکتی ہیں۔ بالالتزام مردانہ، زنانہ الگ رکھا جاتا ہے۔ کھانا اور پھل وافر مقدار میں کھلایا جاتا
ہے۔ پہلے یہ تقریب شاہ جی کی رہائش گاہ سے ملحقہ سڑک پار کر کے گراؤنڈ میں منعقد کی جاتی تھی لیکن اب کچھ فاصلے پر ایک
گھاس کے اندر روزہ کھلوائی کی رسم جاری ہے۔

شاہ جی مردانے کا خیال رکھتے ہیں۔ بار بار عورتوں کی طرف آتے ہیں۔ ان کی مردت کا یہ عالم ہے کہ اتنی مصروفیت
کے وجود اگر کوئی عورت ان کی خصوصی توجہ کی طالب ہو اور کسی مسئلے کا حل چاہتی ہو تو وہ سب سے ہٹ کر کرسی پر بیٹھ جاتے
ہیں۔ ورد جاری رہتا ہے۔ وہ آنکھیں بند کر کے کسی ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں جہاں سے انہیں مسائل کا جواب پکڑنا ہوتا ہے۔

اب نہ اشفاق صاحب ہیں.....

نہ باباجی.....

نہ سخی رازی صاحب.....

نہ عفت..... نہ شہاب بھائی.....

سنا ہے دانش کا سلسلہ کبھی ٹوٹتا نہیں۔ حسین زنجانی کے جانے سے پہلے حضرت داتا علی بھومیریؒ کو لایا گیا۔ آرزو مل جاتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی پشت در پشت چلتا ہی چلا جاتا ہے۔ امید قائم رکھنے والے سلامت رہیں۔

(ڈیرے پر نوجوان نے آکر کہا، میں ترک دنیا کرنا چاہتا ہوں اور فقیری اختیار کرنا چاہتا ہوں۔ یہ زمانہ کبھی بکھیڑے، یہ ساز و سامان، یہ لٹم پٹم میرے بس کا روگ نہیں۔ جواب دیا گیا رہبانیت زندگی کے منافی ہے۔ اس سے راہب کو فائدہ پہنچتا ہے نہ اس کے ارد گرد کی دنیا کو۔ ہمارے دین اسلام میں اس کی سخت ممانعت ہے۔)

خال صاحب کہا کرتے..... ”ہمارے گھر کو تو چاہیے ہر وقت سجدے میں رہے۔ وہ کونسی نعمت ہے جو اللہ رب نے ہمیں دے نہیں رکھی۔ ہم اس سے اور کیا تقاضا کریں قدسیر۔“

کبھی کبھی کہتے ”جب اللہ یوں بھر دے تو پھر آدمی کبھی اوپر کے طبقے کو نہ دیکھے ہمیشہ نیچے والوں میں رہے۔ جہاں نعمتیں کم ہیں۔ ویسے بھی بابا جی نور والے فرمایا کرتے تھے۔ ”امیر آدمی کی خدمت میں رہنا اپنی مرضی سے وقت ضائع کرنا ہے۔“

چند دنوں سے میں ایک عجیب الجھن میں مبتلا ہوں۔ ہمارے یہاں کلچر پر بڑا زور دیا جاتا ہے۔ کلچر کی بجائے اپنی Roots کی تلاش کو دین سے مقدم گردانا جاتا ہے۔ لیکن.....

1- دین انسانیت کو آگے کی طرف لے جاتا ہے اور کلچر ماضی کی طرف۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ سورۃ رحمن میں سورۃ یسین میں مجھے ایک آیت ایسی بھی نظر آئی جس کا مطلب یہ ہے کہ ”اللہ کو ہر روز ایک نیا کام ہے۔“ اس آیت سے دین کا آگے ہی آگے بڑھتے جانا ثابت ہے۔

2- جب ہم کلچر کی بات کرتے ہیں تو ساگ روٹی، بیل گاڑی کا سفر، ہاتھ کی پٹکھی، پرانے کونوئیں کا نشہ، میلے ٹھیلے، پنگھوڑے بھنگڑے یاد کرتے ہیں۔

3- جب ہم اپنی روئیں کی طرف مراجعت کرتے ہیں تو ہم حاکم کو سجدہ کرنے، سونے کے کنگن پہننے، پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کرنے اور بیوہ کوستی کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

4- حضور سائیں صاحب اس سلسلے میں پیوند کا ذکر کیا کرتے تھے کہ جب پیوند لگ گیا تو زندگی ماضی سے علیحدہ ہو کر حال سے وابستہ ہوگئی۔ ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جاہلیہ کی رسوم ختم ہو گئیں۔

ڈیرہ پاک پر میری موجودگی میں حضور نے تین مرتبہ اس (پیوند) کا ذکر کیا مگر میں ہر مرتبہ ان سے قاصر ہونے کی وجہ سے ان کے الفاظ ٹھیک سے catch نہ کر سکا۔ پھر حضور کا بیان ایسا ہوتا تھا کہ چند جملے بول کر چپ ہو جاتے تھے۔ بہت سی باتوں کو ان کے سیاق میں جوڑنا پڑتا تھا۔ اس کام میں آپ ہی ہمارے موہڈی تھے۔ اس لیے ہم بھروسہ آپ سے رجوع کر لیا کرتے تھے۔ اب بھی آپ کی ویسی ہی ضرورت ہے۔

(خال صاحب کے کاغذات)

یہ چاند، سورج کا طلوع و غروب محض وقت کے احساس کی اکائی بنا لیے گئے ہیں اور ہم وقت کو ایک خارجی تھے

کے ہیں۔ فرض کریں کہ چاند سورج نہ ہوں تو کیا ہو۔ صرف اندھیرا، جو کہ مسلسل ہوگا تو گویا پھر ایک ہی جیسی کیفیت میں
کے تحت گزرنے کا احساس کیسے ہوگا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ انسان کا بچپن، بڑھاپا وقت کے چلنے کا احساس دلائیں
کے مگر انسان کی عمر میں تبدیلی کا یہ عنصر ختم کر دیا جائے تو پھر وقت کا احساس کیسے ہوگا۔ گویا Timelessness ایک جیسی
Physical State کو کہا جائے گا۔

یہ فرق زمان و مکان میں قید اور آزاد کرتا ہے۔

دراصل وقت ایک صدوری کیفیت ہے۔ یہ کہنا کہ کائنات ارتقاء میں ہے، غلط ہے۔ وقت صرف انسان کی
کی کیفیت ہے۔ اس کی ذات کے علاوہ کوئی چیز بھی اس اندرونی کیفیت سے باہر نہیں۔ تغیر اور ارتقاء اندرونی واردات
کے ہیں۔ ہر واردات میں نوعی سراپا کی نقلیں افراد کی شکل میں چھاپتی ہیں۔ چھپائی اندر رفتار میں ہے۔ اس رفتار کا نام
تہ ہے۔ اگر اس رفتار میں کمی بیشی ہو جائے تو اندر لنگڑا، لولا، اندھا چھینے لگتا ہے۔ حوادث اسی طرح رونما ہوتے ہیں۔

جب عارف کا ذہن ایک لمحے کے لیے صدوری کیفیت میں داخل ہو جاتا ہے تو بے اعتدالیوں دور ہو جاتی

ارشاد: سائیں کے پاس بیٹھا ہوں کہ ایک لنگڑا آدمی وہاں سے گزرتا ہے جو سائیں سے فریاد کرتا ہے، اسے
دیا جائے۔ سائیں ایک نظر اس کی طرف دیکھتا ہے تو وہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

ارشاد: اس واقعہ کی توجیہ دریافت کرتا ہے تو وہ اس کو مندرجہ بالا وضاحت دیتا ہے یعنی سائیں چھپائی کی رفتار

ba کر دیتا ہے۔

کسی کا دیوار یا کسی اور ٹھوس چیز سے گزر جانا۔

کائنات میں کشش ثقل ہی سب کو تھامے ہے اور اشیاء اسی ثقل کے باعث ایک دوسرے کی حرکت میں
پیدا کرتی ہیں لیکن ثقل لطیف اشیاء کے راستہ میں زیادہ رکاوٹ نہیں بنتی۔ اس طرح اگر کسی کا دماغ تجلی الہی میں
تھمے ہو جائے جو کہ نہایت لطیف ہے تو جسم ذہن کے تابع ہونے کی وجہ سے ثقل کی منزل سے آگے چلا جاتا ہے۔ اس
رح شوش اشیاء میں سے انسان گزر جاتا ہے۔

ایک سے زیادہ جگہوں پر ایک ساتھ نظر آنا۔

اس کی مثال فوٹو ہے۔ اس میں پہلے نیگٹیو تیار کیا جاتا ہے۔ پھر پوزیٹو بنایا جاتا ہے۔ ایک نیگٹیو سے ہم جتنی
تصویریں تیار کر سکتے ہیں۔ یہی حال روح کا ہے۔ روح ایک Negative ہے اور گوشت کا جسم اس کا پوزیٹو۔ اگر
کسی شخص کے ذہن کا Lense مصفی اور طاقتور ہے تو چاہے تو وہ خود کو یعنی روح کو پوزیٹو کی شکل میں کئی جگہ ظاہر کر سکتا ہے۔
سری مثال ٹی وی ہے۔ اولیاء اللہ اس علم روح کی نشریات کو بیک وقت کئی سکریٹوں پر متحرک کر دیتے ہیں۔

روح

پوری کائنات اور اس کے اندر تمام مظاہرات ایک سرکل میں سفر کر رہے ہیں اور ہر شے دوسری سے متعارف
ہے۔ تعارف کا یہ سلسلہ خیالات پر مبنی ہے۔ کائنات کی ہر شے دوسری کو ”فکر“ کی لہروں کے ذریعے سے جانتی ہے۔

سائنس دان روشنی کو تیز ترین سمجھتے ہیں مگر تفکر کی لہریں ان فاصلوں کو حاضر ہی نہیں سمجھتی جن کو روشنی کم کرتی ہے۔ اس سلسلے میں حضرت سلیمان کی مثال دی جاسکتی ہے۔ جب انہوں نے ملکہ سبا کے آنے سے پیشتر اس کے تخت کو منگوانے کو کہہ دیا تو اس نے کہا کہ میں آپ کے دربار پر خاست ہونے سے پہلے وہ لاسکتا ہوں جبکہ ایک اہل علم نے پوک جھپکنے میں وہ تخت حاصل کر دیا۔

دراصل اس آدمی کے خیال کی لہریں تخت کے اندر کام کرنے والی لہروں میں جذب ہو کر تخت کو منتقل کرنے کے ذریعہ بن گئیں۔ اس طرح حیوانات اور جمادات صرف تفکر کی لہروں سے گفتگو کرتے ہیں۔ سائنس نے کائناتی تفکر کو تیز کرنے کا نام دیا ہے۔ تصوف میں اس کو روح کا نام دیا گیا ہے۔ مکمل موت نہ تو انائی پر وارد ہوتی ہے نہ روح پر۔ روح کو جو علم و وحی دیا گیا ہے وہی خیالات، تصورات اور احساسات بنتا ہے۔ یہ دونوں لہروں اور شعاعوں پر ہر وقت مصروف عمل رہتے ہیں۔ ہمارا ذہن ان لہروں کو پڑھنے اور ان کو حرکت دینے پر قدرت حاصل کر لے تو ہم کائنات میں تصرف کر سکتے ہیں۔

دریائے وحدت

چاروں طرف آسمان کے اوپر دائرے میں نور کا دریا بہ رہا ہے۔ یہ دنیا سے بالکل قریب ہے۔ یہ وحدتِ وحدت ہے، اس میں سے آواز آتی ہے..... ”لوگو! اٹھو۔ میں تم سے بہت قریب ہوں۔ جاگوتا کہ میں تمہاری مشکل آسان کروں۔ تم پر رحمت کروں۔“

اس میں لوج محفوظ کا ایک مقام ہے۔ یہاں سے اللہ کے احکامات دنیا پر نازل ہو رہے ہیں۔ یہ روشنی کا شکل میں ہیں۔ اس مقام پر دنیا کے ہر فرد کے متعلق احکامات کا ذخیرہ ہے۔ اس ذخیرہ سے روشنی کی لہریں دھار کی شکل میں نکل کر اس فرد کے اندر داخل ہو رہی ہیں۔ یہ تمام نظام آٹومینک ہے (گن گن گن گن.....) جہاں سے آٹومینک قمر کے تحت روشنیاں (احکامات کی) ہر ہر فرد تک پہنچ جاتی ہیں۔

تجلی ذات کے نقطہ وحدانی سے 11,000 صفات الہیہ کی روشنیاں حکم گن کے ذریعے نکلتی ہیں اور بارہ برجوں میں تقسیم ہو جاتی ہیں یعنی 12 ستارے، 12 برج بن گئے اور ایک برج میں اس ستارے کے ماتحت اربوں گھر بن گئے۔ ستارے آگے اور ان سب کو برج کے لیڈنگ ستارے سے روشنی تقسیم ہوتی ہے۔ اس طرح ایک ایک نقطہ وحدانی کے بارہ برج ہیں۔ اس سے کائنات کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ خیال بھی کہ کیا اتنی بڑی کائنات میں محض ہماری تہمت پر زندگی ہے؟ نہیں بلکہ ہزاروں عالمین اور ہیں۔ ہر عالم کا ایک جدا گانہ رنگ ہے۔ جیسے ہماری زمین پر آسمانی رنگ ہے۔ کیونکہ ہر عالم میں مختلف صفات کام کر رہی ہیں۔ اس لیے رنگ مختلف ہیں۔ زمین ہی کی طرح زندگی، فرانسے، باغات ہیں۔ ہر شے کی حقیقت اللہ کی نگاہ میں ایک ہے۔ روزِ ازل سے اللہ نے ہر شے کو جس قانون اور فارمولے کے تحت پیدا کیا تھا۔ اس میں ابد تک کسی رد و بدل کا اندیشہ نہیں۔ عالمین میں ہر شے کا وہی متعین فارمولا ہے جو ازل میں تھا۔ اس شے کی حقیقت ہے۔

درود شریف

درود شریف ایک خاص نور کی دھار ہے جو خاص تناسب رکھتی ہے۔ جب اسے پڑھا جائے تو یہ لہر فوراً ستر کے

تک پہنچ جاتی ہے اور حضور اس شخص کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ درود شریف روشنی کی وہ لہر ہے جس کا کنکشن حضور سے ملتا ہے۔

اگر ڈرامے میں درود شریف پڑھاتے دکھائی دے تو اس طرح کہ لائن میں لوگوں کے ماتھوں میں دیئے ہوں یا کھینچے ہوئے ہوں اور جیسے جیسے وہ شخص درود شریف پڑھے۔ ایک کے بعد ایک بلندی کی طرف رہے۔ روشن ہوں اور آسمان کی طرف روشنی جائے۔ (اندھیرے میں) یاد یہ منورہ کی طرف جاتے ہوئے دکھایا جائے۔

اگر آپ نور کی فضا کائنات میں دکھائیں تو ایسے کہ ایک کالی چادر یا کاغذ پر ”محمد ﷺ“ لکھیں کر کے لکھیں اور اس طرح کمرے سے دکھائیں کہ کائنات پر محیط نظر آئے اور ہر لفظ سے روشنی کی لہریں نکل کر لوگوں تک پہنچ رہی ہوں۔ جب خدا سے جو کچھ بنائی تھی اس سے بہت پہلے یہ لفظ نور کی فضا میں لکھ دیئے گئے تھے۔

اگر آپ یہ دکھانا چاہیں کہ سائیں یا صاحب ارشاد کسی کو نسبت دے رہے ہیں تو نسبت عطا کرنے والے کے لئے روشنی کی لہر دوسرے کے دل میں جذب ہو جائے گی۔

لائٹوں کے ذریعے سر کے اوپر روشنیاں ڈال سکتے ہیں۔ اگر ارشاد دائرے میں ہے، اس کے اطراف دائرے سے روشنیاں حرکت کرتی ہوئی دکھائیں یا کمرے میں پتلی روشنی کی دھار جو باریک ٹارچ سے ڈالی جاسکتی ہے، جو جلتی بجھتی ہے۔ کبھی ایک طرف کبھی دوسری طرف۔

کیونکہ روشنیاں باشعور ہیں۔ وہ گفتگو بھی کرتی ہیں۔ آپ ارشاد کی کسی روشنی سے گفتگو دکھا سکتے ہیں۔ روشنی کے شمار ہی ہو۔ آپ دل کی صفائی ایسے دکھا سکتے ہیں کہ پہلے دل کو کالا دکھائیں، پھر نور سے وہ آہستہ آہستہ سفید چمکدار بن جائے۔

لطفائف ستر سے ہر شخص روشنی حاصل کرتا ہے جو کہ تصوف میں کام آتی ہے۔ سائیں اپنے لطفائف ستر سے روشنی دے سکتا ہے۔ ان مقامات سے روشنی کی دھاریں نکل کر ارشاد میں جذب ہو سکتی ہیں۔

آپ ارشاد کو یا کسی کو نور کے دریا می دکھا سکتے ہیں۔ سفید دھوئیں میں ڈوبا ہوا دکھا دیں۔

آپ مختلف رنگوں کی روشنیاں دکھانے کے لیے اندھیرے میں مختلف رنگ کے بلب استعمال کر سکتے ہیں۔

آپ نور کی بارش دکھا سکتے ہیں۔ لائٹ آبشار کی طرح گرے۔

تصوف کا طریقہ یہ ہے کہ سائیں یا مرشد اپنے دل میں ارشاد کے دل کی طرف لائٹ بھیجتا ہے۔ یہ دھاریں جمع ہوتی ہیں تو جس پر پڑتی ہیں اس میں Charge پیدا کرتی ہیں جیسے کوئی بیمار ہے، اس کے دل پر جا کر اس کے دل میں حرکت پیدا کرتی ہیں۔

آپ کسی کو ایسا خواب دیکھتا دکھائیں کہ وہ لائٹ کی دھار پر جتی ہوئی آسمان پر پہنچے۔ ایک کمرہ میں داخل ہو جہاں بہت سے لوگ مشینوں پر ہوں۔ دیوار پر تصویریں ہوں۔ وہ ان سے پوچھے کہ یہ تصویریں کیوں ہیں تو وہ دکھائیں کہ یہ طرح تصویر ڈال کر ہم روزانہ اس شخص کے اعمال کا جائزہ لیتے ہیں۔ مومن کی تصویریں کمپیوٹر میں ڈالیں تو جلدی جلدی کی زندگی ٹی وی پر دکھائیں اور بتایا جائے کہ ہم انسان کے اعمال کے مختلف خانے ہیں اور ہم روزانہ اس میں اس کے

اعمال کی Marking کرتے ہیں۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ اسے اصلاح کی طرف لائیں۔

خواب اور بیداری میں فرق

ہماری روح کی بناوٹ ایسی ہے کہ وہ ہر لمحہ مضطرب ہے۔ دن میں تو ہم کام کرتے ہیں مگر رات کو جب سو جاتے ہیں تب یہ روح اپنے لباس میں یعنی جسم مثالی کی شکل میں حرکت کرتی ہے اور تمام کام کرتی ہے مگر ہمارا جسم چونکہ سو جاتا ہے، اس لیے اسے خواب کا نام دیا جاتا ہے۔ مادی جسم کشش ثقل میں قید ہونے کے باعث محدود ہوتا ہے جبکہ جسم لطیف ہونے کے باعث کائنات کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آسانی سے پہنچ جاتا ہے۔

زمان و مکان کی تھوڑی کو ڈسکس کریں، جو کہ پہلے والے پیرز میں تفصیلاً ہے۔

دراصل زمان و مکان ایک دوسرے کے ساتھ چپکے ہیں۔ ایک سکے کے دو رخ ہیں اور مکانیت، زمانیت، طرح سے تیل بوٹے بنے ہیں اور یہ ایک مشین پر ایک ساتھ چھپ رہے ہیں۔

واقعہ سورج

تیز رفتار سواری ہو تو وقت کم لگتا ہے۔

یہ تمام کائنات اللہ کے نور سے بنی ہے اور ہر شے میں اللہ کا نور مختلف متعین مقدا روں میں کام کر رہا ہے۔ چاند ستارے سب اللہ کے نور سے روشن ہیں۔

اس کائنات میں مختلف لہریں کام کر رہی ہیں۔ ان میں سب سے اہم اور تیز رفتار، تفکر کی لہریں ہیں۔ کائنات قائم ہے۔ اسی کے ذریعے سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ تفکر کی لہر فرش سے عرش تک ایک لمحہ میں سفر کرتی ہے اور یہی لہر تصرف کی قوت حاصل کر کے انسان کو عرش تک پہنچا دیتی ہے۔

زمان و مکان Related ہیں۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ آپ کو پیدل جانے میں جتنا وقت لگتا ہے۔ سائیکل رکشہ، جہاز استعمال کریں تو وقت اتنا ہی کم ہو جائے گا، فاصلہ وہی رہے گا۔

کشش ثقل کا قانون

تخلیق کا قانون ہے کہ مرد اور عورت دونوں کا وجود دونوں پر قائم ہے۔ اگر آدم میں حوا نہ ہوتی تو آدم پیدا نہیں ہو سکتا۔ دوسری مثال مریم سے حضرت عیسیٰ کی ہے۔ فرد میں ایک پرت مغلوب اور دوسرا غالب رہتا ہے۔ مغلوب اور پرت اپنے آپ کو مکمل کرنے کے لیے دوسرے کی تلاش میں رہتا ہے۔ اسی سے جنس مخالف میں کشش پیدا کرتا ہے۔

زمان ماضی ہے۔

سمجھا جاتا ہے کہ زمانہ گزرتا ہے حالانکہ زمان ماضی (ریکارڈ) ہے حال اور مستقبل ماضی کے اجزاء ہیں۔ جو کچھ ہونے والا ہے قلم اس کو لکھ کر خشک ہو گیا ہے۔ زندگی گزارنے کے دو طریقے ہیں۔ زمان متواتر اتوار، پیر.....) شعوری ہے۔ دوسرا وہ جہاں زمان لا حساب ہے جیسے کہ خواب ہیں۔

اصل میں زندگی کی نغمہ بنائی گئی ہے اور اب لوح محفوظ سے سکریں پرری پلے کی جا رہی ہے۔

جیسے سینما میں ہم فلم میں ماضی، حال، مستقبل کا سوچتے ہیں مگر اصل میں تمام فلم ماضی میں بنتی ہے۔ یہی حال ہے۔ تم کو چلایا جا رہا ہے، سب کردار اپنا کام کر رہے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب کا خط اشیر کے نام

لندن

11 فروری 1983ء

پیارے بیٹے اشیر! السلام علیکم۔ تمہارا خط ملا۔ کئی بار پڑھا۔ افسوس صرف یہ ہوا کہ یہی صورت حال پہلے ہی بتادی تھی۔ میری مانو تو کسی عامل یا مجذوب وغیرہ کے پاس جانے، ان سے کچھ کھانے پینے یا تعویذ لینے کی ہرگز ہرگز کوئی نصیحت نہیں ہے۔ ارے بیٹا! اگر کسی لڑکی سے محبت ہوگئی تو کیا ہوا لیکن اس سے آگے تم نے پوری طرح نہیں لکھا کہ نصیحت کیا ہے اور کس نوعیت کی ہے۔ مجھ کو ذرا اور Confidence میں لے کر پوری طرح بتاؤ کہ مصیبت کیا ہے جسے تم نصیحت سے محسوس کر رہے ہو؟ اس کے بعد ہی تفصیل سے کوئی مزید مشورہ دے سکوں گا۔

یوں وسوسوں کی حد تک کسی پریشانی کی ضرورت نہیں ہے۔ آتے ہیں تو آنے اور گزر جانے دو۔ ان کی طرف سے نصیحت بھی نہ دو۔ نماز، سورہ حشر کی آخری رکوع کی آیات باقاعدگی سے پڑھتے رہو لیکن اعتدال کے ساتھ، بہت زیادہ نصیحت سے نہیں۔

زندگی کی مسرتوں کی اصلی کنجی اعتدال میں ہے یعنی ہر چیز میں نارمل رویہ اختیار کرنے کی۔ عبادت میں بھی، نصیحت میں بھی، دیگر ہر شے میں بھی۔

میں تمہارے اگلے خط کا بے چینی سے انتظار کروں گا۔ اس وقت تک انشاء اللہ میں آنکھ کے آپریشن سے بھی نصیحتوں کو چمکا ہوں گا۔ اگر تم واقعی مجھے اپنے Confidence میں لینے کے قابل سمجھتے ہو تو ضرور لکھنا۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ اللہ تمہاری کوئی ایسی پرابلم یا مصیبت نہ رہے گی جو حل ہو کر بہت جلد دور نہ ہو جائے۔ فی الحال کالج کی پڑھائی سب سے چیز میں مقدور بھر نارمل حد تک دل لگائے رکھو۔ تمہارے لیے دل سے دعا کرتا ہوں۔ میرے لیے بھی دعا کرنا۔ تمہارے اگلے خط کا جواب انشاء اللہ زیادہ تفصیل سے لکھوں گا۔

نانا، اشفاق اور بانو کو سلام۔ نوتی اور کیسی کو پیار۔

تمہارا

قدرت اللہ شہاب



برکے ایکسچینج

Berkeley Exchange

ابھی ہمیں داستان سرائے میں آئے بمشکل چار سال ہوئے تھے کہ برکے Exchange کے تحت ہمارے پاس میں ایک نئی تبدیلی رونما ہوئی۔ ڈیرہ پاک پر آپ نے شمس سے ملاقات کر ہی رکھی ہے لیکن اب کچھ سالوں کے لیے گھر پر گویا امریکیوں کا راج ہو گیا۔ برکے سے شاگردوں کا تبادلہ پاکستان اور پاکستان سے ادیبوں، طالب علموں کے قابل ذکر لوگوں کو امریکہ سے متعارف کرانے کا پلان تھا۔

خاں صاحب اس پروگرام کے تحت 1963ء میں مدعو ہو چکے تھے۔ اب میزبانی کی ہماری باری تھی۔ پاکستانی گھروں میں بطور مہمان رکھنا، انہیں اردو پنجابی سے یہاں کے رسم و رواج، رہن سہن سے شناسائی عطا کرنے کے لیے روپے پیسے کی پہچان عطا کرنے کی یہ ایک معمولی سی کوشش تھی۔ مجھے اس پروگرام کی تفصیل معلوم نہیں تھی نہ مجھے اسے انفرمیشن ہی لینے کی عادت تھی۔

ایک دن خاں صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے ”قدسیہ! مجھے معلوم ہے تمہارے پاس کام زیادہ سے زیادہ میں کسٹ ہو چکا ہوں۔ تمہارے پاس کل ایک مہمان آئے گا۔“

”ٹھیک ہے آنے دیں..... بس اُسے یہ بات ضرور بتادیں کہ میں اُسے گفتگو سے entertain نہیں کرتی۔“

”ٹھیک ہے..... ویسے بھی وہ پڑھنے لکھنے کا شوقین ہے۔ اپنے میں مگن رہے گا۔ کبھی کبھی میں اُسے ڈیرہ لے جایا کروں گا۔“

باب ہیز پہلے غالباً Y.M.C.A. میں اُترا۔ پھر خاں صاحب اُسے گھر لے آئے۔ ابھی شہاب صاحب کا سنی کمرہ خالی تھا۔ باب کو اس میں ٹھہرا دیا گیا۔ دُبلے پتلے دراز قد مہمان سے متعارف ہونے میں دیر نہ لگی۔ اُس کسی کھانے کے لیے اصرار نہ کیا نہ مجھ سے کسی چیز کی فرمائش ہی کی۔ مجھے ایک واقعہ اچھی طرح سے یاد ہے۔ روزوں کے دن تھے۔ بچے تک پابندی سے روزے رکھ رہے تھے۔ میں دوبارہ صبح اُٹھ کر باب کے لیے

تعمیر یہ ناشتہ عموماً انڈے پر اٹھے تک محدود ہوتا۔ کبھی کبھار اس میں مکھن تو س کا اضافہ کر دیا جاتا۔ میں ناشتے پر اس
 سے بچنے جاتی، کبھی بچوں کو خدا حافظ کہنے گھر کے کام کاج میں مصروف ہوتی تو وہ اکیلا ہی ناشتہ کر لیتا۔

ایک دن صبح وہ برآمدے میں آیا۔ خاں صاحب اردو بورڈ جانے والے تھے۔ باب نے اشارے سے انہیں
 محبت سے انگریزی میں بولا..... ”اشفاق! کل سے میں آپ لوگوں کے ساتھ سحری کھاؤں گا اور رات کو روزہ افطار

”

”اوناں بھائی ناں۔ تم اپنا معمول جاری رکھو۔ ایسی مصیبت کی ضرورت نہیں۔“

”لیکن میں ایسا کرنا چاہتا ہوں۔“

”تو کیا تمہارا عقیدہ بدل گیا ہے؟ مسلمان تو نہیں ہو گئے کہیں؟“

”جی نہیں! ابھی تک نہیں..... ابھی تک میں Eck Anker کی تعلیم پر کار بند ہوں۔“

”پھر یہ روزے کس لیے؟“

”بات یہ ہے خاں صاحب! کہ اسی کام کے لیے تو میں پاکستان آیا ہوں۔ یہاں کے رسم و رواج کو قریب سے

مکھن مکھ ڈوب کر دیکھوں..... اور غور سے دیکھنے کے لیے عمل میں داخل ہونا ضروری ہوتا ہے۔“

لوجی طے ہو گیا۔ باب نے بڑے اطمینان سے روزے رکھے اور سحری اور افطار ہم لوگوں کے ساتھ مل جل کر

کے سے کھاتا رہا۔ عید سے کچھ دن پہلے جب بچوں کے عید کے جوڑوں کی تیاری شروع ہوئی تو خاں صاحب نے

”باب سے پوچھ لو اس کے لیے کیا چاہئے۔“

”جانے دیں خاں جی..... ہم اس طرح کی مہمان نوازی afford نہیں کر سکتے۔ پھر وہ نہ جانے کس مذہب کا

”

”بھائی! وہ Paul Tillich کا پیروکار ہے جس نے انسان کی روح کی تربیت کا طریقہ ایک تہی رپیزار گرو

”اس میں گرو کی بہت اہمیت ہے۔ مرشد کی توجہ سب کچھ ہے..... آج کل ڈارون نامی ایک امریکن پال ٹلش کا

”تعمیر ہے اور باب اسی کا پیلا ہے۔“

”لیکن مجھے کیا لینا ہے ڈارون سے یا ٹلش سے۔ جس راستے پر جانا نہیں اُس کا نام کیا لینا۔“

لیکن باب سے کپڑوں کے متعلق بات کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ دوسرے دن وہ میرے پاس باورچی خانے

”بانو! کیا آپ میرا ایک کام کر سکتی ہیں؟“

”کیا باب؟“

”مجھے عید کے لیے ایک شلوار قمیض بنوادیں گی۔ میں پیسے دے سکتا ہوں۔“

”وہ کیوں باب؟“

”میں خاں کے ساتھ عید گاہ جاؤں گا۔ سب کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔“

”مجھے اس ادا پر تعجب تو ہوا لیکن میں نے ازراہِ تفضن کہا ”اچھا تو بھلا کیا رنگ پسند کروں..... گہرا سبز بنوادوں؟“

”گہرا سبز بھی برا نہیں..... یہ گھاس کا درختوں کا خدا کی روئیدگی کا رنگ ہے لیکن مجھے ہلکا نیلا رنگ پسند ہے۔ آسمان کی طرح بے گراں بے پناہ۔“

”جی.....؟ لیکن روز قیامت یہ گلابی ہو جائے گا..... تو گلابی میں کیا ہرج ہے باب؟“

وہ مسکرایا..... ”لیکن روز قیامت تو ابھی آیا نہیں۔“

باب ہیز کا جوڑا مع ٹوپی کے تیار ہو کر آ گیا۔ عید کے روز سب صبح ساڑھے سات بجے عید گاہ جانے کے تیار ہوئے تو آہستہ سے انیق بیٹے نے خوف بھری آواز میں کہا ”مجھے عید کی نماز پڑھنا نہیں آتی۔“

ابو نے تو پتہ نہیں یہ بات سنی یا نہ سنی۔ باب ہیز فوراً بولا..... ”انیق! تم کو کچھ نہیں کرنا بس مجھے دیکھتے جاؤ۔ میں رکوع میں جاؤں تم بھی چلے جانا..... جب میں سجدہ کروں تم بھی سجدہ کر لینا۔“

شاید خاں صاحب بھی یہ Ritual بھول چکے تھے۔ اُن کے لیے بھی سہولت ہو گئی۔

ہمارے گھر میں یہ رواج ہے کہ عید کے دن میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر قرآن کریم لے کر کھڑے ہوں۔ جو نبی مرد حضرات مسجد سے لوٹتے ہیں وہ اس قرآن کریم کے نیچے سے گزر کر مجھے عید مبارک کہتے ہیں اور وصول کرتے ہیں۔ اس میں عمر کا التزام ضرور رکھا جاتا ہے۔ یعنی سب سے پہلے گھر کا سب سے بڑا داخل ہوتا ہے۔ قطار میں باری باری سب آ جاتے ہیں۔

ڈرائنگ روم میں ہی دو چھوٹی میزوں پر یا ٹرولی کے اوپر سویاں، نمکین دال اور سموسیاں وغیرہ پہلے سے رکھی جاتی ہیں۔ مسجد سے واپسی پر قرآن کریم کے نیچے سے گزر کر اپنی اپنی عیدی وصول کر کے سارے مرد کھانے میں بیٹھ جاتے ہیں۔

جس عید پر باب ہیز مسجد گیا تھا۔ وہ بھی خاں صاحب کے ساتھ واپس لوٹا۔ پہلے خاں جی اندر داخل ہوئے۔ باب اس کے بعد ترتیب وار تاجدار غفار، ثار گھر کے اندر آئے۔ سب نے سادہ چیزیں کشمیری چائے کے ساتھ پیش فرمائیں۔ بچوں نے سویاں سموسیاں کھانے کے بعد شربت پیا۔ انہیں ابھی کسی قسم کی چائے کا چسکا نہیں پڑا تھا۔ یہ سب سادہ چائے۔

سردیوں کے دن تھے۔ پچھلی لان میں بڑی خوشگوار گرم ڈھوپ پڑتی تھی۔ کبھی کبھی میں بال دھو کر کھانے کے لیے باہر آ بیٹھتی۔ یہیں بیٹھ کر شتو جی اور میں مونگ پھلیاں اور ریوڑیاں اور عمو مانگنے چوسا کرتے تھے۔ اسی مزے پر میں بچے کرکٹ کا شوق پورا کرتے۔

ایسی ہی بیٹھکوں کے دوران باب مجھ سے Sandy کی باتیں کیا کرتا۔ وہ شادی کے بغیر سینڈی کے ساتھ تھا۔ دونوں اکٹھے سفروں پر جاتے۔ ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں بسیرا کرتے اور اس Living together پرستہ تھے۔ نہ والدین نہ اُس کی اپنی ذات ہی نے کبھی کوئی اعتراض کیا تھا۔

باب ہیز کو اپنے والدین سے بڑی شدید محبت تھی۔ وہ بڑے لاڈ سے اُن کی باتیں کیا کرتا۔ لیکن کسی بھائی بہن کا ذکر میں نے کبھی اُس کے منہ سے نہیں سنا۔

ان ہی دنوں میری کتاب "امریل" کی رونمائی ہوئی۔ میں شہرت نام و نمود کی خواہشمند نے ایک روز فیض سے استدعا کی کہ وہ میرے اس فنکشن کی صدارت کر دیں۔

"ناں بھائی ہمیں تمہاری کتاب پڑھنی پڑے گی۔"

"تو پڑھ لیں کچھ ایسی بری بھی نہیں۔"

"چلو پڑھ لیں گے۔" فیض صاحب نے ان مانے جی سے صدارت کے لیے حامی بھری۔

اور فنکشن کا دن آ پہنچا۔ الحمر ہال جو ان دنوں چھوٹا سا تھا اس میں فنکشن ہوا۔ باب ہیز نے اپنے طور پر از خود مضمون لکھنے کی آفر دی۔

مضمون پڑھنے والے کم تھے۔ فنکشن غریبانہ تھا۔ البتہ خاں صاحب اور باب ہیز نے میری حوصلہ افزائی پر جوش لیا تھا۔ باب کا مضمون پڑھ لیجئے اور پھر اپنا سا اندازہ لگا لیجئے کہ ہماری میزبانی کا اس نے کیسے صلہ دیا؟

"باوجود اس کے کہ میں بانو قدسیہ کو بہت تھوڑے عرصے سے جانتا ہوں، لیکن ان کی شخصیت ایسی ہی ہے۔ ملنے سے محسوس کرنے لگتا ہے جیسے وہ ہمیشہ سے انہیں جانتا ہو۔ گوانتے تھوڑے عرصے میں کسی کے متعلق کچھ جانتا اور کسی کے گونے کرنا قریب قریب ناممکن ہے، پھر بھی میں ان کی شخصیت کے کچھ پہلوؤں سے ایسے متاثر ہوا ہوں کہ چند دنوں کے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

جب تک New Critics کی تحریک ترقی پر رہی فنکار کی شخصیت پر کچھ کہنا حرام تھا۔ لیکن اب ہم اس بات کو سمجھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ فنکار اور اس کے فن کو علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ رقص اور رقص کرنے والا دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ یہ دونوں کچھ میں آنے لگی ہے کہ فن اپنے واضح مطلب کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے۔

فن ایک خاص سطح پر آ گا ہی ہے۔ ایک قسم کا شعور عطا کرنے والا ہے اور کوئی فن محض اس لیے کامیاب نہیں ہوتا ہے جو خوشی کے ساتھ آ گا ہی کی اس سطح کو بیان کر رہا ہے بلکہ اس کی عظمت اس میں ہے کہ وہ سطح بجائے خود ایسی ہو جو محسوس ہو اور ارفع اور اعلیٰ بھی۔

مشرق کو ازل سے ہی یہ بات معلوم ہے کہ روحانیت کی بنیاد ایک فنکار کے لیے ناگزیر ہے کیونکہ تخلیقی قوت خود روحانیت کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ بانو قدسیہ میں روحانیت کی صلاحیت بہت زیادہ ہے۔ روحانیت سے میری مراد کسی خاص رسم و رواج کی پابندی نہیں بلکہ ایسی روحانیت جو زندگی کی فراوانی سے پیدا ہوتی ہے۔ شدید طور پر وقوف کردہ فن جو محبت سے جنم لیتی ہے۔ بے غرضی سے ابھرتی ہے۔

عورت کی زندگی بجائے خود اس کا فن ہے۔ بانو قدسیہ اس حقیقت کو سمجھتی ہیں اسی لیے وہ لکھنے سے کسی قدر بدکتی ہیں لیکن ان کی وسعت نظر اور روحانیت کی فراوانی نے ہمیں نہ صرف کسی ایک زندگی کی بصیرت بخشی ہے بلکہ کئی فنکاروں میں جھانکنے کا موقعہ دیا ہے۔ اپنی کہانیوں میں انہوں نے اس بات کو واضح کیا ہے جو ہر ایک پر واضح ہونی چاہئے کہ اس کا کام صرف آزادی نسواں نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ روح کی نجات کا ہے۔"

خاں صاحب جس طرح دسترخوان پر وال چپاتی بھی دوسروں کے ساتھ مل کر کھانے میں خوشی محسوس کرتے تھے ویسے ہی باباجی کو بھی دوسروں سے share کرنے میں انہیں راحت ملتی۔ ایک روز میں نے باب ہیز کو جینز اور سر سے نیلے باہر والے برآمدے میں منتظر پایا۔

”کہاں کے ارلوے ہیں باب؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں؟“

”میں اور خاں صاحب تو باباجی نوروالے کے پاس جا رہے ہیں۔“

باب نے ہولے سے جواب دیا ”مجھے معلوم نہیں مجھے اشفاق تیار رہنے کے لیے کہہ گئے ہیں۔“

میں نے خاں صاحب کی Surprise ضائع کر دی۔ ہم تینوں نے دھرم پورہ کا رخ کیا۔ ڈیرہ پاک کے باورچی خانے کی سڑک کے ارد گرد اللہ کی مخلوق ہمیشہ کی طرح بے ترتیب گروپوں میں بیٹھی تھی۔ بکریاں چاہے کھائیں۔ کچھ لوگ گھاس کھودنے، تراشنے میں مصروف تھے۔ خاں صاحب آگے آگے تھے۔ کچھ فاصلے سے شوقی نے آواز میں کہا:

”السلام علیکم باباجی.... آج میں آپ کے لیے ولایت سے ایک مہمان لایا ہوں۔“

باباجی نے دایاں بازو اٹھا کر سلام کا جواب دیا۔ ”نوروالے اپنا ولی ہمیشہ ولایت ہی سے آتے ہیں۔“

خاں صاحب نے یہ جملہ ترجمہ کر کے باب کو سنایا تو اُس کا چہرہ سردی کے باوجود پسینے سے بھیگ گیا۔

”آؤ پت آؤ!“

ہم نے بیٹھنے کی کوشش کی تو باباجی بولے ”یہ آدمی کھرا ہے.... اسے نیچے لے جائیں.... ہم ابھی آتے ہیں۔“

ڈاکٹر فاضلی ہمیں نیچے لے گئے جہاں ہم نے ہمیشہ کی طرح سیر ہو کر لنگر کھایا۔ سرخ چائے پی کر

ملاقات یہاں ہی باباجی سے ہوئی۔

”آ جاؤ آ جاؤ بلکہ ضرور آ جاؤ۔“

”میں آپ کو اپنی کچھ ٹھیس دکھانا چاہتا تھا، بڑی چھوٹی عمر سے یہ نظمیں میرے اندر کھلباتی تھیں۔“

دیکھیں گی۔“

کچھ دیر بعد اسی برکلے پروگرام کے سلسلے میں ایک لڑکی جس کا نام Cathy تھا ہمارے پاس آ کر ٹھہری۔

صاحب نے اُس کا نام ”نوری“ رکھ دیا۔ بھولی بھالی صورت، کھوئی کھوئی سی صورت نیچے گول میڑھیوں کے پاس

رہتی۔ جب کسی کو وقت ملتا وہ اُس سے باتیں کر لیتا ورنہ لا تعلقی کے ساتھ فضاؤں میں جھانکتی رہتی۔ وہ آرام سے

کمرے میں ہی رہنے لگ پڑی۔

Cathy کے بعد برکلے طالب علموں کے Exchange پروگرام کے سلسلے میں ایک اور لڑکی ماریسا

ماڈل ٹاؤن ہی میں ایک گھر میں رہائش پذیر تھی۔ وہ ہمارے گھر آتی جاتی۔ کبھی کبھی رات بھی رہ جاتی۔ ایک

سب ہیروزان دونوں کا نمائندہ بن کر ہمارے پاس آیا۔ خاں صاحب ڈھوپ میں بیٹھے موگ پھلیاں کھانے میں مصروف تھے۔

”اشفاق! اگر تمہارے لیے تکلیف نہ ہو تو فرید الدین گنج شکر کے مزار پر لے چلو۔ ماریا وہاں پاکپتن شریف کے مزار پر حاضری دینا چاہتی ہے..... لیکن اگر نہ جاسکو تو ہمیں ٹرین پر سوار کرادو..... ہم خود چلے جائیں گے۔“

خاں صاحب نے فوراً ساتھ چلنے کی حامی بھر لی۔

میں دل میں سوچنے لگی کہ یہ لوگ کون ہیں۔ ان کا امریکہ کی اکثریت میں کیا مقام ہے۔ کیا مادی ترقی کے داعی ہیں۔ یہ لوگ الٹا پیہرہ چلا رہے ہیں؟ سائنسی ایجادات کے زمانے میں روح کی فلاح کے متلاشی ہیں؟

خاں صاحب نے اپنی بڑی آفاقی فرحت کو اطلاع دی تو انہوں نے جواباً فون پر کہا کہ مہمان ایک رات آپ کے ساتھ رہیں گے۔ پھر دوسری صبح وہ اپنی گاڑی پر ہمیں بابا فرید الدین گنج شکر کے مزار پر بھجوادیں گی۔

شیڈول کے مطابق ہم منگمری پہنچے۔ ابھی اس کا پاکستانی نام ساہوال نہ چلا تھا۔ صبح تیار ہو کر ہم پاکپتن شریف کے مزار پر پہنچے۔ سب اپنے اپنے طور پر ننگن ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد میں نے ماریا کو ڈیکھا تو میری تعجب سے اس کی شکل گئی۔ ماریا کی آنکھیں پڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی نیلی پتلیاں غائب تھیں اور آنکھ کا صرف سفید حصہ نظر آ رہا تھا۔ مزار پر خاں صاحب کے پاس پہنچی۔ وہ دونوں مزار کے باہر بیڑی کے درخت تلے کھڑے تھے۔ سنا ہے بابا جی فرید کی بیڑی تلے کھلے آسمان سے رحمتوں کے نزول کا انتظار کیا کرتے تھے۔

”خاں صاحب! وہ جی ماریا کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ کچھ بولتی نہیں۔“

لیکن خاں صاحب نے اپنی توجہ بیڑی پر رکھی۔ اس میں سرایت کیے ہوئے بابا جی کے معجزاتی کشف و کمال کی شہادت ہے۔ باب ہبزد دیکھتے دیکھتے آگے بڑھا اور اس نے اپنی سگریٹ کی ڈبیا ایک شاخ پر لٹکا دی۔

”اشفاق! آپ ہولی مین کو کیا نذرانہ دے رہے ہیں؟“

خاں صاحب نے فوراً اندر کی پاکٹ سے اپنا پرس نکالا اور پوچھا..... ”کتنے پیسے باب؟“

باب مسکرایا..... ”یہ نذرانہ نہیں اشفاق..... کوئی اپنی خراب عادت یہاں اس کی دلہیز پر چھوڑ جاؤ تو ان کا دل خوش ہوگا۔ مجھ کو وہ سامنے گولڈ فلیک کی خالی ڈبیا..... میں نے ہولی مین سے وعدہ کیا ہے کہ اس کے بعد میں کبھی سگریٹ کو ہاتھ نہیں لگائے گا۔“

خاں صاحب غالباً اس وعدے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن وہ کسی امریکن سے بازی ہارنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ اس نے اپنی جیب سے سگریٹ نکالے اور جس طرح کوئی اپنی من چاہی محبوبہ کو کھڑا چھوڑ کر جاتا ہے ایسے ہی ڈبیا کے پیسے گنے ڈبیا کو چوما اور ایک شاخ پر لٹکا دیا۔

سگریٹ چھوڑنے کے بعد برسوں خاں صاحب ان سگریٹوں کے لیے تڑپے تھملائے پریشان رہے۔ اس وقت کے میں برس بعد انہوں نے ایک روز مجھ سے کہا ”قد سیر! ابھی بھی مجھے یہ چھوڑی ہوئی منزل یاد آتی ہے۔ جس وقت میں کوئی سگریٹ پی رہا ہوں وہاں بیٹھ کر مجھے آند ملتا ہے..... دھواں اندر جاتا ہے خوشبو سے سابقہ پڑتا ہے تو مجھے

بڑی راحت ملتی ہے۔“

واپسی پر ٹرین کے سفر کے دوران ماریسا پر گویا کسی گم سم مجذوب کی کیفیت طاری تھی۔ باب اُسے زبردستی سے لے کر آ گیا۔

گھر پہنچے تو ماریسا اور باب میرے پاس باورچی خانے میں آئے۔

”یہ آپ کو انفورم کرنے آئی ہے؟“

”کیا؟“

”یہ دہلی جانا چاہتی ہے۔ اسے نظام الدین اولیاء نے بلایا ہے۔“

”یہ مجھے کیوں انفارم کرنا چاہتی ہے۔ باب! تم جانتے ہو میں روحانیت کے سفر کو نہیں جانتی۔“

”بات یہ ہے قدسیہ! کہ یہ سمجھتی ہے آپ اسے پاکپتن شریف لے کر گئیں، وہیں اس کا مسئلہ فیصلہ کرنے کے لیے

پہنچا۔“

میں نے معاملہ خاں صاحب کے سامنے پیش کیا تو وہ بولے..... ”بھائی جو یہ چاہتی ہے کرے۔ جن کے گھر میں

ٹھہری ہوئی ہے اطلاع دے۔ میری حیثیت صرف اتنی ہے کہ جس کی جو تلاش ہو اُسے راستہ بتا دوں..... باقی چلنا تو

نے خود ہی ہے۔“

ہمارے گھر کے پگھواڑے جہاں بعد میں تاکستان لگا اور اس کے بعد کباب پارٹی کے لیے جگہ بنائی گئی تھی

صاحب کبابیے بن کر بیچوں پر کباب لگاتے گویا صدیوں سے یہی پیشہ رہا ہو۔ ابھی سٹوڈیو اور سرورنٹ کوارٹر کے کمرے

خالی جگہ میں مکنی کا کھیت لگا تھا۔ جس روز وہ ہم سے رخصت ہوئیں ماریسا مجھے پگھواڑے لے گئی۔ اس وقت مجھے مطہر

کہ وہ مکنی کے کھیت میں کیوں جا رہی ہے۔

وہ کچھ دیر سہی کھڑی رہی۔ شاید چاہتی تھی کہ میں کہیں ادھر ادھر ہو جاؤں لیکن میں نے اسے ہی شروع

نوازی سمجھا کہ میں اُس کے ساتھ چھٹی رہوں۔

اُس نے بیچوں کی سی Sheepishness کے ساتھ اونچے اونچے مکنی کے ٹانڈوں میں ادھر ادھر

کپڑوں کی چھوٹی سی گٹھڑی نکالی۔ یہ کپڑے کی طرح میلے کپڑے تھے۔ وہ انہیں نکال کر بولی..... ”مجھے افسوس ہے جب

آئی تھی میں نے اپنے میلے کپڑے یہاں چھپا دیئے تھے۔“

”کاش تم مجھے یہ کپڑے دے دیتیں تو میں انہیں دھلا دیتی۔“

وہ سر جھکائے آہستہ سے کیتھی کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ وہ اس دنیا کی روح نہ تھی۔ اُس نے کسی کے ساتھ

رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کی۔

ماریسا چلی گئی۔ باب ہیز کے جانے سے کچھ دیر پہلے ایک اور بم پھٹا۔ ہوا یہ کہ ہم سب لان میں بیٹھے

باب نے خاں صاحب سے کہا ”اشفاق! ماریسا کی اطلاع آئی ہے۔“

”خیریت سے ہے؟“

”بالکل خیریت سے! اُس نے نظام الدین اولیاء کے دربار پر تجویٰ اسلام کر لیا ہے اور اب وہ تمہاری

Sister in Faith ہے۔“

نوری نے واپسی کا ٹکٹ کٹا لیا۔

بہت عرصہ بعد ماریسا ہمارے گھر چاٹک آ گئی اور اُس نے ہمیں اطلاع دی کہ اُس نے پشاور میں ایک فیوڈل

کے دوران سے شادی کر لی ہے۔ بعد میں یہی شوہر وزیر بن گیا اور ماریسا کی عزت میں اضافہ ہوا ہے۔ وہ دو تین بار پھر

آئے ہیں اس گھر کا حصہ نہ بن سکی۔ نہ جانے اُسے زندگی بہا کر کہاں لے گئی؟ اُس کی اسلام پسندی نے اُس کے لیے کیا کیا

مشکلات پیدا کیں اور کیا کیا مشکلات کھڑی کیں؟

میں نے ایک دن ازراہ گفتگو خاں صاحب سے کہا۔

”خاں صاحب! یہ امریکن لوگ کیا بلا ہیں۔ جو چاہتے ہیں جس طرح چاہتے ہیں کر لیتے ہیں۔ انہیں اتنی

مشکلات کے قانون نے دی ہے معاشرے نے عطا کی ہے یا فیملی سسٹم ٹوٹنے سے ملی ہے؟“

”تینوں نے مل جل کر لیکن اب یہ اُن کا Way of life ہے۔ وہ آزادی کی خاطر سب کچھ قربان کر سکتے

ہیں۔ مزہ چھیڑتی کہ اپنا مذہبی عقیدہ بھی۔“

”اشفاق جی! لیکن اتنی آزادی سے بے راہ روی کا راستہ بھی تو کھلتا ہے۔ آدمی خود غرضی کی بھیٹ بھی

کھینچتا ہے۔“

”بالکل بالکل وہ بھی ممکن ہے اور ہوتا ہے لیکن یہی آزادی انہیں بالآخر اسلام سے بھی ہمکنار کرے گی۔ ایک

دشمن میں نکلیں گے جیسے ماؤنٹ ایورسٹ کی چوٹی، افریقہ کے جنگل، الاسکا میں تیل کی تلاش کرتے ہیں..... پھر انہیں

اسلام بھی کہیں نہ کہیں اسی تلاش کے دوران مل جائے گا۔ سکون کی تلاش، اطمینان کی تلاش انہیں آخری نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے پیغام کا علم پکڑا دے گی۔“

میں اُن کی بات کو پورے طور پر سمجھ تو نہ پائی لیکن اثبات میں سر بلا دیا۔

”میں بار بار کہتا ہوں کہ اب اسلام کی ترویج اور اشاعت کہیں الاسکا کے بندے کسی یورپین کسی امریکی یا

سیڑھین کی ذمہ داری ہوگی..... وہ ایک کلمہ پڑھ کر سارے کا سارا مسلمان بن جائے گا اپنی مرضی سے۔ ہم لوگ جو پیدا ہونے

مسلمان پیدا ہوئے ہیں اسلام کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔ ہم اس کا جھنڈا اٹھانے کے قابل نہیں رہے۔ ہم نہ مساوات پر یکس

کے نہ کبھی ہم نے بھائی چارے ہی کا سبق سیکھا۔ جب بنیادی اصول ہی ہم سمجھ نہیں پائے تو ہم اس کی ترویج اور

تعمیرت کا بوجھ کیونکر اٹھا سکتے ہیں۔“

میں ابھی تک لباس زبان اور رہن سہن میں اسلام کو مقید سمجھتی تھی۔ مجھے جنیز اور شریں پہنے ہوئے مسلمانوں پر

بے تحاشہ اعتبار نہ آتا تھا۔

باب ہیز ہر بات برداشت کر لیتا تھا لیکن امریکہ پر اگر کسی قسم کی تنقید کی جاتی تو وہ آپے سے باہر نکل جاتا۔ اُس

تعمیرت کے سرفراز ہو جاتا۔ وہ استدلال کی لائن چھوڑ کر الٹی سیدھی شیام گھات پر مجبور ہو جاتا۔ اُس کی ساری فراخ دلی اور

لبرل نظریات خاک میں مل جاتے۔

ایسے ہی ایک دن اُس پر منفی موڈ طاری تھا۔ میں نے احمق پن سے بھونڈوں کے کھکھر کو چھیڑ دیا تھا اور اُس امریکہ کے معاشرتی نقائص سے آگاہ کرنے کی کوشش کی تھی۔

اُس وقت تو وہ خار کھا کر اپنے کمرے میں غائب ہو گیا لیکن شام کو جب میں ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی تو میرے پاس آیا اور فتح مندی کے انداز میں کہنے لگا۔

”قد سیر! یہ بتائیے کہ اسلام کا Essence کیا ہے؟“

میں سمجھی کہ سیدھا سا جواب ہے۔ میں نے جواب دیا ”توحید۔“

”لیجئے یہ تو سبھی مذاہب سکھاتے ہیں۔ کیا یہودی دو خداؤں کو مانتے ہیں؟ کیا عیسائی توحید پرست نہیں؟ میں تو

یہاں تک جانتا ہوں ہندو مذہب میں جہاں بتوں اور کفر کا فتویٰ آپ لگا سکتی ہیں وہاں بھی اوم کا تصور موجود ہے۔ بتائیں کہ اسلام میں وہ کون سی خوبی ہے جو اسے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتی ہے؟“

”بھائی چارہ..... یہ روایت جب انصار نے مہاجرین پر سب کچھ قربان کیا یہاں تک کہ ان کو اپنی جائیدادیں

بھی شریک ٹھہرا لیا۔ یہ روایت کہیں اور نہیں ہے۔“

”لیکن کون سا مذہب ہے جو Universal Brotherhood نہیں سکھاتا۔ کیا عیسائیوں میں بھائی چارہ

نہیں ہے؟ کیتھولک کیا ایسے نہیں ہیں؟ ہم ایک خدا میں تین سمتوں کا تعین ضرور کرتے ہیں لیکن بھائی چارہ تو ہم میں بھی

طرح کم نہیں..... اسرائیل کی طرف دیکھ لیجئے۔ کس کس دلیس سے یہودی آکر آباد ہو گئے ہیں۔ وہ تن من دھن سے ایک

دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔ چھوڑیے آپ لوگ ایسے ہی احساس برتری کا شکار ہیں..... اصل میں آپ کا مذہب بھی

پچھلوں کی کہانیاں ہیں اور کچھ نہیں۔“

مجھے باب کی بات بر چھپی کی طرح لگی۔

اس وقت دونوں وقت مل رہے تھے۔ آسمان پر ہلکی سرفی مائل زردی غائب ہونے کو تھی۔ باہر اس جھپٹے کے

عالم میں پرندے گھر دل کو ڈار ڈار لوٹ رہے تھے۔ میں نہتی سی احساس کستری میں مبتلا لہجے شیشے والی دیوار نما گھر

کے سامنے جا کھڑی ہوئی..... مجھ میں اتنا علم نہ تھا کہ میں باب سے مناظرے میں جیت جاتی۔ اور اس ہار کا مجھے

سے افسوس تھا۔

ہمارے سامنے کی لان میں سندری کا ایک درخت ہوا کرتا تھا۔ سندری کے درخت سے سارنگی کا ساز بنایا جاتا

ہے۔ اس کی لکڑی بہت قیمتی شمار کی جاتی ہے۔ ساگوان سے بھی مہنگی..... سنا ہے اس درخت کے تنے میں رات کے تخت

وروی آواز سنی جاسکتی ہے۔

میں اس کی طرف نمناک آنکھوں سے دیکھ رہی تھی کہ یکدم سارا درخت روشنیوں سے بھر گیا۔ اس کا پتہ

شاخ، تنان دیکھے نور سے جگمگانے لگا..... اور پتہ نہیں اس کے اندر کے سر مجھ تک پہنچے یا مجھ پر وجدان کی کیفیت

ہو گئی۔ مجھے اسلام کا نچوڑ پتہ چل گیا۔ ایسا Essence جو کسی اور مذہب میں موجود نہ تھا۔ میں نے بھاگ کر فتح مندی

تھکنا۔

”بسبب دروازہ کھولو..... مجھے جو اس بل گلیا ہے دروازہ کھولو۔“

ہاتھ میں جھاڑن لیے وہ باہر نکلا اور برواٹھا کر بولا..... ”ہاں! کیا بات ہے؟“

”تم نے پوچھا تھا کہ اسلام کا وہ کون سا وصف ہے جو اسے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتا ہے۔“

”ہاں تو؟“

”اسلام نے رزقِ حلال و حرام کا تصور دنیا کو دیا ہے..... یہ تصور کسی اور مذہب میں نہیں۔ دوسرے مذاہب میں

Command میں اوامر اور منافی کی فہرست ہے لیکن کہیں حرام و حلال کا تصور نہیں۔“

”ہمیں رزقِ حلال کمانے کی تاکید ہے..... چوری چھپے کی آشنائی حرام..... ہم دو دو تین تین بیویاں رکھ سکتے

Living together نہیں کر سکتے..... غصہ حرام ہے..... طیش میں آنا حرام ہے..... ما یوسی حرام ہے۔“

وہ چپ ہو گیا..... میں خود ابھی حرام و حلال کی جزئیات سے نا آشنا تھی اسی لیے بحث بند کر دی گئی..... باب بیہز

یہ بحث مجھ میں ایک بیج بو گئی۔ وہ پاکستان سے چلا گیا اور کچھ برسوں بعد اُس دن کے گیان نے ”راجہ گدھ“ کی صورت

پیدا کر لی۔ یقین جانیے راجہ گدھ جسے خاں صاحب نے نہیں پڑھا اور جسے میں نے نہیں لکھا کہیں سے مجھ پر وارد ہو گئی تھی

سب سے پہلے رواتوں کا کوئی عقلمانی جواز پیش نہیں کیا جاسکتا۔

ایک روز بغیر دستک دیئے میں باب کے کمرے میں چلی گئی۔ مجھے خیال تھا کہ وہ کہیں گیا ہوا ہے اور میں صفائی

کے ساتھ اُس کے صاف کمرے کو مزید صاف کروانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ بغیر کپڑوں کے آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔

”سوری باب! ویری سوری۔“

”کوئی بات نہیں..... لیکن کبھی میرے کمرے میں دستک دیئے بغیر آنے کی کوشش نہ کیجئے نہ آپ نہ کوئی اور۔“

میں نے حیرانی سے اُس کی طرف دیکھا۔ یہ کیسا مہمان تھا جو مجھے حکم اوے رہا تھا۔ میں نے دل میں سوچا یہ

سیدقام لوگوں کا احساس برتری ہے جو ہر وقت براؤن اور سیاہ تو موں کو عقل سکھانے میں مشغول رہتے ہیں۔

اُس نے میرا مشکوک چہرہ دیکھ کر کچھ قیافہ لگایا اور بولا..... ”آپ مجھے ایک جھاڑن عطا کر دیں۔ میں اپنے

کمرے میں ٹاکی بھی پھیر لوں گا اور اس کی ڈسٹنگ بھی کر لوں گا۔ بس کوئی میرے کمرے میں تشریف نہ لائے۔“

”لیکن کیوں؟“

”بات یہ ہے کہ میں آپ کو بتانا نہیں چاہتا تھا لیکن میں تمام کپڑے اُتار کر Levitation کی مشق کرتا ہوں۔

بھی میں زمین سے چند گز اوپر اٹھ سکتا ہوں لیکن آپ یہ منظر دیکھ کر ڈر جائیں گی اس لیے میں آپ کو پہلے ہی Warn

کر رہا ہوں۔“

یکدم میرا دھیان ہنپ معراج کے عظیم معجزے کی طرف مبذول ہو گیا اور میرے دل میں باب کے لیے قدرے

ت کا مقام پیدا ہو گیا۔

”مبارک ہو باب! جو بھی تمہارا راستہ ہے کاش تمہیں اس پر چل کر سکون اور اطمینان حاصل ہو۔“

وہ ہولے سے مسکرایا اور بولا ”اٹمینان اور سکون نہ ملے تو کوئی چلتا ہے ایسے راستے پر..... لیکن ایک شرط ہے۔ آدمی چلتا رہے۔ تبدیل نہ ہو۔ استقامت کے ساتھ لگن کے ساتھ آنکھیں موندھ کر۔ اندر سیرھی اُتار کر..... باہر سے کھڑے توڑ کر اندر جوڑ کر..... Paul Tillich (پال ٹلش) اس کا پہلا گرو تھا۔ اُس کے مرنے کے بعد Eck Anker کی تصویق ڈارون دے رہا ہے۔“

”اچھا باب..... جو کچھ بھی ہے جس طرح بھی ہے تمہیں مبارک ہو۔“

باب ہیز واپس امریکہ چلا گیا تو اُس نے خاں صاحب کو چند رسالے اور مضمون بھیجے جن سے اس تحریک کو جاسکتا ہے۔ تبت کے ایک لاما کی ایجاد کردہ تعلیم ہے جسے ریبرزار (Rebrzar) کے نام سے پکارتے ہیں اور جس سے امریکن مہنت پال ٹلش نے اولاً اس راستے پر چلنا سیکھا۔

کرتے کرتے اور ہوتے ہوتے باب ہیز کے جانے کا وقت آ گیا۔

سارا سامان سفید سوزو کی دین میں لاوا جا چکا تھا۔ میرے پاس ٹویلہ تھی۔ ہم دونوں مشورہ کر رہی تھیں کہ کس طرح خدا حافظ کہا جائے۔ خاں صاحب میرے پاس برآمدے میں آئے اور کہنے لگے ”قدسیہ! تم باب کو اتنے تک تھوڑ آؤ۔ مجھے آج دفتر میں ضروری کام ہے۔“

”ماموں آپ بھی چلیں ناں برا لگتا ہے۔“ ٹویلہ بولی۔

لیکن ماموں صاحب باب ہیز سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئے اور برا لگنے کو لگنے دیا۔

”کیا تم ہمارے ساتھ آرہی ہو ٹویلہ.....“ باب نے ہمیشہ ٹویلہ کو ٹویلہ کہا۔ شکر ہے ہم اسے ٹویلہ نہ سمجھے۔ کے ٹویلہ پر کوئی اعتراض نہ کیا۔

راستے میں باب عجیب طرح سے اُداس ہو گیا جیسے کوئی گھر والوں سے بچھڑ رہا ہو۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا..... ”بانو آ پا! مجھے معاف کرنا کبھی کبھی میں نے آپ کا بہت دل دکھایا لیکن یقین کیجئے میری نیت ہمیشہ اچھی تھی۔ میں اپنے قیام کو کبھی نہیں بھولوں گا اور آپ کی تصویر کو اپنی تمام تصویروں کے اوپر لگاؤں گا۔“

ایئر پورٹ اُن دنوں غریبانہ اور سادہ سا تھا۔ ہم تینوں وقت سے کچھ پہلے پہنچ گئے تھے اور ابھی چیک ان (check in) کرنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ ہم تینوں باہر ہی لان پر بیٹھ گئے۔ ہلکی ہلکی دُھوپ تھی۔ لیکن دُھوپ میں نہ تھی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گپ چپ بیٹھنے کے بعد اطلاع ملی کہ فلائٹ تین گھنٹے لیٹ ہو گئی ہے۔ ہم واپس گھر آ گئے۔

• اور جب دوبارہ جانے کا وقت آیا تو ٹویلہ میرے پاس آئی..... ”مامی! آپ پیشک نہ جائیں۔ میں باب سے آؤں گی۔ اُنہیں آجاتا تو اُسے ساتھ لے جاتی لیکن وہ دونوں بھائی ابھی کالج سے نہیں لوٹے۔“

باب ہیز بڑے رسمی انداز میں مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔ لیکن یوں نہ سمجھئے کہ اُس نے ہم سے رخصت دیا۔ وہ باقاعدگی سے نہیں لیکن وقفاً وقفاً خط لکھتا رہا۔ سینڈی سے اُس کی شادی ہوئی۔ پھر دو بیٹیاں چھوڑ کر وہ کہیں چلی گئی۔ باب نے دوبارہ شادی کی اور میکسیکو میں Colme کے ایک میوزیم میں ڈائریکٹر لگ گیا۔

جب انٹق وہاں گئے تو عجب سی بات ہے۔ انٹق نے اُس سے رابطہ تو قائم کیا لیکن مغرب کی تیز رفتار زندگی

اینڈریوز

(Andrews)

باب ہیز کے جانے کے بعد ایک دن خاں صاحب جب اردو بورڈ سے لوٹے تو اُن کے ساتھ کرسٹوفر (Christopher) تھا۔ موٹا نہیں لیکن مائل بہ فرہبی ضرور تھا۔ چوڑا چکلا سینہ، تھوڑا سا سامنے پھیلا ہوا گول منول پیٹ، سیدھا ساری ہاتھ لیکن جب بھی بولتا بات کرتا اُس کے چہرے پر معصومیت چھا جاتی۔ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتا تو کسی حد تک بچے کی طرح مظلوم سا نظر آتا۔ اُس کے ہاتھ میں بالکل چھوٹا سا بیگ تھا۔ اُس نے پہلے ہی دن خاں صاحب سے مجھے معلوم نہیں تھا کہ پاکستان میں اتنی سردی ہوتی ہے، میں اوور کوٹ نہیں لایا۔“ خاں صاحب نے فوراً اپنا اوور کوٹ اُس سے دے دیا..... ”تو اب آپ کیا کچنیں گے شوقی؟“

وہ میری کمیٹنگی پر ہلکا سا مسکرائے اور بولے..... ”میرا ڈریسنگ گاؤن مونے کبل کا ہے۔ ایک نہیں دو گاؤن بچے پاس ہیں وہ پہن لوں گا۔ پھر سواتی جب نما کوٹ بھی ہے۔“ میں جانتی تھی کہ وہ اوور کوٹ واپس لینے والوں میں سے ایک ہیں۔ اس لیے چپ ہو رہی۔ اس ٹال میل کے علاوہ کرس نے مجھ سے کبھی زیادہ بات چیت نہ کی۔ وہ خاں صاحب کے ساتھ دفتر چلا جاتا۔ وہاں سے اُسے ڈرائیور ہماری فو کسی پر شہر اور لاہور کی قابل دید عمارتیں دکھانے لے جاتا۔ شالیمار قبرستان، جہانگیر، قلعہ نور جہاں کا مزار، مسجد وزیر خاں اور اندرون شہر کی گلیاں بازار..... کبھی ڈرائیور دن بھر کی واردات بتاتا کبھی یہ انفرمیشن بھی نہ ملتی۔ میں نے بھی دلچسپی لینا چھوڑ دی۔

کرس جس آہستگی سے آیا تھا ایک روز اسی بے تکلفی سے بلے بغیر رخصت ہو گیا۔ نہ کوئی شکریے کا خط نہ کوئی دعا ہی جملے نہ اشک باریاں نہ زینب مسکرائیں۔ یہ قیام میں نے کولڈ سٹوریج میں رکھ دی اور قریباً تیس سال بعد آج نکال کر آپ کو پیش کر دی۔

ابھی کرس کو گئے چند دن ہوئے تھے کہ ایک اور امریکن سا کا پیش آیا۔

یہ تب کی بات ہے جب خاں صاحب برکلے پروگرام سے وابستہ تھے۔ یوں سمجھئے کہ یہ دور ہمیں امریکن لوگوں سے ملنے جلنے کے مواقع بہم پہنچانے کے لیے آیا۔ پہلے خاں صاحب اٹلی میں تنہائی، غربی اور تذبذب کا ایک عہد گزار چکے تھے لیکن اُن میں ایک عجیب وصف تھا۔ حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں۔ اندر کیسی بھی بارشیں جل تھل کیے رکھیں۔ وہ صبر کی برساتی اوڑھ فرانس سے وابستہ رزق کمانے کے لیے ضرور نکلتے۔ میں نے انہیں کبھی موڈ کے تابع زندگی بسر کرتے نہیں دیکھا بلکہ یوں سمجھئے کہ وہ ہمیشہ موڈ کو اپنے عزائم کے تابع کر لیتے۔ کبھی کبھی اُن کی زباں کھٹارنگی ہو جاتی، سارا منہ کڑوا ہو جاتا لیکن وہ ڈاکٹروں کے درپے نہ ہوتے۔ انجانا کی تکلیف ہوئی۔ ڈاکٹری دوائیاں پیتے، گھریلو ٹوٹکے استعمال کرتے، حکیمی علاج آزماتے، ہومیو پیتھک پڑیاں پھاکتے اور خم ٹھونک کر کام پر کھڑے ہو جاتے۔ انہیں حالات نے کبھی پسپا نہ کیا۔ آسموں نے کوئی کام نہ پیسے کے لالچ میں کیا نہ شہرت اُن کے لیے قابل اعتناء چیز تھی۔ بس کام کو وہ ہرانے کے موڈ میں

رہتے۔ گویا وہ بھی کوئی پہلوان تھا جسے دھوبی پٹا اگرا سکتا تھا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب داستان سرائے میں امریکنوں کی آمدورفت زیادہ تھی۔ ان ہی لوگوں میں اینڈریوز تھا۔ تب 121۔ سی کے سامنے کھیت تھے۔ ایک نالہ یہاں بہتا تھا جس سے کھیتوں، سڑکوں، لانوں کو سیراب کرنے کا معمول تھا۔ اسی نالے میں انیس خاں اپنی بطخیں نہلانے کے لیے لے جایا کرتے تھے اور بڑی محبت اور ڈالر کے ساتھ واپس لاتے تھے۔ ہمارے گھر کے سامنے نالے کے پار کوئی کوٹھی ابھی تعمیر نہ ہوئی تھی۔ پھانک بھی واجبی سا پانچ فلٹیا تھا۔ کے آر پار دیکھنا آسان تھا۔ ابھی قانون کو اپنی گرفت میں لینے والے بے روزگار لوگ اتنی تعداد میں نہ تھے اور اگر تھے تو انہیں غریبی کے ساتھ رہنا کچھ مشکل نہ تھا۔ دہشت گردی، چوری، چکاری، ڈاکہ زنی، دھونس، دھول، دھپا، سوسائٹی کا جھگڑا تھا۔ ہم لوگ باہر پنکھا لگا کر لان میں سونے کے عادی تھے۔ کبھی دروازے بند کر دیئے جاتے کبھی ان کی کنڈیاں نہ لگتی جاتیں، کبھی پھانک کو تالا لگا دیا جاتا کبھی ہم بھول بھی جاتے۔ خاں صاحب کی بڑی بہن آپافر خندہ اسی گیٹ کو ٹاپ کر بھی آ جاتیں اور اگر ہم باہر لان میں ہوتے تو وہاں ورنہ کوٹھے پر آ جاتیں اور ہمارے پاس ہی لیٹ جاتیں۔ یہ امن کوٹھا تھا۔ غلطیاں تب بھی ہوا کرتی تھیں لیکن اُن کا خمیازہ اتنا نہ بھگتنا پڑتا۔ یہ خوف و سوسے تب بھی جنم لیتے لیکن ان کا پھل زیادہ دیر کے لیے نہ ہوتا۔

ایسے ہی بھلے دنوں کی ایک صبح میں اُنھی تو گیٹ کے پار سڑک پر نالے سے متصل ایک وین کو کھڑا پایا۔ اس میں کچھ امریکی سوار تھے۔ سفری ٹولے میں سے چند اتر کر نالے کے پانی سے نہا دھورہے تھے۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ مسافروں کی بے سرو سامانی دیکھ کر میں اندر گئی۔ خاں صاحب کو بتایا کہ کچھ پروایسی ہیں۔ ان میں مرد بھی ہیں اور عورت بھی۔ شاید کچھ درکار ہو۔

خاں صاحب چپ چاپ باہر چلے گئے۔

ابھی بچے لان پر سوار تھے۔ سکول جانے کا وقت بھی نہ ہوا تھا۔ باورچی خانے کی زندگی بھی نہ جاگی۔ گرمیوں کی صبح تمازت سے نا آشنا بلکی بلکی ہوا میں ہولے ہولے آگے بڑھ رہی تھی۔ اچانک بڑا پھانک کھلا اور خاں صاحب امریکنوں کے ساتھ اندر وارد ہوئے۔

”قدسیہ! انہیں صابن تو لیے دو۔ یہ آٹھ دس دنوں سے نہائے نہیں ہیں۔“

پھر خاں صاحب جوئی اور اینڈریوز کے ساتھ اوپر والی منزل کی طرف چل دیئے جہاں خاں صاحب لائبریری تھی۔ میں نے پہلے بچوں کو سکول بھیجا پھر مہمانوں کے لیے ناشتہ تیار کیا۔

جب خاں صاحب اپنے مہمانوں کو لے کر نیچے آئے تو یوں لگتا تھا کہ وہ مدتوں سے ان لوگوں کے دوست چکے ہیں۔ میرا اُن سے تعارف کراتے ہوئے خاں صاحب نے کہا:

”قدسیہ! یہ جوئی ہے۔ جوئی گیون (Joey Gavin) اس کے والد لندن میں ڈاکٹر ہیں۔ اسے زندگی کے ساتھ شطرنج کھیلنے کا شوق ہے۔ یہ تجربات کرتی رہتی ہے۔ یہ سیر و سیاحت بھی جوئی کے لیے ایک تجربہ ہے اور یہ اینڈریوز ہے۔ یہ اپنا آپ خود سمجھا دے گا۔ اور یہ ہمارے بچوں کی نانی ہیں۔ ہم سب انہیں نانا کہتے ہیں۔“

”نہیں نہیں میں کچھ سمجھا نہیں سکتا اشفاق صاحب! میں خود سمجھنے کے لیے مشرق میں آیا ہوں۔ ہم لوگ اتنے Materialistic, Practical, Objective ہو چکے ہیں کہ ساری ٹوٹل زندگی کو سمجھنے کے لیے ہمارے پاس درست Instrument نہیں رہے۔“

میں نے باہر نکل کر دیکھا تو وین جا چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ یہ لوگ ناشتے کے بعد چلے جائیں گے لیکن وین کو کچھ کر مجھے تشویش ہوئی۔

”وہ آپ کی وین نظر نہیں آئی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ تو چلے گئے۔ اُن کے ساتھ یہی طے تھا۔ وہ تو اس وقت واہگہ پار کر چکے ہوں گے۔“ اینڈریوز نے کہا۔
نئے مہمانوں کو میرے سپرد کر کے خاں صاحب بولے ”حیران نہ ہوں قدیر! یہ تمہارے مہمان ہیں۔ خدائی خدمتوں کا شکر یہ ادا کرو۔“

”کتنی دیر تک خاں صاحب؟ کتنی دیر کے لیے؟“

”چلے جائیں گے بھائی چلے جائیں گے۔ بیچارے وین ہی میں سوتے تھے۔ اسی میں ناشتہ کھانا بناتے تھے۔ وین میں چھوٹا سا باورچی خانہ فرنیچر سب کچھ موجود تھا..... جب وہ لوگ لینے آئیں گے تو چلے جائیں گے۔“
لیکن وین اپنا بوجھ ہمارے گھر اتار کر پھر کبھی نہ آئی۔ شاید باقی مسافر بھارت چلے گئے۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد مجھے یہ فکر لاحق ہوئی کہ کہیں یہ سب C.I.A. کے مجرّم نہ ہوں؟ اور اپنے طور پر کسی شہرہ کے کوآئف حاصل کرنے کی ڈیوٹی پر نہ مامور ہوں؟ اب میں نے غور سے بڑے شک و گمان کے ساتھ اپنے سفر پر نظر ڈالی۔ اینڈریوز بہت ڈبلا پتلا قریباً تیس برس کا نوجوان تھا۔ جوئی نہ موٹی نہ ڈبلی۔ بس درمیانے قد کی عورت تھی۔

اینڈریوز نے مجھ سے پوچھا ”کیا یہ کسی ایجنسیڈر کا گھر ہے؟“ اس تعریفی جملے نے مجھ پر خاطر خواہ وار کیا۔
تعریفی اور خوشامدی جملوں کے آگے کس قدر نہتا ہو جاتا ہے۔

”ایجنسیڈر کا تو نہیں ایک درویش کا گھر ہے۔“

”ایک ہی بات ہے۔“ اینڈریوز نے ایک اور تیر چلایا۔

اور یوں داستان سرائے میں اُن کا قیام طے پا گیا۔

اب اینڈریوز اور جوئی ہمارے مہمان خاص تھے۔ وہ دونوں شہاب صاحب کے کاسنی کمرے میں رہتے تھے۔ جس جس پیتے تھے کہ شہر خچھیلے تھے لیکن زیادہ وقت اُن کا دروازہ بند رہتا۔ ایک بات ضرور ہے کہ اُنہوں نے کبھی مجھے کھانا نہ کرایا۔ جوئی چائے، کھانا تیار ہوتا ایک آواز پر اُن پر اُن ٹپکتے، مرچوں والے سالن، پراٹھے، اچار سب کچھ جو سامنے دھر دیا کرتے تھے۔ اُنہوں نے کبھی کسی پکیرے پر کسی قسم کا اعتراض نہ کیا۔ دن میں ایک آدھ بار وہ سیر پانے کے لیے شہر چلے۔ شام کے کھانے کے بعد خاں صاحب کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرتے لیکن مجھ سے اُن کی بیٹھکیں کم ہوتیں۔

یہ دونوں بالآخر یہیں رہ گئے۔ پتہ نہیں، مسافر ساتھیوں نے دعا دی یا ان دونوں نے اچھا ٹھکانہ مل جانے پر اُنہیں

بھگا دیا۔ بہر کیف جو بھی معاملہ تھا میرے لیے اچھے کی بات نہ تھی۔ میں اب تک امریکیوں کے سیلانی پن کو کچھ نہ کچھ سمجھتی تھی۔ وہ اپنے لیے سفر کو وسیلہ ظفر بنانے میں بڑی تنگ و دو کرتے تھے۔ ایک مدت کام کی روٹین سے وابستہ رہتے اور جوتے رہتے اور پھر اس رقم سے بریک پر چلے جاتے۔

امریکن تو اس چھٹکارے کو تو انانیاں اکٹھی کرنے اور نئے تجربے سیکھنے کو ”بریک“ کا نام دیتے تھے لیکن میں چاہتی تھی کہ اسے اسلامی نقطہ نظر سے بھی سمجھا جائے اور مہمان بھی اس سفر میں سیکھنے کے عمل کو اپنے لیے وسیلہ ظفر جانتے۔ میرے لیے اس جوتے کو رکھنا آسان تھا، لیکن کچھ دنوں کے بعد میرے لیے ایک مشکل پیدا ہو گئی۔

مجھے پتہ چلا کہ اینڈریوز لندن کے کسی کالج میں انگریزی کا پروفیسر ہے اور جوئی پوری ڈاکٹر ہے اور ڈاکٹر کے ہونے کے ناتے اُس کی جان کاری بہت ہے لیکن وہ ڈاکٹری کی پریکٹس نہیں کرتی۔

پروفیسر اینڈریوز اور ڈاکٹر جوئی دونوں میاں بیوی نہیں تھے اور اکٹھے رہنے کا پلان بنا چکے تھے۔ میرے لیے چوری چھپے کی آشنائی تھی، جس کی میرے دین میں کوئی اجازت نہ تھی۔ اُن کے لیے یہ معمول کا فعل تھا کہ جب تک کسی کو ایک دوسرے کی طبیعت کو جان نہ لیا جائے، لمبی ہمسفری قبول نہیں کرنی چاہئے اور شادی کا طوق اپنے گلے میں نہیں چاہئے۔

جوئی کا والد ایک بڑا مشہور و معروف ڈاکٹر تھا اور لندن میں ایک سنٹرل ہسپتال میں بڑی اہم پوسٹ پر فائز تھا۔ میں حیران تھی کہ اُس نے بغیر نکاح کے جوئی کو انگلش کے پروفیسر کے ساتھ کیسے جانے دیا۔ لیکن تب مجھے علم نہ تھا کہ وہاں ”آزادی“ کی خاطر انسان ہر قسم کی قربانی دے سکتا ہے اور والدین اپنی آزادی اس طرح خریدتے ہیں کہ آزاد کر دیتے ہیں۔

بہر کیف یہ تجربہ میرے لیے نیا تھا۔ اب میڈیا کی بدولت مشرقی معاشروں میں بھی شادی سے پہلے together کچھ ایسے اچھے کی بات نہیں لیکن آج سے قریباً تیس برس پہلے ایسی بات سن کر منہ کھلے کا کھلا رہ جاتا تھا۔ یہ دونوں اپنے میں لگن رہتے۔ بہت کم آمیزتھے۔ باب کی طرح مناظرے اور بحثوں میں شریک نہ ہوتے۔ دن کے وقت جوئی اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے مقفل رکھتی۔ اینڈریوز شلوار نمیض پہن کر سر پر نمازیوں والی ٹوپ پہن چمپت ہو جاتا۔ ایک روز جب وہ باہر جا رہا تھا میں آک کے درخت تلے کھڑی بجلی کا ٹیل دیکھنے میں مشغول تھی۔ ایک روز اینڈریوز باہر نکلا تو ہم دونوں ایسے ہی سرسری علیک سلیک کرنے لگے۔

”تم کہاں جا رہے ہو اینڈریوز؟“ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”بھائی! وہ تم جوئی کو پیچھے چھوڑ جاتے ہو۔ وہ کمرے سے نہیں نکلتی۔ لُج کے لیے بھی نہیں۔“

”وہ اُس کی مرضی ہے آپاچی..... grown up ہے۔ اپنے آپ کو Look after کر سکتی ہے۔ آپ“

”کریں۔“

”تم چاہو تو میں تمہیں کوئی سینڈوچ بنا دیا کروں؟“ میں نے بڑی دریا دلی سے کہا۔ اس جملے کے ساتھ

اپنی برتری کا احساس ہوا۔

”نہیں بانو آ پا! مجھے کھانے پینے کی کوئی دقت نہیں۔ میں روز کشمیری بابا کے پاس جاتا ہوں۔ وہ میری تربیت بھی کرتے ہیں اور مجھے لنگر بھی کھلا دیتے ہیں۔“

میں نے داتا گنج بخش کا نام تو سنا تھا لیکن کشمیری بابا کا نام کبھی نہیں سنا تھا۔

اینڈریوز نے مجھے بتایا کہ کشمیری بابا نکلسن روڈ کے آخری کونے پر رہتے ہیں۔ وہ زیادہ وقت ذکر فکر میں مشغول رہتے ہیں اور لوگ ان سے اپنی مشکلات کے حل کے لیے آتے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اینڈریوز کی طرح راہ سلوک، عرفان اور حق اقلین حاصل کرنے کی تربیت بھی حاصل کرتے ہیں۔

کچھ مہینے ایسے ہی گزر گئے۔ ان کے دوران خاں صاحب کو جوئی کے والد نے چند خط شکرینے کے لکھے جن میں ان کی محنت کا اظہار تو ضرور تھا لیکن اس کے انتخاب پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔

پھر اچانک دونوں نے غالباً اکتوبر میں واپس لندن جانے کی ٹھانی۔ جس سہولت سے وہ ہمارے گھر کا فرد بنے ہیں اس آسانی سے وہ اچانک صرف خاں صاحب سے مل کر ایئر پورٹ روانہ ہو گئے۔ لندن پہنچ کر ایک دو خط اینڈریوز کے لکھے لیکن نہ یہ معلوم ہو سکا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ اس بات کا پتہ بھی نہ چلا کہ وہ دونوں اکٹھے بھی ہیں کہ نہیں۔

پھر اچانک کرمس سے کچھ دیر پہلے اینڈریوز اور جوئی بغیر اطلاع دیئے ٹیکسی میں سوار گھر آ گئے۔ میں ان کے آنے پر بڑی خوش ہوئی۔ سفید رنگت مجھے ہمیشہ مرعوب کرتی رہی ہے اور مجھے اندر ہی اندر محسوس ہے جیسے ان کی اس خوبی کے آگے ہر قسم کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے۔ ان دونوں میں کرمس کے قریب تھوڑا سا جوش و خروش ہے۔ اینڈریوز میرے پاس آیا اور کہنے لگا..... ”بانو آ پا! آپ کے چولہے میں بڑا اچھا oven ہے۔ کیا میں اس میں کرمس کیک بنا سکتے ہیں؟“

”شوق سے مجھے صرف سودے بتا دو..... میں منگوا دوں گی۔“

”جی نہیں سودے میں خود لاؤں گا۔ آپ کو کچھ منگوانا نہیں ہے..... صرف اجازت دینا ہے۔“

”دوپہر کے وقت جب چوٹی بہن باورچی خانہ چھوڑ دیتی ہے ہم کیک بنالیں گے۔“

وہ سودے خود لا رہے تھے۔ اس چیز نے مجھے اطمینان کا سانس لینے پر مجبور کیا..... یہ کیننگی ضرور تھی لیکن میں سمجھتی تھی کہ نہ جانے وہ کیا کچھ منگوا بیٹھیں اور اس پر کتنی لاگت آ جائے۔

کرمس کی پچیس تاریخ سے چند دن پہلے انہوں نے قریباً چھ پونڈ کا براؤنی شکل و صورت کا کیک تیار کر لیا۔ اس کو کرائٹ اور میوے ڈالے اور اس کے اوپر کرانچ کرانچ کرنے والی چینی کی مہلکیاں سی سجائی گئی تھیں۔ جوئی نے آدھا کیک کھا کر اپنے والدین کو تیز رفتار ڈاک سے روانہ کر دیا۔ باقی کیک اُس نے اپنے کمرے میں رکھ لیا۔

پچیس دسمبر کو بچوں نے قائد اعظم کی سالگرہ کے سلسلے میں کوٹھے پر موم بتیاں جلائیں۔ بڑا سا سبز جھنڈا جس پر ہندوستان کا نقشہ لکھا ہوا تھا لہرایا۔ غالباً ان دونوں نے یہ سمجھا کہ ہم کرمس کی خوشیوں میں شامل ہو رہے ہیں۔ رات کو وہ دونوں بارہ بجے قریب کھانے کے کمرے میں آئے۔ بچوں کو چپکے سے بلایا۔ کیک پر موم بتیاں لگائیں۔ کچھ حمد و ثنا (Carolls) پڑھیں۔ کیک کا ٹاٹا کھایا اور سو گئے۔

ہمیں انہوں نے جگانے یا شریک ہونے کی زحمت نہ دی۔ صبح تھوڑا سا کیک مع چند موم بتیوں کے کالے پڑا تھا۔ ہم نے اسے بڑے ذوق و شوق کے ساتھ کھایا اور معترف ہوئے کہ واقعی اس رنگت اور مزے کا کیک بیکری میں نہیں ملتا۔ لیکن ہمیں خدا نے یہ توفیق نہ دی کہ اس بات کا ذکر ان دونوں سے کرتے۔

اب یہ بات پایہ تصدیق کو پہنچ چکی تھی کہ وہ دونوں عیسائی تھے اور اپنے مسلک پر استقامت سے گامزن تھے۔ شادی شدہ نہ تھے۔

لیکن جلد باز انسان کے یہ احمق پن کی دلیل ہے کہ کافی شواہد اور ڈیٹا جمع کیے بغیر کچھ معاملات پر حتمی فیصلے دیتا ہے۔ یہی ہمارے ساتھ ہوا۔

ایک روز اینڈریوز اپنے ساتھ تھوڑی سی مٹھائی لے کر گھر آیا۔ ہم دونوں برآمدے میں بیٹھے تھے اور اپنے وقت کا تیاپانچ کرنے میں مشغول تھے۔

”یہ مٹھائی آپ کے لیے ہے۔“

”کس خوشی میں اینڈریوز؟“ خاں صاحب نے پوچھا۔

”میں آج کشمیری بابا کی مہربانی سے مسلمان ہو گیا ہوں۔ اب میرا نام اینڈریوز سلیمان ہے۔“

صرف سلیمان پکار سکتے ہیں۔“

پھر وہ پہلی بار شتوجی سے بغلیں ہوا۔ بچے اور ان کے دوست اس خبر کو پا کر بہت خوش تھے۔ اب مجھے دیکھتے ہوئے بھی کچھ ایسی خوشی نہ ہو رہی تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ شاید ملت کے لیے یہ کوئی گرانمایہ اضافہ نہیں۔ پھر مجھے نے سب میں مٹھائی تقسیم کی۔ اینڈریوز کو مبارک دی اور رات کے وقت پاؤ پکانے کا ارادہ کیا۔

میرے دل میں کھد پد ہو رہی تھی۔ میں اُسے اخلاقیات اور خاص کر اسلامی اخلاقیات پر کچھ لیکچر دینا چاہتا تھا۔ لیکن چونکہ میرا علم کم اور ناقص تھا اس لیے چپ رہی۔

چند دن بعد اینڈریوز اور جوئی سامان ہاندھے برآمدے میں موجود تھے۔ وہ واپس جانے کے لیے برآمدے میں بیٹھے تھے۔

”اینڈریوز کہاں؟“

”گھر... بندن۔“

”لیکن میں تو تمہارے اعزاز میں ایک دعوت کرنے والا ہوں۔ مفتی جی کو بھی اطلاع دے دی ہے۔“

”مشکل یہ ہے خاں صاحب کہ جوئی اب یہاں رہنا نہیں چاہتی۔“

”پر کیوں؟“

”وہ عیسائی ہے اور میں مسلمان..... ہماری شادی نہیں ہو سکتی۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہے۔“

”بھائی اسلام میں صاحب کتاب کے ساتھ شادی جائز ہے۔ وہ کیوں گھبر رہی ہے؟“

”یہ تو اسلامی فراخ دلی ہے خاں صاحب! وہ عیسائی ہے اور وہ مسلمان سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اُسے

ہالے اچھے نہیں لگتے..... فیصلہ اس کا ہے۔“

کچھ ہی دن بعد کا ذکر ہے کہ میرے کمرے میں کھلنے والے غسلخانے اور ڈریسنگ روم سے ملحق باکس روم کا غسل ہو گیا۔ میں نے چابی اندر چھوڑ دی اور کڑک کر کے دروازہ کھینچ کر اندر سے تالا بند کر دیا تھا۔

چابیاں اندر چھوڑ کر دروازہ بند کرنے کا یہ پہلا واقعہ تھا۔ اس کے بعد یہ غلطی میں نے کئی بار کی لیکن اُس روز سے کبھی نہیں ہوا۔ پہلے تو بڑی دیر مختلف چابیاں لگا کر تالا کھولنے کی مہم جاری تھی کہ دروازے پر دستک کی صاحب کی عدم موجودگی میں اینڈر یوز کبھی میرے کمرے میں نہ آیا تھا۔ اُسے دیکھ کر میں حیران ہوئی۔

”کیوں سلیمان..... کیا میں کچھ کر سکتی ہوں؟“

”میں نے سنا ہے کہ آپ کا تالا بند ہو گیا ہے اور اس کی چابی نہیں ملتی۔“

”ہاں..... ٹھیک سنا ہے تم نے۔“

”میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔“

میں نے جھنجھلا کر کہا..... ”اوہ بھائی! تم کیا مدد کرو گے۔ چابی تو اُس کی اندر رہ گئی ہے۔“

اینڈر یوز نے اپنے گرتے کی جیب سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا۔ اس میں ایک نمبر نے کی شکل کی چابی نما چیز

”میں دو سال چور رہا ہوں۔ ہر قسم کا تالا کھول لیتا ہوں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں کوشش کر سکتا ہوں۔“

میراجی تو اُس کی مدد لینے کو نہ چاہتا تھا لیکن میں نے حاجی بھرنی۔ چند ہی لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ میں نے ان سے اُس کا شکریہ ادا کیا اور نئی اُلجھن کو سینے بیٹھ گئی۔

یہ تو مسلم اینڈر یوز کون تھا؟

بغیر شادی کے کاسنی کمرے میں جوئی کے ساتھ رہنے والے کی اصلی شناخت کیا تھی؟ سر پر دو تہوں کی پگڑی پہن رکھی بابا کی درگاہ پر روز جانے والا یہ شخص اچھا تھا کہ برا؟ میں اُسے کس خانے میں ڈالوں؟ مسلمان ہو جانے والا ہے یا نہیں تھا کیا تھا۔

اس سوچ کا ذکر خاں صاحب سے بالکل نہ کیا کیونکہ وہ عموماً کہا کرتے تھے ہمیشہ و ماغ ہی استعمال نہ کیا کرو کبھی یہ سب کراس کی قید سے رہا بھی کر دیا کرو.....

یہ وہ دور تھا جب خاں صاحب کے چھوٹے بھائی اشتیاق احمد کا ہمارے ہاں خوب آنا جانا تھا۔ تقو کے صائل، میرا ہمراہی میرے بچوں کے دوست تھے۔ اس کی بیوی منزہ کبھی اس کے ساتھ آ جاتی، کبھی صبح کے وقت اکیلی ملنے سے۔ عموماً اپنی تمام تر خوش دلی انسان دوستی کے ساتھ کچھ پکا کر سجا کر لے آتی۔ باورچی خانہ اُس کے کھلے دل کی وجہ سے ہوتا جاتا۔ وہ گلاب جاسن بناتی، کیک بیک کرنے کے طریقے سمجھاتی، کڑھائی گوشت بنانے کی ترکیب سمجھاتی، سمجھو وہ سب کو اپنی چھوٹی انگلی کے ساتھ لپٹنے کا فن بھی جانتی تھی۔

خاں صاحب کا رابطہ خلق سے اور طرح کا تھا۔ منزہ اور طرح سے جال پھینکتی تھی۔ خاں صاحب جانتے تھے کہ

جب انسان میں زیادہ خوبیاں اکٹھی ہو جائیں تو خطرے کی گھنٹی کہیں نہ کہیں بجتی ہے۔ دولت، حسن، دانشوری یہ سب اللہ کے دین تو ضرور ہے لیکن اسی دین کے باعث اللہ آزما تا بھی خوب ہے۔ وہ یہ دیکھتا ہے کہ نعمتیں جھولی میں ڈالنے والا متاثر ہے کہ نہیں۔ جہاں غریبی، بدشکلی، کم عملی کا ساتھ ہو وہاں بھی آزمائش ہی مطلوب ہو کرتی ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ نہ سہ کے مقام پر یہ شخص صابر ہے کہ نہیں۔ ہمارے عہد میں غریبی کا امتحان قدرے آسان تھا۔ ابھی غریب آدمی میں ہونے اور حرص ایسے مہلک مرض نہ بنے تھے۔ امیری بھی نمائش، زیبائش، آرائش کی عادی نہ تھی۔ سوسائٹی کی آزمائشیں کم تھیں۔ بس کچھ منزہ جسے ہم شرمیلانگور کہا کرتے تھے ہاں ایک بین ڈوراندیش پہلے تول پھر بول والی خاتون نے جسے چاہتی کر لیتی، جسے چاہتی اپنا بنا لیتی..... غیبت پر آئے غیبت کر لی، تعریف کو دل چاہا سراسر اپنے پر آمادہ ہو گئے تو آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ نہ اپنے اعمال پر نازاں نہ احساس جرم میں مبتلا۔ بہت جلد اُس کی اینڈریوز اور جوئی سے دوستی ہو گئی وہ آتے ہی دھڑلے سے ان کی طالب ہوتی۔ وہ بھی گویا منزہ ہی کے منتظر ہوتے۔ پھر محفل جتنی خوش گیلیاں پونے پکوڑے کا زور ہوتا..... گھنٹے پر یوں کی طرح داستان سرائے کے اوپر سے اڑ جاتے۔

ایک روز بڑا شکر چہرہ لیے منزہ میرے کمرے میں آئی۔ کچھ دیر وہ سوچتی رہی پھر بولی..... ”پتہ نہیں لگا سکتا کہنا چاہئے کہ نہیں..... لیکن آپ کو پتہ ہے میں آپ کو کچھ بتائے بغیر بھی نہیں رہ سکتی۔“

”کیا ہوا؟“

”یہ جو اینڈریوز ہے ناں.....“

”ہاں..... ہمارا اینڈریوز۔“

”بالکل! اور یہ جو جوئی ہے ناں۔“

”ہماری جوئی؟“ میں نے سوال کیا۔

”یہ دونوں شادی شدہ نہیں ہیں۔“

”اچھا پھر؟..... اب کیا کرنا ہے؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”کرنا..... کرنا کیا ہے؟ یہ مغربی لوگ ایسے ہی ہیں۔ یہ Living together کو برا نہیں سمجھتے۔“

تجرباتی طور پر ساتھ رکھتے ہیں۔ پھر اگر نبھ جائے تو شادی ورنہ.....“

پہلی بار میں نے گھبرا کر کہا ”لیکن..... اگر بچوں کو پتہ چل گیا..... دیکھ لو ناں..... ٹولیدہ تو صیغہ بیابان ہے۔“

تمہارے بچے..... کبھی کبھی تو ڈیڈی جی کے بچے عدنان، لبنی اور عائشہ بھی آ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے تو کچھ دماغ تھیں۔“

پر کیا اثر پڑے گا..... پھر اسلام میں تو ویسے بھی چوری چھپے کی آشنائی نہیں کر سکتے..... منع ہے۔“

”تو یہ کون سا مسلمان ہیں کا کی..... تم پریشان مت ہو جانا۔ تمہاری عادت ہے۔ دوسروں کے ساتھ۔“

اپنے سر پر مت اٹھالینا۔ ان کی اپنی اخلاقی قدریں ہیں۔ یہ سیکولر لوگ ہیں۔ یہ ہماری طرح اولڈ فیشنڈ نہیں ہیں۔“

میں نے سیکولر کا لفظ پہلی بار یوں استعمال ہوتے سنا۔ ابھی میں اس لفظ کے استعمال، معنی اور بھرم سے آگاہ نہیں تھا۔

ایک روز ہم باباجی کے ڈیرے سے لوٹے تو بچے گراؤنڈ میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ ان کو چھوڑ کر

سے مس پہنچے۔ برآمدے میں منزہ اپنے گدگدے ہاتھوں کے اشاروں سے جوئی اور اینڈریوز کو کچھ سمجھانے میں مصروف تھی۔ ہم دونوں ٹیوں کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئے۔ ابھی ہمیں زیادہ وقت نہ گزرا تھا کہ منزہ نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

”یادیں شقوبھائی!“

”آئیے آئیے۔“

منزہ کا چہرہ خوشی سے متمایا ہوا تھا اور وہ کلکاریاں مارتے بچے کی طرح معصوم لگ رہی تھی۔

”شقوبھائی! سلیمان چاہتا ہے کہ وہ جوئی سے شادی کر لے۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ اس طرح نہیں رہنا چاہتا۔“

”بڑی خوشی کی بات ہے..... لیکن جوئی تو مسلمان نہیں ہوئی۔“ میں نے خدشہ ظاہر کیا۔

”اہل کتاب سے نکاح جائز ہے۔ میں نے جوئی کو سمجھا دیا ہے اسے مسلمان نہیں ہونا پڑے گا۔ تیاری پکڑو

منزہ نے بڑا کرم کر دیا بڑی خیر ہوگی پت.....“ یہ کہتے ہوئے خاں صاحب باہر اینڈریوز اور جوئی کے پاس چلے گئے

منزہ کے پاس بیٹھ کر نکاح سے متعلقہ تیاریوں میں مگن ہو گئی۔

یہ منزہ کا ڈیپارٹمنٹ تھا۔

اس نے جوئی کو سجانے کے لیے زیور سے لے کر ہانٹنے والی بدکی تیاری تک ڈھونڈی بجانے والیوں کو بلانے

کے لیے اور میلہ منانے تک چھوٹی چھوٹی تفصیل کے ہمراہ ایک ہنگامہ خیز شادی کا اہتمام کر لیا۔ گھر میں ہر وقت سزا بٹری کی

صدا سننے کو بچنے لگیں، ڈھولک کی تھاپ سارے محلے میں خوشیاں بکھیرنے لگی۔ ہر وقت آنے جانے والیوں کا تانتا چل نکلا۔

یہ سب اینڈریوز ایک روز ہاورچی خانے میں میرے پاس آیا۔ کہنے لگا..... ”بانو آیا! میں ایک کیک بنانا چاہتا ہوں۔“

”کیک؟ کیسا کیک؟“

”وہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ شادی کے کیک کے بغیر شادی مکمل نہیں ہوتی۔ Wedding کیک میں بناؤں

تھاپ اجازت دیں گی۔“ اس نے ہاورچی خانے کے اوون کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں نہیں کیوں نہیں..... کیا کچھ درکار ہوگا؟“

”باقی سب کچھ میں لے آؤں گا۔ گھر پر کیا براؤن چینی ہوگی۔“

”ہاں شکر مل جائے گی۔“

”بہت اچھا۔“

منزہ نے ایک مولوی صاحب بلا کر نکاح تک پڑھوایا۔ عموماً بعد میں اصل بھید کھلا۔ نکاح میں مردوں کے علاوہ

کو شریک نہ ہوا لیکن بعد ازاں کیک کاٹنے کی رسم تمام تر عورتوں کے حوالے ہو گئی۔ کوئی دس پونڈ کا کیک موم بتیوں سے سجا

یہ کھانے کے کمرے کی سیاہ میز پر پڑا تھا۔ جوئی اور اینڈریوز نے اسے کاٹا اور بانٹا۔ پھر قریباً ایک چوتھائی کیک اینڈریوز

کے کمرے میں لے کر جانے لگا تو میں نے پوچھا ”اسے کیا کرو گے سلیمان؟“

”یہ میں ڈاکٹر گیون کے گھر بھیجوں گا۔ وہ بہت خوش ہوں گے..... ہم نے کرمس پر بھی انہیں کیک بھیجا تھا۔“

ابھی سلیمان اور جوئی کی شادی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے کہ پتہ لگا وہ دونوں ہنی مون منانے لندن جا رہے

ہیں۔ خاں صاحب اُن کے ساتھ کچھ وقت گزارتے۔ اشتیاق منزه بھی آ جاتے تو باتوں میں گرما گرمی پیدا ہو جاتی۔ لیکن میرے دل پر کوئی بوجھ نہ تھا۔ بچے بھی اس شادی پر بڑے خوش تھے اور جوئی کو زیادہ محبت سے جوئی آپا بلانے لگے تھے۔ پھر جوئی اور سلیمان لندن چلے گئے۔ ایک عرصہ تک پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہیں۔ ایک روز آیا تو جوئی اُس کے ساتھ نہ تھی۔

”یہ میری بیوی ہے۔“

میں نے بیوی پر نظر ڈالی تو سواتی چادر میں ڈھکی ڈھکائی عورت جوئی نہ تھی۔

”یہ اطالوی لڑکی ہے..... مسلمان ہو گئی ہے اور یہ ہماری بیٹی ہے۔“

میں نے دل میں سوچا کہ سلیمان نے بھی مسلمان ہوتے ہی بیوی بدلنے کا ہی سوچا اور کوئی نیک کام اسے کب سوچا۔ چھوٹی بچی سواتی لباس میں تھی۔ فراک نما کرتا نیچے دروازے والی چنٹ دار شلوار۔ سر پر سواتی ٹوپی۔ میں جیسے لگتا تھا کہ بیسوی صدی میں بغیر Pampers کے کسی بچے کا میں تصور بھی نہ کر سکتی تھی۔ یہاں شلوار میں اتنا بڑا اشکاف تھا جس سے بچہ اپنی حاجات پوری کر لیتا اور گیلیا بھی نہ ہوتا۔ اطالوی لڑکی نہ انگریزی جانتی تھی نہ اردو۔ اس لیے اُسے بات کرنے کے لیے صرف خاں صاحب ہی میسر آئے۔ وہ دونوں اطالوی میں دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ ایسے میں اینڈریوز ہاتھ ان کا منہ ٹکا کرتے لیکن کچھ سمجھ نہ پاتے۔

کچھ دن قیام کے بعد اینڈریوز صبح بولا..... ”آج ہم واپس جا رہے ہیں۔ ٹماٹر کی فصل تیار ہو گئی ہے۔“

اس کے بعد سلیمان کب چلا گیا؟ میں اُس سے جوئی کے متعلق کچھ نہ پوچھ سکی جوئی نے کیوں اُس سے قصہ نہ کیا؟ یہ سوال ہی رہے کیونکہ میں جانتی تھی کہ کسی کا ہاتھ پکڑنا بھی اپنی ضرورت کے تحت ہوتا ہے اور اُس ہاتھ کو چھونے سے اپنی ہی جملہ خباثوں کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ کوئی شخص نہ کبھی کسی اور کے متعلق کچھ سوچتا ہے نہ اُس کو مد نظر رکھ کر فیصے کرتا ہے لیکن میں نے اپنی لائق کی خباثت کا اظہار نہ کیا۔

سلیمان اور اُس کی اطالوی بیوی کے جانے کے بعد میں کاسنی کمرے میں گئی تو سارا کمرہ صاف تھا۔ فرش پر پتھر پھیری ہوئی، غسلخانہ ڈھلا ہوا تھا۔

اس بار سلیمان ہم سے یوں رخصت ہوا جیسے امیر رشتہ داروں کے گھر سے دیہاتی غریب رشتہ دار چلے جاتے ہیں۔ اُس نے نہ ہمیں اپنا پتہ دیا نہ گرم جوشی سے الوداعی جملے ہی کہے۔ شاید اس نے بھانپ لیا تھا کہ یہ گھرانہ مغربی تہذیب کے نرغے میں آ گیا ہے۔ بچے انگریزی کتابیں پڑھتے ہیں۔ آپاجی اور خاں صاحب بھی اب مشرقی تہذیب کا حصہ بن رہے۔ پتہ نہیں سلیمان کا آدرش ٹوٹ گیا تھا یا اُس نے ایک نئے معاشرے میں آزادانہ اپنا مقام پیدا کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ چھڑکارا حاصل کرنے داستان سرائے سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جانے میں ہی عافیت سمجھتا ہو۔ وجہ جو بھی تھی کہ بعد سلیمان ہمارے ماضی کی داستان پارینہ بن گیا۔ اُسے صدا دیتے بھی تو بیکار تھا کیونکہ ماضی کبھی ملاقات کو سمجھ سکتا۔ اُسے دفن ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک دن میں نے اُس کا ذکر کیا تو خاں صاحب بولے..... ”جو شخص اپنے ماضی کی یاد دہا

حق ہے یا مستقبل کے اندیشے میں زندہ اُس کا حال بیکار ہو جاتا ہے۔“

زندگی نے ہمیں اور مصروفیات عطا کر دیں اور ہم ان دونوں کے قیام کو بھول گئے۔ ایک دن اچانک مجھے سوات سے ایک خط ملا۔ عجیب سی بات ہے لیٹر پیڑا داستان گو کا تھا لیکن لفافے پر مہر سوات کی تھی۔ خط میں رقم تھا کہ میں نے سوات سے کچھ زمین خرید لی ہے اور یہاں کاشتکاری کرتا ہوں۔ اس زمین کے عوض میں نے اپنی لندن کی زمین ان سواتیوں سے خرید کر لی ہے۔ ان کو لندن میں رہنے کا شوق ہے۔ میں یہاں اپنے آپ کو جنت میں محسوس کرتا ہوں۔ کئی سال میں نے یہ سیر کی۔ نوجوانوں کو پڑھایا۔ مہذب لوگوں کو قریب سے دیکھا۔ اب میں پرندوں کی طرح معصوم لوگوں میں رہتا ہوں۔ سفر فی تہذیب سے بہت دُور..... کھوتی پر اپنا سامان لاد کر منڈی لے جاتا ہوں (بہت دیر تک ہمیں سمجھ نہ آئی کہ یہ کیا چیز ہے۔ پھر انیق بیٹے نے عقدہ حل کیا کہ ٹیچر کو کہہ رہا ہے۔)

خاں صاحب انگریزی کی ڈکشنری پھر لے کر آیا۔ مصروف تھے۔ نوکی نے خط لے کر پڑھا اور بولا:

”ابو! اینڈریوز کے پاس اب پندرہ گدھیاں ہیں جن پر وہ سامان لاد کر منڈی لے جاتا ہے۔“

ایک روز اینڈریوز اپنے ساتھ ایک سواتی لڑکی کو لے کر آ گیا۔ یہ خوبصورت لڑکی اُردو پنجابی سے بالکل ناواقف تھی۔ چہرہ لکھی ہونا تو درکنار وہ تو اشاروں کی زبان بھی نہ سمجھتی تھی۔ یہ اینڈریوز کی تیسری بیوی تھی۔

”میں نے سوات میں اس لڑکی سے نکاح پڑھوا لیا ہے..... یہ کھیتی باڑی کے ایسے گرجانتی ہے کہ مجھے وہاں کام

کے مشکل نہیں رہا۔“

خاں صاحب نے حیران ہو کر کہا..... ”بھائی! تم لوگ عجیب اخلقت ہو جو چاہتے ہو کر لیتے ہو۔ اپنی زندگی سے

یوں کھینچنا اس کے ساتھ ایسے ایسے تجربات کرنا تمہیں ڈر نہیں لگتا؟ وہ اطالوی بیگم کیا ہوئی؟“

”وہ مسلمان تو ضرور تھی۔ گاؤں میں نہیں رہ سکتی تھی چلی گئی۔ اُس کا کلچر اُسے گھسیٹ کر واپس اٹلی لے گیا۔“

ہوا یوں کہ لندن میں اینڈریوز کے پاس زمین تھی اور اُس کی سواتی بیوی کا باپ لندن امیگریشن کے چکر میں تھا۔

یہ لڑکی پہلے تو اپنے سر کی زمین میں کھیتی باڑی کرتا رہا پھر جب امیگریشن کے کاغذات مکمل ہو گئے تو اینڈریوز پندرہ

کھوتیوں اور سواتی زمین کا مالک ہو گیا۔ ان ہی گدھیوں پر سامان لاد کر منڈی لے جاتا ہے۔ سادی زندگی سے وابستہ ہے۔

یہ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ اُس نے زندگی کے ساتھ تجربات کرنے بند کر دیئے ہیں کہ ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے۔

جانے وہ سوات میں ہے کہ کہیں جاپان، ملیشیا یا کہیں چین میں رہتا ہے۔ اُس کی سواتی بیوی ساتھ ہے کہ لندن

اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ لیکن نہ تو ہمارا تجسس اس قدر تیر بہدف ہے نہ ہماری دلچسپی ہی برقرار رہی۔ رابطہ ہو تو کیسے۔

اس کی چند نظمیوں میں رہ گئی ہیں جو کبھی کبھی اُس کی یاد تازہ کرتی ہیں۔

اس خط میں ایک اور صفحہ پر ایک نظم درج تھی اس کے نیچے 1975ء درج تھا۔ غالباً یہ نظم ہمارے پیڑ پر ہمارے

گھر میں ہی لکھی گئی لیکن پوسٹ سوات سے ہوئی۔ لکھا تھا۔

بانو قدسیہ کے لیے ازلی شکر یہ کے ساتھ!

جو حصہ آپ نے مجھے سلیمان ہونے میں ادا کیا اور دوسری مہربانیوں کے لیے (نیچے نظم تھی)

ایک مسلمان ملک میں ابھی تک میں بوڑھی مہاں پرشوں کی تلاش میں ہوں۔ مادہ سے بھری دنیا میں رہتے
ڈھونڈ رہا ہوں۔

میں دریا کنارے پیسا ہوں..... سوپر مارکیٹ میں بھوکا کھڑا ہوں۔

چائے خانوں سے ”چائے“ کی صدا آتی ہے۔

”روٹی اور ترکاری“

مسجد سے اذان کی آواز اٹھتی ہے ”اللہ ہوا کبیر“

اللہ سب پر حاوی ہے

دنیا بے معنی ہے

اللہ کہو اور ان سب کو بے کار کھیل تماشے کے لیے چھوڑ دو

میری آنکھیں برساتِ جناب ہیں

محبت کی رسی پکڑ کر Illusion کے بادلوں سے گزر کر مجھے سات بلند یوں پر چڑھنا ہے

پہاڑ کی اُس سفید چوٹی پر پہنچنا ہے جہاں میرا آقا میری راہ دکھاتا ہے

وہ ہمیشہ ایک ہے

ہمیشہ تنہا ہے

میری محبت کے بغیر اداس ہے

میں اپنی منزل بھول گیا اور کھیل کود میں مصروف رہا

اے اللہ مجھے سکھا

اے نبی ﷺ مجھے یاد دلا

”اپنا کام چھوڑ اور نماز پڑھنے جا

ایک انعام تجھے آخرت میں ملے گا لیکن اطمینانِ قلب تجھے آج ہی نصیب ہو جائے گا“

سلیمان اینڈریو

•1975

مذہب و ملت

اسی نظم کی پشت پر ایک اور نظم بھی درج ہے۔ یہ نظم اینڈریوز نے 1967ء میں لکھی تھی جب وہ ابھی مسلم لیگ

ہوا تھا اور اپنی پریشانی کی بندگلی سے نکلنا چاہتا تھا۔

”بند انجام“

وہ اُس شخص کو اختتام تک پہنچ چکا تھا

اُس گلی کے آخر تک

اُس پاپ سانگ کے انجام کو
اپنے خیالات کے ایسے لمبے سلسلے
جنہوں نے اُس کی زندگی کے مضافات کو

سہ پہروں تک ڈھانپ لیا تھا
اُسے اپنے کمرے سے کیوں اتنی نفرت تھی؟

اسی مسئلے کو سب سوچوں نے گھیرے میں لے لیا
پھر اُس نے سب کچھ ڈھیلا چھوڑ دیا

ہر شے کو زمین پر بکھرنے دیا

وہ فرش پر ٹھنڈا لینا سگریٹ پیتا رہا

دیوار پر بارش اور سورج پھسلتے رہے

اور وہ کھلی آنکھوں انہیں دیکھتا رہا

وہ تذبذب تھا.....

شاید دیر ہو چکی تھی

اور اس دیر کے اصل میں کیا معنی تھے

وہ ہر شے کے معنی کھو چکا ہے

تذبذب ہے کہ کیا کبھی کوئی چیز با معنی بھی تھی

وہ اپنے آپ کو ایک ٹھنڈا ستارہ سمجھتا ہے

جس نے اپنی مروت میں سورج کو جنم دے رکھا ہے

وہ آرزو مند ہے کہ کسی دن ہر امید ختم ہو جائے

پھر وہ پارک میں کھلی ڈھوپ میں اگتا رہے گا

گھاس کے لاکھوں beds میں ایک تنکا

جیسے صبح کے وقت گھاس کاٹنے والی مشین کا بلیڈ

کاٹ کر دھردے

وہ بزرے کے فوارے میں تیرتا رہے گا

اُسے شدید آرزو ہے کہ

یا تو اُسے پروا ہو یا وہ بے نیاز ہو جائے

وہ جاننا چاہتا ہے کہ کیا وہ مر رہا ہے

یا زندہ ہے

اینڈریوز کی نظم پڑھ کر ہم دونوں دیر تک چپ رہے۔ یوں لگا جیسے ایک مدت بعد کوئی گمشدہ انگلی بیٹھ گیا ہو۔ ہیرا گر چکا تھا۔ خاں صاحب نے بالآخر بڑی جرأت سے کہا ”زیادہ مت سوچو قد سید! بڑے سے بڑا ادیب بھی کہتا ہے کہ کہانی نہیں بن سکتا۔ سلیمان بھی ایک ایسی ہی کہتا ہے جس کی نہ کوئی ابتدا ہے نہ انتہا..... بس وہ ہمیں سے نکلتا ہے۔ کہیں ختم ہو جاتا ہے۔ جو کچھ ہوتا ہے ہونے دو..... جو نہیں ہو سکتا اُس کی آرزو میں اپنا آپ بھسم نہ کرو۔ آرزو کے پیچھے بھاگنے والا چاہے مجھوں ہو..... چاہے کوئی سائنس دان کوئی صوفی ہو یا شریعت کا پابند..... آرزو کے تعاقب میں ہرگز درست نہیں۔ اس کے لیے شائق کا آسن لگا کر انتظار کرنا پڑتا ہے۔ دیکھنا پڑتا ہے کہ آخر اُس وحدہ لا شریک کی عبادت ہے..... کیوں ہے نہیں..... بلکہ کیا ہے..... یہی بڑا راز ہے۔“

سفر (اوسلو)

سن 1982ء میں Loriters Ilson Oslo نے مجھے اور خاں صاحب کو اوسلو مدعو کیا۔ ناروے کے خوبصورت شہر کی عمارتیں گویا آئینہ خانہ تھیں۔ سڑکیں دھلی دھلائی، لوگ شانستہ سفید اور نرم طبیعت تھے۔ ہمیں جنس تھسٹین سے ملاقات ہوئی جنہوں نے قرآن کریم کا ترجمہ ناروے کی زبان میں کیا تھا۔

بہت سے ادیبوں سے بھی واقفیت ہوئی لیکن زبان آڑے آئی لیکن Helge Vatsend کو ہم اپنی زبان پٹاری میں ساتھ لے آئے۔ اس سے Trolls کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے دوران ہمیں پتہ چلا کہ وہ شاعر ہے۔ اُس کی کچھ نظمیں انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکی ہیں۔ ناروے کے لوگ روپ میں Trolls بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

Trolls ایک نوعیت کی دیومالائی مخلوق ہیں جیسے جن اور پری کا تصور ہمارے ادب اور لوک کہانیوں میں ملتا ہے۔ ان ٹرولز کا کام انسانوں کی مدد کرنا اور مشکل وقت میں اشارے کنائے سے انتباہ کرنا ہے۔

قریباً سال کے بعد ہیملے ویت سینڈ کا خط ملا۔ اُس کی چند نظمیں بھی ملفوف تھیں جو آپ کو سنائے دیتے ہیں۔ (انگریزی ترجمہ Olav Grinde نے کیا ہے)

(1)

”چیتل“

ہر روز تکنیک (Perfect) ہوتی جاتی ہے

ہمارے لوگ روم میں اب شو ہوتا ہے

دنیا کے ریکارڈ

نیا گرا کی گھن گرج

گھاس کے blades پر کیڑے مکوڑوں کی زندگی

بے رچی کی حد تک بے نقاب

لیکن خوبصورت رنگوں میں موجود

لیکن ایسے دن بھی آتے ہیں

جب ٹی وی کے رنگ گرے ہو جاتے ہیں

جس طرح خزاں کی بارشیں مناظر دُھندلا دیتی ہیں

اور چہرے دُھندلا دیتے ہیں

لیکن جلد ہی دوسرے پروگرام ان کی جگہ آ جائیں گے

چینل کا سوچ کچل کی آزادی کا سہل ہے

جھنڈا اور تھیلا ہے

ہم پھر یور نہیں ہوں گے

پھر ہم سڑکوں پر اکٹھے ہو کر

بے صبری سے تبدیلی کے نعرے نہیں لگائیں گے

دنیا کی تصویر پر ہمارے لیے اور بھی perfect ہو جائے گی

ہماری زندگی سے حیات کا رس

لحہ بہ لحہ پہر در پہر چوتی ہوئی

(2)

Light Rope Art (ایک جھلکی)

شعبہ باز او نچا آسمان میں چڑھا

مسکراتا ہے

وہ تہی ہوئی سرکس کی رسی پر تنہا ہے

جانتا ہے کہ اگر وہ گر پڑا

تو پھر سب کچھ ختم ہے

کیونکہ سرکس پر صرف Perfection دکھائی جاتی ہے

ہم Sirens بجاتے چیختے

اُس کے گرنے کا انتظار کرتے ہیں

ریس کاریں اپنے راستوں سے گر کر اُلٹی ہیں
 ڈرائیوروں کی گردنیں ٹوٹ جاتی ہیں
 سیلابی لہریں
 بموں سے مسمار گھر
 ہمارے عہد کی تباہیاں
 آج کے نو وارد وقت

لیکن ہمیشہ وہی چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں
 وہی الفاظ
 اُن لوگوں کے منہ سے جو ٹیلی ویژن کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں
 الفاظ، تصویریں
 متوازن آراء
 رسی پر چلنے والا شعبہ باز مسکراتا ہے
 صرف ہم ہی شکوک کے ساتھ رہتے ہیں

(3)

The Unspeakable. Translated by Olav Grinde (ناگفتنی)

جان من ایک خار دار لمبے راستے پر پہنچ کر
 ایک ایسے ناگفتنی مقام پر پہنچنا
 جہاں الفاظ کی اشد ضرورت ہو
 ہم اُس متن میں
 اپنی خالی جگہیں بنا لیتے ہیں
 جہاں صرف خاموشی ہوا کرتی ہے
 ایک ایسی چپ جسے دانش کہا جاسکتا ہے
 گھنٹی کی طرح خالی
 باہر اندھیرے میں گھاس کے blade جیسی
 مسل ٹوکے نیچے دیئے گئے بوسہ کی مانند
 ایک مکمل بات

ہمیں پرانی دانش سے بھری کہاتیں
اپنی خاموشی پر چھائی لگتی ہیں
جو ایک بلی کی طرح
اپنے نرم پنجوں پر
دامروں میں چلتی ہے

(4)

(Silence) سناٹا

کچھ بھی تو نہیں ہوتا
دن آہستہ آہستہ گزرتے ہیں
شام کے وقت
تھکے ہارے رپورٹر کی طرح گھر لوٹتے ہیں
چیننے چلا تے آگے بڑھتے
تعاقب میں تیز تیز
منتظر

ایسے شگون کے لیے
جسے آسمان میں بادل
ہو میں Tension ہے
اور جسم خارش سے بھر گیا ہے
آنے والا کل
دھرتی کے سخت سینے
ہل چلانے آئے گا
ایسا ہل جو ہمارے ہل سے بھاری ہوگا
ہم منتظر رہتے ہیں
ہماری پریشانی معکوس ہو
ہماری روح میں گھس بیٹھتی ہے
ایک دن یہ خاموشی
ہمارے کان کے پردے پھاڑ دے گی

سفید موت
خاموشی کی سفید موت
برف زمین سے ڈھانپ دی جائے گی
اور اُس پر لہو ہوگا

(5)

Game (کھیل)

سکہ مشین میں ڈالا جاتا ہے
Pin Ball مشین کی ساری حرکتیں مشینی ہیں
میرے متحرک جذبات اس کے حریف ہیں
فتح مندی، دولت، آزادی
ایسے الفاظ سے میرے خواب اور امیدیں وابستہ ہیں
ایک دن ایسا لمحہ ضرور آئے گا
ایسا لمحہ شگاف
جب پہلے ٹھیک بیٹھ جائیں گے
جس طرح کوئی نظم اچانک دل کو بلا دیتی ہے۔

یہ نظمیں غالباً ستر کی دہائی میں لکھی گئیں اور مجھ تک 1983 تک پہنچیں۔ یورپ کے یہ لوگ مشینی زندگی سانس
کی برکات اور اس سے پیدا ہونے والی تنہائی سے دنیا میں سب سے پہلے آشنا ہوئے۔ ان کی برف پر انسانی لہو کی بھرتی
قتل سے نہیں بلکہ انسان کی آئیڈیلز کی ٹوٹ پھوٹ سے بہ نکلیں۔
میں نے یہ نظمیں اس لیے گوش گزار کی ہیں کہ ابھی ہم نے Perfection کی دوڑ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ہم
اکثریت ٹیلی ویژن کے آگے بیٹھ کر کارریئر، سونامی کے سیلاب، زمانے بھر کے اشتہار نہیں دیکھتے تھے۔ ہمارے بچے
سکہ ڈال کر جوا کھیلنا نہیں سیکھا تھا۔ ہم ابھی دیہات کے سوئے ہوئے کلچر اس کی جہالت، رسم و رواج، مذہب اور اس کی
سے حاصل شدہ سکون سے آشنا تھے۔

جس کیفیت سے گزر کر یورپین ادب اور ہیلگے جیسے نامعروف شاعر کی نظمیں وجود میں آئیں یہ ورثہ
بیسویں صدی کے آغاز میں یا اس سے کچھ ہی دیر پہلے ملا۔ مشرق کی سخت زمین میں بل چل رہا تھا۔ تبدیلی آرہی تھی۔
لیکن ابھی ہمیں شعوری طور پر اس کا کلی احساس نہ تھا۔



آخری ایام (گھر کو واپسی)

کچھ تو خاں صاحب کی بیماری نے کم توڑ دی تھی کچھ نفسیاتی، قلبی ذہنی طور پر میں خوف سے تڑی تڑی ہو گئی تھی۔ ایک خوش الحان راست گوسا تھی سے پچھڑنے کا برا خواب ہر وقت ساتھ تھا جسے میں گس رال سے اڑاتی رہتی تھی، لیکن نہ خواب در ماندہ پیچھا چھوڑتا تھا نہ ہونی ملتی ہی نظر آتی تھی۔

چھ ستمبر کی رات عجیب بے کسی سے پایادہ چل رہی ہے۔ خاں صاحب کی ذہنی نبض اتنی دھیمی تھی کہ بار بار شبہ ہوتا بھی ہے ابھی نہیں ہے۔ سرخ و سپید چہرہ جس نیکی پر دھرا تھا اسی کی مانند سفید ہو چکا تھا۔ بازوؤں کا گوشت جھار صفت لٹ رہا تھا۔ نہ بالوں میں آب و تاب باقی تھی نہ داڑھی میں چمک تھی۔ درو مسلسل چھاپے مار رہا تھا، لیکن اُن کی آواز میں سیوری، ناٹھکی بانی یارتی بھرشکا جیتی اہجہ در نہ آیا تھا۔

وہ بار بار اُٹھتے مجھے ہلاتے۔ میں اُٹھتی پاس جاتی وہ کمزور مدہم آواز میں کہتے ”میں نے تمہیں بہت تنگ کر رکھا ہے۔“ میں جواب میں کچھ نہ کہہ پاتی۔ کچھ دیر میں اُن کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھتی۔ پھر وہ بڑے تردد کے ساتھ مجھے کہتے ”سو جاؤ اور یہ میرے ہلانے پر بھی نہ اُٹھنا۔“

اُن کی تکلیف اس قدر زیادہ تھی کہ اندر ہی اندر یہ دُکھ مجھے ستار ہا تھا کہ کاش وہ قوت برداشت کا مظاہرہ کرنے کے بجائے روئیں، چلائیں، او ویلا چائیں۔ لیکن خاموش شیر قالین تو صاحب فراش تھا۔ ہم دونوں جاگ رہے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو سٹلانے کا مشغلہ اپنائے ہوئے تھے۔

رات قطرہ قطرہ گزر رہی تھی جیسے ڈرپ میں لگا خون۔

کمرے میں ایئر کنڈیشنر کی آواز چہرے پر منڈلانے والی کھٹی کی طرح بھجننا رہی تھی۔ کمرے میں لگا کلاک میں نحوست پھیلانے کے انداز میں سیکنڈ کی سوئی بجائے جا رہا تھا۔ آج اس کی آواز گویا کوچ کا نغمہ تھا۔

کمرے میں زیر و کا بلب روشن تھا، جس کی روشنی پر یاس کا پیلا پن نمایاں تھا۔

کتابوں سے لدی الماریاں جامد باسی اور پرانے کاغذوں کی بو باس کمرے میں سپرے کر رہی تھیں۔ یہ سب کیوں میری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا تھا کہ تمام خاکستری کتابیں زرد رنگ کی ہو چکی ہیں اور ان پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کتابوں کے عنوانات جو خاں صاحب کی لکھائی میں کتابوں کے پشتوں پر تھے پڑھے نہ جاتے تھے۔ اُبھرنے والی صبح پچھڑنے والی رات سے گلے مل رہی تھی۔ گویا کسی مستقل دھچکوزے سے خوفزدہ ہو کر آنسو سے بھیگ گئی ہو۔

قریباً چار بجے تھے جب انہوں نے مجھے بلایا۔

”سنو انیس خاں کو فون کر دو..... وہ آ جائے۔“

میں نے پُر امید ہونے کے انداز میں غلط جواب دیا..... ”آپ فکر نہ کریں خاں صاحب! ابھی صبح ہو۔“

ہے۔ وہ خواہ مخواہ پریشان ہو جائے گا۔“

”اچھا۔“ انہوں نے اپنی کربل کربل کرتی پریشانی کو برداشت کے پتھر تلے دبا لیا۔

پھر چھ بجے کے قریب انہوں نے آواز دی ”باناو... مونس؟“

میں جان بوجھ کر آنکھیں ملتی اٹھی ”جی خاں جی!“

”یہ ذرا میری نبض دیکھنا۔“

وہ بدھا روپنی چہرہ لیے لیٹے تھے۔ چہرے پر رتی بھر پریشانی نہ تھی۔ گرہ نیم باز کا قرض چکانے کے بعد

اطمینان کی صورت۔

میں نے نبض محسوس کرنے کی کوشش جاری رکھی..... انہوں نے بھی اپنے ایک ہاتھ سے دوسری کلائی کو محسوس

دونوں چپ رہے۔

پھر میں نے ہائی نون کے ڈاکٹر عاطف کے موبائل کا نمبر تلاش کیا اور اُٹھ کر غسل خانے میں چلی گئی۔ میں نہیں

تھی کہ وہ میری آواز سے کچھ اندازے لگا لیں۔

”عاطف! پلیز آپ آ جائیں۔ خاں صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”کیا ہوا؟“

”بس جی نبض بہت آہستہ چل رہی ہے اور.....“

”آپ فوراً ڈرپ لگوائیں۔“

”اچھا جی..... آپ آ جاتے اگر تو تسلی ہو جاتی۔“

”میں ضرور آ جاتا لیکن اس وقت میں ایئر پورٹ جا رہا ہوں۔“

میں واپس کمرے میں آ گئی۔

”عاطف کو بلایا؟“ اُن کی آواز میں کوئی جھگڑا نہ تھا۔

”وہ ایئر پورٹ جا رہے ہیں..... اسلام آباد..... میں اشیر بیٹے کو جگلاؤں؟“

”ناں ناں..... پہلے وہ رات ایک بجے تک بیٹھا رہا ہے۔ بیٹکر کی نیند خراب نہیں ہونی چاہئے۔ بڑی ذمہ داری کا

”انہیں کو فون کروں؟“

”ناں ناں..... تم بھی سو جاؤ۔ اب میں ٹھیک ہوں۔“

خاں صاحب نے مسکرانے کی کوشش میں ہونٹ ٹیڑھے کر لئے۔

میں ڈاکٹر عاطف گوہر کو فون ملانے میں مصروف ہو گئی۔ ساڑھ ہسپتال والے ڈاکٹر گوہر.....

وہ غالباً موبائل ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے۔

”ڈاکٹر صاحب! خاں صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں.....“ میں چپ ہو گئی۔

”ابھی ڈرپ لگائیں گے ٹھیک ہو جائے گی۔“

مجھے یوں لگا گیا وہ پہلے سے ہسپتال کی ایسولینس میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ابھی میں سوچ بھی نہ پائی تھی کہ کیا کرنا

ہوگا۔ کیا ہونا درکار ہے کہ ڈاکٹر گوہر آن پہنچے۔ ہم قریباً دس منٹ میں باہر آ گئے۔ پہلے ڈاکٹر صاحب نے شتوجی کو

سیس میں سوار کرنا چاہا پھر کچھ سوچ کر بولے انہیں میری کار میں شہادت دیجئے۔

اس وقت جب ہم انہیں کرسی سے فرنٹ سیٹ پر منتقل کر رہے تھے۔ اشیر خاں بینک کے لیے تیار ہو کر آ گئے۔

”میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں ابو.....“

باباجی

(از ڈاکٹر عاطف گوہر)

صبح سات بجکر پچیس منٹ پر بانو آ پا کی مخصوص سکون آمیز آواز میرے کانوں میں پڑی۔ ”ڈاکٹر صاحب

صحیف کی معافی۔ خاں صاحب کی طبیعت چار بجے سے کچھ ٹھیک نہیں۔ ٹھنڈے پینے آ رہے ہیں اور کئی کروٹ آرام

ہیں۔“ میں نے پچھلے چھ ماہ کے اس کنٹینر امتحان سے گزرتے ہوئے کم ہی کبھی بانو آ پا کو پریشان دیکھا تھا۔ اس

احوال پسند شفقت و ممتا کی بارعب ویوی کو جو سفید لباس اور سفید کھلے دوپٹے میں اپنے آپ کو پسینے رکھتی جب خاں

صاحب کے بارے میں زیادہ تشویش ہوتی تو وہ پنجابی کے بجائے اردو میں اس کا اظہار کرتیں۔ اُس دن آپ کی اُردو

تک کر میرا دل ایک ہارٹ بیٹ مس کر گیا۔ خیال آیا کہ اشفاق احمد صاحب جو پچھلے تقریباً چھ ماہ سے انتہائی تکلیف دہ

حالات کا مقابلہ مرحلہ وار احسن طریق پر کر رہے تھے۔ شاید آج اس دنیا میں اپنا آخری فرض بھی عالمانہ تحمل اور صوفیانہ

سیر و دلیری سے سرانجام دینے لگے ہیں۔

آغا جی کا قول ہے کہ دل میں جو پہلا خیال آتا ہے وہ اللہ تبارک و تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے۔ میں نے

میں سوچ کو ذہن سے نکالنے کی کوشش کی اور ایک بار پھر اللہ سبحانہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ وہ اشفاق صاحب کو آسانیاں

فرمائے۔

یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اشفاق صاحب سے میری ملاقات صدیوں پہلے ہوئی تھی۔ یادداشت کو کریدیں تو بھی بچپن میں ریڈیو پر تلقین شاہ کا یکتا انداز اور ہر لعلیز مثبت مزاحیہ بیان اُبھرتا ہے جسے میں بڑے شوق سے اپنے چہرے کے ساتھ بیٹھ کر سنتا تھا۔ اس زمانے میں آپ کی سبق آموز باتیں تو سمجھ میں کم آتی تھیں مگر ہلکی پھلکی خوش باش گفتگو ضرور لطف اندوز ہوتا تھا۔ پھر تقریباً سات سال پہلے سائرہ ٹرسٹ ہسپتال کی ایک تقریب میں آپ سے بالمشافہ ہوئی اور آپ بہت بھلے لگے۔ اس وقت آپ بلاشک و شبہ اپنے منفرد انداز بیان اور صوفیانہ گفتگو کی وجہ سے ساری مجلس ایک جداگانہ عالی و قابل رشک مقام بنا چکے تھے۔ آپ کی فکر کا کوئی استاد اور عالم جو بات کو کہانی کا رنگ دے کر اسے انداز میں کسی بھی محفل میں نہایت طمانیت سے ذہن نشین کرا سکے اور سمجھا سکے کم ہی کوئی نظر آتا تھا بلکہ آج بھی آپ آتا۔ آپ ترقی پسند تھے اور زمانہ شناس تھے۔ اولیاء اللہ اور علماء میں ایک واضح فرق یہ ہے کہ اولیائے کرام زمانہ شناس نہیں پہچانتے ہیں اور حاضرین اور معتقدین کی ذہنی قابلیت کو سامنے رکھتے ہوئے بات سمجھاتے ہیں۔ دوسری طرف اکثر زمانے سے نا آشنا اپنے علم کی بھاری بھر کم رسلوں کو دوسری کے سروں پر دھونستے ہوئے فرعونی اہرام مصر تعمیر کرنے کے چکر میں رہتے ہیں۔

بانو آپ سے فون پر بات کرنے کے بعد میں نے سوچا کہ بہتر یہی ہوگا کہ خورد چل کر اشفاق صاحب کی مزاج پر کراؤں۔ پھر خیال آیا کہ بیگم کو بھی ساتھ لے چلوں کہ اگر ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی تو وہ بانو آپ کا ساتھ دے گئے۔ آٹھ بجے سے کچھ پہلے داستان سرائے پہنچے۔ مجھی خدمت گزار جو اس سال ریاض ہمیں جلدی سے اشفاق صاحب کے کمرے میں لے گیا۔ میں نے اس مجھی خدمت گزار اور اس کے بھائی اعجاز کو ہمیشہ فرض شناس چابک دستی سے سمجھا۔ صاحب کی خدمت کرتے دیکھا۔ اشفاق صاحب ہمیشہ انہیں بیٹا یا پتر کہتے اور وہ انہیں ابو۔ ویسے بھی جس گھر کا سربراہ ہے ایک منچلا خدا ترس صوفی عالم ابو ہوا اور جس گھر کی مالکن ایک درویش صفت عجز و انکساری کی بیکر آپا ہو تو اس سرائے میں والا ہر جمادونبات اور ذی روح کھلی بانہوں اور بے فتنن جبین سے اپنے آرام کو پس پشت ڈال کر دوسرے کے آرام کو سوچے گا اور اس دنیا دار فقیر کے تو انداز ہی نرالے تھے۔ میں نے کبھی نہ دیکھا کہ آنے والے کی آؤ بھگت ایسے نہ کی جاتی ہو جیسے وہ ہی خاص الخاص ہے۔ رنگ برنگے مشروبات، میٹھے لذیذ پکوان اور سیلے موٹی پھلوں سے لدی پھندی نرانا تہ کے ساتھ ساتھ کمرے میں آ موجود ہوتی۔ قسم قسم کی جزی بوٹیوں سے بنے ہشاش بشاش کر دینے والے قبوے لگائے سرائے کا خاصہ ہیں۔

لبہ کے جاں لیوا کینئر نے اشفاق صاحب کے منہ کا ذائقہ بدل کے رکھ دیا تھا۔ ابتدائے مرض میں انہیں کھانا تو لگتی تھی مگر کھانا بمشکل نیچے اُترتا تھا۔ آخری ایام میں تو بھوک بھی مرگئی تھی اور جسم آدھا رہ گیا تھا۔ ایک روز میں شام کے وقت گیا تو نہاد ہو کر صاف شفاف لباس زیب تن کیے لیٹے تھے۔ فرمانے لگے آج میں نے نہانے کے بعد اپنے کو دیکھا تو یہ تو بہت چھوٹا چھوٹا سا رہ گیا ہے۔ آپ کی خوش خوراک کی دیدنی تھی۔ نہایت انہماک سے دیسی مرغی کے شوربے سے گرم گرم روٹی کے لقمے ڈبو ڈبو کر آپ کو کھاتے دیکھ کر میں خوب محظوظ ہوا کرتا تھا۔ مگر اب آپ کا گزارہ بمشکل دو چوتھوں اور دو دھبی اور شربت پر تھا۔

اس انتہا درجے کی جسمانی کمزوری کے باوجود آپ کا ذہن آخری لمحے تک چاق و چوبند رہا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ آپ کی دلچسپی، مفصل اور پُر مقصد تمہید باقی نہ رہی۔ اب آپ چند جامع اور کھرے جملوں میں بڑے بڑے پیچیدہ مسائل کا حل بتا دیتے تھے۔ وصال سے آٹھ دس روز پہلے میں نے اس بوستانِ علم و ہدایت سے جب دریافت کیا کہ کیا کتبِ اقبال کا فلسفہ خودی تصوف کے فلسفہ بے خودی سے ہم آہنگ ہے۔ تو فرمایا ”بیٹا! اصل میں اقبال کی خودی وحدتِ وجود ہے۔“

سلسلہ شفا سے متعلق کئی ڈاکٹر، حکیم، ہومیوپیتھ، جوگی، عامل اور فنکار اس عالم صوفی کے درد کا کچھ مداوا کرنے پہنچے۔ ایک صدی سے کچھ اوپر اُلفت و محبت کے اس مبلغ کی شگفتہ تحریر اور گفتگو کا اثر تو انہوں نے شاید بہت زیادہ نہ لیا تھا مگر وہ ضرور دھنتے رہے تھے۔ آپ کو اور بانو آپا کو خوب علم تھا کہ شفا ان نعمتوں میں سے ایک ہے جو اللہ تعالیٰ خود بانٹتا ہے۔ یہ کبھی اونچے اونچے دکتے چمکتے صنعتی ہسپتالوں کے سوداگروں کے ذریعے اور کبھی کسی طبیب کی دقیا نوسی بے دام کھانے میں پائی جاتی ہے۔

آپ پیدائشی طالب علم تھے۔ خوب جانتے تھے کہ اصل عالم ہمیشہ طالب علم رہتا ہے۔ وصال سے تقریباً سال پہلے آپ کی ملاقات سلسلہ نقشبندیہ کے روحانی پیشوا آغا جی سے ہوئی۔ دونوں کی یہ کوشش رہتی کہ وہ دوسرے کو ہی سزا دے دیں۔ ایک دن تو اشفاق صاحب کہہ ہی اُٹھے ”آغا جی لوگ میری باتیں سننے آتے ہیں لیکن میرا دل چاہتا ہے کہ آپ تشریف لائیں تو میں چپ ہو کر آپ کی باتیں سنتا رہوں۔“ ہم وہ خوش قسمت ہیں جنہوں نے کئی بار ان سے اور نفع بخش محفلوں کے مزے لوٹے۔

تفصیص مرض اور ایک پیچیدہ اور میجر سرجری کے کٹھن مرحلے سے گزرنے کے بعد ایک دن آغا جی اشفاق صاحب سے فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی لامحدود حکمت میں انسان کی بنیادی ضروریات انسان کو فری مہیا کر رکھی ہیں۔ انسان کو کسی کا دروازہ کھٹکھٹانا نہیں پڑتا۔ یہ بازاروں میں فروخت نہیں ہوتی۔ اسی طرح ہدایت اللہ ملتی ہے۔ جب چاہتا ہے فری مہیا کر دیتا ہے۔ یہ ہنگے داموں مہنگی مہنگی درگاہوں سے خریدی نہیں جاسکتی اور یہی حال اللہ کا ہے۔ اللہ یہ نعمت بھی خود بانٹتا ہے۔ یہ جنس تجارت نہیں۔ اشفاق صاحب جبکہ اُنھے اور ماتھے پر ہاتھ مار کر فرمایا ”یہ سبک داری بات تو مجھے پتا تھی مگر یہ ہدایت اور شفا والی بات اب سمجھ میں آئی۔“

آپ منہ کا ذائقہ بحال کرنے کے واسطے جوارش کمونی اور جوارش تھرہندی کا استعمال کرتے۔ درد کو زور کرنے کے لیے ہومیوپیتھی اور ایلوپیتھی کی ملی جلی گولیاں لیتے۔ جب طلائی کا استعمال بھی خوب کیا کہ یہ مقوی قلب ہے اور آغا جی کی طبیعت ان گولیوں کی خوب حفاظت کرتے۔ یہ مسور کے دانوں سے آدھی بلکہ اس سے بھی کہیں چھوٹی گولیاں تھیں جن کی قیمت میں آٹھ ماہ سے اوپر کا عرصہ درکار ہوتا ہے۔ آپ انہیں شرارت سے بچھدکتی بے قرار گولیاں کہہ کر یاد کرتے۔ جسمانی کمزوری آپ کو بہت زچ کیے دیتی تھی مگر میں نے آپ کو کبھی گھبرایا ہونا پایا۔ تقویت حاصل کرنے کے لیے آپ باقاعدگی سے صائم لیتے اور کئی بار ہم انہیں طاقت و توانائی کی ڈرپ دیتے۔ آپ سب معالجین کے مشورے بغور سنتے اور پھر اپنی طبیعت مزاج اور ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے فیصلہ کرتے۔ مگر جب فیصلہ کر لیتے تو اس پر کار بند رہتے۔

ایک روز سائرہ ہسپتال میں اوپر پرائیویٹ کمرے میں آپ ریگولر معائنے کے بعد پریٹین اور ڈاکٹر ڈرپ لگوار ہے تھے۔ فزیشن ڈاکٹر فواد صاحب نے مشورہ دیا کہ آپ کی دل سے متعلقہ ادویات میں کچھ ردوبدل ہے۔ کہنے لگے یہ دل کی دوائیوں والا نسخہ پروفیسر ڈاکٹر زبیر صاحب ہارٹ سپیشلسٹ کا ہے۔ ان کے مشورے کے اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ میں نے جلدی جلدی زبیر صاحب سے رابطہ کیا۔ وہ حسب وعدہ ایک آدھ گھنٹے سائرہ ہسپتال پہنچ گئے۔ ساری بات سنی اور ہنس کے کہنے لگے خاں صاحب یہ نسخہ تو میں نے آپ کو چھ سات سال پہلے دیا تھا۔ اشفاق صاحب نے کہا ”جی ہاں! لیکن ان دوائیوں سے مجھے فائدہ ہے اس لیے میں اس وقت سے یہ نسخہ روزانہ لے رہا ہوں۔“

اُس دن بیگم اور میں صبح آٹھ بجے سے کچھ پہلے آپ کے کمرے میں پہنچے۔ تین دیواروں پر نہایت سلیقے سے سچی ایک جیسے خاکی کاغذ میں لپٹی ایک جیسی سیاہی اور ایک ہی قلم سے مارک شدہ کتابیں آراستہ تھیں۔ جب بیگم نے اپنی بیگم کو اشفاق صاحب سے ملوایا تو وہ اتنی محنت اور باریک بینی سے محفوظ شدہ اس خزانے کو دیکھ کر خاموش رہ گئی کہہ اٹھی کہ وہ اتنے سلیقہ اور شائستگی سے یہ کام کیا گیا ہے۔ اشفاق صاحب نے اسے بتایا کہ یہ کام انہوں نے آپ سے کیا ہے۔ سینٹ کے تھیلوں کو صاف کر کے ان سے یہ کتاب پوش بنائے ہیں اور بازار سے کافی سارے ایک جیسے لیے تھے کہ تحریر بھی مماثل رہے۔

اس کمرے میں سامنے میز کرسی اور آپ کا قلمدان آراستہ تھا۔ دو اطراف صوفے اور ایک جانب گتے کے لیے گدا پڑا تھا۔ اشفاق صاحب کا بستر ان کتابوں کے زیر سایہ مغرب کی جانب لگا تھا جس کی پائنتی کی طرف چسپاں خسرو کا ایک شعر دریاے محبت کی اُلٹی روشوں کی نشاندہی کر رہا تھا۔ آپ سفید کرتا پہنے اور سفید چادر اوڑھتے فرما رہے تھے۔ سلام دعا کے بعد کہنے لگے ”عاطف میاں! رات تکلیف ڈرا زیادہ ہوگئی اور تمہاری آپا کو بہت شب آپ کو پیٹ میں شدید درد تھی اور پسینے اتنے چھوٹ رہے تھے کہ آپ کے پتے شرابور تھے۔ آپ کا جسم ٹھنڈا ہونے لگا۔ کسی بھی حصہ میں کوئی بھی نبض محسوس نہ ہو رہی تھی۔ مگر آپ بقائم ہوش و حواس گفتگو کر رہے تھے۔ گرمی محسوس ہونے آپ نے بانو آپا سے کہا کہ اے سی چلا دو۔ پھر چند منٹ بعد پیکھا بند کر دینے کو کہا۔ میں نے بہتر جاننا کہ ہسپتال شفٹ کروں۔“

سائرہ ہسپتال فون کر کے میں نے ایسبولینس منگوائی اور خود درد کا ٹیکہ لینے داستان سرائے سے کھانسی غیر موجودگی میں اشفاق صاحب نے میری بیگم سے کہا ”آج ڈاکٹر صاحب کو پتہ نہیں کیوں اتنی جلدی پڑ گئی ہے۔ اسے ناشتہ کر کے نہادھو کے ہسپتال چلتے۔“ پانچ آٹھ منٹ میں ایسبولینس بھی پہنچ گئی اور میں ٹیکہ بھی لے آیا۔ آپ بازو خود میری طرف بڑھایا اور قیض کا بازو اوپر کرنے لگے۔ اس اثنا میں آپ کے چھوٹے صاحبزادے اشفاق صاحب نے میں ٹائی پکڑے کمرے میں آگئے۔ وہ اپنے بینک جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

درد کا ٹیکہ لگنے کے بعد آپ کے دونوں محبتی خدمت گزاروں نے آپ کو ایک مضبوط کرسی پر بٹھایا اور کرسی کے عملے کے ساتھ آپ کو اٹھا کر باہر پورچ میں لے آئے۔ ایسبولینس کچھ تو ویسے ہی اونچھی تھی اور کچھ اس کی سنجیدگی

اشفاق صاحب کا اس میں بیٹھنا دشوار تھا۔ ساتھ ہی میری گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے ان سے کہا اس میں چلے۔ مگر سیٹ پر بمشکل اشفاق صاحب کو دراز کیا۔ اب وہ بالکل خاموش ہو گئے تھے۔ ریاض نے کچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ہنسی سے انہیں سہارا دیا۔ پھر بانو آپ نے ریاض کو چند ضروری ہدایات دیں اور اس کی جگہ خاں صاحب کے پیچھے بیٹھ گئے۔ ہم داستان سرائے سے ماڈل ٹاؤن کی رنگ روڈ پر نکلے تو اشفاق صاحب کا سر کچھ دائیں جانب کو

آخری مہینوں میں انتہائی نقاہت کے باوجود آپ نے مطالعہ کی عادت ترک نہ کی تھی۔ ”ظلم ہو شر با“ پڑھنے لگے۔ تو تھی مگر ہلکے پھلکے رسالے پڑھتے رہتے تھے۔ ان دنوں ”ریڈرز ڈائجسٹ“ پڑھتے ہیں نے انہیں کئی بار دیکھا۔ مجھے کہ اس میں کہانی مختصر ہوتی ہے۔ میں ایک آدھ نشست میں پڑھ لیتا ہوں۔ اخبار کا مطالعہ بھی باقاعدگی سے کرتی اور بین الاقوامی حالات پر گہری نگاہ رکھتے۔

جب حکومت نے ”پہلے پاکستان“ کا نعرہ لگوا دیا گیا تو اشفاق صاحب نے اس سوچ پر سخت ناپسندیدگی اور کھینچا کر کیا۔ فرماتے تھے ”اس طرح تو میں نعرہ لگاؤں پہلے لاہور یا پہلے ماڈل ٹاؤن۔ یہ ایک غلط اور منفی سوچ ہے۔ میرے صداق والی سوچ ہے کہ اپنا گھر بچانے کے لیے سانچے دشمن کے ساتھ مل کے اپنے ہم مذہبوں اور ہم قوموں کو روک دو اور دشمن بھی ایسا کہ جس کے متعلق اللہ سبحانہ تعالیٰ نے قرآن میں فیصلہ صادر فرما دیا ہو کہ وہ تمہارا خیر خواہ اور دوست ہو سکتا۔“

دنیا کے حالات دیکھ کر اشفاق صاحب دل ہی دل میں بہت کڑھتے تھے۔ عراق، فلسطین اور کشمیر کے دن شہید کر دیئے جانے والوں کا حساب کر کے مجھے گناتے کہ آج اتنے مسلمان شہید ہوئے اور آج اتنی عورتوں سے ملاقات کے بعد وہ سمجھ چکے تھے کہ ان ہلاکت خیز اور آفت انگیز حالات سے مسلمانوں کا نکلنا صرف اسی صورت میں ہے کہ انہیں ایک عاقبت اندیش باوقار اور پر نور رہنما مل جائے۔ وہ ہر ملاقات میں آغا جی سے پوچھتے عالم میں کب ہوگی؟ امام مہدی کا ظہور کب ہوگا؟

رسالہ سے ہفتہ دس دن پہلے آپ کی آغا جی سے آخری ملاقات ہوئی۔ اشفاق صاحب نے نہایت رنج و حسرت سے پوچھا ”دیکھیں آغا جی! اب تو اسرائیل اور امریکہ شام میں بھی گھسنے کی تیاری کر رہے ہیں۔“ آغا جی ہنس کر فرماتے گئے ”شام پر حملے کا تو ہمیں انتظار ہے۔ شام میں ہمیشہ چالیس ابدال رہتے ہیں۔ جب آنحضرت ﷺ نے مدینہ کے مطابق شام پر حملہ ہوگا تو یہ چالیس ابدال اکٹھے ہو کر اللہ سے فریاد کریں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ ان کی حاجت دہندہ بھیجے گا۔“ اشفاق صاحب تسلی میں آگئے اور سر نیچے پر رکھ کے مطمئن ہو کر لیٹ گئے۔

ہسپتال تک کا سفر ہم نے ایسے طے کیا کہ میں نے آپ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اپنے بازو پر آپ کو بٹھایا رکھا اور بانو آپ نے بائیں ہاتھ اپنے ہاتھ میں تمام کر اپنے گال سے لگائے رکھا۔ جب ہم رنگ روڈ سے سارہ کی طرف مڑے تو اشفاق صاحب کا بائیں ہاتھ آپ کے گالوں سے کچھ نیچے کھسک گیا اور آپ کو گمان گزرا کہ آخری سفر

یہ گمان اور خیال بھی خوب ہوتے ہیں۔ اشفاق صاحب ایک بار کہنے لگے یہ خیالات بھی بڑی بے وقافتہ زور شے ہیں۔ انہیں لگام دینا بڑا مشکل فعل ہے۔ میں نے ہاں میں ہاں ملائی کہ ہاں جی یہ سوچیں ہی ہمیشہ مرواتی ہیں پوچھا کیا ہمارے خیالات اللہ تعالیٰ کے کنٹرول میں ہیں؟ ذرا تنگ مزاجی سے جواب آیا ”چھوڑو جی! اس کے کنٹرول میں اس کے اپنے خیالات بھی نہیں ہیں۔“

بانو آ پا اور اشفاق صاحب کی جوڑی بھی کمال جوڑی تھی۔ ان کا آپس کا پیار محبت اور ادب و لحاظ قابلِ ستائش نہیں مثالی بھی تھا۔ میں اکثر سوچتا تھا کہ ان میں کون طالب ہے اور کون مطلوب۔ کبھی بانو آ پا انہیں ایک پل کو بچانے سے انکاری نظر آتیں اور کبھی اشفاق صاحب کو میں یہ کہتے سنتا کہ کیا کمال کی خاتون ہے۔ اور آپا کے ناول ”راجہ گتہ“ تعریف میں تو میں نے اکثر سنا کہ آپ اسے اردو ادب کا ایک نہایت ہی زور دار ناول گردانتے۔

اشفاق صاحب سناتے تھے کہ ایک بار وہ اپنے باباجی سے بحث میں الجھ گئے۔ کہتے تھے کہ میں ان سے سوال جواب کرتا تھا۔ باباجی ان کو سمجھا رہے تھے کہ دنیا میں کوئی چیز ساکت نہیں۔ یہ سورج چاند ستارے سب کیسے محور میں گھوم رہے ہیں اور اشفاق صاحب بھند تھے کہ جدید سائنس کی رُو سے سورج ساکت ہے اور زمین اس کے محور پر گھومتی ہے۔ باباجی نے آخر کہا اشفاق میاں! صرف مطلوب ساکت ہوتا ہے۔ سب طالب اس کے گرد گھومتے ہیں۔ صاحب کہتے تھے میں جدید دنیا کا رہنے والا پڑھا لکھا انسان تھا جو سائنس کی ترقی سے بھی خوب واقفیت رکھتا تھا۔ باباجی کی یہ دلیل جو انہوں نے قرآن اور تصوف کی روشنی میں دی تھی قبول تو نہ کی مگر طالب اور مطلوب کی نسبت یہ نسبت بہت پسند آیا۔ کہتے ہیں گھر پہنچا تو ایک جدید سائنسی جریدہ کے سرورق پر درج تھا کہ سائنس نے یہ راز پالیا ہے۔ ساکت نہیں اور ہر لمحہ گردش میں ہے۔

ساڑھے آٹھ سے تھوڑا اوپر ہم ساڑھے ہسپتال پہنچے۔ اشفاق صاحب کو بمشکل ویل چیئر پر بٹھایا اور قریب میں پہنچا دیا۔ بانو آ پا ساتھ ساتھ تھیں۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ وہ میرے آفس میں تشریف رکھیں۔ اشفاق صاحب کی طرف دیکھا وہ بے جان خاموش اور ساکت تھے۔ آپ نے اپنا دایاں ہاتھ اوپر اٹھایا اور انہیں کہا۔ پھر دوبارہ ہاتھ ہلا کر اللہ حافظ کہتے ہوئے وہ میری بیگم کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر چلی گئیں۔

اس دوران ڈاکٹر نواد صاحب بھی تشریف لے آئے۔ انہوں نے ای سی جی کی۔ سکریٹری پر ایک سیٹ پر سنا دے رہی تھی کہ طالب نے مطلوب کو پالیا ہے اور اس کی طلب تمام ہو چکی ہے۔ اشفاق صاحب کے جی سے سکون و اطمینان تھا جیسے محبوب کے پہلو میں بنا خوفِ رقیباں عاشقِ دراز ہو۔ کوئی شکن چہرے پر نہ تھی۔ اتنی اطمینان بخش موت اللہ کے ولی کو ہی نصیب ہو سکتی ہے۔ ایسے جیسے وہ اس اٹل تجربہ سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

اور اشفاق صاحب نے تو ایک عمر اولیائے کرام کے درمیان گزاری تھی۔ مجھ سے کئی بار فرمایا کہ اُبھنوں کا حل کبھی کسی صوفی اور کبھی کسی درویش بابا کے چرنوں میں بیٹھ کر ملا۔ صوفیائے کرام کے عرس میں کئی قصے اکثر سناتے اور وہاں سے فیض حاصل ہونے کا اعتراف کرتے۔ ایک روز فرمانے لگے ”عاطف میاں! تمہاری تمہیوری ہے۔ جو تمہیوری کم اور حقیقت زیادہ ہے۔ کیا تم نے کبھی سوچا کہ دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان حاکم رہے

آنکھوں سے لگا لیا اور ساتھ پڑی ہوئی کرسی کے دامن میں اپنے آپ کو سمیٹ لیا۔
 خسرو دریا پریم کا الٹی واہ کی دھار
 جو ابھرا سو ڈوب گیا جو ڈوبا سو پار

.....

”ناں ناں..... ڈاکٹر عاطف آگئے ہیں تم بینک جاؤ۔ تمہارے پاس لا کر کی چابیاں ہیں تمہیں لیٹ

چاہئے۔“

اشیر خاں کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ ہمیشہ ہر بیماری میں ہمارے ساتھ ہسپتالوں میں رہا لیکن ساتھ ہی اُس نے
 کی بات کبھی کاٹی نہ تھی۔ اشیر کی کار اور ڈاکٹر عاطف کی کار پھانک سے نکلتے ہی ایک دائیں اور ایک بائیں مڑ گئیں۔
 خاں صاحب راضی برضا بندے کی طرح مطمئن سیٹ سے کمر لگائے بیٹھے تھے۔ میں پچھلی سیٹ پر آ کر
 اُن کے گلے پر ہاتھ رکھے بیٹھی تھی۔ اُن کی آواز گویا جیسی تھی لیکن نہ اُن کے حواس پر اگندہ ہوئے نہ اُنہوں نے اپنے
 سے پگھلنے ہی کا احساس دلایا۔

چھ ستمبر کی رات اُن کے گھر کی تصویر تھی۔ اُن کے درد کا یہ عالم تھا کہ بار بار چہرہ اس درد کا شاک ہو جاتا تھا۔
 میں اسی درد کے باعث خوف اور پریشانی لکھی تھی لیکن برداشت کا یہ عالم تھا کہ کسی حرکت آواز اور اشارے سے
 انداز کی حالت کا اظہار نہ کیا۔

پاسپورٹ بن چکا تھا

ویزہ لگ چکا تھا

ٹکٹ، بیگیج چیک ہو چکا تھا۔

اُنہیں شاید سیٹ نمبر بھی معلوم تھا، لیکن اُنہوں نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا اور پھر اُن کا سر ڈر
 گیا۔ وہ اپنے بے جان ہاتھ سے میرا ہاتھ تھپتھپاتے رہے..... وہ اپنے گھر جانے کا ارادہ کر چکے تھے۔

داستان سرائے سے ساڑھے ہسپتال تک کا راستہ ڈور نہ تھا۔ راستے میں درخت پرندے سڑک
 الوداع کہہ رہے تھے۔ جوئی کارر کی وہیل چیئر پر اُنہیں بٹھایا گیا..... میں اُن کے ساتھ تھی۔ پھر سسٹر مجھے ڈاکٹر
 حکم کے مطابق ڈاکٹر کے دفتر میں لے گئی۔

”آپ پلیز یہاں بیٹھیں..... ہم اُنہیں آسجین لگانے لگے ہیں۔“

اس وقت میں نے دو رکعت نفل پڑھے..... خاں صاحب کہتے تھے جب بھی کوئی لمبے سفر پر روانہ ہوتا
 کے دو نفل ضرور گزارنے چاہئیں کہ اللہ میاں کا مال واپس کرتے وقت نہ جھگڑا ہو نہ تقاضا نہ ندامت ہونے چکھتے
 حقدار کے سپرد کرنے کے بعد کسی قسم کا ملال نہ ہونا چاہئے۔

ایسے ہی دو نفل میں نے اپنی والدہ کی رخصتی کے وقت پڑھے۔

ایسے ہی دو نفل میں نے اپنے بھائی کے جانے کے وقت پڑھے تھے۔

علیم مطلق جانتا ہے کب اور کس وقت کس کی روانگی موزوں برحق اور پردہ پوش ہے۔
دفتر میں سسر طاہرہ اندر آئی۔ میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے ساتھ لے گئی۔

وہ ہمیشہ کی طرح آنکھیں موندے ہوئے لیٹے تھے۔ اُن کی ڈرپ ایک طرف لٹکی ہوئی تھی۔ انیس اور اشران کی
جس کمرے تھے۔ نہ جانے کب اور کیسے ڈاکٹر صاحب نے انہیں راستوں ہی سے بلا لیا تھا۔ مجھے خاں صاحب کی حاشیہ
تھی سے چھٹی مل گئی تھی۔ انہوں نے مجھے برطرف کر دیا تھا اور کوئی سفارشی خط بھی لکھ کر نہیں دیا تھا کہ میں کسی اور جگہ اسامی
صحتی۔

یوں لگتا تھا واپسی کے جہاز میں وہ اس وقت اپنی سیٹ بیلٹ باندھ رہے تھے۔ لاہور کا منظر چھوٹے چھوٹے
تھیں ہرے ہرے قطعوں اور بے مصرف سوئی ہوئی سڑکوں سے اُوپر جا رہا تھا۔ پچھلے منظر ہند لار ہے تھے۔
ایئر ہوسٹس نے بڑی توجہ سے پوچھا ہوگا "اشفاق صاحب شراب طہورہ کہ کوئی زمینی مشروب؟"
اشفاق صاحب نے اپنی براؤن آنکھیں اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ لڑکی کی پلکیں گالوں سے چپکی ہوئی تھیں۔
Eye contact سے گھبراتی تھی۔ ایسی لڑکیوں کے متعلق خاں صاحب نے سنا تھا کہ وہ خیموں میں مستور ہیں۔ اُن کو نہ
کسی جن نے ہاتھ لگایا نہ کسی انسان نے ہی۔

شاید انہیں اس شہر اُس کے رہنے والوں سے پھرنے کا اتنا غم نہ تھا جس قدر گھر جانے کی خوشی تھی!

کب چھٹی ہوگی اس در سے

کب اپنے گھر کو جائیں گے

کب روئیں گے اور گائیں گے

کب چین کی بنی باجے گی

ہم اپنا گیت سنائیں گے

ہم اپنا گیت سنائیں گے

کب چھٹی ہوگی اس در سے

کب اپنے در کو جائیں گے؟

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب خاں صاحب کے پاؤں کی ہڈی ٹوٹی۔ ہم گھر لوٹ رہے تھے۔ گیلی مٹی سے
جسٹ کی پڑی بمشکل تمام چھ انچ اُونچی تھی۔ کار سے نکلنے اور پڑی پر پاؤں دھرنے میں کچھ ایسی ناہمواری تھی یا جسم
توازن ہو گیا تھا کہ ذرا سا پاؤں رپٹا اور ہڈی ٹوٹ گئی۔

اسے ہی غالباً۔ تھا کال کہتے ہیں کہ ہونی اپنے حملے کے صرف بہانے ڈھونڈتی ہے۔ ذرا سی چوک ہو اور وار
گے..... شاید اسی کے لیے بابے کہتے ہیں کہ ہونی ٹلا نہیں کرتی۔ اُسے چاہے راکھی باندھو بھلے رادھا بناؤ۔ وہ ڈیوڑھی
سے بیٹھی جھوٹی چوکی بھرتی ہے۔ ادھر کوئی چوکا ادھر اُس نے اپنا وار کیا۔

ہونی کو نالنے والی ایک تو آیت الکرسی تیر بہدف ہوا کرتی ہے دوسرے کسی چاہنے والے کی دُعا۔ صاحب کہا کرتے تھے کچھ صاحب دُعا ایسے بابرکت ہوتے ہیں کہ اُن کی خیر خواہی کی خواہش ہی کن فیکون بن جاتی ہے۔ ادھر انہوں نے wish کیا ادھر willing کا معجزہ ہو گیا۔

میری والدہ بھی کہا کرتی تھیں کہ میرا سارا اسلام آیت الکرسی ہے..... میں نے ساری بیوگی اسی کے سہارے کاٹی۔ اپنے بچوں کو اسی کے سپرد کر کے نوکری کی۔ دورے کیے، اکیلی ریٹ ہاؤس میں رہی۔ اسی کا جب تمہے کرتی میں رات کو بارہ بارہ بجے زمینوں پر اکیلی پہنچ جاتی تھی۔ لاہور والی بس مجھے پکی سڑک پر اتارتی۔ میں چھوٹے فاصلہ اسی آیت الکرسی کے سہارے چلتی۔ راستے میں گیدڑ، بھگیاڑ، سانپ سنبولیے، جنگلی بے بھولے بھٹکے سڑک کے کبھی راہ چلتے دیوانے راہ پر ملتے تھے۔ وہ کہا کرتی تھیں کہ کبھی کسی نے نہ اُن پر حملہ کیا نہ قریب آنے کی جرأت کی..... سب آیت الکرسی کی بدولت۔

غالباً اُس روز نہ تو کسی چاہنے والے نے اُن کے لیے دعا کی تھی نہ ہمارے گھر میں کوئی آیت الکرسی کا تعلق موجود تھا۔ بس خاں صاحب ذرا سے ڈولے اور پاؤں کی بڈی ٹوٹ گئی۔ بڈی ٹوٹنے کے بعد وہ اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے بڑے صبر سے اندر چلے آئے۔ بس ایک بار وہ خاموشی سے آدھی رات کو اُٹھے۔ زیرہ کے روشن بلب کی روشنی میں ذرا سا لڑکھڑا کر غسٹخانے کی طرف گئے۔

پھر مجھے یوں لگا جیسے انہوں نے دیوار سے لٹکر ریک پر سے کوئی دوا نکالی جیسے کوئی سلیپنگ پلٹا سبک چلا..... فلش چلنے کی آواز نہ آئی۔ میں نے پڑتا لگا یا کہ غالباً انہوں نے گولی لگی اور ذرا سا ڈولتے ہوئے واپس آئے..... نیند کی گولی نے اثر دکھایا۔ صبح قریب تھی جب وہ گھوک سو گئے۔

خاں صاحب چپکے چپکے اپنا علاج کرنے کے عاوی تھے۔ وہ کسی ڈاکٹر کو بھی اپنا پورا حال سمجھاتے ہوئے نہیں رہتے۔ میں نے جلد ہی اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ خاں صاحب ذاتی سطح پر بڑی Privacy کے قائل ہیں۔ سچوٹی سچوٹی چیزیں، ننھی ننھی خوشیاں، سکنے والی خواہشیں، بار بار ابھرنے والی نارمانیاں، پھٹا ہونے والی چیزیں پر اندے کی طرح ٹپکنے والے غم سب کو اپنے صبر کے اخوان پوش سے ڈھانپنے رکھتے۔

وہ اُن کے بھائی، بہن، بچپن کی باتیں، دیہات میں گزرے ہوئے واقعات، اُن دنوں کی ملاقاتوں کا ذکر کسی سی تفصیل کے فرق سے یوں بیان کرتے ہیں گویا بیت المال سے رقم لے رہے ہوں۔ ان واقعات کے بیان میں کبھی نہیں کوئی شرمندگی نہیں۔ ڈھکا چھپا فخر، حیرت افزا یادیں جو ایک ہی پنڈورا بکس سے نکلتی ہیں۔ یہ ایک خزانہ عامرہ سے سب بھائی، بہن، بلا تکلف فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سب یادیں بانٹ کر خوش ہوتے ہیں۔ کسی کی بات سن لیں آپ کہیں کہ یہ واقعہ اسی کی میراث ہے۔

خاں صاحب جب بھی ان یادوں کا پتلا رکھولتے، قلم اور کاغذ پر کہانی کے رُوپ میں ڈرامہ کی صورت یا تصویر کی شکل میں وہ اپنے سننے والے، پڑھنے والے ناظرین تک، بخوبی پہنچ جاتے بلکہ ان کہانیوں سے ”گذریا“ جیسی کہیں لیتیں، ڈرامہ ”قرۃ العین“ وجود میں آتا۔ ”زاویہ“ کی شہرت دُور دُور تک پہنچ پائی لیکن یہ دُور مارکا تو س اور تھے۔

تھیں، جو ان کے اپنے اندر سجیلی تھیں اور زمین دور تھیں۔ ان میں سے جب کوئی سرگم مچھتی تو خاص صاحب جاتے، گر پڑتے ہڈی ٹوٹ جاتی، آپریشن کرانا پڑتا۔ گھنٹے تک ٹانگ پلستر میں چلی جاتی، لیکن وہ اس اندرونی بھول جیسی پر کسی کو نہ چلنے دیتے۔

خاں صاحب میں شادی کے بعد ایک واضح فرق آچکا تھا۔ شادی سے پہلے جب تک میں دوری پر تھی وہ اپنی بات مجھے بتانا چاہتے تھے۔ لوجہ لوجہ کا، قطرہ قطرہ کا حساب دینا چاہتے تھے۔ وہ مجھے روم سے جو خط لکھتے رہے وہ اس کی دلیل ہیں کہ یہ عہد بے نقاب ہونے کا تھا۔ ہر منصوبہ، حرکت، سوچ، عمل، مجھ تک ٹیلی گرام تک انداز میں ترسیل کے کا عہد تھا۔

شادی کے بعد انہیں خیال تھا کہ بیوی زیادہ سچ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ بیوی کو اللہ نے حسد کے خمیر اور شوہر کو بے حسد کے سوڈا بانی کا رب سے گوندا ہے۔ وہ سچ جو محبوبہ کی انا کو تسکین دیتے ہیں، بیوی کی انا کو ٹھوکر لگا سکتے ہیں۔ عورت ہمیشہ مرد کی محبوبہ رہنے پر اصرار کرتی ہے اور شوہر کچھ اپنی جبلتی کمزوری کے باعث کچھ کمانے اور کفالت کے ذریعوں سے تھک کر کچھ عورت کے عمر ڈھلنے کے باعث عاشق کا رول اچھی طرح ادا کرنے پر قادر نہیں رہتا۔ یہاں میں بھول پڑ جاتے ہیں۔ اللہ نے مرد کو کھیتی میں بیج ڈالنے پر مامور کر رکھا ہے۔ وہ زمین رشتی ہو، بیج ہو، ہریا دل سے لدی بیج ہوا سے آئے، پون کی شکل میں بار آور کر کے مرد کی جبلت ہی خدا نے ایسی بنائی ہے۔

اگر مرد صرف خوبصورت عورت سے ہی ہم بستری کر سکتا تو شہر میں کتنی کی ماہ پارہ عورتیں ہی بچوں کو گود کھلاتیں۔ یہ بیوی بچہ ہونے کے معاملے میں قدرت نے ایسا اندھا بنایا ہے کہ موٹی، ٹھکنی، بوڑھی، معذور حتیٰ کہ بسا اوقات دیوانی عورتیں بھی حیثیت کے مطابق اسی کم عقل، بے وفاء، ہری چک سے بار آور ہو جاتی ہیں۔ یہ آفریش کی پلاننگ ہے کہ دھرتی پر مخلوق کی جیسی ہے۔ وفاء پر بے وفائی غالب آتی رہے۔ کھیتیاں ہری ہوتی رہیں اور باقی رہے نام اللہ کا۔

ادھر عورت ہمیشہ کسی ایک کی ہو رہے اور کسی ایک کو اپنا کر رکھنے کا خواب دیکھتی ہے۔ اس خواب کا مرکز اُس کی بیوی ذات رہتی ہے۔ اتنی برس کی بڑھیا بھی اپنے حسن کے کرشمے بیان کرتے نہیں ٹھکتی۔ بڑھاپے میں بھی اُس کا یہ خواب توجہ سے تعبیر ہونہ ہو وہ خواب دیکھنے سے نہیں چوکتی۔

محبوبہ اپنے عاشق کو کسی اور کے گھر کا چوکیدار نہیں بننے دیتی..... وہ تو یہاں بیوی سے لے کر بڑھی بیوہ تک اسی خواب کی بنا پر حسد کی آگ میں جلتی ہے۔ اگر خواب پورا بھی ہو جائے تو بھی خواب اُس سے علیحدہ نہیں ہوتا۔ شاید اگر..... میں.....؟ اُس کی جان نہیں چھوڑتے..... مرد کی جبلتی منشائے ایزدی اور عورت کا یہ خواب ہر سطح، ہر ملک، ہر موسم میں مرد و زن کے ذراے میں مختلف قسم کے رنگ بھرتے رہتے ہیں۔ اسی رسہ کشی سے رنگ کائنات قائم و دائم ہے اور رونق حیات ہے۔ ان وفا کی طلب اور بے وفائی کی ضرورت سے مرد اور عورت کا باہمی اتصال اور مولی کیول بنتا ہے۔

یہ شاید میرا اندازہ ہے کہ شادی کے بعد وہ پردہ پوش ہوئے، قرین قیاس تو یہ بات ہے کہ بچپن سے ہی خاں صاحب اندر کی گپت غار میں سادہ صورت سادھی لگا کر زندہ رہنے کے عادی تھے۔ اسی غار میں اُن کی جڑی بوٹیاں، من پوسی کتابیں، جگہ جگہ سے تلاش کی ہوئی قلم دواتیں، بال پوائنٹ، ہائی لائٹر، مارکر، ڈائریاں، ان گنت قسم کے پیڑ، بادام، پستے

اخروٹ، لیمن ڈراپ، چوکیٹ، کیلکو لیٹر، فون، گھڑیاں..... وہ اپنی غار میں علی بابا کی طرح رہتے تھے۔ پرانی یادوں کی طرح ڈراپ کی طرح چوسنا سیکھ لیا تھا۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے کھل جاسم سم کہہ کر یہ سارا خزانہ ہتھیا لیا اور اُن کے پوتے والوں میں جن کی وجہ سے یہ خزانہ جمع ہوا تھا، اپنی پراپرٹی بنا لیا۔

پھر جن کے اظہارِ محبت کے سلسلے میں یہ مال اکٹھا ہوا، لوٹانے کی کوشش کی۔

عجیب سی بات ہے کہ میں کئی مہینے اُن کی یادوں کو مالِ مسروقہ سمجھ کر بانٹتی رہی اور غار خالی نہ ہوئی۔ اُن کی حسرت میں میں نے کبھی اُن کے تخیلے میں جھانکنے کی کوشش نہ کی۔ کبھی کوئی اُن کا خط نہ پڑھا۔ اُن کے تحریر شدہ خطوں کو چوری نہیں پڑھنے کی جسارت نہ کی۔ اب وہی خط پڑے ہیں۔ ان سے کارٹن بھرے ہیں اور پڑھنے کی نوبت نہیں آ رہی۔ وہ آگے جن کو کوئی ہاتھ لگاتا تو اُن کے اندر ”سی“ کی سی کیفیت پیدا ہوتی۔ الماریوں میں پڑھنے والے چھونے والے کی رائی بھی ہیں لیکن کوئی ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

میں نے اس گونگے خاں صاحب کو بہت جلد پہچان لیا تھا۔ اس کی سادھی، اس کی گپت گچھا کی Sanctity سمجھ لیا تھا اسی لیے ہم دونوں بڑے آئندہ سے بڑی سہولت اور شائق سے ساتھ ساتھ رہے..... لڑنے جھگڑنے اور کھانے جانے کے جتنے مواقع تھے ہم دونوں نے ضائع کر دیئے اور ہر قیمت پر امن کا سفید جھنڈا لہرائے رکھا۔ اس میں سادھی کی حسن سلوک اور نرمی کا مظاہرہ خاں صاحب کی شخصیت میں تھا۔ وہ کبھی مجھے اُبھارنے، اُکسانے، اشتعال دلانے کی کوشش نہ کرتے۔

مہاراجہ رام چندر کی طرح شائق سروپ مہارانی سینا کی جگہ سنگھاسن پر خالی رکھتے۔ اُن کی جگہ کوئی اور شائق نہ تھا تو وہ لوگوں کی عقیدت، محبت، پذیرائی کا الاؤ ایسے مزے مزے سے جلاتا اور میری ناسوں میں ایسی دھونی دیتا کہ میرے بدن میں آگ لگ جاتی اور میں ہنگارتی چلاتی واویلا مچاتی گھر گھر ٹیلی فون در ٹیلی فون اپنے خدشات، جلاپے کی دستک لے کر پہنچتی۔

لیکن وہ تو ہر تھنڈا اظہارِ عقیدت کا سہیل، چھوٹے سے روشن دیئے کی طرح اپنی غار میں لے جاتے۔ چاہنے والے شہر سے، دُور دراز ملکوں سے جو بھی نادر زمانہ بھیجتے وہ اس سوغات کو اللہ کی رحمت سمجھ کر نظروں سے چھینے پھر گپت غار میں اس پر نام کے دیئے کو جسنے کے لیے رکھ دیتے۔

اُن کے پاس ان گنت پن، مارکر، بیٹریاں، کیلکو لیٹر، ٹرانسسٹر، سینٹ نہ جانے کیا کیا ساز و سامان اکٹھا تھا۔ لیکن یہ سامان وہ استعمال نہیں کرتے تھے۔ اُن کی غار میں خانہ کعبہ کے وہ پتھر سب سے اُونچے دھرے تھے جو حوض لائے تھے جب صحن کعبہ سنگ مرمر کا نہ بنا تھا اور جس پر عقیدت مند جہلا اپنے کفن آپ زم زم سے دھو کر سوکھنے کے بچھایا کرتے تھے۔

ان پتھروں کے آس پاس وہ خزانہ الماریوں میں، فرش پر، اندر الماریوں میں، درازوں میں پڑا تھا۔ علیٰ غایت اس خزانے کو نہ دلخراشی کے لیے کھولا نہ فخر ذات کو متکبر کرنے کا باعث بنانے کے لیے استعمال کیا..... یہ سارے دیئے کی سادھی کا حصہ تھے۔ وہ مان رکھنے مان بڑھانے، عزتِ نفس بحال کرنے کے لیے یہ تحفے قبول کرتے تھے۔

تعمیر موندے زندگی کو صرف ضرورت بھر استعمال کرنے پر قادر ہو کر ہر خوشی ہر غم کو لبیک کہتے ہوئے زندگی کو لیمن کی طرح چوستے اپنے مخصوص آسن میں بیٹھے رہتے۔

اُن کی عادت تھی جب کبھی وہ کسی کو قریب کرنا چاہتے اُسے اہمیت دے کر اپنے سے بڑا درجہ دینے کے لئے ہمدرد ہوتے تو اُس سے فرمائش کرتے..... مٹھلے بیٹے انیس خاں کا فون آتا..... ”ابو! میں لندن جا رہا ہوں..... کچھ عرصے بائی ٹون کے لیے دیکھنے..... کوئی چیز جو آپ کے لیے لاؤں۔“

اب خاں صاحب بڑے انہماک سے اُسے قلم پین سیاہی مار کر اور جانے کیا کیا لکھواتے..... وہ بھی سعادت مند کی طرح ساری تفصیل لکھتا..... اب دونوں میں ان ہی چیزوں کے سلسلے میں کئی فون آتے جاتے۔ پھر ٹویڈ کو بھی تاکید دینی کہ ”انیس خاں بھول جائے گا تم اسے یاد دلانا میں نے یہ چیزیں لکھوائی ہیں۔ کوئی چیز کم نہ ہو۔“

میں قریب بیٹھی ایک ماں کی طرح سوچتی کہ کبھی یہ کیا مذاق ہے۔ انیس بیٹے پر خواہ مخواہ اتنا بوجھ کیوں..... ہر ماں کی طرح میں بھی صرف یہی سوچنے پر قادر تھی کہ بیٹے کو سوئی بھر تکلیف نہ ہو۔ میرا تخیل وہاں نہ پہنچ سکتا تھا جہاں پہنچ کر سہمی اٹھانے کی ٹریننگ دینا بیٹے کو فرمائشوں سے بٹھنے اور اپنے کو ہاں پر کاٹھی ڈلوانے کا علم بھی آنا چاہئے۔ اور یہ علم صرف باپ عطا کر سکتا ہے..... ماں کا بسل چلے تو بیٹا ہمیشہ اُس کی گود میں بیٹھ کر دودھ پئے اور کبھی اپنے پاؤں پاؤں چلنا بھی سمجھے..... اپنا بیچ ہو جائے پر اُس سے بندھا رہے۔

واپسی پر اویس فرصت میں انیس خاں اور ٹویڈ تھنے لے کر وارد ہو جاتے۔ ابو اشفاق اُن کے بہت قریب بیٹھتے۔ اب ایک ایک پن نکال کر دیکھا جاتا۔ اُس کی قیمت کو عینک ٹھیک کر کے خاں صاحب پڑھتے۔ ٹویڈ کہتی..... ”سوس! پہلے ہم سفر تاج گئے وہاں تو یہ برانڈ تھا ہی نہیں..... ایک افریقی لڑکا سڑک کنارے فٹ پاتھ پر کچھ سامان لگائے بیٹھتا تھا وہاں یہ موجود تھے۔ اس برانڈ کے پن انیس دیکھ ہی رہے تھے کہ ڈور سے پولیس مین آ گیا..... ٹٹے کو دیکھتے ہی فری لڑکا سامان لے کر بھاگ گیا۔ یہ پن چھوڑ گیا..... اس پر کچھ خرچ نہیں آیا۔“

”نہیں نہیں..... ٹویڈ! یہ وہ پن نہیں ہے۔ یہ تو ساؤتھ ہال والی دکان سے ملا تھا جب ہم اسما سے ملنے گئے تھے۔“

اب ٹویڈ انیس ساؤتھ ہال کی باتیں سنانے لگتے اور خاں صاحب ایسی حیرت سے سنتے جیسے وہ کبھی ساؤتھ ہال سے اجازت سے ملنے ہی نہ گئے ہوں۔ انہیں معلوم ہی نہ ہو کہ لندن سے ساؤتھ ہال کیسے پہنچا کرتے تھے؟ وہاں ایشیائی لوگوں کا رہنا سہنا کیسا ہے۔ زندگی کس بیچ پر گزرتی ہے۔ وہ اپنے بولنے کی پٹاری بند کر کے کانوں کے مائیکروفون کھول دیتے..... خاں صاحب بڑی عاجزی سے گفتگو کرتے تھے لیکن اس ساری حیرت انگیز خوبی کی بنیادی وجہ اُن کے سننے کا عمل تھا۔ وہ انتہائی توجہ کے ساتھ سنتے۔ ون ٹون گفتگو میں وہ مجسم کان بن جاتے۔ اپنی بولی بند کر کے بغیر گلے لگائے ہاتھ کچرے بات کرنے والے کی تخت نشینی میں حاضر باش قسم کارویہ اپنا کر مودب رہتے۔ سننے کے مقام پر وہ مجسم حیرت ہوتے اور یہی حیرت اپنی گفتگو میں منتقل کر دیا کرتے۔

انیس خاں کے سامنے یوں ان بھول بیٹھے رہنے سے ایسا رابطہ بنتا جو کسی اور طور ممکن نہ ہو سکتا۔ اُس کے جانے کے بعد سارے تنھے کئی بار آنکھوں سے عقیدت رنگ دیکھنے کے بعد ان میں سے ایک دو چیزیں ہی استعمال کے لیے

رکھتے۔ باقی سب کسی الماری، دراز، ڈبے میں بند کر کے گپت غار کا حصہ بنا دی جاتیں۔ محبت سے یوں قریب آجے۔
باپ بیٹے کی یہ یاد بھی لیمن ڈراپ بن جاتی جسے سادھی کے وقت وہ شانتی سے چوتے۔

ریاض محمود کو فون کرتے..... ”مر میں! پگلی ہانڈی نہیں پکتی تجھ سے.... خرچے سے نہ ڈرا اللہ اور دے گا۔“
کے روز پگلی ہانڈی پکا کر لے آئیں۔“

بہتے کے روز ریاض محمود جسے ہم سب شاہی باورچی کہا کرتے ہیں، پگلی ہانڈی سمیت حاضر ہو جاتے۔
گھر میں اس کی خوشبو پھیل جاتی۔ مجھے وہم ہوتا کہ ریاض محمود کو زحمت ہوئی ہوگی..... خاں صاحب کا خیال تھا کہ ریاض
ہانڈی کے باعث سارے 121۔ سی میں درک پا گیا ہے۔

ریاض میاں کی ہانڈی بھی کشمیری کھانوں کی طرح بڑی انوکھی ایجاد تھی۔ گولاش، کھٹے بیگن، شب
کشمیری کھانے نصیر انور، کشور نصیر اور لالی جان نے ہمیں کھلائے تھے لیکن پگلی ہانڈی کی ایجاد ایک ایسے باورچی کی تھی
جو کھانا پکانا نہ جانتا تھا۔ اُسے جو کچھ بھی باورچی خانے میں مہیا ہوا بازار سے دستیاب ہوا، اسے گوشت میں ٹھوک
مسالہ دہی جو کچھ ملتا گیا ریاض میاں ڈالتے گئے۔

بانو باجی دم بخود کچھ منع کرنے کے انداز میں کچھ حوصلہ افزائی کے دستور پر چل کر ڈالتی رہیں۔
گوشت کا سالن تیار ہو گیا جس کی ترکیب سوائے ریاض میاں کے کسی دوسرے کو معلوم نہ تھی۔ اسی صدری نئے کو سب
لگائے شاہی باورچی کا خطاب خاں صاحب سے لے کر اور اسے خلعت کے طور سینے پر سجا کر ریاض آتے رہتے۔
یہی فرمائش یہی رساں سے بات سننے کا عمل رہی کا وہ مضبوط پل بن گیا جس کے نیچے سے زندن کا
کھلبلا تاپانی نکر میں مارتا گزر رہا ہے لیکن دونوں ساتھ آتے رہے جاتے رہے۔

مجھے یاد ہے ایک مرتبہ ہم ہوم اکٹنا مکس کالج گئے..... یہاں لڑکیوں کو گھر داری کا علم سکھایا جاتا ہے۔
سے لے کر کھانے مینو اور چھوٹی دکن میں بڑے روشن ویسے کافرن بھی فیڈ کیا جاتا ہے۔ لڑکیاں پُر امید چلت
خود اعتماد کام کاج میں مستعدی سیکھ کر گھر داری کو بڑے منظم سائنسی طریق پر کرنا سیکھتی ہیں۔ تمام لڑکیوں کو
ہانٹ کرائی نہیں الگ الگ Homes لاث کر دیئے جاتے ہیں اور کبھی کبھار سارے گروپ مل کر کسی قابل ذکر شخصیت
کر کے اُس پر اپنے علم فن کا رعب گانھتی ہیں۔

ایسی ہی ایک تقریب میں خاں صاحب گئے۔ میں بھی ساتھ شامل ہا جہ تھی۔ تمام چیزیں بڑی نفاست
خود نمائی کے انداز میں پیش کی گئی تھیں۔ ہم دونوں نے بحری قزاقوں کی طرح خوب رج کھایا اور درباری جی
والوں کی طرح خوب دل کھول کر دوا پیش کی۔ واپسی کے وقت طالب علم ایک دوسرے کے بازو کمر ہاتھ جوڑے
ہالہ بنائے کھڑی تھیں۔ اس چاند ہالے سے خاں صاحب نے کہا..... ”کچھ سامان خورد و نوش بچا ہے کہ نہیں؟“
”جی بہت کچھ بچ گیا ہے۔“

”تو مر و ساتھ کچھ نہیں دینا..... میرا سٹاف کیا کہے گا کن تھوڑ دلیوں کے مہمان بن کر گئے تھے۔“
وہ ساری چوکڑیاں بھرتی رخصت ہو گئیں۔ اس وقت خاں صاحب نے جیب سے کارینا کی ایک

صحت کی دو گولیوں سمیت منہ میں ڈالیں اور انہیں چوسنے لگے۔ وہ جب بھی دل رکھنے خوش کرنے کے لیے بیسارنوشی کرتے اور اُن کا معدہ جواب دے جاتا تو وہ اسی طرح بعد ازاں باضے کے لیے کئی ٹونکے استعمال کرتے۔ دوائیوں کے لیے کبھی چورن، آیورو ویدک پڑیوں، ایلو پیتھک گولیوں، Effervescent الکالینز، اینوز سے لدی پھندی تھیں جن کو سنے پوری نظر بھر کر کبھی نہ دیکھا..... وہ علاج معالجہ بہت شراہٹ کے ساتھ کرتے تھے گویا سمجھتے ہوں کہ یہ عمل تو کل سے

ہرنیاں چوڑی بھرتی ہوئی تھقبے لگاتی، تالیاں بجاتی غائب ہو گئیں..... خاں صاحب راضی کر کے راضی ہوئے تھے پینے کا سامان جوڑا اور اہ بنا کر لائے تھے اُردو سائنس بورڈ میں اپنے شاف کے لیے اُتار کر گھر آ گئے۔
شاید 2002ء کا واقعہ ہے۔

مجھے A.R.Y. نے دس ہزار ڈالر انعام دیا تھا۔ یہ انعام لائف ٹائم کارکردگی کی وجہ سے ملا۔ اس میں میری شکرگاہی کم اللہ کا فضل اور بھائی جمیل الدین عالی کی کوشش بمقدار وافر اور رنج صاحبان کا حسن ظن زیادہ شامل تھا۔ میں نے ہولے ہولے چاروں کھونٹ مشاہدہ کر کے دھیرے دھیرے چھان پھٹک کے بعد ایک بات جانی ہے باقی تیس تو شاید انسان مان ہی لے لیکن ایک بات پر اُس کا دل کبھی راضی نہیں ہوتا کہ اُس کی کمائی ہوئی دولت اور چکا چونڈ کر دینے والی محنت کے فضل، اُس کی دین، اُس کی مہربانی کے باعث حاصل ہوئی۔ وہ زبانی کلامی بے وقافی کیا شک ہے کہے لیکن اندر ہی اندر اس تصور سے منمناتا رہتا ہے کہ سارا کچھ اُس کی اپنی محنت کا ثمر ہے..... یہ پٹی اُسے نفس رناتا ہی چلا جاتا ہے۔

میں بھی بظاہر منمنی سی حلیم الطبع، اکتساری کی پوٹ بنی لیکن اندر اپنی کتابوں اور ڈراموں کی گنتی کرتی اپنی محنت پر جس کراچی پہنچی تھی۔ انسان میں یہ بھی وصف ہے کہ وہ قرآن کو بھی اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا کرتا ہے۔ رزق حاصل کمانے کی جو اہمیت ہے اُسے جاگ لگا کر خوب خیر اٹھا کر اپنے نفس کو یہ باور کرا لیتا ہے کہ یہ جو گل و گلزار کھلا ہے اُس کے سنبھنے، گودنے، کیاری کیاری خون پسینہ ایک کرنے سے وجود میں آیا ہے۔

خاں صاحب ہمیشہ کی طرح میری چادر اور چادر دیواری بنے ساتھ تھے..... وہ خطرے کے مقام پر آ گئے ہوتے ہر عام کے وقت آخری سیٹوں پر جا بیٹھتے۔

اسی قیام کے دوران ایک روز چلتے پھرتے عظمیٰ سے ملاقات ہو گئی۔ اس فنکشن پر جاتے وقت تو عظمیٰ گیلانی اور رمیض راجہ مجھے فلائٹ پر نہ ملے لیکن واپسی کے وقت ایئر پورٹ پر سے ملاقات ہو گئی۔ رمی مبارکباد کے بعد رمیض راجہ بولا..... ”آپاجی! میں آپ کے گھر کرکٹ کھیلنے آیا کرتا تھا..... میں خیر خاں کا دوست ہوں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“

”آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ میں آپ کے گھر اشیر کے ساتھ کرکٹ کھیلتا تھا لیکن آپ کو یہ علم نہیں کہ ایک بار جب میں نے فل ٹاس ہٹ کیا تو گیند آپ کے برآمدے میں لگی کھڑکیوں سے جا ٹکرایا..... وہ شیشہ میں نے توڑا تھا آپاجی..... گو سارا الزام اشیر خاں نے اپنے ذمے لیا۔“

”وہ ایسا ہی ہے رمیض میاں..... اچھا ہی ہوا تم نے مجھے بتایا نہیں ورنہ لمبا چوڑا بیکچر تمہیں بھی مل جاتا۔“

چند ثانیے وہ چپ رہا پھر بولا..... ”آ پاجی! آپ نے اشر کو فرسٹ کلاس کرکٹ میں کیوں نہ جانے دیا اس

تو آ گیا تھا۔ اگر وہ کرکٹر بن جاتا تو بڑا نام کماتا۔“

”بھائی! تمہیں علم نہیں خوف میرا بنیادی وصف ہے..... خوفزدہ لوگ بچوں کو کسی عمل یا سوچ کی آزادی نہیں

سکتے..... خوف کو آپ محبت تو نہیں کہہ سکتے لیکن یہ اپنی طرز کی Concern ہے..... میں اُسے کیونکر جانے دیتی

میں اُسے کیسے کھلے میدان، سخت Pitch کے حوالے کرویتی۔ میں تو کرکٹ کی لال گیند کو بھی ماتھے میں لگنے والی تھی

تھی..... پھر میں اُسے اتنے بڑے امتحان میں کیسے جھونک دیتی؟ میرا خیال تھا کہ اس فیلڈ کے لوگ عورتوں سے بچ سکتے

اور اس کھلی ڈلی زندگی میں پینا پلانا اُن کے لیے گناہ نہیں رہتا..... پھر تو ہی بتا جہاں اتنے خطرے ہوں اس جہاد میں

کیسے جھونک دیتی۔ میری اتنی پسلی کہاں۔“

خاں صاحب نے کبھی اپنے بچوں کے کیریئر میں زیادہ مین میج نہیں نکالی۔ شاید اُن کا یقین تھا کہ عزت

شہرت سب اللہ کی دین ہے۔ ہو سکتا ہے اُن کے پاس ایسی باتوں کی نہ اہمیت ہو نہ وقت..... اُن کے برعکس آج کل

پہلے اپنے بیٹے کو اپنی سیٹ کے لیے تیار کرتا ہے اور پھر ریٹائر ہوتا ہے..... آرٹسٹ ٹرینٹ ہی اپنی اولاد کو بام عروت

کر پسا ہوتا ہے۔ پہلے زمانے میں بھی باپ دادا کا پروفیشن نسلوں چلتا تھا لیکن تب Awareness نہ تھی اور اولاد کے

سنہرے مستقبل دیکھنے کی عادت بھی والدین میں نہ در آئی تھی۔

لوہار کا بیٹا لوہار، سنار کا بیٹا سنار، بڑھئی کی اولاد زینہ قرب کی وجہ سے غیر محسوس طریقے سے سارا علم چوس

جیسے کشمش پانی میں پڑے رہنے سے میٹھی تو نہیں رہتی لیکن بہت سا پانی چوس لینے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔

ایک دن اسی فنکشن کے دوران عظمیٰ گیلانی سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اور خاں صاحب ”پاداش“

دوراں، ”زردبان عرفان“ کی باتیں کرنے میں مشغول تھے۔ پھر اچانک عظمیٰ نے کہا ”خاں صاحب! میں چلتی

بہونے ایک فرمائش کر رکھی ہے اُسے پورا کرنا ہے۔“

”اچھا؟ تمہارے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ فرمائشیں پوری کر سکو۔ سنا ہے تم ایک بڑی ایڈورٹائزنگ

رہی ہو کا سپاہی کے ساتھ۔“

کچھ دیر عظمیٰ گیلانی بتاتی رہی کہ کیسے رضا میر کے بیٹے اُس کے ساتھ مل کر ایک بہت بڑی ایڈورٹائزنگ

چلا رہے تھے اور کیسے اب اُس کا زوال بھی شروع ہو چکا تھا۔

”آپ کو معلوم نہیں اشر بھی تو میرے ساتھ ہوتے تھے Midas میں۔ سنا ہے اب وہ اسلامک انوشٹ

میں چلے گئے ہیں۔“

”میں کچھ پوچھتا ہوں تو کچھ اور بتاتی ہے۔ جو ایک ٹراپی لائسنز یاد کر کے نہیں آتے انہیں عموماً فضول قہقہے

بیان کرنا پڑتی ہیں۔“

اپنی خوبصورت آواز میں عظمیٰ نے سوال کیا۔

”تو جی آپ کیا پوچھ رہے تھے خاں صاحب؟“

”عقل کی کوکون! میں پوچھتا ہوں کیا تو فرمائش پوری کرتی ہے لوگوں کی؟“

”لوگوں کی تو نہیں..... لیکن بہو کی فرمائش تو ضرور پوری کروں گی..... اُس نے مجھ سے نمکو مانگی ہے۔ یہاں کی

سب مشہور ہے خاں صاحب۔“

”اُس سے ڈرتی ہے ناں؟“

”ہاں جی کچھ کچھ۔“

”عجیب سی بات ہے آج کل ساس بہو سے ڈرتی ہے..... پہلے بہو کی جان جایا کرتی تھی ساس سے، لیکن اگر تو

میں ہوتی تو بھی تو ہی خوفزدہ ہوا کرتی۔“ خاں صاحب بولے۔

”وہ کیوں جی؟“

”بھائی میرے ایک اچھے فنکار میں اگر خوف نہ ہو تو وہ اچھی طرح پرفورم نہیں کر سکتا..... کرشن کال سے پہلے عام

پرفورمنس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جایا کرتے ہیں۔ یکسرہ رولنگ کی آواز سن کر خوف سے ایکسٹرن ہو جاتے ہیں۔“

”جی خاں صاحب! ”زدبان عرفاں“ میں جب فاروق ضمیر مجھے کندھے پر لا کر ساہوکار کے دروازے پر لایا

تھا۔ نے سوچا تھا کہ بھاگ جاؤں اور پھر کبھی ٹیلی ویژن سٹیشن میں قدم نہ دھروں۔“

”اچھا یہ بتا مجھ سے کبھی ڈر لگا تھے؟“

”زیہرسل کے وقت جان جایا کرتی تھی لیکن جب taking ہوتی اور آپ آ جاتے تو پھر حوصلہ بڑھ جاتا۔ لگتا

سب ٹھیک ہو جائے گا۔ گرجی یہ کچھ گزرنے نہیں دیں گے۔“

”اچھا تو جب بہو کے لیے نمکو خریدنے جائے میرے لیے بھی چڑوے والا نمکولانا..... بھول نہ جائیں مرے۔“

”دلیں میں بھول سکتی ہوں جی۔“

انتظار حسین، عظمیٰ گیلانی اور ہم دونوں فائوسٹار کی چوتھی منزل میں تھے۔ عموماً نیچے اترنے سے پہلے ایک

بڑے کوفون کر لیتے۔ کھانے پر اترتے وقت لفٹ میں ملاقات ہو جاتی۔ ایک کامہمان آتا تو دوسرے کو علم ہو جاتا کیونکہ

انتظار حسین کے حوالے سے قریباً سارے مہمان سناچھے تھے۔

اسی طرح عظمیٰ سے لفٹ میں ملاقات ہو گئی۔ وہ بازار سے نمکو کے تھیلے اٹھائے اوپر جا رہی تھی۔ ہم کھانے کے

نیچے جانے کے لیے سوار ہوئے تھے۔

”اُترے اُترے خاں صاحب! یہ اپنے نمکو کمرے میں رکھ لیجئے۔“ چار نمبروں والی منزل پر ہم تینوں اُترے اور

نے کئی تھیلے مجھے پکڑا دیے۔

”یہ تو بہت زیادہ ہیں عظمیٰ اتنے سارے تھیلے۔“ میں نے ہچکچا کر کہا۔

”زیادہ کہاں ہیں کم ہیں..... ہاں بھئی بوری بازار سے بس اتنے ہی ملے؟“ خاں صاحب بولے۔

”عظمیٰ میرا بیگ اتنا بڑا نہیں کہ یہ سب اُس میں سما سکے۔“ میں بولی۔

”چلئے میں لاہور پہنچ کر گھر پہنچا دوں گی۔“

خاں صاحب نے بڑے ندیدے انداز میں تھیلے پکڑے..... ”ناں جی قدسیہ! اس کا کیا اعتبار۔ یہ کیسے

چلتے کو پکڑا دے گی..... یہ ایسی ہی ہے نعمتیں بانٹنے والی۔“

خاں صاحب نے لاہور پہنچ کر یہ نمکوا ایک آدھ بار کھایا اور پھر اسے مہمانوں کی نذر کر دیا۔ رکھنے والے

یہ ضرور اسے بھی اپنی گپت گپھا کا حصہ بنا لیتے اور پھر بھول بھال جاتے۔

شیمم فاطمہ خاں صاحب کے ساتھ تلقین شاہ میں کام کیا کرتی تھیں۔ ”ادھ کھایا امروڈ“ لکھنے والے شخص

خاں کی بیگم اور انگریزی کے پروفیسر ضیاء الرحمن کی والدہ تھیں۔ بڑی پاٹ دار آواز بے لاگ لہجہ باندھتے

ڈھنگ..... جب بے دھڑک ”تلقین“ کہہ کر خاں صاحب سے مخاطب ہوتیں تو پروگرام کرار ہو جاتا۔ پتہ نہیں

کہ جس قدر شہرت فضل الرحمن صاحب کو ملنا چاہئے تھی نہ ملی۔ ”ادھ کھایا امروڈ“ کا لکھنے والا گتائی میں ہی مر گیا۔

فاطمہ کی آواز سارے پاکستان میں گونج اٹھی..... یہ اللہ کے بھید ہیں جن میں کسی کو دخل نہیں۔

شیمم فاطمہ پریم کی ڈوٹی چلا کر خوب سارے میوے ڈال کر شیر خرما پکا کر لاتیں۔

اور خاں صاحب کہتے ”شیمم! ہمارے ایک ڈاکٹر اشرف فاضلی صاحب ہیں۔ ان کی ”تفسیر“

تمہاری نظر سے گزری ہو۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ سویاں اور جلوہ بغیر میوے کے پکانے چاہئیں۔ یہ چیزیں کھاتے

بن جاتی ہیں.....“ لیکن خاں صاحب کی بات سن کر بھی شیمم رکاوٹیں ڈالنے سے باز نہ آئیں اور خاں صاحب کے

کے ہاتھ کے پکے ہوئے شیر خرما کو پسند کیا۔

فون کی گھنٹی بجتی ”میں شہزاد احمد بول رہا ہوں..... ذرا خاں صاحب سے فون ملا دیجئے۔“ اب سارا

ہو جاتا۔ دونوں آواکون سے لے کر جو دیت تک انسانی سوچ کی گنجلک ڈوریوں کو سلجھاتے۔ شہزاد احمد کا

ہے۔ وہ غیر نصابی فلسفے کی کئی کتابیں تخلیق کر چکے ہیں۔ خاں صاحب زندگی کو صوفی رنگ کی عینک پہن کر

تلے دیکھنے کے عادی تھے۔ جہاں ایک سفید کرن پوری قوس قزح بن جاتی ہے۔ نور کی وحدت کیسے کثرت میں

ہے۔ جلوہ ایک ہی ہے کبھی خوشبو بن کر پھیلتا ہے، کبھی رنگ بن کر نکھرتا ہے، کبھی کرنوں کی طرح ہر روپ کو

ہے۔ لیکن ساری گفتگو کے بعد پریم کہانی اُدھوری رہتی۔

خاں صاحب کہتے ”شہزاد یار! وہ تیرا تھوم کا اچار بس دو تین دن کا رہ گیا ہے۔ اس سے میرے

رہتا ہے..... پتہ نہیں بھائی میرے تو کیوں بھول جاتا ہے کہ میں انجانا کا مریض ہوں۔“

میں نہ مصلحت سمجھتی تھی نہ دانائی۔ غلط وقت پر بیجا بولنے میں راسخ..... جب فون بند ہو جاتا تو

”خاں جی! ابھی تو پوری بوتل اچار کی پڑی ہے۔“

وہ نہ مجھے سرزنش کرتے نہ میری دانائی یا بچ کو چیلنج کرتے۔ بس مسکرا کر کہتے ”آنے دو..... آنے دو۔“

ہیں ان کو آتے رہنا چاہئے..... اس جذبے سے رزق پاک ہوتا ہے۔“

میں اُن کی منطق کو تو نہ سمجھتی تھی لیکن چپ ہو جاتی..... ایک بار انہوں نے میری موجودگی میں عطاء الحق قاسمی سے کہا: ”یار! ایک روز..... مجھے اچھی طرح سے تو نام یاد نہیں شاید داراشکوہ تھا..... یا شاید کوئی اور شہزادہ..... یہ شہزادہ کیسے سونے کی اشرفیوں سے ٹھنسنے ہوئے لے کر میاں میر صاحب کے آستانے پر پہنچا اور دست بستہ عرض کی حضور! اس سے کیا جو کھٹ پران گنت سوالی آیا کرتے ہیں۔ میری عرض ہے کہ یہ آپ خلق خدا میں تقسیم کر دیں..... اُن کا سوال بھی میرے ارزاق بھی پاک ہو جائے۔“

میاں میر صاحب ڈر اسالرزے۔ پھر دونوں ہاتھ بہ انداز انکار اٹھا کر بولے ناں بابا ناں۔ میں چھوٹا سا جو ہڑت کا تحمل نہیں ہو سکتا..... یہ مال اسباب تم داتا گنج بخش کے ہاں لے جاؤ وہ سمندر ہیں..... علی ہجویریؒ کی طرح سب کچھ سمیٹ کر بھی اُبلے کا اُجلار ہتا ہے..... ہمیں ایسی خجالت سے معاف ہی رکھو۔“

”سننا ہے..... جونہی وہ شہزادہ والا تاجر علی عثمان ہجویریؒ کی درگاہ پر پہنچا..... ایک ساعت بھی نہ گزری تھی کہ اس سے لدے توڑے چوسے ہوئے آموں کی طرح خالی ہو گئے..... داتا نے انہیں ہاتھ بھی نہ لگایا نہ کوئی بات کی نہ کیا۔ جس ترنت ہی تھیلیاں بانٹنے کا حکم دیا اور سب بھول گئے۔ اشرفیاں..... شہزادہ اور تھیلیاں..... ایک حکم کے ساتھ وہ سب قارغ ہو گئے۔“

یہی کچھ خاں صاحب بھی کیا کرتے تھے..... اُن کے پاس فتوحات آتیں..... کھانے پینے کی اشیاء ترنت بانٹ دیتیں..... رکھنے والی چیزوں کو گپت غار کا حصہ بنا دیا جاتا اور باقی سب کو فوراً ہی بھلا دیا جاتا۔

افضال حیدر اُن کے ساتھ اردو بورڈ میں کام کرتے تھے..... اُن کے گھر سے ساگ اور مکئی کی روٹیاں رسالوں کی طرح پکرتی۔ ان دونوں چیزوں کا گھر والوں کو بہت انتظار رہتا۔ جب کبھی اقبال شہاب یا افضل حیدر کے گھر سے ساگ کھانا صاحب چسکے لے کر کھاتے اور کہتے..... ”قدسیہ! کیا ایسا ساگ ہم نہیں پکا سکتے۔“

”مکئی کی روٹی تو چکچکے بھن پر میں پکا سکتی ہوں لیکن یہ..... ایسا ساگ مجھ سے نہیں پکتا۔“

میں خاں صاحب کی توجہ ساگ سے ہٹا کر اپنی مکئی کی روٹیوں کی طرف مبذول کرانا چاہتی تھی۔ مجھے ارمان ہوتا تھا کہ میں چپاتی کی طرح چمکی مکئی کی روٹی صرف قدسیہ ہی پکا سکتی ہے..... مجھے کھانا پکانے کا علم بھی خاں صاحب نے ہی سکھایا تھا۔ جب میری شادی ہوئی تو مجھے ہاف ہائل انڈیا بھی بنانا نہ آتا تھا۔ رفتہ رفتہ میرے کڑوے کرلیے کچے آلو ڈالڈاٹین کے کھانے کی ہوئی روٹیاں ٹھنڈی چائے پی پی کر انہوں نے مجھے رام کر لیا۔ وہ کھانے میں نقص نہیں نکالتے تھے۔ صرف اس سے اجتناب کرتے اور میری انا کو اسی تعریف کی تلاش تھی۔

جب کبھی فتوحات میں کوئی اچھا مزیدار کھانا آتا وہ پکانے والے سے محبت کا اظہار اس طرح کرتے کہ ساری کھانے کو چھتے اور کچھ ایسے وضاحت سے سوال اٹھاتے کہ میری تربیت ہو جاتی۔ مجھے یاد ہے ایک بار شاہد کے گھر سے کھانا لیا۔ انکل ظفر کے یہ بھانجے غیبی طور پر ہماری توجہ میں رہتے تھے۔

انکل سے روسٹ کی ترکیب پوچھی تو وہ صرف کھانے تک شمولیت کرتے تھے۔ ترکیبوں سے اُنہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ ”قدسیہ! آپ شاہد کی والدہ سے مل کر ترکیب پوچھ لیں۔“

”ہاں یہ ٹھیک ہے..... تم کسی دن اُس کے پاس جا کر طریقہ وزن پوچھ آؤ..... یہ آسان ہے۔“

میں شاہد کی امی کے پاس گئی..... ساری ترکیب کان اور کا پی کھول کر لکھی..... کئی مرتبہ روسٹ پکایا.....

بنا لیکن وہ لذت پیدا نہ ہو سکی جو شاہد کی والدہ کے ہاتھ سے روسٹ میں منتقل ہوتی تھی..... پتہ نہیں کیا بات ہے ہر عمل

شخص اپنا پریم رنگ اپنی سائیکے اپنا روحانی زور کیسے منتقل کر دیتا ہے..... عمارت ہو یا فنون لطیفہ کھانا پکانا جو

ترتیب..... عمل کی حد تک پروسیس ایک ہوتا ہے لیکن نتیجہ کبھی ایک سا نہیں نکلتا..... تاش کے باون پتے انسانی جراثیم

چھبیس چیز اتنی رنگارنگی پیدا کرتے ہیں کہ ارتقاء ختم ہونے میں نہیں آتا..... کائنات ختم نہیں ہو سکتی۔

یہ سوال سائنس دان پوچھتا چلا جاتا ہے۔ نئے نئے جوابات بھی تشکیل کیے جاتا ہے لیکن صوفی ہاتھ اٹھا کر

”علموں بس کریں او یا.....“ علم رضا و رغبت پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے..... عمل راستہ چلنا سکھا دیتا ہے لیکن راستہ

پر منتج ہو اُس کا تعین نہیں کر سکتا..... بس نیت کی درستی سے رضا و رغبت کے ساتھ چلتے رہنے میں ہی راحت اور عافیت ہے۔

مجھے یاد ہے

ایک روز من آباؤ میں خاں صاحب اور میں پچھلے ویٹرے میں بیٹھے تھے کہ اماں جی آگئیں۔ ان کے ساتھ

الطاف ماموں بھی تشریف لائے۔ اماں جی ہمیشہ کی طرح شرمندہ شرمندہ ہنستی ہوئی بغیر استری کے ریشمی شلواری

تھیں۔ اب اماں جی ڈرتے ڈرتے اپنے بیٹے کے گھر بھی آنے لگی تھیں۔ باتوں باتوں میں خاں صاحب نے

”اماں جی کریلے کیسے پکتے ہیں؟“

اماں جی ہمیشہ کی طرح ہنسنے لگیں..... ”بس دو تین نمکین پانیوں سے دھولیا۔ پھر تھوڑا سا بھون کر پانی

ساتھ ہی پیاز چھوڑ دیا۔“ میں نے فوراً جواب دیا۔

”پانی چھوڑ دیا کریلوں میں؟“

ماما جی الطاف بولے ”ناں بی بی ناں..... اشفاق بیٹا..... کریلوں کو بھونتے جاؤ..... ڈھکنا دو..... پھر

ڈھکنا دو..... پھر بھونو..... پانی وانی نہ ڈالنا۔ قدیرہ بیٹی! کریلے کڑوے ہو جائیں گے۔“

ماں بیٹے نے اپنی ترکیب پر نہ اصرار کیا نہ ترکیب دوہرائی..... بس چپکے سے میرے گوش گزار کر دی کہ

طرح سہرا کہا کرتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے کریلے دھو دھو کر چٹے سفید کیے..... ڈرتے ڈرتے پانی ڈالا..... کھانے والوں

ترکیب سے پکے کریلوں کی ہمیشہ تعریف کی لیکن وہ ذائقہ پیدا نہ ہو سکا جو اماں سردار بیگم کے کھانوں کی خاصیت

کے قلب سے ڈوئی تک اور ڈوئی سے ہانڈی تک جو چیز منتقل ہوتی تھی اُس کا عرفان مجھے نہ ہو سکا۔

ہم نئے نئے امیر ہوئے تھے۔ نو دولتوں کی طرح ہمیں بھی نئی چیزوں کا شوق ہونے لگا تھا۔ میز پر

مہمان و رطہ حیرت میں چلا جاتا ہے اور اخبار سے لے کر ہر انسان تک تھوڑا یا زیادہ دوسرے لوگوں کو حیران کر کے

ہے۔ چائیز کھانے نئے نئے رائج ہوئے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ میں بھی چکن کارن سوپ، ہاٹ اینڈ سائز

وغیرہ پکاؤں لیکن دو چار مرتبہ کوشش بیکار گئی۔ دسترخوان کے طفیل لوگوں کو مرغوب کرنے کا مجھے بڑا شوق تھا۔

غالباً وہی عورتیں بالآخر اچھی باورچیںس بندھ جاتی ہیں، جنہیں دسترخوانی تعریف من بھاتی ہے۔ مرثیہ لحاظ اور تعریف کے تحت لوگ پسندیدگی کا اظہار بھی کرنے لگے تھے لیکن اندر مجھے یقین تھا کہ ابھی ناچخت ہے۔ پھر ایک کورس کا انتخاب میں چھپا۔ یہ کورس چینی کچوانوں کی سکھلائی کا تھا اور غالباً اس کی سپانسر حیات احمد صاحب کی بیٹی غزالہ تھیں۔ وہی حیات احمد خاں جو کلاسیکی موسیقی کی بقائے دوام کرتے کرتے اس دنیا میں کل پاکستان موسیقی کا نفرنسوں کو گھمے۔ اس گھرانے کو احمد بشیر صاحب کے خانوادے کی طرح فنون لطیفہ سے گہری وابستگی تھی۔ غزالہ تخلیقی اہنج کے تحت بہ اہتمام سے خلق خدا کے لیے کورس وغیرہ ترتیب دیتی رہتی تھی۔ اس سے پہلے سکھانے کا بھی ایک شارٹ کورس لے کر آیا تھا جسے میرے بیٹے اینق اور انیس بڑے ذوق و شوق سے اینڈ کرتے رہے تھے۔

چینی کھانوں تک میں ایسے سہولت سے پہنچ جاؤں گی اس کی سب سے زیادہ خوشی خاں صاحب نے منائی۔ مے کونگ کا چینی شیف ہمیں ماہر کرنے پر مامور ہوا..... سبزیاں کاٹنے کا فن ہم نے سیکھا ضرور لیکن جس طرح چینی پکڑتے اور چھری چلاتے یہ ممکن نہ تھا۔ ترکیبیں تو قریباً سب سمجھ میں آگئیں لیکن سبزیاں کا ٹنا عموماً خاں صاحب کا یہ نمٹ ہوتا۔ شیف صاحب کو نقل کرنا آسان تھا لیکن وہ پریکٹس ہاتھ آئیں نہ کبھی ویسے رزلٹ نکلے۔ البتہ تعریف سے ایک اور دروازہ کھل گیا۔

مجھے یاد ہے ایک روز شہاب بھائی اور خاں صاحب کہیں باہر گئے تھے۔ واپسی پر پتہ چلا کہ انہیں "کوئنج" میں کچھ دعوت دی تھی۔ چکن کارن سوپ، ہاٹ اینڈ سار، فرائیڈ چکن، رائس اور پران اینڈ ویگیٹبل مینو میں تھا۔ شہاب صاحب نے گھستے ہی کہا..... "ہمارا چینی کھانا بہتر ہوا کرتا ہے..... ہے ناں اشفاق؟" خاں صاحب چپ رہے۔

مجھے خوب علم تھا کہ شہاب صاحب دل رکھنے کی روایت قائم رکھے ہوئے ہیں، لیکن پھر بھی ان کی تعریف سن کر باغ باغ ہو گیا۔ انسان بھی کیا گھٹیا Specie ہے۔ اس کا بہرا من تو تانا کوئی وصف ہے نہ ذات..... بس اپنی تعریف سن کر خود بخود آزادی چھوڑ کر ہتھکڑی پہننے پر رضامند ہو جاتا ہے۔ جاگیر دار اور میراثی اسی تعریف کی زنجیر سے بندھے رہتے ہیں۔ جاگیر دار اپنے غلے کا منہ کھلا رکھتا ہے اور خوشامدی میراثی کو واہ جی واہ کرنے سے فرصت نہیں ملتی۔

نہ تو مزارعے میراثی کی ضرورت کبھی پورے طور پر پوری ہوتی ہے نہ نمبر دار جاگیر وار فیوڈل لارڈ ہی کا تعریف سے بھرتا ہے۔ دونوں ننڈیں بھر بھر کر لاتے رہتے ہیں۔ رہٹ چلتی رہتی ہے۔ طبیعت کبھی سیر نہیں ہوتی۔ اسی لیے یہ سسٹم کبھی ٹوٹ نہیں پایا۔ شہروں میں دیہاتوں میں پڑھے لکھے لوگوں میں یہ سسٹم چھوٹے بڑے رڈ و بدل کے ساتھ جاری ہے۔

سفر و سفر

سفر لندن

تشخیص کے بعد مجھے بلڈ کیمر کا مرض بتایا گیا اور میں مستقل طور پر ہسپتال میں رہنے لگی۔ دو تین بوتلیں دن کے کھانے میں لیکن صبح بلڈ کاؤنٹ کم نکلتا۔

ان ہی دنوں جب میں ایم آئی آر اور بلڈ ٹیسٹ کے چکروں میں تھی ایک روز جیلہ ہاشمی چند ایبوں کے ہمارے گھر آ گئیں۔ خاں صاحب کی پیشی ڈرائنگ روم میں ہوئی۔

”سنو اشفاق (نہ بھائی نہ شائی) تم قدسیہ کولندن کیوں نہیں لے جاتے۔ وہاں اس کا علاج ہو جائے گا۔“ سائنس نے کینسر کا علاج معلوم کر لیا ہے۔ Para-medical staff بھی بہتر ہے اور ڈاکٹر بھی۔“

”بھائی میری پہلی نہیں ہے۔“

”اگر تمہاری پہلی نہیں ہے تو ہم سب ادیب ل کر خرچ برداشت کر لیں گے۔“

”ضرور ضرور میں جلد جواب دوں گا۔ اس کے دو تین سٹ اور ہولینے دو۔“

خاں صاحب گو بظاہر جھوٹے ہی نظر آتے ہوں وہ لڑنے بھڑنے مناظرہ کرنے اور دل آزاری سے حتیٰ حدت بچتے تھے۔

اب وہ اسی سوچ میں مبتلا تھے کہ کیسے اس گھر آئی بلا سے جان چھڑائیں؟

پھر پتہ نہیں کیسے B.C.C.I کے بینک کو خبر ہوئی۔ ان دنوں برنی صاحب اس بینک کے صدر تھے۔ صاحب وائس پریزیڈنٹ.... غالباً جاوید طارق (جیدی) نے میری مخدوش حالت دیکھ کر مشتاق احمد یوسفی صاحب کو دئی۔ ان دنوں جیدی M.C.B بینک میں آفیسر تھا۔ اُس نے یوسفی صاحب سے رابطہ قائم کیا اور پتہ نہیں کیا کہ کون سی لیکن یوسفی صاحب کا خاں صاحب کو فون آ گیا کہ آپ قدسیہ کو لے کر آئیں تو ہم سارے سفر کا خرچ برداشت کر لیں۔ چوری چوری اعانت کرنے والے یوسفی صاحب ایک لفظ کے لیے محسن کی شکل میں سامنے نہ آئے اور انہوں نے برنی صاحب کے سر تھوپ دیا۔

ہم ڈرتے ڈرتے پہنچے۔ جب بیتھر وائیز پورٹ پر اترے تو ابھی سامان نہ آیا تھا۔ خاں صاحب سامان والی بیلٹ کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے کرسی پر بٹھا گئے۔ میری ساتھ والی سیٹ پر ایک قد آور مضبوط مرد بیٹھا ہوا تھا۔ شاید انہوں نے میری شکل سے اندازہ لگایا۔ وہ اٹھے اور سامان باہر لے جانے والی ریڑھی اٹھا کر اور بیلٹ کے پاس کھڑے خاں صاحب سے کہا ”بھرا جی! آپ فکر نہ کریں۔ مجھے صرف اپنا بکس اشارے سے کھارنے میں اتار دوں گا۔ آپ بی بی کے پاس رہیں۔“

خاں صاحب چپ رہے۔

اس سے پہلے ہمارا سوٹ کیس دو بار بیلٹ پر چکر لگا چکا تھا۔ اب سردار جی نے ترنت ہی سوٹ کیس اٹھا کر ریڑھی میں رکھ دیا۔ خاں صاحب نے ہوائی جہاز کے اندر جانے والا بیگ اور ایک آدھ اور بیگ اوپر رکھے اور ہمیں کا شکر یہ ادا کر کے چلتے بنے۔ حسن اتفاق سے سیورٹی پر جو آفیسر تھا اُس نے سوال کیا ”آپ اشفاق صاحب ہیں؟“

”جی۔“

”ایک محبت سوانسائے“ والے۔“

”جی۔“

”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی..... چلے کوئی چیکنگ نہیں۔“

اب فکر یہ تھی کہ ہمیں کون لینے آئے گا اور ہم کہاں ٹھہریں گے؟

جونہی باہر پہنچے ایک خالص انگریز Placard اٹھائے جنگلے سے باہر کھڑا نظر آیا۔ ہمیں شبہ بھی نہ ہوا کہ ہمارے پاس کون سا ڈرائیور بھی آسکتا ہے۔ جنگلے سے باہر نکلے تو ڈرائیور نے فوراً سامان کی گاڑی سنبھال لی۔ ہم دونوں اپنے اپنے گھر گئے۔ سڑک پار کر کے ہم پارکنگ لائٹ میں پہنچے۔ ڈرائیور صاحب نے سامان لوڈ کیا۔ ہمیں Cross Street ہسپتال سے تھوڑی دور ایک دو منزلہ مکان کی اوپر والی منزل میں لے گیا۔ کسی سفید قام انسان سے پہلی بار ملے۔ سوٹ کیس اور بیگ اٹھوائے۔ کچھ دیر گزری تھی کہ یوسنی صاحب آگئے۔ ہمارے پاس سر دست اُن کی توضیح کے لئے کھڑے تھے۔ میں نے فریق میں دیکھا تو چند جوس پڑے تھے۔ یہاں سے ایک جوس نکال کر یوسنی صاحب کو پیش کیا۔

اُن کے گھٹنے کے ساتھ ایک بڑا سا شاپر تھا۔ اب انہوں نے اسے مجھے دے کر کہا ”اس میں کچھ کچی رسد ہے۔“ یوسنی صاحب نے چینی سب موجود ہے..... لیکن میں دوبارہ یہ مہربانی نہ کر سکوں گا۔ یہ لندن ہے۔ یہاں ساری Groceries خود لانا پڑتی ہے۔ واشنگ اور کوئنگ کرنے کے لیے کوئی ملازم نہیں ہوتا۔“

مشرق میں تو لوئر مڈل کلاس میں بھی کپڑے دھونے برتن مانجنے کے لیے عورت مل جاتی ہے۔ یوسنی صاحب بولے ”قریب ہی ٹیوب سٹیشن ہے۔ آپ جہاں بھی جانا چاہیں ٹرین سے جا سکتے ہیں۔ ویسے تو سب بھی قریب ہے اب آپ کو کار بھی نہیں دی جا سکتی کیونکہ یہ ”ہوم“ ہے اور اس کی مراعات سب کے لیے ایک ہی

یوسنی صاحب ہمیں مغرب کی سب سے بڑی قدر Self-reliance ہاتھ میں پکڑا کر چلے گئے۔ ہم لوگ عادی کے عادی ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑنے پر ایسا تادہ اور راستہ پوچھنے والے لوگ تھے۔ پھر خاں صاحب جو سفر کے طے میں تاک ضرور تھے لیکن ایک بیمار عورت کے ساتھ پر کچھ اڑے اڑے سے لگتے تھے۔ اسی روز جاوید عبداللہ سے پاس آئے۔ وہ ہمیں ٹیوب سٹیشن دکھانے لے گئے۔

ٹیوب کا کمال بھی انسانی پھرتی کا ٹیسٹ تھا۔ بس یہ منٹوں کے لیے رکتی اور جھپٹا پٹ روانہ ہو جاتی۔ ایسی تیزی پر جھپٹا پٹی کچھ مجھے پریشان کر گئی۔ اس ٹیوب پر دوسرے تیسرے دن سوار ہونے کا اتفاق ہوا اور ساتھ ہی دہشت گردی کا یہ سحر آنکھوں سے دیکھا۔ ابھی ہم سٹیشن پر پہنچے ہی تھے کہ سر پھرا تو جوان بندوق لے کر کہیں سے برآمد ہوا اور دائیں بائیں ٹھاٹھا گولیاں داغ دیں۔ بچے اور عورتیں بدحواس ہو کر تتر بتر ہو گئیں۔ جونہی ٹیوب آئی اور ہم سوار ہوئے۔ جناب دہشت گرد بھی بندوق لے کر بیٹھیاں چڑھ آئے۔ ٹکٹ چیکر غالباً ایسے سر پھروں کا عادی تھا۔ وہ شانتی سے کھڑا رہا۔ دہشت گرد نے بندوق تانی اور سیٹوں پر بیٹھے مسافروں کو کافی پریشان کیا۔

پہلے ہی دن جاوید عبداللہ کے علاوہ نعیم ہمیں ملنے آیا۔ آپ عمر بکری کے نام سے تو غالباً واقف ہیں۔ عمر بکری کے دنوں کا رسیا تھا۔ اس کا ذکر خاں صاحب کے ”سفر در سفر“ میں تفصیل سے موجود ہے۔ میرے بھائی ریزی اور عمر بکری کے دنوں کا رسیا تھا۔ نعیم اُن ہی عمر بکری کے داماد تھے اور لندن میں رہتے تھے۔ انہوں نے آتے ہی کہا

”آپ مجھے اپنی رپورٹیں دے دیں۔ میں انہیں لے کر کراچی میں ہسپتال ابھی پہنچا دیتا ہوں۔“ اُس نے ڈاکٹر جی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور پورٹوں کے ہمراہ ایکس رے اور بلڈ کاؤنٹ کی باقاعدہ دن وار تفصیلات ہم پہنچائیں۔

”آپ ہسپتال جانے کی کوشش نہ کریں۔ میں کل تک آپ کو ڈاکٹر سے مائٹ لے کر بتا دوں گا۔“

اس کے بعد ہم Edgware Street گئے۔ یہاں ٹویلہ اور انیس موجود تھے۔ وہ کراچی سے آئے تھے۔

تھے۔ چونکہ انیس میناں Manager Agreements and Handling تھا۔ اس لیے اُسے پی آئی آئی کے حکام سے مل کر ٹویلہ اور ہائیکس ملی ہوئی تھی۔ ٹویلہ نے ہمارے لیے بڑا عمدہ پلاؤ اور آلو گوشت تیار کر رکھا تھا۔ مزے لے لے کر کھائے۔ اس کے بعد وہ ہمیں ایک سنڈے مارکیٹ میں لے گئے۔

یہ مارکیٹ ایک پاکستانی مہاجر لگا تا تھا۔ ادھر ادھر سے ہر عمر اور سائز کے کپڑے خرید لاتا اور اسے پکڑنے اور اتارنے میں اتنے دماغ پر بیچ دیتا۔ اب تو پاکستان میں بھی اتوار بازار جمعہ بازار ایک عام چیز ہے لیکن تب یہ ایک نیا اور نوکھلا بازار تھا۔ میں نے واپسی پر کچھ سوٹ خفے میں دینے کی غرض سے خریدے۔ ٹویلہ اور انیس نے مجھے خاں صاحب کو چند سوٹ خرید دیئے۔ میں جانتی تھی کہ انیس کی تنخواہ زیادہ نہ تھی۔ میں اصرار کرتی رہی کہ یہ فضول خرچی ہے۔ باز آ جاؤ لیکن مجھے خوف تھا کہ بارہ سو روپے کی تنخواہ میں اُس کے پاس اس اسراف کے لیے کہاں گنجائش تھی لیکن انیس بیٹے کی تنخواہ کم تھی۔ وہ بازار میں اپنے لیے آپ کو کچھ خریدنے نہیں دیتا۔ کبھی کوئی فرمائش نہیں کرتا لیکن آپ کے معاملے میں کچھ خریدنے سے بے فکر رہتا۔

شام کو اردو مرکز کے کتب خانے میں خاں صاحب کی کتاب ”اُجلے پھول“ کا فنکشن تھا۔ انیس اور انیس نے وہاں لے کر گئے۔ لندن کے ادیبوں کا خوب کٹھ تھا۔ زیادہ تر تعریف ہوئی۔ کچھ سوال بغلی گھونسلے جیسے بھی کیے گئے۔ ایسی مصفلوں میں ہوتا ہی ہے۔

مشاق یوسفی صاحب سے یہاں ملاقات ہوئی۔ ابھی انہوں نے ”آبِ گم“ نہ لکھی تھی اور بینکر کی حیثیت سے جانے جاتے تھے لیکن اُس وقت بھی اُن کی طبیعت کی شگفتگی اور مزاح کی حس نے بہت متاثر کیا۔

دوسرے دن صبح صبح ٹویلہ اور انیس ہمارے پاس پہنچ گئے۔ اُن کے ہمراہ Cromwell ہسپتال میں ڈاکٹر خالد حمید سے ملاقات ہوئی۔ اتنی تیز رفتار زندگی اور مصروفیت کے باوجود اُن کے چہرے پر ایک شگفتگی تھی۔ رپورٹیں دیکھ کر وہ شاکستہ سی آواز میں بولے۔

”ہماری اور میو ہسپتال کے ڈاکٹر جی کی رپورٹیں ایک سی ہیں۔ ہم آپ کے ڈاکٹر سے اتنا متفق کرتے ہیں کہ وہ کولڈ کیئر ہے..... لیکن ایک اختلاف ہے۔“

خاں صاحب کچھ گھبرا گئے۔

”وہ کیا ڈاکٹر صاحب؟“

”آپ ڈاکٹر جی سے کہیں کہ وہ ٹائپ رائٹر بدل لیں۔ اگر انہیں پاکستان میں نیا ٹائپ رائٹر نہ ملے تو یہاں سے بھجوا دوں گا۔“

ہم دونوں کی جان میں جان آئی۔

طے یہ پایا کہ ہم چند دن بعد چرچل ہسپتال میں ڈاکٹر شارپ سے مل لیں۔ وہی کینسر کا علاج کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نے ایک نرس کو حکم دیا کہ وہ میرے بلڈ کا ایک اور سیمپل شارپ کے معائنہ کے لیے لے لیں۔

ابھی ہمیں گھر پہنچا کر انیس اور ٹویلیڈ کو گئے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا کہ تقو آ گیا۔ اُن دنوں وہ عاشق حسین بٹالوی کا دوست تھا اور لندن کے گلے کوچے کنگل رہتا تھا۔ چونکہ وہ لڑائی اور جوگنگ کا شوقین تھا۔ وہ کبھی نہ سٹریٹ بس لیتا نہ کبھی ٹوب سے سفر کرتا۔

ابھی ہم حال چال معلوم کرنے کی سٹیج میں تھے کہ کرومیل ہسپتال سے فون آیا۔ اشتیاق نے فون اٹھایا۔ کچھ دیر تک بکے سنتا رہا۔ پھر بولا..... ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے پتہ چلا کہ لندن کا پیرامیڈیکل سٹاف اتنا Efficient نہیں جس کا ہم آپ لوگوں کو سمجھتے ہیں۔“

پھر کچھ دیر دوسری طرف سے کچھ کہا گیا..... اس کے جواب میں تقو بولا ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ میں تمہاری بحث ڈاکٹر خالد حمید سے نہیں کروں گا لیکن پتہ چلا سسٹر کہ تم لوگ ہم کالے آدمیوں کو کیا سمجھتے ہو۔ بڑی فرعونیت ہے بڑا غم۔ لاتا ہوں لاتا ہوں ابھی۔“

فون نیچے رکھ کر اُس نے شتوچی سے کہا..... ”تم نے سسٹر کی حرکت دیکھی۔ پہلے ہی کا کی میں بلڈ کی کمی ہے۔ اوپر سے کچھ کر سارا بلڈ گرا دیا۔ کہتی ہے مریض کو ہسپتال لے آؤ لیکن ڈاکٹر خالد حمید کو پتہ نہ چلے..... یہ تو لندن والوں کا حال ہے۔ تمہارے پٹھے۔“

خاں صاحب کو تقو ساتھ لے جانے پر رضامند نہ ہوا۔ ہم دونوں پیدل کرا مویل ہسپتال پہنچے۔ تقو کے جانے کے بعد جاوید عبداللہ آ گئے۔ اُس کے ساتھ میں لندن شہر گھومنے پھرنے لگے۔ لندن ناور Westminster Abbey۔ پیر سے کیننگھم پبلس دیکھتے چلے گئے۔ دوسرے دن جاوید عبداللہ ہمیں Bond Street لے گئے۔ یہاں Selfridge، جٹ مائیکل اور Littlewood کے سٹور دیکھے۔ اُس وقت تو احساس نہ ہوا کہ مغرب مارکیٹنگ کی وبا میں مبتلا ہو چکا تھا۔ مردموں نے لوگوں کی خواہشات کا بازار گرم کر رکھا تھا اور لوگ بازاروں میں خرید و فروخت کو ایک اہم خوشی سمجھنے لگے تھے۔ صرف زندگی میں در آ یا تھا اور لوگ ضرورت بھرا شیاؤ پر قانع نہ رہے تھے۔

اگلے دن ہمیں نعیم میاں ونڈسرا کا قلعہ دکھانے لے گئے۔ پھرتے پھرتے Eton اور Slough کا علاقہ زیرِ بحث آیا۔ واپسی پر انیس اور ٹویلیڈ کو گھر میں موجود پایا۔ اُن کے دو بیگ اور کچھ دستی سامان ساتھ تھا۔

”ابو آپ ذرا اطلاع نہیں دیتے کہ آئندہ کیا پروگرام ہے؟ میں اور ٹویلیڈ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہم اب ہمیں غمیں گے اور آپ کے ساتھ نتھی ہو جائیں گے۔“

”تم دونوں کیوں اپنی چھٹیاں برباد کرتے ہو۔ ہم مزے میں ہیں۔ جاوید اور نعیم ہمیں خوب سیر کر رہے ہیں۔ اب چرچل ہسپتال جانا ہوگا ہم تمہیں اطلاع دیں گے۔“

”نہیں نہیں ابو..... اب ہم آپ کو ٹرسٹ نہیں کرتے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔“

دوسرے دن ہم چرچل ہسپتال پہنچے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں میرا Bone marrow ٹسٹ دوبارہ کب ہوگا۔ ڈاکٹر شارپ نے ہم سب کو مخاطب کر کے کہا ”دیکھئے ہم نے مریضہ کو admit کر لیا ہے۔ رات کو انہیں سلا دیا جائے گا۔ شوہر حیات ہے؟“

”جی یہ ابو ہیں ہمارے۔“

”پھر یہی رہ سکتے ہیں۔ آپ دونوں جائیے۔ ہسپتال میں ایک آدمی سے زیادہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔“
مجھے اندر لیبارٹری میں لے جاتے وقت وہ پھر ٹولید اور انہیں سے مخاطب ہوا..... ”آپ لوگ جائیں۔ ہم بے ہوش کر کے ٹسٹ کریں گے..... کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

رات کے وقت مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لایا گیا۔ خاں صاحب کے سامنے بے ہوشی کا ٹیکہ لگا کر پھر انہیں جانے کا حکم ملا۔ وہ رات انہوں نے کسی کرسی پر بیٹھ کر گزاری۔

صبح کے وقت جب میری آنکھ کھلی تو ڈاکٹر شارپ اور خاں صاحب پاس کھڑے تھے۔
رات کس وقت Bone marrow ٹیسٹ ہوا مجھے معلوم نہیں۔ یہی ٹسٹ جب میوہسپتال میں ہوتا تھا۔
قدر تکلیف ہوئی تھی کہ الامان۔

ڈاکٹر شارپ نے خاں صاحب سے پوچھا ”آپ واپس کیسے جائیں گے؟“
”کوئی بس لے لیں گے۔“

”آئیے۔“

ڈاکٹر شارپ نے ہمیں اپنی کار میں بٹھایا اور لے چلا۔ کافی دُور جا کر بس سٹاپ ملا۔ ہمیں اُتار کر صاحب سے مخاطب ہوا ”میں آپ کو گھر پہنچا دیتا لیکن مریضہ ٹسٹ کے لیے آچکا ہوگا۔ میں کسی کو انتظار کرنا نہیں سمجھتا۔“

ایک ہی ٹسٹ کے دوران دو تجربے ہوئے۔ سسٹر نے بغیر کسی معذرت کے اشتیاق کی کسی بات کا نوٹس نہ لیا۔ دوسری بار یوں لہو کا ٹیمپل لیا جیسے کسی جانور کا لہو نکال رہی ہو اور اسی ٹسٹ کے دوران ڈاکٹر شارپ جیسا ہمدرد بھی نہ سمجھا۔ ہر قسم کا گلہ دھو ڈالا۔ Generalities کے ساتھ Exceptions ہمیشہ رہتی ہیں۔ سائنس کے اصول بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ ہم افراد کے اختلاف سے نہیں اُن کے Behaviour کے عمومی رویے سے قومی مزاج کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور غالباً یہاں کسی قوم کو سمجھنے کا بہترین طریقہ ہے۔

کچھ چینی بھی ٹکھنؤ کام چور اور بھگوڑے ہوتے ہیں لیکن زیادہ تر وہاں محنت کا راج ہے۔

جاپانی لوگ شائستہ مہذب اور دوسرے کے آگے کمر جھکا کر تعظیم کرنے کے عادی ہیں لیکن اس عموماً کے ساتھ ساتھ ایسے افراد بھی ضرور ہوتے ہیں جو بد تمیز تھو تھو کرنے والے اور آپ کو نلکے ٹنڈ سمجھنے والے ہوتے ہیں۔
لندن میں اب لسا قیام ممکن نہ تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر شارپ کی رپورٹ ویسی ہی تھی جو ڈاکٹر جی نے دی تھی۔
ان ہی دنوں میں ہمیں امپیریل کالج نے مدعو کیا۔ یہ بھی انٹرویو کی شکل کی ملاقات تھی۔ لندن میں مقیم

میں کرموشی سے آئے تھے لیکن یہاں وہ گرم گرمی نہ تھی جو اردو مرکز کی محفل میں تھی۔ پھر بھی ہماری انا کے لیے یہ شام بھی
بہت نسی بخش تھی۔

اسی سفر کے دوران ہماری ملاقات ایک بڑے ایکٹر بدیع سے بھی ہوئی۔ اس نے پاکستان میں خاں صاحب
کے کئی ڈراموں میں شرکت کی تھی۔ اس کے گھر ایک معرکے کی دعوت ہوئی جس میں چند مقامی ایکٹروں سے ملاقات
ہوئی۔ اس نے ہمیں ”سیکنڈ اور سنڈریلا“ کا ٹیپ بھی دیا جسے ہم نے انیس اور ٹو ویلہ کے ہمراہ دیکھا۔ اسی قیام کے دوران
ہم Ingman Bergman کی Autumn Sonata دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا اور ہم ورلڈ کلاسک بنانے والے ایک
ساز سے پہلی بار متعارف ہوئے۔

لوگوں کی اتنی ساری محبتیں سمیٹ کر جب ہم لاہور کے ایئر پورٹ پر واپس لوٹے تو عجب طرح کی اُداسی ساتھ
تھی۔ صرف ڈرائیور گاڑی لے کر موجود تھا۔

گھر کا کالا پھانک کھلا۔ ہم اندر داخل ہوئے اور پھر لاہور کے روزمرہ کی لپیٹ میں آ گئے۔

سفرِ دراوڑ

پتہ نہیں کیا تحریک تھی جس کی بنا پر ہم لوگوں نے قلعہ دراوڑ کا رخ کیا۔ اس سفر میں ہم دونوں کے ہمراہ جیلہ ہاشمی
بھی شامل تھیں۔ اس قلعے کی حیران کن بات یہ تھی کہ سارے کا سارا مٹی سے بنایا گیا تھا۔ منگھری کے علاقے میں ایسا پختہ اور
پتہ نشان آپ قلعہ دیکھ کر ہم سب حیرت میں ڈوب گئے۔

اتنی ساری یادیں دُھندلا گئیں لیکن اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود اس قلعے کی تصویر کبھی کبھی آنکھوں میں گھومتی

ہے۔

ہمیں دراوڑ کے قلعے کے علاوہ ایک اور رانی کوٹ کا قلعہ بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ تب ہم حیدرآباد میں مقیم تھے
کہ وہاں کے کچھ ادیب ہمیں رانی کوٹ کا قلعہ دکھانے لے گئے۔ سارا قلعہ دیکھنا ممکن نہ تھا اس لیے ہمیں ایک کتابچہ بھی عطا
کر دیا گیا۔ قلعے کا حسن کچھ الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ پاکستان بننے کے بعد یہاں کی پرانی عمارت اور آثارِ الصنادید
کے ساتھ بڑا سوتیلا سلوک روا رکھا گیا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل (ر) خواجہ عبدالرشید مرحوم نے رانی کوٹ کے قلعے پر ایک اہم
مقالہ ”پہرہ قلم کیا تھا جو اقبال ریویو“ (1965ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس قدیم قلعے پر یہ تحریر اہم معلومات کی حامل ہے۔

سفرِ اوسلو

13 اگست 1983ء کو پورے ساڑھے تین بجے صبح آدھی رات کو ہم اوسلو ہوائی ایئر پورٹ Forne Bu پر
پہنچے۔ یہاں چند لوگ ہمارے منتظر تھے۔ ہمیں Grandvig Raguar Segard کے علاقے میں پہنچا دیا گیا جو
سٹیاگلی سے مشابہ ہے۔ شام کو یہاں کے ادیبوں نے پاکستان کے یوم آزادی کو جشن کی صورت منانے کا پروگرام بنایا تھا
اور خاں صاحب آزادی کی اس Celebration میں صدر تھے۔

شام کو ہمیں قیصر سعید اُس کی بہن عذرا درانی، سلیم بیگ اُس کی بیگم شہناز لینے آئے۔ یہ فنکشن رائٹرز یونین
نے ایک بہت عالیشان محل میں کرایا۔ اس میں مہمان خصوصی یہاں کی منسٹر آف جسٹس تھی۔ ہمیں آزادی کی مبارک دی اور

بڑے تپاک سے پیش آئیں۔

اب تقریباً رو نمائی آزادی کے فنکشن ہونوں میں مل جل کر باہمی ستائش کے پروگرام عام سی بات ہیں۔ تب یہ معاملات اتنے روزمرہ کا معمول نہ تھے۔ خاں صاحب نے ایسی تقریر کی کہ ہال میں موجود تمام لوگوں نے کھڑے ہو کر داد دی۔ ہال بھرا ہوا تھا اور سائیڈوں پر کئی لوگ کھڑے تھے۔ پاکستانی تو موجود تھے ہی لیکن اس شام ناروے کے بھی اتنی تعداد میں آئے کہ ہم حیران رہ گئے۔

جب میری باری آئی تو میں نے تقریر میں کہا کہ کوئی معاشرہ بھی جب تک تو ازن اختیار نہیں کرتا اس کے لئے نہیں ہو سکتی۔ آزادی اور Cooperation دونوں میں Balance نہ ہو تو انسان مختلف قسم کی بیماریوں کا شکار ہے۔ مغرب نے اپنے معاشرے کی بنیاد آزادی بنائی ہے۔ یہاں مرد اور عورت اس قدر آزادی کے خواہاں ہیں کہ عورت کا دیر تک ایک دوسرے کے ساتھ رہنا ممکن نہیں رہا اسی لیے شادی کا ادارہ بے کار ہو گیا ہے۔ بچے چھوٹی عمر سے خود مختار ہو کر گھر چھوڑ جاتے ہیں حتیٰ کہ نرسری میں ان کے گلے میں گھر کی چابی لٹکا دی جاتی ہے۔ جو بچی گھر سے کھول کر اندر جاتا ہے، فریج سے دودھ نکالتا ہے، Cereals ڈالتا ہے اور کھا کر ہوم ورک کرنے لگتا ہے۔ پڑھنے کے باپ کو ’بوڑھے گھروں‘ میں منتقل کر دیتے ہیں اور کرسس کے قریب ان سے ملنے کی گنجائش بنائی جاتی ہے۔

اس طرح حاصل کی گئی آزادی سے جو تنہائی ملتی ہے اس کا لاکھ علاج تلاش کریں انسانی روح تھرتھرتی ہے اور مشرق کا معاشرہ خاندانی روایات کا پابند ہے۔ یہاں دو تین پشتیں ساتھ رہتی ہیں۔ مشکلات ہوتی ہیں، لیکن روگ، نفسیاتی، ذہنی اور قلبی بیماریوں کو اس طرح فروغ نہیں دیتا جس طرح مغرب میں اس کے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ فنکشن کے بعد فریج تھا۔ اس کھانے پر میرے دائیں ہاتھ فن تھسین Finn Thiesen بیٹھے تھے۔ قرآن پاک کا ترجمہ ناروے میں کیا تھا۔ فن تھسین Indo i ravsk institut میں پڑھاتے تھے۔ اس کے بعد Boks 1035 اور وہ اوسلو کے Blindern کے علاقے میں رہتے تھے خاں صاحب اپنے ساتھ بیٹھی پروفیسر Srennby سے مصروف گفتگو رہے جو کشمیری زبان پڑھاتی تھیں۔ ان سے انہوں نے چند ناروے کی حروف لے لیے اور ان کو بلا تکلف استعمال کرنے لگے۔

خدا حافظ

Adjq

بادیو

السلام علیکم

morn

مون

شکریہ

thant

تھک

ساتھ ساتھ انہوں نے لڑکیوں کے پرانے اور نئے نام معلوم کیے۔ فیملی نام اور لڑکوں کے نام یاد کیے۔

لڑکیوں کے نئے نام

لڑکیوں کے پرانے نام

Anne

آنے

Eva

ہیو

Mona

مونا

Ingborag

انگم بورگ

Liv

لیو

Helma

ہلیما

Toeil	تھورل	Sigrid	سگریڈ
	فینلی نام		لڑکوں کے نام
Hansen	ہانس	Olav	اولاد
Olsen	اولسن	Knut	کھنوت
Petersen	پیٹرسن	Per	پچیر
Berg	Berg	Hans	ہانس
Rud	رود		

لڑکوں کے کام

- 1- ہوٹل اینڈ ریستورنٹ
- 2- فیکٹری
- 3- صفائی
- 4- ڈرائیونگ وکل ٹرانسپورٹ
- 5- برانس

لڑکیوں کے کام

- 1- صفائی
- 2- نرسری میں زبان کی تعلیم
- 3- فیکٹری
- 4- دوکانوں پر کام

خاں صاحب اپنے سفر کو سونا بنانے میں مشغول تھے۔ میں ہمیشہ کی طرح حیرت میں تھی۔ تھسکین نے اپنا تخلص یہ پورا رکھا ہوا تھا۔ اُس نے اسلام قبول نہ کیا لیکن قرآن پاک کا ترجمہ نارویجین میں کیا۔ یہ ناروے میں ہونے والا پہلا ترجمہ تھا۔ تھسکین کئی آیتوں کو زبانی سنا سکتا تھا۔ میں حیران ہوں کہ کس طرح اس شخص نے اتنا کام کیا۔ ساتھ ہی میں خاں صاحب کی تفصیل پسندی پر بھی حیران ہوئی۔ انہوں نے اس کے ساتھ آٹھ دنوں کی ڈائری تیار کی جو آپ کی خدمت میں پیش کرتی ہوں۔

خاں صاحب کی تحریر سے اقتباس

ایک خوبصورت گھر میں ایک گھنٹہ گزارنے کے بعد مجھے اپنا ہوائی سفر یاد آ گیا۔ پچھلے دنوں دنیا میں ہوائی زندگی کے سوال پورے ہونے پر بڑے فنکشن ہوئے۔ سواری کے جہازوں اور فوجی جہازوں کا ڈسپلے ہوا اور ہم نے اخباروں سے وی پرائے ایسے جہاز دیکھے جو پہلے نظر سے نہیں گزرے تھے..... میرے ساتھ ہوائی جہاز کا رشتہ بڑا پرانا ہے مگر اتنی ہی سہ دوستی کے باوصف ہم میں گہری مناسبت پیدا نہ ہو سکی۔ 1947ء میں پاکستان بننے کے دوسرے ہی مہینے میں رمفیو جی کیمپ میں ہیڈ کمر کی کے عہدے پر فائز تھا.....

گرمیوں کی چھٹیوں میں روم سے میڈرڈ گیا۔ میں تو سپین پہنچ گیا مگر میرا سوٹ کیس کہیں اور چلا گیا۔ کمپنی میں نے کہا آپ کا بیگ آپ کے ہوٹل پہنچا دیا جائے گا۔ میں ہوٹل کا نام نکھوا کر ہوٹل آ گیا۔ سارا دن تین کپڑوں میں گزارا۔ رات کو زیر جامہ میں سو گیا۔ اگلا دن پھر ایسے ہی۔

کپڑے دھونا..... قرطبہ کا سفر لاری میں صبح منہ اندھیرے چل کر سہ پہر قرطبہ پہنچا۔ وہاں تین دن قیام میں

کپڑے نہیں دھوئے۔ مسجد میں دو وقت آنا ہوتا لیکن کپڑے دھونے کی ضرورت نہ تھی کہ وہاں جماعت ہی نہ ہوتی تھی۔ سامان نہ ہونے کی بدولت آزادی۔ بھلا ہوا میری گھگھری ٹوٹی۔

واپسی سفر: بینگروالے سے کہا اس کے بغیر بھی کام چل جاتا ہے۔

روم میں گھر پہنچ کر دیکھا میرا سوٹ کیس پہلے سے موجود تھا۔ میں پھر چیزوں میں اور سامان میں گھر گیا۔

سفر (اوسلو)

سن 1983ء میں Writers' Union نے مجھے اور خاں صاحب کو اوسلو مدعو کیا۔ ناروے کے اس قریبی

شہر کی عمارتیں گویا آئینہ خانہ تھیں۔ سڑکیں دھلی دھلائی لوگ شائستہ سفید اور نرم طبیعت تھے۔

بہت سے ادیبوں سے بھی واقفیت ہوئی لیکن زبان آڑے آئی لیکن Nelga Uafsenl کو ہم اپنے

پناری میں ساتھ لے آئے۔ اس سے Trolls کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے دوران ہمیں پتہ چلا کہ وہ

اور اس کی کچھ نظمیں انگریزی میں ترجمہ بھی ہو چکی ہیں۔ ناروے کے لوگ روپ میں Trolls بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

ٹرولز ایک قسم کی روہیں ہیں جو انسانوں کی مشکل میں امداد فیسی کے طور پر اچانک نمودار ہو جاتی ہیں۔

مشابہت پریوں سے ہے اور وہ کسی Fairy God Mothers کی طرح انسان کو دکھائی پڑتی ہیں۔ ہر خطے سے

کی روحانی امداد کی تجسیم کرنے کا خواب ضرور دیکھا ہے۔۔۔ تاریخ گواہ ہے کہ جغرافیائی تقسیم کے باوجود اس خوب

عجیب قسم کی مماثلت ہے۔

Trolls ایک نوعیت کی دیوالاکی مخلوق ہیں۔ جیسے جن اور پری کا تصور ہمارے ادب اور لوگ کہتے ہیں

ہے۔ ان ٹرولز کا کام انسانوں کی مدد کرنا اور مشکل وقت میں اشارے کنارے سے انتباہ کرنا ہے۔

یہ نظمیں غالباً ستر کی دہائی میں لکھی گئیں اور مجھ تک 1983ء تک پہنچیں۔ یورپ کے یہ لوگ مشینی زندگی

کی برکات اور اس سے پیدا ہونے والی تنہائی سے دنیا میں سب سے پہلے آشنا ہوئے۔ ان کی برف پر انسانی سونے

قتل سے نہیں بلکہ انسان کے آئیڈیلز کی ٹوٹ پھوٹ سے بہہ نکلیں۔

میں نے یہ نظمیں اس لیے پسندیں کہ ابھی ہم نے Perfection کی دوڑ میں حصہ نہیں لیا تھا۔ ہم

کے آگے بڑھ کر کارریس سونامی کے سیلاب زمانے بھر کے اشتہار نہیں دیکھتے تھے۔ ہمارے بچوں نے سکے ڈال کر

نہیں سیکھا تھا۔ ہم ابھی دیہات کے سوائے کچھ اس کی جہالت رسم و رواج مذہب اور اس کی وجہ سے

سکون کے آشنا تھے۔

جس کیفیت سے گزر کر یورپین ادب اور ہیگلے جیسے نامعروف شاعر کی نظمیں وجود میں آئیں یہ

بیسویں صدی کے آغاز میں یا اس سے کچھ ہی دیر پہلے ملا۔ مشرق کی سخت زمین میں ہل چل رہا تھا۔ تبدیلی آ رہی تھی۔

لیکن ابھی ہمیں شعوری طور پر اس کا کئی احساس نہ تھا۔

1985ء میں جب ہم انگلینڈ سے لوٹے تو ان دنوں میری صحت کا معاملہ اتنا گڑبڑ تھا کہ خاں صاحب

سرج لائٹ موڑنے کی زحمت نہ کی۔ وہ انجانا کے مریض تھے۔ شکاگو میں اُن کے کئی سٹ اُن کے بھتیجے ڈاکٹر طارق نے کھانے کروائے تھے جن میں ایک سٹ یہ بھی تھا جس میں ایک دوڑتے پھپھے پر تیز تیز چل کر اپنے دل کو تھکانے اور اس پر پورا ہمت کا اندازہ لگانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہ سن پچاسی سے تین سال پہلے کی بات ہے۔ ابھی میرے بلڈ کیمنسٹر کا شروع نہ ہوا تھا۔

غالباً یہ 1987ء کے شروع میں ہوا۔ ڈاکٹر زبیر اپنی خاموشی، سنجیدگی اور خوفِ خدا کے باعث Misunderstood محسوس کرنے کے بہت مواقع بہم پہنچاتے ہیں۔ خاں صاحب کے بھانجے ڈاکٹر جواد ساجد کے اصرار پر ہم ڈاکٹر زبیر کے پاس ہسپتال پہنچے۔ ہمیشہ کی طرح خاں صاحب نے نہ تو بچوں کو بتایا نہ اپنے کسی بھائی بہن ہی کو اطلاع دی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح خاں صاحب کو جانے کیسے علم ہو گیا۔ وہ انجو پلاسٹی کے دوران ہمارے ساتھ تھا۔

مفتی جی کا گونگا جھ سے بھی نہ بولا۔ بڑے بھرپور ڈرامے تحریر کرنے والے نے اپنی زندگی میں کسی ڈرامے کو دور سے دیا۔ وہ جذباتی اظہارِ محبت سے کتراتے تھے۔ انہیں نہ آنسو اچھے لگتے تھے نہ بھرائی آواز میں روکی رکی باتیں... وہ ایسے بابوں کے عاشق تھے جو ٹانگ amputate کروا لیتے ہیں لیکن ذکر سے زیادہ Anesthesia استعمال نہیں کرتے۔

ڈاکٹر زبیر نے انجو پلاسٹی تجویز کی۔ Anesthesia کے لیے ڈاکٹر طارق بن افتخار کا نام تجویز ہوا تو بولے "کاش! میں بھی صبر اور نماز کی معاونت اختیار کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ لیکن میں بڑا باہا نہیں ہوں۔ وہ تو پورے ہوش میں باجگ کٹوا لیتے ہیں لیکن آف نہیں کرتے۔"

ڈاکٹر زبیر نے بڑی مشکل سے اپنی خاموشی کا قفل توڑا اور بولے "آپ کتنے بڑے بابا ہیں؟" خاں صاحب اپنی کئی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے "آپ کو پتا ہے پٹھان، مغل اور راجپوت عموماً بابے نہیں سمجھے۔ ان کی انا کا خول ٹوٹنے میں نہیں آتا۔ میں بابا ہوں نہیں صرف بننا چاہتا ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ سرکاری لیول پر شائق ڈے نہ منایا جائے بلکہ میرا عرس ہوا کرے میرے بعد۔ داتا گنج بخش کی طرح.... اتنا بڑا نہیں.... چھوٹا سا... وہاں وصال پڑے تو الی ہو.... لوگ اندر باہر نہال ہوں ٹٹا ہوں.... خوش آئیں خوش جائیں...."

ڈاکٹر زبیر باتوں کے عادی نہیں۔ ماتھے پر ٹکدر کے آثار پیدا کر کے بولے.... "آپ کا کیا خیال ہے یہ بات کس؟... شرک نہیں؟"

خاں صاحب آہستہ سے مسکرائے پھر بولے "ڈاکٹر صاحب! جہالت ایک قسم کی سادگی کا نام ہے۔ غریب و عیاش حاصل نہیں کر سکتے۔ وہ غربت کے باعث زندگی کے Exposure تک نہیں پہنچ پاتے۔ سفر اُن کے بس کی بات ہے۔ پھر وہ تحفظ کہاں سے حاصل کریں۔ مینڈک سے تالاب کے بند پانیوں کی لذت بھی آپ چھین لینا چاہتے ہیں۔ یہ بڑی کے کوٹھے کی تو اجازت دیتے ہیں کہ اس طرح لوگوں کی جنسی آسودگی Stress اور Frustration کم ہوتی ہے جس سے آپ روحانی آسودگی حاصل کرنے نہیں دیتے۔"

کیا ساری ذمہ داری بوجھ اور تکالیف کو کسی بابے کی چوکھٹ پر پھینک آنے سے جو اطمینان ملتا ہے وہ قابل

تقلید نہیں۔ بابا امید کا جو دیا جلاتا ہے..... جس اگر بتی کا مشام انگیز دھواں چھوڑتا ہے کیا وہ قابلِ نفرین ہے۔ مجھے نے اُن لوگوں کے چہرے دیکھے جو کسی مزار سے باہر نکلتے ہیں۔ جھولیوں میں ہاتھوں میں باسی پھول کھانے کے تمام مصیبتوں کے باوجود چہرے پر امید کی کرن..... جو صلے کی چمک..... چکروں میں پھنسے ہوئے نادار انسان کے کیا یہ کم آسودگی ہے؟“

اب ڈاکٹر صاحب نے سنجیدہ سا پکا سامنہ بنا کر کہا..... ”اور وہ جو شرک ہے..... اللہ کی ذات کے ساتھ ملانے کا گناہ..... وہ جو دھاگے باندھتے ہیں۔ مزاروں پر منتیں مانتے ہیں۔ اپنی خواہشوں کے پورا کرنے کی آس..... بابے سے۔ وہ سارا تو شرک ہے..... ہے نا.....“

”لیکن ڈاکٹر صاحب..... پھر انجو پلاسٹی ختم..... اب میں چلتا ہوں۔“

ڈاکٹر زبیر حیران ہو کر بولے ”ہیں وہ کیوں؟“

”میں بھی شرک کر رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ آپ کے علاج سے میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ حالانکہ یہ تو مجھے

مجھے سب کچھ اللہ پر چھوڑنا چاہئے۔“

”لیکن اونٹ کا گھٹنا باندھنا چاہئے اشفاق صاحب!“

”غریب لوگ بھی گھٹنا باندھتے ہیں۔ کچھ واقعی بابے کو خدا سمجھتے ہیں اور حاجت روائی کے لیے

ہیں..... لیکن یہ اُن کی مایوسی کی آخری سٹیج ہوتی ہے..... وکیل اور ڈاکٹر رب کے نعم البدل ہیں۔ ان کی طرف اشارہ

کرے ہی کرے۔ ایسے ہی بابا ایک رُخ سے سائل کا حل ہیں۔ رہا شرک کا معاملہ تو یہ رب اور بندے کے درمیان

ہے۔ ہمیں..... اس کی فکر نہ ہونی چاہئے..... ہاں جی تو کون سا Anesthesia تجویز کرتے ہیں آپ؟“

خاں صاحب جانتے تھے کہ گفتگو اس سے آگے ڈاکٹر صاحب کے لیے ناقابلِ برداشت ہو جائے گی۔

پتہ نہیں خاں صاحب بابے تھے یا نہیں تھے۔ وہ کشف و کرامات کے متعلق کچھ علم بھی رکھتے تھے کہ

نے انہیں نمازوں کی پابندی اور وظائف میں بھی زیادہ گھرے ہوئے نہیں دیکھا..... ہاں خلق میں رلے

دل نوازی و دلداری اور مہمان داری میں وہ خوب ماہر تھے۔

اگر آپ کبھی کسی ڈیرے پر گئے ہوں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بابے ہمیشہ میل جول پر اصرار کرتے ہیں۔

قائم رہیں۔ میل جول میں کمی نہ آئے تو کبوتر کبوتروں کی ہمرکابی میں پلے گا۔ کوئے اپنے جیسے کوئے تلاش کر لیں گے۔

زانی جوئے باز کو اپنے مطلب کی صحبت مل جائے گی۔ نیکو کاروں کی ہمراہی میں گناہ تو سرزد ہوتے رہتے ہیں

گھڑی ڈور نہیں ہوتی۔ انسان نیک عمل کے بعد اتراتا تو رہتا ہے لیکن اس شیخی پر احساسِ جرم بھی جلد یا بدیر ہونے لگتا

خاں صاحب بھی میل جول پر اصرار کیا کرتے تھے۔ اُن میں ایک خاص خوبی یہ بھی دیکھی کہ جو اُن سے

جس کو اُن کی ذرا سی قربت نصیب ہوئی، جو کوئی اُن کی صحبت سے فیضیاب ہوا وہ یہی احساس لے کر اٹھا کہ

صاحب کو جانتا ہے۔ وہی اُن کے قریب تر ہے اور اُسی کی راہ خاں صاحب دیکھا کرتے ہیں۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد جو بھی اُن کی یاد میں شریک ہونے کے لیے آیا اُس نے ایسی کہانی

سے زیادہ قریب کوئی تھا ہی نہیں، جیسے وہ مقرب خاص انہیں جانتا تھا باقی سب تو محض حاشیہ آرائی کیا کرتے تھے۔ جس قدر وہ گلاس بھر سیر ہوئے، جنہیں تو اتر سے نصیب ہوا وہ جل تھل کی کیفیت میں یوں آئے، جو ان کے ساتھ شریک ہوئے انہوں نے بارش میں بھگینے کا سا احساس پایا۔

”زاویہ“ دیکھ کر تو یوں احساس ہوا کرتا ہے جیسے وہ غیب میں بیٹھے ناظرین کا دل موہ لینے میں ثانی نہیں رکھتے۔ وہ لوگ جو منہ در منہ فقط ایک بار ملے انہیں بھی یہی اعتراف کرنا تھا کہ وہی خاں صاحب کے قریب تھے.....

غالباً با بے جانتے ہیں کہ انسان دو صورتوں کے آگے نہتا ہے جنسی آسودگی اور پیٹ کی بھوک..... ان دو حالتوں کو پورا کرنے والا احسان کرتا ہے اور باسانی رابطہ قائم کر لیتا ہے۔ جنسی آسودگی کے معاملے میں تو با بے شرع کی بات سمجھتے ہیں، لیکن کھلانے کے بارے میں ان کی فراخ دلی کا کوئی جواب نہیں.....

اجتہاد کے بجائے انتظام کے قائل ہوتے ہیں۔ جو کچھ گھر پر موجود ہے اس میں ٹروٹی سمجھانے، اسراف کرنے، شیش آرائش کے ساتھ کھلانے پلانے کی شرط نہیں۔ اگر گرم روٹی اور اچار مہیا ہو جائے تو یہی لنگر ہے اور بھوکے کو کھاتا ہے..... امیر کے لیے دال چپاتی اور غریب کے لیے مرغی گوشت لنگر کی اعلیٰ قسم ہے کہ دونوں کے دسترخوان پر یہ کھانا ہوتا ہے۔

ڈاکٹر زبیر کے ساتھ جس صبح انجو پلاسٹی کا مرحلہ تھا اُس دن میں نے دیکھا خاں صاحب قدرے متفکر تھے۔ انق سے صبح میں تھے۔ خاں صاحب اشر اور میں ہمیشہ کی طرح میوہ ہسپتال پہنچے۔ اشر ابو کے ساتھ تھیٹر کے اندر چلا گیا۔ اشر ابو کے ساتھ تھیٹر ہی میں اوٹ کر کے بٹھا دیا گیا۔ ڈاکٹر زبیر ہمیشہ کی طرح مجھے نا دیدنی منظر سے بچانا چاہتے تھے اس لیے اندر تھیٹر کی ٹیبل کے پاس نہ لے گئے۔

میں نے ہمیشہ کی طرح واقعہ سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لیں اور ایک مرتبہ بھی اُس سکرین پر نظر نہ ڈالی جس پر کھانا کی پیشکش کی گئی۔ آپریشن کا منظر چلا آ رہا تھا۔ میں ہمیشہ سے چھوٹے چھوٹے خطرات کا مقابلہ آنکھیں کھول کر اور بہادری سے کرتا ہوں لیکن جونہی معاملہ میرے بس کا نہیں رہتا میں اس سے ایسی چشم پوشی کرتی ہوں گویا طوطا چشم ہوں..... غرضیکہ آپریشن ہو گیا۔

لیکن اس کے بعد کچھ سقم کی بدولت لہورس رس کرنانگ میں اترنے لگا اور ساری ناگ لہو بہان نظر آنے لگی۔ یہاں جب انہیں بہت تکلیف تھی اور ڈاکٹر جواد اور ڈاکٹر زبیر بہت متفکر تھے، وہ نہ تو فکر مند ہوئے نہ کسی کو پریشان کیا۔ وہ کوئی نچا کر کے پڑے رہتے۔ وقت کا انتظار کرتے اور شاید دل ہی دل میں لہو کے رُک جانے کی راہ دیکھتے۔ انسان کی طرح صبر کو ڈھال کی طرح استعمال کرتا ہے اور کیسے واویلا مچائے بغیر مشکل کا وقت گزار سکتا ہے یہ ان ہی کی ترکیب ہے۔ مجھ میں آیا اور نہ منہ پر ایک دانہ نکل آنے پر میں نے لڑکیوں کو روتے دیکھا ہے۔

آخری دنوں میں جب ان کا وزن لبلبے کے کینمر سے گھٹ رہا تھا وہ عجیب قسم کی بے بسی میں مبتلا تھے۔ مجھے علم تھا

کہ وہ جسمانی تکلیف کو برداشت کرنے کی قوت مدافعت رکھتے ہیں۔ کچھ اور فکر تھی جس کا اظہار وہ کرنا نہ چاہتے تھے۔
کی پرائیویسی میں دھکم دھکا بغیر دستک دیئے داخل ہونے کا مجھ میں حوصلہ نہ تھا۔

کبھی کبھی وہ آنکھ کے کونے میں جمع شدہ آنسو پینے کی کوشش کرتے، لیکن اندرونی کرب اتنا تھا کہ آتے آتے اور کانوں کی جانب رسنے لگتے۔ ہم نے ان کے سامنے کبھی کینسر کا ذکر نہ کیا تھا لیکن غالباً وہ ہم سب کے جسم پر بھانپ چکے تھے اور بھلے ہی جانتے تھے کہ جس رسولی کا ڈاکٹر بلال نے سرسری ذکر کیا تھا 'Malignant' ہو کر رہ جائے گا۔
ہوگی۔

رات کے پچھلے پہر قریب ساڑھے تین کے لگ بھگ میں جوس کا گلاس لے کر ان کے پاس بیٹھی تھی۔
انگلیاں ٹھنڈی بن گئیں۔ میری تسلی کی خاطر وہ مجھے بن کر سو رہے تھے۔

”یہ پی لیں؟“

”کیا؟“ بڑی عمدہ اینٹنگ کے ساتھ خاں صاحب نے آنکھیں کھولیں۔

”جوس..... بڑا اچھا ہے۔ مزے دار۔“

”ضرور ہوگا۔“

”پی لیں۔“

”تم پی لو..... میرا جی نہیں چاہتا۔“

”Ensure لاؤں؟“

”ناں رہنے دو۔“

ان کی آواز نحیف تھی۔

”سنو قد سیر! ایک بات کرنا تھی تم سے، پی نہیں تمہیں سمجھ بھی آئے گی کہ نہیں..... میرے دل پر جو

”آپ کوشش کر دیکھیں شاید.....“

”ویسے تو تم بہت ذہین ہو لیکن یہ تمہاری فیلڈ نہیں۔ عارف دنیا کو ایسی باتوں پر وقت بھی نہ

چاہئے۔“

اس وقت چپ رہنا ہی بہتر تھا ورنہ گفتگو کے بہاؤ میں پھر ڈکا لگ جاتا۔

چند لمحے سیکھے کی آواز آتی رہی

”جب کئی دن قبض رہے تو آدمی کتنے علاج کرتا ہے۔ تر پھلا، اسپغول..... مجو نہیں استعمال کرتا ہے۔

آرام نہ آئے تو لالہ Duphalac بھیج دیتا ہے۔ فروٹ سالٹ الکا سلسمز لیتا ہے..... کھانے پینے کو طاقت

استعمال کرنے کے بعد باقی پھوک کو جسم اپنے اندر پناہ نہیں دیتا۔ فضلہ رتخ کے لیے جسم سٹور ہاؤس بننا نہیں چاہتا۔

صحت کی جس قدر input ضروری ہے ویسے ہی اس کی output کے بغیر آدمی بے چین ہو جاتا ہے۔ سمجھ رہی ہو گی

نہیں کرتے ڈاکٹر لوگ پیٹ، انٹریاں صاف کرنے کے لیے، خاص کر آپریشن سے پہلے تو انیما تک بدو بدی

تھی۔

”جی..... لیکن کیا؟“

”ہم سمجھتے نہیں روح میں جو غلاظت جمع ہو جاتی ہے..... وہ وہ وہ.....“ اچانک وہ چپ ہو گئے۔ اُن پر نقاہت

تھی۔

”برے اعمال کے بعد تو یہ روح کو دھو دیتی ہے..... نماز بھی تو غلاظت نکالنے کا طریقہ ہے۔ روزہ صدقات،

”روحانی قبض کا علاج اتنا آسان نہیں قدسیہ بیگم..... برے اعمال کے بعد جو احساسِ جرم انسان پر غالب آتا

کے کام کی چیز ہے..... اسی احساسِ جرم کے باعث بسا اوقات ایک ہی جست میں انسان چور سے قطب بن جاتا

تو اسے آنسو روح کی غلاظت دھو ڈالتے ہیں..... لیکن میں بداعمال کے متعلق نہیں سوچ رہا۔ میں..... میں اُس

پر فرحت کے بارے میں کبھی نہیں سوچتا جو اتنی آسانی سے اچانک اللہ کے فضل سے مٹ جاتی ہے۔

میں تو سوچتا رہتا ہوں جو لوگ نیک عمل کرتے رہتے ہیں جن کی ساری سوچ خدمتِ خلق میں گزرتی ہے جن

کی سرزد ہی نہیں ہوتی۔ ذرا تہہ جام تو وہاں بھی اکٹھا ہو جاتا ہوگا..... قبض سے تو وہ نیک لوگ بھی خالی نہ ہوں گے۔“

”لیں..... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جو نیک عمل ہی کر رہا ہے اُسے قبض کا کیا خدشہ؟“

وہ ہلکا سا مسکرائے۔ اپنی نئی سی دلنشین مسکراہٹ۔

”زندگی جامد نہیں جان من..... اگر نیک اعمال کرنے والا نیک آدمی ایک ہی سطح پر رہ گیا تو اُس کے درجات

کے طرہوں گے۔ وہ ارتقاء کی منزلیں کیسے طے کرے گا؟ وہ تو قبض کی حالت میں مرجائے گا۔“

یہ بات میرے لیے سمجھنا مشکل تھی کیونکہ میں اندر سے متفق نہ تھی۔

”نیک عمل کرنے والے کے اندر ہولے ہولے تکبر کی غلاظت جمع ہوتی ہے قدسیہ..... نماز روزے کا پابند

کا شیدائی..... اپنے آپ کو بچا بچا کر چلنے والا..... دوسروں کے ساتھ اپنا مقابلہ کر کے احساسِ برتری میں جانے

کے نفس ہولے ہولے غلاظت جمع کرنے لگتا ہے۔ اُس کی انا میں خود پرستی کے کیزے چلنے لگتے ہیں۔ اگر نیک بندے

سے رحمت نہ ہو تو پھر یہ نفس ہی ابلیس کا ساتھی بن جاتا ہے اور تکبر جو شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ ہے اور غالباً شرک

تعمیر سے ہی جنم لیتا ہے وہ اس کے خمیر میں داخل ہو جاتا ہے۔ جیسے سارا کھانا یا پینا لہو میں داخل ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی یہ

نفس خود ستائی، من مانی قلب کو سیاہ کرنے لگتا ہے..... احساسِ جرم اُس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا..... پھر یہ روحانی قبض کیسے

ہو سکتا ہے..... تم نے فرانس انا طولی کی تھامیں پڑھی ہے؟“

”جی جوانی میں کبھی پڑھی تھی۔“

”بس دُعا کرو مجھے اُس روحانی جلاب کی ضرورت نہ پڑے۔ میں کسی تھامیس کا محتاج نہ ہو جاؤں؟“

میں نے اُن کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”کیسی باتیں کرتے ہیں آپ۔ خدا کے لیے اپنے پر رحم کریں..... اپنے آپ کو دوسری تکلیف میں مبتلا نہ

کریں۔ یہ جسمانی کرب کافی جان لیوا ہے۔“

”تم بڑی خوش نصیب ہو قدسیہ! اللہ نے تمہیں سپاٹ راستوں کا مسافر بنایا ہے۔ تم بڑی سادگی اور سادگی سے زندگی بسر کر لیتی ہو..... میرے لیے..... میرے لیے دُعا کرو..... میں نیک ہوں اور نیک اعمال میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔“

”آپ وِرجو (virgo) ہیں ناں..... ہر وِرجو کی عادت ہوتی ہے تفصیل میں جانا..... باریک بینی سے چھوٹی تفصیل کو مانجھتے رہنا۔ پلیز تفصیل میں جانا چھوڑ دیں۔“

”بس تم دُعا کرو۔“

”کردی۔“

”ایسے نہیں حاجی امداد اللہ کی دعا پڑھ کر..... سب کچھ اوپر والے کا فضل ہے۔ بد اعمال تو روح میں جہنم جاتے ہیں۔ یہ الوکی پٹھی نیکی بھی فضل کے بغیر کچھ نہیں..... اپنا قد بڑھانے، شیخی مارنے، بچے کبھے لوگوں کو کھانے دکھانے اپنی مثالیں پیش کرنے کے لیے جو نیک اعمال کیے جاتے ہیں وہ بھی انسان کا بھٹا بھٹا دیتے ہیں۔“

”کردیتے ہیں۔“

”آپ نے ایسا کوئی کام نہیں کیا جس پر آپ شرمندہ ہوں۔“

”نیک بی بی نیک مرد میں علم، انکساری عاجزی نہیں رہتی۔ وہ خلق سے اپنے آپ کو بہتر سمجھنے لگتا ہے۔“

فرشتہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے پر ابلیں جیسے ہونے لگتے ہیں..... لیکن تم نہیں سمجھو گی..... تمہاری روح مائے رحمت ہے..... تم صرف دُعا کرو۔“

”جی کر دوں گی۔“

”ایسے نہیں حاجی امداد اللہ کی کان فیکو ن پڑھ کر..... پوری توجہ کے ساتھ۔“

”ضرور جی۔“

آج کے تمام قابل ذکر ادیب ساٹھ سے اوپر ہو چکے ہیں اور اس عمر میں پہنچ کر انسان اگر ماضی کی طرف

سوائے یادوں کے کچھ نہیں ملتا۔ اگر مستقبل کی طرف نگاہ اٹھائے تو فنا کے سوائے کچھ یقینی نہیں۔ ہمارے آج کے

ایک ایسے مقام پر ہیں جہاں جوانی کا احساس تو رہتا ہے لیکن ولولے، جوش، Motivation کچھ کر گزرتے

نہیں رہتی۔

آج کا ادب وہ لوگ تخلیق کر رہے ہیں جو زندگی سے disillusion ہو چکے۔ سچ پوچھئے تو فلکشن

دگیری کی فضا میں پلتا ہے۔ افسانے، ناول، خوف اور فکر سے لبریز ہیں۔ جب ادیب ماضی کی طرف لوٹتا ہے تو کس

ہے کہ سانپ ایک باریک بینی سے نکل جانے کے بعد اس میں داخل نہیں ہو سکتا۔

یادیں پچھتاوے کا روپ دھار لیتی ہیں۔ مستقبل کی طرف نگاہ اٹھانے پر فنا یقینی ہے۔ باقی

باید..... راضی برضا ہونا نہیں جاتا۔ رجائیت کو زندگی چاٹ جاتی ہے۔ اس بے یقینی میں ادیب ایسا فلکشن لکھنے پر مجب

میں خوف، مکر اور زیاں کا احساس خیر کی طرح رچا بسا ہے۔

لیکن اشفاق احمد نے ہمیشہ ایک اُمید کو اپنے ساتھ رکھا۔ وہ بھی ساٹھ سے اوپر ہو گئے۔ اُن کے قوائے مضحکہ خیز عیسوں ڈاکٹروں، پیروں کی دُعاؤں کا آسرا لیا۔ لیکن ضرورتِ بشری تک اُن کی رجائیت کی جان بچانے والی کشتی کی محبت تھی۔ وہ اس محبت کے ساتھ ہمیشہ Motivated رہے۔ اس تحریک نے انہیں کبھی شیطان کا دوست نہ بنایا جو ہمیشہ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے کا درس دیا کرتا ہے۔ اُنہوں نے کبھی ماضی کو Nostalgia کی نگاہ سے نہ دیکھا۔ کبھی موت کو فنا کا راستہ نہ سمجھا بلکہ یہ جانا آگے چلیں گے دم لے کر۔

پتہ نہیں اللہ کا نظام کیا ہے؟ ہم اپنے قلیل علم کی دُور بین لگا کر لاکھ اس کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہم پر حجابِ درمندی کی ایسی دُھند چھائی رہتی ہے کہ آر پار کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ دعائیں کہیں مانگی جاتی ہیں مقبول کہیں اور ہو جاتی ہیں عراق میں مانگی جاتی ہیں افغانستان کا آسمان دعاؤں سے اٹ جاتا ہے لیکن اندھا دُھند وہ امریکہ میں اور کوشش کے گھر پر برس جاتی ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ اللہ ساری مخلوق کو واحد سمجھتا ہے اور جو فرد واحد کے ساتھ بیت جاتی ہے ساری انسانیت کا مقدر ہے۔

دعائیں افتخار عارف مانگتا ہے کہ کسی ایسے شخص کا ساتھ ملے جو مزاج کے سب موسموں کا ساتھی ہو۔ میں تو اُس سے محبت بولوں لیکن وہ ہمیشہ سچ کا دامن تھامے رہے۔ ساری وحشتیں جو لکھنے والے کا مقدر ہوا کرتی ہیں اُن کو برداشت کرنے کا عادی ہو..... ایسی دعائیں افتخار سے گریاں مجھ تک پوری نمرتا کے ساتھ پوری ہو گئیں۔ خاں صاحب میرے لیے حاصل بنے رہے جس پر زندگی کا ہر وار سہہ جانے کی صلاحیت بھی تھی اور حوصلہ بھی۔

پتہ نہیں اشفاق احمد کو زندگی سے بہت پیار تھا یا نہیں۔ وہ تو سب تزیح کے سات رنگوں کی طرح تھے۔ میں جانے Periscope تھی کہ مجھ سے گزر کر تمام رنگ یک رنگ ہو جاتے۔ خاں صاحب کے ہوتے ہوئے میں نے کبھی کسی دستِ رشتہ دار مددگار کی ضرورت محسوس نہ کی بلکہ کبھی کبھی تو مجازی خدا کے ہوتے ہوئے اصلی خدا بھی یاد نہیں آیا اور شاید حرکت کے باعث مجھ سے یہ نعت چھین گئی۔

اشفاق احمد میں بغیر قریب ہوئے دوسرے کو قربت کا احساس دلانے کی بڑی خوبی تھی۔ وہ جس کسی کے ساتھ رہتے تھے اسی وہم میں مبتلا کر دیتے کہ بس مجھ سے ہی اُن کا رابطہ ہے باقی سب تو اضافی تھے۔ لیکن ہر عمل کا ایک رد عمل ہوتا ہے۔ اُن کی مخلوق نوازی زندہ پروری، نمکساری جو وہ اپنے ملنے والوں سے برتتے تھے اس کا رد عمل اُن کے بچوں تک پہنچتا تھا۔

ایک واقعہ یاد آیا۔ برکلے پروگرام کے تحت خاں صاحب امریکہ گئے۔ ابھی اشیر خاں بمشکل پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہے تھے اور پہلا لفظ جو اُس نے بولنا سیکھا وہ ”بتی“ تھا۔ جب بھی دروازے پر کوئی دستک دیتا یا اُسے کسی چیز کی تلاش ہوتی ”بتی“ کہتا بھاگتا آتا۔ خاں صاحب کو بچے چھوڑ کر برکلے جانے کا بزار نچ تھا لیکن اُنہوں نے کبھی اس بات کا اظہار نہیں کیا۔ اشفاق احمد نے اس بھاگتے ”بتی“ کہتے اشیر کو ریکارڈ کر کے اس کا ٹیپ محفوظ کر لیا۔

اشفاق احمد اندر کا موسم بتانے سے قاصر تھے۔ وہ بتی کی طرح چپ چپ گھلتے رہتے۔ غم کو لیمن ڈراپ کی طرح بھرتے رہتے۔ کڑوی کافی، کرلیے کی بھجیا، اُن سب کو اس کے Bitter Sweet ذائقہ کی وجہ سے وہ بہت پسند کرتے تھے۔

پھر ایک اور واقعہ ہو گیا۔

میرے بٹھلے بیٹے انیس خاں نے ایک کبوتر کا پر مجھے پکڑا کر کہا..... ”امی! یہ میری طرف سے ابو کو تحفہ ہے۔ خط میں ملنا تھا کہ خاں صاحب نے ٹگری ٹگری پھرنا بند کر دیا۔ رنگ برنگی کلاس جس میں جیکولین کینیڈی بھی شامل تھے۔ کلاس کو خاں صاحب نے ان گنت کہانیاں سنا کر اپنا عاشق کر رکھا تھا، ان سب کو چھوڑ چھاڑ وہ گھر لوٹ آئے۔ شاید ایسے لوٹنے کی لذت سے آشنا تھی۔

خاں صاحب بھی جہاں گئے کیسے ہی گم کیوں نہ ہوئے ہمیشہ لوٹ آئے۔ لیکن اظہار کی کمی نے ان کی کبھی باپ کی محبت سے آشنا نہ ہونے دیا۔ لوگوں نے ہمیشہ ان پر ایسا قبضہ جمایا کہ بچوں کو علم نہ ہونے کا کہہ دیا۔ شفقت میں کتنی حدت ہے۔ جو لوگ کم وقت کے لیے ملتے تھے، جن کو اپنا وزن خاں صاحب پر منتقل کرنا ہوتا تھا، ان کو اپنے Catharsis کے لیے استعمال کرنا ہوتا۔ وہ اتنا وقت ہی نہ چھوڑتے کہ بچے ان کے قریب آسکتے۔ بڑے آدمیوں کا المیہ ہے۔

خاں صاحب کی تپائی پر بیماری کے دنوں میں یہ ورق پڑے رہتے تھے۔ وہ کبھی کبھی پڑھے تھے۔ لیتے تھے۔

اشفاق احمد

از نور الحسن

اشفاق صاحب بڑی تخلیقی قوتوں کے مالک تھے۔ ان کی رنگا رنگ تخلیق کاری نے عجب گل کھلائے۔ چھوٹے سے تھے تو انہوں نے ایک رسالہ نکالا۔ اسے وہ خود ہی لکھتے، اس کی کاپیاں بناتے اور کلاس کے جماعت دوستوں میں بانٹ دیتے۔

پاکستان پہنچ کر جب انہوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو ایم اے اردو کے دوران ہی ان کی ”ایک محبت سوانسے“ آئی۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ روم چلے گئے۔ واپسی پر خاں صاحب نے جلدی لکھنا شروع کر دیا جو پورے 39 برس آن ایئر گیا لیکن ان کی تخلیقی قوتیں ”تلقین شاہ“ کی سرحدوں کو پار کر گئیں۔ پہلے خاں صاحب نے ریڈیو پر ڈرامے لکھے پھر جنوبی ٹیلی ویژن 1964ء میں ہماری زندگی کا حصہ

نے اس میڈیا کو اپنالیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے بڑی عمدہ کمپیوٹرنگ کی۔ ٹیلی ویژن کے افتتاحی پروگرام کی کمیٹی میں ان ہی کے سر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی موسیقی سے گہری دلچسپی نے ”نکھار“ جیسے پروگرام دیئے۔

”زاویہ“ سے تو آپ کی ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خاں صاحب کی مختلف طبقتوں میں اتنی ہی رنگا رنگ ہے جس قدر ان کی شخصیت..... جو پڑھے لکھے افسانے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ تھے کہ خاں صاحب صرف افسانے لکھیں..... اور وہ بھی ”اُجلے پھول“ اور ”ایک محبت سوانسے“ جیسے۔ افسانے“ سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔ جنہیں ”تلقین شاہ“ سے عشق تھا وہ انہیں کسی اور روپ میں دیکھنا نہ چاہتے تھے۔

”زاویہ“ دُور دُور پھیلا اور الیکٹرونک میڈیا ہونے کی وجہ سے اس کی پذیرائی بھی زیادہ ہوئی۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر چاہنے والا اپنی پسند کا تابع ہو کر مُصر تھا کہ صرف وہی ٹھیک ہے۔ لیکن آج تین سال گزر جانے کے بعد مجھ پر یہ خیال صاحب سے اُن کے چاہنے والوں کی وابستگی کم نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ قارئین ناظرین کی محبت ہے۔ محبت یہاں جذبہ ہے جو کسی عمل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اچھائی برائی کی بیشی اور نیچ نیچ محبت کے سامنے بے معنی ہے۔ محبت کو کسی لیے خدا کا سب سے بڑا روپ کہا جاتا ہے۔

محبت کرنے والا محبوب کی خرابیاں نہیں دیکھ پاتا بلکہ اُن کو اپنی خرابیوں کی طرح قبول کر لیتا ہے۔ ڈیروں پر اسی نظر نظر آتا ہے اور خاں صاحب غالباً اسی محبت کی تلاش میں بایوں کے پاس آنے جانے لگے تھے۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگ محبت نہیں کر سکتے۔ انہیں اپنی ذہانت پر زیادہ مان ہوتا ہے۔ وہ دوسروں میں کسی کی کرسی اور کاقد چھوٹا کر کے کسی دوسرے کی خوبیوں میں خرابی کا پہلو نکال کر اپنی کلا جگاتے ہیں۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ خاں صاحب فرشتہ تھے۔ اُن میں یقیناً انسان ہونے کے ناطے خوبی اور خرابی دونوں کے دریا ساتھ ساتھ بہتے

یقیناً اُن میں حسب مال اور حسب جاہ کی طلب ہوگی لیکن وہ کسی صوفی کی طرح جہانِ نفس میں بہتا رہتے تھے۔ میں نہیں۔ اُن کی زندگی میں ضروریات کو پختہ جھل کر دھکا نا ضروری نہیں۔ بھڑکی ہوئی آگ کو بجھانا اہم تھا۔

پچھلے سال 4 ستمبر 2007ء کو برسی کے موقع پر پی ٹی وی والوں نے انٹرویو لیے۔ فرحان مشتاق پروڈیوسر تھے۔ میں بھی تھے اور افسردہ صورت بھی۔ سارے ہی آپس بھرتے بہ چشم نم سٹوڈیو میں داخل ہوئے۔ فرحان مشتاق نے

کے شروع میں کہا.....

تین مرتبہ ایسے ہوا تھا

میرا دل اُن کو دیکھ کے زور سے دھڑکا تھا۔

پہلی مرتبہ اُس وقت تھا جب لاہور ایئر پورٹ پر بونگ 737 کسی وجہ سے بڑے اسپرن کے بجائے جمبو Boy کے رُکا تھا۔ پرانے ایئر پورٹ پر جہاں حاجی کیمپ کی سفید رنگ کی چھوٹی سی عمارت تھی اُس کے بالکل سامنے ایک لمبا سفر تھا۔ اسی ٹاور سے نکلنے والی زرد روشنی ہمیشہ مجھے ایک عجیب اُداسی بھرے رومانس سے بھر دیتی ہے۔ اسی ٹاور کے ذرا سے طرف بونگ 737 آ کے رُکا تھا۔ سیڑھی والی گاڑی جہاز سے لگ چکی تھی۔ میں جب تک جہاز کے تینوں پہیوں میں سے ایک لگا کر سیڑھی تک پہنچا مسافر اترنا شروع ہو چکے تھے۔ پھر اچانک وہ نظر آ گئے۔

میرا دل زور سے دھڑکا

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ

جہاز کے دروازے کو چھوڑتے ہوئے بالکل ہولے سے اُن دونوں نے سیڑھی پر قدم رکھا۔ میں جو نیچے زمین پر سے اتر رہی تھی وہاں سے ذرا پیچھے مہوت کھڑا تھا دو قدم اور پیچھے ہو گیا۔ اشفاق صاحب نے بانو قدسیہ کی کلائی اس طرح تھامی ہوئی

تھی بالکل پتہ نہیں چل رہا تھا کہ کس نے کس کو سہارا دیا ہوا ہے۔ بانو قدسیہ آپا نے سفید دوپٹہ اوڑھا ہوا تھا۔ دھیرے دھیرے نیچے اتر رہے تھے۔ زرد روشنی اور جہاز کے نیم تاریک بیک گراؤنڈ میں وہ دونوں اس وقار سے اترے تھے جس طرح کسی سلطنت کا درویش بادشاہ خاتونِ اول کے ساتھ اترتا ہے۔ میرادل چاہا کہ ادھر شہنشاہ سیرج اترے ادھر میں پروٹوکول آفیسر کی طرح کڑکتا ہوا سیلوٹ کروں۔ لیکن میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ اشفاق صاحب کے ساتھ میرے قریب سے گزر کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں سٹوڈیو میں تھا۔ سنٹرل پروڈکشن یونٹ لاہور کی ڈپٹی ایگزیکٹو ایجنٹ نے مجھے کہا میرے کمرے میں اشفاق صاحب بیٹھے ہیں۔ انہیں سٹوڈیو میں لے آؤ۔

یہ دوسری مرتبہ تھا کہ میرادل زور سے دھڑکا تھا۔

میں انتہائی خوشی خوشی قدرے اضطرابی حالت میں کمرے میں پہنچا۔ ایک بوڑھا شخص کرسی پر بیٹھا بیٹھا تھا۔ اُس کی نظریں جیسے کسی سوچ میں تھیں۔ میں نے کہا ”سر! ریکارڈنگ کے لیے چلیں؟“ میں نے اشفاق صاحب کے سنگ 45 یا 50 سینکڑ کی مسافت طے کی۔ کتنے سوال، کتنی کتابیں، کتنے الفاظ تھے جو میں پوچھ سکتا تھا۔ لیکن اُن کا مزاج بھی نہ پوچھ سکا۔

مجھے پروگرام منیجر طارق احمد صاحب نے بلایا اور ایک چھوٹی سی فہرست ہاتھ میں تھما دی کہ یہ انٹرویو کس کس کے ساتھ کروں۔ میرادل زور سے دھڑکا۔ یہ تیسری مرتبہ تھا۔ فہرست کے سب سے اوپر لکھا تھا۔ بانو آپا

میں نے جو کچھ اس انٹرویو کے دوران کہا، حاضر خدمت ہے۔

میں نے خاں صاحب کے ساتھ زندگی کا ایک لمبا وقفہ گزارا۔ اُن کو بہت قریب سے دیکھا۔ فاصلے سے کیا۔ بارہا یوں ہوا کہ مجھے اُن کے عمل، سوچ اور رویہ سے اتفاق رائے نہ تھا لیکن ایک بات میں گورنمنٹ کاٹی میں سمجھتا تھا۔ جب ہمیں اکٹھے ایم اے اُردو کرنے کا اتفاق ہوا۔ خاں صاحب کی نیت ہر مقام پر بے داغ رہتی۔ کسی شخص کو سمجھنے کے لیے تمام تر تجربے، مشاہدات، تخیل، احساس کے باوصف اُس کی سمجھ نہیں آ سکتی۔

کی سرج لائٹ بھی پڑتی ہو تو انسان کے کونے کھدے ایسے رہ جاتے ہیں جن میں کئی خوبیاں اور خرابیاں چھپ جاتی ہیں۔ انسان کا پتھر اور دھات کے زمانے سے اب تک یوں چلتے چلتے آنا غالباً اسی گپت چھپے رازوں کی بدولت ہے۔ ہر مقام پر قلیل رہتا ہے۔ غالباً اسی لیے اعمال کو تولنے جانچنے کے لیے نیت سے بڑا کوئی Catalyst نہیں۔ کبھی کبھی بد نیتی پر معمول ہوتی ہے اور کبھی کبھی رابن ہڈ جیسے لیرے بدی کے سرپر کا میانی کا سہرا لگا دیتے ہیں۔

اشفاق صاحب نے اُردو بورڈ میں سروس کی۔ یہاں کئی ماتحتوں کو ڈانٹا برا بھلا کہا ہوگا لیکن یقین ہے کہ وہ ڈسپلن کے تحت مارے باندھے کیا ہوگا۔ کبھی کسی کی اے سی آ خراب نہ کی ہوگی۔ اُن کے جانے کے بعد مجھے پتہ چلا

بھوکوں کی مالی اعانت وہ کرتے رہے لیکن کبھی مجھے بھی نہ بتایا۔

انہوں نے ریڈیو ٹیلی ویژن پر کئی پروگرام کیے۔ یقیناً یہاں بھی آویزش کے سلسلے ہوں گے خاص کر ”تلقین“ کی ریکارڈنگ کے دوران کاسٹ زیر عتاب آتی ہوگی لیکن بعد ازاں اُن ہی کاسٹ کے بندوں کے ساتھ بیٹھ کر پیسے پیسے خوش گپیاں جاری ہو جاتیں۔ اگر اُن کی نیت میں کھوٹ ہوتا تو اُن کے جانے کے بعد اُن کے ساتھ کام کرنے کے نہیں اس طرح یاد نہ کرتے جیسے اب کرتے ہیں۔

گھر پر اُن کا رویہ ملازموں کے ساتھ ایسا تھا کہ جو ایک بار آ گیا وہ اُن کی زندگی میں پھر اُنہیں چھوڑ کر نہیں گیا۔ کبھی بھی پڑ جاتی۔ سوال جواب کی نوبت کبھی نہ آتی۔ حجام، قصائی، دودھ والا، سبزی والا ملازمین جس طرح یہ لوگ اُنہیں دیکھتے اور روتے ہیں اس کی مثال کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

اور اس کی یہی وجہ ہے کہ اُن کی نیت آئینے کی طرح صاف تھی اسی لیے وہ تادیر کسی انسان سے ناراض نہیں رہے تھے۔ رشتے ٹوٹ جانے پر حیثیتیں بدل جانے پر اپنا اپنا راستہ اور اپنا اپنا منہ لے کر رخصت ہو جانے پر بھی اُن کی نیت کس ڈول نہ ہوتی۔ شاید اسی لیے وہ کبھی منافقت کے شکار نہ ہوئے۔ غلطی سرزد ہو جاتی۔ بڑی شرمساری سے اعتراف لیتے۔ اچھائی کر بیٹھتے تو سر جھکا کر بھینی سی مسکراہٹ کے ساتھ خوش ہو جاتے۔ اسی نیت کی بدولت نہ اُن کی تحریر میں کبھی کبھی غم آ یا نہ ہی زندگی میں۔

مجھے اُن کے برعکس دیہات سدھار کا اتاشوق ہے دوسروں کو ٹھیک کرنے کا ایسا لپکا ہے کہ اپنے آپ کو ٹھیک کرنے کے لیے ہمارے جہاں کو مشورے دیئے جاتی ہوں۔ مجھے خاں صاحب سے ایک گلہ ہے کہ جہاں انہوں نے مجھے لکھنے سے اپنی اتنی تعلیم دی وہاں مجھے بابوں کی یہ تربیت دیتے کہ جہادِ نفس کیسے کرتے ہیں؟ اور ہر گرم و سرد میں اپنی نیت کے لیے کوسیدھا کرنے کا کیا طریقہ ہے؟



ملفوظات مولانا محمد رفیع

لوگ لوگ

محمد یحییٰ خاں

محمد یحییٰ خاں کالے کپڑوں میں ملبوس گلے میں موٹے ٹمنکوں کی مالا نہیں سجائے، لمبی لمبی زلفوں اور خوشبو سے چھپائے ایک عجوبہ روزگار شخصیت ہیں۔ ان کے اندر اور باہر واضح طور پر دورا سے ہیں۔ پتہ نہیں یحییٰ خاں صاحب کی عمر ہے۔ اگر وہ درویش ہے تو دوسرا ادیب کون ہے جو اس وقت پاکستان کے جملہ ادیبوں میں اتنے منفرد مسائل کی سہولت پر ہے۔ اس کے ادب کا رجحان منہو کی طرح ایسے لوگوں کو رفعت بخشنا ہے جو سوسائٹی میں عزت کے قائل نہیں کی کہانیاں، مشاہدے سے زیادہ تخیل کی مرہون منت ہیں۔ یحییٰ خاں نے گلی گلی، دیس دیس ہر مسلک کے لوگوں سے دیکھا اور اپنے مشاہدے سے وہ ادب تخلیق کیا جو قاری کے لیے ہوشربا ہے۔

یحییٰ خاں کا بہت پہلے سے اشفاق صاحب سے ملنا ملنا تھا۔ وہ خاں صاحب کے ہیروں پر جہدے کرنے والے ہر شخص کے لیے برا لگتا کیونکہ میرا خیال ہے سجدہ فقط اللہ کے لیے ہے لیکن خاں صاحب کسی اور سمت کے آدمی تھے۔ وہ پتہ نہیں لگتا ہی بوجھ بڑے شوق سے اٹھاتے۔

وجدان و حقیقت، سنی سنائی اور دن بیتی یحییٰ خاں کی کہانیاں ہر سمت کی کہانیاں ہیں۔ مجھے سب سے پہلے ان کی کتاب ”پیارنگ کالا“ کی معرفت ہوا۔ یحییٰ خاں نے فرمائش کی کہ میں اس کتاب پر کوئی رواں تہرہ لکھوں۔ پڑھنے کے بعد میرے چھکے چھوٹ گئے۔ اے کلاس ادب پر کوئی بی کلاس لکھاری کیسے لکھے اور کیا لکھے۔

اشفاق صاحب کے جانے کے بعد بہت سے لوگ میری دلجوئی کے لیے آتے رہتے تھے۔ ان میں سے ایک اور ان کے بیٹے بھی ہوتے۔ بہت جلد مصیبتوں کے مارے لوگوں نے یہیں ڈرائنگ روم میں یحییٰ خاں کے گروہ ایک عقیدت بنا لیا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ لڑکیوں کو سر پر دوپٹہ لینے پر مجبور کرتے۔ نئے عہد کی عورت اس پابندی سے حاصل کر چکی تھی۔ وہ لباس کے معاملے میں خود مختار تھی، نہ چھوٹی آستین کی قمیض ہی اسے کاٹتی تھی۔ نہ کھلے بال نہ تھے۔

پسے کا لباس۔

دوسری بات جو میرے لیے ناقابل برداشت تھی وہ میں نے یحییٰ خاں کو بتادی۔ وہ مجھے سجدہ کرتے تھے، اسی لیے میں نے انہیں داستان سرائے آنے سے منع کر دیا۔ اب وہ کم کم آتے ہیں۔ پوٹلی کھول کر ملازمین کو ڈھیر سارے پیسے دیتے ہیں۔ مٹھائیوں کے ڈبے بانٹتے ہیں اور راضی برضا چلے جاتے ہیں۔

بابا محمد یحییٰ خاں ولد محمد عمر خاں، سیالکوٹ (موری دروازہ) میں پیدا ہوئے۔ اپنے آبائی شہر میں چوتھی صحت (ناکمل) تک تعلیم حاصل کی۔ دو شادیاں کیں۔ ایک ناکام اور دوسری کامیاب۔ دو بیٹوں اور چار بیٹیوں کے مالک ہیں۔ کئی کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مثلاً من مندر۔ من مسجد۔ شب دیدہ۔ موم کی مورت۔ گل شبو۔ آہ آہ۔ پیارنگ کالا۔

مرزا ادیب

مرزا ادیب بڑے آدمی تھے۔ انہوں نے کبھی یہ خیال نہ کیا کہ اشفاق احمد مجھ سے بہت جو نیر ادیب ہے، اس سے کیا ملتا پھروں۔ وہ ہمارے گھر آتے تو ان کے آنے جانے کا پتہ نہ چلتا۔ ایک دو مرتبہ مجھے بھی ان سے ملنے کا اتفاق ہوا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ مرزا ادیب مثنوی پریم چند کی کئیگری کے ادیب ہیں اور ان کو ماڈرن تنقید کی تول بخوبی پر تو لانا نہیں جاسکتا۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد بھی مرزا جی نے مجھ سے رابطہ رکھا لیکن احترام کے باعث میں اس میں بے کھلی پیدا نہ کر سکی۔ یہ بھی عجب طور ہے کہ احترام بھی ایک بہت بڑا حجاب بن جاتا ہے اور رابطہ مضبوط نہیں ہونے پاتا اور حرام نہ ہو تو بھی رابطہ کھل کھا کر، درو پدی کی ساڑھی بن جاتا ہے جسے لپیٹنا ہر بندے کے بس کا نہیں۔ بس یہاں وہاں ہر گد تو وزن کی ضرورت رہتی ہے جو رشتے ناٹوں میں وقت کے ساتھ ساتھ مضبوطی پیدا کرتا چلا جائے۔ مجھے مرزا ادیب کی تہنوشت تحریر بہ عنوان ”مثنوی کا دیا“ بہت پسند ہے کیونکہ اس میں انہوں نے خود انتہائی دلچسپ اور خوبصورت انداز میں اپنے حالات زندگی بیان کر دیئے ہیں۔

صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

صوفی تبسم 14 اگست 1899ء کو امرتسر (بھارت) میں پیدا ہوئے جہاں ان کے بزرگ کشمیر سے آ کر آباد ہوئے تھے۔ والد کا نام صوفی غلام رسول اور والدہ ماجدہ کا نام فاطمہ تھا۔ صوفی تبسم کا نام غلام مصطفیٰ رکھا گیا۔ صوفی تبسم نے جو عرصہ گورنمنٹ کالج لاہور میں گزارا وہ 23 برسوں پر محیط ہے۔ 1931ء سے 1954ء تک وہ اس کالج میں تدریسی فرائض انجام دیتے رہے اور بے انتہا خدمات انجام دیں۔ ایک ڈرائیونگ سوسائٹی بنائی جس کے تحت شیکسپیر کے کئی ڈرامے ترجمہ کر کے

سٹیج بھی کروائے۔ ڈرامیک کلب کے تحت سٹیج کرائے گئے ڈراموں میں ”ساوان رین داسفہ“ اور ”خطرناک لوگ“ کے طور پر قابل ذکر ہیں۔

شیکسپیر کے ڈرامے Mid-Summer Night Dream کا پنجابی ترجمہ ”ساوان رین داسفہ“ کے نام سے کیا۔ Such men are dangerous کا اردو ترجمہ ”خطرناک لوگ“ کے نام سے کر کے صفدر میر اور رفیع صاحب نے ڈائریکشن، دلوائی۔ یہ ڈرامے اس قدر مقبول ہوئے کہ ہر سال سٹیج کیے جاتے۔ ایک خصوصیت ان ڈراموں کی یہ بھی تھی کہ صوفی صاحب نے بطور ایکٹریٹ بھی اپنے فن کے جوہر دکھائے۔

”دلی کی آخری شمع“ کے عنوان سے مشہور تمثیل میں برصغیر کے نامور شعراء کے نام اور کلام کو نئی نسل سے روشناس کرایا گیا۔ یہ وہ بڑا اور کامیاب کارنامہ تھا جس کی یادگار تصاویر آج بھی گورنمنٹ کالج کے ہال میں زندہ رہ رہی ہیں۔ بلاشبہ گورنمنٹ کالج کا یہ علمی و ادبی عروج کا زمانہ تھا۔ یہ دور ڈی جی سوئدھی کا تھا جو پطرس بخاری سے پہلے گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل رہے۔ صوفی تبسم نے تعلیم بالغاں کے لیے ایک جریدہ ”دوست“ کے نام سے نکالا جو انہی کی قیادت میں خاصا کامیاب رہا۔

گورنمنٹ کالج میں ادیب فاضل کی شام کی کھالیں بھی صوفی صاحب نے ہی شروع کرائیں۔ صوفی صاحب ریڈیو پاکستان کے مشیر مقرر ہوئے تو انہوں نے ریڈیو کے لیے دن رات تیزی اور مستعدی سے کام کیا۔ وہ ”علامہ اقبال ایک شعر“ پروگرام میں علامہ اقبال کے فارسی کے کلام کا ترجمہ پیش کرتے۔ یہ پروگرام بے حد مقبول تھا اور لوگ خاص خاص صوفی صاحب کے پروگرام صبح آٹھ بجے ریڈیو پر سنا کرتے تھے۔

انہوں نے ریڈیو فیچر اور سکرپٹ بھی لکھے۔ اس کے علاوہ وہ ناک لکھا کرتے تھے۔ ان کی فن میں مہارت کے سے ظاہر ہے کہ وہ چند لمحوں میں بڑے بڑے مشکل موضوعات کو کاغذ پر اتارتے اور اگلے چند لمحوں میں وہ الفاظ بولتے گروش کر رہے ہوتے۔ انہوں نے ریڈیو کے لیے، بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ انہوں نے ریڈیو پر رہ کر بہت سی ایسی نظمیں تحریر کیں جن کو اس وقت کے مشہور گلوکاروں نے گایا، جن میں ریڈیو کے بچوں کے پروگرام ”کمپیئر“ ”شیم آپا“ سرفہرست ہیں۔ صوفی تبسم کی نظمیں ”عذرا کی گڑیا سوئی ہوئی ہے“ ”گھنٹی بجاؤ، اس کو جگاؤ“ ”آج بھی ریڈیو پاکستان کی لائبریری کا ایک لازوال سرمایہ ہے۔ ان کی نظموں کو نذیر بیگم، خورشید بیگم اور بہت سے فنکاروں نے گایا۔ بچوں کا پروگرام جو ہر اتوار کو نشر ہوتا، بچے صوفی صاحب کی نظموں کا انتظار کرتے۔ ”یہ گاؤں ہمارا یہ گاؤں ہمارا“ ”خوشیوں نے بہت خوبصورت گایا، جو آج بھی بچے شوق سے سنتے ہیں۔

”پانچ چوہے گھر سے نکلے کرنے چلے شکار، ایک چوہا باہر رہ گیا بیچھے باقی رہ گئے چار“ یہ نظم بھی بچوں کے پروگرام کے لیے ہی ریکارڈ ہوئی اور ریڈیو پاکستان کی لائبریری میں موجود ہے۔

صوفی تبسم صاحب کی غزلیں

1- وہ مجھ سے ہوئے ہم کلام اللہ اللہ

2- یہ کیا کہ اک جہاں کو کرو وقف اضطراب

3- کیا ہوا جو ستارے چمکتے نہیں

4- داغ دل کے فروزاں کرو دوستو

نذیر بیگم نے بھی صوفی تبسم کے بہت سے پنجابی گیت گائے اور بے حد مقبول ہوئے۔ غلام علی کی وجہ شہرت بھی صاحب کی غزل ہے جو انہوں نے غالب کے فارسی کلام کا ترجمہ کیا تھا۔ آج بھی مقبول ہے۔

”میرے شوق دائیں اعتبار تینوں، آ جا ویکھ میرا انتظار آ جا“

نسیم بیگم نے صوفی تبسم کی غزل بھی گائی۔

سو بار چمن مہکا، سو بار بہار آئی
دنیا کی وہی رونق دل کی وہی تنہائی

پاک بھارت 1965ء کی جنگ کے موقع پر صوفی تبسم کے جو نئے ریڈیو سے نشر ہوئے، وہ پورنی قوم کے دل کی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ جنگی ترانے ریڈیو پاکستان کی تاریخ میں نہ صرف نمایاں حیثیت رکھتے ہیں بلکہ وہ ہماری یہ شہری کا حصہ بھی بن چکے ہیں۔

اے پتر ہشاں تے نہیں وکدے
تو بسدی پھریں ہزارے

چچا غلام علی

روم جانے سے پہلے اشفاق صاحب دیال سنگھ کالج میں پڑھاتے تھے۔ سید عابد علی عابد کالج کے پرنسپل تھے۔ سب سے کم اور محبت سے راہ لگانے پر زیادہ اصرار کرتے تھے۔ بڑی بے تکلفی سے سٹاف روم میں آ کر بیٹھ جاتے۔ سب سے مسائل تک زیر بحث آتے۔ طالب علموں کے کردار، ان کی محنت اور جانفشانی کو سمجھنے اور بہتر بنانے کے لیے راستے تلاش کیے جاتے۔

سٹاف روم میں اشفاق صاحب اور ڈاکٹر غلام علی (جو ابھی ڈاکٹر نہیں تھے) کی موجودگی اس میلے کی روح رواں تھی۔ اشفاق صاحب اپنی گفتگو، مزاح آفرینی، مل جل کر کھانے پینے کی روایت سے محبت کا ادا جلائے رکھتے۔ پروفیسر صاحب اپنی خاموشی اور ذات کے حوالے سے پوری انجمن تھے۔ اس پر طرفہ تماشا یہ کہ اردو کے ادیب پروفیسر صاحب دیال کالج میں انگریزی پڑھاتے تھے۔ ایسا نستعلیق انگریزی لہجہ کم کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔

دراز قد پروفیسر غلام علی اپنے طالب علموں کو کالج کے بعد دیر تک پڑھاتے رہتے۔ کبھی کبھی وہ باغ جناح میں جاتے جہاں لے کر چلے جاتے اور وہیں طالب علموں کو انگریزی لٹریچر سے متعارف کراتے۔ باغ جناح کی چاٹ خاں صاحب کو پروفیسر غلام علی سے ہی لگی تھی۔

خاں صاحب روم سے واپسی پر جب اردو بورڈ میں ملازم تھے تو بھائی غلام علی ان کے پاس بڑی باتقاعدگی سے

آیا کرتے تھے۔ ہم داستان سرائے میں منتقل ہو چکے تھے۔ عفت اپنی بیماری کے دوران ہمارے پاس قیام پذیر تھی۔ غلام علی ان کی طبیعت پوچھنے آتے لیکن انہوں نے کبھی اندر آ کر عفت سے طبیعت نہ پوچھی بلکہ باہر سے ہی بیمار ہونے کی اطلاع چلے جاتے۔

ان کی شائستگی کا یہ عالم تھا کہ وہ بابا فضل شاہ کے ڈیرے پر جاتے لیکن کبھی گفتگو یا سوال جواب میں شائستگی ہوتے۔ وہ اپنے تذبذب اپنے مسائل اپنے تک محدود رکھتے۔ بس کچھ ہاتھ باندھے سر جھکائے جیسے دعا کے حاصل کر کھڑے رہتے۔ جب عفت بہت بیمار ہو کر میوہ ہسپتال پہنچی، Dialysis کے باوجود اس کی صحت مندوش تھی۔ ان کا بھی بھائی غلام علی آتے اور نیچے نرسوں اور لواحقین سے طبیعت پوچھ کر روانہ ہو جاتے۔

عفت ان کی بیمار پرسی کے انداز سے بہت متاثر تھی۔ ہمیشہ مجھ سے کہتی ’قدسیہ! کس قدر Decent ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اس کے لیے کچھ کروں لیکن میں ایک انگریزی کے پروفیسر کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔‘ پتہ نہیں یہ عفت کی خیر سگالی تھی کہ اس کی دعائیں بھائی غلام علی مکہ میں پروفیسر ہو کر چلے گئے۔ ان کی اپنی اپنی دونوں بیٹیوں کے ہمراہ گئیں۔

جب خاں صاحب پہلی بار عمرہ کرنے گئے تو بھائی غلام علی نے نکت بھیجا اور انہیں اپنے پاس ٹھہرایا۔ جب یونیورسٹی چلے جاتے تو خاں صاحب سیزی اور مٹی کے ساتھ پیچھے جاتے۔ ان دونوں لڑکیوں کے ساتھ ان کا پاپا ہو گیا۔ خاں صاحب نے کئی عمرے کیے۔

ایک بار جب شہاب صاحب ساتھ تھے۔ صرف اس بار ہم ان کے پاس نہیں ٹھہرے۔ شہاب صاحب نے کہا کہ حاضری کے دوران کم سے کم انسانی رشتوں میں Involve ہونا چاہیے۔ عموماً نکت بھی وہی ادا کرتے تھے۔ آخری بار کے جب میں اور خاں صاحب مکہ پہنچے تو غلام علی بھائی Edinburgh میں پی ایچ ڈی کر رہے تھے۔

جب پہلی مرتبہ میں اور خاں صاحب عمرہ کرنے گئے تو مجھے سیزی کی محبت کا پتہ چلا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ طرح رہتی۔ دور سے اشارے کر کے اپنے ہونے کا ثبوت دیتی۔ ذکیہ کا معمول تھا کہ وہ ہمارے کھانے پکائے کے پتے جاتی۔ مٹی کبھی ساتھ چلتی کبھی پیچھے رہ جاتی لیکن سیزی نے کبھی ناندہ نہ کیا۔

مجھے اچھی طرح وہ منظر یاد ہے جب ہم خانہ کعبہ میں موجود تھے۔ یکدم کالی گھٹا کہیں سے اٹھی۔ ہر طرف سے ہوا ہو گیا۔ لہوؤں میں موسلا دھار بارش برسے گی۔ خاں صاحب اٹھے اور نیچے حطیم کی طرف چل دیے۔ یہاں خانہ کعبہ کے پانی کے نکاس کے لیے ایک بڑا پرنا لہ ہے۔ بارش کا پانی زور و شور سے بہ رہا تھا۔ مجھے اور سیزی کو چھوڑ کر خاں صاحب نیچے کی طرف اترتے جا رہے تھے۔ پھر وہ پرنا لے کی سیدھ میں کھڑے ہو کر اللہ کی رحمت میں خوب نہائے۔ مجھے بھی اس کے گناہ ان سے جھڑ رہے ہوں۔ ایسے ہی جب ہندو لوگ گنگا اشنان کے لیے جاتے ہیں، تو انہیں احساس ہونا سکتا ہے جو ن ملی ہے اور وہ نوزائیدہ بچے کی طرح پوتر ہو گئے ہیں۔

خاں صاحب لوٹے تو ان کے چہرے پر بڑی معصومیت تھی۔ براؤن آنکھوں میں ایک چمک اور حیرت شانت سی مسکراہٹ تھی۔

”احرام نچوڑ لیں چچا۔“ سیزی نے کہا۔

”نہیں بیٹا..... ایسا پانی کب ملتا ہے، خود ہی سوکھ جائے گا۔“

”پھر گھر چلیں۔“

اب اس کا اصرار بڑھ گیا تو خاں صاحب نے ہتھیار ڈال دیئے۔

جس بار ہمارے ساتھ شہاب بھائی عمرہ کرنے لگے۔ شہاب صاحب کہنے لگے۔ ”اشفاق! تم اور قدسیہ میرے

ساتھ سونے میں رہو۔ بھائی غلام علی کو اس بار زحمت نہ دو۔“

”لیکن شہاب بہت خرچ ہوگا۔“

”نہیں بھائی میں ڈبل بیڈ والا کمرہ لوں گا۔ میں اور تم ڈبل بیڈ پر سوئیں گے اور قدسیہ کے لیے ایک ایک سٹرابیڈ لگوا

دیں گے۔“

اس عمرہ کے دوران مجھے پتہ چلا کہ شہاب بھائی سونے کا تو بہانہ کرتے تھے۔ پتہ نہیں رات کے کس پہر وہ چپکے

نکلے اور خانہ کعبہ کے لیے روانہ ہو جاتے۔ ہم سے تو فجر کی نماز بھی پکڑی نہ جاتی تھی لیکن جب وہ غالباً اشراق پڑھ کر

واپس آتے تو کبھی غلطی سے بھی ہماری اس غفلت کی طرف اشارہ نہ کیا۔ کسی شریعتی معلم کی طرح ہمیں احساس نہ دلا یا کہ ہم

بے شوق سعادت کھورہے ہیں۔

غالباً شہاب صاحب کا مسلک یہ تھا کہ خود اللہ انسان کو فیصلہ کرنے کی اجازت دیتا ہے تو پھر انسان کو اس فیصلے

کا طعن ہونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اپنی مثال سے اگر بات کسی تک پہنچ سکتی ہے تو خیر ورنہ اجتناب ہی بہتر ہے۔

جس بار ہم اپنی ٹکٹ خود خرید کر عمرہ کرنے گئے۔ غالباً یہ ہمارا آخری سفر تھا۔ جدہ ایئر پورٹ پر ہمیں جنگلی (نعیم

بن) اشفاق صاحب کے کزن ہمیں لینے آیا ہوا تھا۔ وہی ہمیں مکہ میں ایک ایسے ہوٹل میں چھوڑ گیا جو خانہ کعبہ سے بہت

نہیں تھا۔

اس بار بھائی غلام علی مکہ میں موجود نہ تھے۔ وہ اپنی پی ایچ۔ ڈی مکمل کرنے کے لیے لندن جا چکے تھے۔ نہ سیزی

بھی تھی نہ منی کی خاموش شمولیت۔ نہ واپسی پر ذکیہ غلام علی ہی کے کچے کھانے اور اس کی خدمتوں سے حظ اٹھانے کا

سہارا۔ ہوٹل کی دوسری منزل میں ایک کمرہ، غسل خانہ اور چھوٹی سی بیٹھک نما جگہ تھی جو نیچے جانے کا راستہ بھی تھا۔

ہم جب حاضری دے کر واپس لوٹتے تو راستے میں چھوٹا سا بازار ملتا جس میں ایک پاکستانی بی کلاس ہوٹل تھا۔

یہی رات جب ہم عشا کی نماز پڑھ کر خانہ کعبہ سے لوٹے تو اس ہوٹل پر رُکے۔ خاں صاحب نے کچھ سالن مانگا۔

”اور روٹی.....“ خواجہ فروش نے سوال کیا۔

”ایک روٹی.....“ خاں صاحب بے دھیانی سے بولے۔

دکاندار نے میری طرف اشارہ کر کے سوال کیا۔ ”اور اس کے لیے؟“

”ہاں دو روٹیاں۔“

غالباً اس وقت خاں صاحب مکمل طور پر غائب تھے۔ انہیں میرا خیال تک نہ تھا۔

”لو..... اور اس کو بھولنا نہیں۔“

ہم دونوں کھانا لے کر ہوٹل میں پہنچے۔

اسی قیام کے دوران ایک چھوٹا سا واقعہ اور بھی ہوا۔

رات کے وقت تک خاں صاحب صفا اور مردہ کے مقام پر ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی پر بھاگ کر دے دے رہے ہوتے اور میں اس کھلے درپے میں شانتی سے بیٹھی خانہ کعبہ کے کالے غلاف کو تنگ رہی کیونکہ میرے کسی سہیلی بی بی ہاجرہ کرپچکی تھیں اور تمام عورتوں کو اس بھاگنے سے چھٹی دلا چکی تھیں۔ مرد ہانپتے کانپتے کچھ بوڑھے عورتیں Wheel Chair پر بھاگ بھاگ آ جا رہے تھے۔ کچھ انا کے مارے مردوں کے چہروں پر ناخوشگوار احساسات واضح عیاں تھے۔

پھر میں نے دیکھا ایک گورا چٹا نوجوان (جو غالباً لبنان یا جنوبی ترکی کا تھا) نیچے والی قطار سے اٹھا۔ اس نے ایک کاغذی گلاس اٹھایا اور اس میں زمزم کا پانی انڈیلا۔ زمزم کا یہ پانی اور ایسے گلاس جا بجا خانہ کعبہ میں پڑے تھے۔ ایک وقت تھا کہ یہاں ایک ہی گلاس ہوا کرتا تھا۔ گویا حکم تھا کہ امت محمدی میں کوئی اونچ نیچ، چھوت چھات، تفرقہ گنجائش نہیں۔ سب مثل یک قالب اور ہزار جان ہیں۔

جب سے مغرب نے مسلمان ممالک میں اپنی ہانچیں کا تصور رائج کر دیا، ہم اسلامی صفات اور طہارت سے بھولتے جا رہے ہیں اور اسی لیے ہم بھول چکے ہیں کہ اصل صفائی اور طہارت اندرون کی ہوتی ہے۔ بیرون صرف آئینہ ہے جس سے مراد ایک نظام کی تخلیق ہے جس سے موتیوں کو ایک دھاگے میں پروانے کا کام لیا جاتا ہے۔

میں آپ کو بتا رہی تھی کہ ایک نوجوان بظاہر پاکستانی نہیں لگتا تھا۔ میری طرف بڑھا۔ اس نے اپنا ہاتھ میری طرف اٹھایا اور مجھے پیپر گلاس میں زمزم کا پانی بڑی محبت اور احترام سے پیش کیا۔ پانی کا گلاس دے کر وہ نہ چلا گیا۔ غائب ہو گیا۔ میری نگاہوں نے اسے تلاش کیا لیکن وہ کہیں نہ ہوتا تو نظر آتا۔

مجھے آج تک اللہ کی اس رحمت کی سمجھ نہیں آئی۔ کبھی لگتا ہے اس گلاس کی وجہ سے میرے سارے دل کی آغوش سہل ہوئے۔ کبھی گمان گزرتا ہے کہ یہ گلاس اس بات کا مظہر تھا کہ میرا عمرہ قبول ہو گیا۔ کبھی خوش فہمی ہوتی کہ میرے معاف کر کے مجھے نوزائیدہ بچے کی طرح رحمت کا ہتھمہ دیا گیا۔

جب خاں صاحب لوٹے تو میرے ہاتھ میں گلاس دیکھ کر بولے ”تدسیہ! یہ گلاس کہاں سے آیا۔ زمزم سے“

کافی نیچے پڑے ہیں۔“

میں نے واقعہ بیان کیا۔

”دیکھو اس گلاس کا دھیان رکھنا۔ ایسے واقعات عام طور پر نہیں ہوتے اور یہاں جو بھی پیش آتا ہے اس کے لیے شکرگزاری شرط ہے۔ تم اس کے معنی سمجھو نہ سمجھو احترام ضروری ہے۔“

اب میرے لیے یہ واقعہ اور بھی اہمیت اختیار کر گیا۔ واپسی پر ایک مدت میرے پاس یہ یادگاری گلاس

ذکیہ غلام علی لاہور کالج فارویمین میں انگریزی پڑھاتی تھیں۔ بھائی غلام علی ایڈنبرا میں پی ایچ۔ ڈی مکمل کر رہے تھے۔ دونوں چھاؤنی والے پل سے ذرا سا اترائی میں اردو بورڈ کا خوبصورت دفتر تعمیر ہوا تھا۔ اسی سڑک پر کچھ آگے ذکیہ نے خرید لی، لیکن اسے گھر بنانے کا شعور نہ تھا۔ خاں صاحب نے اس کے گھر کا نقشہ اپنی نگرانی میں بنوایا۔ اسی ٹھیکیدار نے داستان سرائے اور اردو بورڈ کی عمارتیں بنائی تھیں۔ ذکیہ کا گھر بھی تعمیر کرایا۔ اس گھر کا نام بھی ”ادب سرائے“ رکھا گیا۔ اس کی تعمیر بھی خاں صاحب کی زیر نگرانی ہوئی۔

شاید یہ ان مہمان نواز یوں کا رد عمل تھا جو بھائی غلام علی نے ہر عمر کے دوران انہیں دکھائی تھیں یا شاید وہ دوستی کے جزو سمجھتے تھے کہ دوست کے کام آنا ہی سب سے بڑی دوستی ہے۔ بہر کیف اس گھر کی تعمیر کے دوران دونوں نے خاں صاحب کے بہت قریب آگئیں۔

مٹی نے ادبی دنیا میں بہت نام کمایا۔ کچھ عرصہ اردو بورڈ میں ڈوگری بھی کی اور اب اپنی بیٹی کے ہمراہ وہ ”ادب سرائے“ میں ہی رہتی ہے۔

زہیرہ سخن علی کے نام سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ اس کی کہانیوں نے باپ کی روایت کو زندہ رکھا ہے۔ سبزی کے ساتھ ایک ایڈورٹائزنگ کمپنی چلاتی ہے اور وہ بھی ادب سرائے کا ایک لازمی حصہ ہے۔

دونوں دوست ہم سے رخصت ہو چکے ہیں۔ ان دونوں کی سائنسی خوبی یہ تھی کہ دونوں ”رول ماڈل“ تھے۔ ایک بات وضاحت طلب ہے۔ ہمارے پاس ”رول ماڈل“ کے تین تصور موجود ہیں۔ ایک تصور مغرب کی سفید فام سماج سے درآ مد کیا گیا ہے۔ ایک رول ماڈل مشرق میں چین سے مستعار لیا گیا ہے اور تیسرا تصور رول ماڈل نئی دنیا کی سماجی کردہ ہے۔

مغرب کے لوگ صرف کام کو اہمیت دیتے ہیں اور کام کرنے والے کی عزت نفس کا معیار اس کی کام کرنے کی اہمیت کے تناسب سے ہے۔ اس کے بعد سارا معاشرہ بری الذمہ ٹھہرتا ہے۔ چین کا رول ماڈل باقاعدہ معاشرہ کا سند ہے۔ انہیں کام یافتہ فرد ہوتا ہے جیسے ماؤزے تنگ کے معیار پر پرکھ کر ساری قوم سر پر چڑھ جاتی ہے لیکن اس Workaholic معاشرہ، اخلاق یا ذاتی خوبیوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ وہ ذاتی زندگی میں جھوٹا، فریبی، دغا باز، کیسی ہی کبھی کا مظہر کیوں نہ ہو سماجی میں احترام کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

نئی نے جس رول ماڈل کا تصور دیا ہے، وہ نرالا ہے۔ یہاں کردار، اخلاق اور ذہن داری رول ماڈل بننے کے لیے بنی ہوئی ہیں۔ اچھا انسان کامیاب اور کام کرنے والے انسان سے زیادہ تعریف کا مستحق ہے۔ معاشرے کو ان کی مثال دینے رکھنی چاہیے اور آنے والی نسلوں پر اس کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کرنا چاہیے۔

جہاں تک میرا علم ہے خاں صاحب اور ان کے دوست بھائی غلام علی واقعی رول ماڈل تھے۔ ان کی اچھائی کے لیے ان کی محنت چھپی تھی اور محنت بھی وہ اس لیے کر۔ تھے کہ یہی وصف عبودیت ہے اور یہی حکم ہے کہ رزق حلال سے کماد۔

قرۃ العین حیدر

یہ ان دنوں کی بات ہے جب عینی کراچی میں انفرمیشن کی ایک بڑی افریقہ تھی۔ پھر یکدم پتہ چلا کہ کسی ہم سفر نے ”آگ کا دریا“ پڑھ کر یہ رپورٹ حکومت کو دی کہ عینی تو پاکستان دشمن ہے۔ اس کی ساری وفاداریاں ہندوؤں کے ہیں اور ایسا افریقہ پاکستان کے دو قومی نظریے کو گزند پہنچا سکتا ہے۔ لیجئے صاحب قرۃ العین حیدر دلبرداشتہ ہو کر ہندوستان سدھاریں۔ اکھنڈ بھارت کے پجاریوں کو ٹرپ کا پتہ ہاتھ آ گیا۔ دہلی میں ایک چھوٹا سا گھر لے لیا۔ اللہ اللہ خیر سہا۔ یہ وہی دن تھے جب فہمیدہ ریاض بھی پاکستان بدر کر دی گئی تھی۔ اچھی بھلی وطن دوست کا ناس کر دیا۔ ایک گزر گیا۔ پھر خاں صاحب سے ملنے اچانک یہ دونوں آپہنچیں اور اتفاق ملاحظہ ہو دونوں ایک ہی دن ایک ہی وقت سے روز قیامت ہو اور حساب کا وقت آ گیا ہو، ہمارے ہاں آئیں۔ خاں صاحب تو سوائے اپنے کسی کا حساب لینے والے نہیں۔ دونوں سے بڑی محبت سے ملے۔

وہ شام بڑی سلوٹی مشلوٹی تھی۔ خاں صاحب کے ایک طرف عینی اور دوسری جانب فہمیدہ بیٹھی ہوئی تھی۔ سے پہلے میں نے قرۃ العین حیدر کو قریب سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بھی کچھ محبوب نظروں سے مجھے تک رہی تھی۔

”اشفاق یہ تمہاری بیوی بھی لکھتی ہے۔“

”آپ کو پتہ نہیں۔ انہوں نے ”راجہ گدھ“ لکھی ہے۔“ فہمیدہ بولی۔

”ارے بھئی میری نظر سے تو نہیں گزری۔“

”کتاب لاکر دو قریب۔“ خاں صاحب نے نرمی سے آرڈر کیا۔

میں بھاگ کر ”راجہ گدھ“ لے آئی اور عاجزی سے عینی کو پیش کی جس طرح مجھے لکھنے والے اپنی کتاب بڑے لکھنے والوں کی خدمت میں حاضر کیا کرتے ہیں۔

عینی نے کتاب دکھ لی۔ کافی دیر کے بعد ایک روز مجھے خاں صاحب نے بتایا۔

”بھئی تم بہت Lucky ہو۔ عینی نے تمہاری کتاب پڑھ بھی لی ہے اور اسے پسند بھی کیا ہے۔ یہ جرت ہے۔“ آگ کا دریا“ لکھنے والی کو کیا مصیبت پڑی ہے کہ وہ ”راجہ گدھ“ پڑھے۔“

نیلے رنگ کی پھولدار ساڑھی، چہرے پر خوبصورت چشمہ، پیروں پر کیوکس کے پرانے نشان، سر سے بغیر ہیل کے جوتی عینی کا وجود آج بھی بڑی صفائی سے میرے سامنے جھلملاتا ہے۔ عینی اور خاں صاحب فون پر کھڑے رکھتے تھے اور ایک دوسرے کو خط بھی لکھتے تھے لیکن میں اس بے تکلفی کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

مفتی جی

مفتی جی کے متعلق میں وثوق سے نہیں کہہ سکتی کہ ان کے جانے سے کس کا نقصان ہوا.....

میرا؟..... کہ میرے بچوں کا؟ ہم سب الگ الگ عجب غلط فہمی میں مبتلا تھے۔ ہم انہیں مہمانوں، رشتہ داروں، گھر سے نکلنے کے ساتھ شہر ضرور کرتے تھے لیکن دعویٰ ملکیت اپنی اندر کی جیب میں صرف اپنے لیے محفوظ رکھتے تھے۔ ہم نے کسی مفتی کو بھی اس کا دعویٰ نہیں سمجھا۔

1947ء میں جب مفتی جی بنالہ شہر سے ہجرت کر کے لاہور آئے تو انہوں نے سب سے پہلے والٹن کے رفیو جی میں ملازمت کی۔ اس وقت لوگ اپنے خاندانوں سے بچھڑ کر اس کیمپ میں جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ اس وقت نئے ہوئے لوگوں کی کھوج، ان کے ٹھکانے اور دکھ سکھ میں شریک ہونے اور کرنے کے لیے انہوں کی تلاش تھی۔ مفتی جی یہاں پر افسر رابطہ لگ گئے۔ ان کے ہاتھ میں مائیکروفون رہتا۔ وہ پکار پکار کر لوگوں کے نام پتے مانگتے رہتے۔ ان کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ خاں صاحب بھی کلرک بھرتی ہو کر والٹن کیمپ جا پہنچے۔ نئے ملک کے چروں کے ساتھ یہ ایک نیا سفر تھا۔

پرانی یادیں اندر والی جیب میں دل کے ساتھ محفوظ کر کے پٹی کس کے مفتی جی اور خاں صاحب کام کر رہے تھے۔ مفتی جی مجھے تو گوردا سپور سے جانتے تھے، جہاں میری خالہ گورنمنٹ ہائی سکول میں ہیڈ مسٹریس تھیں اور مفتی جی اپنی سہیلیوں کو داخل کروانے کے لیے لائے تھے۔ میری ان کی واقفیت سرسری تھی کیونکہ قیام پاکستان کے بعد نارمل تعلیم چھل ہو گئیں اور پرانے رابطوں کو مضبوط کرنے کے لیے وقت نہ ملا۔ لیکن اشفاق صاحب سے تو پہلی بار مفتی جی کے کیمپ میں ہی ملے۔

مفتی جی چہرہ شناس تو تھے ہی، جوہری کی سی نظر سے پتھر اور جوہر میں حد فاصل قائم کر لیتے۔ کچھ ہی دنوں کے بعد مفتی جی کی ادب نوازی کا مفتی جی نے مکمل جائزہ لے لیا۔ انہوں نے خاں صاحب سے کہا..... ”بھائی! کچھ مائیکروفون لگائیں۔“

حیران ہو کر خاں صاحب نے پوچھا۔ ”جی..... کیا؟“

”بھائی کبھی ریڈیو وغیرہ سنتے ہو؟“

”جی میرے پاس اپنا ریڈیو ہے۔“

”پھر تو ٹھیک ہے۔ اتنا ڈسمنٹ کرو گے؟“

”جی کر لوں گا۔“

یہ وہ پہلی چاٹ یا چرکا تھا جو خاں صاحب کے منہ کو لگا۔ جس الیکٹرانک میڈیا کے آخر میں مفتی جی خلاف آئے۔ اس کا پکا بھی مفتی جی نے ہی لگایا۔ ان کا خیال تھا کہ خاں کے ادبی کیریئر کو الیکٹرانک میڈیا کی سستی شہرت کھا گئی۔ یہ سب بے نقصان، ان دنوں نے ایک دوسرے پر گہرے نقوش چھوڑے۔ ڈرامے کی طرف خاں صاحب مفتی جی کو ورغلا لے گئے لیکن ایک بات جو مفتی میں بڑی قابل ذکر نظر آتی ہے، وہ یہ کہ مفتی جی نے کبھی قلم کاغذ کا ساتھ نہ چھوڑا۔

لکھنا لکھانا خاں صاحب نے بھی مکمل طور پر منقطع نہیں کیا لیکن ان کی توجہ زیادہ ”تلقین شاہ“ اور ٹیلی ویژن کی طرف ہو گئی۔ مفتی جی ڈرامے سے منسلک رہے لیکن ڈھیلے ڈھالے۔ انہوں نے کبھی ہمہ وقت اپنی ساری

تو جہادھر مبذول نہیں کی۔

ان دنوں جب خاں صاحب مزنگ روڈ سے سائیکل پر آیا کرتے تھے، ان دنوں پاکستان میں مفتی جی کے قیام کرشن نگر میں ساندہ روڈ پر تھا۔ ان کے گھر کا نام Lovely Lodge تھا اور میراجی چاہتا تھا کہ وہ جہاں بھی رہے گھر کا یہی نام ہو۔ 1950ء تک وہ یہیں ساندہ میں قیام پذیر رہے۔ پھر جب پاکستان نے ٹراؤ کھیل میں ایک ٹیسٹ ریڈیو سٹیشن کھولا تو مفتی اس کے مؤدھی تھے۔ یہ ریڈیو سٹیشن بھارت کے پروپیگنڈہ کا جواب در جواب تھا۔ یہاں سے جی، یوسف ظفر اور خاں صاحب سکرپٹ تحریر کرتے جو اسی وقت تاج محمد صاحب، محمد حسین صداکار ہوا کے ذریعے دیتے۔

1951ء میں مفتی جی پنڈی آ گئے۔ ان کا گھر B-365 میں سینٹ میری کالج کے پاس تھا۔ اس وقت کے دوران ان کا رابطہ خاں صاحب سے رہا اور میں ان کے دائرہ اثر سے دور رہی۔ پھر 1958ء میں وہ مشہور واقعہ Deputation پر تھے۔ مفتی جی نے ایک اختلاف کی بنا پر اپنے افسر اعلیٰ کے منہ پر تھپڑ مار دیا تھا۔ اس بے جا نتیجے میں انہیں suspend کر دیا گیا مگر شہاب بھائی کی مدد آڑے آئی۔ انہیں کراچی میں منتقل کر دیا گیا۔ یہاں نے دوسرے رہائش بدلی۔ پہلے وہ ٹٹھو پیر کے قریب ناظم آباد میں پاک کالونی میں رہے، پھر بندر روڈ پر پلازہ سینما کے کرائے کا مکان لے کر آباد ہو گئے۔

اس وقت ان کے پاس آپا اقبال اور ان کے بھائی رفیق بھی رہتے تھے۔ جب مفتی جی کراچی میں رہتے تھے تو ہم شہاب بھائی کے مہمان ٹھہرے۔ ہمارے ساتھ بچے اور تبت کے بستر تھے۔ بچے اور بستر ہاتھ آئی لینڈ میں ہم مفتی جی کے پاس پہنچے۔ مفتی جی نے ہمیں بچوں کے بغیر دیکھ کر کہا..... ”وہ بچے کہاں ہیں؟“

”وہ مفتی جی..... وہ سو رہے تھے۔ ان کو ہم عفت کے چارج میں دے کر آئے ہیں۔“

”ہاں بھی جب بڑے آدمی سواگت کرنے کو لیں تو پھر مفتی کہاں یا دوہتا ہے؟“

”یہ بات نہیں مفتی جی۔ اسی نے ٹرین کے ٹکٹ بھیجے تھے۔ میں کیا کرتا؟“

”یہ بھی مجھے ہی دھونس دی جا رہی ہے کہ شہاب ہماری دوستی afford کر سکتا ہے اور آپ جیسے ٹکٹ کرایہ نہیں دے سکتا۔“

اتنے میں آپا اقبال آ گئیں اور پوچھنے لگیں۔ ”شکو کھانا کھا لو۔“

”ناں ناناں..... ناناں تم وال بھجیا کھلا دوگی۔ وہاں پتہ نہیں کیا ضیافت ان کا انتظار کر رہی ہوگی..... جاتے ہیں ہم کچھ دیر سب سے بیٹھے رہے۔ پھر مجرموں کی طرح اجازت لے کر باہر نکل آئے۔ مفتی جی نے ہمیں تکلیف بھی گوارا نہ کی۔

1964ء میں ہی مفتی جی O.S.D. بنا دیئے گئے۔ یہ بھی شہاب صاحب کے توسط سے ہوا۔ سیٹلائٹ ٹاؤن میں کمرشل مارکیٹ کے قریب منتقل ہو گئے۔ ایک ہی سال گزرا تھا کہ انہیں حیدری چوک سید پور میں الاٹ کر دیا گیا اور وہ صدر کے Speech Writer بنا دیئے گئے۔ 1969ء میں وہ ریٹائر ہو گئے اور عکسی منتقل ہوئے۔

تسرع ہو گیا۔

1978ء تک انہوں نے دو گھر اور بدلے۔ یہ دوران کی ملازمتوں کے لیے اہم نہیں ہے بلکہ اس دوستی اور حقیقت مندی کا مظہر ہے جو مفتی جی کو شہاب بھائی سے ہو گئی تھی۔ شہاب بھائی اس وقت ثاقب سمیت اپنی بہن محمودہ اور سہیل کے پاس رہتے تھے۔

شہاب کے بہنوئی امین صاحب بہت اچھی سرکاری نوکری پر تھے اور وہ بلوچیل اور ثاقب کو بڑی توجہ سے دیتے تھے۔ یہاں مفتی جی ہر روز دوپان لے کر پہنچتے۔ کبھی یہ پان باہر ہی دے جاتے۔ کبھی شہاب صاحب سے مڈھ سے بات کرتے تو ان کے ہاتھ میں تھما دیتے لیکن انہوں نے کبھی اندر بیٹھ کر شہاب صاحب سے گپ شپ کرنے کی کوشش نہ کی۔

امین بھائی ان سے گھل مل گئے۔ 1978ء میں گھر بنایا۔ یہ گھر ایک برس اتنی نالے کے پہلو میں ہے اور سٹریٹ پر واقع ہے۔ بقول مفتی جی انہوں نے اس گھر کی تعمیر میں چچی انگلی برابر زور نہیں لگایا۔ روڑا، اینٹ، بجری سب امین صاحب کا دوسرا بنیادوں سے چھتوں تک ایک ایک سٹیج پر امین بھائی حاضر۔ دروازے لگے۔ پینٹ ہوئے۔ مفتی جی یہاں تھے۔

غرض یہ کہ یہاں بھی مفتی جی کو ان کے توکل کی جزا ملی۔ شہاب بھائی کی Wishing Well رنگ لائی۔ شہاب بھائی کا ایک یہ بھی فلسفہ تھا کہ اگر آپ کسی شخص کے لیے اچھے واقعات کی فقط آرزو ہی پال لیں تو عجب معجزانہ طریق سے یہ آرزو دعا میں بدل جاتی ہے اور جس کے لیے آپ بہتری کی خواہش پالتے ہیں اس کے ساتھ خوشگوار واقعات ہونے لگتے ہیں۔

میں مفتی جی پر عقیل روٹی اور ابدال بیلا جیسی کتاب تو نہیں لکھ سکتی۔ میں تو فقط یہ بتانا چاہتی ہوں کہ کس طرح مجھ سے ساتھ ان کا تعلق بیچ سے پھلتا پھولتا ایک تناور درخت میں بدل گیا اور داستان سرائے کے ورود دیوار کیسے ان کی محبت کے شہد بن گئے۔

داستان سرائے میں مفتی جی کبھی شہاب بھائی کے کمرے میں نہ ٹھہرے۔ یا تو برآمدے میں اپنا بیگ، پان، تباکو کے لوازمات رکھ کر ایک بازار سجالیٹے یا پھر اندر ڈرائنگ روم میں اس آخری دیوار کے ساتھ چار پائی لگا لیتے جس کے ساتھ غسل خانہ ہے۔

میں ان سے جھگڑتی ”مفتی جی یہ کیا مذاق ہے۔ آپ پبلک کے لانگے میں کیسے آرام کر سکتے ہیں؟ اندر کمرہ خالی ہے۔ آپ اس میں رہیں آرام سے۔ جب چاہیں جب دل کرے لکھیں، جب جی چاہے کھانا منگوا لیں۔“ وہ تھوڑا سا ہنستے اور پھر دونوں ہاتھ باندھ کر بولتے..... ”ناں بھئی ناں میں پلید آدی۔ میرا شہاب کے کمرے سے کیا لینا دینا۔ مجھے تو اندر جھاتی مار کر بھی نہیں دیکھنا چاہیے۔“

میں نے جب پھر کوئی دلیل دینا چاہی تو وہ بولے۔ ”کا کی! میں سلسل البول کامریض ہوں۔ پیشاب بغیر نوس کے آ جاتا ہے۔ سارے کپڑے بھیک جاتے ہیں۔ یہ جگہ اچھی ہے۔ غسل خانے کا دروازہ ساتھ ہے۔ کھولا اور اندر۔“

میں پھر بھی مُصر ہوئی تو ان کا جواب آیا۔ ”کاکی! میرے ملنے والوں میں ہر قسم کے لوگ ہیں۔ میں تو سب سے بھی برآمدے کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ ملاقاتی بلا جھجک آ جاتا ہے۔ احمد بشیر، پروین عاطف، مودی، نیلم..... عقیل اور ابدال بیلا، اسلام بی بی۔ اب کس کس کو گنوؤں..... میں تیری محبت کو سمجھتا ہوں لیکن اتنا تو سمجھ پاگل کہ تیری محبت کی تکلیف دے گی۔“

میں چونکہ اپنی تکلیف وہ محبت کا کچھ کچھ ادراک رکھتی تھی، اس لیے دلیل کے آگے میں نے ہتھیار ڈال دیا۔ جب مفتی جی آخر آخریں بہت بیمار ہوئے تو ایک دن خاں صاحب نے مجھ سے لجاجت سے کہا ”قد سید! تیری محبت جی بہت بیمار ہیں۔ شفا یاب ہونے کے امکانات نہیں ہیں۔“

”یہ کون وثوق سے کہہ سکتا ہے؟“

”پیشاب کی تھیلی ساتھ لڑکائے رکھتے ہیں۔ اوپر سے مسلسل کھانسی بھی ہے اگر.....“

وہ چپ ہو گئے۔ پھر کچھ لمحوں بعد بولے..... ”قد سید! جیسا دودھ کا کاڑھا تم مجھے پلایا کرتی تھیں اگر تم مجھے ویسا ہی پلا سکو تو؟“

بات ابھی بھی واضح نہیں تھی۔

”لیکن خاں صاحب! اس کا کاڑھا بنانے میں تو قریباً دو گھنٹے لگتے ہیں۔“

”ہاں وہ تو ہے۔“

”لیکن آپ چاہتے کیا ہیں؟“

”میں مفتی جی کو بلا کر یہاں رکھنا چاہتا ہوں۔ وہ اوپر سارا دن تخت پوش پر رہیں گے۔ رات کو صوفی کرسی میں انہیں منتقل کر دیا کریں گے۔ میں ایک طرح سے ان سے وعدہ بھی کر چکا ہوں۔“

معاملہ طے ہو گیا۔

مفتی جی آ گئے۔ دودھ میں چھوہارے ڈال کر ہلکی آٹھ پر اتنی دیر پکایا جاتا کہ دودھ ایک تہائی رہ جاتا۔ پھر اس میں چھوہارے ملا کر دن میں دو تین مرتبہ مفتی جی کو پلایا جاتا۔ حکیم صاحب کے بتائے ہوئے کاڑھے نے معجزہ دکھایا۔ پہلے کھانسی کے دورے کم ہوئے۔ آہستہ آہستہ کھانسی، بخار، بلغم سب غائب..... سب سے آخر میں وہ ہلکا ہلکا بخار بھی مجھ سے ان کی جان توڑ رہا تھا، ختم ہو گیا۔

مفتی جی کے چہرے پر سرخی آ گئی۔ میزھے میڑھے ہاتھ پاؤں سیدھے سہاؤ چلنے لگے۔ مفتی جی نے پروگرام بنالیا اور ہم دونوں کے اصرار کے باوجود وہ اسلام آباد چلے گئے۔ مفتی جی جب کسی چیز کا ارادہ کر لیتے تھے تو اس کے ارادے کو متزلزل کرنا مشکل تھا۔

عقیل، روبی اور ابدال بیلا نے مفتی جی پر بہت خوبصورت، انوکھی اور جامع کتابیں لکھی ہیں۔ ان کے مضمون مندوں نے اپنی محبت کے پھول ان کے چرنوں میں چڑھائے ہیں لیکن عکسی مفتی نے اس محبت میں اور ہی قسم کی برکتیں لکھی ہیں۔ اس کا مضمون پڑھیے اور عکسی کے لگاؤ کا خود ہی اندازہ لگائیے۔

ممتاز مفتی کی یادیں

از عکسی مفتی

ہمیں چھوڑ جانے سے چند روز قبل ممتاز مفتی مجھ سے کہنے لگے۔

”یار عکسی! تیرے لوگ ورثہ دار کیہ فائدہ! یار، یاد رکھنا جب میں مر جاؤں تو دو شہنایوں والے اور ایک ڈھول

لے کر لینا اور گھر کے باہر خوب شادیاں بجانا۔ خوشی منانا۔ وعدہ کرو یار۔ ایسا ہی کرو گے۔“

والد سے کیا ہوا وعدہ تو میں نہ نبھاسکا۔

لیکن آج اتنا ضرور عرض کروں گا کہ ہمیں ممتاز مفتی کا سوگ نہیں منانا چاہیے بلکہ انہیں celebrate کرنا

So let us celebrate MUMTAZ MUFTEE

He was a gift to all us from ALLAH

مجھے یہ زعم تھا کہ ممتاز مفتی کے نام رفقاء کو ذاتی طور پر جانتا پہچانتا ہوں اور پھر ان میں سے بیشتر تو میرے بھی

صحت میں لیکن یہ زعم ان کی وفات پر پاش پاش ہو گیا۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ نہ جانے کہاں کہاں سے اُٹ پڑے۔ اچھے

سے عمر رسیدہ بزرگ دھاڑیں مار مار رہے تھے۔ کچھ چیخ چیخ کر پکار رہے تھے۔

”باپو باپو۔ میں یتیم ہو گیا۔“

میں حیرت سے ان سب کو دیکھ رہا تھا۔

یہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ یہ کیونکر یتیم ہو گیا؟ میں سوچتا رہا۔

میرا خیال تھا لوگ آئیں گے، مجھے سہارا دیں گے، گلے لگائیں گے۔ دلا سہ دیں گے۔ غم بانٹیں گے۔ اللہ مجھے

سب کا دکھ بانٹنا پڑ گیا۔ اور تو اور وہ مولوی حضرات جنہوں نے ”لبیک“ کے چھپنے پر مفتی جی کے خلاف فتوے جاری

کیے یہ کون ہے جو بیت المکرم کو ”کالا کوٹھا“ کہتا ہے۔ اس کی یہ جسارت کہ حج کا تمسخر اڑائے کہ ”کوٹھے والا مجھے آنکھیں

بٹا ہے۔“

ان ہی میں سے ایک مولانا ممتاز مفتی کے قلم کو اسلام کی تلوار سے تشبیہ دینے لگا۔

میں حیرت سے سنتا رہا۔

اسی موقع پر جیب کترے بھی پیچھے نہیں رہے۔ جب کتروں کا ایک پورا گروہ جنازے کے دوران ممتاز مفتی کے

تاروں کو لوٹا رہا۔ بہت سوں کی جیبیں کٹ گئیں۔

ایک صاحب جن کی جیب کٹ چکی تھی، فرمانے لگے: ”کیا مذاق ہے۔ ممتاز مفتی جاتے جاتے بھی ہاتھ دکھا

گئے۔“ پاس ہی کھڑا احمد بشیر بولا: ”نہیں صاحب۔ ممتاز مفتی جاتے جاتے سب کو کچھ دے گئے۔ جیب نہیں اپنا دل ٹولیں

اور کہیں کہ میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

ممتاز مفتی جب کتروں کو بھی کچھ دے گئے ہیں۔

ممتاز مفتی کو بچپن سے اپنے گھر کے ماحول سے سخت نفرت تھی۔ جب ان کے والد مفتی محمد حسین نے

شادی کر لی تو ممتاز مفتی کی والدہ صغرا بی بی کی حیثیت گھر میں نوکرانی کے برابر رہ گئی۔

اپنے والد کے خلاف شدید غم و غصہ تھا۔

گھر چھوڑ کر چلے گئے۔

کتنے ہی برس، کئی سال بیت گئے۔ والد مفتی محمد حسین نوے برس کو پہنچے لیکن ممتاز مفتی نے ان سے ملنے نہ سکیے۔

وہ ایسے ہی اگر کبھی کسی سے روٹھ جاتے تو برسوں بات نہ کرتے۔ بہت غصے والے تھے۔

بڑی بڑی خطائیں معاف کر دیتے لیکن کسی چھوٹی سی بات پر روٹھ جاتے۔

ایف اے اور بی اے میں انگریزی امتحان میں ہمیشہ فیل ہوتے رہے۔ کہتے تھے تعلیم نے میرا کچھ نہیں سیکھا۔

لیکن 1935ء میں بطور انگلش ٹیچر ملازم ہو گئے۔

سکول میں انگریزی پڑھانے لگے۔

Recession کا دور تھا۔ چالیس روپے تنخواہ پائی۔

باپ انسپٹر آف سکولز تھا۔ کسی نے یوں ہی چھیڑ دیا۔ مفتی سفارشی ہے۔ باپ نے کہلوا بھیجا۔ گھر واپس آئے۔

بس اسی دن سکول سے استعفیٰ دے دیا۔ نوکری چھوڑ کر چلے گئے۔ شہر ہی چھوڑ دیا۔

ممتاز مفتی باغی تھے۔ والد، گھر بار، رشتہ دار، عزیز واقارب سب کو چھوڑ چکے تھے۔ کسی رشتہ دار کی جرأت نہ تھی

ممتاز مفتی کو ملے۔ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ جس قدر باپ سے نفرت تھی، اسی قدر مجھ سے پیار تھا۔ کہتے وہ کبھی نہ

تمہارا کوئی تایا ہے نہ پھوپھا۔ نہ ماما ہے نہ چاچا۔ بس ایک میں ہوں تمہارا ابا۔ میں ہی تمہارا دوست اور میرے سب سے

بھی تمہارے دوست ہیں۔ والد سے نفرت اب پورے معاشرے کو پلیٹ میں لے چکی تھی۔

اسی دور میں ممتاز مفتی نے گہما گہمی، چپ اور اسمار میں جیسا ادب تخلیق کیا۔ وہ نفسیاتی افسانے جسے لوگ

کہانیاں بھی کہتے ہیں، دراصل ممتاز مفتی کی معاشرے کے خلاف کھلی بغاوت تھی۔ معاشرے کی گھٹن، رسم و رواج

پابندیاں اور گرامر زبان کی قیود کے خلاف۔ ممتاز مفتی کی شخصیت کے ارتقاء کا یہ اہم دور تھا۔

وہ صرف جنسی حوالے سے فرائیڈین نہ تھے بلکہ Hatred father جو فرائیڈ کے فلسفے کا اہم ستون ہے۔

پورا پورا لاگو ہوتا ہے۔

ان کی شخصیت میں تضاد ہی تضاد تھا۔

غصیل اور باغی ہونے کے باوجود ممتاز مفتی شرمیلے تھے، ڈرے ڈرے، سہے سہے، خوف زدہ، انہجی

کتری کے شکار۔

کبھی کسی بڑے افسر سے نہ ملتے۔

دفتر میں چپڑاسیوں اور کلرکوں کو دوست رکھتے۔ انہیں یاد رکھتے۔ انہیں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے۔
افسر سے خوف یا پھر شدید غصہ رکھتے۔

ایک افسر کو گھونسا مارنے پر کئی سال معطل رہے۔

پیشاب کی حاجت ہو تو کبھی Officers' Toilet نہ جاتے۔ Staff Toilet تلاش کرتے ہمیشہ یا باہر کسی
جگہ ہی میں بیٹھنا گوارا کر لیتے۔

1950ء کے لگ بھگ ممتاز مفتی میں تبدیلی آ گئی۔ اب وہ ایک مشہور افسانہ نویس تھے اور ریڈیو پاکستان میں
سرگرم راسٹر کام کرتے تھے۔ مختار صدیقی، مسعود قریشی، اشفاق احمد، یوسف ظفر، باقی صدیقی، محمد حسین ان کے ہم عصر
ہوتے تھے۔

فطرت تو نہ بدلی۔ وہی شدت، وہی غصہ، طبیعت کا تضاد اور احساس پن تو ویسا ہی رہا لیکن رخ بدل گیا۔
نہ جانے کسی بابے کی دعا تھی یا کسی بزرگ کی نگاہ یا خود قدرت اللہ شہاب کا چمکار۔ یہ تو میں نہیں جانتا لیکن تبدیلی
تھی۔

ممتاز مفتی کی تلاش ذات نے رخ تبدیل کر لیا۔ شخصیت کی صفات تو نہ بدلیں البتہ ارتقاء نے ایک دوسری شکل
دیا کر لی۔ ایک نیا راستہ اپنا لیا۔ پھر ممتاز مفتی بابوں اور خانقاہوں کی تلاش میں سرگرداں رہتے۔ عقیدت کی دلدل میں
تھمتے چلے گئے۔

لیکن اس سفر میں ہر موڑ پر قدرت اللہ شہاب سے ان کے گہرے مراسم یا خط و کتابت رہی۔ آہستہ آہستہ ممتاز
مفتی کی شدت مجذوبانہ رنگ اختیار کرتی گئی۔ ممتاز مفتی مجذوب ہو گئے۔

شکر ہے خدا کا کہ پورے پورے مجذوب نہ ہوئے لیکن کسی درجہ ایسے ہی جیسے نارنجی میں کچھ کچھ مالٹے کا ذائقہ
ہوتا ہے۔ ممتاز مفتی میں بھی ایک مجذوب تھا۔

اسی دور میں ممتاز مفتی نے ”لبیک“ اور ”لکھ نگر“ جیسا ادب تخلیق کیا۔ خانہ کعبہ کو کال کوٹھایا اللہ کو ٹٹھے والے
سے تعبیر دینا کسی مجذوب کی تحریر تو ہو سکتی ہے، ہوش مندا دیب کی نہیں اور کسی مجذوب ہی کو یہ قبولیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ
یہی گستاخانہ باتیں لکھے اور صاف بچ نکلے۔

آپ اور میں پورے ہوش میں ایسی تحریر نہیں لکھ سکتے۔

پھر ایک دن اچانک قدرت اللہ شہاب چل بے۔ ممتاز مفتی کے خواب ادھورے رہ گئے۔ عقیدت کے وہ تانے
نے جو ممتاز مفتی نے قدرت اللہ شہاب کی ذات کے گرد بن رکھے تھے، ٹوٹ گئے۔ بے محل وقوع بے جہت ہو گئے۔ وہ
سچی کرن، پاکستان کا عروج جس کا ممتاز مفتی کو یقین تھا کہ وہ قدرت اللہ شہاب کی زندگی ہی میں حقیقت بن جائے گی، بکھر
کر رہ گئی۔ ممتاز مفتی کا مدار چھن گیا۔

قدرت اللہ شہاب کے مرنے کے چند ہی سال بعد ممتاز مفتی کا محبوب بیٹا عکسی مفتی گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ عکسی نے
سری شادی کر لی۔ ممتاز مفتی کو دوسری شادی سے سخت چڑھتی۔ اس نے اپنے والد کو کبھی معاف نہ کیا تھا۔ بیٹا دوسری شادی

کرتے ہی گھر چھوڑ گیا تو ممتاز مفتی بالکل تنہا رہ گیا۔ تنہا۔ اس کی نفرت بے معنی ہو کر رہ گئی۔

اس کی موج در موج محبت اور عقیدت کا نہ کوئی ساحل رہا نہ کنارہ۔

وہ اکیلاتن تہا Old man & the Seal کی طرح چپو مار مار کر اپنی کشتی ٹھیلتا رہا۔ اس میں زندگی کی اُمٹ

اب بھی باقی تھی۔

آخری سانس تک ممتاز مفتی کی آنکھوں میں چمک تھی۔ قلم میں تلوار جیسی کاٹ تھی۔ وہ علی پور کا ایلچی تھا۔ ہار

اس کا شیوہ نہ تھا لیکن اب مفتی دھیما پڑ چکا تھا۔ مجزوبیت رنگ بدل کر فقیری میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک بوسیدہ بستری پر پڑ

لوگ یوں ہی کھپے چلے آتے۔ لوگوں کی سیوا اس کا مسلک بن چکا تھا۔ ایک گھنے درخت کی طرح اس کا سایہ

دور دور پھیل چکا تھا لیکن اس کی تلاش ختم نہ ہوئی۔ حالانکہ وہ بہت تھک چکا تھا۔ اس کی آرزو جوان تھی۔ اس کی جستجو میں

چمک تھی۔ وہ ایک لمحے کے لیے رکا نہ تھا۔ اس کا سفر جاری تھا۔

”قلم میں لامکاں کی آرزو رکھنا

توے یا سو سال، آخروٹ جاتی ہے

گئے ممتاز مفتی جی

ازل سے تا ابد پھیلی

کہانی رو پڑی ہے۔“

ممتاز مفتی کی زندگی دراصل ایک طویل تلاش ہے۔ ان کی آخری تصنیف کا نام بھی ”تلاش“ ہے۔ 1905ء

لے کر 1945ء تک جو کچھ ان پر بیٹا اس کا نام ”ایلی“ رکھا۔ یہ پہلا حصہ ممتاز مفتی کی عالم شہادت کی روئیداد ہے۔ ”علی پور کا

ایلی“ تلاش ذات کا ناول ہے۔

1950ء سے 1990ء تک کی آپ بیتی کو ”الکھ نگری“ کا نام دیا۔ یہ دوسرا حصہ ممتاز مفتی کا عالم الغیب کا سفر ہے۔

”ہلیک“ اور ”الکھ نگری“ دراصل تلاش خدا کی روئیداد ہے۔ دونوں ہی ممتاز مفتی کی تلاش ہیں۔ وہ مشاہدات ہیں۔

میں سے ممتاز مفتی گزرا اور جن کی بدولت مفتی ”ممتاز“ ہو گیا اور دونوں تصانیف میں بلاشبہ بہت تضاد ہے۔

”علی پور کے ایلی“ کے دھواں دھارا اندھیرے آنے والی کرن کو مزید چمک بخشیں گے۔ ایلی کے اندھیرے

”الکھ نگری“ کے چمکیلے خواب ایک دوسرے سے جس قدر مختلف ہیں، اسی قدر ممتاز مفتی کی شخصیت کے ارتقاء کی اہم

ہیں۔ یہ ایک ہی عمل کے دو Aspects ہیں، دورخ ہیں۔

اس عمل کے دوران کئی شخصیات، کردار، روحانی باپے، بزرگ، عامل پروفیسر حتیٰ کہ خود قدرت اللہ شہاب

میل تو ضرور ہیں منزل نہیں۔ ممتاز مفتی کا سفر یہاں ختم نہیں ہوتا، جاری ہے۔

ممتاز مفتی کی تلاش جاری ہے۔

ان کی وفات کے بعد ایک لڑکی نے فیصل آباد سے مجھے خط لکھا۔ لکھتی ہیں:

”ممتاز مفتی کبھی مرنہیں سکتے۔ آج بھی وہ اپنی تحریروں کے اندر زندہ ہیں۔ اپنے جذبے کی پوری سچائی کے ساتھ اپنی خوبصورت عقیدت کے ساتھ۔ ان کی تلاش بھی ان کی طرح ہی خوبصورت تھی۔ ان کو خدا ملا یا نہیں، یہ تو وہ جانتے ہیں گے یا شاید آپ؟ مگر میری تمنا تھی کہ کاش خدا کہیں میرے پاس ہوتا تو میں انہیں دے دیتی۔“

اب سے بہت سال پہلے کی بات ہے جب میں گارڈن کالج میں پروفیسر تھا۔ ایک روز کالج کے چند طالب علم میرے گھر آئے اور ممتاز مفتی سے کہنے لگے۔ ”اچھا تو آپ عکسی مفتی کے باپ ہیں۔“

یہ سن کر میرے والد کچھ سوچ میں پڑ گئے۔

اسی شام اپنے ایک دوست سے کہنے لگے۔

”یار! آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ میرے تو وہم و گمان میں نہ تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ لوگ ممتاز مفتی کو بیٹے کے حوالے سے پہچانیں گے۔“

بس مجھے موقع مل گیا۔ میں نے کہا۔ ”والد صاحب! اب پتہ چلا جو دل کو لگی۔ آخر میرا حوصلہ دیکھیں پچھلے برس سے آپ ہی کے نام سے پہچانا جاتا ہوں۔ کالج میں پروفیسر ہوں، شعبہ نفسیات کا سربراہ ہوں، کئی قسم کے پابھنڈ کرتے ہوں لیکن پھر بھی لوگ یہی کہتے ہیں ممتاز مفتی کا بیٹا۔“

بات کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا ”سر! پچھلے 38 برس میں نے زندگی آپ کی طرز پر گزاری ہے۔ اب میں اپنے طور پر رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے اجازت دیں۔“

ممتاز مفتی نے تھوڑی دیر سوچا اور کہنے لگے۔ ”جاؤ عکسی! اجازت ہے۔“

اسی دن میرا اور ممتاز مفتی کا راستہ الگ ہو گیا۔ اب میں 52 برس کا ہوں۔ کئی سال گزر چکے ہیں لیکن آج مجھے اس بات پر فخر ہے کہ میں ممتاز مفتی کا بیٹا ہوں۔ ممتاز مفتی ہی میری پہچان ہے۔ ممتاز مفتی ہی میرا ورثہ ہے۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے اور کوئی اعزاز نہیں۔

کچھ تو لوگوں نے مفتی جی کو جانا پہچانا اور پھر آپ تک پہنچایا۔ کچھ حسن اتفاق سے مفتی جی نے عرفان ذات میں خوب کراپنا پتہ اور سراغ لگایا۔ اس سلسلے میں مفتی جی نے جو مضمون لکھا، وہ بھی پیش خدمت ہے۔

ایک ذاتی خاکہ

اس وقت اپنا یہ عالم ہے کہ اعضاء بے رحمی کے محکمے کو آوازیں دے رہے ہیں۔ کہتے ہیں 86 سال سے ہم دن رات ننگ ننگ کر رہے ہیں، نہ کبھی جمعے کی چھٹی ملی ہے نہ عید شب برات کی۔ اب بس کرو بہت ہولیا، ہم پر ظلم بند کیا جائے۔

نتیجہ یہ ہے کہ میں پلیٹ فارم پر بیٹھا انتظار کر رہا ہوں کہ کب گاڑی آئے اور میں آپ کو ٹاننا کر کے رخصت ہو جاؤں۔ جناب والا! میری تحریر اور شخصیت کے متعلق چند خوش فہمیاں چل نکلی تھیں۔ سو چار رخصت ہونے سے پہلے احوال واقعی قلم بند کر جاؤں۔ حال ہی میں میں نے اپنی تحریر اور شخصیت پر ایک مضمون لکھا تھا جس سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں۔ عنوان ہے چھوٹا۔

ممتاز مفتی کو میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، سیانے کہتے ہیں، دو جگہوں سے دیکھو تو ٹھیک سے نظر نہیں آتا۔

دور سے!

بہت قریب سے!

چونکہ میں نے بہت قریب سے دیکھا ہے، اس لیے مضمون سندنہیں ہے۔

مفتی کو ادیب ہونے پر فخر نہیں ہے بلکہ معذرت ہے۔ اس نے کبھی نہیں چاہا تھا کہ ادیب بنے۔ اتفاق سے آ گیا۔ تالی بچ گئی۔ یوں زندگی بھر لکھنے پر مجبور کر دیا گیا۔

اسے اردو زبان نہیں آتی۔ اس کی تحریر کی Roots اردو ادب میں نہیں ہیں۔ اس نے کبھی شعوری طور پر ادب کے لیے نہیں لکھا۔ اس نے اردو ادب پر کوئی احسان نہیں کیا نہ ادب کی خدمت ہی کی ہے۔ الٹا اہل ادب نے مفتی پر احسان کیا ہے۔ اسے ادیب کا مرتبہ بخشا، اہمیت عطا کر دی۔ زندگی بے مصرف نہیں رہی۔

اس کے گھر میں کسی کو ادب سے خصوصاً اس کی تحریروں سے دلچسپی نہیں ہے۔ بیٹے میں بڑی صلاحیت تھی مگر اس نے کہا میں خود! میں خود! جیسے جان دار ضدی بچے کہا کرتے ہیں مطلب تھا، میں اپنا راستہ خود تلاش کروں گا۔ ہوئے راستے پر چلنا گوارا نہیں۔ یہ تو بیٹے کا باپ سے تعلق ہے۔ بیوی کہتی ہے، کیوں جھوٹی کہانیاں لکھ کر اپنی عاقبت خراب کرتا ہے۔ اب بھی توبہ کر لے۔

دوست کہتے ہیں، تجھے توج کے زعم میں خود کو سر بازار رسوا کرنے کی لت پڑی ہوئی ہے۔ نہ نہ نہ ہمیں سزا ہی رکھنا، خبردار ہمارا تذکرہ نہ کرنا۔

مفتی ازلی طور پر اکیلا ہے۔

اکیلے دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک وہ جو جان بوجھ کر الٹا مانا لگ رہنا پسند کرتے ہیں۔ محفل لگ جائے تو ڈوبتے نہیں تیرتے رہتے ہیں۔ دوسرے وہ جو محفل سے گھبراتے ہیں، کتراتے ہیں۔ لگ جائے تو ڈوب جاتے ہیں۔ مفتی دوسری قسم کا ہے۔ اگر آپ مفتی کو ایک کمرے میں بند کر دیں جہاں اس کی ضروریات اسے ملتی رہیں تو بے شک چھ مہینے کے بعد دروازہ کھولیں مفتی یوں ہشاش بشاش بیٹھا ہوگا جیسے ابھی ابھی روزگار ٹون کی سیر کر کے آیا ہے۔

دروازہ بچے تو مفتی کا دل ڈوب جاتا ہے۔ کوئی آ گیا، ظاہر ہے جو ڈرتا ہو کہ کوئی آ نہ جائے تو مہمان نوازی کے کمرے گا۔

مفتی نے کسی مہمان کو کبھی ٹھنڈا یا گرم نہیں پوچھا۔ جب مہمان چلا جاتا ہے تو اسے یاد آتا ہے کہ افوہ ٹھنڈا گرم پوچھا ہی نہیں، یاد ہی نہیں رہا۔ انگریزی میں ایک مثال ہے جس کا پنجابی میں ترجمہ یوں ہوگا۔ ”ٹریا نہ جائے تے پھے دا گوڈیاں دا۔“ لوگ انتظار کرتے ہیں کہ کب مہمان آئے اور وہ کھانا کھائیں۔ مفتی انتظار کرتا ہے کہ کب مہمان چائے وہ کھانا کھائے۔ مفتی کو غصہ بہت آتا ہے۔ وہ غصہ جو بھوت بنا دیتا ہے، دھول اڑاتا ہے، سدھ بدھ رہنے نہیں دیتا۔

عرصہ دراز ہوا کہ اس نے جان لیا تھا کہ غصہ ایک خنجر ہے جو انسان اپنے ہی دل میں بھونک دیتا ہے۔ دوسرے
 پر خود کو سزا دینے کا نام ہے، خود کو چٹائی میں ڈال کر بلوہنے کا عمل ہے۔ جان لینے کے باوجود، مان لینے کے باوجود وہ
 تک خود کو چٹائی میں ڈال کر بلوہنے پر مجبور ہے۔ صاحبو! ہائے کیا چیز بے بسی ہوتی ہے۔ عورت کے متعلق ممتاز مفتی کا
 یہ بیان مٹھا ہے جسے انگریزی میں Love-hate relationship کہتے ہیں۔ مفتی میں ریڈر قسم کا ایک ریسورٹ لگا ہوا
 ہے۔ قرب و جوار میں کوئی عورت آجائے تو وہ ٹک ٹک کرنا شروع کر دیتا ہے اور اگر وہ بائگی نار ہو تو ٹھاٹھوں ٹھاٹھوں کرتا ہے۔

مفتی کو ہر راہ چلتی عورت سے عشق ہے۔ بلا لحاظ جسم، خدو خال اور سٹینس۔ گورے رنگ پر تو اس کی جان نکلتی
 ہے۔ ہمت یہ ہے کہ اگر خاتون زیادہ ہی قریب آجائے تو وہ خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھتا ہے۔ یہ ”لو ہیٹ ریلیشن شپ“ اس
 لیے یہ ہوا کہ بچپن میں جس خاتون سے وہ شدت سے متاثر ہوا وہ اس کی سوتیلی ماں تھی۔ وہ بڑی حسین اور بارعب خاتون

ممتاز مفتی نے بڑی محبتیں کی ہیں لیکن بڑی دیر کے بعد اسے اس حقیقت کا شعور ہوا کہ دراصل اسے محبت کرنے
 سے محبت تھی۔ اس کیفیت سے محبت تھی، محبوب سے نہیں۔ محبوب کی حیثیت تو ضمنی تھی۔

اس کے نزدیک محبوب میں چند اوصاف کا ہونا لازم ہے۔ خدو خال اہم نہیں، رنگ گورا ہو، عمر رسیدہ ہو کہ ٹیاری
 جسم بھرا بھرا ہو، سب سے اہم بات یہ ہے کہ محبوب میں ہر جاہلیت کی واضح دھونس ہو۔

مفتی کسی نیک یا وفا شعار خاتون سے محبت نہیں لگا سکتا۔ آج کل کی لڑکیاں اسے اپیل نہیں کرتیں، کہتا ہے محبت
 کے ایک فن ہے، یہ آج کل کی کھٹی مٹھی لڑکیاں کیا جانیں کہ محبت کیا چیز ہے۔ مفتی کے نزدیک محبت میں مٹا کا ہونا ضروری
 ہے۔ مٹا بھرے لگاؤ کے ساتھ ہر جاہلیت کی دھونس ہو تو سبحان اللہ۔

اسے طوائف قسم کی عورت سے بڑی دلچسپی ہے کہ طوائف تن کے تقاضے سے آزاد ہو چکی ہوتی ہے۔ صرف من
 کی بھوک ہوتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس کی کہانیوں میں طوائف کا بڑا تذکرہ ہوتا ہے۔

اللہ میاں سے مفتی کے تعلقات ادا لتے بدلتے رہتے ہیں۔ بچپن میں وہ اللہ سے خوفزدہ رہتا ہے۔ سمجھتا رہا تھا
 کہ اللہ نے ایک بھٹی جلا رکھی ہے اور اس کا من بھاتا شغل یہ ہے کہ لوگوں کو اس بھٹی میں جلانے۔

پڑھ لکھ گیا تو اللہ سے منکر ہو گیا اور مذہب پر شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ جیسے آج کے ہر پڑھے لکھے کا وٹیرہ
 ہے۔ پھر پتہ نہیں ایک بزرگ نے کیا کیا اس کا رخ بدل گیا۔ اسے ڈال ڈال پات پات میں اللہ نظر آنے لگا۔ اسے اللہ سے
 گہری عقیدت پیدا ہو گئی۔ اللہ سے یارا نہ لگ گیا۔ پھر اس پر حیرت طاری ہو گئی کہ اللہ اس پر اس قدر مہربان کیوں ہے۔
 قدم قدم پر کرم نوازیاں کیوں کرتا ہے۔ مفتی میں عقیدے کا فقدان ہے۔ عقیدت کی بھرمار ہے۔ قدرت اللہ شہاب کو عمر بھر
 یہ تکایت رہی کہ وہ مفتی کی عقیدت کا شکار ہے، اس لیے مظلوم ہے۔

1990ء میں دفعتاً مفتی کی نگاہ سے پردہ ہٹ گیا اور اسے حقیقت کی پہلی جھلک نظر آئی۔ وہ یہ جان کر حیران رہ
 گیا کہ اسلام واحد مذہب ہے جو کہتا ہے، دیکھو سمجھو، غور کرو، عقل کو کام میں لاؤ۔ حقیقت پسند بنو۔ علم بدنصیب ہے۔ جب
 جس تھی اللہ سے منکر تھا، اب عقل نہیں رہی تو اللہ کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ ممتاز مفتی شدت کا مارا ہوا ہے۔ اس کی شدت کا قوام

کچھ زیادہ ہی گاڑھا ہے۔

کہتے ہیں ایک عالم حکیم کی دکان پر گیا۔ کہنے لگا آپ کے پاس شیرا ہے۔ حکیم بولا، جناب شیرا تو ہے۔ پرستہ
گاڑھا نہیں۔

مفتی کی شدت شین والی نہیں ش وئے والی ہے۔ زندگی بھر اس کے دوستوں کو اس کی شدت کے متعلق
پڑے۔ شہاب نے کہا، مفتی کی دوستی پھوڑے جیسی ہے، جس کی ٹیسوں میں لذت ہے۔ اشفاق احمد بولا نہیں، انہیں
سی سی کرتا رہا۔ احمد بشیر ہنسنا اور قہقہے لگاتا رہا چونکہ وہ خود شدت سے لت پت ہے۔ بانو نے کئی بار کچھ کہنے کے لیے
کھولا، لیکن ممتاز نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پروین کے لیے شدت کے کوہوں میں اپنا کوئی نئی بات نہ تھی۔ احمد نے
”مفتی میں صرف شدت ہی نہ تھی، وہ شدت کو اک وصف سمجھتا رہا، اسی پرناز کرتا رہا“ سمجھتا رہا کہ جس میں شدت
میں خلوص ہے، ٹھنڈے ٹھنڈے کرداروں سے الٹا رہا۔ اکسی سال کا ہوا تو اس نے پہلی مرتبہ جانا کہ شدت
عیب ہے اور زندگی ٹھنڈے ٹھنڈے لوگوں کے دم سے ہری بھری ہے۔

مفتی نے اس حقیقت کو جان لیا سچے دل سے مان لیا کہ شدت ایک عیب ہے ایک رکاوٹ ہے لیکن وہ اسے
اپنا نہ سکا۔ چونکہ شدت اس کی ہڈیوں میں رچی بسی تھی۔
صاحبو! کسی چیز کو جان لینا سچے دل سے مان لینا لیکن عملی طور پر اپنا نہ سکنا یوں ہے جیسے پچانسی پر لٹکے
رہے۔ کاش کہ وہ شدت کو وصف ہی سمجھتا رہتا۔

دوستو! سچی بات یہ ہے کہ میں نے ممتاز مفتی جیسا خوش قسمت شخص نہیں دیکھا۔ اونہوں! خوش قسمت
ایک لکی ڈیول ہے۔

اس نے بڑی Rich بڑی بھرپور زندگی گزاری ہے۔ اللہ نے اسے بہت کچھ اور بن مانگے دیا ہے۔
اللہ نے اسے کئی ایک لعنتوں سے بچائے رکھا۔ امارت سے بچائے رکھا، اقتدار سے بچائے رکھا، عہدے سے بچائے رکھا،
ذاتی اہمیت کے احساس سے بچائے رکھا۔

نئی ماراں دلی کے بزرگ حاجی رفیع الدین نے 1930ء میں سچ کہا تھا۔ کہنے لگے، جوانی میں وہ عمل
بدنامی ہوگی، رسوائی ہوگی لیکن بعد میں آپ کو بڑے اچھے لوگ ملیں گے۔ واقعی مفتی کو زندگی میں بڑے اچھے
ملے۔

اگر آج اللہ میاں ممتاز مفتی کے روبرو آکھڑے ہوں اور کہیں..... ”مانگ کیا مانگتا ہے“ تو سوچ میں
گا، کیا مانگوں۔ جسے زندگی بھر بن مانگے ملا ہو، وہ بھلا کیا مانگے۔ اب تو وہ تکمیل کی خوشی میں سرمست پلیٹ فارم پر
انتظار کر رہا ہے کہ کب گاڑی آئے اور کب وہ آپ کو ”مانا“ کہہ کر رخصت ہو جائے۔

مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں نے ”مردا بریشم“ لکھی تو سچ کے داعی مفتی جی نے اس کتاب کو پڑھ کر
کا اظہار کیا۔ کہنے لگے ”قدسیہ..... تو نے بڑی سچ سی کتاب لکھی ہے۔“

”کیا مطلب مفتی جی؟“

”تو نے شہاب کی شخصیت، اس کی بڑائی کو بے نقاب کرنے کے بجائے اپنے بچوں کا قصیدہ لکھا ہے۔ بچوں کو Bull کرنے کی کوشش میں لگی رہی ہے۔“

”اس لیے مفتی جی! کہ میں سنی سنائی کا بندہ ہوں۔ میں نے مفتی جی، شہاب بھائی کو خاں صاحب کی آنکھوں سے دیکھا۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ میں شہاب صاحب کے ناخن کاٹنے والا نائی ہوں جسے عام زبان میں خلیفہ کہتے ہیں۔ بچوں کی حقیقت بھی ان سے زیادہ تھی۔ خاص کر اشیر خاں کی..... اگر.....“

لیکن مفتی جی نے سننے سے انکار کر دیا۔ جو وہ سچ کچھ بیٹھے اسی پر اڑے رہتے۔ اب جب وہ دنیا میں نہیں ہیں تو یہ نظر یہ کچھ اور ہو گیا ہے۔ میں ان سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ مفتی جی! اگر شاعر محبوبہ کی تعریف کے قلابے ملائیں تو حق بجانب، بڑا شاعر اور اگر وہی شاعر وطن کی محبت کے گن گائے، نعت یا مرثیہ کہے، ماں کی محبت، اولاد کی فریفتگی میں رطب عثمان ہو تو ادب میں کتر جگہ پائے۔ یہ تو ایک طرح سے فرائیڈ کو درست ثابت کرنے کی کوشش ہوئی۔

اب کیا کروں میرے پاس تو اب صرف وہ خطرہ رہ گیا جو انہوں نے خاں صاحب کے پرنٹ میڈیا سے اکھڑ کر Visual میڈیا میں گھس جانے پر لکھا۔

داستان گو اور اشفاق احمد

گذشتہ چند ایک سال سے داستان گو نے اودھم مچا رکھا ہے۔ وہ جگہ جگہ جمع لگائے کھڑا ہے۔ ٹی وی پر، ریڈیو پر، عروبی جریڈوں اور محفلوں میں، ثقافتی اور سماجی ”گٹ ٹو گیدرز“ میں، شہروں میں، قصبوں میں، دیہات میں ان دور افتادہ مقامات پر جہاں ٹرانسٹریکس کی رسائی ہے۔

عوام ریڈیو پر بڑے اہتمام سے اس کے پروگراموں کا انتظار کرتے ہیں۔ اس کی پھلجھڑیوں سے محفوظ ہوتے ہیں۔ اس کی ”ہم اُٹنے“، ”بات اُٹنی“ پر حیران ہوتے ہیں۔ جوان اثر سے بھیگ جاتے ہیں۔ دانشور کچھ عرصے کے لیے بھول جاتے ہیں کہ ان کا کام محفوظ اور متاثر ہونا نہیں بلکہ مین میخ نکالنا ہے۔ نقاد گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتے ہیں کہ کوئی انہیں سگراتے ہوئے دیکھ نہ لے۔

بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ باتوں کے جال بن کر مجمع لگانے والا، مجمع میں رنگینی کی رو بڑانے والا، ہنسنے ہنسانے والا داستان گو درحقیقت گونگا ہے، ازلی گونگا۔ اس کی شخصیت دکھ اور چپ کے تانے بانے سے بنی ہے۔ اس کی بزم آرائی اور زعفران زاری شخصیت کے دو بنیادی عناصر دکھ اور چپ سے فرار کی سعی پیہم ہے۔ اس فطری جھروقتہ کے خلاف ایک صدائے احتجاج ہے۔ ایک رد عمل، ایسا رد عمل جس کے تحت پودے کشش ثقل کی زنجیروں کے خلاف احتجاجاً پھوٹتے ہیں۔ اُگتے ہیں، بڑھتے ہیں، ابھرتے ہیں۔

داستان گو کی تمام تر زندگی اس عمل اور رد عمل کا ایک پیہم چکر ہے۔ ایک عظیم بھنور جس میں وہ ڈبکیاں کھاتا رہتا ہے۔ ڈوبتا ہے، ابھرتا ہے۔ پھر ڈوب جاتا ہے۔ مجمع صرف اس کے ابھرنے کا تماشا کرتا ہے۔ اس کی مدد کے

سور ہے۔ اشفاق Para-Psychology کو صرف اس لیے نہیں مانتا کہ وہ اس ہاتھ کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور نہ

میں سمجھتا ہوں کہ اشفاق کی شخصیت کی بیشتر کمزوریاں اسی کامیابی کی وجہ سے ہیں۔ اس لیے ہیں کہ وہ ناکامی
تف نہیں۔ وہ جدوجہد سے ناواقف ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اگر کامیابی ہم رکاب ہو جائے تو جدوجہد نہیں رہتی۔ اگر
کی ہڈی میں دکھ اور چپ نہ ہوتے، بے وجہ دکھ اور چپ، بے نام دکھ اور چپ۔ اللہ واسطے کے دکھ اور چپ تو اشفاق
سرمیاب طوائف بن کر رہ جاتا جو آنکھیں منکارتی ہے۔ دلوں کو لبھاتی ہے۔ نگاہیں خیرہ کر کے دولت کے ڈھیر لگا لیتی
کی وہ نہیں نہ محسوس کرتی ہے نہ پیدا کر سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ دکھ اور چپ اشفاق کے لیے قدرت کا ایک عطیہ ہیں جن کی وجہ سے کامیابی کے باوجود اشفاق آج
ہو سکتا ہے۔

1947ء میں جب میں اسے پہلی مرتبہ ملا تو بنیادی طور پر وہ یہی کچھ تھا جو آج ہے۔ دکھ اور چپ کے تار و پود
کا ٹکڑا جس پر یہاں وہاں سنہرے تاغے سے کڑھی ہوئی پھل پتیاں تھیں۔ آج بھی وہی ٹکڑا کا ٹکڑا ہے۔
پن کچھ اور بڑھ گیا ہے اور سنہری پھول پتیوں میں طوائف کی چمکیلی پسوانج کچھ اور نمایاں ہو گئی ہے۔ ٹکڑا
کا تضاد کچھ اور واضح ہو گیا ہے۔

ان دنوں میں مہاجر کیپ میں مہاجروں کا حوصلہ بندھانے کے لیے مقرر کی حیثیت سے نوکر تھا۔ یہ اور بات
کہ حوصلہ بندھانے کی بجائے میرا اپنا دل ڈوب ڈوب جاتا۔ ایک روز کیپ کے ایک ویران کونے میں جب میں
ہوئے دم کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا تو ایک چٹی سفید، شگفتگی اور تازگی سے بھرپور کشمیرن میرے روبرو
ہوئی۔

آنکھیں چمکا کر بولی۔ ”آپ ممتاز مفتی ہیں؟“
میں نے کہا۔ ”جی۔“

کہے گی۔ ”ہم نے آپ کی ”آپا“ پڑھی ہے۔“
میں نے کہا۔ ”جی بہت اچھا کیا آپ نے۔“

بولی۔ ”میں ساتھ والے کیپ میں ملازم ہوں، کبھی آئے اُدھر۔“
میں نے کہا۔ ”جی اچھا۔“

بولی ”میرا نام اشفاق احمد ہے۔“

اسے پہلی مرتبہ دیکھ کر مجھے ایسے لگا جیسے سرخ خواب پر سنہرے بیل بوٹے کڑھے ہوں۔ شاید آج بھی ان
کی نظر میں جو اسے سرسری طور پر جانتے ہیں، اشفاق احمد سرخ خواب پر سنہری پھل بوٹے ہی ہو۔ جیسے وہ پہلی نظر میں
کھائی دیا تھا۔

پھر اشفاق اور میں ملنے لگے۔

جوں جوں وہ مجھ سے قریب ہوتا گیا۔ توں توں کنو اب جو گیاناٹ میں بدلتا گیا لیکن سنہری پھل پتیوں کے
میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔

پھر جلد ہی مجھے اشفاق کے بھید کا پتہ چل گیا۔ اس ایک جسم میں دو شخصیتیں چھپی ہوئی تھیں۔ جو گیاناٹ
احمد تھا۔ سنہرے پھول بوٹے داستان گو تھا۔ مجھے اشفاق احمد سے محبت ہو گئی اور میں داستان گو سے کھلنے لگا۔ اس سے
کہ داستان گو میں سے طوائف جھانک رہی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ طوائف میری طوائف سے کہیں زیادہ بھڑکیلی تھی
نفی کر دیتی تھی۔

آپ سے کہہ دوں تو کیا حرج ہے کہ میری دانست میں ہر فنکار میں ایک طوائف ہوتی ہے۔ کسی میں مست
میں ادھ کھلی کسی میں نمایاں کسی میں تنگی مثلاً ابوالثر حفیظ میں بالکل تنگی ہے اور طفیل میں بالکل مستور ہے۔ شباب
کبھار لب بام آتی ہے اور اشفاق میں گھونگھٹ نکال کر سامنے بیٹھی رہتی ہے۔ بہر حال آج بھی اشفاق احمد یہ
دوست ہے لیکن داستان گو سے مجھے چڑ ہے۔

ان دنوں اشفاق اور میں روزانہ اوپن ایئر تھیٹر میں ملا کرتے تھے۔ اوپن ایئر تھیٹر ان دنوں زوہبی کے تھے
تھا۔ زوہبی ایک ابھرتا ہوا آرٹسٹ تھا، سنا ہے آج کل وہ کراچی کا رئیس ہے۔

زوہبی ایک خوش باش نوجوان تھا۔ کم گو تھا لیکن بات میں پھلجھڑی تھی۔ زمین تھا لیکن خدو خال ایسے تھے
منظر عام پر نہیں آتی تھی۔ رنگین تھا لیکن چہرے پر بے نیازی کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اتنے ڈھیر کہ جمود کا شہ
کی سب سے بڑی خصوصیت ایک پراسرار خصوصیت تھی جو غور و خوض کے باوجود میری سمجھ میں نہیں آتی تھی اور میں
ایک مستقل چیلنج بنی ہوئی تھی۔

زوہبی کی درمیانہ سی شکل و صورت، عام سی چال ڈھال اور عام سی بات چیت کے باوجود لڑکیاں، بچے
بیگمات سپردگی کے مفرد اور واحد جذبے سے سرشار، دور دور سے اپنے خرچ پر اوپن ایئر تھیٹر میں آتیں اور کسی
ملاقات کے بغیر دیوتا کی بھینٹ چڑھ کر خوشی خوشی واپس چلی جاتیں اور دیوتا مہاراج یوں نروان زدہ بیٹھ رہتے
بات ہی نہ ہو۔ جیسے بھینٹ لیانا کا پیدائشی حق ہو۔

اشفاق کے لیے یہ سب لانگ شاٹ تھے۔ داستان گو کے لیے صرف رنگین تفصیلات تھیں جو وہ اپنے
بھرتا رہتا تھا۔ اشفاق اور داستان گو دونوں کو جنس سے کوئی دلچسپی نہ تھی اور میں جو اپنے کو جنسیات کا طالب علم
کتابی مسائل میں بڑی دسترس رکھتا تھا، میرے لیے اوپن ایئر تھیٹر میں ہر نئی بھینٹ کی آمد ایک تھیٹر کی حیثیت
چونکہ مجھے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ سب کس اصول کے تحت ہو رہا ہے، اس عمل میں سبب کیا ہے، نتیجہ کیا ہے۔

چٹاخ..... میرے علمی زعم کے منہ پر تھیٹر پڑتا۔ داستان گو میری بے بسی پر بغلیں بجاتا۔ پٹاخ
پڑتا۔ اشفاق میرے قریب آ بیٹھتا اور اپنا جو گیاناٹ میرے گرد لپیٹ دیتا جیسے حقائق کی دیدہ دلیری کے خلاف
رہا ہو۔ دیدہ دلیر دیوتا حیرت سے ہماری طرف دیکھتا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ بات کیا ہے۔

پھر ماحول کی گھٹن دور کرنے کے لیے داستان گو میدان عمل میں آ جاتا اور سنہری باتوں کے غبار

تے۔ جاذب توجہ کلوز آپ۔ دل نشین تفصیلات، نقلیں، Mimics، قصے، کہانیاں، لوک کہتائیں حتیٰ کہ اوپن ایئر تھیٹر
تھیٹر بن جاتا جس میں قہقہے گونجتے، تالیں بجتیں اور دیوتا بھیٹ کا قصہ پس پشت پڑ جاتا۔

ان دنوں اشفاق احمد ایک لٹریچر جزیئرے میں رہتا تھا، جو رابنسن کروسو کے جزیئرے سے کہیں زیادہ ویران
تھا۔ اشفاق احمد کا یہ جزیئرہ ایک وسیع و عریض رستے بستے گھر کی دوسری منزل پر واقع تھا۔ چلی منزل میں میلہ لگا رہتا۔
چلتے، ہنڈول جھولتے۔ شور شرابا گونجتا۔ اوپر منزل میں ہوتی اور عظیم خلا کے تلے دبا ہوا سہا ہوا اشفاق احمد۔

اشفاق احمد کی کشادہ نیم چھتی میں چاروں طرف کتابوں کے انبار لگے ہوئے تھے۔ پتہ نہیں کہ کتابوں کے انبار
بہنے سے دل میں ایک بے نام عجز کیوں پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے نیم چھتی میں اکیلا اشفاق بیٹھا رہتا تھا۔
یاد وہاں دم گھٹتا تھا، لہذا اس نے وہاں کبھی قدم نہ رکھا تھا۔

اس جزیئرے میں آنے جانے کے بعد میں نے جانا کہ اشفاق صرف چپ اور دکھ ہی نہیں بلکہ وہ ازلی اکیلا
ہے۔ وہ بذات خود ایک جزیئرہ ہے جو کسی کشتی کو کنارے لگنے نہیں دیتا۔ جو نہیں چاہتا کہ کوئی اس کی وحدت
توڑے۔

سارا سارا دن وہ کتابوں کے انباروں تلے ڈھیروں جو گیاٹاٹوں میں لیٹا ہوا پڑا رہتا۔ پتہ نہیں اس بوجھل تنہائی
یا ناٹ کے ڈھیر کی وجہ سے یا جو گیارینگ کی وجہ سے، اس میں ایک عظیم اکتاہٹ بیدار ہو جاتی۔ ایک وحشت سی
گروہ سنہرے پھول بوٹوں والا چغڑا پہن لیتا۔ چغڑا پہنتے ہی طوائف جاگتی، چہرے کے زاویے اوپر کو ابھر
توتوں پر غمی تبسم آ جاتا اور وہ نیم چھتی کی سیزھیماں اتر کر چنگیاں، بجاتا ہوا لاہور کی بھیر میں جا داخل ہوتا۔

وہ اوپن ایئر تھیٹر یا کسی اور مقام پر جا پہنچتا۔ ڈگڈگی، بجاتا، گھنگھر و چھنکاٹا، مجمع لگاتا۔ تھیلے سے رنگین داستا
گھنٹاتا، آنکھیں چپکاتا، قہقہے لگاتا۔ خود نہ جتا مجمع کو مچھلتا۔ لیکن داستان کو گائیڈ اور زیادہ دیر نہیں چلتا تھا۔ اس
ویران جزیئرہ، وہی ہوتی، وہی جو گیاٹاٹ، وہی دکھ، وہی چپ، وہی تنہائی۔

اشفاق کی یہ دو شخصیتی زندگی سٹیونس کے ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیز کی طرح نہیں تھی۔ چونکہ اشفاق کی شخصیت
ہائیز کا عنصر سرے سے مفقود ہے۔ داستان کو طوائف کا شرف مجمع لگانے اور اپنے سنہرے پھول بوٹوں کی
بھیر میں بھرتی کرنے تک محدود ہے۔ یہ فن برائے فن شغل کسی مطلب یا مقصد سے بے نیاز ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اپنی اس تصنیف میں سٹیونس نے خیر اور شر کا سہارا لے کر انسانی شخصیت کے گونا گوں تضاد
کے جان چھڑانے کا اہتمام کیا ہے۔

اشفاق احمد میں چھپے ہوئے دونوں افراد ڈاکٹر جیکل تھے۔ ایک مٹی کی ہنڈیا کے مصداق تھا جس میں دکھ، چپ
کے کچھوے رنگ رہے تھے۔ دوسرا نقش و نگار سے سجا ہوا چاندنی کا سرپوش تھا جو ہنڈیا اور کچھووں کو چھپانے کے
لیے کوریوریشن پیس کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس زمانے میں اشفاق کی زندگی اس عورت کی طرح گزر رہی تھی جو سارا دن ننگے سر ننگے پیراں دھلا منہ اور ہن
لیے دھوپ میں بیٹھی ”ہونسیا پانے“ میں مصروف رہتی ہے اور شام کو سناگر کر کے پوجا پہن کے طوائف بن

جاتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ طوائف لینے دینے اور بکنے بکانے سے بے نیاز تھی۔

پتہ نہیں فنکار کی تخلیق میں قدرت کا تضاد کا آرا کیوں چلاتی ہے۔ بنیادی طور پر پانچ بنا کر پھر اسے اپنے
انگلیخت کیوں دیتی ہے۔ ازلی طور پر گونگا بنا کر پھر اسے باتوں کی پھلجھڑیاں چلانے پر کیوں اکساتی ہے۔ کسی نہ کسی طرح
کر پھر دکھ کے بادلوں کو کھرا کر بجلی کے قمقمے کیوں جلاتی ہے۔ پتہ نہیں قدرت ایسا کیوں کرتی ہے مگر وہ یقیناً ایسا کرتی ہے
اس زمانے میں اس ویران جزیرے میں تنہائی، دکھ اور چپ کے بنیادی رنگوں سے قدرت ایک فنکار کی تھی
رہی تھی۔

اشفاق احمد درحقیقت اشفاق احمد خاں ہے، وہ ذات کا پٹھان ہے لیکن اس کی شخصیت میں پٹھان کی کوئی
نہیں۔ ممکن ہے اس کی وجہ تبدیلی آب و ہوا ہو۔ اس کی تنہائی کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اس رستے بستے
چاروں طرف سے یوں پٹھانوں میں گھرا ہوا تھا جیسے کوئی شوردر براہمنوں میں گھرا ہوا ہو۔
اپنی مٹی میں پٹھان چند ایک واضح اور نمایاں خصوصیات کا حامل ہوتا ہے جو پٹھانیت کی شاہد ہوتی ہے۔
آب و ہوا بدل دیے جائیں تو پٹھان میں نئے جوہر پیدا ہوتے ہیں۔ نئی صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ تخلیقی دلوں
ہیں جو پٹھانیت کی دیگر مثبت خصوصیات کو دبا دیتے ہیں۔ غالباً اسی وجہ سے پٹھان ان پٹھانوں کو نہیں مانتے جو تبدیلی
ہوا کے مرتکب ہوتے ہیں اور انہیں اپنانے سے گریز کرتے ہیں۔

اشفاق احمد وہ پٹھان ہے جسے پٹھان پٹھان نہیں مانتے اور وہ خود بھی اپنی طبعی ناپٹھانیت کو تسلیم کرتے ہیں۔
تبدیلی آب و ہوا کی وجہ سے یا جانے کیوں اشفاق احمد میں کئی ایک ہفت رنگی عناصر پیدا ہو چکے تھے۔
شخصیت میں ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ ایک جنادھاری سادھو رکھ رکھاؤ سے سرشار ایک صوفی خودنمائی سے بھرپور
طوائف، پتھر کا بنا ہوا ایک دیوتا۔ دوسروں کو نصیحتیں کرنے پر پھبتیاں کہنے والا تلقین شاہ، سن کر جذب کر لینے والا
کان۔ ایک صف میں کھڑا ہونے والا محمود، چھوٹ چھات کا متوالا کشمیری پنڈت۔ مشینوں سے کھیلنے والا ایک
پُرتوں کو ذی روح جاننے والا ایک بدھ پجاری۔ مدہم محبت سے سرشار مگر نہ دھڑکنے والا ایک دل پیسے پر
والا ایک بنیا، لٹیا لندھانے والا ایک غنی۔ دے کر کبھی نہ بھولنے والی ایک معمر عورت اور نہ جانے کیا کیا۔
صلاحیت نہیں کہ ایک رنگارنگ ہفت رنگی شخصیت کا احاطہ کر سکوں۔

دور حاضر کے جانے پہچانے شخصیت نگار محمد طفیل کی طرح میں الفاظ میں شخصیت کی تمیر نہیں کر سکتا
تجزیے کی قبینچی سے کاٹ پیٹ کر کے شخصیت کے بنیادی عناصر کی نشاندہی کر سکتا ہوں۔ محمد طفیل انسانی شخصیت کے
(Jig Saw) ٹکڑوں کو بڑی محبت بڑے صبر و تحمل سے جوڑتا ہے۔ مجھ میں محمد طفیل سا صبر نہیں، تحمل نہیں۔ محاسن نہیں
رنگین بیانی نہیں۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ محمد طفیل نے آج تک اشفاق احمد کی شخصیت پیش کرنے سے بخل کیوں فرمایا ہے۔
منہ بند حاضر رہے لیکن وہ بخیل نہیں۔ شاید اس کی وجہ اشفاق خود ہو جو کسی کشتی کو اپنے کنارے لگنے نہیں دیتا۔ یا شاید
وجہ سنہرے پسواں والی طوائف ہو جو چاروں طرف گھوم پھر کر اشفاق احمد کے خلاف پروپیگنڈہ کرتی پھرتی ہے۔

یقینی ہے کہ مولانا محمد طفیل کا اسلام ابھی خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلا، اس لیے وہ ابھی گھنگھرو کی آواز کے سن سکیں ہو پائے جیسی تو وہ اپنی طوائف کو سات پردوں میں ملفوف رکھتے ہیں۔

اشفاق احمد کے والد ایک عظیم شخصیت تھے۔ اتنی عظیم کہ انہوں نے خان منزل کے تمام افراد کو کبڑا بنا رکھا تھا۔ وجہ سے گھر میں بالشتیوں کی بھڑنگی ہوتی تھی۔ جب یہ گلیور گھر پر ہوتا تو کسی کودم مارنے کی اجازت نہ ہوتی۔ جب وہ باہر ہوتا تو گھر میں دھما چوڑی مچ جاتی لیکن ان کی بیگم اس سوچ میں کھوئی رہتیں کہ عجز و ادب اور احترام کا کون سا عیب ایجاد کیا جائے جس کی مدد سے ظل الہی کو ڈھب پر لایا جاسکے۔

خان منزل میں صرف پٹھان خصوصیات کی قدر و منزلت تھی۔ چونکہ اشفاق ان خصوصیات سے محروم تھا، لہذا اس میں وہ سب سے چھوٹا بالشتیا تھا۔ چونکہ ازلی گونگا تھا اس لیے متکلم احتجاج نہیں کر سکتا تھا۔ یوں اشفاق احمد کی ادبکی تہوں کی طرح ایک طوفان اکٹھا ہوتا رہا۔ اسی عرصہ دراز سے دبے ہوئے طوفان کی وجہ سے اشفاق احمد آج بھی کسی گلیور کی عین تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ کسی لحاظ سے کسی پہلو سے اپنے کو بالشتیا سمجھنے یا ماننے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اشفاق احمد کی عظمت کا خود تذکرہ نہیں کرے گا لیکن اس کا جی چاہے گا دوسرا کرے۔ دوسرا کرے تو اشفاق احمد کے چہرے کی چلنی شروع ہو جائیں گی۔ چہرے کے زاویے اوپر کو ابھریں گے۔ آنکھوں میں نرمگی مکان کی چمک ظاہر ہوگی۔ دوسرے فنکار کی عظمت کی بات چھڑ جائے تو وہ اسے کانٹے کانٹیں لیکن آپ کی ہاں میں ہاں بھی نہیں ملائے گا۔ اشفاق احمد کی شخصیت کے بنیادی سادھوپن سے مجھے انکار نہیں لیکن اس کی فنکارانہ خاموشی کے گھونگھٹ میں چھپے رہنے کی ضرورت کچھ زیادہ ہی طوطا چشم ہے۔ ہاں وہ فنکارانہ عجز سے کورا ہے۔

اس جزیرے کی بو جھل تہائی میں اشفاق احمد نے جو اظہار کا پہلا طریقہ آزمایا، وہ مصوری تھا۔ اس کا مصوری کی شکل ہونا غالباً زوبی سے میل ملاپ کی وجہ سے تھا۔

ویسے تو میں نے اشفاق کے بنائے ہوئے کئی ایک مکمل اور ادھورے عمل دیکھے تھے لیکن دو عمل مجھے خصوصی طور پر متاثر کیا ہے۔ ایک اس لیے کہ وہ دونوں میرے مضمون یعنی جنس سے متعلق تھے۔

اشفاق کے پہلے عمل کا نام دی کال بل (The Call Bell) تھا۔ تصویر میں نسائی جسم کا وہ برقی بٹن دکھایا گیا ہے جس سے محترمہ احترام کے پردے چاک کر کے باہر نکل آتی ہے۔ تصویر کو دیکھ کر ایسے لگتا تھا جیسے باہر آنے والی محترمہ حقیقت ایک جن ہو جسے نسائی بوتل میں قید کر رکھا ہو۔ عمل کی عظمت یہ تھی کہ تصویر میں ایک نظر میں محترمہ دکھائی دے اور دوسری نظر میں جن۔

دوسری تصویر کا کوئی نام نہ تھا۔ ہوتا تو The Phallic Woman ہوتا۔ یہ تصویر بھی عورت ہی کی تھی جو اپنے جسم کی مٹکی عریانہ منظر عام پر کندھوں پر اٹھائے پھرتی تھی اور صرف اٹھائے ہی نہیں پھرتی تھی بلکہ اسے چھلکانی عمل کی خوبی یہ تھی کہ ایک نگاہ میں وہ جھنگی نظر آتی تھی اور دوسری نگاہ میں معصومیت میں ملفوف جیسے جانتے نہیں۔

پتہ نہیں اشفاق احمد نے جنس کے موضوع کو عمل نگاری میں کیوں اپنایا اور اگر اپنایا تھا تو اسے کیوں چھوڑ دیا۔ ایک نئی شکل پر یقینی ہے کہ اشفاق احمد اور داستان گو دونوں کو جنس سے کوئی لگاؤ نہیں۔ دونوں کو جنس صرف اسی صورت میں

گوارا ہے جب وہ جذبے کے سینڈوچ میں چھپا ہوا ہو۔

میری دانست میں جنس کے اس لحاظ سے مردوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ جو جذبے کے درپچہ کھولنے کے بغیر جنس کے ایوان میں چہل قدمی کے شوقین ہیں۔ دوسرے وہ جن میں جنس کی وجہ سے جذبے کے کھل جاتا ہے اور تیسرے وہ جن میں جذبے کی وجہ سے جنس کی کھڑکی نیم وا ہو جاتی ہے۔ اشفاق احمد ازیلی طور پر تیسرے قسم سے تعلق رکھتا ہے۔

۹ دنوں اشفاق احمد کی آرزو تھی کہ حسین اور طرح دار لڑکیوں کو باتوں کے جال بن کر اپنی طرف متوجہ کرے کہ وہ اثر سے بھیگ جائیں۔ متوجہ اور متاثر کر لیتا تو پھر گھبراہٹ اور خوف طاری ہو جاتے۔ ”اب کیا ہوگا۔“ ”اب کیا ہوگا“ کے متعلق اس کا ذہن بے خبر نہ تھا لیکن دل تیار نہ تھا، لہذا ”اب کیا ہوگا“ کے خوف سے وہ بھاگ لیتا۔ اٹنے سے بھاگ لیتا۔

دراصل اشفاق کی خواہش یہ تھی کہ لڑکی اس کی داستانوں کے جال میں پھنسے۔ اثر سے بھیگ جائے۔ اس قدر بھیگ جائے کہ اس میں حرکت کی طاقت نہ رہے۔ دور کھڑی رہ کر بات کرے۔ محفوظ فاصلہ قائم رکھے تاکہ ”اب کیا ہوگا“ کا خطرہ پیدا نہ ہو۔

لیکن آپ جانتے ہیں کہ نسائی نفسیت کے مطابق فاصلے محفوظ نہیں ہوتے قرب محفوظ ہوتا ہے، لہذا وہ اس حفاظت کے لیے آگے بڑھنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس اشفاق احمد کے لیے پیچھے ہٹنا محفوظ تھا، لہذا بار بار وہ پیچھے ہٹا۔ اٹنے پاؤں بھاگا، ہونکتا ہوا اپنے جزیرے میں پہنچا۔ بارہا اس نے خطرے کے مقام پر باتوں کے جال بننے سے متنبہ لیکن باتوں کے جال بننے کی عادت اس کی ہڈیوں میں رچی ہوئی تھی، لہذا بارہا تو بے ٹوٹی۔ بارہا وہ اٹنے پاؤں بھاگا۔ ہونکتا ہوا اپنے جزیرے میں پہنچا۔ جب گورنمنٹ کالج کے میدان میں وہ محترمہ منظر خاص پر آ گئی۔

وہ محترمہ بڑی چتر کارتھی۔ اس کی آنکھ میں دو دھاری نگاہ تھی۔ اندر سے قدیم تھی، اوپر سے جدید۔ اوڑھ رکھا تھا۔ اندر پرانا مشرقی رنگ تھا اوپر ڈھمپڑ تھا یعنی دروپدی کے سونے پر گیشیا کا ملمع چڑھا ہوا تھا۔ وہ محترمہ متاثر کرنے کی بجائے متاثر کی چتر کاری سے واقف تھی اور متاثر ہو کر آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹنے کی عادت تھی۔ وہ محترمہ ان مشرقی خواتین میں سے جو پیچھے ہٹنے والے کو پہچان لیتی ہیں اور خود پیچھے ہٹ کر اسے پیچھے ہٹنے کی ندامت سے بچا لیتی ہیں۔

وہ محترمہ اشفاق احمد کی باتوں کے جال میں پھنس گئی۔ تاثر سے بھیگ گئی اور پھر آگے بڑھنے کی بجائے پیچھے ہٹے۔ اشفاق احمد کے لیے یہ ایک نیا تجربہ تھا، وہ اسے پیچھے ہٹتے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ اب کیا ہوگا کے خوف سے ہو کر پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے بڑھنے لگا اور آگے۔ اشفاق کے لیے یہ ایک نیا اور انجانا مشاہدہ تھا جس میں آگے بڑھنے کی لذت موجود تھی لیکن فاصلہ کم ہونے کا ڈر نہ تھا۔ آگے بڑھتے بڑھتے وہ اس مقام پر جا پہنچا جہاں سے واپسی ممکن نہیں تھی۔ اشفاق احمد نے برش اور رنگ کو کیوں الماری میں بند کر دیا اور ان کی جگہ قلم کو کیوں اپنایا۔ مجھے اس کا محسوس حالانکہ عمل معانی اور تکنیک کے لحاظ سے کامیاب تھے۔ اصولی طور پر تو اشفاق کو موسیقار ہونا چاہیے تھا کیونکہ اس کے

سیٹار نہ بننے کی وجہ شاید یہ ہو کہ اسے انسانی کردار کے گونا گوں روپ سے بے پناہ دلچسپی ہے۔ اس لیے خالی آواز زیرو سے نہ کر سکا۔

قلم اٹھاتے ہی تفصیلات نے اسے چاروں طرف سے آگھیرا۔ وہ تفصیلات جن کے بل بوتے پر داستان گو مجمع کرتا داستان گو نے اپنے تھیلے سے گلوزاپ کے رول کے رول نکال کر باہر رکھ دیئے۔ اشفاق احمد نے ان بھڑکیلی تفصیلات کو اپنے میں چھان لیا۔ بے نام دکھ اور چپ کی چاشنی کی وجہ سے ان میں ادبی رنگ پیدا ہو گیا اور اشفاق احمد افسانہ نویس بن گیا۔ اگرچہ اس کا سہرا اس گونگے اکیلے دکھ کے پٹارے اشفاق احمد کے سر پر تھا لیکن تفصیلات تو داستان گو کی تھیں، داستان گو نے لپک کر اپنے سر پر لگا لیا۔

اس زمانے میں اشفاق احمد کو کچھ کرنے کا شوق تھا، کر دکھانے کا نہیں۔ آج کل اسے کچھ کرنے کا شوق بھی تھا۔ گھر کا بھی چونکہ وہ شو بزنس میں کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ اس کے باوجود بنیادی طور پر وہ ایک مزدور ہے، وہ کدال چلا سکتا ہے۔ بیج بوسکتا ہے، فصل اگا سکتا ہے۔ اسے یہ تمنا ہے کہ فصل کو دیکھ کر لوگ واہ واہ کہتے کہ کیسے اچھے بوٹے ہیں لیکن فصل بٹ نہیں سکتا۔ وہ اپنے فن کی گڈول (Good Will) پیدا کرنے کا متمنی ہے لیکن اس گڈول کو کیش کرانے کا اہل نہیں۔ ادبی دنیا میں ابھی مقام پیدا ہی نہیں ہوا تھا کہ اشفاق احمد کو دنیاوی مصائب نے آگھیرا۔ ان مصائب کی تمام تر جہد ایک فرائی ڈے تھی۔ جزیرے کے رائسن کرو سونے اس فرائی ڈے کو اپنا لیا۔ اس کا یہ فعل اس ویران اور تنہائی زدہ جزیرے کا اپمان تھا، لہذا جزیرے نے اشفاق احمد کو اگل دیا اور وہ دنیاوی مصائب کے طوفان زدہ پانیوں میں ڈبکیاں کھانے لگا۔

اب رائسن کرو اور فرائی ڈے کو کسی چھت تلے سر چھپانا تھا، چولہا جلانے کا اہتمام کرنا تھا۔ دو وقت کی روٹی سیر کرنا تھا، لہذا اشفاق احمد سکرپٹ رائٹر بن گیا۔ خوش قسمتی سے یہ فرائی ڈے وہ محترمہ تھی جو پیچھے ہٹنے والے کو آگے بڑھنے کی شہمتی دے سکتی تھی جو بہتر نصف کا بوجھ بننے کے بجائے شوہر کا ساتھ دے سکتی تھی، لہذا دونوں میاں بیوی نے اپنے اپنے تمام کاموں پر اٹکائے، ہاتھوں میں کاغذ کی سلپیں تھامیں اور لاہور کے گلی بازار میں پھیری لگانے لگے۔ چلو بھی کوئی سکرپٹ لکھو۔ چلو بھی کوئی سکرپٹ لکھو۔

عرصہ دراز تک اشفاق احمد کے گھر میں تمام حساب کتاب سکرپٹوں کا ہوتا رہا۔ گرا یہ مکان چار سکرپٹ۔ بھتی خانے کا خرچ آٹھ سکرپٹ، لین دین ایک سکرپٹ، علاج معالجہ آدھا سکرپٹ۔ آج بھی اشفاق کی بیگم سے پوچھو کہ یہ ساڑھی کتنے میں لی تھی تو وہ جواب دے گی، اچھی طرح سے یاد نہیں شاید ایک سکرپٹ لگا تھا یا ڈیڑھ۔

بانو قدسیہ کی آمد کے بعد اشفاق احمد کے گھر میں دکھ کے ڈھیر لگ گئے۔ یہ دنیاوی دکھ نہ تھے چونکہ اشفاق احمد میانی پر کامیابی حاصل کیے جا رہا تھا۔ یہ دکھ ازدواجی بھی نہیں تھے۔ چونکہ اشفاق کو بانو سے محبت تھی اور بانو صرف اشفاق کے لیے جیتی تھی۔ دکھ کے ان ڈھیروں کی وجہ صرف یہ تھی کہ بانو اشفاق کے دکھ کو بانٹنے پر مصر تھی لیکن یہ نقطہ وضاحت طلب ہے۔ اس سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ ایک لحاظ سے بانو کا اشفاق سے تعلق کچھ ایسا ہے جیسے حبیب کا تعلق اپنے بڑے بھائی سے ہے۔

میرے دوست قدرت اللہ شہاب جو دکھتے نہیں لیکن دیکھتے ہیں۔ ایک روز مجھ سے کہنے لگے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں بہت مہربان ہیں۔ میں نے کہا، وہ کیسے؟ بولے انہوں نے میرے تحفظ کا ایک انوکھا انتظام کر رکھا ہے۔ میں نے پوچھا کیا؟ بولے میرے حصے کے سارے دکھ میرے چھوٹے بھائی حبیب کو منتقل کر دیئے جاتے ہیں اور حبیب کی ساری خوشی مجھے منتقل کر دی جاتی ہے۔ میں نے کہا، مطلب کیا ہوا؟ کہنے لگا کتنا مجھ کو چھتا ہے۔ درد حبیب کو ہوتا ہے۔ قبضہ حبیب ہے، خوشی مجھے منتقل ہو جاتی ہے۔ اس کی صرف باچھیں دُکھنے لگتی ہیں۔ میں نے کہا، کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ بولے ہاں ہے۔ ہو رہا ہے۔ میں نے کہا، میں نہیں مانتا۔

کچھ عرصہ بعد قدرت اللہ شہاب کی آسامی کے متعلق راولپنڈی میں شدید گڑبگڑ ہو گئی۔ حبیب کراچی میں تھا۔ اسے اس گڑبگڑ کا علم نہ تھا۔ شام کو حبیب کا فون آیا۔ کہنے لگا وہاں کوئی گڑبگڑ تو نہیں۔ میں نے کہا بالکل نہیں۔ بولا میرا دل کھتا ہے کہ ہے۔ میں نے کہا، تیرا دل تو دیوانہ ہے۔ بولا وہ تو ہے لیکن بکار خویش، شیار ہے۔ میں نے کہا فضول باتیں۔ قدرت اللہ پنڈی آ جاؤں؟ میں نے کہا، ضرورت بھی ہو۔ بولا تمہیں یقین ہے کوئی گڑبگڑ نہیں۔ میں نے کہا بالکل۔ اگر میری ساری یقین نہ ہو تو شہاب سے پوچھ لو۔ شہاب نے فون پر آ کر کہا، یہاں بالکل خیریت ہے۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ شام سے سو جاؤ۔

اگلے روز صبح سویرے حبیب نائٹ کوچ سے پنڈی آ پہنچا۔ کہنے لگا تمہاری تسلیوں کے باوجود مجھے چین نہیں تھا۔ دل کہتا تھا ضرور یہاں گڑبگڑ ہے اور قدرت تکلیف میں ہے۔ اس لیے میں کراچی ادھار لے کر چلا آیا۔ اس روز مجھے پتہ چلا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کتنا کسی کو چھپے اور درد کسی اور کو ہو۔

اگر کتنا اشفاق کو صرف چھتا اور دکھ صرف بانو کو ہوتا، اشفاق کو نہیں یا دکھ اشفاق کو ہوتا اور بانو اسے ہاتھ سے اک بات ہوتی لیکن اشفاق کا دکھ کانٹوں سے بے نیاز ہے۔ اسے اس بات پر دکھ ہے کہ اسے کوئی دکھ نہیں۔ اس کا دل وجہ ہے۔ بے مقصد ہے، ازلی ہے، ازلی دکھ کو کوئی بانٹ نہیں سکتا۔ وہ ایک کنوئیل کی طرح ہے۔ بانو چاہے ڈول چلا کر نکالتی چلی جائے کنواں جوں کا توں بھرا کا بھرا رہے گا۔ بانو اپنی طبیعت سے مجبور ہے۔ دکھ بانٹنے کے لیے وہ ڈول چلا کر نکالتی رہتی ہے۔ اشفاق اپنی اصلیت کی وجہ سے مجبور ہے۔ اس کا کنواں بھرا کا بھرا ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ گھر میں بے مقصد بے معنی دکھ کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ آپ جانتے ہی ہیں کہ بے معنی ہو تو دکھ کی دھارا اور بھی تیز ہو جاتی ہے۔

کئی ایک برس اشفاق اور بانو کے وقت لاہور کے بازاروں میں سکرپٹ لکھوا لو کی پھیری لگاتے رہے۔ رات کو قلم کے پھاؤڑے چلاتے رہے۔ آج وہ پھیری نہیں لگاتے لیکن قلم کا پھاؤڑا پہلے کی نسبت کہیں زیادہ چلاتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ان کے گھر چلے جاؤ تو یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ نشیوں کا گھر ہے۔ وہ تو فارغ البال میزبانوں کا گھر ہے۔ یہ آج کی بات نہیں اس زمانے میں بھی وہ فارغ البال میزبانوں کا گھر لگتا تھا جب چولہا جلانے رکھنے کا مستحق پیش تھا۔ دوسری حیران کن بات یہ ہے کہ اشفاق اور بانو دونوں کے سکرپٹوں سے کبھی مشقت کے سینے کی بو نہیں آتی۔ اسی زمانے میں داستان گو کو شرارت سوجھی۔ اس نے اشفاق احمد میں چھپے ہوئے اس ٹھگنے بالشتیے کو کھینچا جسے اشفاق کے بچپن میں کسی گلیور نے تخلیق کیا تھا اور جو جذبہ انتقام سے اندر ہی اندر اب تک سلگ رہا تھا۔

دراصل اشفاق کو غصہ نہیں آتا۔ وہ بھڑک کر جلنے کی لذت سے محروم ہے۔ وہ چڑتا ہے، بل کھاتا ہے، سلگتا ہے۔ سلگنے کا دوسرے کی ناک میں دھواں دیتا رہتا ہے۔ آپ کوئی بات کہہ دیں تو وہ چپ ہو جائے گا، جواب نہیں دے گا۔ یہ اس کے اندر چڑچڑانے بھنتے رہیں گے۔ کئی بار یہ چیز اس قدر شدید ہو جاتی ہے کہ اس کا گھر بھٹیاریان کی کڑھائی بن کر رہتا ہے۔

ہاں تو داستان گونے اس ٹھکنے کی چڑ کو جگا دیا۔ اشفاق کے روبرو ایک گلیور آکھڑا ہوا۔ ایک ایسا گلیور جو دوسروں سے مختلف کرنے کا متوالا تھا۔ اشفاق نے قلم سنبھالا اور دوسروں کو تلقین کرنے والوں کا بھانڈا پھوڑنا شروع کر دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صاحب تلقین شاہ صاحب عالم وجود میں آ گئے۔

تلقین شاہ ایک عظیم کردار ہے، ایک روایتی گلیور۔ لوگوں نے تلقین شاہ کو سنا تو بھونچکے رہ گئے۔ ہر کسی کے دل کی گہرائیوں سے چھپے ہوئے ہاشیہ نے سر نکالا اور لوگوں کو تلقین کرنے والے اس گلیور پر تالیاں بجانے لگا جس نے اسے کھینچ لیا تھا۔ ہم سب میں ایک نہ ایک ہاشتیا موجود ہے جس کا وجود کسی ناکسی تلقین شاہ کا مرہون منٹ ہے۔

تلقین شاہ کی آمد پر بہت سے بھرے ہوئے پھوڑے پھوٹ گئے۔ دلوں میں تپتے ہوئے تپتے و تاب ڈھیلے پڑ گئے۔ دے ہوئے غصے تمسخر کی صورت میں نکلنے لگے۔ انتقام کے جذبات ترس میں بدل گئے۔ پند و نصیحت کا بھانڈا چورا ہے۔ پھوٹ گیا۔ تلقین شاہ ایک عظیم کردار ہی نہیں۔ وہ ایک سائیکل ایسٹ (Psychiatrist) بھی ہے۔ ایک عظیم ڈاکٹر جس نے کبڑوں کو سیدھا کر دیا۔ ہاشتیاؤں کو قد و قامت عطا کیے، گوگلوں کو زبان بخشی۔ دلوں میں پڑی ہوئی گہروں کو کھول دیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے بتوں کو توڑ دیا۔

لوگوں نے فرط محبت سے اس بت شکن کو آنکھوں پر بٹھالیا اور اشفاق احمد ہکا بکا رہ گیا۔ اسے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ عوام آنکھوں پر بٹھالیں تو آسمان کے تارے قدموں میں آگرتے ہیں۔ اسے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ شہرت کا مفہوم کیا ہے۔

ریڈیو کے پروگرام میں ایک رات تلقین شاہ نے ہدایت اللہ سے کہا کہ وہ کہیں سے مالٹوں کے چھلکے اکٹھے کر کے صاحب کے مکان کے دروازے پر ڈھیر کر دے تاکہ محلے والے سمجھیں کہ شاہ صاحب کے گھر میں پھل اس کثرت سے کھائے جاتے ہیں تاکہ محلے میں ان کی ساکھ پیدا ہو۔

اگلی صبح اشفاق احمد کے مکان کے صدر دروازے پر مالٹے کے چھلکوں کا ایک بہت بڑا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ پتہ نہیں اشفاق کے شیدا بیوں نے رات کے اندھیرے میں مالٹے کے اتنے سارے چھلکے کہاں کہاں سے چن کر اکٹھے کیے تھے۔

اشفاق احمد کے مالک مکان نے جان بوجھ کر وائٹ ٹیکس ادا نہ کیا تاکہ ٹل کٹ جائے اور اشفاق احمد مکان خالی کر دے تاکہ مکان زیادہ کرائے پر لگ سکے۔ ٹل کاٹنے کے لیے دولائن مین آگئے۔ ہم نے انہیں بہت سمجھایا کہ میاں جلد پڑی سے کام نہ لو۔ کچھ مہلت دو لیکن وہ نہ مانے۔ جب دلیل سے کام نہ چلا تو ہم نے ان کی منتیں کیں۔ پھر بھی وہ نہ مانے۔ اس اثنا میں اشفاق آ گیا۔ اس نے صورت حالات کا جائزہ لیا اور معاملہ بھانپ لیا۔ پھر وہ لائن مینوں سے تلقین شاہی زبان میں بولا۔ ہاں کاٹ دو۔ اس ٹل کو فوراً کاٹ دو۔ جو نہ کاٹا گیا تو یہ خدشہ لگا رہے گا کہ کسی روز ہم چلو بھر پانی میں ڈوب

میں۔ شاہ کی آواز سن کر لائن مینوں کے ہاتھ رک گئے۔ بولے شاہ جی..... آپ؟ تلقین شاہ بولا، ہاں ہاں بھئی یہ ہے ہی تو ہے۔ لائن مینوں نے جھک کر تلقین شاہ کو فرشی سلام کیا اور کہنے لگے، شاہ جی معاف کرنا ہمیں پتہ نہ تھا۔ چاہے سب سے واٹرنیکس ادا نہ ہو، پر شاہ جی کاٹل نہیں کئے گا، کبھی نہیں۔

نیکس والوں نے اشفاق کو دفتر میں حاضر ہونے کا حکم دیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ نیکس کم ادا کیا گیا ہے۔ حساب کتاب پیش کیا جائے۔ دفتر میں حاضر ہو کر اشفاق نے دیا رگڑا۔ تلقین شاہ حاضر ہو گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حساب کتاب دکھانے اور نیا نیکس ادا کرنے کے بجائے ادا شدہ نیکس میں چھوٹ کے فارم بھر کر اشفاق گھر آ گیا۔

تلقین شاہ کی آمد نے اشفاق احمد کی زندگی کو سوتے جاگتے کا قصہ بنا دیا۔ اشفاق احمد، ابوالحسن تھا۔ تلقین شاہ جی الہی تھا۔ ابوالحسن کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ ظل الہی کو دیکھ کر لوگ ادب، احترام اور محبت سے سر جھکا لیتے تھے۔

پہلے پہل اشفاق احمد کو بہت غصہ آتا تھا۔ بھٹیاریں کی کڑاہی میں چڑچڑانے بھتنے۔ وہ کہتا یا رول کی گروہی ہے۔ تلقین شاہ کو تخلیق کرنے والے کو کوئی نہیں پوچھتا۔ تلقین شاہ پیش کرنے والے آرٹسٹ پر لوگ جانتے ہیں۔ وہ تو شکر ہے تلقین شاہ کا پارٹ ادا کرنے والا آرٹسٹ خود اشفاق احمد تھا اور نہ کوئی اور ہوتا تو یا تو اشفاق احمد تھیں۔ گلا گھونٹ دیتا اور یا آپ خود کھی کر لیتا۔

اپنی تخلیق میں وہ کسی دوسرے فرد کو کریڈٹ کا حصہ دار ماننے کے لیے تیار نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ تمام تر کام لکھنے والے کا حصہ ہے۔ آپ اس سے کہیں یا رتہ ہارے فلاں ٹی وی کھیل میں فلاح شخص نے بہت عمدہ رول کیا۔ اسے ناگوار گزرے گی۔ فوراً جواب دے گا، ہاں یا ر اچھا خاصا کام کیا۔ بڑی ڈھونڈ کے بعد یہ لڑکا تلاش کیا تھا، اسے آ یا تو بالکل ہی کچا نکلا۔ اس پر بڑی محنت کرنی پڑی، خیر نبھا گیا۔

کریڈٹ بانٹنے میں اشفاق احمد ایک بنیا ہے۔ ایسا بنیا جو لیتے وقت دو اور دو پانچ گنتا ہے اور دیتے وقت دو تین لیکن نہیں یہ مثال ٹھیک نہیں بیٹھتی چونکہ یہ بنیادینے کا سرے سے قائل ہی نہیں۔

تلقین شاہ کی تخلیق میں اشفاق احمد کا کمال یہ ہے کہ اس نے کبھی اس پند و نصیحت کے جال بننے والے کا حصہ شیدائی پر پھینکی نہیں کسی۔ اسے من نہ کر دم شام حذر بکند کا طعنہ نہیں دیا۔ دوسروں کو کبڑا بنانے کی سعی پیہم پر کبھی غصے کا اظہار نہیں کیا۔ الٹا وہ شاہ صاحب کی عظمت کو اجاگر کرتا رہتا ہے اور اس حد تک اجاگر کرتا ہے کہ شاہ صاحب کا باشندی ہر وقت منظر عام پر آ جاتا ہے۔ یہی اشفاق احمد کے فن کا کمال ہے۔

تلقین شاہ میں اشفاق احمد نے اپنے بچپن کا کردار بھی پیش کیا ہے۔ جب وہ حقیقی شاہ صاحب کے ساتھ ہدایت اللہ تھا۔

بنیادی طور پر اشفاق احمد آج بھی وہی ہدایت اللہ ہے۔ اگر وہ بظاہر ایسا نہیں دکھتا تو اس کی وجہ صرف کامیابی کی شہرت کی وہ شہ نشین ہے جس پر وہ آلتی پالتی مارے داستان گو بن کر بیٹھا رہتا ہے۔

اشفاق احمد میں تحمل ہے، رواداری ہے، عجز ہے، مٹھاس ہے اور مدہم محبت کا بے پناہ 'نگ' ہے جسے میں گرامٹس کہا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ایسا محبت کرنے والا غیر تلقین شاہی باپ ہے کہ اس کے تینوں بیٹے کبھی کبھی

کے بن گئے ہیں۔ وہ ایک پیارا دوست ہے۔ بظاہر نرم لیکن بڑا سخت گیر افسر ہے۔ ایسا جی حضور یہ ماتحت ہے جو کام اپنی سی سے کرتا ہے لیکن اپنی مسلسل جی حضوری سے افسر کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتا ہے کہ کام اس کی مرضی کے عین عین کیا جا رہا ہے۔

اشفاق احمد ایک آئیڈیل خاوند ہے۔ اس کے باوجود اگر بانو کو اس سے کوئی شکایت ہے تو یہ بانو کا اپنا قصور ہے جس کی تمام تر ذمہ داری خود بانو پر عائد ہوتی ہے۔ بانو کا قصور یہ ہے کہ وہ خالی بیوی ہی نہیں بلکہ ایک فنکار بھی ہے اور فنکار ہی نہیں بلکہ ایک بڑی فنکار ہے۔ داستان گو کسی بڑے فن کار کو لفت دینے کا عادی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اشفاق احمد نے آج تک ادبی ریڈیائیائی وی کے انٹرویو کے علاوہ بانو کو بحیثیت فنکار کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اگر آپ بانو کی شخصیت کے متعلق اشفاق سے بات کریں تو یقیناً وہ کہے گا ہاں اچھا لکھتی ہے لیکن یار بڑی مغز ماری کے بعد اسے اس مقام پر پہنچا۔ پھر بھی اتنی ناشکر گزار ہے کہ میرے فقرے تک چراتی ہے۔

اشفاق کی بیوی ہونے کی حیثیت سے بانو میں دو بڑے عیب ہیں۔ ایک تو وہ بڑی فنکار ہے اور دوسرے وہ محبت سے ہے اور اس کی محبت کا شیر اتنا گاڑھا ہے کہ اشفاق ہر وقت یوں بیٹھ رہتا ہے جیسے کوئی بھینس راب کے چھپر میں پھنسی ہو۔

اشفاق کو اپنے رنگ میں دیکھنا ہو تو اس وقت دیکھیے جب وہ کچھ بنیان پہنے دھوپ میں بیٹھا کچھ کھاتی رہا ہے اس وقت اسے احساس بھی نہیں ہوتا کہ لوگ اسے دیکھ رہے ہیں۔ دیکھ رہے ہیں تو پڑے دیکھیں۔ اس وقت کا کچھ بچپنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس وقت یوں لگتا ہے جیسے مینڈک جو ہڑ میں آ پہنچا ہو۔ اس وقت بانو بھی قابل یہ ہوتی ہے۔ اس کی خوشی سمیٹے نہیں سہتی۔ یوں لگتا ہے کہ ایک طرف ڈالڈا ہی ڈالڈا ہوتا ہے اور دوسری طرف مٹا ہی مٹا۔

اشفاق احمد بلا کا خوش خور ہے۔ صرف اچھی چیز کھاتا ہے لیکن چیز اچھی ہو تو بہت کھاتا ہے اور اس اشتیاق سے کھاتا ہے کہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ پھان ہے۔

اشفاق احمد کو مشینوں سے محبت ہے۔ وہ انہیں ذی روح سمجھتا ہے اور مہاتما بدھ کی طرح ان کا احترام کرتا ہے۔ گھر کو دیکھ کر وہ ہمیشہ احتجاجاً چیختا چلاتا ہے۔ ”ظالمو تم اس ننھی سی جان کا خیال نہیں رکھتے۔ تمہیں کیا پتہ کہ ایک چھوٹا ننھی اپنی نازک سی جان کے بل بوتے پر لوہے کے اتنے بڑے کھر کھرے کو دکھیل کر چلاتا ہے۔ اس ننھی جان کا کچھ خیال رکھا کرو۔“ اشفاق کے گھر میں طرح طرح کی مشینیں اور قسم قسم کے گچٹ پڑے ہیں۔ چاہے اس کی جیب میں پینے کے لیے نہ ہو۔ پھر بھی کباڑیے کی دکان پر نیا گچٹ دیکھ کر وہ اسے خریدے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ چاہے اس کے لیے سے ہاتھ کی رہن رکھنی پڑے۔

گھر میں اشفاق احمد کی سب چیزیں کھلی پڑی رہتی ہیں جنہیں بچے آزادانہ استعمال کر سکتے ہیں۔ ماسوا اس کی مشینوں اور گچٹوں کو ہاتھ لگانے کی کسی کو اجازت نہیں۔ فارغ وقت میں اشفاق احمد ان مشینوں کو باہر نکالتا ہے۔ بڑے پیار سے صاف کرتا ہے۔ تیل لگاتا ہے۔ گریس لگاتا ہے یعنی در پردہ اپنے ان کھلونوں سے کھیلتا ہے۔ کھیلنے کے بعد وہ مقفل کر

دی جاتی ہیں۔ آپ اشفاق سے اس کی موٹر مانگیں۔ وہ آپ کا شو فر بن جانا گوارا کرے گا لیکن اپنی موٹر آپ کے پاس نہیں دے گا۔

آج بھی اتنی شہرت کا مالک ہونے کے باوجود اتنی جان پہچان کے باوجود اتنے میل ملاپ کے باوجود احمد اندر سے رابنسن کرو سو ہے جو کئی ایک برس پہلے خان منزل کی بالائی ٹیم چھٹی میں رہا کرتا ہے۔ اشفاق احمد اینٹی سوشل نہیں مگر وہ سوشل بھی نہیں۔ اس لیے کہ وہ لوگوں سے ملنے سے بچکچاتا ہے۔ بیٹھا وہ یوں نروان زدہ ہے جیسے دلدل کے کنارے دھوپ میں مگر مجھ پڑا ہو۔ اس وقت اگر ملازم آ کر کے صاحب ملنے آئے ہیں تو پیشانی پر تلوار سی تیوری پڑ جاتی ہے۔ باہر ڈرائنگ روم میں جانا پڑ جائے تو اس کا چہرہ کھتا ہے ”مارے گئے۔“ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ اگر ایک خون معاف ہو تو وہ فلاں صاحب کو جیتا نہ چھوڑے۔ یہ ہے کہ ڈرائنگ روم میں پہنچ کر ایسے بڑے اخلاق سے ملے گا جیسے صبح سے انہی کے انتظار میں بیٹھا ہو اور پھر پھر کے بعد ڈرائنگ روم سے ہٹنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ تہمتے گونجیں گے لیکن یقین جانے یہ شور اور ہنگامہ پھر کن کیسا کے مصداق ہوگا۔

اشفاق احمد کی سب سے بڑی عسرت یہ ہے کہ وہ کچھا اور بنیان میں اکیلا پڑا رہے۔ یوں پڑا رہے جیسے دلدل میں پڑا رہتا ہے۔ سوشل زندگی سے اجتناب کی وجہ سے وہ آج تک اپنا میج نہیں بنا سکا۔ اس میں اس کی اہلیت نہیں مگر حسرت ضرور ہے۔ وہ مجھ سے اکثر کہا کرتا ہے مفتی جی بس میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آئندہ سے زندگی بسر کروں گا اور اپنا میج بناؤں گا۔ نہیں نہیں مذاق نہیں کر رہا۔ قد سید اور میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے ایک مہینہ سے روز شام کو سوشل وزٹ کیا کریں گے۔ آج ان کے ہاں کل ان کے ہاں اور پھر اس تمہید کے بعد ہم ڈریس اپ باہر لان میں کر سیاں ڈال کر سوشل وزٹر کا انتظار کیا کریں گے۔ ہر مہینے چار ایک دعوتیں دیا کریں گے۔ کبھی گھر میں۔ میں آج کل سوشل آداب پر ایک کتاب پڑھ رہا ہوں۔ قد سید انٹرنیشنل کھانے پکانا سیکھ رہی ہے۔ ایک بار اشفاق نے اپنے اس سوشل پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کی تھی۔ تین دن مسٹر اشفاق شام کے وقت سوشل وزٹ کرتے، پھر پتہ نہیں کیا ہوا چوتھے روز وہ اپنے سخن میں حسب دستور مگر بچھڑی تھی اور سامنے بانو ممتا کے ڈھیر لگائے بیٹھی تھی۔

میں نے سوچا وہ تمہارا سوشل پروگرام کیا ہوا۔ کہنے لگے جو کچھ چھو گے چوبارے میں ہے، نہ بیخ میں ہے۔ میں ہے۔

سوشل اور ادبی میج پیدا نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اشفاق احمد اذلی طور پر ایک کامی ہے۔ ایک جسے مزدوری کرنے کی لت پڑی ہوئی ہے۔ چاہے ضرورت ہو یا نہ ہو وہ مزدوری کرنے کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بنانا ایک الگ فن ہے جسے فنون لطیفہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک جدید فن ہے جو حال ہی میں ایجاد کیا گیا ہے۔ خاصا رائج ہوتا جا رہا ہے۔ اس فن کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ آپ کام کریں یا نہ کریں۔ نہ کریں تو بہتر ہے فنکار کہلائیں گے۔ چاروں طرف آپ کے نام کا ڈنکا بجے۔ جس جگہ بیٹھیں وہ نشست صدر بن جائے۔

اشفاق اور بانو کے اس طبعی غیر سوشل رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ اتنا کام کرنے کے باوجود کسی سرکاری یا نیم سرکاری تنظیم پر پروگرام یا مجوزہ تحریک یا تنظیم میں کبھی ان کا نام نظر نہیں آئے گا۔ چونکہ ان کا کوئی امیج نہیں، نہ ان میں امیج بنانے کی سیرت ہی ہے۔

اشفاق احمد کا گھر میری زندگی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مجھے اشفاق کے گھر سے محبت ہے۔ مجھے اس دکھی گھر کے مگر مجھ سے محبت ہے جو اس خوب صورت وسیع و عریض مکان میں یوں پڑا رہتا ہے جیسے وہ مشرقی پاکستان کا ایک صحرائی زدہ علاقہ ہو۔ مجھے اس فرائی ڈے سے محبت ہے جسے دنیا میں اشفاق کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ جو ہر وقت یا تو مگر مجھ پر اپنے چپچپاتے تازہ کوٹ چڑھاتی رہتی ہے یا ممتا کے ڈھیر لگانے میں کھوئی رہتی ہے۔ مجھے ان تین جنوں سے محبت ہے جو کسی گھوڑے کے سائے تلے پرورش پانے کی لذت سے محروم ہیں۔ اشفاق احمد کے گھر کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ گذشتہ کئی سالوں سے اشفاق کا گھر میری واحد پناہ گاہ ہے جیسے بھنگ پینے والے کے لیے فقیر کا تکیہ ہوتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ چاروں طرف اشفاق ہی اشفاق ہوتا ہے۔ داستان گو کو گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں۔ اگرچہ داستان گو نے اشفاق کے نئے گھر پر داستان سرائے کی تختی لگا رکھی ہے لیکن داستان گو ڈرائنگ روم سے ورے نہیں آ سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اشفاق کے گھر کا نام داستان سرائے نہیں بلکہ منشی خانہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ گھر دو منشیوں کی کامیاب جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ یہ گھر قرض پر بنا ہے اور اس قرض کو صرف سکرپٹوں کی مدد سے اتارا جاسکتا ہے اور اسے ادا کرنے کے لیے دونوں منشی دن رات قلم کا پھاؤڑا چلانے میں مصروف رہتے ہیں۔

میں داستان گو کی قابلیت کا اعتراف کرتا ہوں۔ میں اس کی تخلیقی قوتوں کو مانتا ہوں۔ میں اس کے سنہرے پھول پتوں کی سجاوٹ کو پسند کرتا ہوں۔ میں اس کے مجمع لگانے کی عادت کو زیادہ ناپسند نہیں کرتا لیکن میں ایک دانشور ہوں۔ میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ وہ میرے سامنے کھڑا ہو کر مونچھ مروڑے۔

عبدالرحمن چغتائی

عبدالرحمن چغتائی سے تعارف ہمیں باب بیڑ کی زبانی ہوا۔ وہ عموماً ان کا ذکر کرتا۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ وہ ہر مغربی آدمی کی طرح نئے کچھر، موسم اور شہر میں گھومتا پھرتا خیر کا شکار ہے۔

ایک دن اس کی اصرار بھری گفتگو کے دوران خاں صاحب نے پوچھا۔

”بھئی چغتائی..... چغتائی۔ وہ ہے کون؟“

”اشفاق صاحب..... جس کشمیری بابے کے پاس میں جاتا ہوں، ان کے پڑوس میں ہی عبدالرحمن چغتائی رہتے ہیں۔ اوپر سٹوڈیو ہے، ہر طرف پن ڈرائیونگ بکھری ہوئی ہیں۔ اس کے گھوڑے اور عورت کے سہیل نے تو مجھے حیران

کردیا ہے۔ آپ کبھی موہنی روڈ نہیں گئے ان کا سٹوڈیو دیکھنے؟“

”تو کیا وہ رنگوں کا استعمال نہیں کرتا؟“

”کرتا ہے کرتا ہے..... لیکن پھر رنگ بھی خود ہی بناتا ہے۔ بنے بنائے رنگ اسے پسند نہیں آتے۔“
 ”کمال ہے۔“

”کیا آپ میوزیم نہیں گئے۔ وہاں تو آپ نے ان کا کام دیکھا ہی ہوگا؟“

اب اسے کون بتائے، اپنے وطن میں کون میوزیم دیکھتا ہے۔ کس کو فکر ہوتی ہے کہ قومی ورثے کی تحفظ کرے۔ کس آدمی کے پاس اتنی فرصت ہوتی ہے کہ وہ پرانی عمارتوں کے قصے ہسٹری، اہمیت جتا کر بچوں کو قومی احساس دلانے۔ یہ سارے کام زندہ قومیں کرتی ہیں، جن کے لیے روزی کمانا ہمہ وقت مصروفیت نہیں، جو اپنے مستقبل سے غافل نہیں ہوتے۔

بہر کیف میں نے تو پروانہ کی لیکن خاں صاحب یہ نہیں چغتائی صاحب کے سٹوڈیو میں کتنی بار گئے اور کس قدر متاثر ہو کر آئے۔ ایک روز میں باورچی خانے میں رعب ڈالنے میں مصروف تھی کہ مجھے آ کر کہنے لگے۔
 ”جیوٹی یہ سب سنبھال لے گی۔ تم میرے ساتھ آؤ۔“

سارے راستے انہوں نے مجھے ایک بار بھی نہ بتایا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ دوسری منزل پر چغتائی صاحب کا سٹوڈیو تمام تخلیق کاروں کی طرح بے ترتیب تھا لیکن جسے میں بے ترتیب نہ رہی تھی اسی میں چغتائی صاحب کی ترتیب پوشیدہ تھی۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے بڑی خوشی کا اظہار کیا۔ ابھی چند تصویریں دیکھ پائے تھے کہ بڑی خوشبودار گلابی گلابی کشمیری چائے آ گئی۔ چند تصویریں چغتائی صاحب نے علیحدہ رکھ لیں۔ جب ہم رخصت ہونے لگے تو وہ تصاویر مجھے دیتے ہوئے چغتائی صاحب بولے۔

”بھابھی صاحب! یہ آپ کے لیے ہیں۔ میرا ناچیز حقیر تحفہ قبول کیجیے۔“

میں ہکا بکا تصویریں اٹھانے لگی تو ”ناں نائن“ کر کے انہوں نے روک دیا اور چھوٹے سے کہا کہ وہ بیچے۔ کار میں تصویریں رکھ دے۔ اس کے بعد میں تو تصویروں سمیت چغتائی صاحب کو بھول گئی لیکن انہوں نے مجھے بڑے محبت بھرے خط ”بھابھی صاحب“ کے القاب سے شروع کر کے لکھے۔

یہ میں اس لیے بیان کر رہی ہوں کہ عبدالرحمن چغتائی کے ساتھ اس تعلق سے فائدہ اٹھاؤں اور اتنے بڑے کریڈٹ کارڈ آپ کو دکھا کر آپ سے عزت کی پونجی وصول کروں۔

چغتائی صاحب کے جانے کے بعد یکدم کہیں سے عبدالرحیم چغتائی منظر پر آدھمکے۔ انہوں نے ایک ملاقات تو خاں صاحب سے تکلفاً کی، پھر تصویروں کے لیے اصرار شروع کر دیا۔

”اگر آپ کے پاس ان کے کچھ ذاتی خط ہوں تو وہ بھی دے دیجیے۔ میوزیم میں ان کی ضرورت ہوگی۔“

دو تین تصویریں شاید ہمارے پاس کہیں ادھر ادھر پڑی رہ گئیں لیکن زیادہ تصویروں اور خط چغتائی کے بھائی ملکیت سمجھ کر واپس لے گئے۔ شاید ہر بڑے آدمی کے بعد یوں ہی اُس کی ذات کو سمیٹا جاتا ہے۔

انشاجی

خاں صاحب نے اپنے مضمون ”رینی ڈے“ میں لکھا ہے کہ شہاب بھائی کی ایک گپت پاپ لائن ایسی تھی جس سے لوگوں کی خفیہ مدد کر کے اپنی عاقبت سنوارا کرتے تھے۔ وہ کسی بڑھی ماٹی کی طرح اپنی جیب کی پوٹلیاں چوری چوری کھینچتے اور کسی پر اپنا راز افشا نہ کرتے۔

ہم جب سمن آباد میں تھے اور ”داستان گو“ ایک مہنگی عیاشی تھی، انہوں نے خاں صاحب کو ساتھ لیا اور کراچی کے لیے روانہ ہوئے۔ انہوں نے اپنے سیکرٹری ہونے کا فائدہ اٹھانا چاہا۔ ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ اس طرح اشتہار مانگتے پھرنا اُن کی شہرت کو بڑھ لگا سکتا ہے۔ جب اشتہار ملنے میں ناکامی ہوئی تو شہاب صاحب نے خاں صاحب کے لیے نوکری کا بندوبست کیا اور انہیں اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر بنا دیا۔

شہاب صاحب کی دوسری نیکی جو ہمارے دیکھنے میں آئی، وہ انشاجی کو نوکری میں ایڈجسٹ کرنے میں مشغول تھے۔ یہی انشاجی تھے جنہوں نے ہمارے لیے بڑا خوبصورت یہ مصرعہ چھوڑا

”انشاجی اب کوچ کرو اس شہر میں جی کو لگانا کیا“

اس مصرعے سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ انشاجی کہیں اداسی، ناامیدی یا فکر مندی کا شکار تھے۔ میں نے انہیں جب دیکھا ان کے چہرے پر بشارت ہی دیکھی۔ شہاب صاحب کے کاسنی کمرے میں مہمان ٹھہرنے سے کتراتے تھے لیکن انہیں نے کبھی اس کمرے میں ٹھہرتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس نہ کی۔ وہ جب بھی آتے کمرے سے باورچی خانے تک چکر لگاتے رہتے۔

”کیا پکا یا ہے بانو؟“

”جی سرسوں کا ساگ، مکی کی روٹی اور تازہ بکھن۔“

دوسرے چکر تک انہیں Menu بھول جاتا اور وہ پھر پوچھتے۔ اگلے دن پھر وہی سوال۔

”اور آج۔“

”آج تو گا جرا لوکی بھیجا ہے۔“

”بہت اچھے.....“ وہ انفریشن لے کر لوٹ جاتے۔

انہوں نے کبھی کسی کھانے کی از خود فرمائش نہ کی۔

ہم عہد رفتہ کے لوگ ہیں۔ ہماری طرز معاشرت، اقدار اور ذاتی تجربات سے اخذ کی ہوئی دانش آج کے دور سے لاکھوں نہیں ہوتی لیکن آج کی نوجوان نسل دور دراز کے بھولے بھٹکے معاشروں کا مطالعہ انٹرنیٹ پر کرنے کی عادی ہے۔ فریقہ کے جنگلوں میں بسنے والوں کی بود و باش، میکسیکو، کیوبا اور Inca کے رسم و رواج پر معلومات حاصل کرنا ان کی بابی ہے۔ اسی تجسس پر تکیہ کر کے اس نئی پود سے مخاطب ہونے کی جسارت کر رہی ہوں۔

لمبے تجربے سے میں نے یہ بات اخذ کی ہے کہ جس شخص نے مثبت شیشوں کی عینک اپنے چہرے پر سجائی اس کا:

رویہ، سوچ اور عمل مثبت ہو جاتے ہیں۔ وہ چاہے بیاباں سے گزرے، چاہے خارزار سے، ناداری، مفلسی، بیماری، رعبے یا بے وفائی اور بے توجہی کے تھپڑے کھائے۔ اس کے چہرے پر بشارت اور دل میں طمانیت رہتی ہے۔ جس شخص کے چہرے پر منفی شیشوں کی دھندلی عینک چڑھی رہے اس کا رویہ، سوچ اور عمل ہمیشہ منفی رہتا ہے۔ بھلے ہی محلوں میں رہے، کوٹھیوں کے مالک ہو، لمبی کاروں سے اترنے بیٹھنے والا ہو۔ اسے بے اطمینانی، مایوسی اور غم نہیں چھوڑتے۔

شہاب صاحب اور ان کے قریبی دوستوں میں ابن انشا و احدا ایسے شخص تھے جن کے چہرے پر یہ عینک نہیں اتری۔ یہ نہیں کہ ان کی زندگی آسان تھی لیکن ان کے مثبت رویے، سوچ اور فکر نے انہیں کبھی ناامیدی کے حوالے نہیں کیا۔ ہمیشہ شانت، مسرور اور پُر امن نظر آئے۔ یہ اسلام آباد کا واقعہ ہے۔

شہاب صاحب اپنی بہن محمودہ اور ان کے میاں امین بھائی کے گھر میں رہتے تھے۔ عفت کے جانے کے بعد ثاقب کی تنہائی کا خیال کرتے ہوئے انہوں نے یہیں بسرام کر لیا تھا، تاکہ ثاقب تنہائی کا شکار نہ ہو اور بھرے گھر میں بڑھے۔

شہاب صاحب، مفتی جی، اشفاق صاحب ڈرائنگ روم میں جمع تھے۔ ابن انشا کرسی کھینچ کر ٹیلی ویژن کے بیٹھے تھے۔ میں اور محمودہ جی اضافی Also Rau قسم کے تماشاخی سب خاں صاحب کا ڈرامہ چانگڑہ دیکھ رہے تھے۔ انشا کچھ پریشان تھے۔ محمودہ جی بار بار دوپٹے سے منہ پونچھ رہی تھیں۔ جب ڈرامہ آخری چند سینوں پر پہنچا تو امین صاحب جی اٹھ کھڑے ہوئے اور گہرا کر بولے۔ ”یہ اشفاق بہت ظالم آدمی ہے۔ اس نے بچہ مار دینا ہے۔ میں چلتا ہوں۔“ میں جب ڈرامہ ختم ہو جائے گا تو آ جاؤں گا۔“

محمودہ جی بولیں۔ ”بخار اتر گیا۔ آئیں انشا جی لال لویا کھائیں۔ آپ کا پسندیدہ کھانا۔“ انشا جی نے سکھ کا سانس لیا اور خاں صاحب کا شکر یہ ادا کیا۔ ایک مرتبہ ہم کراچی گئے۔ ہم انشا جی کے دفتر میں ان سے ملنے گئے۔ وہ گھومنے والی کرسی پر بیٹھے۔ ہمیں والی سیدھی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کراچی کے متعلق سرسری گپ شپ ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد خاں صاحب نے ہمیں کہا۔ ”انشا جی! دو سو روپے دے دو..... درکار ہیں۔“

مجھے کبھی علم نہ ہوتا کہ خاں صاحب کے بنوے میں کتنے پیسے ہیں۔ اس لیے مجھے تھوڑا سا تعجب ہوا کہ جس شخص سے پہلے انہوں نے خاطر خواہ انتظام کیوں نہ کیا؟ انشا جی نے خاں صاحب کی بات کا رتی بھر نوٹس نہ لیا اور نہ عمر آگے لے کر منگھو پیر تک ہر رنگ کی بات جاری رہی۔ مجھے ان کی بے پرواہی پر ذرا سا ملال ہوا۔ پھر اچانک انہوں نے رازداری سے اپنا دراز کھولا۔ کچھ ہلکا سا تلاش کیا اور بڑی ہی رازداری سے ایک لفافہ خاں صاحب کو پکڑا دیا۔

اس لفافے پر لکھا تھا ”More?“ انشا جی کا یہی طریقہ تھا، وہ مانگنے والے کو رازداری سے عطا کرتے، اسے مانگنے کی خجالت سے بچاتے تھے۔

بچہ جو مانگا جاتا اس سے سوادیتے۔ وہ جانتے تھے کہ مانگنے والا عموماً ضرورت سے کم مانگتا ہے۔ ایک مرتبہ انشاجی ہمارے گھر پر مقیم تھے کہ ایک سالہ آئی۔ اس نے ہزار روپے مانگے۔ انشاجی نے اسے دو ہزار پکڑا دیئے۔ خاں صاحب بولے۔

یہ انشا! اس نے ہزار مانگا تھا، تم نے دو ہزار کیوں دیئے؟“

کہنے لگے ”خود ہی تو کہا کرتا ہے کہ دھرم پورے والے بابا سائیں فضل شاہ کا فرمان ہے دل کھول کر دو..... تم

نے دتے میں سے ہی دینا ہے، کون سا پلے سے جاتا ہے۔“

میں بھی ”دتے میں سے دینا“ کا فلسفہ سنتی رہی تھی لیکن انشاجی کی طرح عمل تک نہ پہنچ پائی تھی۔

آخری مرتبہ جب وہ ہمارے پاس لندن جانے سے پہلے آئے تو ان کا چہرہ سبزی مائل زرد تھا۔ وہ بڑی تکلیف

میں تھے لیکن ہمیشہ کی طرح چہرے پر طمانیت اور سکون تھا۔

ویسے تو شہاب صاحب، مفتی جی اور خاں صاحب کی عینکوں کے شیشے بھی مثبت تھے لیکن کبھی کبھی وہ یہ عینکیں

تھوڑے کر مابعد اور نامعلوم کی تلاش میں چل نکلتے تھے۔ انشاجی کو کبھی تلاش نے تنگ نہیں کیا..... کیونکہ انہوں نے کبھی اپنی مثبت

تیشوں کی عینک اتاری ہی نہیں۔ کبھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوئے۔ پھر وہ اور کیا تلاش کرتے؟

ان کا زرد رنگ اور پہلے ہاتھ دیکھ کر میں نے خاں صاحب سے پوچھا۔

”انشاجی کو کیا ہوا ہے؟“

”کیا ہوا۔ ہے انشا کو؟“

”پہلے دیکھتے نہیں ان کا رنگ ہلکی سا ہے۔ بیمار ہیں کیا؟“

مجھے اب معلوم ہوا کہ انشاجی کینسر کے مریض تھے۔ غالباً خاں صاحب کو اس وقت صحیح حالت معلوم تھی لیکن خاں

صاحب کی ستر پوشی کے مختلف اصول تھے۔ وہ کسی شخص کی ناداری، بیماری، ذلت اور بیماری کو اپنے تک محدود رکھتے۔ ان کا

تہا بہ یہ خیال تھا کہ لوگ ایسے حالات جان کر محض گفتگو کا موضوع بنا دیتے ہیں اور اسے غیبت کی ایک گھناؤنی شکل عطا کر

دیتے ہیں۔ اس لیے ایسی انفرمیشن کو افواہ کی شکل نہیں دینی چاہیے بلکہ اوپر والے ستر پوش کی طرح چشم پوشی کرنے میں ہی

بھرتی ہے۔

شہاب بھائی نے انشاجی کے لیے لندن میں نوکری کا بندوبست کر دیا تھا۔ وہاں وہ ایک بڑے میوزیم (انڈیا

آفس لائبریری) کے کرتا دھرتا تھے۔ اس میوزیم میں پاکستان کی نادر کتابیں، اہم اوبیوں کا کام اور سیاسی لیڈروں اور

عام کر ہمارے کلچرل Heritage کا خزانہ جمع تھا۔ انشاجی اپنی مثبت عینکیں لگائے اپنے کام میں مگن تھے۔

آخری بار ہم انشاجی کے پاس لندن پہنچے۔

انہوں نے ہمیں لائبریری میں مدعو کیا۔ کچھ انگریزی اور پاکستانی سکالر وہاں جمع تھے۔ خاں صاحب نے ہمیشہ

کی طرح اپنے مسلک کے عین مطابق دو قومی نظریہ پر تقریر کی اور پاکستانی کلچر کا تشخص بھارت کے رسم و رواج سے مختلف

ست میں دکھا کر پیش کیا۔ انشاجی بہت خوش ہوئے اور بعد میں بولے۔ ”یارتو ادیب کی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ یہ نیا ملک

ہے۔ اس کی Ideology کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ کاش! ہم سب شاعری میں علامہ اقبال کا پرچم اٹھا کر چلیں۔“

”ہاں وہ تو ہے لیکن سب ادیبوں میں وہ ایچ اور جنیوس نہیں ہے۔“

انشاجی نے ہد امید لہجے میں کہا۔ ”یا تو ذہین آدمی ہے۔ کچھ اس سلسلے میں ہمت کرناں۔ کوئی تحریک، کوئی سنگت تشکیل دے ناں۔ یہ تنکے تنکے بکھرا جھاڑوا کٹھا کرناں۔“

”کروں تو..... لیکن وہ سمجھیں گے اشفاق چودھرا ہٹ چاہتا ہے۔ لیڈری کا شوق ہے اسے۔ میری برادری تو میری نہیں مانے گی کبھی بھی۔“

”لے لے ناں یہ الزام، پھر کیا ہوا۔ جب تیری نیت صاف ہے تو پھر الزام کی فکر کیسی؟“

”بھائی انشاجی! ادیبوں کا بڑا مسئلہ اُن کی اتا ہے۔ ان کی کمر میں لوہے کی لٹھ پڑی ہے۔ وہ کب جھکا سکے کسی کے آگے؟“

جب انشاجی باتیں کر رہے تھے تو میں نے نوٹس لیا کہ اُن کے ہاتھ، خاص کر اندر کی ہتھیلی انڈے کی زردی کی طرح پیلی تھی۔ پھر انہوں نے آنکھیں ادھر ادھر گھمائیں تو آنکھوں کی سفیدی حیرت انگیز حد تک بے رنگ نظر آئی۔ میں میں پہنچ کر میں نے خاں صاحب سے ایک بار پھر اپنی تشویش کا ذکر کیا۔

”انشاجی کی طبیعت تو مجھے ٹھیک نہیں لگتی خاں صاحب۔“

”تمہیں تو ہر وقت ایسے ہی وہم ہو جاتے ہیں۔ ٹٹو جیسا دن دناتا پھرتا ہے۔ واہ کیا کام ہے کیا خزانہ کتابوں کا کھنڈا کر لیا۔ پتہ نہیں ہم اس خزانے سے کچھ اٹھا سکیں گے یا نہیں لیکن یہاں کے سکا اس کا مطالعہ کر کے کوئی بڑی سہولت پاکستان پر کریں گے۔“

”لیکن جی ان کی صحت۔“

”تم پیلے ہاتھوں کا مرثیہ گارہی ہو۔ یہ میرے ہاتھ دیکھو۔“

خاں صاحب کے سفید رنگ کی وجہ سے ان کے ہاتھ پیلے مسطر کی طرح پیلے ہو رہے تھے۔

میں نے ابھی تک ان کے ہاتھوں کی طرف کبھی توجہ نہ دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ کام کی زیادتی اور آج کے دن کے باعث وہ یوں زردی مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ میری بے فکری کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ میں نے ان کی بیماری تو بھانپ لی لیکن مجھے لُختہ بھر کے لیے شبہ نہ ہوا کہ خاں صاحب بھی کینسر کے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ انشاجی کراچی لوٹ آئے۔ ڈاکٹروں نے ان کا اصلی مرض تشخیص کر لیا تھا۔ انشاجی تو ہمارے پاس نہ آئے لیکن ان کا رابطہ اور بھی باقاعدہ ہو گیا۔ انہیں فکرتھی کہ ان کی کتابوں کی اشاعت ان کے بھوکے کرے گا۔ وہ کسی پبلشر سے معاہدہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پھر گھر کا بھی مسئلہ تھا۔

ان مسائل کو سلجھانے میں خاں صاحب ان کے ساتھ ساتھ رہے لیکن وہ زیادہ فکریں ساتھ ہی لے گئے۔ ایک شریف انفس، شرمیلا اور غیرت مند ادیب کا انجام آپہنچا۔ اوپر والا کیوں چاہتا ہے، کب چاہتا ہے اور کیسے چاہتا ہے اس کا بھید کبھی کسی انسان کو کھٹی طور پر نہیں ہوسکا۔ انسان کا علم ہمیشہ سے قلیل ہی رہا ہے اور رہے گا۔ جتنا برتن اتنا پانی۔ برتن میں موسلا دھار بارش ساری تو سامنیں سکتی البتہ مقدور بھر پانی ضرور اکٹھا کیا جاسکتا ہے۔

انشاجی کے کوچ کرنے کے بعد سمجھ آئی۔

”انشاجی چلو اب کوچ کرو اس شہر میں جی کو لگانا کیا“

ہوسکتا ہے ان کا دل کبھی بھی اطمینان یا خوشی سے ہمکنار نہ رہا ہو لیکن ان کی مثبت عینکوں نے ان کے چہرے پر

جی بے اطمینانی کا منظر پیش نہیں کیا۔

انتظار حسین

یہ A.R.Y. فنکشن کا ذکر ہے۔ مجھے اس فنکشن پر دس لاکھ کا انعام ملا تھا اور اسی قدر رقم انتظار حسین صاحب کو ملی تھی۔ ہم ایک ہی ہوٹل میں رہ رہے تھے۔ ایک روز میں اور خاں صاحب باہر نکلے تو انتظار صاحب بھی باہر ہی آ رہے تھے۔ میں نے ہمیشہ کی طرح بلا سوچے سمجھے عالیہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس درجے بیمار ہے۔ جب ہم باہر رخ میں نکلے تو انتظار بھائی نے مجھے کہا ”شکر یہ! یوں پبلک میں اس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لانا مجھے کچھ معیوب سا لگا لیکن آپ نے بہت مہربانی کی جو عالیہ کو سنبھال لیا۔“

انہوں نے میرے کردار کی تعریف ضرور کی لیکن میری تسلی نہ ہوئی کیونکہ انہوں نے میرے ادبی کام کے حلقے ایک لفظ نہ کہا۔ جب عالیہ دنیا سے رخصت ہوئی تو بڑی مردت سے ہمیں اس کے متعلق اطلاع دینے خود حریف لائے۔

”کل قبرستان میں ہی اس کے قتل ہیں۔ چند لوگوں کو اطلاع دی ہے، آپ دونوں ضرور آئیے۔“ ہم دونوں قبرستان پہنچے۔ چند لوگ موجود تھے۔ تازہ قبر پر تھوڑے سے پھول چڑھائے۔ ایک اچھی روح کو رخصت کیا اور سوچتے گئے کہ انتظار بھائی بھی کتنے بڑے آدمی ہیں۔ ان کے گھر میں اللہ نے بچے کا چراغ نہ جلایا لیکن وہ نہ اللہ کے شاکی ہوئے بلکہ کو بچے کی خاطر چھوڑ کر دوسری شادی کے مرتکب ہوئے۔

انتظار حسین، خاں صاحب کے داؤ جی کو ان کے ادب کی معراج سمجھتے تھے۔ اس کے بعد کا جو ادب خاں صاحب نے پیش کیا، اس کے وہ قائل نہ تھے۔ میں انتظار حسین کو ایک بڑا لکھاری سمجھتی ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ میرا ان کا سگ ایک نہیں۔ میرا خیال ہے کہ انتظار حسین پاکستان کی نعمت ملنے کے بعد بھی Nostalgia کی کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ جو لوگ پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں پتھر کے بن جاتے ہیں اور اللہ کی رحمت سے منکر ہونے کے مرتکب ہوتے ہیں۔

یہ نہ مجھے میں انتظار حسین کی تخلیقی ہنرمندی، ان کی زبان و بیان کی شاخواں نہیں۔ مشکل صرف اتنی ہے کہ میں جی تک نظر ہوں۔ مجھ میں واقعی وسعت قلب کی کمی ہے جو انسان کو لبرل ہونا سکھاتی ہے۔

انتظار بھائی اب بھی میری دلجوئی کے لیے آتے رہتے ہیں۔ خاموشی سے میرے زخم پر پھار رکھتے ہیں۔ ڈیرہ لگ کر یہاں سے تھوڑا سا کھاپی لیتے ہیں لیکن آج تک ہم دونوں میں تخلیقی عمل پر کوئی بات چیت نہیں ہوئی۔

بھٹو

لوگوں میں جو نیک نیتی پیداؤں ہوتی ہے، اسی کے طفیل خاں صاحب سے سکھ برادری کے کچھ لوگ ملنے آتے تھے۔ یہ لوگ ہجرت کرنے والے تھے اور خاں صاحب ان کا مان آدراسی طرح کرتے تھے گویا انصار کی نقل کر رہے ہوں۔ جب تک خاں صاحب زندہ رہے، میری ان سے ملاقات رکھی تھی۔

میرا خیال تھا کہ یہ سکھ حضرات I.S.O. کے رکن تھے۔ ان میں ایک لمبے ترنگے لمبی داڑھی والے سردار سرغندہ تھے۔ خاں صاحب انہیں ”بھٹو“ کہہ کر بلاتے تھے۔ ان کا ڈرائیور بڑی ہی پیاری شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اندر تو جاتا لیکن سردار حضرات اسے اپنے جتھے کا حصہ سمجھتے تھے۔

خاں صاحب کا بچپن، بلوغت کا زمانہ بکتر میں کٹا۔ یہ سکھوں کی بستی تھی۔ یہاں کے رسم و رواج اٹھنا بیٹھنا سب میں سکھی پنتھ کی جھلک تھی۔ گوباباجی ایسے میل جول پر ”بھوں بھوں“ کرتے لیکن روک نہ سکتے تھے۔ کچھ عرصہ بکتر میں رہتے ہوئے جب باباجی کا خوف کم ہوا تو ان کی ڈپنٹری پر سکھ سردار بڑی بے تکلفی سے آنے لگے۔ اس علاقے میں زمینیں سکھوں کی تھیں۔ ان بڑے سرداروں کی گھر والیاں سروں پر احتیاط سے دوپٹہ اور ہتھیں اور مردوں سے پردہ کرتی تھیں۔ بابا فرید الدین گنج شکر کے دوہے گرنٹھ کی زینت تھے۔ اس لیے سکھوں کے دل میں درگاہوں کا بڑا احترام تھا۔

خاں صاحب اپنی پرورش میں سے سکھوں کے کچھ کو منہا نہ کر سکے تھے۔ جب بھی سردار بہاں آجاتے تھے سب کی پنجابی سننے والی ہوتی۔ اندر آ کر خاں صاحب کہتے ”قد سید! کھانے میں گوشت نہ ہو، صرف چھلی رکھ سکتی ہو۔“

کبھی کبھی امریکہ میں رہنے والے ڈاکٹر پرت پال بھی خاں صاحب سے ملنے آتے۔ دہلیہ پتلے درختوں کی واڑھی والے شائستہ ڈاکٹر صاحب کی گفتگو میں مغربی Manner اور مشرقی حیا ہوتی۔ وہ کبھی عورتوں کی طرف آنکھ نہ اٹھاتا دیکھتے۔ ان کی گھر والی بھی ڈاکٹر تھیں۔ وہ ایک مدت سے وہیں آباد تھے لیکن اب ان دونوں نے ڈاکٹری کا پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ کاشتکاری کا آبائی پیشہ اختیار کر کے زمینیں خرید لی تھیں جس پر بادام کاشت کرتے تھے۔ جب بھی ساتھ آتے تھے ساتھ خاں صاحب کے لیے باداموں کا تحفہ ضرور ہوتا۔

امریکی باداموں میں یہ خاصیت تھی کہ ان میں سے ایک بھی کڑوا نہ نکلتا۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد انہوں نے پچھلی روایت قائم رکھی۔ میرے لیے بادام ضرور لاتے۔

جب خاں صاحب نے اردو بورڈ چھوڑا تو انہوں نے بھٹو سے کہا..... ”اب سرکاری گاڑی کے مزے تو مجھے پرانی گاڑیوں کا کاروبار بھی کرتے ہو۔ ایک پرانی سوزو کی مجھے کہیں سے لا کر دو لیکن ایک شرط ہے، گاڑی زیادہ پرانی نہ ہو۔ کچھ ہی دن نہیں گزرے تھے کہ بھٹو ایک گہرے سبز رنگ کی فوکسی لے آئے جو شاید آٹھ دس ہزار روپے کی ہو۔“

اب بھٹو نے اس کی قیمت وصول کرنے سے انکار کیا۔ خاں صاحب نے گاڑی نہ رکھنے پر اصرار کیا۔ بڑی مشکل سے اس نے اس کی قیمت وصول کی جو غالباً ایک لاکھ چالیس ہزار تھی۔ ان قیمتوں کو پیش نظر رکھیں تو Inflation کی رفتار آنے لگتی ہے۔

ان سنگی ساتھیوں کے ساتھ مومناریاض محمود ایک لازمی جزو بن جاتے۔ وہ بڑے خاموش تماشاگاہی تھے۔ بولتے کم
تے سنتے زیادہ تھے۔ بھٹو کی گھر والی اور ان کے تین بچے لندن میں رہتے تھے۔ جب بھی وہ بچوں کو چھینوں میں بھٹو سے
مٹاتی، بڑی گہما گہمی ہوتی۔ بانو باجی اور ریاض محمود ان کی دعوتیں کرتے۔ ہمارے ہاں بھی ایک دو مرتبہ اکٹھے ہونے کا
مہمان ہو جاتا۔

پھر ہولے ہولے بھٹو بھی ہماری دعوت کرنے لگے۔ خاں صاحب کے آخری ایام میں بھٹو کی گھر والی نے ایک
تہہ بھری پر تکلف دعوت کی۔ میز پر رنگ رنگ کی سبزیاں، دالیں تو تھیں ہی لیکن مرغ اور گوشت کے بھی سالن موجود
تھے۔ ان کی میز بانی کا طریقہ تھا کہ انہوں نے بازار سے گوشت اور مرغی منگوا کر دعوت کو مہمان کے حوالے سے سجایا تھا۔
یہ ملاقات گفتگو کے اعتبار سے بڑی اہم تھی۔ کھانے کے بعد جب چائے کا دور چلا تو گفتگو نے بڑا پلٹا کھایا۔
بھٹو بولے..... ”خاں صاحب اسکھوں نے قیام پاکستان کے وقت بڑا ظلم کیا۔ جتھوں پر حملے کیے۔ ٹرائیوں کو
بھائی۔ ہندوؤں میں اتنی جان نہیں تھی کہ مسلمانوں کو چھیڑ سکتے لیکن ہمیں ماسٹر تیار سنگھ نے پھنسا دیا۔ وہ یہ نہیں جانتا
تھا کہ جب ہندو کو ضرورت پڑتی ہے، وہ دوست بن جاتا ہے۔ وعدے کرتا ہے اور جب حالات سازگار ہوتے ہیں تو
سب سے مکر جاتا ہے۔“

”جان دے سکھا جان دے تجھے کیا بھول گیا کہ جب جہانگیر کے عہد میں بابا تیغ بہادر کو پکڑ کر دربار میں لائے تو
جہانگیر تخت سے اتر کر اسے ملا اور حکم دیا کہ گور و بہادر کو عزت کے ساتھ امرتسر لوٹا دیا جائے لیکن جہانگیر کے برہمن وزیر نے
جہانگیر کو اس کا سر کاٹ کر امرتسر بھیجا۔“

بھٹو نے لمبی آہ بھری اور گویا ہوا..... ”ایک ظلم دوسرے ظلم کی وجہ بن جائے۔ خاں صاحب یہ تو کور لوگوں کی
تہہ ہے۔“

خاں صاحب نے سر ہلا کر آہستہ آہستہ کہا۔ ”بھائی میرے سوہنا۔ جب پشاور میں تحریک چلی تو سکھوں کا قلعہ
جہان کا دبدبہ سارے پشاور میں تھا۔ سید اسماعیل شہید نے اس قدر زبردست جنگ کی کہ سکھوں کا قلعہ سکھوں کے لیے
جیواں والے باغ بن گیا۔ ہزاروں کی تعداد میں سکھ کھیت رہے۔ پھر جنگجوؤں میں تو ایسی آزمائشوں سے گزرتی ہیں۔“
اب بھی بھٹو قائل نہ ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر غم کی گہری لکیر تھی۔

”سنو بھائی میری بات سنو۔ سکھ اور مسلمان تو ام بھائی ہیں۔ برصغیر میں یہ دونوں اللہ کی وحدانیت پر ایمان
رکھتے ہیں۔ ان کی خرابی یہ ہے کہ دونوں مارشل ریس ہونے کے باعث تیز مزاج ہیں۔ سارا دن یہ جڑواں بھائی لڑتے
ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ایک دوسرے کی جان لیے بغیر نہ رہیں گے لیکن جب رات پڑتی ہے بھائی ایک دوسرے کو تلاش کرتے
ہیں۔ اکیلے کسی کو بھی نیند نہیں آتی۔ بستر پر جب تک ایک دوسرے کی ٹانگوں میں ٹانگیں پھنسا کر، بانہوں میں ایک دوسرے
کو قید نہ کر لیں سو کوئی بھی نہیں سکتا۔ یار بھٹو! بھول جان سٹیجی باتوں کو..... اس محبت پر توجہ رکھ جو اندر ہی اندر
Undercurrent کی طرح ان میں چلتی ہے۔“

خاموشی سے سننے والے ریاض محمود نے ان باتوں اور اپنے ذاتی مطالعے سے اتنا اثاثہ جمع کر لیا کہ ریڈیو

پاکستان سے ”پنجابی دربار“ چلا رہے ہیں اور اسی سلسلے میں انہیں Pride of Performance بھی مل چکا ہے۔
 خاں صاحب کے جانے کے بعد بھی بھٹو میرے پاس آتے رہے، ہر بار ان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ میرے
 معاونت کریں لیکن مجھے علم ہے کہ میں اتنی بُری نہیں کہ ہاتھ میں کاسہ پکڑ سکوں۔ مجھے مانگنے سے بھی ڈر لگتا ہے
 سے بھی۔ خاں صاحب کے خیالات سکھی بھائی چارے کے متعلق کیا ہیں، یہ ان کی تحریر سے دیکھیے۔

وسریاں یاداں

ساڈے پنڈ دا تیلی چا چا حشمت بڑا نیک تے اماندار بنداسی۔ جدوں وی تارے میرے، تو ریے
 یا سروں دا تیل بیڑنا اوہناں نوں دھیان نال گوہ کر کے اڈواڈ پھیاں وچ پانا تے او سے حساب نال من تولے
 لینے۔ اوہنے کدے نخالص نوں خالص کر کے رول نہیں سی ماریا تے ناں ای ٹولن لگے، دھڑا کرن لگے، کھ
 نوں ٹھونگا ماریا سی۔

چا چا حشمت ہورتے چارے بیوں ٹھیک ٹھاک سی پر قبیل دار ہون پاروں اوکھا ای رہندا سی۔ اک آپ
 گھر والی، چھی بچے اک بڈی ماں اتوں امانداری، بس مرکھپ کے ای ویلا اٹپاندا سی نہ کدے ہوکا بھر کے کسے نوں
 نہ کے دی شکایت کیتی نہ اپنے ہارے کدے رب نوں کوئی رائے دتی، ہیر بہت سوہنی پڑھدا تے کوڈی بہت چھٹی
 سہاگا چکن وچ وی پنڈ وچ دو بے نمہرتے سی۔

اک واری مور کہ بخار چڑھیا۔ چاچی پہلاں اوہنوں حکیم صاحب دی دوا پیندی رتی پھیر درشن وی
 چاٹ جئی بنا کے دتی۔ پر چاچے دے بخار دا چکر اونویں ای نویں ریاتے او سے طراں گھسن گھیری پاندا گیا۔ جدوں
 ضلع دے وڈے ہسپتال لجان دا ارادہ کر کے گڈے تے پایا تے انگ ساک ادھر راہ وچوں ای موڑ لیائے جو چاچا
 اپڑیا، مسافر وی وچ ای گزر گیا تے اوہدے ایانیاں دے سر تے ہتھر رکھن آلا کوئی نہ ریا۔

مولوی صاحب نے ساڈی بستی دے سارے مسلمان گھراں وچ آپ جا کے اطلاع دتی بنی پرسوں حشمت
 تیلی دا تیجا اے سارے بھرا مسیت وچ کٹھے ہون تے جان والے لئی دعا کرن تے اوہدی روح نوں ثواب پچھو
 بنداسی۔ ہر ایک دی اوہنے خدمت کیتی اے سانوں وی چاہی دا اے کہ اسیں وی دعا بخش کے اوہدیاں مہربانیاں
 بدلہ لایئے۔

میرا کھیال اے بنی چاچے حشمت دے تیجے تے اسیں کوئی پچی تیبہ بندے مسیت وچ ہونواں گے
 بندے ساڈی پتی توں باہر دے وی سی جیز دے چاچے حشمت تیلی نوں کلام بخشن آئے سی تے اک پاسے بیٹھے
 شریف پڑھ رئے سی..... گنگاں، تسبیاں، مکالین مگروں مولوی صاحب نے دعا منگائی تے اسیں جتیاں پا کے
 مسیتوں باہر نکلے تو ہونے لگے بھائی جسا سنگھ دا چھوٹا کا کا، پرانی پتھر وچ لے کے اپنے گڈے اگے بلداں نوں
 تھوڑا کچا جیا ہو کے تے نوں پا کے میرے اباجی نوں کہن لگا، تایاجی! باپو نے آپ آنا سی پر اوہنوں تاپ چڑھیا

ڈھلا مٹھا جیہا ہے۔ میرے ہتھ اوہنیں سینھیا بھجیا اے بنی مسیتے جا کے ساریاں نوں دس دس میں وی دعائے اپڑنا
کے بنے ہتھوں رہ گیا ایں۔ بڑا چاراماریا پر میرے کولوں ٹریا نہیں گیا۔ ہن بلیہریاں دے ہتھ بانی حشمت لئی دعا بھج رہا
ہے۔ مینوں اپنے نال شامل شریک ای سمجھنا۔

بلیہریاں نے گڈے توں ترپال لاہ کے آکھیا ”باپو نے تیجے لئی آہ دعا بھجی اے تے نالے سنیہا دتا اے بنی
ہن بھڑا ہو گیا چاچے حشمت دے چالیے تے پھیروی دعا بھجوان دا پر بندھ کراں گا۔
گڈے وچ دو بوریاں کنک سی، اک مانی چولاں دی، ویہہ چکی سیر شکرسی تے اک چپا گھنپو دا، دورر جانیاں،
کے تھان چھینٹ دا۔

کا کے بلیہریاں نے اک واری پھیر کپے جے ہو کے آکھیا۔ ”اوجی باپو کہند اسی بنی اپڑتاں میں آج وی جانا
کے پر میرے کولوں چنگلی طراں ٹریا نہیں جاند، پیر چھوٹے جے پین ڈیہہ پنے سن۔“

بائیسکل

اُرتج حساب کریے تے کھی ساں پہلے دیاں کھاں ایں پر جے سن دی تپھی کھول کے ورتے پھو لیسے تے کھل دیں
کھل دی اے۔ اوہی دھپاں، اوہی پیلی رشنائی، اوہی ہوتا لے لا بھریاں دانو ہری تے اوہیوادھید اپریت سماں بوتنا
جیو کھائی ٹی بابونال شرڈلا کے گڈی تو پہلے اگلا ٹیشن لنگھ جائے۔ جیو جی گل میرے ابا نے نہیں سی مٹی ہندی اوہ اسیں تائے
توں دس کے پوری کروالینی، جیو جی شے میری ماں نے لیان توں انکاری ہو جانا اوہ اسیں تائی نوں دس کے پکوالینی۔ چھنے
بھر کے گھر لے آنے آپ وی کھائی تے گھر دیاں نوں وی کھوانی۔ میری ماں نے کہنا ”بی بی تو منڈیاں نوں وگاڑ دس گی۔
ہاگے ای کسے دے آکھے نہیں گڈے توں ایناں نوں ہو روگاڑ وگاڑ دینا ایں۔“

تائی کرپونے ہس کے کہنا۔ ”بھابھی توں چتتا نہ کریا کر، تے بستے وہماں وچ نہ پیا کر۔ ایناں دے آہی تاں
کھان پین دے تے موجاں مارن دے سے ایں۔ پھیر ایناں نے جو لے پٹھاں سردے کے ویلا کڈھنا اے۔ اوہوں
ہیں نے کدھر آکے کہنا اے تائی ساگ پکا دے، تائی کڑاں بنا دے، تائی پوڑے تل دے، ایناں نوں ٹھکھیا نہ کر، جو آنکھن
من لیا کر، اپنے اپنے کم کرتے ہو گئے تے فیر ایناں نے کتھے ملنا اے۔“

میں دسویں دا امتحان دتا تے اپنے ابا کول اوہناں دی ڈپنٹری تے آکے کہیا ”بابا مینوں بائیسکل لے دے
کھن میں ہڈا ہو گیا ایں۔“ تائی لا بھریاں کول ای اک موڑھے تے بیٹھا، کھنڈے جے چاقونال پیراں دے نوں نہ پیا کٹ دا
ہی۔ ہتھ روک کے کہن لگا۔ ”اوائے ملا، بائیسکل نوں پھائے دینا ایں۔ بابے نوں آکھ گھوڑا لے کے دے وے۔ سواری
کریں تے سانوں وی سوہنا لگیں تے سارے جگ نوں وی بھانویں، سیکل وی کوئی سواری اے۔ دفع کر، مار کاٹھ،
یہے نالوں تے بند اپیدل ای چنگا۔“

میں کہیا ”تائی مینوں بائیسکل ای چنگلی گڈی اے تے میں بائیسکل ای لینی اے۔“
میرے ابا نے پکا جیام نہ کر کے آکھیا۔ ”بی اے وچ داخلہ لوں گا تے سائیکل ملے گی ایڈوں پہلاں نہیں۔“

تیرے وہڈے بھرانوں وی بی اے وچ لے کے دتی سی تے تینوں وی اودوں ای ملے گی۔“ میں کش بولے بغیر جواب دے
بناں رون باکا جیا ہو کے ڈپسری باہر آ گیا۔ تے ماں کول آ کے اُچی اُچی روں لگ گیا۔

اگلے دن میں سویرے سویرے اپنے ہرن دے سنگاں نوں تیل لارہیاسی جو مینوں گلی دی نکر تے تاپالا بھ سیلا
آؤندا سیلا۔ اوہ کچ کبا کباتے ٹیڈھا ٹیڈھا مزدا پیاسی تے اوہنوں سمجھ نہیں آؤندی سی جی کبھے ہو کے ٹراں کہ بچے پاس
ہو کے پینڈا کراں۔ کش گابڑ جیاسی۔ اوہدھے ہتھ وچ اک نوں سیکل سی جیدھے ڈنڈیاں تے کھا کی کاغت و حلیٹ
سی۔ تاپالا اوہنوں کدے ہنڈل تو پھڑکے کھچد اسی کدے گدی تو پھڑکے دھکد اسی۔ سیکل ٹیڈھی ہو ہو جاندی سی تے
چوڑے دا ہوئی جاند اسی۔ میں بھج کے، اگے ودھ کے اک ہتھ ہنڈل نوں پالیا تے دو جی بانہہ و حلیٹ کے تائے نوں
لئی۔ اوہنے میرے سرتے دھپا مار کے کہیا: “لے پھڑ اینوں، رون نہ لگ جایا کرا ئیڈی چھیتی تے مرا بھرانوں تنگ نہ
کرتوں ساریاں چوں لاچیں بلاریں؟“

پھیر پتہ نہیں کی ہونیا۔ کس نے منتر بڑھیا تے کس نے جادو کر دتا۔ تاپالا سا تھوں تے اسیں تائے توں دور
ساڑے سنھ وچ کوئی ہو آ کے پھس گیا۔ کسے نے ساڈے اعتبار دی ڈور توڑ کے سانوں اک دو بے توں پرا کر دتا۔
اسیں ایڈھر آئے ایں اور ایسا ویلا سی جدوں تائے تے تائی ہندے ہوئے وی اسیں اک دو بے نوں مل نہیں سکے۔ میرے
دی گنڈھ میری سیکل وہ اتھے ای رہ گئی۔ جیڑھی نہ میرے کول رتی نہ میرے تائے دے گھر گئی۔ کوئی ہو رانی اوہنوں
لکیا۔ کوئی تچا ای سانوں دونوں نوں لٹ کے لیے گیا..... سانوں پتہ نہیں چلن دتا تے اسیں دونوں لٹے گئے۔

احمد ندیم قاسمی

قاسمی صاحب سے دور دور کی ملاقات رہتی تھی۔ عموماً وہ منصورہ کی تحویل میں ہوا کرتے اور ان تک رسائی
کے طفیل ہوتی۔ وہ بھی ان کی حفاظت کسی زس کی سی مستعدی سے کرتی۔ نہ اسے اپنی فکر ہوتی نہ اپنے گھر والوں کی
ہوتا تو دوائیاں پلا دیتی۔ کبھی کبھی کلائی پکڑ کر نبض جانچ لیتی، منصورہ میں ایک شکر گزار روح ہے۔

جس طرح قاسمی صاحب نے ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کی زندگیاں بنائیں، ویسے ہی وہ منصورہ کو
سے منسلک کر کے اس کی صلاحیتوں کو ابھارنے میں لگے تھے۔ خاں صاحب اور میں بڑے شوق سے اس محفل میں

پھر مشکور حسین یاد نے ہمیں شام کے کھانے پر بلایا۔ یہ ادیوں کا کٹھ تھا۔ کھانا Caterers سے آیا تھا۔
کے بعد سب فرشی نشست میں بیٹھ گئے۔ سب ادیوں کی خواہش تھی کہ قاسمی صاحب اور دوسرے موجود حضرات اپنے
سنائیں۔ پھر قاسمی صاحب کچھ اٹھتے بیٹھتے میرے پاس پہنچے۔

”قد سید میرے کچھ کام آؤ گی۔“

ہم دونوں کچھ حیران سے ہو گئے۔

”کیوں نہیں کیوں نہیں، اس کی کیا مجال کہ انکار کرے۔“ خاں صاحب تپاک سے بولے۔

”وہ دیکھتی ہو..... شہزاد احمد کے دائیں ہاتھ۔“

”جی ایک لڑکی ہے۔“

”بھائی لڑکی نہیں میری بیٹی ہے ناہید قاسمی۔ میں اس کا گنہگار ہوں۔ سب کے لیے مجھے وقت ملا لیکن میں اس کی سزا جیتوں کو ابھار نہیں سکا۔ اچھی بھلی شاعرہ ہے لیکن میں اسے مشاعروں میں ساتھ نہیں لے جا سکا۔ اب بھی مشکور اسے سزا دینی لے آیا ہے ورنہ میں تو شاید اسے کبھی ساتھ نہ لاتا۔“

”شاعری کے علاوہ کیا کرتی ہے ناہید؟“

”پی ایچ۔ ڈی کر رہی ہے۔“

اس کے بعد میں نے ناہید کے قریب ہونے کی کوشش ضرور کی لیکن ایسے کام جس کو اترا اور پیہم گمن کے ساتھ کیے جاتے ہیں، مجھ میں اس کی اہلیت نہ تھی۔ لوگوں کو اُن کی من چاہی منزلوں تک پہنچانے کا فن قاسمی صاحب اور خاں صاحب ہی جانتے تھے۔ نقل و حرکت اور اصل کی طرح نہیں چل سکتی۔

”فنون“ اور منصورہ کی وساطت سے مجھے قاسمی صاحب ملتے رہے۔ پھر خاں صاحب کے جانے کے بعد تیسرے دن ہمارے گھر پر بہت سے رشتہ داروں اور ادیبوں کی بھینٹ تھی۔ سب چپ چپ کھوئے کھوئے سے تھے جیسے راستہ بھول گئے ہوں یا رہبر گم ہو گیا ہو جو انہیں راستہ دکھائے۔

مولوی صاحب اور ان کے شاگرد اونچے اونچے پارے پڑھنے میں مشغول تھے۔ گفتگو اول تو تھی ہی نہیں اور اگر تھی بھی تو کھسر پھسر کے انداز میں..... پھر کسی نے مجھے پیغام دیا ”آپ کو قاسمی صاحب بلا رہے ہیں۔“

قاسمی صاحب کے ساتھ والی کرسی خالی تھی۔ میں چپ چاپ اس پر بیٹھ گئی۔ چند منٹ قاسمی صاحب کچھ نہ بولے۔ پھر گویا ہوئے۔

”تدسیہ! مجھے تمہارے شوہر کا بڑا سہارا تھا۔ آج میرا بازو ٹوٹ گیا۔ میں اور کیا کہوں جس کا بازو جاتا رہے، وہ کیسے بے سہارا ہو جاتا ہے۔“

دونوں جانب خاموشی طاری ہو گئی۔

پتہ نہیں اس دار الفنا میں انسان کیسے کیسے سیکھتا ہے، کبھی گنوا کر کبھی لٹا کر کبھی حاصل کر کے..... اور جاپے یہ سیکھا ہوا سے یاد بھی رہتا ہے کہ نہیں؟

احمد بشیر

ممتاز مفتی ہماری زندگی میں بہت سے لوگ لے کر آئے۔ ان میں سے ایک احمد بشیر بھی تھے۔ گھنگریا لے بال، سانولا رنگ، بھرا بھرا سا جسم، ان کا رشتہ خاں صاحب سے رشک اور حسد سے ملا جلا تھا۔ وہ خود جس ہر دل عزیز کے متمنی تھے، وہ خاں صاحب کے گھر کی لونڈی تھی۔ بھائی احمد بشیر اس طرح الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ نہیں تھے اور شہرت اب

الیکٹرانک میڈیا کی مرہون منت ہو چکی تھی۔

لیکن اللہ میاں ہر مقام پر تلافی کے سامان پیدا کر دیتا ہے۔ جب تا دیر کوئی شخص اندر ہی اندر کسی خواہش پر مرتا ہے، اس کے لیے مرا جاتا ہے۔ اس کے پورے ہونے کی آرزو، اس کے اندر دم نہیں توڑتی تو اشک شوقی کے طور پر کس سے اس کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

احمد بشیر کے چار بچے تھے جو ابھی پروان چڑھ رہے تھے اور ان کی شخصیتیں ابھی نکھری نہ تھیں۔ ان چار بچوں میں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بیٹا امریکہ چلا گیا اور وہیں سٹبل ہو گیا، لیکن بیٹیوں نے احمد بشیر کے نام کو روشن کرنے کا بیڑا اٹھ لیا۔ سب سے بڑی نیلم احمد بشیر دنیائے ادب سے وابستہ ہو گئی، لیکن ناروے سے پہلے وہ امریکہ اپنے شوہر کے ساتھ چلی گئی تھی۔ افسوس خد متیں کرنے، ہاتھ پاؤں جوڑنے کے باوجود اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی۔ اس کے بچے وہیں باپ کے پاس رہ گئے اور نیلم خالی ہاتھ پاکستان آ گئی۔ احمد بشیر نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ نیلم نے اب دنیائے ادب میں اپنا مقام تلاش کر لیا ہے اور بھائی احمد بشیر کی تلافی ہو گئی۔

دوسری بیٹی بشری نے الیکٹرانک میڈیا پر دھاوا بول دیا اور وہ مارا ماری کی کہ بڑے بڑے نام مانہ پڑ گئے پروڈیوسر اقبال انصاری کو تو اس شہرت کا تھوڑا فائدہ ہوا لیکن احمد بشیر کی شان دو بالا ہو گئی۔ اس سے چھوٹی بہن کی شادی ایک کرنل سے ہوئی لیکن ازدواجی زندگی قسمت میں نہ تھی۔ باپ کے پاس لوٹ آئی اور اب ٹیلی ویژن سے وابستہ ہے۔ پروڈیوسر کا کام کرتی ہے۔ ایک اور بہن سنبل بھی ٹیلی ویژن پر گاتی ہے اور ان دنوں بچوں کے پروگرام ”وک“ میں شرکت کرتی ہے۔

اصل میں احمد بشیر بھائی کی جان ان کی بیگم مودی میں ہے۔ انہوں نے جب ”نیلا پربت“ فلم بنائی تو اس کے لیے شہاب صاحب سے چار لاکھ روپیہ لیا۔ شہاب صاحب پیر دیتے وقت تو ذرا بھی متذبذب نہ ہوئے لیکن ایک دن بونے سرسری انداز میں انہوں نے خاں صاحب سے کہا۔ ”یار یہ ”نیلا پربت“ مجھے چلتی نظر نہیں آتی۔ اس کا موضوع ہی ”یہ ہے۔“

احمد بشیر کو مودی سے بہتر کوئی سگر نظر نہ آئی اور مودی بیگم نے کسی پروفیشنل عورت کی طرح یہ گانے گائے۔ گانے تو فلاپ نہ ہوئے اور کئی بار الیکٹرانک میڈیا پر سنے گئے لیکن یہ فلم دو روزہ ایک کہیں بھی کامیابی سے ہمکنار نہ ہوئی۔

آذر زوبی

آذر زوبی سے خاں صاحب کی دوستی میری شادی سے بہت پہلے کی تھی۔ وہ ان کے ان محدودے چند دوستوں میں سے تھے جو اٹلی جانے سے پہلے خاں صاحب کے پاس 1- مزنگ روڈ آیا کرتے تھے۔ فرش پر خاں صاحب کے ساتھ سوتے۔ اماں جی کھانا بھجواتیں تو صبر شکر سے کھا لیتے۔

زوبی بھائی میں مصور کی ازلی بیگلی تھی۔ وہ اپنے راستے کا تعین چاہتے تھے لیکن یہ تعین کسی استقامت کے ساتھ

من کے اندر نہیں ہوتا تھا۔ جن دنوں خاں صاحب تراڑ کھیل میں ایک ٹرک میں ریڈیو پاکستان کے پروگرام کر رہے تھے، ان دنوں زوہبی صاحب نے اوپن ایئر تھیٹر میں اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ اس وقت اوپن ایئر تھیٹر میں سٹیج کے پیچھے تین کمرے اور غسل خانہ ایک سیٹ کے طور پر موجود تھے۔ ان ہی میں زوہبی صاحب نے بسیرا کر لیا اور وہ اپنا ایزل برش پینٹ لگا کر تصویریں بنانے لگے۔

وہ غالباً تجریدی آرٹ کے پہلے مصور تھے۔ ان کی معروف پن ڈرائنگ میں آپ کو ایک مرد کی آنکھ رکھنے والا گھوڑا اور ایک نیم خوابیدہ حسینہ کا سہیل نظر آتا ہے۔ یہاں زوہبی صاحب سے ملنے ادب دوست، آرٹسٹ آنے لگے۔ پتہ نہیں لارنس گارڈن میں کچھ ایسی کشش ہے کہ پہاڑی کا اثر ہے، شاید اوپن ایئر تھیٹر میں رومانیت کی رو چلتی ہے کہ کافور کے چھنکار کے درخت کا اثر..... شاید باہارت مزار کے ارد گرد ایسی Frequency موجود ہے کہ انساں کشاں کشاں اُدھر کھینچا چلا جاتا ہے۔

اس جگہ آرٹسٹ تو کم بنے لیکن ادیبوں کی ایک منڈلی تیار ہو گئی۔ ممتاز مفتی، یوسف ظفر مع اشفاق احمد صاحب۔ جب بھی آتے گفتگو کا زعفران کھل اُٹھتا۔ کبھی کبھی جلیلہ ہاشمی اور قرۃ العین حیدر بھی جا نکلتیں لیکن نثار عزیز باقاعدگی سے آنے لگیں۔ نثار میں ایک بڑی ادیبہ کے جراثیم موجود تھے۔ وہ سب کی توجہ سمیٹ لیتیں۔ اشفاق احمد اور نثار میں خصوصی تعلق پیدا ہو گیا کیونکہ دونوں پٹھان تھے اور اظہار کے بغیر محبت کا اظہار کرنا جانتے تھے۔ اس تعلق کی پاسبانی ابھی تک نثار کرتی ہیں۔

جب 24۔ ایس کینال پارک میں خاں صاحب آنے لگے تو ایک دن وہ آڈرزوہبی کو اپنے ہمراہ لے آئے۔ کالا پھانک کھول کر اندر آئے تو میں کیکر کے درخت تلے بیٹھی تھی۔ ”یہ میرا دوست آڈرزوہبی ہے۔ میں اسے تمہیں ملانے لایا ہوں۔ افسوس اپنے آنے کی تمہیں پہلے سے اطلاع نہ دے سکا۔“

ترنت میں نے لاٹو کو بازار بھیجا اور وہی، برنی اور نمک پارے منگوا لیے۔ سارا وقت دونوں دوست اپنی باتیں کرتے رہے اور زوہبی صاحب نے بھی مجھ سے کوئی سوال جواب نہ کیے۔ 1950ء میں ابھی ہمارے امتحان نہ ہو پائے تھے کہ زوہبی بھائی روم چلے گئے۔ وہاں Radio Italiana کے اردو پروگرام لکھتے۔ ان کو براڈ کاسٹ کرتے اور خطوں کے جواب دیتے۔ اٹالیا نہ کے گرتا دھرتا ان سے خوش تھے۔ صرف مشکل یہ تھی کہ زوہبی بھائی کا کنٹریکٹ فقط دو سال کا تھا اور شرائط کے مطابق اس معاہدہ میں توسیع ممکن نہ تھی۔

زوہبی بھائی نے خاں صاحب کو لکھا کہ تمہارے لیے یہ گولڈن چانس ہے۔ تم یہ پروگرام بہ سہولت کر سکتے ہو۔ پھر تمہارے پاس ایم اے کی ڈگری بھی ہے۔ تم ISMEO میں اردو پڑھا سکو گے۔ ابھی ابھی یہاں اطالوی طالب علموں کو اردو پڑھانے کا سیکشن کھلا ہے۔ یہاں موقع ہے، فائدہ اٹھاؤ۔ میرا گھر 16-Catore موجود ہے۔ تم کو وہ مل جائے گا۔ خاں صاحب بھی چھوٹے چھوٹے سفروں سے چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے اکتا چکے تھے۔ انہوں نے اسے امداد نیبی سمجھا اور لمبی اڈاری کے لیے تیار ہو گئے۔ جوائن کرنے سے پہلے جب وہ کراچی پہنچے تو زوہبی واپس آ چکے تھے۔

آخری مرتبہ جولمباخط مجھے خاں صاحب نے ساحل سمندر سے لکھا، زوہبی صاحب کے گھر سے لکھا۔

بہت سال بعد زوہبی صاحب واپس آ گئے اور انہوں نے ایک آرٹ سکول کراچی میں بنا لیا۔ اس میں وہ طالب علموں کو آرٹ کے رموز سکھایا کرتے۔ ان کی گھریلو سیاق و سباق میں زوہبی صاحب نے اپنے گھر کے خواب دکھتی رہی لیکن آرٹ سکول میں ایک طالب علم صفری بی بی پہلے ان کی منظوری نظر بنی، پھر بیوی ہو گئیں۔ صفری مجھے اور خاں صاحب کو ملنے آتی رہتی تھی۔ ہم بھی ایک بار زوہبی بھائی کے School of Decor میں گئے۔ خاں صاحب چیف گیٹ اور تقریب انعامات تسلیم کرنے کی تھی۔

لیکن کسی کو کیا پتہ کہ مستقبل ہمارے لیے کیا چھپائے رکھتا ہے۔ صفری کی کچھ ان بن زوہبی بھائی کے ساتھ رہنے لگی۔ زوہبی بھائی گھر چھوڑ کر سکول میں منتقل ہو گئے۔ صفری گھر میں اکیلی رہنے لگی۔ قضائے کار ایک دن صفری اپنے گھر کے فرش پر مردہ پائی گئی۔ آنا نانا اس کے گھر والوں نے پولیس کا درکھنا کھنایا۔ پتہ چلا کہ موت طبعی نہ تھی بلکہ اسے ہاتھوں کے پھٹنے میں کس کر کسی نے گلا گھونٹ دیا تھا۔

الزام زوہبی صاحب کے سر تھوپ دیا گیا۔ زوہبی صاحب اپنی بے گناہی ثابت کرنے والے نہ تھے، خاموشی رہے اور دھر لیے گئے۔ خاموشی سے جیل بھگتی۔ معتوب ٹھہرے۔ خاں صاحب جب تک حیات رہے، زوہبی صاحب ہمارے پاس آتے رہے۔ اب وہ تصور بھی جانے لگے تھے لیکن دونوں نے صفری بھائی کا نام کبھی نہیں لیا۔ سکول آف ڈیکور زوہبی صاحب کے جیل جانے پر بند ہو گیا۔ واپسی پر ان کے نظریات میں زمین آسمان کا فرق پڑ چکا تھا۔ وہ قرآنی تعلیمات، نظریہ پاکستان اور اقبال کے نظریات سے متاثر ہو کر تصویریں بنانے لگے۔

زوہبی انتقال کر چکے ہیں۔ اس کا ذکر ضروری ہے۔

اقبال کی Interpretation جس طرح آذر زوہبی صاحب نے کی ہے، اس کی نقل کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں۔ اب وہ جس مقام پر پہنچ چکے ہیں، اس کا حوالہ ساتھ ملفوف ڈاکٹر محمود الرحمن کے مضمون سے کیجیے۔

اقبال..... آذر زوہبی کی نظر میں

ڈاکٹر محمود الرحمن

28 اگست 1922ء کو پنجاب کے مردم خیز قصبہ قصور کے ایک غریب گھرانے میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ ماں باپ نے اس کا نام عنایت اللہ رکھا۔ کھیتی باڑی کرنے والوں کے ماحول میں یہ واحد بچہ تھا جو نہ کدال پکڑتا نہ کھرنی ہاتھ میں لیتا۔ وہ تو بس لکڑی کے کوسلے یا سفید کھریا مٹی سے دیواروں پر لکیریں بناتا رہتا۔ ماں باپ، رشتہ دار اور محلے والے اس کی حرکتوں سے نالاں رہے مگر عنایت اللہ اپنے کام میں مگن تھا۔ کسی طرح اس نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور گھر سے بھاگ کر لاہور آ گیا تاکہ ڈرائنگ اور پینٹنگ کی باقاعدہ تعلیم حاصل کر سکے۔

نیشنل کالج آف آرٹس کے پرنسپل سے ملاقات کے لیے وہ تین دن تک چکر لگا تا رہا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر چوتھے روز زبردستی پرنسپل کے کمرے میں گھس گیا۔ پرنسپل گپتانے میلے کھیلے شلوار کرتے میں ایک دیہاتی لڑکے کو دیکھا تو

مے سے سرخ ہو گیا اور چڑاسی کو بلا کر کہنے لگا۔

"Throw this boy out."

قبل اس کے کہ کان پکڑ کر کمرے سے نکالا جاتا، عنایت اللہ نے جھٹ بگل میں دہلی اپنی تصویریں میز پر پھیلا دیں۔ پرنسپل گپتا نے انہیں دیکھا اور ایک دم نرم پڑ گیا۔ کہنے لگا کہ دو روپے نکالو اور یہ فارم بھردو۔ عنایت نے دس آنے کا میز پر رکھ دیئے اور یہ کہا:

"سرجی! بس یہی ہے۔ قصور سے ایک روپیہ لے کر چلا تھا۔ چھ آنے کرائے اور کھانے پینے میں خرچ ہو گئے۔" ہندو پرنسپل گپتا نے اپنی جیب سے دو روپے ادا کر دیئے۔ داخلے کے لیے امتحان ہوا۔ قصور کا یہ الہردیہاتی لڑکا پاس ہو گیا اور اسے داخلہ مل گیا۔ 1943ء میں اس نے آرٹ میں ڈپلومہ حاصل کر لیا۔ بعد ازاں مصوری کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اٹلی کے دارالحکومت روم پہنچا اور 1954ء تک وہاں قیام کیا۔ پھر اس کو پرلگ گئے اور وہ بین الاقوامی شہرت یافتہ آرٹسٹ کے طور پر پہچانا جانے لگا۔ اس قصوری لڑکے عنایت کو اس کے جگری دوست مشہور افسانہ نگار اشفاق احمد نے آذربائیجان کا بانکاسا نام دیا اور وہ اسی نام سے تمام دنیا میں مشہور و معروف ہوا۔

کلام اقبال کی ترمین کرنے والے مصوروں میں قصور کے یہ آرٹسٹ آذربائی بھی شامل ہیں۔ ان کا اپنا رنگ و نشان ہے۔ وہ محض مصور، خطاط اور مجسمہ سازی ہی نہیں، ادب آشنا بھی ہیں۔ شعر و نغمہ کی ماہیت پر انہیں جو عبور حاصل ہے، اس کی نمایاں مثال "شعور" جیسا ان کا منفرد رسالہ ہے کہ جب نکلا تو اردو داں طبقے کی آنکھوں کو خیرہ کر گیا اور جب بند ہوا تو دنیا نے ادب سونی ہو گئی۔

ادب شناسی کا یہی فطری جذبہ تھا جس نے کلام اقبال کی آفاقیت کا احساس دل آذر میں جاگزیں کیا۔ انہوں نے اپنے انفرادی رنگ میں شاعر مشرق کے افکار کی تشریح کی ہے۔ ان کے بنائے ہوئے خاکے منفرد انداز سے مفکر پاکستان کے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں۔ زوہبی کے خطوط میں بڑی ہمہ گیری، بڑا تنوع اور بڑی پہنائی ہے۔ ان کی ہر تصویر اقبال کے فکرو فن اور انداز و اسلوب کی غماز ہے۔

آذربائی نے کلام اقبال کی پہنائی میں غوطہ زن ہو کر معنی و مفہوم کے جو موتی نکالے اور انہیں جس فنکارانہ پیک دستی سے خطوط اور دائرے میں پرویا ہے، وہ ان کے عظیم مصور ہونے کی دلیل ہے۔ اس کی نمایاں مثال علامہ کی شہرہ آفاق نظم "شکوہ" کی ترمین ہے۔

جیسا کہ اقبالیات کے قاری کو علم ہے، نظم "شکوہ" اردو شاعری میں انفرادی مقام کی حامل ہے۔ اس میں خدا سے خطاب کا ایک نیا اور انوکھا انداز ہے۔ اس میں حمد و ثنا کی مشرقی روایت سے انحراف کر کے ایسا طرز تکلم اختیار کیا گیا ہے جس میں گن گرج ہے، زور ہے، توانائی ہے، بے باکی ہے، انا ہے، احساس خودداری ہے، بندے کی شناخت ہے، جذبہ شخص کا اظہار ہے، رنج و ملال کی ترجمانی ہے، شکوہ و شکایت ہے اور نظر انداز کیے جانے کا صدمہ و غم ہے۔ یہ وہ تاریخی نوعیت کی نظم ہے جو علامہ نے اپریل 1909ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں سنائی تھی۔ اسلامیہ کالج، لاہور کے ریواز ہال میں موجود سارا مجمع اقبال کی سحر انگیز آواز اور کلام کی اثر آفرینی سے سراپا مسحور تھا۔ جب ستمبر

1924ء میں ”بانگِ درا“ شائع ہوئی تو نظم ”شکوہ“ پورے برصغیر کے مسلمانوں کی آواز بن گئی۔ اس لیے کہ بقول پروفیسر عبدالقادر سروری:

”اس میں جس شاعرانہ انداز سے مسلمانوں کی پستی کا گلہ خدا سے کیا گیا ہے، اس میں الہام ربانی کی شان نظر آتی ہے۔“

ایسی الہامی نظم کے مفہوم کو موئے قلم سے ظاہر کرنا آذر زوہبی کے کمال کی دلیل ہے۔ ان کی وسیع انظری اور فنکارانہ صلاحیت نے ہر بند کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ہر تصویر اپنی آواز کا جادو جگا رہی ہے۔ مثلاً نظم کا پہلا بند ہے۔

کیوں زریاں کار ہوں، سو فراموش رہوں
فکر فردا نہ کروں، جو غم دوش رہوں
نالے بلبل کے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
ہمنوا! میں بھی کوئی گل ہوں کہ خاموش رہوں
جرات آموز مری تاب سخن ہے مجھ کو
شکوہ اللہ سے خاتمِ بدہن ہے مجھ کو

مفہوم یہ ہے کہ میں کب تک خاموش بیٹھا اپنی بربادی کا تماشا دیکھوں۔ کب تک اپنے حسین مستقبل سے ناخوش رہوں۔ جب مجھے قوتِ گویائی حاصل ہے تو کیوں نہ اللہ سے شکوہ کروں اور رودادِ غم سناؤں۔

مذکورہ بند اور اس کے معنی و مطلب کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم آذر زوہبی کے بنائے ہوئے اسلوب کا مطالعہ کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان چھ اشعار میں پنہاں اقبال کے جذبات، تفکرات، مشاہدات اور خیالات زوہبی کے نقش میں اس طرح حلول کر گئے ہیں کہ ہر خط، ہر لکیر اور ہر دائرہ نغمہ و لے کی اثر آفرینی، عورت کے پس منظر میں تیرا جھک اور درندہ صفت دنیا کا ہیولا۔ یہ سب کچھ وہی عنصر ظاہر کر رہا ہے جو اقبال کے ذہن میں جاگزیں ہے۔ زوہبی نے خدا کے سہارے اسی عنصر کو زندگی سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔

غرض ”شکوہ“ پر مبنی ہر اسلوب زوہبی کی ذہنی بالیدگی، تاریخی شعور، سخن فہمی، وسیع انظری اور فنکارانہ چابکدستی کا مظہر ہے۔ ان کی اس کوشش نے اقبال شناسی کے فن کو فروغ دیا ہے اور عوام الناس کو شاعر مشرق کے آفاقی کلام سے قریب کر دیا ہے۔ یہ ان کا اردو ادب پر راقبالیات پر اور اسلام کی تاریخ پر بہت بڑا احسان ہے۔

الطاف فاطمہ

پتہ نہیں الطاف فاطمہ خاں صاحب کو کب کا جانی تھی۔ غالباً جب وہ اسلامیہ کالج میں اسٹنٹ پروفیسر تھی۔
سے خاں صاحب سے ملنا ملنا ٹھہرا۔

الطاف فاطمہ کالج کے سامنے مین سڑک سے ہٹ کر ایک چھوٹی سی کونھی میں رہتی تھی۔ پتہ نہیں نشاط فاطمہ

تھے۔ یہ سچے مقیم تھے کہ کہیں اس کا گھر بھی پاس ہی تھا۔ دونوں بہنیں لکھتی تھیں، لیکن الطاف فاطمہ کی کلا ہولے ہولے جگ رہی تھی۔ ہر خاں صاحب الطاف فاطمہ سے بہت متاثر تھے کیونکہ ایک تو اس کا گھر علمی، ادبی، مذہبی روایات کا حامل تھا۔ پھر حسین اس کے سگے ماموں تھے۔ یہ ہمارے لیے ایک بہت بڑی ادبی شناخت تھی کیونکہ رفیق حسین کی کتاب ”گوری“ کے افسانے ہم بار بار پڑھتے تھے۔

الطاف فاطمہ کبھی کبھی پیدل ”داستان گو“ کے دفتر میں آ جاتی، کبھی نشاط ان کے ہمراہ ہوتی۔ یہ ملاقاتیں ادبی صحبت کی ہوا کرتیں۔ ”داستان گو“ میں اس کی دو تین کہانیاں بھی چھپی تھیں۔ مجھے ان مہاجرین سے گہری ہمدردی ہے، جو داستان اس امید پر آئے تھے کہ ہم سب ایک ہیں اور مسلمان کی اصل شناخت اسلام ہے، لیکن یہاں پہنچ کر سب کو اپنی یہ حالت دکھائی دے رہی تھی، رہن بہن کا خوف چٹ گیا اور اسی خوف نے بھانت بھانت کے اختلافات کو جنم دیا۔ پتہ نہیں الطاف فاطمہ کہاں کھو گئیں۔ اس کا شائستہ لب و لہجہ، نشست و برخاست کبھی یاد آتا ہے تو جی چاہتا ہے کسی ٹرٹ میں اچانک اسے میرے گھر کا راستہ مل جائے۔

محسن احسان + شفقت

محسن احسان اور شفقت اسلام آباد میں رہتے تھے۔ میں اس جوڑے کا تصور علیحدہ علیحدہ نہیں کر سکتی۔ جب کبھی یاد ہو آتے، ہم سے ضرور ملنے اور ہم جب اسلام آباد پہنچتے تو ان کو ضرور خیر کر دیتے۔ ایسے ہی ایک موقع پر ایک روز ہم ایوبیہ پارک دیکھنے گئے۔ خاں صاحب اور محسن احسان مزے سے ایک بیچ پر بیٹھ کر میاں اور ادبی گفتگو کرتے رہے لیکن میں اور شفقت اندر گھومنے پھرنے چلی گئیں۔ اس روز شفقت میری چھوٹی بہنوں کی طرح اپنے چھوٹے چھوٹے بے ضرر رازوں کو بے نقاب کرنے پر تھی۔ شفقت سے ملنا بڑی پرائیویٹ ملاقات تھی۔ ہم خوب ہنسے، لڑکیوں کی طرح شرمائے لگائے..... اس ملاقات کا اثر ابھی تک زائل نہیں ہوا۔ اسی لیے آپ کو وہ تصویریں دکھانا چاہتی ہوں جو میرے لیے اعزاز کا باعث ہیں۔

ڈاکٹر انور سجاد

ڈاکٹر انور سجاد ان لوگوں میں سے ہیں جو ہر طرح فٹ آتے ہیں۔ الیکٹرونک میڈیا کی طرف نظر ڈالیں تو وہ میڈیوں میں بھی قابل ذکر، لکھنے والوں کی فہرست دیکھیں تو بھی سرفہرست۔ ان کی کام کی رفتار کچھ ایسی تخلیقی قوتوں کی نشانی سے بھری ہے کہ دو بیویوں کے باوجود ان کی رفتار سست نہیں پڑی۔

پہلی بیوی کے ساتھ اولاد نہ ہونے کی وجہ سے جو کچھ بھی تنازع تھا، اسے انور کے بہت قریبی جان کاروں کے ساتھ کوئی نہیں جانتا۔ فنکاروں کی ایک مشکل عام آدمیوں سے ذرا مختلف ہے۔ جب ایکٹرس کی فنکار کے ساتھ بار بار عشقیہ

ڈائلاگ بولنے کی سچائی میں دور تک دھنس جاتا ہے تو اس کا باہر کا حال اندر کی کیفیت سے مل جاتا ہے۔ یہاں ہی مجھے نبھانے کے وعدے ہو جاتے ہیں اور ہیرا اور ہیروئن کو علم تک نہیں ہو پاتا۔ جب زیب اور انور سجاد دیر تک اور دور تک کھیل میں اتر گئے تو شادی ناگزیر تھی۔

اب انور کی پچیاں بڑی بڑی ہیں۔ وہ کبھی کبھی انہیں مجھ سے ملانے آتا ہے۔ ”جیوسوپر“ کا سنبھالنے والا ہے۔ میڈیا سے اتنی پرانی وابستگی نے اس میں اس شعبے سے متعلقہ لوگوں سے خاص رابطے قائم کرنے کا سلیقہ دے رکھا ہے۔

انور خاور

”جیوسوپر“ کا ایک دفتر لاہور میں ہے جسے انور خاور سنبھالتے ہیں۔

ایک وقت تھا جب انور خاور شہدہ شاعر کی حیثیت میں ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ میں اس کی شاعری کو اب بھی معترف تھی اور آج بھی اس کے اشعار مجھے متاثر کرتے ہیں۔ اس کے تخلیقی عمل کی اسے ویسی شہرت نہ ملی جس کے دارتھا لیکن یہی مشکل ہے یہاں شہرت آپ کے کام اور محنت کے حوالے سے نہیں ملتی بلکہ اوپر والے کی مرضی ہے۔ جس قدر وہ چاہے جس قدر وہ توفیق عطا فرمائے، عطا ہو جاتی ہے لیکن انور شاید اس کی قابلیت کا میری طرح قائل ہے۔ اس نے لاہور کی برانچ اس نے انور خاور کے سپرد کر دی ہے۔

دونوں طرف کا کام آرام، شائستگی سے چل رہا ہے۔ چھوٹی چھوٹی اڑچنیں، خرابیاں، نالائقیاں دونوں طرف سے سرزد ہوتی ہوں گی لیکن یہ تو ہر کام کے اندر ہمیشہ چھپی ہوتی ہیں اور ان کی وجہ سے کام آگے بڑھتا ہے۔ مجھے انور خاور سے چھوٹے بھائیوں کا سا پیار ہے۔ میں اس کی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو اسی طرح معاف ہوں جس طرح میں اپنی بڑی بڑی غلطیوں کو درگزر کرتی ہوں۔ اس نے میرے کئی ڈراموں میں معرکے کا رول ادا کیا ہے اور میرا خیال ہے اسی کی وجہ سے یہ ڈرامے مقبول بھی ہوئے ہیں۔

واجدہ تبسم

ہم 121-سی میں آچکے تھے جب خاں صاحب اور واجدہ تبسم کے درمیان خط و کتابت کا سلسلہ چل گیا۔ دن وہ کھانے کی میز پر لکھنے پڑھنے کا سامان دھرے چپ چپ بیٹھے کبھی کبھی دو سطریں لکھ لیتے، پھر رک جاتے۔ جھاڑن سے گریاں صاف کرنے میں مشغول تھی۔ میں نے بھی رک کر پوچھا..... ”خاں جی مسئلہ کیا ہے؟“

”مسئلہ تو کچھ نہیں، بس خط لکھ رہا تھا۔“

”اچھا..... کسے؟“

”واجدہ تبسم کو۔ بہت بڑی افسانہ نویس ہے۔“

میں اس نام سے قطعی ناواقف تھی۔

”کبھی وقت ملے تو اس کے افسانے پڑھو۔“

مجھے واجدہ تبسم کو جاننے، پڑھنے اور اپنی رائے قائم کرنے میں بہت وقت لگا۔ وہ حیدرآباد میں رہتی تھی اور اس تک رسائی کا ذریعہ تھے۔ خط بھی لکھے اور جب وہ ہندوستانی لکھنے والوں کے ساتھ پاکستان آئی تو وہ بڑی مدت سے مجھے ملنے بھی آئی۔ آپ واجدہ کی کہانی خود اس کی زبانی سننے کے لیے اُس کی تحریر بعنوان ”میری کہانی“ کا مطالعہ کیجیے۔

پروین عاطف

پروین عاطف کو آج اردو داں طبقہ بہت بڑی لکھاری کے طور پر جانتا ہے۔ احمد بشیر، ان کی بیٹی نیلم احمد بشیر نے جب میں اپنا مقام بنا رکھا ہے۔ احمد بشیر کا گھرانہ تخلیقی نیرنگیوں کا حامل ہے۔ نیلم کی دونوں بہنوں نے ٹیلی ویژن پر دھوم مچائی ہے۔ بشری انصاری کا میڈین کونسلر ہے اور دوسروں کی نقل اتارنے میں اپنا ثنائی نہیں رکھتی لیکن میں اس وقت سب سے زیادہ مشہور احمد بشیر کی چھوٹی بہن پروین عاطف کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتی ہوں۔

یہ ان دنوں کا ذکر ہے جب مفتی جی داستان سرائے کا حصہ بنے اور ان کا پٹنگ ڈرائنگ روم میں لگایا جاتا ہے۔ مفتی جی سے ملنے لوگ چلے آتے تھے۔ مجھے عموماً آنے والوں کی خبر نہ ہوتی۔ پھر اچانک ایک دن مجھے مفتی جی سے ملنا پڑا۔

”قدسیہ ایک بُری خبر ہے۔“

”مفتی جی! کبھی اچھی خبر بھی دے دیا کریں۔ بری خبروں کے لیے تو سارا شہر بھرا ہے۔“

”کیا کیا جائے اس وقت تو یہی حاضر حال ہے۔ تمہیں میری مدد کرنا ہوگی۔ یہ ضروری ہے۔“

مفتی جی نے مجھے بتایا کہ پروین عاطف نے کچھ زہر وغیرہ پھانک لیا ہے اور اس وقت ہسپتال میں داخل ہے۔ یہ سب کچھ پروین عاطف کے شوہر بریگیڈیئر عاطف نے ایک من چاہی عورت سے رابطہ قائم کر لیا تھا اور پروین عاطف کی طبیعت کے عوض اسے ٹھکرا کر علیحدہ ہو گئے ہیں۔

بریگیڈیئر عاطف ہاکی کے کرتا دھرتا اور چیف تھے۔ ہر بڑے آدمی کی طرح ان کا زیادہ وقت ہاکی کے ساتھ گزارا اور وہ گھریلو تعلق درست نہ رکھ سکتے تھے۔ یہ نہیں کہ انہوں نے کوشش نہیں کی۔ انہوں نے پروین عاطف کو ساتھ لے کر پروان چڑھانے کے لیے پہلی بار پروین عاطف کو عورتوں کی ہاکی ٹیم کا چیف بنایا لیکن اس توجہ کے باوجود وہ ایک عرصے تک تازگی کا شکار ہو گئے۔

میں ایک بات سوچتی ہوں کہ محبت ایک ایسا وصف ہے کہ اگر اس کی خوبی کو فقط اس کی خاطر نہ اپنایا جائے اور اس بات پر ایمان نہ ہو کہ مجھے جو محبت کرنے کا شرف عطا ہوا ہے وہ بذاتِ خود میرے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے تو بڑے مسئلے

اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ محبت کے بدلے محبت کی توقع سے پروین عاطف کی طرح خود کش ہونے کی مشکل پر دیکھتی ہے۔ پروین عاطف اپنے شوہر کی پرستار اس کے قدموں میں زندگی بسر کرتی آئی ہے۔ عاطف اس کے لیے پانی، گرمی سردی کے بچاؤ کی صورت تھا لیکن اندر ہی اندر کہیں وہ اس توقع پر بھی جی رہی تھی کہ اس آرتی کے اُتار سے مورتنی بھی اسے کچھ عطا کرے گی۔

جب مجھے مفتی جی نے پروین کے متعلق اطلاع دی کہ وہ ہسپتال میں ہے تو میں گویا اسی موقع کی تلاش میں تھی فوراً پروین کی کمک کو پہنچی۔ مجھے اپنے آپ کو اچھا اور بہتر ثابت کرنے کے لیے ایک موقع دستیاب ہوا۔ میں نے پروین کے لیے مفتی جی مثبت آدمی تھے۔ انہوں نے پروین کو لکھنے پر راغب کیا اور ہر ملاقات پر ”لکھ لکھ لکھ“ کی رٹ لگا دی۔ مجھے ہرگز اس کے لکھنے لکھانے سے غرض نہ تھی۔ میں اسے اپنا بغل بچہ بنا کر ساتھ رکھتی۔ اس کے زخموں کو دیکھنے کی کوشش کرتی۔ اسے ہرگز نہ بھولنے دیتی۔ نہ خود بھولتی کہ اس کے ساتھ اتنی زیادتی ہوئی۔ پروین کو میری جوتیوں کی عادت نہ پڑی کہ وہ ہر صورت مجھ تک پہنچتی۔

ایک دن کیا دیکھتی ہوں کہ ایک دودھ والے ریڑھے پر پروین عاطف سوار ہے۔ ریڑھا ہمارے گھر کے رکا۔ پروین اندر آئی۔ حسن اتفاق سے میں باہر کھڑی تھی ورنہ وہ مجھے کبھی نہ بتاتی۔

”ریڑھے پر..... کیسے کیوں؟“

وہ ہمیشہ کی طرح لجاجت سے بولی۔ ”گلیبرگ تک تو رکشہ پر آگئی تھی بانوجی، لیکن آج رکشہ ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی ادھر آنے کو مائل نہ ہوتا تھا۔ میں بڑی دیر کھڑی رہی۔ پھر یہ جون جو کار ریڑھے والا مل گیا۔ یہ ادھر بڑی آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ آگئی۔“

”لیکن پروین اگر کوئی دیکھ لیتا..... تو۔“

”تو پھر کیا بانوجی۔ کہہ لے اسے جو کہنا ہے۔“

میں اس کی جرأت پر حیران ہوئی۔ شاید میں ایسا قدم کسی کی خاطر نہ اٹھا سکتی۔ یہیں سے میرے دل سے اس کے لیے جذبہِ برترم کے ساتھ ساتھ اس کی عظمت کے آگے ایک کمتری کا احساس بن کر بھی ابھرا۔ محبت میں اپنے آپ کو تحفظ کی نہ پروا کرنے والا احمد بشیر کا سارا گھر اندہ ایک سا ہے۔ یہ لوگ رتی بھر محتاط نہیں۔ شیشہ توڑ بھی ہیں اور شیشہ بھی۔ محبت سے اپنا آپ جوڑنے میں بھی ماہر ہیں اور اسی محبت کا پتھر مار کر اپنے آپ کو کرچی کرچی بھی کر دیتے ہیں۔

پروین اور میری دوستی میں اس کے بچے بہت معاون ثابت ہوئے۔ بچے ایک ایسی ہتھکڑی ہیں جو طریقہ کار کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ظل عاطف ایک نعم البدل جو عاطف کی جگہ قدرت نے پروین کو عطا کیا ہے۔ اس نے اس کی تعلیم لندن سے حاصل کی اور پاکستان لوٹا لیکن پی آر کی کمی کے باعث وہ ایبٹ آباد چلا گیا جہاں اس نے ایک میڈیم سکول کھول لیا۔ اس کی خوبصورت بیوی فریحہ قدم قدم اس کے ساتھ چلتی ہے۔ ایک مرتبہ خاں صاحب اور میرے آبا داس کے سالانہ فنکشن پر بھی گئے اور یہاں ہی فریحہ نے ہمارے دل جیت لیے۔

کچھ عرصہ بعد سکول بند ہو گیا اور ظل عاطف ماڈل ٹاؤن میں لاکالج کا پرنسپل بن گیا۔ یہاں فریحہ

جائے جاتے تھے۔ پروین ظل، فریحہ اور ان کے بچوں میں کھو گئی۔ ظل عاطف کی کوشش کے باوجود وہ اس کالج کا پرنسپل بن گیا اور اب وہ فیصل آباد شفٹ کر گیا ہے جہاں پروین عاطف اس کے ساتھ رہتی ہے۔ نیا شہر نئی زندگی..... لیکن اب پروین کی کتابیں پڑھتی ہوں۔ اس کا انداز بیان، مشاہدہ، تخیل انمول ہے۔ کاش! کسی دن وہ ہمت اور استقامت سے نکلے کر ایک ناول بھی لکھ ڈالے۔ اپنے حالات زندگی کتاب میں منتقل کر دے۔ کسی سفر نامے میں رکنے اور قیام کرنے کی باتیں اور غم بھی بے نقاب کرے۔

شکوہ عاطف پروین کا دوسرا سپوت ہے۔ باپ کی طرح، بھائی کی مانند اونچا لمبا خوبصورت و جیہہ نوجوان ہے۔ نئے پروین سے علیحدہ ایک شناخت ہمارے گھر میں قائم کر لی ہے کیونکہ وہ بڑی جاندار نظمیں لکھتا ہے۔ پہلے وہ انیق کے قریب ہوا پھر میرے دل میں جگہ بنا لی۔ آرٹس کونسل میں ایک فنکشن ہوا جس میں انگریزی نظموں کا مظاہرہ کیا گیا۔ اس وقت، انیق احمد خاں نے اپنی اپنی نظمیں پیش کیں اور یہ نظمیں بہت سرائی گئیں۔

اب شکوہ امریکہ میں ہے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ مل کر بزنس کرتا ہے اور بیوی مریم بینک میں ملازم ہے۔ اس کے دل پر ایک کاری زخم یہ بھی لگا ہے کہ شکوہ عاطف نے والدہ سے رابطہ توڑ رکھا ہے۔ مجھے تو خط لکھ سکتا ہے لیکن اسے کتنی تک نہیں کر سکتا۔ یہی زندگی ہے اور یہی اس کے رنگ ہیں۔

ڈاکٹر گل عاطف میرے لیے ایک تھد ہے جو پروین عاطف نے مجھے دیا ہے۔ گل نے ثاقب شہاب کے ساتھ کئی کئی بار اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ وہ ایک کامیاب زندگی کے تمام لوازمات سے آراستہ ہے لیکن ماں باپ کی علیحدگی نے اسے تیارہ پارہ کر دیا ہے۔ وہ نہ جانے کن کن عارضوں سے گزرتی ہے اور کبھی بھاگی بھاگی میرے پاس آتی ہے۔ اخیر احمد کی ستریڈنی ہے اور اسی کوشش سے بالآخر اس نے آپ پارہ میں اپنا کلینک کھول لیا ہے۔

لیکن ٹوٹے گھروں کے بچے جذباتی طور پر بہت ثابت و سالم شاذ و نادر ہی ہوتے ہیں۔ ماں باپ کو ایک گھر، ایک شخص ایک راستہ سمجھنے والوں کو زندگی سمجھنے میں ایک خاص قسم کی سہولت میسر آ جاتی ہے۔ یہ صدی نسخہ گل جیسے بچوں کے پاس نہیں ہوتا۔ شان عاطف میں بھی خود اعتمادی کی کمی باقی بچوں سے کم نہیں۔ وہ گلبرگ میں اپنے شوہر کے ہمراہ اسی بے اعتمادی کے ہمراہ رہتی ہے۔ وہ بھی پروین کی طرح میرے پاس آتی رہتی ہے اور میں اسے چنگی بھر دعا اور دوا دیا کرتی ہوں۔

پروین کا بھلا ہوا اس نے مجھے اپنے بچوں سے ملا کر مجھ پر بڑا کرم کیا۔ میرے گھر میں محبت کے پروانے بھیجے۔ احمد بشیر کا ذکر بھی یہاں بے جا نہ ہوگا۔ نایلم امریکہ کو چھوڑ کر پاکستان آئی ہے۔ اس کے شوہر نے اس کے بچے کو "بچہ" لیے ہیں اور نئی بیوی کے ہمراہ آنند کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

نایلم کے پاس اب اپنی ذات کی جھاڑ پونچھ باقی رہ گئی ہے اور سبحان اللہ کیا خم ٹھونک کر وہ ادب کے میدان میں آ کر رائی کرنے نکلی ہے۔ اس نے امریکہ، اس کی تہذیبی ثقافتی زندگی پر حیران کن کہانیاں لکھی ہیں۔ وہ گھٹنوں میں سر کر خود ترسی کا شکار بھی ہو سکتی ہے لیکن اس نے پروین کی مثال سے کچھ سیکھا۔

سلامت رہو پروین اور سلامت رہے احمد بشیر کا گھر اند!

سلیم اختر، وزیر آغا، انور سدید

میں طبعاً ڈرپوک ہوں۔ خوف میری شخصیت کا بنیادی وصف ہے۔ اس لیے مجھے تنقید نگاروں سے ڈر ہے۔ جس تحریر کو ہم بیہر امن موطا سمجھ کر سنبھالتے رہتے ہیں، تنقید نگاروں کے ہاتھوں ان کے پر جڑ سے اکھاڑ پھینکا جاتا ہے۔ مجھ پر تنقید نگاروں نے ہمیشہ مہربانی کی۔ مجھ سے محبت اور میرے کام کو پس پشت رکھا۔

ابھی ”راج گدھ“ مسودے کی شکل میں ہی تھا کہ سرانج منیر مجھ سے مسودہ لے کر چلے گئے اور جب اسے رونمائی فیض صاحب کی صدارت میں ہوئی تو سب سے لمبا مضمون، حوصلہ افزا مضمون اسی نے لکھا تھا۔

ڈاکٹر سلیم اختر، خاں صاحب کے ہوتے ہوئے بھی اور ان کے بعد بھی مجھ سے بڑی محبت سے جڑے رہے ہیں۔ ہمارے گھر میں کوئی چھوٹی موٹی تقریب ادیبوں کی ہو، وہ ضرور موجود ہوتے ہیں۔ میری طبیعت کا پتہ چلتے ہیں۔ میری بیماری کا سن کو ملول ہوتے ہیں۔ اب تو ان کی تخلیقی پروازیں بھی خوب تیزی پکڑ گئی ہیں لیکن ان کی ساری بدلی۔ نہ اس کا ماڈل نہ اس کی رفتار ہی اور یہی بات ان کی وفاداری میں ہے..... زندہ باد سلیم اختر!

وزیر آغا بڑے مشفق ہیں۔ ذرا مشکل پسند ہیں۔ اپنی نظموں اور نثر میں مشکل پسندی کی روایات کو توڑتے ہیں لیکن سائل کی مشکل پسندی کے باوجود طبیعت بڑی آسانیاں عطا کرنے والی ہے۔ ایسا تضاد بڑا خوش آئند ہے۔ کرے تا دیر یہی فضا قائم رہے۔

انور سدید سے میری ملاقات کم کم ہوتی ہے لیکن ان کی مختصر ملاقاتیں بڑی جان بخش ہوتی ہیں۔ ان میں ایک قدر مشترک یہ بھی ہے کہ ہم دونوں 1928ء میں پیدا ہوئے۔ ہم دونوں کا برج ”قوس“ ہے۔ عین ممکن ہے کہ برج کے اثرات ہم دونوں پر ایک سے مرتب ہوتے ہیں۔

بشری رحمن

عبدالرحمن میاں ان دنوں سے ہمارے ساتھ ہیں جب ہم موڑھوں پر بیٹھا کرتے۔ لمبے شوربے سے روٹیاں چولہے کے پاس بیٹھ کر کھایا کرتے تھے۔ رحمن میاں لکھنے کے شوقین اور ان کی کہانی ”دیرانے کا پھول“ گو، میں چھپی تھی۔ وہ تین حصوں میں بنا ہوا تھا۔ بزنس، افسانہ نویس اور اپنی محبوبہ ثریا، جو اسے دودھ والوں کے گھر سوار ہو کر ملتان روڈ سے 121۔ سی ماڈل ٹاؤن ملنے آیا کرتی تھی۔ ثریا کا جذبہ دیکھ کر میں حیران رہ جاتی۔ ان تین حصوں چلتی تھی نہ رکشہ نیکی ملتا تھا۔ پھر ثریا کسی نرم دل گوالے کے ریڑھے کو روکتی۔ ریڑھے پر سوار ہو کر داستان سرائے کے

عبدالرحمن میاں شاید شروع سے شادی کا ارادہ رکھتا تھا لیکن اس نے ثریا کے جذبوں کا ٹیسٹ نکالتے کئی کافی دیر تک اس کے پرچے لیے۔ شادی میں ہم دونوں کو شریک ہونے کی دعوت نہ ملی جس کا بچوں کا بہت افسوس تھا۔

رحمن میاں جو ہمیشہ ہمارے پاس رہا کرتا تھا، یکدم ثریا کے ساتھ غائب ہو گیا۔ آدمی تو منچلا تھا۔

کچھ اچھی بات نہ تھی۔ پھر خبر ملی کہ رحمن میاں نے ثریا کو طلاق دے دی ہے اور بہاولپور میں ایک بشری سے شادی کر کے۔ بشری ایک بہو کی حیثیت سے داستان سرائے میں آئی۔ اس کے طور طریقے دو لہنوں جیسے نہ تھے۔ جلد ہی پتہ چلا کہ اس میں ادب قدر مشترک ہے اور بشری رحمن کی تحریر سے متاثر ہو کر اس کی شریک حیات بنی۔

جس گھر میں عکسی مفتی نے لوگ ورثے کا دفتر بنایا تھا، جب عکسی اسلام آباد چلا گیا اور یہ گھر جو ہمارے بالکل قریب ہے، خالی رہ گیا تو رحمن اور بشری اس میں رہنے لگے۔ رحمن پہلے بھی تنہائی پسند اور Anti-social تھا۔ اب بشری کے ساتھ ان کی شخصیت کے سامنے اس نے گھر کے ایک کمرے میں اپنے آپ کو مقفل کر لیا۔ شاید بشری کو بھی دنوں دن اس کی تنہائی ہوئی تھی۔

ایک Introvert دوسرا Extrovert۔ وہ تین بیٹوں کے ماں باپ تو بن گئے لیکن اصلی جیون ساتھی نہ بن سکے۔ رحمن نے داستان سرائے آنا چھوڑ دیا اور باوجودیکہ اس کا گھر ایک چوراہے سے دور نہ تھا، ہمیں بھی تو نیت نہ ہوئی کہ اس سے ملنے جاتے۔

اب وہ لکھنا لکھانا بھول چکا ہے۔ اس کی بزنس پھیل گئی اور اس نے اپنے بیٹوں کو قازقستان میں بزنس کھول دیا ہے۔ وہ وہاں تیل نکالنے کی مارکیٹنگ کرتے ہیں۔ رحمن بنیادی طور پر انجینئر تھا اور وہ بھی ڈچین انجینئر سے اپنی اصلی فیلڈ مل گیا۔ یا شاید؟

بشری کی اڑانیں اپنے طور پر بہت اونچی ہیں۔ وہ اپنی کتابوں کی وجہ سے اردو ادب میں مقام پیدا کر چکی ہے۔ اسے جانے آگے کیا ہو؟ بشری بزنس کرنے لگے اور رحمن ویرانے میں پھول اگانے نکل پڑے.....

منیر نیازی + احمد فراز

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ہم 479۔ این میں نئے نئے آئے تھے۔ غریبی سے نجات اور اس کے ساتھ ہیشت فراغت اور امید روز افزوں تھی۔ دماغ اپنی برتری پر نازاں بھی تھا اور مغرور بھی۔ یہ وہ عہد تھا جب ”داستان گو“ سالہ ہماری ساری توجہ کا مرکز تھا۔ ”داستان گو“ سے ہمیں بڑی امید بھی وابستہ تھی۔ ہم اس کی بچوں کی طرح پرورش کر رہے تھے۔

ان دنوں میرے گھر میں منیر نیازی کا پھیرا ٹوڑا رہتا۔ منیر نیازی کی نظم ”ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں“ ”داستان گو“ میں لکھی اور ہولے ہولے ان کی نظمیں ”داستان گو“ کی زینت بننے لگیں۔ منیر نیازی میں دو خوبیاں ان دنوں خوب واضح تھیں۔ وہ پشاور کی پٹھانوں کی طرح بہت خوبصورت تھے اور اپنے متعلق اتنے ہی گونگے تھے جس قدر اشفاق احمد..... ان کے ساتھ ملاقاتیں رہنے لگیں کیونکہ وہ ”داستان گو“ میں لکھنے کے متمنی تھے اور ہماری اتھارٹی کو مانتے تھے۔ ان کے متعلق کچھ کرید کے بعد پتہ چلا کہ قیام پاکستان سے پہلے مشرقی پنجاب میں ضلع ہوشیار پور میں رہتے تھے جہاں سے کوہ شوالک کی پتھریاں کبھی دھند میں کبھی نیلے آسمان میں نکھری نکھری صاف نظر آتی تھیں۔ منیر نیازی تب بھی کہا کرتے تھے کہ انہیں ان

پہاڑوں میں جذب رہنے کی وجہ سے شاعری ورثے میں ملی۔

خاں صاحب ”یو ایس آئی ایس“ کے دفتر بھی باقاعدگی سے جاتے تھے۔ مجھے ”داستان گو“ رسالے کی ایڈٹ ہونے کا شرف حاصل تھا۔ ایک روز منیر بھائی کے ساتھ ایک شرمیلانوجوان بھی آ گیا۔ کھوج لگانے پر پتہ چلا کہ نوجوان پٹھان زادہ ہے۔ شاعر بھی ہے اور قبول صورت بھی..... تب فرما احمد Legend تھا نہ اس کی حیثیت دیو مالائی تھی۔ کشت بہت زیادہ نہ تھی بلکہ یوں سمجھئے چپ غالب تھی۔

ملاقات کراتے ہوئے منیر بھائی بولے۔

”یہ احمد فرما ہے۔ بڑا اچھا شاعر ہے۔ اس کی کچھ نظمیں اگر ”داستان گو“ میں چھپ جائیں تو تمہاری مہربانی میں کچھ چمکپائی تو منیر بھائی بولے..... ”قد سید! یقین کرو اپنے وقت پر یہ بہت بڑا شاعر ہوگا۔ پھر تم افسوس“

گی۔“

میرے لیے یہ اعزاز بہت ہے کہ ان دونوں کو اول اول چھاپنے کا مجھے شرف حاصل ہوا۔ یہاں سے تین غیرت مند پٹھانوں کی گپت کہانی شروع ہوتی ہے۔ منیر نیازی جس نے اپنی شاعری سے باذوق قارئین کی دنیا میں طوفان برپا کر دیا۔ احمد فرما جو منیر نیازی سے ہرگز کسی صورت بھی کمتر نہ تھے۔

اور اشفاق احمد جن کا تخلیقی سفر مختلف چکر کاٹتا ہوا شلق سے وابستگی پر منتج ہوا اور بڑی شہرت کو پہنچا۔ میں زیادہ کچھ تحریر نہیں کر سکتی۔ منیر نیازی 2007ء اور احمد فرما 2008ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔

مسعود کھدر پوش

قدرت اللہ شہاب زیادہ مجلسی آدمی نہ تھے۔ مفتی جی اور خاں صاحب کے علاوہ جب کبھی لاہور آتے تھے کھدر پوش سے ضرور ملتے۔ شملہ پہاڑی کے قریب جب کبھی وہ آفیسرز میس میں ٹھہرتے تو مسعود کھدر پوش کو ضرور ملتے۔ آپ جانتے ہیں وہ اٹھربنیے کو اپنا ڈرائیور بناتے اور یہ بات ہم سب کے لیے سعادت کا باعث ہوتی۔ لاہور میں ایک بڑا گھنادرخت تھا۔ اس کے نیچے شہاب صاحب اور اٹھربنیے پھلیاں اور مالٹے کھاتے تھے۔ پھر مسعود کھدر پوش بھی بلا لیتے اور یہیں ملتے۔

کبھی کبھی وہ داستان سرائے میں بھی مسعود کھدر پوش کے ساتھ بیٹھے نظر آتے۔ ان ملاقاتوں میں خاں صاحب کم کم نظر آتے کیونکہ یہ اردو بورڈ کا وقت تھا۔ عین ممکن ہے مسعود کھدر پوش اردو بورڈ میں جا کر خاں صاحب کو ملے۔ آپس میں نظریاتی اختلافات پر گفتگو ہوتی۔

مسعود کھدر پوش اس بات کے حامی تھے کہ ہمیں ابھی برآمد درآمد کے بکھیڑوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔ پاکستان نیا ملک ہے۔ اس کی اقدار کی جڑیں مضبوط نہیں۔ جب بیرونی تجارتی وفد پاکستان آئیں گے تو صرف یہ

تیس ہوگا۔ رسم و رواج، زبان، کلچر کی قسم کی نئی چیزیں چکا چوند پیدا کرنے کے لیے ہمراہ ہوں گی۔ وہ اس خیال کے داعی تھے کہ ابھی جو کچھ مقامی طور پر بن رہا ہے، اسے ہی استعمال میں لائیں۔ اگر ہم کھدر بنا رہے ہیں تو کھدر ہی سب کا پہناوا ہونا چاہیے۔ اس سے کچھ فائدے ضرور ہوں گے۔ ایک تو سوسائٹی فیشن اور بناوٹ سے بے گی۔ دوسرے طبقاتی فرق مٹانے میں یہ پالیسی معاون ثابت ہوگی اور تیسرے سب سے بڑا فائدہ وقت کی بچت کا ہے۔ اب ان کے خواب اور تحریک کس حد تک سوسائٹی پر اثر انداز ہوئی، اس کا اندازہ آپ لوگ مجھ سے بہتر کر سکتے

خواجہ جی

واکس آف امریکہ پروگرام کی وساطت سے دو ایسے ”بیرامن طوطے“ خاں صاحب کو مل گئے جنہوں نے بہت حد تک آپ کو خاں صاحب کی زندگی میں گوندھ لیا۔

سلیم خواجہ برکھے کے پروگرام کیا کرتے تھے۔ پھر انہوں نے خاں صاحب کی فلم ”دھوپ سائے“ ریکارڈ کی۔ اس وقت سے ہر سین کے ریکارڈ کرنے سے پہلے ڈائلاگ مانیٹر (Monitor) کرتے۔ لیول بتاتے۔ انیس کو طبعاً نہیں کا لپکا ہے۔ وہ خواجہ جی کے پاس گھسارہتا۔ یہاں سے ہی اس نے ریکارڈنگ کا اولین سلیقہ سیکھا۔

چلتے چلتے ہوتے ہوتے کئی مشکلات اپنے آپ پر سہہ کر خواجہ جی گہرے ڈپریشن کا شکار ہو گئے۔ ناز و نعم میں پے خواجہ جی، مشفق خواجہ کے چھوٹے بھائی تھے لیکن انہوں نے کبھی اپنی اس شناخت کو عام زندگی میں استعمال نہ کیا۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد خواجہ جی نے زندگی کے الٹ پھیر کے ہاتھوں اپنا موروثی گھر بیچ کر عسکری کالج میں ایک فلیٹ خرید لیا۔ وہ مجھے ملنے آئے تو ان کی ڈاکٹر بیوی ناہید ساتھ تھیں۔

”یہ بہت اداس اور پریشان رہتے ہیں بھابھی! خاں صاحب بھی نہیں جن کے پاس آ کر کچھ دل ہلکا کریں۔ کسی بات کسی سے کرتے نہیں۔ آپ ہی انہیں سمجھائیں۔“

میرے پاس وقت ہوتا تو میں سمجھاتی۔ ویسے بھی میں نے رکنا، ٹھہرنا اور سوچنا تو سیکھا ہی نہیں۔ پتہ مجھے اس وقت لگا جب خواجہ جی دنیا سے رخصت ہو گئے۔ میری سردمہری کے پیش نظر نہ انہوں نے مجھے جنازے کی اطلاع دی نہ یہ۔ یسویں یا سوئم پر بلایا۔ میں نے کبھی احسان کا بدلہ احسان سے نہیں چکایا۔ جب مشکل پڑی مدد کی، ضرورت ہوئی تو فوراً سنبھال کر بلایا۔ وقت نکل گیا مصیبت ٹل گئی پھر نہ وقت تھا نہ فرصت۔

لیکن خواجہ جی شریف روح ہیں۔ مجھے یقین ہے انہوں نے میری غفلتوں کو معاف کر دیا ہوگا۔ مجھے لگتا ہے، وہ مجھ کو پکڑ کر اب بھی کہہ رہے ہیں۔ ”آپ میری بیوی کے انتقال پر بھی رسماً جانیں سکیں۔ آپ کے کام بہت پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ملنا ملنا وسیع ہے۔ لیکن آپ کی نیت اچھی ہے۔“

اپنے طور پر یہ معافی نامہ حاصل کر کے نہ تو اب کبھی مجھے احساسِ جرم ہوا نہ کسی پچھتاوے کی
 احساس..... میں نے رفتہ رفتہ اپنی کمزوریوں کے ساتھ جینا سیکھ لیا ہے۔ مشفق خواجہ ساری زندگی ہمارے کچھ
 پڑھنے سے متاثر نہ ہو سکے۔ اب جب وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں تو ان کے لیے بھی یہی احساسِ دل میں جا سکتا
 ہے کہ وہ بھی خواجہ جی کے بھائی تھے۔ انہیں بھی تو صرف محبت درکار ہوگی جو جو جو ہم دونوں ادا نہ کر سکے۔ یہ قرص
 بھی واجب الادا ہے۔

احمد علی

بھائی احمد علی اونچے لمبے پٹھان آدمی۔ ان سے بھی واکس آف امریکہ کے دوران ملاقاتیں ہوئیں۔ پھر
 ملاتے رہے۔ جب ہم داستانِ سرائے میں آگئے تو بھائی احمد علی نے سب سے پہلے سچ کباب بنا کر ہم سب کو کھلائے۔
 پیالے کے پٹھان اردو بولتے تھے اور ساری ترکیب بھی اردو میں سکھاتے تھے۔

کبابوں کی انگیٹھی، قیہ، مسالہ، کبابوں میں پڑنے والی بالائی، نان اپنے ساتھ لاتے۔ کھانے والوں میں
 ریاض محمود، خاں صاحب اور جو بھی مہمان حاضر ہوتے سب چسکے لے لے کر کھاتے رہتے۔

پورے کبابیے، کبھی بجلی کا پنکھا ٹھیک کرتے، کبھی سلاخیں الٹاتے پلاتے، کبھی ویسے ہی شور مچاتے لیکن
 صاحب کے جانے کے بعد ان کی کباب پارٹیاں اور گہما گہمی ختم ہو گئی۔ اب وہ مجھے ملنے ضرور آتے ہیں لیکن اس
 ملاقات میں تو اتر نہ رہا۔ پھر انہوں نے لاہور کالج کے سامنے APWA کا سامان رکھ کر Sale Point بنا لیا اور
 ساخت کردہ چیزیں بیچنے لگے۔

مشقت بڑھ گئی۔ کام برکت کا بھی باعث ہوتا ہے لیکن جب یہ تعلقات کا وقت بھی ہڑپ کرنے لگے تو اس کے
 منفی اثرات واضح ہو جاتے ہیں۔ ہر Workaholic کو اس مقام پر ٹھہر کر سوچنا چاہیے کہ انسان کے کردار کی بہت
 خوبی تو ازن ہے۔ جو کام بھی تو ازن سے نکل کر شدت اختیار کرتا ہے، اس سے چاہے وہ نیکی ہی کیوں نہ ہو، نقصان کا
 زیادہ ہے۔

ذوالفقار احمد تابش

خاں صاحب کا تعلق تابش سے اردو سائنس بورڈ سے شروع ہوا۔ تابش اردو بورڈ میں حنیف رائے اور محمد
 چغتائی کے ساتھ ہر کام میں پیش پیش رہتے تھے۔ گھنگھر یا لے بال، درمیانہ نقد، ناک پرنیک اور چہرے پر ملامت
 رہتی تھی۔ تابش عجیب طور روحانیت اور عقیدت میں توازن رکھنے کے قائل تھا۔ اسی لیے اس کی کبھی خاں صاحب سے
 نہ ہوئی۔ اپنے خیالات میں پختہ ہونے کے باوجود کبھی مناظرے کی نوبت نہ آئی۔

جب خاں صاحب ریٹائر ہوئے اور ہم 121- سی میں آگئے تو تابش ان سے ملنے آتے رہتے تھے۔ یہ عقیدت و محبت کے رشتے تھے۔ مجھے خیال نہیں تھا کہ کبھی تابش کو جانے کا مجھے بھی موقع ملے گا۔

لیکن خاں صاحب کے جانے کے بعد تابش اچانک پرسنل زندگی سمیت میرے قریب ہو گیا۔ وہ اور مریم کے پاس آجاتے، باتیں کرتے، اپنی زندگی کے بکھیرے بیان کرتے۔ زندگی میں جو تبدیلی اچانک آگئی تھی اس سے آگے بڑھنے کے متعلق اپنی تشویش ظاہر کرتے۔ بچے چھوٹے تھے۔ ریٹائر ہونے پر پیسوں کی قلت تھی۔ کام کہیں ملتا نہ تھا۔ تب بہت ملول اور پریشان رہتا تھا۔

اب کچھ عرصہ ہوا تابش میرے پاس کم ہی آتے ہیں۔ مجھ سے نہ ان کو محبت ملتی ہے نہ اعانت۔ جو چشمہ خشک ہو گیا اس پر ہولے ہولے لوگ پانی بھرنے نہیں آتے۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد میرے ماتھے پر تیوری، زبان میں روئیے میں روکھاپن آ گیا ہے۔ لوگ مجھ سے خوفزدہ ہو کر بچھڑتے جا رہے ہیں۔ یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے۔ جو آدمی کبڑا ہو، وزن اٹھا کر کاٹتا ہو، اس پر وزن کیا لادنا؟

اصغر ندیم سید

ملتان ایک زرخیز خطہ ہے۔ ہر اعتبار سے یہاں روئیدگی کی ریت زیادہ ہے اور اس نے پاکستان کو زریعی طور پر ترقی دینے کی جگہ بنائی ہے لیکن لاہور شہر میں ایک بڑے شہر کا تکبر اپنے سوائے کسی کو ماننے پر مشکل سے رضامند ہوتا ہے۔

ایک شخص جو ملتان سے آتا تھا اور خاموشی سے خاں صاحب کے درشن کر کے چلا جاتا تھا۔ اس نے مجھے ہمیشہ یہی کہا۔ ایک مرتبہ میں نے پوچھا۔

”خاں صاحب! یہ اونچا لہبا، مسکراتے چہرے والا کون ہے جو اتنے حلم اور انکساری سے ملنے آتا ہے؟“

”ہے ایک۔“

”پھر بھی؟“

”ہے ایک اصغر ندیم سید۔“

ہولے ہولے مجھے پتہ چلا کہ اصغر ندیم سید نے ملتان میں بیٹھ کر ٹیلی ویژن کے لیے کچھ ڈرامے لکھے رکھے تھے۔ چاہتا تھا کہ کسی طرح ٹیلی ویژن سٹیشن کا دروازہ اس پر کھل جائے اور وہ میڈیا میں اپنا مقام خود بنائے۔ خاں صاحب کے اپنے ساتھ لے گئے۔

اور یوں ٹیلی ویژن سٹیشن کو ایک بہت بڑا ڈرامہ نگار مل گیا جو راستہ دکھانے والوں سے بھی ہنرمندی میں آگے

اجمل نیازی

اجمل نیازی ایک معروف شخصیت ہیں۔ ان کی شخصیت میں ایک انفرادیت یہ بھی ہے کہ وہ قومی لباس شہسہ قمیض اور جیکٹ پہنتے ہیں۔ ان کے سر پر ایک خاص قسم کا پٹلہ یا چادر قبائلی علاقوں کی یاد دلاتی ہے۔ شاید اس طرح کوئی چادر سر پر باندھے تو مضحکہ خیز لگے لیکن اجمل کی خوبصورتی سے اس میں بھی ایک طرحداری پیدا ہو جاتی ہے۔

اجمل نیازی میں منیر نیازی کی طرح اپنے نیازی ہونے پر بہت فخر ہے۔ وہ ہر چیز بھول سکتے ہیں۔ یہ نیک بھولتے کہ وہ نیازی ہیں اور ان کی اصل شناخت اس کے منبع کی طرف اشارہ کرتی ہے، جہاں سے دریا پھوٹا تھا۔ شاید ہی کسی نے اجمل نیازی کو پینٹ قمیض پہنے دیکھا ہو۔ وہ بڑی سے بڑی محفل میں اونچے سے اونچے مقام پر، امریکی، یورپی۔۔۔ انگریز مندوبین کے درمیان بھی اپنی قومی اور قبیلے کی شناخت قائم رکھتے ہیں۔ یہ کواکبھی ہنس کی چال نہیں چلتا اور شاید ہی لپے اپنی نظر میں اور دوسروں کے ہاتھوں عزت نفس پر حملہ نہیں ہونے دیتا۔

بڑے سال ادھر کی بات ہے کہ ایک روز اجمل ہمارے گھر آئے۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ اس کی گھر والی اور بچے ساتھ تھیں۔ ماحول گھر یلو تھا جس میں ادب، سیاست اور اقدار کی باتیں سرے سے غائب تھیں۔ غیر رسمی ملاقات کے بعد یہ تینوں رخصت ہو گئے۔

اس کے چند دن بعد اجمل نیازی اکیلا آیا۔ وہ کچھ پریشان تھا، لیکن شرمیلے پن کے باعث اصلی پریشانی کی طرف نہیں آ رہا تھا۔

”کیا بات ہے اجمل۔ تم آج خلاف توقع گول مول باتیں کر رہے ہو؟ نہ ٹھیک سے سنتے ہو نہ صحیح جواب دیتے ہو۔“

”اچھا ہے بانو آپ نے پوچھ لیا ورنہ شاید میں بتائے بغیر ہی چلا جاتا۔“

ایسا موقع ہاتھ آئے تو میں ون اپ ہو کر شیر ہو جاتی ہوں۔

”ہاں ہاں بتاؤ بلا تکلف بتاؤ۔ کیا بات ہے؟“

”میرے ساتھ تقدیس آئی تھی نا۔“

شرمائی لجائی سفیدی گھنڑی۔

”اچھا اچھا تمہاری بیٹی۔“

”جی جی..... اسے ہارٹ پرابلم ہے۔ مجھے اس کا آپریشن کرانا ہے۔“ اجمل بولا۔

میں حیران رہ گئی۔ میں سمجھتی تھی ہارٹ پرابلم بوڑھوں کی جاگیر ہے اور ایسے پھول سے بچوں کو تو بس زکا مکھ تھی

ملیر یا بخاری ہوا کرتا ہے۔

”گھبراؤ نہیں، ٹھیک ہو جائے گی۔“

اب مزید گھبرا کر اجمل بولے۔ ”وہ جی میں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر جو اس کا آپریشن کرتے۔ میں P.I.C. گیتھ

سین وہ مل نہیں سکے۔ مصروف ڈاکٹر ہیں۔ ان تک رسائی مشکل ہے۔“

”بھائی! خاں صاحب کا بھانجا ہے جواد۔ میں اسے فوراً کہہ دوں گی۔ تقدیس چنگی بھلی ہٹی کٹی ہو جائے گی۔ تم

گرنہ کرو بس اللہ پر بھروسہ کرو۔“

اپنے آپ کو اوپر اٹھانے اور بڑا سمجھنے کا موقع ہاتھ آ گیا۔ میں نے جواد سے بات کی۔ معاملہ طے پا گیا۔ تقدیس واقعی ہٹی کٹی ہو کر گھر چلی گئی اور اجمل ہمارے اور قریب آ گیا۔ اس مدد کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اجمل نیازی پہلے تو شاید سحری اس لیے عزت کرتا تھا کہ میں خاں صاحب کی بیوہ تھی لیکن اب مجھے اس کی عقیدت حاصل ہو گئی۔

ایک فون

ایک۔ سفارش

اور اتنا بڑا صلہ

یہ زندگی کچھ کم حیرت انگیز تو نہیں۔



ایک گھر کے دوراتے

اجمل نیازی

یہ کم کم ہوا ہے کہ میاں بیوی دونوں کسی میدان میں نامور ہوئے ہوں اور انہوں نے اپنا اپنا مقام بنایا ہو۔ ایک سرے کے لیے مثال بن گئے ہوں۔ ایک دوسرے کی مثال بن گئے ہوں بلکہ مثال اور ڈھال بن گئے ہوں۔ مثال بانو قدسیہ کے سر پر اور ڈھال اشفاق احمد کے ہاتھ میں۔ یہ تو ہوا کہ خاوند یا بیوی کی وجہ سے دوسرے کو ملازمت مل گئی اور ترقی کے موقع۔ تحفے بن گئے۔ یہ بھی ہوا کہ دو لکھنے والوں نے شادی کر لی مگر آگے چل کر راستے بدل گئے۔ کوئی ایک پیچھے رہ گیا یا کئی آگے نکل گیا۔ بیویوں میں تو اکثر لکھنا چھوڑ گئیں۔ کچھ نے اپنے شوہروں کو چھوڑ دیا۔ چند ایک نے بے چاروں کو نہیں کا سمجھا۔ بہت کم ایسے جوڑے تھے جو ایک دوسرے سے جڑے رہے۔ ایک دوسرے کی جڑیں کھوکھلی کرنے والے بھی ہیں۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ ایک سدا بہار مثالی جوڑا ہے۔ سنا ہے یہ جوڑے آسمانوں پر رہتے ہیں۔ بھارت میں ایک آئیڈیل بیوی سے مل کر میں نے کہا تمہارے لیے جتنی کال فکس قدر شاندار ہے۔ ”رب نے کرایا ساڈا پنتاں تے میل سے۔“ جتن زمین پر ہوتے ہیں۔ اب تو بہت کم رہ گئے ہیں۔ ہر کہیں واٹر ورکس اسکیمیں پہنچ گئی ہیں۔ جب بہت سوچنے کی اسکیمیں شروع ہوتی ہیں تو محسوس کرنے والوں کی قلیمیں برباد ہو جاتی ہیں۔ ترقی یافتگی میں وارفتگی اندر رہتی ہے۔ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کا نظریہ فن اسی لہر کے گرد گھومتا ہے۔

مغرب میں ازدواجی زندگی کا جو حشر ہوا، وہ ہم اپنے ہاں برپا کر لینے کے لیے بے چین ہوئے جا رہے ہیں۔ میاں بیوی اپنے حقوق کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ گھروں میں طبلہ بجتا ہے یا طبل بجتا ہے۔ مغربی موسیقی کی کیفیت ہنگامے تبدیل بنتی جا رہی ہے۔ اب ان گھروں میں مار پیٹ کے واقعات عام ہو رہے ہیں۔ مغرب میں شوہر اپنی بیویوں کو اکثر

زد و کوب کرتے ہیں۔ مشرق میں کبھی پہلے یہ وارداتیں عام تھیں۔ جو کام چھوڑ دیتے ہیں وہ شروع کر دیتے ہیں۔ جو کام کے ہاں رک جاتے ہیں ہم انہیں نئے سرے سے اپنالیتے ہیں۔ ایک دوسرے کی پیروی کا یہ سلسلہ جاری ہے۔ میں آزادی نسواں کی مکمل حمایت کرتا ہوں مگر اس سے پہلے آزادی انسان کا مطالبہ کرتا ہوں۔

یہ سب باتیں مجھے الجھار ہی ہیں اور میں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کے لیے ایک مضمون لکھ رہا ہوں۔ ان دنوں پر علیحدہ علیحدہ تحریریں بھی لکھی گئی ہیں مگر یہاں یہ احساس میرے لیے بڑی انوکھی مسرت کا باعث ہے کہ دو آدمیوں کے لیے ایک مضمون بھی لکھا جاسکتا ہے۔ عورت اور مرد مل کر جو اکائی بنتی ہے، اسے محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ مقابلے کے جنون کے ہم سے یہ لطف بھی چھین لیا ہے۔ جب عورت اور مرد اپنے اپنے مقام کو جان لیتے ہیں تو صاحب مقام بن جاتے ہیں۔ قدیم چینی فلسفہ تاؤ مت (تاؤ ازم) کے حوالے سے ایک دائرہ دو قوسوں سے بنتا ہے۔ ایک فاعلی اور دوسری انفعالی ہے۔ دونوں کی وحدت اور یکتائی سے دائرہ وجود میں آتا ہے۔ دائرہ چھوٹا بڑا ہوتا رہتا ہے۔ قوسیں دو ہی رہتی ہیں۔ قوس میں ایک نقطہ فاعلی قوس کا کہیں ہوتا ہے۔ یہی حالت دوسری طرف ہوتی ہے۔ ایک بڑا دائرہ بانو قدسیہ اور اشفاق احمد نے بنایا ہے۔ اشفاق احمد میں بانو قدسیہ، بانو قدسیہ میں اشفاق احمد رہتا ہے۔ ممتاز مفتی نے ”ادکھے لوگ“ میں دونوں کا الگ الگ خاکہ لکھا ہے۔ شاید ایک خاکہ دوبارہ لکھ دیا ہے۔ بانو کے خاکے میں اشفاق، اشفاق کے خاکے میں بانو کا زیادہ ہے۔ بڑی تحریر ہے۔ یہ ادکھے لوگ بڑے سوکھے لوگ ہیں۔ وہ دونوں مختلف ہستیاں ہیں مگر ایک زندگی انہوں نے بسر کی ہے۔ ایک دوسرے کی زندگی بسر کی ہے۔ اس زندگی کا عنوان اشفاق احمد ہے اور خلاصہ بانو قدسیہ ہے۔ اشفاق احمد مزاجاً کامل آدمی ہیں۔ جی رہے ہیں جیسے لیٹے ہوئے دھوپ سینک رہے ہیں۔ انہیں تب خبر ہوتی ہے کہ دھوپ لگ رہی تھی جب بانو سورج اور ان کے درمیان آکھڑی ہوتی ہے۔ بانو کی پھڑکی بھی ان کے لیے سیک کو مزیدار بنا دیتی ہے۔ ایک جی ازدواجی زندگی کا منظر ہے۔ اسے بانو نے منظر نامہ بنا دیا ہے۔

ادب میں بانو قدسیہ اور اشفاق احمد کا مرتبہ انیس بیس کا ہے۔ بانو کہتی ہیں کہ بیس اشفاق احمد ہیں۔ بہر حال کرائیس بنتے ہیں۔ دونوں نے فن و ادب کا کوئی میڈیا چھوڑا نہیں۔ ڈرامہ، افسانہ، ناول، سکرپٹ، سفر نامہ، فلم، ٹیلی ویژن بہت کام۔ اب وہ الگ سے بھی کوئی کام کرتے ہیں تو لگتا نہیں۔ وہ اپنی یگانگتوں کو ظاہر ہونے سے بچاتے رہتے ہیں۔ دونوں کو پانا مشکل ہے۔ الگ الگ کر کے بھی سمجھنا مشکل ہے۔ وہ دونوں مس انڈر سٹنڈ مخلوق ہیں۔ ان پر نگاہ غلط انداز میں ڈال کر دیکھ لیجیے۔ سارے اندازے غلط ہو جائیں گے۔ ان سے بہتر اور کمتر آدمی ہوں گے مگر ان کے جیسا اور کوئی نہیں۔ ان دونوں کے اندر ایک ایک شاعر بھی ہے۔ ابھی انہوں نے نجانے کیا کیا چھپایا ہوا ہے۔ جو کچھ مل کر چھپا رکھا ہے۔ کسی کو نہیں مل سکتا۔

بانو پُر اسرار لگتی ہیں۔ اشفاق صاحب اسرار لگتے ہیں۔ دونوں صوفی ہیں۔ ملاحتی صوفی۔ دونوں کا عمل ہے۔ رد عمل ایک سا۔ عمل ظاہر ہوتا ہے۔ رد عمل چھپایا جاسکتا ہے۔ ایک بے نام سانجھ ان کے درمیان قائم ہے۔ ایک دوسرے کو مانتے ہیں، جانتے نہیں۔ جانا ضروری نہیں۔ یہی ایمان بالغیب ہے۔ ظاہر مختلف باطن مشترک۔ ایک برتن سے ان کے پاس جس میں سے بیک وقت اپنی پسند کی غذا نکال لیتے ہیں۔

دونوں اپنے وقت کے مصلوب کردار ہیں۔ بانو اشفاق کی صلیب پر لٹک گئی ہے۔ انہیں تو یہ صلیب دکھائی بھی
 کس دی۔ ”راجہ گدھ“ کو چھوڑ کر تقریباً تمام تخلیقات میں بانو کا انداز ”تیرے سامنے بیٹھ کے روناتے دکھ تینوں نہیں دسنا“
 ہے۔ وہ روتی ہے اور سامنے بھی نہیں بیٹھتی۔ ایسے میں اپنے آپ سے بھی دور کہیں ہوتی ہے۔ انہوں نے اپنی مشکلوں کا
 پھیلنے دیا اشفاق احمد کو۔ اپنے آپ کو محدود کر کے لامحدود ہونے کی کوشش کی ہے مگر لگتا ہے کہ یہ حدود اس دائرے سے
 کس جاتیں جو اشفاق احمد کے گرد بن گیا ہے۔ کمال یہ ہے کہ ایک گھریلو عورت عظیم ادیبہ بن گئی ہے۔ بانو کو بڑی عزت
 ہے۔ انہوں نے سر کی چادر کو کاغذ بنایا اور چادر یواری میں شش جہات تلاش کر لیا ہے۔ وہ سامنے سے بہت مست ہیں مگر
 پتہ اندر بہت ایکٹو ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ ظہور اور اخفا میں فرق مٹ جائے۔ اشفاق احمد نے نئے علام کو اپنے اندر گم
 کر لیا ہے۔ اس گمشدگی کو پینڈو اور آن پڑھ بابو کی کٹیاؤں میں ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ دانش جب تکمیل اور تازگی کی طرف
 ترقی ہے تو لوگ دانش میں جمع ہو جاتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے ان سے کہا کہ لاعلمی کی بھی اپنی ایک تہذیب ہوتی ہے تو
 میں نے مجھ سے پوچھا کہ تمہیں یہ بات کہاں سے معلوم ہوئی؟

میں نے کہا ”معلوم نہیں۔“

وہ اور خوش ہوئے۔

اصل بات معلوم سے نامعلوم، نامعلوم سے معلوم کی طرف سفر کے دوران ملتی ہے۔ ہونی ہو کے رہتی ہے اور یہ
 ہونی میں موجود ہوتی ہے۔ اشفاق احمد لوگوں کو حیران کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ ان کے اس ہنر سے
 کس پریشان ہیں۔

ایک بات میں اشفاق احمد کو بانو پر برتری حاصل ہے۔ بانو ان کی ہر طرح کی برتری کو دل سے مانتی ہے۔
 اشفاق احمد کو اس صورتحال نے خاصا سازگار کیا ہے۔ اشفاق احمد گفتگو کے بادشاہ ہیں۔ موقع کے مطابق ان جیسی بات
 کا ملکہ کم کسی کو ملا ہوگا۔ اس ضمن میں بھی ان کی ”ملکہ“ کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ بانو ان کے سامنے بولتی نہیں۔ بولتی
 ہے جیسے تھکے بارے گھر آئے ہوئے کے لیے دروازہ کھولتی ہیں۔ پھر ان کی خدمت کی فراوانیاں سارے ماحول میں
 تھوہو گھولتی ہیں۔

اشفاق احمد تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ اپنے زمانے میں کھڑے اشفاق احمد جو باتیں کر رہے ہیں، کوئی نہیں کر
 سکتا یا کرنا چاہتا نہیں۔ وہ ان چیزوں کے خلاف باتیں کرتے ہیں اور اس وقت کرتے ہیں جب ان کی حمایت
 ہر قسم ہوتا ہے۔ سائنسی ترقی کے خلاف، ترقی کے خلاف، علم کے خلاف، کتاب کے خلاف، سب سے پہلے یہاں
 میں نے کیسٹ کے ذریعے مطالعے کی بات چھیڑی۔ اس وقت سب سے زیادہ ان کی مخالفت انتظار حسین نے کی۔
 اس طرح کی پہلی کیسٹ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے زیر اہتمام سیرت النبی ﷺ کے حوالے سے تیار کی گئی۔ کتاب
 کے حوالے اس کا اردو ترجمہ انتظار حسین نے کیا۔

یہ اتفاق ہے۔ ایسے اتفاقات اشفاق احمد کی زندگی میں بہت ہیں۔ ان کی فراست کی فطرت نے کئی بار حمایت
 اور بانو جی نے ہمیشہ اشفاق احمد سے اتفاق ہی کیا ہے۔ اس لیے گھر سے باہر اشفاق احمد بہت اختلافی گفتگو سن کر بھی

طیش میں نہیں آتے۔ جب راولپنڈی میں ایک تقریب کے دوران نوجوانوں نے اپنے جملوں کو حملوں کے برابر کر دیا تو اشفاق احمد نے سٹیج پر آ کر سیدھے سیدھے اعتراف سے بات شروع کی اور وہ ساری باتیں جو نوجوانوں کے اعتراف سے بھری ہوئی تھیں، خود انہی کے کندھوں پر رکھ دیں اور وہ خوشی سے نعرے لگاتے ہوئے یہ گٹھڑیاں اٹھا کر اپنے لیے گھروں کو چلے گئے۔ ایسے واقعے اشفاق احمد کی زندگی میں کافی ہیں۔ ریڈیو پاکستان پر جب تلقین شاہ کا پیکر پہن کر بت کرتے ہیں تو بھی ہمیں برے نہیں لگتے۔ یہی باتیں کوئی اور کرے تو ہم اس سے لڑ پڑیں۔ ہر شخص کے اندر ایک شخصیت ہوتا ہے۔ ہم اسے چھپاتے رہتے ہیں۔ سامنے آنے پر منافق کے دشمن بن جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔

اشفاق احمد نے بندے کے اندر سے نکال کر اس بندے کو سامنے لا کھڑا کیا ہے۔ ہم زاد بھی ہوتا ہے ہر عمل کا تسخیر نہیں ہوتا ہر کسی کا۔ اشفاق احمد نے اپنا ہم زاد تسخیر کر لیا ہے۔ ہم تو اپنے ہم زاد کو بھی قابو میں نہیں رکھ سکتے۔ بیکس ہوتے رہتے ہیں اس سے۔ اشفاق احمد کی مدد سے ہم بلیک میل ہونے سے تونج سکتے ہیں۔

یہ نہیں کہ اشفاق احمد کو غصہ نہیں آتا۔ اگر کسی آدمی کے ہر عمل کا جواب محبت بھرے رد عمل سے دینا جائے تو محبت انگیز حد تک سوہنی سرشت لہو میں جاگ اٹھتی ہے ورنہ اشفاق احمد بھی خاں ہیں۔ پٹھان کا رویہ گھروں میں بھی حاوی ہے اور بلا شرکت غیرے ہوتا ہے۔ حاکم کو حلیم کرنے والی بڑی ہستی عورت ہے۔ مقابلہ تو حاکم کو ظالم بناتا ہے۔ مغرب میں یہی کچھ ہو رہا ہے۔ وہاں عورت مرد کے برابر آ کر بھی مظلوم بنی پھرتی ہے۔

یہ بحث میرا موضوع نہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ عورتوں اور لڑکیوں کو بانوجی سے ملنا چاہیے۔ شاید ان کے اندر ایک مکمل عورت کی روح سرایت کر جائے۔ وہ اشفاق احمد کو بہت بڑا سمجھتی ہیں۔ اپنا مرشد کہتی ہیں:

”بانو کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ایک پٹھان مرد کو ایک بہت بڑا انسان بنانے پر اپنا آپ نچھا اور کر دیا۔ بڑا انسان تو اشفاق احمد کے اندر تھا۔ دنیا میں بہت لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر ہوتا ہے بڑا آدمی۔ مگر باہر کا رستہ مشکل سے ملتا ہے۔ دروازہ ملتا ہے تو کھلتا نہیں۔ عورت و یواروں میں بھی دروازہ کرنا جانتی ہے۔

میرے نانا مظفر خاں بڑے سخت گیر پٹھان تھے۔ انہوں نے بھی ایک اعوان لڑکی سے محبت کی۔ پھر اسے لے کر آئے اور شادی کر لی۔ محبوبہ تو مغویہ ہوتی ہی ہے۔ کسی کو اغوا کیا نہیں جا سکتا۔ یہ ڈاکہ ہوتا ہے۔ عورت کو لے کر آئے۔ اسی لمحے میں جب محبت کی کرن اس کا لباس بن جاتی ہے۔ یہ مخلوق منکوحہ ہو جائے تو اس کی حقیقت بالکل بدل جاتی ہے۔ بابا مظفر خاں نے بظاہر کوئی حسن سلوک نہ کیا نانی اماں سے مگر کبھی نانی کے لبوں پر حرف شکایت نہ چکا۔ ان کی حالت اس وقت کھلی جب وہ مر گئیں۔ نانا کی شخصیت کا جلال ایک مال میں بھیگ گیا۔

ایک دن وہ دیوار کے سائے میں اداس کھڑے تھے۔ میں نے ان سے حال احوال پوچھا تو انہوں نے کہا:

”بیٹا! میں یتیم ہو گیا ہوں۔“

زوجہ، زوجہ محترمہ بلکہ زوجہ والدہ ماجدہ کے رتبے پر جا پہنچی۔ محمد حسن عسکری نے کہیں ایک تمثیل بیان کی ہے کہ مرد بھول بھلیوں میں رازوں کے سراغ میں داخل ہو جاتا ہے۔ عورت ہاتھ میں اون کا ایک گولا لے کر ایک سرا سے پکڑا دیتی ہے۔ کہیں سے کہاں تک گھومنے بھٹکنے کے بعد بھی

ہوتا۔ اسے پیچھے کارستہ نہیں بھولتا۔ اُون کے دھاگے کی رہبری میں واپس آ جاتا ہے۔ اپنی عورت کے پاس جو اون کا گولہ لیے اس کی منتظر ہوتی ہے۔ کارہائے نمایاں مرد کے ہیں۔ عورت بظاہر بے عملی کی تصویر ہے۔ عورت کا یہ عمل بے کار نہ ہوتو مرد کی واپسی مشکوک ہو جاتی ہے۔ اسے بھٹکنے نہ دینے کا رستہ ہے وہ۔

اشفاق احمد کی بھیدوں کی خاطر زندگی کی ٹیڑھی میڑھی راہوں پر تھک ہار کر اپنا سفر کھو بیٹھتا مگر بانوان کے لیے مراجعت کی نشانی ہر وقت فراہم رکھتی ہے۔ وہ کہیں چلے جائیں انہیں خبر ہوتی ہے کہ آغاز میں بانو ہوگی۔ اس امید نے اس انجام سے بچائے رکھا ہے۔

ایسی کئی تمثیلیں دھرتی کے دل میں دھڑک رہی ہیں۔ عورت اور دھرتی ایک حقیقت کے دو روپ ہیں۔ دھرتی اپنے سینے پر چلنے والوں کو صرف تحمل کا تحفہ ہی نہیں دیتی، طاقت کا توازن بھی دیتی ہے۔

دھرتی کا سینہ تخلیق کا منبع ہے۔ دھرتی کسی سے روٹھتی نہیں۔ کسی کو روٹھنے دیتی بھی نہیں۔ ہم اسی کی کوکھ سے نکلتے ہیں اور پھر اسی کی کوکھ میں کہیں اور نکل جاتے ہیں۔ وہ اپنوں کو سفر پر جانے دیتی ہے اور مراجعت کی طلب ان کے دل میں نمودار رکھتی ہے۔

جوگی اتر پہاڑوں آیا، نی چرنے دی گھوک سُن کے
مجھے لگتا ہے کہ چاند پر بھی بانو جی ہی بیٹھی چرخہ کاتی ہیں اور اشفاق احمد سورج کو تسخیر کرنے نکلے ہوئے ہیں۔
سورج کو تسخیر کرنے کا مطلب اسے چاند بنانا ہو۔ بانو منتظر رہتی ہیں۔ دھاگے کا گولہ ہاتھ میں ہے اور چرنے کی گھوکر۔
چرنے کی گھوکر آج بھی ان کے دل میں گونجتی ہے۔

قاضی جاوید

قاضی جاوید نے مجھے اصل میں اکادمی ادبیات اور افتخار عارف سے متعارف کرایا۔ وہ اکادمی ادبیات کی لاہور شاخ کا ڈائریکٹر ہے۔ ادیبوں سے اس رسالے کے لیے ان کی نگارشات مانگتا، ان کے بائیو ڈیٹا، ایڈریس اور فون نمبر جمع کرتا اور وقت بے وقت خیر سگالی کی ملاقاتیں اس کے ذمے ہیں۔ ٹیلی فون پر تو اس سے رابطہ تھا ہی لیکن اچانک اس سے بات بھی باقاعدگی سے ہونے لگی۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد جب اشیر بیٹے نے میرا چارج سنبھال لیا تو اس کی ڈیوٹی بڑھ گئی۔ اس نے مجھ سے کچھ اظہار نہ کیا اور چپ چاپ اپنا بستر میرے پٹنگ کے ساتھ جوڑ کر رات کو میری نگرانی کرنے لگا۔ ڈاکٹر نے خبر دیا کہ میری بیماریوں کے پیش نظر میرے لیے سیر بے حد ضروری ہے۔ اس کے لیے شام کو سیر کرنا ممکن نہ تھا کیونکہ وہ شام سے شام گئے، گھر آیا کرتا تھا۔

اس لیے ہم دونوں صبح سات بجے جوگر پہن کر چاک و چوبند نواز شریف پارک جاتے۔ یہ جوگر میرے لیے اشیر ہے۔ پہلی مرتبہ مجھے خود پہنائے کیونکہ مجھے تم سے باندھنا نہیں آتا تھا۔ پہلی مرتبہ جوگر پہن کر سیر کا تجربہ بالکل نیا تھا اور ایک

طرح سے یہ معیار زندگی بہتر کرنے کی تمہید بھی تھی۔

پارک کے اندر جانے کے صرف دس روپے فی کس لگتے تھے۔ اندر سیر کرنے کے دوران تھے۔ ایک تو پارک کے اندر کا راستہ تھا جس پر عام سیر کرنے والے خراماں خراماں جاتے اور دوسرا جو گنگ کرنے والوں کے لیے پارک کے وسط میں گولائی میں چلتا۔ پورے ڈھائی کلومیٹر کی مسافت تھی۔ شروع میں تو اشر میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے عام اندر والے راستے پر تھمہ کر سیر کراتے رہے۔ پھر جب میں رواں ہو گئی تو انہوں نے جو گنگ شروع کر دی۔ ۱۰۰ جو گنگ ٹریک پر نکل جاتے۔ اندر والے راستے پر رواں ہو جاتی۔

آخر میں باہر والے احاطے میں ایک بیچ پر جو بھی پہلے پہنچتا، بیٹھ کر دوسرے کا انتظار کرتا۔ اسی سیر کے دوران مجھے ٹیلی ویژن کے پروڈیوسر، نئے لکھنے والے ادیب اور ایکٹر بھی ملا کرتے۔ یہاں میری ملاقات قاضی جاوید اور مستنصر حسین تارڑ سے ہوئی۔ ایک درمیانے قد اور درمیانے جسم کا شخص دور کر سیوں پر بیٹھا تھا۔ وہ بھاگ کر سیر والی سڑک پر آ گیا۔ ہم نے خوشدلی سے ایک دوسرے کو سلام کیا۔ کچھ دیر باتیں ہوئیں۔ پھر وہ اس کر سیوں کی طرف چلا گیا۔ میں نے اشر سے پوچھا۔

”بھائی یہ کون تھا؟“

”پتہ نہیں امی کوئی ابو کا جاننے والا ہی ہوگا۔“

کچھ ملاقاتوں میں باتوں ہی باتوں میں پتہ چلا کہ محترم قاضی جاوید ہیں۔ اس کے بعد یہ رابطہ مستقل ہو گیا۔ ایک روز ہم سیر کر کے باہر لوٹ رہے تھے تو ہم نے دیکھا جاوید پیدل جا رہے ہیں۔ اشر بھاگ کر پاس پہنچا۔

”آپ کس طرح جائیں گے؟“

”بس لے لوں گا۔“

”لیکن آپ ہمارے ساتھ چلیے نا۔ ابو کی گاڑی ہے۔“

پھر ہم انہیں گھر پہنچانے گئے۔ جب ہم انہیں گھر اتار کر واپس آئے تو اشر بولے۔

”امی! یہ بہت دیا سندر شخص ہے۔ اس دور میں جب فنانس پر گاڑیاں مل رہی ہیں، سیکنڈ ہینڈ کاروں سے تیار پڑا ہے۔ یہ اپنی سفید پوشی نبھائے چلے جا رہے ہیں۔“

پھر سیر چھوٹ گئی۔ مجھ میں سیر کی ہمت نہ رہی۔

لیکن قاضی جاوید سے رابطہ قائم رہا۔ اس سے ادیبوں کے فون نمبر ایڈریس تو ملتے ہی تھے لیکن افتخار عارف کے جاننے میں بھی وہ بہت معاون ثابت ہوئے۔

محمد طفیل + جاوید طفیل

یہ ان دنوں کی بات ہے جب ”نقوش“ رسالہ نہ تو اتر سے چھپتا تھا نہ اسے پڑھنے والا ایسی لگن سے پڑھتا

ایک سنجیدہ قاری کو بڑی ضرورت ہوتی تھی۔ یہ دو غزل اور غزل کی معرفت نظم تک پہنچنے کا عہد تھا لیکن تب بھی طفیل صاحب ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔ شیشوں والی دیوار کے ساتھ بیٹھ کر خاں صاحب سے باتیں کرتے اور چلے جاتے۔ وہ کئی بار خاں صاحب کو اساتے کہ ”داستان گو“ ایک بار پھر شروع کیجیے۔ اب نئے رسالوں کی مانگ ہے۔

خاں صاحب کہتے ”تمہیں داستان گو پسند ہے؟“

”جی بہت۔“

”اس میں کیا بات اچھی لگتی ہے طفیل؟“

سوچ میں پڑ کر طفیل کہتے ”اس کا انوکھا پن، اس میں کئی ایسے مضمون ہوتے ہیں جو کسی اور رسالے میں نہیں ملتے۔ مثلاً جانوروں کے متعلق۔“

”اچھا طفیل ایک کام کرو۔ تم اس رسالے کو چھاپ لو۔ میری پوری اجازت ہے۔ کہو گے تو تحریری اجازت نامہ لکھ دوں گا۔“

”ناں خاں جی نانا۔ میں ”نقوش“ کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ ”داستان گو“ کیسے چلاؤں گا..... یہ کام تو آپ ہی کو چاہیے۔“

خاں صاحب چلے گئے۔ طفیل رخصت ہو گئے لیکن جاوید طفیل نے اب بھی والد کی روایت جاری رکھی۔ وہ مجھے بتاتے ہیں۔ عمو مان کے ساتھ ”نقوش“ کا تحفہ ہوتا ہے۔ پھر میری خیر خیریت پوچھتے ہیں۔ کہانی کے لیے اصرار کرتے ہیں۔ یہی عقیدت سے رخصت چاہتے ہیں۔

ایسے ہی چاہنے والے قلم میں روشنائی بھر کر قلم و کاغذ نکالنے پر اکسایا کرتے ہیں۔

محمد طفیل کا انتقال 5 جولائی 1986ء کو ہوا۔

پنپسی سدھوا

پنپسی سدھوا میرے لیے شروع میں ایک نام تھا۔ ایک چھوٹا سا بادل جو افق پر کہیں معلق تھا۔ پھر ہولے ہولے میں تیز کبھی بدلی میں منتقل ہوا۔ دیکھتے دیکھتے یہ گھٹا ٹوپ بادل بن گیا جو ابھی برساکہ برساکہ اور پھر اس نے سارے لاہور کو تان لیا۔ سورج کو بھی نگاہوں سے اوجھل کر دیا۔ پنپسی سدھوا بھی آئیوری مرچنٹ کی طرح اپنے کام سے پہچانی گئی تھی کہ Beloved City کے سرورق پر کتاب کا نام چھوٹا رہ گیا اور پنپسی سدھوا کا نام کتاب کی ضمانت بن گیا۔

لیکن شروع میں پنپسی صرف ایک غیر معروف نام تھا جو کبھی کبھی خاں صاحب استعمال کیا کرتے۔ ایک دن وہ ”پاس The Crow Eaters لے کر آئے اور کہنے لگے، یہ کتاب پڑھو۔ پارسی کمیونٹی پر اس سے بہتر کوئی ادب سے غر سے نہیں گزرا۔ کتاب غلام علی اینڈ سنز کی چھپی ہوئی تھی، کاغذ معمولی تھا اور ابھی اس کا سرورق بھی غالباً نہ چھپا تھا۔ میں نے بڑی بدمعاملگی سے شروع کی لیکن جلد ہی میں نے اسے پوری توجہ، انہماک اور جی جان سے پڑھنا شروع

کر دیا۔ اسی طرح جب ”آتش رفته“ ”داستان گو“ میں چھپنے کے لیے آئی تھی، یہ کتاب مجھے حیران کر گئی تھی۔

یہ تب کا واقعہ ہے جب خاں صاحب اردو سائنس بورڈ میں ڈائریکٹر تھے۔ ہم سمن آباد سے نقل مکانی کے ماڈل ٹاؤن میں رہائش پذیر ہوئے۔ ان دنوں اردو بورڈ کا دفتر گلبرگ میں مین مارکیٹ سے ملحق اور مین سڑک سے متعلق تھا۔ اس کی مالکہ بانی جی مسز بھنڈارا تھیں۔ خاں صاحب جلد ہی بانی جی کے چہیتے بن گئے اور ان ہی کی وساطت سے پیپسی سدھوا کے نام سے متعارف ہوئے۔ پھر وہ چار ملقاتوں کے بعد خاں صاحب نے پیپسی کو اس بات پر اکتفا نہ کر دیا کہ کتاب کو مغرب میں کسی معروف ادارے سے چھپنا چاہیے جو اسے مغربی دنیا سے متعارف کرائے۔ جب خاں صاحب پیپسی کو اکتا تو بانی جی عموماً انٹ کے لہجے میں کہتیں ”اوہ اشفاق بابا تو کاہے کو اس کو غلط راستے پر ڈالتا ہے۔ چار کہانیاں میرے تیرے سے سن کر لکھی ہیں تو اس کو اتنا Importance نہ دے۔“

لیکن خاں صاحب اشتعال دلاتے رہے، ان کا خیال تھا کہ یہ کتاب ضرور تہلکہ ساز ہوگی۔ City جس پری زاد کے نام منسوب ہے، اس کی سالگرہ تھی۔ ان دنوں بانی جی مسز بھنڈارا حسین روڈ والی کوچی میں تھیں۔ ہم دونوں پیپسی کی بیٹی پری زاد کی سالگرہ والے دن بروقت پہنچے۔ قیام پاکستان سے پہلے کی پرانی تعمیر شدہ کوچی میں سالگرہ کا سا دہ سا اہتمام تھا۔ مہمان کم تھے اور کوئی طمطراق، کسی قسم کا Show off معیار زندگی کا رعب نہ تھا، جاہ و جلال جس سے ظاہر ہوتا کہ یہ لوگ اس قدر امیر ہیں کہ قیام پاکستان بننے کے بعد جب پہلی بار بجٹ میں خسارہ پڑا تو اسے بھنڈارے وزیر خزانہ کو قرض دیا اور ایک طرح سے آئی ایم ایف کا کردار ادا کیا۔

چائے جاری تھی جب باہر کسی آئس کریم والے نے اونچی آواز میں آواز لگا دیا۔ پری زاد بانی جی کے پاس اور بولی ”مجھے دس روپے دے دو۔“

پیپسی نے اشارے سے منع کیا لیکن پری زاد بولی نہیں۔ پھر دس روپے مانگے۔

بانی جی نے پیار سے پوچھا ”دس روپے کاہے کو چاہیے؟“

”آئس کریم کھانی ہے۔“

خاں صاحب بانی جی کے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے فوراً دس روپے کا نوٹ پری زاد کو دینا چاہا لیکن بانی جی روک دیا۔ پھر بانی جی نے کمال پیار سے پری زاد سے کہا۔ ”تم کوکل آئس کریم ملے گا۔ جب ہمارا پری زاد سکول سے آئے گا آئس کریم فروتنج میں ہوگا۔“ یہ اس گھرانے کی تربیت تھی جو فضول خرچی نہیں سکھاتے تھے۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ مجھے سمجھ آ گئی کہ کیوں پیپسی کی شخصیت، اس کی گفتگو، اس کے انداز تحریر میں نہ مبالغہ، نہ نمائشی پہلو، نہ

زبان تھی، نہ زیبائشی انداز..... بہت برسوں بعد 'The Bride' Ice Candyman Cometh, Crow Eaters تینوں کتابیں باہر چھپ چکی تھیں۔ پیپسی امریکہ میں Creative Writing بطور مضمون کے پڑھا رہی تھی۔ اس کے ایک بار جب پیپسی لاہور آئی اور خاں صاحب سے ملاقات ہوئی تو اسے دکھ تھا کہ فارن میڈیا ابھی بھی پاکستان کو نہیں دیتا جو اسے دینا چاہیے۔ خاں صاحب اور پیپسی دونوں اپنے محبوب موضوع پر دیر تک باتیں کرتے رہے اور یہ پاکستان تھا۔ دونوں جی جان سے اپنے وطن کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ اب ”محبوب شہر“ (Beloved City)

کر کے پتھی نے پاکستان سے اپنی محبت کا ایک تین ثبوت پیش کر دیا ہے۔

لاہور داتا کی نگری ہے۔ یہ ایک خوبصورت نہر سے آراستہ ہے۔ مغلیہ عمارتوں سے سجا ہوا، تعلیمی اداروں کی بستی ہے۔ میلے ٹھیلوں کی آوازوں سے گونجتا رہتا ہے۔ باغوں اور بہاروں والا ہے۔ کلچرل سٹی ہے۔ ادیبوں، شاعروں، سیتاروں، فنکاروں کی بستی ہے۔ کھانے پینے کے رسیا لوگوں نے اس کی فوڈ سٹریٹس جاندار کر رکھی ہیں۔ پتنگ بازوں نے اس کے آسمان رنگین کر رکھے ہیں۔

یہی لاہور یونس ادیب کی قلم سے ہو گزرا ہے۔ ”تحقیقاتِ چشتی“ کا حصہ بن گیا ہے، لیکن یہ بات مجھے اچنبھے میں ڈالتی ہے کہ اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی پتھی اسے بھولی نہیں جبکہ اس کے کئی شہریوں کو اس کی شناخت بھی یاد نہیں۔ یہی اس کا محبوب شہر بھی ہے اور اس کی کتاب دیکھ کر لگتا ہے جیسے کہہ رہی ہو جس نے لاہور نہیں دیکھا اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ وطن کی یادیں زندہ رکھنے والی پتھی سدھوا سلامت رہو، خوش رہو۔ لاہور کے عاشقوں کی طرف سے شریہ..... سلام اور دعائیں۔

مینو بھنڈارا

بائی جی نے ہمیں دو بڑے خوبصورت تعلق عطا کیے، پتھی سدھوا اور مینو بھنڈارا۔ مینو، خاں صاحب کو کبھی کبھی پتھی سے یاد کرتے تھے لیکن خاں صاحب کے جانے کے بعد انہوں نے میرا بہت خیال رکھا۔

جب میرے بیٹے اشیر احمد خاں نے ”بونا سیرا ایڈورٹائزنگ کمپنی“ بند کر دی تو بیکاری، کھٹو پن کا بھوت سر پر حملہ لگے۔ اللہ بے عزتی اور ذلت سے کسی کو آشنا نہ کرے۔ قرض، بیکاری، گھریلو ناچاقی عموماً ایسی ذلت کا ضامن بن جاتی ہیں۔ انسان کی عزت دوسروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ دوسرے مشوروں کی آڑ میں احسان جتاتے ہوئے اور آپ کے نقائصِ محبت سے بیان کرتے کرتے ذلت کا گھونسا مار جاتے ہیں۔ اشیر پر بھی کچھ ایسا ہی وقت تھا۔

پچھلے عہد حکومت میں چند اس وقت منسرتھے۔ میں ان سے پہلے چند اور صاحب ثروت و حیثیت لوگوں کو نوکری کے لیے کہہ چکی تھی لیکن بے سود۔ پھر میں نے مینو بھنڈارا سے کہا تو انہوں نے بڑی جلدی اشیر کو Islamic Bank میں نوکری دلوا دی۔

جب بائی جی حیات تھیں، تب کی بات ہے جو نبی انہیں پتہ چلتا کہ کوئی پارسی گھرانہ مالی مشکلات میں مبتلا ہے وہ ایک سیل تیار کرتیں۔ سب گھروں میں اطلاع دی جاتی کہ وہ اپنے پرانے کپڑے، جوتے جو سامان استعمال میں نہیں، بائی جی کے گھر عنایت کر دیں۔ اب اس بیکار سامان کو ڈبوں میں پیک کیا جاتا۔ بائی جی بڑے خوبصورت ڈبے اپنے ہاتھ سے تیار کرتیں۔ ان پر گفٹ پیپر چڑھاتیں۔ پھر ان میں سامان کو فرینے سے لگاتیں۔ سیل ہوتی۔ سامان ہاتھوں ہاتھ بک جاتا۔ ہر دو رقم جمع ہوتی وہ اسی ضرورت مند خاندان کو رات کے اندھیرے میں پہنچا دی جاتی۔

مینو بھنڈارا سے مل کر مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ یہ خوبی ان میں اور بائی جی میں سانجھی تھی۔ عموماً ہر اقلیت

کے پاس بھی اخلاق کی برتری اسے اکثریت کے مقابلے میں سر بلند کرتی ہے۔ کسی اور خوبی اور وصف سے اکثریت کو بائیس مانتی۔ اللہ مینو بھنڈارا کو سلامت رکھے اور رفاہی کاموں کی اور توفیق دے۔ آمین

افضل توصیف

”گزواچ“ کالم لکھنے والی افضل توصیف ایک ایسی ڈرپوک روح ہے جو سچ بول کر بوٹر کی طرح آنکھیں بند کرتی ہے اور دل میں سوچتی رہتی ہے کہ کہیں اس سچ کی مجھے اور میرے گھر والوں کو بھاری قیمت ادا نہ کرنا پڑے۔ ”سچا سچا ادب“ کے حوالے سے اس نے بڑا نام کمایا ہے۔ اسے ملکی اندوہناک حالات، سیاست کی اونچ نیچ، معاشرتی خرابیوں کا تیکھا علم ہے۔ وہ ان سب کے لیے کچھ عمل بھی کرنا چاہتی ہے اور جب عمل کے میدان میں اترنے کے لیے اپنے دوسرے ساتھیوں سے پاتی ہے تو قلم اٹھا کر کم از کم احتجاج اور جہاد شروع کر دیتی ہے۔

ایک لمبا عرصہ وہ میرے پاس آتی رہی۔ اس کے اپنے گھریلو حالات بھی ناسازگار تھے۔ اس لیے دو سالہ صاحب کے چلے جانے کے بعد میری مجبور یوں کا بھی بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی۔ لکھنے لکھانے سے ہم دونوں وابستہ تھیں۔ تعجب خیز بات یہ ہے کہ ہم دونوں نے کبھی حسد کی پلیٹ محسوس نہیں کی اور سچ اور کھلے دل سے ایک دوسرے کے فن کی دانستہ۔ افضل توصیف زیادہ ترقی کی خواہاں بھی نہیں۔ جب سرکاری دوروں پر ادیب بھی نمک برابر ساتھ جاتے ہیں تو افضل نے کبھی کسی سے سفارش کی نداں خواہش ہی کا اظہار کیا کہ وہ بھی اور کچھ نہیں تو دوسرے ممالک کی سیر کرنا چاہتی ہے۔ اس دور میں ایسے ملکی حالات میں اتنا سیدھا راستہ پکڑنا اور استقامت سے اس پر چلتے رہنا بڑی ہمت کا کام ہے۔

آفرین افضل توصیف آفرین.....

مستنصر حسین تارڑ

یہ ان دنوں کی بات ہے جب خاں صاحب ہم سے رخصت ہو چکے تھے۔ انیل اپنا گھر رائیونڈ میں بنا کر چلا گیا تھا۔ اینق امریکہ میں تھا۔ اشیرا ظہار کے معاملے میں باپ کی مانند ہے۔ زبانی کلامی تشفی نہیں دے سکتا لیکن پھر اسے محسوس کیا کہ مجھے گھر سے نکلنے کی ضرورت ہے۔

وہ بینک جانے سے پہلے مجھے نواز شریف پارک میں لے جاتا۔ کار کا کرایہ ادا کر کے انٹری فیس دے دیتا۔ دونوں باغ کے وسط میں ہوتے ہوئے دائرے کی شکل میں چلتے رہتے۔ اسی سیر کے دوران ایک دن میں نے دیکھا کہ شخص بھاگ بھاگ ہماری طرف آیا۔

”میں مستنصر حسین تارڑ ہوں آپا۔“ اس نے اپنا تعارف کرایا۔

”جی میں جانتی ہوں۔“

وہ ہمارے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

قریباً سال بھر یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جب میرے نپکھے، پروڈیوسرز، تفریحی ملنے والوں کی تعداد بڑھ گئی تو اشیر کے لیے میرے ساتھ چلنا مشکل ہو گیا۔ اب وہ باہر کے جو گنگ ٹریک پرائیویٹ لکھ جاتا اور مجھے اپنا پینڈا اکیلا کرنے دیتا۔ ہم میں سے جو بھی پہلے آ جاتا، وہ باہر والی بیخ پر آ کر انتظار کرتا۔

مستنصر ان یادوں میں سرفہرست ہے۔ میں اس سے پہلے اس کے سفر نامے اور ”بہاؤ“ جیسے خوبصورت ناول سے آشنا تھی۔ یہ ناول مجھے حیران کر گیا۔ ایک نئی زبان، کچھ اور بہتی ہوئی آبادی کی خواہناک داستان کسی اور ادیب کے کی بات نہیں۔ پاکستان میں کسی ایسے ناول سے شناسا نہیں تھی جو تخیل کے زور پر اس پرانی تہذیب میں روح پھونکے۔ وہ زبان بھی اختراع کرے جو غالباً اس عہد میں بولی جاتی تھی۔

مستنصر خیال کے پیچھے بھاگنے والا ادیب ہے۔ وہ خیال کے گولے کے پیچھے بھاگتا بھاگتا ایسے راستوں پر، کتابت سے ہو گزرتا ہے جن کے متعلق ہم اپنے تصور میں کبھی رنگ نہیں بھر سکتے۔ سفر نامے اس کی بے چین روح کی پیداوار ہیں۔ ان میں وہ شیخیاں نہیں مارتا، گدگدی نہیں کرتا، کسی حسینہ کا سہارا نہیں لیتا۔ اسے ”ماچو مین“ بننے کا کوئی شوق نہیں۔ پھر بھی اسے والا اس کی کتاب چھوڑ نہیں سکتا کیونکہ اس کا سفر سحر سے کم نہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ مستنصر خیال سے حقیقت کی طرف آتا ہے۔ اس کی ترغیب خواب سے شروع ہوتی ہے اور پھر پہاڑوں میں ریگستانوں میں پہنچا دیتا ہے جو مکمل حقیقت سے راستے، راستے میں ملنے والے مناظر ہر چیز چھوٹی، دیکھی اور احساسات کے ساتھ محسوس کی جاسکتی ہے۔

مستنصر کا نام ہی بلا مشکل نہیں، اس کے سفر نامے اور سٹائل، اس کے نام کی طرح ناقابل تقلید ہیں۔ سیر بالکل بند ہو گئی۔

لیکن یہاں کی ملاقاتیں گھر میں منتقل ہو گئیں۔ مستنصر اپنی بیگم کے ساتھ کبھی کبھی اور عموماً اکیلے ہی مجھے ملنے آتے رہے اور یوں اس گلدستے میں اضافہ ہوا جو داستان سرائے کے کمرہ نمبر زاویہ میں سجا رہا ہے۔

باقی آپ ٹیلی ویژن پر ان سے کافی واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ وہ ایک انوکھا پروگرام کرتے ہیں جو شادی کے لائن قسم کا ہے، جس میں شادی کے آرزو مند مرد اور عورتیں، لڑکے اور لڑکیوں کو باہمی رابطے کی صورت دکھاتے ہیں۔ اس ثواب کے کام میں وہ میرج بیورو کا کام کرتے ہیں لیکن تعجب یہ ہے کہ چارج کچھ نہیں کرتے۔ یہ پھر مستنصر کے خیال کی مہربانی ہے۔ اس کا یقین ہے کہ احسان کا بدلہ احسان ہے اور اس طرح پیسہ وصول کر کے انسان بڑے اجر سے محروم ہو جاتا ہے۔

کشورناہید

کشورناہید کو اپنی زندگی کے سفر کو سیدھا کرنے میں بڑی جدوجہد کرنا پڑی۔ اسی مشقت بھری زندگی میں کسی

مقام پر وہ بہادر عورت بن گئی۔ اب اس کا ذاتی غم، ناکامی اور ”وا حسرتا“ قسم کی مایوسی نے عمومی رنگ بنا لیا۔ وہ اپنے غم کا لبادہ اتار کر کالا لباس پہن کر عورت کی مظلومیت کی داعی بن گئی۔ اس کا خیال، اس کی تحریکوں میں ابھرنے لگا۔ وہ ایک نئے کو بھی یہ سننے کو تیار نہ تھی کہ ”کاغذی ہے پیر بن ہر پیکر تصویر کا“۔ وہ یہ ماننے کو راضی نہیں کہ مرد کی زندگی جو عورت اور بچے کی کفالت کا بوجھ اٹھاتی ہے، اسے بیرون گھر کچھ ذلتوں کا سامنا رہتا ہوگا۔ افسروں کی زیادتی، ماتحتوں کے موڈ، کام کی اڑچن، مرد کی عزت نفس پر پے در پے حملے کرتی ہیں۔

اب کشور عورتوں کو اس بات پر اکتاتی ہے۔ اٹھو اور میری دنیا کی عورتوں کو جگا دو۔ وہ بھی باہر نکلیں اور اپنے حصے کا رزق کمائیں۔ گھر کی پرورش، بچوں کی رہنمائی، شوہر کی دلجوئی کو خدا حافظ کہیں۔ بیسویں صدی عورت کی آزادی کی علمبردار ہے۔ اب شادی وہی تھپیڑے کھائے گی جو مغرب کے معاشرے میں اس کا نصیب ہے۔ شادی کا مستقبل، مشرق میں بھی مشکوک ہو چکا ہے۔ اب یہاں بھی خاندانی نظام مشکوک ہے اور بچے جو ہر نسل کا مستقبل ہیں، ماں باپ کی طرف دیکھتے رہ گئے ہیں اور پوچھتے ہیں آخر وہ کس کی اولاد ہیں۔ انہیں اتنا وارث کیوں چھوڑ دیا گیا؟

لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب کشور لمبی اڑانوں پر نہیں نکلتی تھی۔ وہ خاں صاحب کی چیتھی تھی اور ”کھلم“ پروگرام کے ہر Episode میں ان کے ساتھ بیٹھتی تھی۔ اس کے چہرے پر قدرتی حیا اور مٹی کا سادب چھایا ہوتا لکیریں۔ یوسف کامران اللہ کو پیارا ہو گیا۔ چادر اور چادر یواری کا تصور ختم ہو گیا۔ اب کشور عورت سے انسان بن گئی۔ اس کے گھر میں شام کو رنگ رلیوں کی محفل ہوتی اور کشور آزادی پسند لوگوں کی میزبانی کرتی۔

کشور دل کی اچھی لیکن زبان کی آری چلانے سے باز نہیں آتی۔ دعا ہے کہ اسے اپنے رویے میں ”توازن“ کا خوبی مل جائے۔ وہ اپنے بچوں، ملاقاتیوں اور رشتہ داروں کے لیے مثبت رویہ، سوچ اور عمل رکھے۔ اس سے خود اس کے ذات کو بہت سکون اور اطمینان ملے گا اور وہ اللہ کے شکر گزاروں میں شامل ہو جائے گی۔ یہ نسخہ بھی آزما دیکھیں۔ کشور..... ایک مطمئن ماں سے بڑی وراثت اولاد کے لیے کچھ نہیں.....

افتخار عارف

افتخار عارف اپنی عینک کو اس طور استعمال کرتے ہیں، جیسے چونچل لڑکیاں اپنے دوپٹے کو اداؤں میں باندھتے ہیں۔ افتخار عینک چہرے سے کم کم اتارتے ہیں لیکن اپنی انکشت شہادت سے کبھی انگوٹھے سے اسے ناک پر جماتے ہیں۔ ہجرت کر کے جو لوگ بھی پاکستان میں آئے ہیں، ان کی مشکلات مقامی لوگوں کی سمجھ میں پورے طور پر نہیں آتی۔ زبان، رسم و رواج، رہن سہن میں تو واضح طور پر فرق ہوتے ہی ہیں لیکن سب سے بڑا مسئلہ Acceptance کا ہے۔ مہاجر بہت زیادہ خوشدلی سے آگے بڑھ کر آپ سے دوستی کرنا چاہے تو اس کی شامت آ جاتی ہے۔ اس پر مغرب کا لیبل لگ جاتا ہے۔

ان دونوں صورتوں میں توازن قائم رکھنا اور اصلی میرٹ کی وساطت سے مقام پیدا کرنا کاردار ہے۔

تیار اور ادب میں مقام پیدا کرنا خاصی کٹھن منزل ہوتی اگر اس کے پاس شاعری کا ہتھیار نہ ہوتا۔ اس کی شاعری میں وہ سادگی، تیکھا پن اور دل میں اتر جانے والی خاصیت ہے جو اس کی آدھی لڑائی لڑتی ہے۔ جو لوگ بظاہر افتخار کے قائل نظر نہیں بھی آتے، وہ بھی اس کے اشعار کی تاثیر سے انکار نہیں کر سکتے۔

میں افتخار سے خاں صاحب کے جانے کے بعد ملی۔ خراج تحسین کا پروگرام تھا۔ وہ میرے سامنے والی قطار میں بیٹھا تھا۔ دو تین بار اٹھ کر آیا اور لفظی اظہار کے بغیر اظہار ہمدردی کر گیا۔ خاں صاحب سے اس طرح پیار کرنے والوں کی حرمت میں افتخار ایک قابل ذکر شخصیت ہے۔ اب باقاعدگی سے ”ادبیات“ ملتا ہے۔ افسانوں کے لیے اظہار اور عقیدت کو چھپا کر نہیں اعلانیہ پیش کر دیتا ہے۔

شکر یہ اور پھر شکر یہ.....

امجد اسلام امجد + عطاء الحق قاسمی

امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی ایسے جڑواں ادیب ہیں جن کا تصور علیحدہ کرنا میرے لیے مشکل ہے۔ خاں صاحب کی ان دونوں سے محبت مجھے تھوڑا سا حسد عطا کیا کرتی تھی۔

امجد جب بھی کوئی نئی نظم یا غزل لکھتا فوراً داستان سرائے پہنچا کرتا۔ عطلہ آتا تو اپنے کالم، نظمیں ساتھ ضرور لاتا۔ ایک روز جب عطاء گھر پہنچا تو دو پہر کے کھانے کا وقت تھا۔ خاں صاحب نے مجھے کھانا لانے کے لیے کہا۔ اس روز سرسوں کا ساگ پکا تھا اور میں کئی کی روٹی بنا رہی تھی۔ تازہ کھن اور روٹی لے کر میں اندر پہنچی تو عطاء نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا۔

”یہ روٹی آپ نے پکائی ہے یا تو آپ؟“

”بالکل کوئی شک ہو تو اندر آ کر دیکھ لو۔“

اس نے حیران ہو کر سردائیں بانیں ہلایا۔ ”پڑھی لکھی عورت اور اس قدر مہارت! تعجب، حیرانی!“

تعریف نشانے پر لگی۔ میرے دل میں عطاء نے گھر کر لیا۔ ان دنوں ”معاصر“ رسالے کے دنوں کرتا دھرتا امجد اسلام امجد اور عطاء الحق قاسمی رسالے سے قریب قریب ریٹائر ہو چکے تھے اور عطاء کا بیٹا عمر قاسمی ادارت کی ذمہ داری سنبھالتا تھا۔ شاید عطاء نے گھر پر میری تعریف کی ہو کیونکہ اسی واقعے کے بعد عمر نے ”راجہ گدھ“ پر ایک سیر حاصل سمنون لکھا اور مجھے اپنے احسان کے Lasso میں گھیر لیا۔

خاں صاحب بابوں کی طرح سمجھتے تھے کہ دسترخوان دوستی اور اظہار یگانگت کے لیے ایک آزما یا ہوانسخہ ہے۔ ایک مرتبہ جب امجد اسلام امجد اپنی بیوی فردوس کے ہمراہ آئے تو فردوس کچھ پکوان پکا کر لائی لیکن انڈے ادرک کی ڈش نے میلہ لوٹ لیا۔

”بھئی ادرک انڈے قدسیہ کو پکانا سکھا دو فردوس۔“

فردوس نے بڑی لگن اور محنت سے مجھے ترکیب سمجھائی لیکن وہ لطف پیدا نہ ہوسکا جو فردوس کے پکیارے میں تھا۔ غالباً یہی ہاتھ کا فرق ہے جو کسی ہوٹل کی مشہوری کا باعث بن جاتا ہے۔

امجد ہمیں ایک مرتبہ اصرار کے ساتھ چائیز کھانا کھلانے لے گیا۔ جس محبت سے اس نے کھانے کا آرڈر کیا۔ کھانا بھلائے نہیں بھولتا۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد وہ باقاعدگی کے ساتھ میری خیریت معلوم کرنے آیا کرتا ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر مجھے لگتا ہے جیسے وہ میری ساری تنہائی کو کسی طرح اپنے اندر جذب کر کے لے جانا چاہتا ہے۔ جیسے جاتے وقت اس کے کندھے کچھ ایسے سکرے ہوئے خمیدہ ہو جاتے ہیں جیسے وہ اپنے مشن میں فیل ہو گیا ہو۔

بیشتر ادیبوں کی طرح عطاء اور امجد نے روزی کمانے کے لیے بڑے پاپڑ بیٹے ہیں۔ ایم اے او کالج میں پڑھایا۔ گورنمنٹ کالج میں پروفیسری کی۔ ان دنوں امجد اسلام امجد Children Complex کا ڈائریکٹر جنرل ہے۔ اتنی مصروف زندگی میں وہ پتہ نہیں میرے لیے کیسے وقت نکال لیتا ہے۔

عطاء الحق قاسمی اپنی بیگم کو بھی دو تین بار میرے پاس لائے ہیں۔ خاموش خاموش، پروفیسر نی کم گو بھی ہیں۔ عطاء میں گم بھی ہیں۔ اس جوڑی کو دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ ان دونوں نے ایک دوسرے کے سہارے جینے کا فن سیکھ لیا ہے اور ان کو اب گھر سے باہر رابطوں کی ضرورت نہیں۔

”معاصر“ رسالے کے لیے امجد اور عطاء نے بڑی محنت کی۔ رسالہ مستقل مزاجی اور استقامت کے بغیر نکلنے کا مشکل ہے اور ان دونوں کی سائنجی کوشش سے یہ رسالہ اردو کے رسالوں میں ”سرکڈ واں“ نظر آتا ہے۔

سیما پیروز، یاسمین حمید، رخشندہ نوید

یہ تینوں نہ تو دوست ہیں اور نہ غالباً ایک دوسرے کو جانتی ہی ہیں لیکن میرے ذہن کی سکرین پر یہ تینوں چہرے عموماً ڈزاولو (Desolve) کر کے سمجھی ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں اور کبھی ایک کے بعد دوسرے ٹھپے کی طرح تین رنگوں میں منتقل ہو جاتا ہے۔

سیما پیروز عموماً جب مجھ سے ملنے آتی تو تھنسی پیروز بھی اس کے ساتھ ہوتے۔ تھنسی بھی اچھی بھلی کہانیار تھے تھے لیکن شاید سیما کے پیرو بکس کے آگے ان کا دیا نہ مل سکا یا پھر روزی کمانے اور گھر یلو اخراجات پورے کرنے کی سبب نے انہیں اس فیلڈ میں دور تک چلنے نہ دیا۔

آج مسابقت کے عہد میں ویسے بھی اچھے بھلے ادیب یونہی روندے جاتے ہیں اور کچھ بانصیب ادیبوں کے کندھوں پر سوار بالا ہی بالا ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں، جن کی ان کو بھی امید نہیں ہوتی۔ سیما کے نصیب یا دور رہے۔ کافی فاصلہ طے کر گئی۔ میرا خیال ہے جہاں تک اس کی رسائی ہو سکتی تھی، وہاں تک وہ پہنچ نہ پائی۔ پتہ نہیں پئی آرکی کی تھی کہ محنت کی۔ بہر کیف ترقی کا سفر ایسا ہے کہ اس کے لیے حتمی طور پر کچھ بھی کہا نہیں جاسکتا۔

یاسمین میرے پاس آئی تو وہ مجھے نہ تو استانی لگی نہ شاعرہ۔ میرا خیال ہوا کہ وہ ٹی وی سے وابستہ ہے اور کسی

کے سلسلہ میں آئی ہے لیکن جب اس نے اپنا تعارف کرایا تو بھید کھلا کہ موصوفہ ایک بڑی حساس شاعرہ ہیں اور ان کا پروفیشن
تصمیم و تدریس سے ہے۔ یاسمین مجھے ملنے آتی رہیں لیکن خاں صاحب کے جانے کے بعد اسے زندگی کی مصروفیت نے
بے کر لیا۔

رخشندہ نوید جب پہلی مرتبہ مجھے ملیں تو ان کے ہاتھ میں اپنی شاعری کا مسودہ تھا۔ انہوں نے مجھ سے فرمائش کی
کہ میں اس پر دو بیاچہ لکھ دوں۔

”تم غلطی پر ہو رخشندہ۔ تمہارا مطلب یہ ہوگا کہ خاں صاحب تمہارے لیے پیش لفظ رقم کریں۔“

”نہیں بانو آپا، آپ ہی لکھ کر دیجیے۔ وہ پتہ نہیں کتنی دیر لگا دیں گے۔“

مجھے اس کے چہرے پر ایسی حیا نظر آئی جس نے مجھے بڑا متاثر کیا اور میں نے مسودہ اس سے پکڑ لیا۔

ابھی خاں صاحب حیات تھے۔ ایک دن میں نے ٹیلی ویژن لگایا تو سکرین پر سرفراز شاہ صاحب نظر آئے۔
رخشندہ نوید ان کا انٹرویو لے رہی تھی۔ شاہ صاحب کچھ روحانی بصیرت کے حوالے سے لوگوں کے مسائل اور ان کے حل
پیش کر رہے تھے۔ ابھی ٹیلی ویژن پر ایسے پروگرام کم ہوتے تھے۔ یہ اپنی نوعیت کا غالباً پہلا پروگرام تھا جو اونٹے کے شانہ
یہ شانہ چلتا رہا۔ پھر شاہ جی لندن چلے گئے اور یہ پروگرام سکرین سے مع رخشندہ نوید غائب ہو گیا۔ اب مجھے معلوم نہیں کہ
موصوفہ کہاں ہوتی ہیں۔ ان کی نظمیں، غزلیں میں شوق سے رسالوں میں پڑھتی ہوں۔ کچھ پرانے تعلق کی بنا پر۔ کچھ اس کی
شاعری میں اپنی ہی سلگا ہٹ ہے جس کی تپش آسانی سے آپ تک پہنچ جاتی ہے۔
زندگی کا شکریہ جس نے مجھے ایسی محبت کرنے والی روحمیں ملا دیں۔

احمد عقیل روبی

میرا خیال ہے کہ ہر پچیس تیس سال کے بعد ہر ملک کے مشاہیر بدل جاتے ہیں۔ جوں جوں نئی ایجادات فروغ
پاتی ہیں۔ معاشرہ غیر محسوس طریقے سے نئے رسم و رواج، لباس کی تراش خراش، زبان میں نئے الفاظ کی نمو، معیار زندگی
میں نئے انداز اختیار کر لیتا ہے۔ زبان جو ادیب کا ہتھیار ہے، اس میں بھی نئے الفاظ کی پھیری لگ جاتی ہے۔ انگریزی تو
عشری زبان میں داخل ہوئی رہی ہے لیکن اردو بھی اب انگریزی میں لکھے جانے پر مُصر ہے۔ اسے فیشن کہہ لیجیے کہ وقت کی
ضرورت کہ زبان پر ہر طرف سے یلغار ہو رہی ہے۔

اب آپ کو جگہ جگہ Bill Boards پر ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں ایسے اردو الفاظ کثرت سے نظر آئیں
گے جو انگریزی میں اردو کو رواج دے رہے ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ادبی دنیا ایک گلوبل ویلج بننے پر مُصر ہے۔
صرف ایک مشکل ہے کہ ابھی جس کی لائٹھی اس کی بھینس جیسی قدر نہیں بدلی۔ معاشرے میں انصاف کی بنیادی اہمیت کا
سلامی معاشروں کو نہ احساس ہے نہ وہ اس معاملے میں کوئی ذمہ داری ہی محسوس کرتے ہیں۔

اس ضمن میں ہم سب الفاظ کے استعمال میں فراخ دل ہو رہے ہیں، لیکن عقیل روبی ایک نئی سمت سے اس تبدیلی

میں داخل ہوا ہے۔ عقیل روہی گریک Mythology میں سر تا پا کھویا ہوا ہے۔ اس نے ہندو دیومالاؤں کی طرف کم کم توجہ دی ہے۔ وہ Odepius, Trojan Wars اور ہیلن آف ٹرائے کے شہرہ آفاق حسن کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ میں ترجموں کی بات نہیں کر سکی۔ ورلڈ کلاسیک کا ترجمہ ایک بہت خوش آئند عمل ہے لیکن عقیل روہی نے صرف ترجمے کا سہارا نہیں لیا۔ ہمارے ادب کو گریک دیومالاؤں سے رنگ برنگی روایات دکھانے کی کوشش کی ہے۔

عقیل روہی ہمارے گھر میں ممتاز مفتی کی وجہ سے آتے تھے۔ مفتی جی جب بھی لاہور آتے، اپنا میلہ ساتھ لاتے۔ خاں صاحب سے بھی ان آنے والوں کی ملاقات ہو جاتی۔ پھر کچھ لوگ مفتی جی کو نہ چھوڑتے اور کچھ ان سے پتھر کہہ خاں صاحب کے ارادت مند بن جاتے اور مفتی جی کو نئے سے لگ جاتے لیکن میرا خیال ہے کہ جب تک مفتی جی حیات رہے، عقیل ان ہی کے حلقہ ارادات میں داخل رہے اور خاں صاحب کو کبھی دوسرے درجے کی توجہ دی۔ اس بات کا اندازہ میں نے یوں لگایا کہ عقیل روہی نے مفتی جی پر ”علی پور کا مفتی“ تحریر کی لیکن انہیں کبھی خاں صاحب پر ایسی کوئی کتاب لکھنے کا خیال نہ آیا۔

ابدال بیلا اور عقیل روہی مفتی جی کے ایسے عاشق زار ہیں جنہوں نے اپنی محبت میں دوئی کا زہر نہیں ملایا۔ شہرہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں تنقید نگار نہیں ادیب ہیں اور وہ جب بھی لکھتے ہیں ان پر جذبات حاوی ہو جاتے ہیں وہ کسی چیز پر معرضی تبصرہ نہیں کر سکتے۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد عقیل روہی نے بڑی مروت سے مجھے ملنا شروع کر دیا۔ خاں صاحب گویا اپنے چاہنے والوں کی محبت سے میری زندگی کا خلا پُر کر رہے تھے۔

ایک روز شام کے وقت عقیل روہی آیا۔ پتہ نہیں ہمارے ڈرائنگ روم کا مشرق کی جانب شیشے کی لمبی کھڑکیوں سے کیا تعلق ہے کہ عموماً یہاں ہی کچھ ایسے بھید کھل جاتے ہیں جو ہماری شعوری سوچ کا حصہ نہیں ہوتا اور یہ بات بھی سمجھ نہیں آتی کہ ایسے واقعے عموماً عصر اور مغرب کے درمیان کیوں ہوتے ہیں۔

جس روز شام کو عقیل آیا۔ کہیں مغرب کا وقت قریب تھا۔ آسمان پر بادل تھے اور وقت کا تعین نہ ہو سکتا تھا۔

”آپاجی..... باہر لان میں دیکھیے۔“

میں نے باہر نگاہ دوڑائی۔

”کیا آپ اندازہ لگا سکتی ہیں کہ اس وقت چاند نکلنے والا ہے کہ سورج غلج ہوئے کا عمل ہے۔“

”لو اس کا اندازہ لگانا تو آسان ہے۔ ابھی میں نے عصر پڑھی ہے۔ اب تو غروب آفتاب کا وقت ہے۔“

بادلوں کی وجہ سے سرفی نظر نہیں آ رہی۔“

”نہیں نہیں بانو! آپ تو تجربے سے بات کر رہی ہیں۔ بھلا اگر کسی دوسرے ملک کے اجنبی کو آنکھوں پر پتے

باندھ کر ملکہ سبا کی طرح یہاں لے آیا جائے تو کیا وہ بتا سکے گا کہ سورج نکلنے والا ہے کہ ماہِ منیر۔“

”ہاں پھر تو مشکل ہے۔“

”میں کافی دیر سے ارضی و سماوی نباتات و جمادات، بستے پانی، اونچے پہاڑ دیکھ رہا ہوں۔ بادلوں نے میرے

بوش گم کر دیئے ہیں۔ بانو آ پ! جو راز مذہب کی جھولی میں چھپے ہیں ان کا مقابلہ تو کوئی دیو مالا نہیں کر سکتی، آخر فلسفی اور دیو مالا کی ہیرو بھی تو زندگی کے معنی تلاش کرتے ہیں، لیکن جو معنی مذہب عیاں کرتا ہے اور ڈھانپ بھی رکھتا ہے اس سے بے اسرار، راز اور کہاں ہوں گے۔“

کچھ عرصے بعد مجھے پتہ چلا کہ عقیل روبی نے جو کچھ گریک Mythology سے حاصل کرنا تھا، غالباً کر لیا اور یونانیوں کا سفر چھوڑ کر بڑی شاہراہ پر گامزن ہو گئے۔ اس کی شہادت یوں ملی کہ ایک روز وہ آیا تو اس کے ساتھ ”سورۃ الحمد“ کا منظوم ترجمہ تھا۔

اصرار سے بولا۔ ”بانو آ پ! اسے پڑھ کر ضرور بتائیے کہ ترجمہ کیسا ہوا؟“

میں اسے کیا بتاتی کہ ترجمہ کیسا تھا۔ نہ مجھے مذہب کی سمجھ تھی نہ شاعری کی نہ ترجمے ہی کی۔

ابھی تھوڑی دیر پہلے کی بات ہے کہ ایک روز عقیل طے آئے تو میں نے اپنے کچھ شکوک کا اظہار کیا۔

”عقیل..... نماز کے کچھ حصے میری سمجھ میں نہیں آتے۔“

”آپ سمجھ کے کیا لیں گی۔ ساری نماز حمد و ثنا ہے اور انسان کی عاجزی اور اللہ سے مدد مانگنے کے لیے پڑھی جاتی

ہے۔ یقیناً جائے بانو آ پ! اللہ کو ہماری تعریف سے کوئی خوشی نہیں ہوتی۔ وہ کہتا ضرور ہے کہ میرے لیے نماز پڑھو لیکن وہ

ہرگز اس نماز کا محتاج نہیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ ہم پانچ وقت اس کی مدد کے طالب رہیں اور ارض و سما کے ان لوگوں

میں شامل رہیں جو اسی سے مانگتے ہیں۔ یہ نماز ہماری روح کو وضو کی طرح دھوتی ہے۔ اس کا فائدہ صرف ہمیں ہے۔“

میں عقیل روبی کی تبدیلیاں دیکھ دیکھ کر حیران ہوں۔ ویسے تو ہر انسان تک رسائی مشکل ہے لیکن ایسا انسان جو

واضح طور پر اتنی کروٹیں لے اس کا کیا پڑتا لگا کریں۔

محمد یونس بٹ

آپ لوگ محمد یونس بٹ کو ایک مختلف زاویے سے دیکھتے ہیں۔ آج کے سٹ کام کے عہد میں جب آدمی کے جڑے سخت، آنکھیں تنی ہوئی اور زبان لکنت کے آس پاس رہتی ہے۔ یہ ساری ٹینشن، ہلکے پھلکے مزاج سے دور کرنے کی کوشش میں محمد یونس بٹ ہی کامیاب ہے۔ وہ جملے لٹانے اور اس میں نئے معنی اور روح پھونکنے میں لاجواب ہے۔

لیکن میں محمد یونس بٹ کو اپنے محسن کے طور پر جانتی ہوں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب 1985ء میں مجھے بلڈ کینسر نے گھیر لیا تھا۔ میں یونس کو نہیں جانتی تھی۔ وہ بھی خاں صاحب سے ملنے ڈرائنگ روم کی حد تک آیا کرتا تھا۔ غالباً وہ ہمیشہ سے ایک ہمدرد دل کا مالک ہے۔ جب میں ہسپتال میں داخل ہوئی تو پتہ چلا کہ مجھے خون کی شدید ضرورت ہے۔ سارا دن خون کی بوتل لگتی اور بلڈ کاؤنٹ کو بارہ تک لایا جاتا۔ پھر بیماری حملہ آور ہوتی اور میرا بلڈ کاؤنٹ گر کر چھ تک ہو جاتا۔

ہسپتال میں سب سے پہلا Donor اشتیاق کا بیٹا صائل پہنچا۔ اس نوجوان نے مجھ سے کہیں پہلے میرا بلڈ گروپ اپنے لہو سے میچ کر کر بی پوزیٹو لہو کی بوتل جمع بھی کرادی تھی۔

دوسرا شخص جو ہسپتال میں موجود تھا۔ وہ یہی نوجوان یونس بٹ تھا۔ جس وقت میرے بازو میں صائل کے خون کا قطرہ قطرہ جا رہا تھا، یہ بڑی لجاجت سے داخل ہوا۔
 ”آؤ بھئی آؤ تم کہاں؟“

وہ بلا جھجک بولا..... ”ڈاکٹری کے پاس گیا تھا خاں صاحب۔ میرا خون بھی بی پوزیٹو ہے۔ میں خون دینا چاہتا ہوں لیکن ڈاکٹری کہتے ہیں آپ کی اجازت کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔“

”اویار یونس! بیٹھو بیٹھو تم کس مصیبت میں پڑ گئے ہو۔ لہو کی کمی ہو جائے گی خواہ مخواہ۔ جانے دو۔“
 ”جی نہیں۔ اشفاق صاحب! مجھے خون دینے دیں۔ میں شہنی مار سکوں گا کہ بانو قدسیہ ”راجہ گدھ“ کی مصنفہ کی رگوں میں میرا ہودوڑتا پھرتا ہے۔ آپ مجھے اس اعزاز سے کیوں محروم کرتے ہیں؟“
 اس کی خواہش میں کچھ ایسی سچائی اور طلب تھی کہ خاں صاحب انکار نہ کر پائے اور یونس کا لہو میری رگوں میں دوڑنے پھرنے لگا۔

باقی دعا ہے کہ اللہ سے اپنی آرزوؤں میں کامیاب کرے اور لوگ تادیرا سے یاد رکھیں۔ عموماً مزاج نگار لوگ سوڈے کی بوتل کی مش ہوتے ہیں۔ جو نہی کسی کی ٹینشن رفع ہو جاتی ہے، گیس نکل جاتی ہے۔ مزاج نگار بھی بھول جاتا ہے۔ مسکراہٹ اور آنسو میں یہی فرق ہے۔ ایک آنسو بھی یاد میں تادیرا باقی رہتا ہے اور گھنٹہ بھر ہنسانے والا لہو میں بھٹی جاتا ہے۔

ایکٹروں کی دنیا

اللہ نے کچھ بیکار پیدا نہیں کیا۔ لطافت اور کثافت اپنے اپنے مقام پر ہوں تو فائدہ اور راحت پہنچاتے ہیں۔ بے وقت اور غلط مقام پر ان کے نتائج نہیں نکلتے۔ ایسے ہی وفاداری بے وفائی دونوں اپنے مقام پر خوب ہیں۔ یہ سب کچھ یہ کہ گھنا چھتھرا درخت ایک مدت ایک ہی جگہ کھڑا رہتا ہے۔ اس کی وفاداری آپ کے سامنے ہے۔ پرندے گھومتے بنانے، مسافر آرام کرنے، لڑکیاں جھولنے ڈالنے کے لیے ایسا ہی سایہ دار شجر تلاش کرتی ہیں۔

بہار کے دنوں میں کھلنے والے خوشبودار پھول دو روزہ مہمان بڑی بے وفائی کے مرتکب ہوتے ہیں، گیس کے بغیر زندگی کا گلزار رنگ و بو سے آشنا نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ایکٹروں کی میڈیا سے وابستہ فنکاروں کی بے وفائی ہے۔ پرت میڈیا میں ان کے سکیڈل ان کی بے وفائیاں چسکے لے لے کر بیان کی جاتی ہیں۔ مارلین منرو، ریمیا ہو، سب اپنے اپنے مقام پر اپنی جان پر کھیل کر آپ کی بے رنگ و بو زندگی میں رنگینیاں کے کرآتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی شہرت گلاب کتنی دیر کھلے گا اور کس وقت کوئی نیا چہرہ انہیں پچھاڑ کر گمنامی کے کنوئیں میں پھینک دے گا۔

ہم فقط ان کو دل لگی کا درجہ دیتے ہیں۔ عارضی وقت کئی کا ذریعہ سمجھتے اور اپنے اخلاق اور کردار کو ان سے بچر کھ کر ایک قسم کے احساس برتری میں چلے جاتے ہیں لیکن 1970ء کے لگ بھگ نہ معاشرہ اتنا بے رحم تھا نہ ناظرین اتنے

خود غرض۔ نیلی ویژن کی نئی کھپ سر اٹھا رہی تھی۔ جب خاں صاحب نے ”ایک محبت سو ڈرائے“ شروع کیے تو کئی من موہنے چہرے اور بڑے آرٹسٹ ان کے قریب آ گئے۔

حبیب، فردوس، جمال، قوی، عابد علی، خیام، افضل، آفتاب احمد سب نہ صرف بڑے نام تھے۔ بڑے لوگ بھی تھے۔

عظمیٰ گیلانی، روحی بانو، خورشید شاہد، منور توفیق اسی عہد کی یادگار ہیں۔

ایکسٹرونک میڈیا بھی پوجا پاٹ جیسی متبرک چیز تھی۔

اس میڈیا کو ابھی سٹارٹ ہونے میں دیر تھی۔ ہم لوگ 75۔ جی میں رہتے تھے۔ پتہ نہیں خاں صاحب کو کیا سوچ کر ”دھوپ سائے“ فلم بنانے کی سوچھی۔ اس کا پونٹ خود ایک معرکے کی چیز تھا۔ فلم کی ریکارڈنگ خواجہ جی نے کی۔ فوٹو گرافر فلمی دنیا سے وابستہ تھے لیکن کسی نے بھی خاں صاحب سے ایک پیسے کی ڈیمانڈ نہ کی۔ گانے منیر نیازی نے لکھے اور اس کی دھین طفیل نیازی نے کمپوز کی۔ منیر بھائی کی ایک نعتیہ نظم آج بھی بہت شہرت کی حامل ہے جس کا کھڑا تھا

شام شہر ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تو

یاد آ کر اس نگر میں حوصلہ دیتا ہے تو

سیٹ کے طور پر ایک پرانی کٹڑی کو معمولی سے کرائے پر لیا گیا۔ خاں صاحب دفتر سے گھر آتے۔ پھر مجھے اور بچوں کو کار میں لوڈ کرتے اور کٹڑی پہنچتے۔ میں حیران تھی کہ وہ ہمیں کیوں ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایک روز خود ہی کہنے لگے۔

”کبھی کبھی اردو بورڈ میں کام زیادہ ہوتا ہے۔ شوٹنگ رک نہیں سکتی۔ میری جگہ تم ڈائریکٹ کر لیا کرو۔“

”دھوپ سائے“ کی مختصر کہانی یہ تھی کہ کٹڑی میں سوسائٹی کے راندہ درگاہ لوگ رہتے تھے۔ ان میں ایک طوائف اور ایک شرابی تھا۔ نائب طوائف (منور توفیق) بچوں کو قرآن پاک پڑھایا کرتی تھی۔ اسی کٹڑی میں ایک بدکار دو نمبری مصلیٰ دوایاں بیچنے والے (آفتاب) کا دفتر تھا۔

بچوں کی نفری جب پوری نہ ہوتی تو میرے تینوں بچے اور ان کے دوست عدنان قدیر سے کتنی پوری کر لی جاتی۔ جس روز منور بچوں کے ساتھ ایک بھاری درخت کے تلے ایک تھڑے پر بیٹھی تھی، شرابی (قوی) گارہا تھا۔ ”شام شہر ہول“ سارا ہنگامہ ہوا۔ مصلیٰ ادویات بنانے والے (آفتاب) نے طوائف کی بے عزتی کی اور شرابی (قوی) طوائف کو لے کر رخصت ہو گیا۔ یہاں ایک معرکے کا جملہ تھا جب قوی کہتا ہے:

”چل آ پا زہرہ۔ ہم اس کٹڑی میں رہنے کے قابل نہیں ہیں۔“

خاں صاحب کی جملہ تحریروں میں ایک بات اگتباہ کے ساتھ جاری و ساری ہے۔ وہ بار بار پاکستانی معاشرے کو Warn کرتے تھے کہ دوسروں سے نفرت پاکستانی معاشرے کو کھوکھلا کر کے اسے طبقوں میں بانٹ دے گی۔ پھر اس میں یکجہتی اور قومی مفاد کی پیروی لگانا مشکل ہوگی۔ جیواور جینے دو کے فارمولے پر عمل کر کے ہی بھانت بھانت کے لوگ اکٹھے رہ سکتے ہیں اور ایک منزل کے راہی بن سکتے ہیں۔

اسی فلم میں ایک بدنصیب لڑکی کے منہ سے خاں صاحب نے ایک ایسا جملہ کہلوا یا جو بعد میں کئی مقامات پر انہوں نے خاص طور پر استعمال کیا۔ یہ بدنصیب لڑکی جو شرابی سے محبت کرتی ہے، تندور چلاتی ہے اور آرزو رکھتی ہے کہ شرابی شراب پینا چھوڑ دے۔ جب شرابی کٹڑی سے رخصت ہو جاتا ہے تو کہتی ہے۔

”پہلے میں کہتی تھی کہ وہ پینا چھوڑ دے۔ اب میں کہتی ہوں وہ چاہے پیتا رہے لیکن یہیں رہے۔“

کچھ دیر بعد اپنے آپ کو سمجھانے کے انداز میں دلاسہ دیتی ہوئی کہتی ہے:

”جانے والے چلے جاتے ہیں لیکن اپنی محبت یہیں کہیں چھوڑ جاتے ہیں۔“

یہ جملہ اب مجھ پر صادق آتا ہے۔ خاں صاحب تو چلے گئے لیکن اپنی محبت یہیں کہیں آپ لوگوں کے دلوں میں چھوڑ گئے ہیں جس کی بدولت زندگی قابل برداشت ہے۔

یہاں سے قوی، خاں صاحب کا ہم سفر بن گیا۔ قوی اور اس کی اہلیہ ناہیدہ ابھی تک مجھے بڑی محبت سے دیکھ رہے ہیں اور ان کی محبت کا مجھے بڑا سہارا ہے۔ قوی چونکہ پٹھان آدمی ہے اس لیے اس کی غیرت و فاداری کی بنیاد بن گیا۔ ابھی تک اس کی نیاز مندی میں کمی نہیں آئی۔

”دھوپ سائے“ سینما گھر میں ایک ہفتہ بھی نہ چلی، لیکن خاں صاحب اور میرے درمیان کبھی کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس سے مایوسی کی بو آتی ہو۔ خاں صاحب زندگی گزارنے کا طریقہ، سلیقہ اور وطیرہ جانتے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ شکست آخری حرف نہیں۔ خم ٹھونک کر یا علی کا نعرہ لگا کر چیخ بول کر قبول کرنے سے زندگی کی بازی جیتی جاسکتی ہے۔

خاں صاحب کی زیادہ توجہ جب فلم کے تجربے کے بعد ٹیلی ویژن ڈرامے کی طرف مبذول ہوئی تو ”ایک ہیبت سو ڈرامے“ سے کھیل گرم ہوا۔ خاں صاحب پروڈکشن میں تو شامل نہ ہوئے لیکن ڈرامے کی ریڈنگ ضرور کراتے۔ ڈرامے کی کاسٹ ان کے گرد سکرپٹ ہاتھ میں لیے ریہرسل کرتی۔ وہ لب و لہجہ اور تلفظ ٹھیک کراتے۔ خود پڑھ کر سمجھاتے کہ Stress اور Pause کیا معنی رکھتے ہیں۔ جس طرح مکالموں کی ادائیگی میں وقف کی اہمیت ہے۔ کس مقام پر کتنی وقفہ کرنا اہم ہے، ایسے ہی خاں صاحب اپنی کاسٹ کوڑکنے، تیز بولنے اور آواز گرا کر یا بلند کرنے کے مقامات سمجھاتے۔ یہ ریڈنگ ایکٹروں میں لگانگت اور مفاہمت کی ایسی فضا قائم کر دیتی کہ مسابقت کی جگہ پر معاونت سے کام ہولت سے جاتا۔

پھر میں نے خاں صاحب کی نقل میں کھیل لکھنے شروع کر دیے۔ میرا ڈرامے سے لگاؤ اس وقت سے تھا جب میں انارکلی ڈرامہ مشکل سے پڑھ سکتی تھی۔ اس ڈرامے سے میرا قلبی لگاؤ 60۔ فیروز پور روڈ پر زندہ تعبیر بن چکا تھا۔ اب اتنا بڑا چانس ملا تو میں نے ٹی وی اور ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھنا شروع کیے۔ ”دھوپ جلی“ اور ”خانہ بدوش“ لکھ کر مجھے کئی گیلانی، عابد علی اور حبیب کی شعبدہ بازی دیکھنے کا علم ہوا۔ تب ایکٹریاں نہیں بدلتے تھے۔ اپنے اندر ایک نئے کردار کو سمجھ کر اس کی طرح سوچنے، عمل کرنے اور اٹھنے بیٹھنے پر ترجیح دیتے تھے۔

میرے ڈرامے ”زرد گلاب“ میں روجی بانو اور عابد علی کے کام کو ابھی بھی لوگ سراہتے ہیں۔ ”رات گئے کسے فردوس جمال نے جو معرکہ سر کیا اسے لوگ نہیں بھولے۔ اس کے علاوہ قوی خاں، بندیا، راحت کاظمی، ثروت عتیق، قاسم

میں، ساحرہ کاظمی، طلعت حسین، سکندر شاہین ایک پوری کھیپ ایکٹروں کی ایسی ہے جس کے ناموں سے بھی آج کی پودت ختم نہیں۔

خاں صاحب نے تو ٹیلی ویژن کے لیے اتنے فنکاروں کو روشناس کیا اور خود ان کے ٹیلنٹ سے متاثر ہوئے کہ اس کتاب میں ان سب کا محاسبہ کرنا ناممکن ہے۔ اس کے لیے تو کسی ایسے ٹی وی کے نامہ نگار کو زحمت کرنا پڑے گی جو ٹیلی ویژن کی تاریخ مرتب کر رہا ہو۔ یہاں تو ”ایک محبت سو ڈرامے“ ”تو تانہ کہانی“ ”اور ڈرامے“ ”من چلے کا سودا“ کو بھی جائزہ نظر سے دکھایا نہیں جاسکتا۔ آخر برسوں کا سفر چند صفحات میں کیونکر قید کیا جاسکتا ہے۔

حنابا برعلی

داستان سرانے کے کالے پھانک پر ان دنوں نہ رات کو تالا لگتا تھا نہ دن ہی کو کبھی اسے مقفل کیا جاتا۔ لوگ بے روک ٹوک اندر چلے آتے اور ہم دونوں اپنی نویافت شخصی شننی کے تحت انہیں بڑی خندہ پیشانی سے ملتے۔ اس وہم کا یہ ہم تھا کہ ہم اپنے اندر بھی اسی طرح کے گھیرے میں تھے کہ ہم کس قدر نیک، اچھے اور مددگار قسم کے بندے ہیں۔

ایک دن ہمارے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ میں اس وقت جھاڑن ہاتھ میں لے کر صوفے جھاڑنے میں مصروف تھی۔ ایک لڑکی داخل ہوئی۔ اس نے بھڑکتے سرخ رنگ کی پینٹ اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ نہ سر پر سکارف تھا نہ گلے میں دوپٹہ۔ ایسی شعلہ رو لڑکیاں تب شاذ ہی ملتی تھیں۔ میں نے اسے صوفے پر بٹھایا اور آنے کی وجہ تسمیہ پوچھی۔

حنابا برعلی نے کہا: ”Ann Arbor میں پڑھتی ہوں۔“

”وہ کہاں ہے بھئی؟“

”امریکہ کی ایک ریاست Seattle ہے۔ اس میں یہ کالج ہے۔ آپ کو شاید علم نہ ہو لیکن اس کالج میں Co-education نہیں ہے۔“

”اور تم کیا پڑھ رہی ہو؟“

”میں انگریزی میں ایم اے کر رہی ہوں۔“

اس نے میرے سامنے دھڑے میز پر ایک کہانی رکھ دی۔ اس کہانی کا نام The Heed Seekers تھا۔

”یہ میرے Thesis کا حصہ ہے۔ میں نے آپ کی کہانی ”توجہ کی طالب“ پڑھی۔ اس کا ترجمہ کیا۔ میرے پروفائزر نے اسے approve کر دیا ہے لیکن جب تک آپ تصدیق نہ کریں گی، یہ آگے بھیجی نہیں جاسکتی۔“

گرمیوں کے دن، جولائی کا مہینہ، یہ اس رابطے کا آغاز تھا جو سیدھی لائن بن کر ہمیں یہاں تک لے آیا ہے۔

اس پینٹ شرٹ میں ملبوس لڑکی میں عجب قسم کی انکساری اور عاجزی تھی۔ وہ جب اس کا جی چاہتا منہ اٹھا کر میرے پاس آ جاتی۔ تب مجھے اس کی فیملی بیک گراؤنڈ کا کچھ علم نہ تھا۔ نہ چھان بین ہی کی عادت میں مبتلا تھی۔ میں نے اس سے کبھی نہ پوچھا کہ وہ کس علاقے میں رہتی ہے۔ اس کا حسب نسب کیا ہے اور اسے مجھ میں ایسا کیا نظر آیا کہ وہ گھر کا فرد ہی بن گئی۔

حنابا برعلی میں ایک خوبی اور بھی انکساری کے علاوہ تھی۔ وہ بہت Helpful تھی۔ کبھی صوفی پر چڑھ کر یوں بیٹھتی کہ اس کی دیکھ بھال اور خدمت کا بوجھ میزبان پر پڑ جائے۔ میں جو کچھ کر رہی ہوتی وہ فوراً یہ کام میرے ہاتھوں سے لے لیتی۔ آپ کون کر تعجب ہوگا کہ ایک روز میں فرش پر ناکی پھیر رہی تھی۔ اس نے فوراً گیلی ٹاکی میرے ہاتھ سے پکڑ لی اور فرش کو آئینہ کر دیا۔

پھر وہ صبح آنے لگی۔ انیس اس وقت یونیورسٹی میں ایم بی اے کر رہا تھا۔ میں اس کا ناشتہ بنانے میں مشغول کرتی۔ حنا کے آنے پر وہ فوراً انڈے میرے ہاتھ سے لیتی اور ایسا آملیٹ تیار کرتی کہ ہم سب حیران رہ جاتے۔ پھر بسا اوقات وہ دوپہر کے وقت جیونی بہن کو اچھی اچھی ترکیبوں سے نئے نئے کھانے پکا کر دکھاتی اور سب اس طرح وہ کھانے کھاتے گویا کسی ریستوران میں بیٹھے ہوں۔ آج تک اس کے گھر سے پکے ہوئے وہی تھے بگھارے بیٹنگن اور ان گت سوغا تیں آتی رہتی ہیں۔ میں انہیں کبھی نقل کرنے کی کوشش نہیں کرتی کیونکہ مجھے علم ہے اس کا نلکہ جاری ہے، کبھی نوڈ شیڈنگ نہیں ہوگی۔

کہانی سے میں تو مطمئن تھی لیکن وہ کبھی ترچھے سے مطمئن نہ ہوئی۔ اسی سلسلے میں اس نے یہ ترجمہ ایتق لکھا دکھایا۔ منظور قادر پھر باقاعدگی سے افسانہ دیکھنے آتے رہے۔ وہ چونکہ سکالر آدمی تھے، اس لیے انہوں نے کئی جگہ سے ترجمے کو اکھاڑ پچھاڑ دیا۔ دوستی کے ان مراحل سے گزرتے بالآخر مجھے علم ہوا کہ حنابا برعلی، سید با برعلی کی بیٹی ہے۔ بہت مدت بعد نیکیجر کی فیکٹری کا بیرونی حصہ اورس کے سامنے لگے ہوئے ان گت ٹرک دیکھے جن پر *Castle Rose* اور *Petal* اور پیکیجز کی دیگر مصنوعات مارکیٹ کرنے کے لیے بھیجی جاتی ہیں۔ اندر جانے کا اتفاق مجھے صرف ایک بار ہوا جب خاں صاحب اور میں با برعلی صاحب کے پاس انیس خاں کی نوکری کے سلسلے میں گئے۔

حناسے بہت پہلے مجھ سے منوبگیم اور واجدل چکے تھے۔ منو کا اصل نام ساڑھ تھا لیکن مجھے اس پیاری سی منو کا اصلی نام معلوم کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ پتہ نہیں واجد کب اور کہاں ملے لیکن رفتہ رفتہ وہ باقاعدگی سے ہمارے گھر آنے لگے۔

منوعوماً اس کالے گوتھڑے پر بیٹھ جاتی جو اوپر خاں صاحب کی لائبریری کی طرف جاتا تھا۔ واجد خاں صاحب کے ساتھ عموماً باورچی خانے میں بیٹھتا۔ یہ باورچی خانہ نہ جانے کیوں ہمیشہ ہمارے ڈرائنگ روم کا رول ادا کرتا رہا۔ ایک روز وہ اپنے ساتھ ایک لوسے کی کڑا ہی مرخی اور کچھ مسالے لے کر آ گیا اور کہنے لگا کہ آج میں آپ کے لیے کڑا ہی پکاؤں گا۔ برگر اور پیزا (Pizza) تو دور کی بات ہے ابھی کڑا ہی، تکے اور توے کی نکلیاں چانپیں بھی تھکے کلاس میں عام نہ ہوئی تھیں۔ اب کڑا ہی تیار ہوئی۔ نان منگوائے گئے۔ ضیافت کا سماں بن گیا۔

بہت بعد میں جب حنابا برعلی مستقل طور پر ہمارے گھر آنے جانے لگی تو مجھے پتہ چلا کہ منوبگیم اور واجد اصل حنا سے دراصل حنا کے رشتہ دار ہیں اور وہ بھی بہت قریبی یعنی سید با برعلی کے بھائی کی اولاد۔

حناسے ملنے ملانے کے سلسلے میں میری ملاقاتیں پروین با برعلی سے ہونے لگیں۔ حنا کی والدہ پروین نے مجھے اپنے حسن سے اپنی فراخی اور وسعت قلب سے ہمیشہ disarm کیا۔ وہ بغیر کسی جھجک یا حجاب کے مجھے اپنا ازلی دوست

کھئے گئیں۔ پرائیویٹ خطوط، واقعات، دوستوں کی باتیں، رشتہ داروں کا زانچہ ان ہی سے پتہ چلا۔

حنا کے دادا امرا تب علی شاہ تھے جو ایک بڑے ہی سیلف میڈ آدمی تھے۔ انہوں نے سائیکلوں سے اپنا سفر شروع کر کے پیکجز کی بنیاد رکھی تھی۔ ان ہی کی رواداری اور عاجزی کے جرثومے (Genes) ابھی تک خاندان میں چلے آ رہے ہیں۔ شالیمار ہسپتال جو غریب لوگوں کا مفت علاج کرتا ہے اور با بر علی ٹرسٹ جو نادار لوگوں کی دادرسی میں ثانی نہیں، اس کا ہاکی یا دزدہ کرتے ہیں جو جاتے وقت اپنی وراثت میں انہیں شامل کر گئے لیکن میں نے کبھی حنا کے لبوں سے نہ تو دادا کا ذکر سنا نہ ان مخیر اداروں ہی کا۔ وہ تو عجب طور پر ادب سے وابستہ تھی اور ادیبوں کی پوجا میں مصروف رہتی تھی۔

مجھ سے بھی زیادہ اس کی وابستگی فیض صاحب سے رہی۔ فیض صاحب نے تو بڑی جانکاری سے فیض صاحب کے فیض کو اپنی ذات میں چار چاند لگانے کے لیے استعمال کر لیا لیکن حنا قدرے احمق ہے۔ اس نے میرے سوائے شاید اس حلق خاطر کا ذکر نہ کیا جو اسے فیض صاحب سے تھا۔

وہ جب امریکہ میں رہتی تھی۔ فیض کچھ دیر کے لیے اس کے پاس ٹھہرے تھے۔ وہ زبانی اسے اپنی نظمیں پڑھاتے۔ اس کے پکائے ہوئے کھانے نوش جاں فرماتے۔ اس کی اردو کی نظمیں سنتے۔ غرض یہ کہ یہ تعلق ایک عرصہ تک قائم رہا لیکن حنا اس تعلق سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکی۔

چلتے چلاتے اور ہوتے ہواتے وہ وقت آ گیا جب پروین کو بیٹی کی گھر بسائی کی فکر صبح و شام ستانے لگی۔ حنا ہر معاملے میں سعادت مند تھی، لیکن شادی کے معاملے میں وہ الف ہو جاتی اور کسی رشتے پر رضامند نہ ہوتی۔ پروین اسے بیویوں میں بلکہ بہت قریبی رشتہ داروں میں بیاہنا چاہتی تھی۔ حنا مغربی تعلیم کے زیر اثر ان باتوں کو فرومی اور غیر ضروری سمجھتی تھی۔ بیٹی کو منانے کا مرحلہ کافی سنجیدہ شکل اختیار کر چکا تھا۔ ایک روز پروین با بر علی بھگم بھاگ میرے پاس آئیں۔

”بانو آپا۔ میرے ساتھ گھر چلیے۔“

”کیا معنی؟ کیوں؟“

”بس جی Now or never۔“

میں نے پروین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تشنی آمیز لہجے میں پوچھا۔ ”لیکن ہوا کیا ہے؟“

”آج مجھے فیصل امام کا رشتہ آیا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ، شائستہ اور بہت محنتی آدمی ہے۔ پہلے تو حنا انکار کرتی رہی۔ پھر

بتول لے کر کمرے میں چلی گئی۔ میں کھٹکھٹاتی رہی اور ادھر سے کوئی جواب نہیں آتا؟“

”تم کیا چاہتی ہو؟“

”اس سے اچھا نہیں سکتا بانو آپا..... لیکن..... وہ کسی لمحے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھ سکتی ہے۔ ابھی چلیں ابھی۔“

ہم دونوں اسی وقت تیز رفتار گاڑی میں گھر پہنچے۔

میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی جواب نہ آیا۔

میں ذرا سی خوفزدہ ہو گئی۔ ”حنا! میری بات سنو۔ دروازہ مت کھولنا لیکن بات سن لو۔“

مجھے لگا جیسے وہ دروازے کے پاس لگی متوجہ ہے۔

”سنو تم میرے گھرات دن دو پہر جب بھی آتی ہو میرے دروازے تم پر کبھی بند نہیں ہوئے۔ میں نے سنا تمہیں اپنی ادبی اولاد سمجھا ہے۔ اگر آج تم نے میرے لیے دروازہ نہ کھولا تو شاید داستان سرائے کے دروازے تم پر بند نہ جائیں ہمیشہ کے لیے۔“

میں نے پروین کو اشارہ کیا کہ وہ غائب ہو جائیں۔

”آپ کے ساتھ کون ہے؟“

”کوئی نہیں، دروازہ کھولو پلیز۔“

چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ حنا نے دائیں بائیں جھانکا اور پھر مجھے اندر بلا کر دروازہ مقفل کیا۔ پستول لکھنے والی میز پر پڑی تھی۔

”مجھے کہیں بٹھاؤ گی کہ کھڑے رہنے کا حکم ہے۔“

اس نے جلدی سے ڈیسک کی کرسی باہر نکال دی۔ اب میرے تخیل کا ٹیسٹ تھا۔

”مجھے بتاؤ، کیا تم کس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟“

”کوئی خاص چوائس تو نہیں لیکن میں اپنی ماں کی بات ماننا نہیں چاہتی۔“

”یعنی تمہیں فیصل پر اعتراض نہیں۔ اپنی ماں کے انگوٹھے پر غصہ ہے جو تمہیں دہرا رہا ہے۔“

”میری ماں ایسی ہی ہے بانو آپ۔“

”سنو حنا! میں نے آج تک تم سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ تم مجھے اپنی Foster Mother بھی کہتی ہو۔“

ایک فیصلہ میری فرمائش پر کر سکتی ہو؟“

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر اشارات میں بلایا۔

”تم فیصل سے شادی کر لو۔ وہ تعلیم یافتہ، شریف الطبع، اچھے کردار کا مالک ہے۔ اگر کہیں باہر شادی کرنا ہو تو

بالکل اجنبی لوگوں سے رابطہ کرنا ہوگا۔ شاید وہ تمہاری سگریوں کا پوجہ بھی برداشت نہ کر سکیں۔ میری خاطر حنا.....

لیے یہ سہرا میرے سر باندھ دو..... کچھ تو میں پروین کو کبھی تخیل میں دے سکوں!“

حنا کی شادی بخیر و عافیت فیصل الامم سے ہو گئی۔

فیصل نے شادی کے بعد خانہ نوال میں مبارک ڈیری کھولی اور مبارک دودھ کو مارکیٹ کرنے لگا۔ کچھ دیر کے

اس نے خانہ نوال کونوٹ میں پڑھانے کی کوشش کی۔ حنا خانہ نوال چلی گئی اور بڑے سادہ سے گھر میں نہایت معمولی فرنیچر کے

ساتھ متاہل زندگی شروع کی۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ ان دو کمروں کے گھر میں اس کے پاس صوفے تک نہ تھے۔

نے خالی کھوکھے بچھا کر ان کو تکیوں سے سجایا اور کوئی پروانہ کی۔

لیکن فیصل بنیادی طور پر زمینوں اور سیاست سے وابستہ تھا۔ اس کا دل بزنس کی دلدل میں کبھی نہ پھنسے

دونوں لاہور آ گئے۔ فیصل امام نے کچھ عرصہ اپنے سر کے کالج Lums میں بھی پڑھانے کی کوشش کی لیکن دل سیاست

میں اٹکارا۔ پروین نے حنا کو ایک بہت خوبصورت عالیشان بنگلہ بناوا دیا۔ فیصل نے لاہور کی بے جان گہما گہمی کا حصہ بننے

شش کی لیکن بے سود۔

وہ اپنے گاؤں میں لوٹ گیا جہاں اس کے پیارے مزارعے، مرانی، مٹھی چا پی کرنے والے ماشیے، کسے تندوروں پر روٹیاں پکانے والیاں، اندر باہر آنے جانے والوں کا ایک میلہ تھا۔ وہ ایک طرح سے حنا کا رنگ ہنر بنڈ بن گیا۔ آیا چند دن رہا اور پھر واپس جہانیاں۔ دونوں نے اس وضع کی شادی سے برضا و رغبت کھوتہ کر لیا۔

یوں سمجھیے کہ ہر خوبی مکمل طور پر خوبی نہیں ہوتی۔ اس میں کہیں نہ کہیں سے خرابی ضرور آتی ہے اور ہر خرابی میں یہ مف ضرور ہوتا ہے کہ کہیں اسی کے اندر سے فلاح اور بہتری کے لیے راستہ جاتا ہے۔ حنا نے جیکبڑ میں نوکری کر لی۔ اب صرف رہنے لگی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے نظمیں لکھنے کا وقت بھی زیادہ ملنے لگا۔

فیصل امام کے بڑے بھائی فخر امام اور عابدہ حسین بڑے فعال سیاستدان ہیں اور عابدہ جسے گھر والے ”چندی“ کہتے ہیں، نہ صرف چاند صورت ہے لیکن حنا کی طرح کچھ اندر سے بھولی بھولی اور دوسروں پر بھروسہ کرنے والی ہے۔ میں سے دو چار مرتبہ ملی ہوں اور مجھے تعجب رہا ہے کہ سیاست تو ترقی پذیر ممالک میں خزانٹ لوگوں کا پر فیشن ہے، پھر عابدہ یہاں کہاں؟

فخر امام اور عابدہ کی انتہائی کوشش رہی ہے کہ فیصل ہمہ وقت سیاستدان بن جائے لیکن وہ ابھی زمینوں اور سیاست میں بنا ہوا ہے لیکن حنا کو عجیب طرح سے سکون کا خزانہ مل گیا ہے۔

انسان کو غم تنہائی بہت کچھ عطا کرتا ہے۔ کچھ لوگ اس غم کو اپنے لیے سونا بنا لیتے ہیں۔ کچھ اس آشوب آگہی کو دیوب کے حوالے کر کے وقت کو رائیگاں گزار دیتے ہیں۔ حنا ہولے ہولے اس طرف لو لگانے میں مصروف ہو گئی ہے جو سب کو سکون اور اطمینان دیتا ہے۔ ذکر فکر کی دولت سے مالا مال ہو کر اس کی سوچ یکسر بدل گئی۔ پہلے چہرے پر ملال کے نشانات تھے، ہولے ہولے ان کی جگہ عجب قسم کی روحانی طراوت نظر آنے لگی۔ نظموں کا رخ بھی یکسر بدل گیا۔ اسے نہ پڑھنے والوں کی اکثریت ڈرا سکتی تھی نہ اس بات کی پرواہی تھی کہ پڑھنے والا اس کی نظموں کو پڑھ کر دل سے لگاتا ہے کہ حق میں سچ دیتا ہے۔

اس کے میل جول میں بھی فرق آنے لگا۔ وہ بیکن ہاؤس کی ایسے انجم سے رابطہ بڑھانے لگی جو مغرب میں جا کر تھوڑے روزوں میں اللہ کی تعلیمات کے سمپوزیم کر رہی تھی۔ یہاں بھی جب وہ ہوتی تو گپ شپ اور نصیحت سے پرہیز کرتی اور نہ کی بندی بن کر زندگی بسر کرتی۔

اب یہاں پہنچ کر ایک اور فیصلہ حنا کو کرنا پڑا۔ اس نے پبلشرز کے پیچھے بھاگنا، ان کی تجویز میں ماننا یکدم ختم کر دیا اور اپنی کتابیں چھپانے کا عزم کر لیا۔ اب پبلیکیز سے اس کی کتابیں چھپ کر منظر عام پر آ رہی ہیں۔ وہ اپنا اردو کلام بھی پڑھنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کی ان نظموں پر اسلم کوسری نظر ثانی کر چکے ہیں اور مجھے امید ہے کہ اردو قاری ان نظموں کو پسند کریں گے۔

محترمہ نصرت بی بی

خاں صاحب کے عقیدت مندوں میں محمد یحییٰ خاں کے بعد نصرت بی بی کا نمبر آتا ہے۔

کچھ لوگ ہمت اور وقار کے ساتھ زندگی سے نبرد آزما ہونے کا طریقہ سلیقہ جانتے ہیں۔ وہ زندگی میں کبھی ہار نہیں مانتے۔ ایسا ہی گھر انہ نصرت بی بی کا ہے لیکن شروع میں میرا یہ خیال نہ تھا۔ ان دنوں میں اس گھرانے سے واقف نہ تھی۔

ایک درمیانی عمر کی خاتون سر پر سفید دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے ڈرائنگ روم میں بیٹھی نظر آتی۔ وہ پیر خانے کے آداب سے بخوبی واقف تھی۔ خاں صاحب کو دل سے اس نے بابا جی سمجھ لیا تھا۔ خاں صاحب ہمیشہ صوفی پر ہوتے تھے نصرت فرسٹ پر ان کے قدموں میں ڈھیر سی ہوئی لگتی۔ کبھی خاں صاحب کے پاؤں دبا رہی ہوتی۔ کبھی ہاتھ چومتی نظر آتی۔ کبھی آنکھوں سے ان ہاتھوں کو مس کرتی۔ مجھے یہ منظر کبھی سکھ نہ پہنچا سکا۔ میرا خیال تھا کہ خاں صاحب یوں اپنی آرزوی تکمیل کر شرک اور تکبر کے مرتکب ہوتے ہیں اور پوجا کرنے والے کی انا کو مجروح کرتے ہیں۔ تب مجھے نہ استاد کے مقام کا کھمبہ تھا جو آپ کو جہالت سے نکالتا ہے نہ ڈیروں کی تربیت ہی کی خبر تھی۔

شاید خاں صاحب سمجھتے تھے کہ تصوف محض اللہ کے حضور عاجزی اور انکساری کا درس سکھانے کا مکتب ہے۔ لوگ مرشد کے حضور اپنا آپ عاجزی اور انکساری سے پیش کر کے ماننے والوں میں داخل ہو جاتے ہیں ان کے سامنے اپنے انا وجود پیش کرنے میں دقت محسوس نہیں ہوتی اور اس طرح وہ شرک اور تکبر جیسے ناقابل معافی گناہوں سے محفوظ رہ جاتے ہیں۔

انسان فرد کے طور پر آزادی کا خواہاں ہے لیکن گروہی اعتبار سے نقل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گروہ کی تشکیل ہی اسے طور پر ہوتی ہے کہ لوگ معاشرے میں رہ کر وہی رنگ پکڑتے ہیں جو وہ دوسروں میں دیکھتے ہیں۔ ڈیروں کی تعلیم ہی اسے اہم ہے کہ یہاں ماننے والوں کی خصوصی تربیت کی جاتی ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد مجھے علم ہوا کہ دید اور شنید میں بڑا نقص تھا۔ نصرت عقیدت کے جس مقام پر تھی، وہاں کوئی مسئلہ نہ تھا۔ نصرت بیگم اپنے خاندان کی بھلائی چاہتی تھی اور اسی لیے وہ دعا کے سلسلے میں محتاج تھی۔

کچھ عرصہ بعد جب نصرت بی بی ریٹائرڈ ہوئیں تو خاں صاحب نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس رقم سے گھر خریدیں اور بچوں کو اس پیسے کا علم نہ ہونے دیں کیونکہ بچے اپنی ضرورتوں کا اتنا جال پھیلا دیتے ہیں کہ والدین مجبور ہو جاتے ہیں۔ نصرت کے شوہر نے غالباً ساری عمر کچھ اس کی خاطر خواہ کفالت نہ کی تھی۔ وہ اس سلسلے میں مطمئن نہ تھی۔ اس لیے جب ریٹائر ہوئیں تو انہوں نے بڑی عقلمندی سے خاں صاحب کے مشورے کے مطابق ایک گھر خرید لیا جس میں اپنے بچے بھی بسالیے۔ بی بی نصرت کے سارے بچے ذہین اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایسے گھرانے میں جہاں ذہانت کی خصوصیت ہے اچھا کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا بڑا اہم ہوتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہ چودہ پندرہ لاکھ روپیہ ان ہی اللوں تلموں میں ازبیت لے کر نصرت بی بی کو خاں صاحب کے مشورے پر چل کر اچھا راستہ مل گیا اور وہ گھونسلے میں اپنے چنگی پوٹوں کے ساتھ

سٹار کر گئی۔

ہولے ہولے نصرت بیگم کے بچے بھی گھر آنے لگے۔ سب سے بڑی بیٹی رابعہ بے حد ذہین اور شدھ آرٹسٹ تھی۔ وہ N.C.A. میں پڑھ بھی رہی تھی اور پارٹ ٹائم کچھ ٹیچنگ بھی کر رہی تھی۔ جب اشیر خاں نے اپنی ایجنسی Advertising بونا سیرا شروع کی تو اس کے سارے سیٹ رابعہ ہی کے ڈیزائن کیے ہوئے تھے اور دیکھنے والے اس کی اور فن کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ اس کی شہرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے خاں صاحب کے دعائیہ سلوگن ”اللہ یہ کو آسانیاں عطا کرے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے“ اس دعا کی اسے بہت خوبصورت تصویر بنا کر پانچ ڈی جود یو ایس کے پوسٹ پر تھی۔

رابعہ کا شوہر انجینئر تھا اور خانیوال میں رہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ رابعہ خانیوال میں اپنے سرال میں رہے۔ یہ جانتی تھی کہ لاہور میں اس کو ترقی کے مقامات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اشرف نے زیادہ اصرار نہ کیا اور رابعہ کو نصرت بی بی کی طرحی لین میں مکان خرید دیا۔ اب رابعہ ہفتہ یا اتوار ملتان چلی جاتی۔ اب رابعہ لندن میں پی ایچ ڈی کرنے کا سوچ رہی ہے۔ اللہ بہتر کرے۔ اس کی تصویر اب بھی دیوار کی ڈیزائن ہے۔ سامنے بیٹھنے والا تو چلا گیا لیکن تصویر ان کی یاد دلاتی ہے۔

نصرت بی بی کی منجھلی بیٹی عائشہ سے جب میں ملی، اس کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ اس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا اس کا شوہر ٹھیک ٹھاک حیدرآباد میں رہتا تھا اور اس کی خواہش بھی تھی کہ عائشہ حیدرآباد چل کر بے لیکن ترقی کرنے میں اپنی آزادی کی جو چنگاری سلگتی ہے وہ اسے پابندیوں میں رہنے کا راستہ نہیں دکھاتی۔ بہت منت سماجت کر کے حیدرآباد بھیجا لیکن کچھ عرصہ بعد وہ اپنے میاں سمیت لاہور آگئی اور ماں کے ساتھ رہنے لگی لیکن اس کے میاں کو کچھ سنی کے مسائل تھے۔ وہ پھر حیدرآباد چلا گیا اور عائشہ واپس میاں کے پاس رہنے لگی۔

خیر گاڑی چلتی ہی رہتی ہے۔ اونچ نیچ زندگی کے رنگ ہیں۔ اپنی اپنی عقل، فیصلے اور تجویز کے مطابق ہر انسان کے حل تلاش کرتا ہے اور اسی لیے زندگی کی رنگارنگی میں فرق آتا ہے۔ اللہ کا ارتقائی نظام چلتا رہتا ہے۔

تیسری بیٹی سائرہ مظلوم ہے لیکن مظلوم ہوتے ہوئے بھی وہ ہار ماننے والی نہیں۔ پہلے تو سائرہ نے اپنے آپ کو بچوں کے لیے وقف کر دیا لیکن اس کے لیے اس قدر ایثار بوجھ بننے لگا۔ آخر اسے اپنے مستقبل کے لیے بھی کچھ دینا پڑا۔ سائرہ تھوڑی سی موٹی ہے اور اسی موٹاپے کو کم کرنے کے لیے وہ اچھڑے سے ماڈل ٹاؤن آتی ہے اور وہاں سے تھمیرے پاس آ جاتی ہے۔ اس کی شادی ابھی سے بڑا مسئلہ ہے۔ وہ بھی دعا برکت کے لیے یہاں آتی رہتی ہے۔ اسے دینا کہ تیر بہدف دعائیں کرنے والا تو کبھی کا رخصت ہو گیا۔

نصرت کے دو بیٹے لندن میں ہیں اور دونوں چھوٹے بھی لندن اڑ جانے کے لیے ”بھرن بھسن“ بیٹھے ہیں۔ سب سے ان کی زندگی دیکھ کر ضرور حاصل ہوتا ہے کہ زندگی سے ہارتا وہی ہے جو اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ وہی حیات جاتے ہیں، جو خود اعتمادی اور خوشی سے چلتے ہی چلے جاتے ہیں۔ واہ نصرت بی بی واہ!

چہاردرویش

داستان سرائے کے لان میں اُگے ہوئے سندری کے درخت پر بھانت بھانت کے پرندے آ کر بیٹھتے۔ کبھی گھونسلے بناتے اور اپنی اپنی مقررہ رُت میں چلے جاتے۔ گو مفتی جی مجھ سے ہمیشہ ناراض ہوتے تھے کہ تم اشفاق چھتھنا درخت کہہ کر اس کو بہت زیادہ مان دیتی ہو لیکن یقین جانے کہ وہ واقعی ایک ایسا شاخوں بھرادرخت تھے جن پر لوگ آ کر بیٹھتے، اپنے اپنے حصے کی برکتوں کا چوگا کھاتے اور اڑ جاتے۔ کبھی کبھی ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہوتی۔ پھر کبھی کبھی والے باہم دوست بن جاتے اور آج ان کے جانے کے بعد بھی ان کا دوستانہ نہیں ٹوٹا۔

مجھے معلوم نہیں کہ چہاردرویش علیحدہ علیحدہ اشفاق صاحب سے ملنے آیا کرتے تھے کہ پہلے سے ان کا دوست تھا۔ میں اس طرح کی کنسولیاں لینے کی عادی نہ تھی۔ گھر کے مددگار لوگوں سے پتہ چلتا کہ چارو نوجوان خاں صاحب نے پاس اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔

ایک روز خاں صاحب اندر آئے کہنے لگے۔ ”قدسیہ! اندر کھانا نہ بھجوانا۔ میں درویشوں کے ساتھ رہتا ہوں۔“

میں نے سوچا لمبی لمبی سفید داڑھیوں والے سروں پر ہیر ٹوپیاں پھنسائے، ٹخنوں سے اونچے چوٹے پہنے ہوئے گے۔ ایک مدت تک میں اسی مغالطے میں رہی، لیکن ان کا عمل بابوں جیسا ہی تھا لیکن حلیہ یہ نہ تھا۔

وہ چاروں جب بھی آتے خاں صاحب کو ساتھ لے کر باہر کسی طعام گاہ میں چلے جاتے۔ سردار کی اندرون شہر کے کباب کھنے، نسبت روڈ کی ٹکانک چائیں اور کھیر، حلوے، دہی بھلے ان کے علاوہ..... تب ابھی نوڈل کھانے کا رواج نہ ہوا تھا اور نہ میرا خیال ہے یہ لوگ اسے باقاعدگی سے نوازتے۔

یہ چاروں درویش تعلیم یافتہ تربیت شدہ مڈل کلاس کے لوگ تھے۔ ان کی جیبوں میں دولت نہ اچھلتی تھی۔ انہیں کھانے کھلانے کا شوق تھا اور غالباً وہ خاں صاحب کو مسکین جان کر ان کی ادائے عاجزی و انکساری کے پیش نظر کھانے باہر مدعو کرتے رہتے۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد جیسے ان کے بینک اکاؤنٹ مجھے اچانک ملے ویسے ہی یہ عقیدت کا شوق میسر آ گیا۔ چہاردرویش مجھ سے چھتھنا درخت کی باتیں کرتے۔ داستان سرائے کی خاموشی، اداسی اور بندہ نوازئی کا ذکر کرتے تو دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو جاتا۔

خاں صاحب کے وصال کے بعد میں ان سے پہلی بار ملی تو مجھے حیرت ہوئی نہ کسی کے لمبی داڑھی تھی نہ سر پہلی اور نہ لمبا چوٹہ ہی..... وہ چاروں پروفیسروں کی طرح پینٹ شرٹ پہنتے تھے اور بڑی شستہ زبان بولتے تھے۔ ان میں سے سردار قدوسی صاحب ہیں۔ میری ایک ہی شرط ہوا کرتی ہے کہ پہلے قدوسی صاحب قدم دھریں اور پھر ان کے درویش۔

میں ان کے ساتھ خاں صاحب کی طرح باہر تو نہیں جاسکتی لیکن وہ اپنی روایت قائم رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی

ایک، کبھی بسکٹ کبھی دوسری نعمتیں ان کے ہمراہ ہوتی ہیں۔ میں لاکھ منع کرتی ہوں کہ آپ خاں صاحب کے دھوکے میں مجھے آسمان پر نہ چڑھائیں لیکن وہ پتنگ اڑانے کے شوقین ہیں۔ اڑائے چلے جاتے ہیں۔ وہ پوجا کرنے والے لوگ ہیں۔ انہیں آرتی اتارنے کے لیے بت درکار ہے۔ مجھے ”ماں جی ماں جی“ کہہ کر مارتے رہتے ہیں۔ برآمدے میں جوتے اتار، دست بستہ میرے سامنے بیٹھتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ عارف دنیا سے لکی عقیدت ایک خیال خام ہے۔ حسن ظن بھی یہاں کچھ کام نہیں آتا!

ارشاد مسعود قدوسی

میں (ارشاد مسعود قدوسی) 25 اکتوبر 1959ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اور گریجویشن گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ بزنس ایڈمنسٹریشن میں داخلہ لیا اور 1983ء میں بی بی اے (مارکیٹنگ) کیا۔

فیصل آباد اور لاہور کی مختلف پرائیویٹ کمپنیوں میں ملازمت اختیار کی جو تا حال جاری ہے۔ اس دوران اپنے ملک پاکستان کے دوسرے شہروں پشاور، اسلام آباد، راولپنڈی، گجرات، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، ساہیوال، ملتان، بہاولپور، میر آباد اور کراچی میں رہنے کا موقع ملا اور ایک ایک سپورٹ مارکیٹنگ کے سلسلے میں بیرون ملک سنگاپور، کوریا، ہانگ کانگ اور چین کا سفر کرنے کا موقع بھی ملتا رہتا ہے۔ (اللہ کا کرم ہی ہے جس نے مجھے سو کی تعلیم حاصل کرنے اور سووی نظام جاننے سے بچائے رکھا۔)

شادی 1988ء میں ہوئی۔ اللہ کے کرم سے تین بیٹے (انس مسعود، معز مسعود، طہ مسعود) ہوئے۔ انس مسعود اے لیول کر رہا ہے۔ معز مسعود ایس ای کر رہا ہے اور طہ مسعود حفظ قرآن کے بعد ساتویں کلاس میں ہے۔ ایک اور کرم کہ اسی سال میری شریک حیات نے عالمہ کورس مکمل اور امتحان پاس کر لیا ہے۔

متوسط سے بھی کم درجے کے گھرانے سے پیدل لاہور آنے والے کے پاس اب اپنا گھر اور کار بھی ہے۔ اللہ نے اسی لاہور میں بابا اشفاق، ماں جی بانو قدسیہ اور بابا عرفان الحق ملائے تاکہ عاقبت بھی سنور جائے اور اس بیکراں ذات باری تعالیٰ کے کرم ہی کرم جاری ہیں اور میریاں موجاں ای موجاں۔

محمد عامر (ڈاکٹر)

میں (محمد عامر) لاہور میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم فیصل آباد سے حاصل کی۔ والد مکرم ڈاکٹر محمد ریاض حسین زرعی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ جنوری 1976ء کو ہمراہ فیملی (والدہ چھوٹی ہمشیرہ اور بھائی) اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ روانہ ہوئے۔ میں بسلسلہ تعلیم میٹرک میں لاہور آ گیا۔ F.Sc. لاہور سے کی۔

گریجوییشن (B.Sc.) گورنمنٹ کالج فیصل آباد۔ ماسٹر (M.Sc.) زکریا یونیورسٹی ملتان سے کی۔ بعد ازاں ماسٹر ڈگری فیڈرل پبلک سروس کمیشن سے گریڈ 17 (Class One Officer) سے ملازمت کا آغاز کیا۔ تا حال دوران ملازمت لاہور، ملتان، اسلام آباد پوسٹنگ رہی۔ اس دوران کچھ عرصہ جاپان بھی قیام رہا، جہاں سے اعلیٰ تعلیمی سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔

2 دسمبر 1993ء لاہور میں شادی ہوئی۔ بیوی راحیلہ عامر مقامی ہسپتال میں ڈاکٹری (M.B.B.S.) کی ملازمت کرتی ہیں۔ ایک بیٹی انعام عائشہ Convent School میں ساتویں جماعت کی طالبہ ہے۔

ڈاکٹر جہانگیر تمیمی (پنجاب یونیورسٹی) نے بابا جی اشفاق صاحب کے پاس بھیجا۔ میری بے چینی کو سکون دے آ گیا۔ طبیعت ٹھہر گئی اور زندگی بسر کرنے کا ایک نیا رخ متعارف ہوا۔ میں بابا جی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھ جیسے بھٹکے ہوئے گنہگار اور ادنیٰ حیثیت والے کو اپنے پاس جگہ دی اور بے پناہ شفقت سے نوازا۔

”ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔“

”جس نے بندے کا شکر ادا نہیں کیا اس نے خدا کا شکر ادا نہیں کیا۔“

(اشفاقیات)

عاصم بخاری

نام: عاصم نذیر بخاری

تاریخ پیدائش: یکم مئی 1959ء

آبائی گاؤں: امیر پور سادات ضلع لودھراں

پیشہ: کاروبار

تعلیم: M.B.A.

شادی شدہ: تین بیٹے (سید غیور احمد۔ سید فرقان احمد۔ سید سرد احمد) ایک بیٹی (سیدہ فاطمہ زہرا)

بڑا بیٹا NUST میں انجینئرنگ کر رہا ہے۔ ایک F.Sc. میں ہے اور دوسرا میٹرک میں۔ بیٹی تیسری کلاس میں

ہے۔

بابا کے ساتھ تعلق بہت ہی پرانا۔ سب سے پہلے میں نے انہیں جب میں شاید میٹرک کر رہا تھا، دیکھا اور انہوں نے جواب دیا جو کہ آج تک محفوظ ہے اور پھر یہ تعلق آخری وقت تک قائم رہا اور آج تک یہ تعلق قائم ہے۔ زندگی کے سفر میں تمام تر مطلوب رہنمائی، آج بھی اسی طرح میسر ہے جس طرح ان کی حیات میسر تھی۔

پروفیسر محمد اعجاز چوہدری

میں نے 1989ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اکنامکس سے ماسٹر ڈگری حاصل کی اور اس وقت لاہور کے ایک کالج میں درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں اور اب پی ایچ ڈی اکنامکس کے سلسلہ میں تحقیقی مقالہ لکھنے میں مصروف ہوں۔

جون 2005ء میں ایک روحانی شخصیت کے حکم سے شادی کے بندھن میں بندھ گیا۔ عالیہ بھی ایک مقامی کالج میں اسلامیات کی ٹیچر ہیں۔ نومبر 2006ء میں اللہ کے فضل سے ایک بیٹا عطا ہوا جس کا نام محمد علی ہے۔

بچپن ہی سے مجھے روحانی شخصیات کا قرب حاصل رہا۔ یہی طبعی رجحان اشفاق صاحب تک لے آیا۔ ان کی محفلوں میں زیر تربیت رہا جس کے سحر سے اب نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ خاں صاحب کی تربیت، محبت، شفقت ان کی کسی بھی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتی۔

میں نے خاں صاحب کو ”زاویہ“ میں جس زاویہ سے دیکھا وہ مجھے ادبی شخصیت سے زیادہ روحانی طور پر قد آور نظر آئے۔ قاری ان کو ادب میں تلاش کرتا ہے اور میں انہیں روحانیت کے مراتب طے کرتے دیکھتا ہوں۔ دین کو سہل انداز میں پیش کرتے اور عملی زندگیوں میں اس کو لاگو کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

خاں صاحب کی ہمہ جہت شخصیت، محبت، مساوات، ہمدردی، ایثار اور آسانی کا جو عملی درس دیتی ہے، اس کا احساس شدت سے پیدا ہوتا ہے کہ ایسی نابینہ روزگار شخصیت بظاہر تو ہم میں نہیں ہے مگر اس کی گفتگو ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔

خاں صاحب کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ ہر کوئی خواص ہوں یا عوام ان کو اپنا محسوس کرتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سب سے زیادہ پیارا سی سے کرتے ہیں جو ان کے سامنے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد مسعود قریشی

ریاض محمود کہتے ہیں کہ خاں صاحب جانتے تھے کہ انہیں جگر کا کینسر ہے، اسی لیے ڈاکٹر تاج نے جب فاطمہ میموریل ہسپتال میں ان کا آپریشن کیا تو کچھ کیے بغیر واپس نائکے لگا دیئے، لیکن خاں صاحب تشویش پھیلانے سے گریز کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی نہ بتایا کہ انہیں جگر کا کینسر ہے، جو ناقابل علاج ہے۔

لیکن ابھی جب آپریشن تک نوبت نہیں آئی تھی، وہ ہومیو پیتھک علاج کرتے تھے اور بڑے پُر امید، مثبت رویے کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان ہی دنوں میں ڈاکٹر صاحب اپنی جادو کی پڑیاں لے کر آیا کرتے۔ ان کا کالج علامہ اقبال روڈ کے قریب محمد نگر میں تھا اور خاں صاحب ان سے ملنے ان کے کالج جایا کرتے تھے۔

ایک بار ڈاکٹر مسعود کے کالج میں بڑے دھڑلے کانفرنس ہوا جس میں خاں صاحب نے صدارت کی اور مجھ پر اضافی مہربانی کے تحت مجھ سے ان طلباء کو ڈگریاں دلوائیں جو 2000ء میں چار سالہ کورس کے بعد پاس ہوئے تھے۔

اب 2007ء ہے۔ خاں صاحب رخصت ہو چکے ہیں، لیکن ڈاکٹر مسعود نے اس گھر کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان

کے پوتے ڈاکٹر حامد الیاس مسعود باقاعدگی سے میرا علاج کرتے ہیں۔ میں نے آزمایا ہے کہ جن پر اللہ مہربان ہوں۔
خلق کو بھی مکمل مہربانی کے روپ میں بھیج دیتا ہے۔
شاید آپ مجھ سے مختلف رائے رکھتے ہوں۔

ڈاکٹر طیب (سروسز ہسپتال)

ہر کام کا آغاز ہمیشہ خاں صاحب کرتے تھے اور پھر اپنے تجربے کو کسی Osmosis کے طریقہ سے مجھ تک منتقل
کر دیتے تھے۔ 2000ء کے آغاز میں خاں صاحب بار بار آنکھیں ملنے لگتے۔ کبھی عینک اتار کر ایک طرف دھردیتے
پڑھنا لکھنا موقوف کر دیتے۔ انہوں نے کبھی اپنی تکلیف کی تشہیر تو کی ہی نہیں تھی۔ ایک روز میں نے پوچھا۔
”کیوں خاں صاحب! آنکھ میں کچھ تکلیف ہے کیا؟“
”ہاں قدسیہ! بائیں آنکھ سے دھندلا دھندلا نظر آتا ہے۔“
”گھر بیٹھے بیٹھے کیسے پتہ چلے گا کہ آنکھ کو کیا ہے؟“
”ٹھیک ہو جائے گا۔“

”اتنی خوش فہمی بھی ٹھیک نہیں۔ کل آپ میرے ساتھ سروسز ہسپتال جا رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔
”او بھائی مس قوالی..... یہ تیرا کیا سٹم ہے۔ ادھر کا تا ادھر لے دوڑے۔“ وہ بولے۔
”بس جی میں تو ایسی ہی ہوں۔ خوشی Play خوشی Play“

دوسری صبح قریباً دس بجے ہم سروسز ہسپتال پہنچے۔ سکندر جیسا وفادار ڈرائیور ساتھ تھا۔ وہ انکو آڑی سے پوچھ کر
توپتہ چلا کہ آئی ڈی پیارٹمنٹ تیسری منزل پر ہے اور اس کے انچارج ڈاکٹر طیب ہیں۔
ہم دونوں تو تھمبو کر کے اوپر پہنچے۔ تیسری منزل پر ڈاکٹر طیب موجود تھے۔
صاحب رنگت، درمیانہ قد اور جسیم، دلنشین مسکراہٹ۔ خاں صاحب کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔
”زہے نصیب، زہے نصیب آئیے۔“
ان کا جونیئر ڈاکٹر ہمیں حیرانی سے دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب نے کسی جونیئر کو خاں صاحب کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا اور خود ٹیسٹ لیا۔

”خاں صاحب! بائیں آنکھ فوراً توجہ چاہتی ہے۔ اگر ذرا بھی غفلت کی گئی تو بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔“

”آپ کا کوئی کینک گلیبرگ میں بھی ہے؟“ خاں صاحب نے کہا۔

”ناں ناں اشفاق صاحب آپ نے وہاں نہیں آنا۔ وہاں کے ڈاکٹر طیب کمرشل ہیں۔ وہ ایس کچھ گڑبڑ کہتے

گے۔ یہیں ہسپتال میں آئیے۔ پھر سچی بات تو یہ ہے کہ سروسز کا Latest Equipment ہے۔ اس میں Risk کم ہے۔“

دوسرے دن ہم پھر ہسپتال گئے۔ اس آپریشن کے دوران انہیں بیٹا سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہا۔ آپریشن

کامیاب ہو گیا اور ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے انتہائی مشکور لوٹے۔ کچھ دن خاں صاحب نے کالی اندھیریاں آنکھوں پر تھائے رکھیں۔ پھر نئی عینک لگی۔ ان کی طبیعت کا پوچھنے ڈاکٹر صاحب گھر آتے رہے۔ لیکن ڈاکٹر طیب کی اصلی مروت خاں صاحب کے جانے کے بعد کھلی۔

آپ کو میں کئی بار بتا چکی ہوں کہ مجھے خاں صاحب کی نقل کی عادت تھی۔ جو کچھ وہ کرتے مجھ پر لازم ہو جاتا کہ میں بھی کروں۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد میری دونوں آنکھوں میں موتیا اتر آیا۔ میں نے دونوں بچوں کو نہ بتایا اور چوری چھری سرور ہسپتال پہنچی۔ وہی تیسری منزل پر تیسرا کمرہ۔ مجھے دیکھ کر ایک جونیئر ڈاکٹر نے میرا معائنہ کرنا چاہا لیکن اچانک کہیں سے ڈاکٹر طیب آ گئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے جونیئر ڈاکٹر کو منع کر دیا اور خود معائنہ کرنے مشین کے پیچھے گئے۔

”آپ کیا کیا جائے کہ آنکھیں تو دونوں خراب ہیں لیکن آپریشن باری باری ہوگا۔ لکھنے والے کی نظر کام نہ کرے یہ تو واقعی ظلم ہے لیکن یہی زندگی ہے۔ اس کی کوئی منطق نہیں نہ کسی کو اس کی کل ہی سمجھ میں آسکتی ہے۔ آپ بروقت پہنچ جائیے گا۔ میں جو کچھ کر سکوں گا ضرور کروں گا۔“

مقررہ وقت پر انیس اور اشیر میرے ساتھ گئے۔ سب کو سفید کوٹ پہنا دیئے گئے۔ ماسک لگائے گئے۔ مجھے مریض کے بستر پر لٹا دیا گیا اور ڈاکٹر طیب نے بڑی پریت سے کامیاب آپریشن کر دیا۔ کارنیا کالز بدل دیا گیا۔ مجھ پر دو اینیوں کے علاوہ کوئی بوجھ نہ تھا۔ ان کا خرچ بھی نہ جانے کس بیٹے نے دیا، مجھے علم نہیں۔

بس کیا کیا جائے۔ زندگی کے جھمیلوں نے مجھے فرصت نہ دی کہ میں دوسری آنکھ کا آپریشن کرواؤں۔ مجھے مجبور کرنے کے لیے دونوں بیٹوں نے ایک روز اصرار کیا کہ اب بہت دیر ہوگئی۔ آپ پلیز بہت کر کے دوسری آنکھ کا آپریشن کروالیں۔ ہو سکتا ہے تاخیر سے کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے۔ ایسی چونکہ امریکہ میں تھے، اس لیے وہ فون پر بڑی لجاجت سے مناتے رہے۔

میں ان کی خوشی کی خاطر سرور ہسپتال پہنچا کہ ڈاکٹر طیب ایک عرصہ سے چھٹی پر ہیں۔ ان کے کلینک پہنچی تو ٹینک پر تالہ پڑا تھا۔ مجھے فکر لاحق ہوگئی کہ شاید ڈاکٹر صاحب بیمار ہیں ار اسی لیے چھٹی پر ہیں۔ گھر ڈھونڈ کر پہنچی تو گھر پر بھی تالہ پڑا تھا۔ ایک مفلوک الحال چوکیدار باہر بیٹھا تھا۔

”بھائی ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟“

”وہ تو بی بی جی دوہی چلے گئے۔ یہاں تو نہیں آئے دو مہینے سے۔“

چلیے دوہی والوں کی قسمت کھلی۔

اب 2007ء ہے۔ دوسری آنکھ کا آپریشن ابھی نہیں ہوا۔ سوچتی ہوں کہ آپریشن کراؤں یا یونہی چھوڑ دوں۔ شاید حسن خاتمہ قریب ہو۔

ڈاکٹر شاہد محمود

ڈاکٹر راشد لطیف کے ہسپتال میں ایک میرے محسن ڈاکٹر شاہد محمود بھی ہیں۔ میں شوگر کے ٹیسٹ لے کر ہسپتال

پہنچی تو مجھے ڈاکٹر راشد لطیف نے شاہد محمود صاحب کی طرف ریفر کر دیا۔

میں ہسپتال سے ذرا پیچھے فرٹیلیٹی کے سیکشن سے پہلے جہاں کاریں پارک ہوتی ہیں، ڈاکٹر شاہد محمود کا دفتر ہے۔ کچھ میٹر حیاں اوپر چڑھ کر بائیں ہاتھ ایک بڑا سا وینٹنگ روم ہے۔ میں یہاں پہنچی تو ایک نوجوان ڈاکٹر مجھے وینٹنگ روم میں لے گیا۔ ابھی چند منٹ نہ گزرے تھے کہ ڈاکٹر صاحب خود آئے اور آپا آپا کہہ کر مجھے اپنے آفس میں لے گئے۔ اس آفس کے دو حصے ہیں۔ سامنے وہ حصہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب مریض سے ملتے ہیں۔ دیوار پر ان کی ڈگریاں لٹکی ہوئی ہیں۔ پیچھے ان کا معائنہ کرنے والا چھوٹا سا کمرہ ہے، جس میں بلڈ پریشر جاننے اور دیکھنے کے لیے مریض کے لیے ایک اونچا سا بیڈ ہے۔

میرا ہاتھ پکڑ کر جب وہ اپنے آفس میں پہنچے تو یہاں دو تین مریض بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے ڈاکٹر صاحب نے بڑی لبا جت سے کہا۔ ”معاف کیجیے میرا اصول ہے کہ میں مریض کو باری باری دیکھتا ہوں لیکن اب مجبوری ہے، جگت آگئی ہیں۔“

اس کے بعد وہ مجھے اندر والے کمرے میں لے گئے۔ مریض کا بیڈ اونچا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اوپر چڑھانے سے منع کیا اور خود میرا بلڈ پریشر لیا۔ اب میرا معمول ہے۔ میں دوسرے تیسرے ماہ ان کو ملتی ہوں۔ ان کی مرمت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔

ڈاکٹر احمد خاں

یہ بات کچھ کشف سے تعلق رکھتی ہے اور کچھ ہومیوپیتھک علاج سے۔ جس وقت میری والدہ ملتان میں آف سکلز تھیں، ان دنوں وہاں ڈاکٹر احمد خاں بھی ہوتے تھے۔ جب مجھے ٹائیفائیڈ بخار چڑھا تو ڈاکٹر صاحب میرا علاج ہومیوپیتھک قطروں سے کیا کرتے تھے۔

پھر ہم 121 سی میں آ گئے۔ ہمیں پرانے نرسنگ ہسپتال میں مددگار بھجول گئے۔ ایک روز صبح سویرے کھنٹی بجی۔ برآمدے کے پاس نیچے ڈاکٹر احمد خاں کھڑے تھے۔ میں بکا بکا رہ گئی۔

”آپ..... آپ یہاں ڈاکٹر صاحب!“

”بھائی یہ بتاؤ گھر میں کون بیمار ہے؟“

”آپ کو کیسے پتہ چلا؟“

”رات مجھے خواب میں آ پاذا کرہ نے بتایا کہ میرے گھر جائیے وہاں کوئی بہت بیمار ہے۔“

”اندر تو آئیے۔“

”میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مریض چھوڑ کر آیا ہوں۔“

”میں ڈاکٹر ہوں۔ شاید کچھ میں مدد کر سکوں۔“

”ضرور آجائیے۔“

وہ اپنا ڈاکٹری بیگ اٹھائے برآمدے میں چلنے لگے۔

”میرا ایک اور بھی تعارف ہے۔“

”جی فرمائیے۔“

”آپ کے مرزا عبدالرزاق کا میں بھتیجا ہوں۔“

لیجیے خیال حقیقت میں بدل گیا۔ ڈاکٹر عاطف سے اب ملنا کسی تکلف کا حامل نہ تھا۔ میں انہیں کسی فارمیسی کے بغیر خاں صاحب کے بیڈروم میں لے گئی۔

خاں صاحب، عاطف کو دیکھ کر نہال ہو گئے۔

”قد سید! عاطف کو تہوہ پلاؤ۔ یہ گھرانہ تو کھانے پینے کا شوقین ہے۔“

لیجیے پہلی ہی ملاقات میں عاطف اور خاں صاحب کی دوستی ہو گئی۔ پتہ چلا وہ پروفیشنل آدمی ضرور ہیں۔ دنیاوی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ شریعت کے پابند اور روحانیت کے قائل بھی ہیں۔

کچھ عرصہ کے بعد پتہ چلا کہ عاطف کی بیگم صاحبہ بھی ڈاکٹر ہیں اور اندرون شہر کسی کلینک پر کام کرتی ہیں۔ یہ انفرمیشن تازہ تھی کہ مجھے علم ہوا کہ بیگم عاطف مرزا نے کرشن نگر کا کلینک چھوڑ دیا ہے اور فرحت ہاشمی کی بیروکار بن گئی ہیں۔

حجاب اوڑھ لیا اور اب وہ ایک ایسا مکتب چلاتی ہیں جس میں گھریلو پردہ دار عورتوں کو فرحت ہاشمی کی تعلیم عنایت کرتی ہیں۔ زندگی عجب طور پر چلتی ہے۔ جو شخص ہر وقت خاں صاحب کے پاس آجاتا تھا اور میری تشفی کا باعث بنتا تھا۔

7 ستمبر کو جب خاں صاحب اس دنیا سے جانے والے تھے، میں نے قریباً آٹھ بجے صبح عاطف کو فون کیا۔

”عاطف..... ڈاکٹر صاحب! خاں صاحب کی طبیعت ذرا زیادہ خراب ہے۔ آپ پلیز آجائیں۔ مجھے کچھ نہیں آ رہی، میں کیا کروں؟“

”میں ضرور آجاتا لیکن میں تو ایئر پورٹ جا رہا ہوں اور بالکل ایئر پورٹ سے قریب ہوں۔“

خاں صاحب کے جانے کے بعد میں ان کی بیگم سے ملی۔ جس طرح کی عورت ان کے ساتھ بچتی ویسی ہی تھی۔ جب عاطف مرزا کے والد فوت ہوئے۔ ان کے قتل کی اطلاع ملی۔ میں ان کے گھر گئی۔ میں نے ان کو اپنے

نئے روپ میں دیکھا۔ وہ بڑی اعجازی اور انکساری کے ساتھ شرعی انداز میں مہمانوں کی دیکھ بھال کرنے میں مشغول تھیں۔ اب میری بیماری کا دور دورہ ہے۔ ڈاکٹر عاطف مرزا بڑے تواتر کے ساتھ اسی پرانے انداز میں بیگم صاحبہ

آتے ہیں۔ جہاں بٹھاؤ بیٹھ جاتے ہیں۔ میرے نسخے دیکھ کر دواؤں میں اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔ دو تین مرتبہ دوائے کھانے کے ساتھ لائے ہیں، لیکن عاطف مرزا ان لوگوں میں سے نہیں جو واقفیت کو بے تکلفی کا بہانہ بنا لیں۔ بہت جی چاہتا ہے کہ

ان کے لیے کچھ مثبت کروں لیکن انسان اپنی خواہش کو ہمیشہ پورا بھی تو نہیں کر پاتا۔

ڈاکٹر اکرم زبیر

کچھ لوگ خوش نصیب ایسے ہیں جو بیمار پڑتے ہیں تو ڈاکٹر آگے بڑھ کر مسیحا کا روپ دھار لیتے ہیں اور کچھ نصیب ڈاکٹروں کو چنگل سمجھتے ہیں۔ کچھ کو غلط Anesthesia کا ٹیکہ لگ جاتا ہے اور مریض آپریشن تھیٹر میں ہی دم توڑتا ہے۔ کبھی غلط آپریشن، کبھی پیرامیڈیکل سٹاف کی غفلت..... یہ سب یقیناً ہم سب کے ساتھ ہے۔ کچھ ڈاکٹروں پر تھرے کرتے ہیں۔ انہیں رسوا کرنے میں وقت گزارتے ہیں۔

کچھ حضرات کو ڈاکٹر ملتے ہی گھر والے بھی بھول بھال جاتے ہیں۔ یقیناً اس میں کچھ تو امیر غریب کا چکر بھی ہے، سوسائٹی کے وی آئی پی کو اور طرح کا رویہ ملتا ہے اور کچھ بے نوا روتے پیٹے ہسپتالوں سے رخصت ہوتے ہیں اور بسا اوقات قرض کی لعنت میں بھی پھنس جاتے ہیں، لیکن اس ساری اونچ نیچ میں ایک فیکٹر غریبی بھی ہے۔ جہاں امداد نہیں اور نہ کی رحمت آپہنچتی ہے وہاں سارا تفرقہ مٹ جاتا ہے اور کسی کسی بے نوا کو وی آئی پی کا سلوک مل جاتا ہے اور کئی مرتبہ بخارہ وی آئی پی ہسپتال ہی بدلتا رہ جاتا ہے۔ کبھی لندن، کبھی امریکہ، کبھی یورپ۔

میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے رنگ رنگ کی بیماریاں نے گھیر لیکن مجھ پر ڈاکٹر صاحبان ہمیشہ مہربان رہے۔ جب میں بلڈ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر میو ہسپتال پہنچی تو ہماری کسی سے میو ہسپتال میں جان پہچان نہ تھی۔ مجھے ہر روز ایک بوتل خون کی لگتی تھی لیکن دوسری صبح بلڈ کاؤنٹ پھر گر کر خطرے کی گھنٹی بجانے لگتا تھا۔

ان دنوں صبح عین نو بجے ڈاکٹر اکرم زبیر ہولے سے میرا دروازہ کھٹکھٹاتے اور چپ چاپ پلنگ کے ساتھ گئی کرسی پر بیٹھ جاتے۔ عموماً دن کے وقت اشیر خاں یا انیق میرے پاس ہوتے۔ رات کو خاں صاحب خود میرے پاس گزارتے۔ ڈاکٹر زبیر ہارٹ سپیشلسٹ تھے۔ ان کا کینسر سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن ان کی باقاعدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

جب مشتاق یوسفی صاحب کی مہربانی سے یہ طے ہوا کہ ہم لندن چلے جائیں گے اور میں گھر آگئی تو ڈاکٹر زبیر میری طبیعت کا پوچھنے داستان سرائے آتے رہے اور جب خاں صاحب دل کے مریض ہو گئے تو ہم ڈاکٹر زبیر کے کلینک پر باقاعدگی سے جاتے۔ ڈاکٹر زبیر کو اطلاع ملتی تو وہ فوراً ہمیں اپنے آفس میں بلا تے، بڑی توجہ سے خاں صاحب کو چیک کرتے اور سسر سے کہتے ”ان کا ای سی جی میں خود کروں گا۔“

ڈاکٹر اکرم زبیر اتنے چپ چاپ آدمی تھے کہ شبہ ہوتا کہ گونگے ہیں۔ پر ان کے چہرے کی ملاہمت بتاتی رہتی کہ وہ پوری توجہ سے سن رہے ہیں۔ پھر نہ جانے کیسے ان کی بیگم میری گرویدہ ہو گئی۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد وہ بڑی محبت سے مجھے ملنے آتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو مجھے حیران کرنے کو کافی تھے لیکن ان کی بیگم کی محبت نے تو واقعی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیئے۔

ڈاکٹر جاوید شیخ

مجھے معلوم نہیں ڈاکٹر جاوید شیخ کب خاں صاحب سے ملے، کب ان سے متعارف ہوئے اور ان دنوں کے

مابین محبت کا کیا رشتہ تھا لیکن جب میں بلڈ کیمنر کے مرض میں مبتلا ہو کر میوہسپتال پہنچی تو خاں صاحب کو مشتاق احمد یوسفی نے فون کر کے کہا ”اشفاق صاحب میں B.C.C.I. بینک کی طرف سے بول رہا ہوں۔ یہاں کے چیئر مین برنی صاحب آپ سے کہہ رہے ہیں کہ آپ بانوقدسیہ کو اپنی ملکیت نہ سمجھیں۔ وہ قومی سرمایہ ہیں۔ ہم یہاں لندن میں ان کا علاج کر رہے ہیں۔ ہسپتال میں کرائیں گے۔ یہاں ڈاکٹر شارپ ایک بہت ماہر ڈاکٹر ہیں۔ وہ ہی ان کے بلڈسٹ لیس گے۔ آپ میوہسپتال کی رپورٹ ساتھ لے کر آئیں۔ آپ کو نہ قیام نہ طعام کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

یہ تو ایک دوسری کہانی ہے لیکن سفر سے پہلے پڑاؤ پر لندن ایئر پورٹ پر ہمیں جو شخص دوسری مرتبہ ملے وہ جاوید تھے۔ پہلی بار تو ہم یوسفی صاحب کے مہمان تھے لیکن اس دوسری بار ہمارے میزبان ڈاکٹر صاحب نکلے۔ وہ اپنی بیوی مرسیڈیز لے کر موجود تھے۔ ہم ان کے ساتھ گھر پہنچے۔ لندن کی بھیڑ بھاڑ سے دور ڈاکٹر جاوید کا گھر تھا۔ باغوں سے گھر کی خاموشی کی ردا اوڑھے۔ انہوں نے ہمیں اوپر والی منزل میں کمرہ دیا جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا سنگ روم بھی تھا۔

ان کی دوسری بیگم حسینہ قریب ہی کاؤنٹی کے ہسپتال میں کام کرتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی چھ سالہ بیٹی فاطمہ گھر پر موجود ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب لندن کے کسی ہسپتال میں کام کرتے تھے۔ ان دنوں کا معمول تھا کہ باری باری ایک بندہ گھر پر فاطمہ کے پاس رہتا اور ایک بندہ ہسپتال میں مریضوں کو دیکھتا لیکن جونہی ہم گھر کا فرد بنے فاطمہ نے ہمیں دادا، دادی، روپ بخش دیا۔ ہم بھی اس میں خوب مصروف رہے اور بی بی جگہ کی اجنبیت ہمیں محسوس نہ ہوتی۔ ہسپتال کے چکر بھی دینا لگے دیتے۔ ڈاکٹر شارپ کے پاس بھی وہی ڈیوٹی دیتے۔ اتنی اپنائیت سے انہوں نے ہماری دعوت کی جس میں لندن کے اویوں کو اکٹھا کیا۔ اگر ڈاکٹر جاوید نہ ہوتے تو یہ ملاقات ممکن نہ ہوتی۔

اب 2007ء میں جب وہ مجھے ملنے آئے تو فاطمہ کو دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ اتنا وقت کتنی جلدی گزر گیا ہے۔ عجیب رابطہ تھا کہ اس پراجنبیت کی ذرہ بھر وصول نہ گری!

ڈاکٹر راشد لطیف

جب میں لندن سے واپس لوٹی اور ڈاکٹر شارپ نے یہ طے کر دیا کہ مجھے بلڈ لوکیمیہ ہے اور لاہور کے ڈاکٹر کی تشخیص درست ہے تو معلوم نہیں کیسے ڈاکٹر راشد لطیف کو پتہ چل گیا۔ وہ خاں صاحب کو بہت پہلے سے جانتے تھے۔ انہوں نے از خود ملے اور تفتیش کی کہ بلڈ کیمنر کسی طور پر لہو سے نکلنے والی بیماری نہیں اور میں فوراً راشد لطیف ہسپتال پہنچوں۔ یہاں جب ہم دونوں پہنچے تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہوں نے ٹیسٹ لیے اور پتہ چلا کہ کیمنر چوری چوری Leis tacleoy کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

مقررہ وقت پر خاں صاحب، ٹویلہ اور میں راشد ہسپتال پہنچے۔ مجھے تیار کر کے جب اندر لے گئے تو ٹویلہ نے ماسک اور کوٹ پہنا کر ساتھ لے گئے۔ اتنے بڑے آپریشن کا ڈاکٹر صاحب کم از کم ڈیڑھ لاکھ وصول کیا کرتے تھے خاں صاحب سے انہوں نے ایک پائی بھی نہ لی۔

اس کے بعد ابھی پانچ چھ دن گزرے تھے کہ صبح دس بجے کے قریب ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ میں شفا کی آرزو کے ساتھ شہاب صاحب کے کاسنی کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ میرا حال چال پوچھا۔ حوصلہ دیا اور ہمت بڑھائی۔ میں نے کہا..... ”ڈاکٹر صاحب آپ نے بہت سچھل کی۔ اتنی مصروفیت کے باوجود چلے آئے۔“ آہستہ سے بولے..... ”آپ کہہ کر تو آنا ہی پڑتا ہے۔ کیا کریں مجبوری ہے۔“

راشد لطیف ہسپتال کے بائیس ہاتھ فریٹیٹی سنٹر ہے اور اس کے عقب میں ڈاکٹر صاحب کی رہائش گاہ ہے۔ ابھی زیادہ دن نہ گزرے تھے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی اہلیہ طلعت کو لے کر میری طبیعت کا پوچھنے آ گئے۔ اب تک ان کی مروت کا یہ عالم ہے کہ میں اگر کبھی ہسپتال جا پہنچوں تو وہ بہ نفس نفیس مجھ تک آ پہنچتے ہیں۔ کسی کے علاج کی سفارش کر دوں تو وہ بغیر پیراج لیے اس کا علاج بھی کر دیتے ہیں۔ اب بتائیے اس مادی عہد میں ایسی مروت کی کس کو فرصت یا ضرورت ہے۔

دراز قد، ذہین چہرہ، مضبوط کاٹھی، پراعتماد رویہ اس بات کی دلالت کرتے ہیں کہ یہ ڈاکٹر اپنے پروفیشن میں ہی بے مثال نہیں، ساتھ ساتھ بیمار لوگوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ بھی رکھتا ہے۔

نئی، شنیہ، علی، ہاروی

اب مجھے ٹھیک طور سے یاد نہیں آ رہا کہ نئی ہماری زندگی کا حصہ کیونکر بنی۔ ہر ادھوری انفرمیشن چونکہ مجھے یا تو خود بخود کرنا پڑتی تھی یا خاں صاحب کے اکاؤنٹوں اور ریمارکس سے مل جاتی تھی۔ مجھے پتہ چلا کہ خاں صاحب کچھ سیرزادیوں کے ایک گروپ کا بڑا فعال حصہ بن چکے ہیں۔ یہ خواتین اللہ کی رحمتوں برکتوں سے کثیر رزق پر دسترس رکھتی تھیں۔ ان کے شو ہر اس قدر مصروف تھے کہ ان کے پاس خواتین کی مجلسی زندگی کے لیے قطعی وقت نہ تھا۔

ان چھ سات خواتین سے نئی نے خاں صاحب کو متعارف کرایا۔ جس طرح امیر لوگ قوالوں کو بلا کر یا موسیقار کو گھر مدعو کر کے اپنی محفل سجاتے تھے اس طرح کبھی کبھار کسی ایسے مقرر کو بھی ذاتی طور پر بلانے کے لیے بلا لیا جاتا جو انہیں دین، روحانیت اور صوفی ازم کی باتوں سے محظوظ کرتے۔ ابھی ایسی محفلوں کا رواج عام نہ تھا۔ ابھی یہ وی وی آئی پی کی دل لگی تھی۔ پھر ہولے ہولے معمول کے مطابق یہ فیشن بھی اوپر والے طبقے سے سرايت کرتا بدل کلاس میں پہنچا اور غریب طبقہ تو پہلے ہی مزاروں، خانقاہوں، سجادہ نشینوں، ڈیروں پر حاضری دینے کے عادی تھے اور ان کی اس عقیدت کو امراء جہالت سے تعبیر کرتے تھے۔

غالباً نئی اس گروہ میں خاں صاحب سے پہلے داخل ہوئی۔ وہ ان دنوں باغ جناح کے سامنے کسی بلڈنگ میں رہتی تھی۔ نسیم کے شو ہر سعودیہ ایئر لائنز میں اپریٹر کے چیف تھے۔ اسی پوزیشن کے دھکے سے نسیم بانو کا ہر دروازہ کھل جاتا تھا۔ نئی کے شو ہر فضلی زیادہ وقت جدہ میں رہتے تھے جہاں وہ سعودیہ ایئر لائنز کے Marketing & Agreements کے ڈائریکٹر تھے اور وہاں بڑی تندی اور توجہ سے کام کرنا پڑتا۔

ان دعوتوں کا معمول تھا کہ پُر تکلف کھانے کے بعد خاں صاحب اس اندر سجا میں پیر بادشاہ بن کر بیٹھ جاتے۔

پہلے تھوڑا سا لکچر خاں صاحب اپنی مرضی کے مطابق سامعین کی نذر کرتے پھر سوال جواب شروع ہو جاتے۔ اس کے بعد چائے کا ذور چلتا۔ دنیا داری کی باتیں ہوتیں۔ مزاج کی چاشنی چلتی۔ میں ان محفلوں میں کبھی شریک نہ ہوئی۔

ایک روز خاں صاحب میرے پاس یہ کہنے آئے ”کچھ وقت ہو تو میری بات سن لو۔“

میں کام کاج چھوڑ کر ہمہ تن گوش ہوئی ”جی؟“

”بات یہ ہے کہ کل دوپہر کے کھانے پر کچھ مہمان خواتین آئیں گی۔ وہ بہت اعلیٰ کھانوں کی عادی ہیں۔“

انہیں ڈیروں پر کھانے کا کوئی تجربہ نہیں۔ ہمارا داستان سرائے مان آدر میں تو کم نہیں، صرف ہمارے کھانے بہت سادہ ہیں۔“

”جی تو میں بازار سے قہیے کے نان کئے منگوا لوں گی۔“

”ناں بھائی ناں! ایسا ظلم نہ کرنا۔ وہ بازاری چیزیں نہیں کھاتیں۔ اُن کے گلے خراب ہو جاتے ہیں۔“

فوذ پوازنگ ہو جاتی ہے۔“

”تو پھر تو..... جی..... مشکل ہے۔ میں تو سادہ سادہ کھانے جانتی ہوں۔“

”بس پلاؤ آلو کا شوربہ ذال، کباب لیکن ایک شرط ہے۔“

”جی وہ کیا؟“

”تم کھانا خود پکاؤ گی..... جیونی بہن صرف پرائیٹے بنائے گی۔“

جیونی بہن گو مجھ سے بہتر پکاتی تھی اور پکاتی ہے لیکن خاں صاحب کے فیصلے کے آگے میں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

ان خواتین کا مجھ پر بن دیکھے ہی رعب پڑ گیا۔ کالا لہسا میزڈرائنگ روم میں دروازہ کھلتے ہی لگایا گیا۔ اس پر

حسب توفیق برتن سجائے گئے۔ ان دنوں میرے پاس تاجدار اور رفیق ہوا کرتے تھے۔ انہوں نے مہمانوں کا دھیان دینا

میں اندر نہیں گئی۔ سنا ہے عورتوں نے آلو گوشت کی بہت تعریف کی۔ باقی سب سے تو میرا تعارف نہ ہو سکا لیکن نئے

آگئی اور مجھ سے یوں ملی گویا برسوں کی سکھی پہلی ہو۔

”بانو آپا! یہ آلو گوشت کیسے بنایا ہے۔ سب لٹو ہو گئی ہیں۔ ہم نے تو ایسا آلو گوشت نہ کبھی کھایا نہ پکایا۔“

میں نے شیخی میں آکر ترکیب تفصیل سے بتائی اور تب سے اب تک اس ذم میں مبتلا ہوں کہ ہمارے گھر میں

آلو گوشت کا شوربہ پکتا ہے، وہ بالکل لاثانی ہے۔

نینی اس طرح خاں صاحب سے سرکتی سرکتی میری اور بچوں کی دوست بن گئی۔ اُس کے علاوہ نسرین آفتاب

میری واقف بن گئی۔ نسرین امیر خواتین کی طرح بے مصرف زندگی گزارتے گزارتے اس نتیجے پر پہنچ گئی تھی کہ اشیاء

کو اطمینان یا سکون نہیں بخش سکتیں۔ وہ خوشی ضرور عطا کرتی ہیں لیکن یہ خوشی دیرپا نہیں ہوتی۔ جیسے کسی اجنبی

سفر و قیام۔ انسان چاہے لاکھ آرام سے عیش سے کسی جگہ قیام کرے لیکن اول و آخر گھر کی یاد ستانے لگتی ہے۔

نینی ہمارے اور بھی قریب آگئی، جب فضلی نے اُسے ماڈل ناؤن میں گھر خرید دیا۔ علی اور شہیہ بڑی کلاس

گئے تھے اور فضلی انہیں اکھاڑ کر جدہ میں نئے سکولوں کے تجربے سے گزارنا نہ چاہتا تھا۔

اب ہمارے گھر میں ایک نیارنگ ابھرا۔ نوجوانوں میں دوستی ہوگئی اور اس میں وہ سارا جذبہ گوندھ دیا گیا جو صرف بلوغت کے عہد کا طرہ امتیاز ہے۔ چھٹی ڈالنا ہوئی چھٹی ڈال لی۔ لڑائی پر آمادہ ہوئے تو لڑائی کرنی لیکن رہے ہمیشہ گئے۔ اس دوستی میں بیڈمنٹن کورٹ نے بہت فائدہ پہنچایا۔

گھر کے سامنے عین کالے پھانک کے پیچھے دو گانا ڈسکوارٹ اور برتری جتانے کے لیے کورٹ بنایا گیا۔ اس میں لوہے کے ڈنڈے گاڑے گئے اور نٹ لگایا گیا۔ ٹشل کاک اور خوبصورت ریکٹ بھی آئے۔ نہ جانے بچوں نے خود پیسے جمع کیے یا پھر کسی نے ان کی بے کسی کو سہارا دیا۔ بہر کیف ہر شام کھیل جاری رہنے لگا۔ اشیر احمد طبعاً کھلاڑی تھا۔ وہ کوئی کھیل بھی کھیلے اُس میں سائل اور چنگلی خداداد صلاحیت کے باعث جلد پیدا ہو جاتی ہے۔

شام کو نینی اپنے دونوں بچوں سمیت ہمارے گھر آ جاتی۔ بیڈمنٹن چلتی۔ خوب شور و غوغا مچتا۔ ایک مرتبہ انیق اشیر سے کھیلتے کھیلتے جھگڑ پڑے اور آگے بڑھ کر اشیر کا ریکٹ توڑ دیا۔ بعد میں بہت پچھتائے اور اشیر سے چھٹی ڈال لی۔ ثنیہ اور سباز کھلاڑی تھیں لیکن اُن کی کھیل کولٹ کے سنبھال لیتے۔

اس گیم بازی کے بعد ہم ان سب کو پانی اور شربت پیش کر دیتے۔ وہ لوگ شاذ ہی ہمارے گھر کھانا کھاتے تھے۔ کھانے کے وقت سے پہلے ہی سب تتر بتر ہو جاتے۔

انیق کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ دونوں عام طور پر سسرال چلے جاتے۔ اشیر ان دنوں پرائیویٹ ایف اے کی تیاری کر رہا تھا۔ غزل کی چھوٹی بہن صبا نے اشیر کو سوشل سٹڈیز پڑھانے کا بیڑا اُٹھایا۔ اوپر لاہری میں بیٹھ کر یہ دونوں پڑھتے رہتے۔ یہاں سے ایک اور اُلجھن پیدا ہوئی۔ ثنیہ اور صبا دونوں اشیر پر ملتنت تھیں۔ نینی اور فضلی بھی اس بات کے خواہشمند تھے کہ ثنیہ کسی طرح ہمارے گھر کی بہو بنے لیکن اشیر اور صبا وعدے وعید تک پہنچ گئے اور ثنیہ والا معاملہ لگتا رہ گیا۔

لیکن بچوں کے معاملات کا ہم بڑوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نینی جب نہ تب۔ مزے دار کھانے پکا کر لاتی اور خاں صاحب جو نعمتوں کو دست بستہ قبول کرنے کے عادی تھے بڑے خضوع و خشوع اور رغبت سے انہیں کھاتے۔ نینی کی سرنامیوں کے طفیل علی اور اشیر میں بڑی دوستی ہوگئی۔ جب بھی نینی کو جدہ کا سفر درپیش ہوتا وہ ثنیہ کو تو ساتھ لے جاتی لیکن علی ہم سے پاس رہ جاتا۔

اشیر اور علی دونوں شہاب بھائی والے کاسنی کمرے میں اکٹھے ایک رضائی میں سوتے ایک تھالی سے کھاتے ایک گلاس سے پیتے۔ اسی نینی کے طفیل اُس کے دونوں بھائی بھی ہمارے گھر کا حصہ بن گئے۔ نینی کے بھائی امجد اور نغمہ بڑے ایسی محبت والے تھے۔ نغمہ کھانے پکانے کی ماہر تھی۔ یہ دونوں تب جدہ میں رہتے تھے۔ جب ہم دونوں پہلی بار عمرہ کرنے گئے تو جدہ میں ان ہی کے پاس ٹھہرے۔ نینی کے بڑے بھائی آفتاب امریکہ میں رہتے تھے۔ جب بھی لاہور آتے خاں صاحب سے ملنے ضرور آتے۔

نینی کا خاندان ڈل کلاس تھا۔ اُن میں مشرقی اقدار تھیں۔ ہائی سوسائٹی میں گھسنے کے لیے نینی کے پاس خوبصورتی اور فضلی کا پاسپورٹ تھا۔ وہ اس پاسپورٹ کو استعمال کر کے وی وی آئی پی تو ضرور بن گئی لیکن اُس میں ایک عجیب

قسم کی عاجزی اور انکساری تھی جس نے اُسے کبھی زمینی حقیقتوں سے جدا نہ کیا۔

جب کبھی بچوں کو چھٹیاں ہوتیں یعنی ان کو تفریح کی غرض سے کہیں نہ کہیں لے جاتی۔ فضلی ٹکٹ اور خرچہ بندوبست کر دیتے اور یہ تینوں ہتے کھیلتے روانہ ہو جاتے۔

ایسے ہی ایک سفر کی داستان سنئے۔

یعنی دونوں بچوں سمیت ممبئی گئی اور وہاں تاج محل ہوٹل میں ٹھہری۔ اس ہوٹل سے کچھ ہی قریب اُن دنوں کا ہارٹ بیٹ دھر میندرز ہوتا تھا۔ وہ عام طور پر تاج محل میں جا کر اپنے پنکھوں (fans) کو درشن دیتا۔ اُن کے ساتھ بیٹا پیتا کھانا پینا ہوتا۔ ان ہی جھرو کے درشنوں کے دوران یعنی اور اُس کے بچے دھر میندر کے بہت قریب آ گئے۔

ثنیہ فلور پر اُس کے ساتھ ناچنے لگی تو تمام تماشاخی گھیرا ڈال کر اُن دونوں کا ناچ دیکھنے لگے۔ بڑی دلور اور ثنیہ میں خود ستائی اور خود اعتمادی کا بیج بویا گیا۔ دھر میندر نے اُنہیں اپنے گھر مدعو کیا اور اس گھر یلو دعوت نے جیسے دلوں میں اپنی بڑائی مستحکم کر دی۔ وہ اپنے آپ کو خاص اور special سمجھنے لگے۔

اور اسی خود اعتمادی کے ساتھ جب واپس لوٹے اور اترائے اترائے ہمیں ملنے آئے تو خاں صاحب نے کہا کیا کہ یہ سفر ان بچوں کے حق میں نہیں تھا۔ دونوں بچے اپنی پڑھائیوں سے غافل ہو چکے تھے اور اُنہیں ناچنے پانے بننے اور شو بین بزنس سے وابستہ ہونے کا شوق اندر ہی اندر چاٹ رہا تھا۔

اگر پاکستانی معاشرہ اُس وقت الیکٹرانک میڈیا کی مہربانی سے وہاں ہوتا جہاں وہ آج ہے تو غائب ہوتا۔ اس وقت بہت اے ون ماڈل الیکٹریا کپڑوں کے ڈیزائن بن چکے ہوتے اور نام و اکرام پاتے۔ لیکن معاشرہ اس قدر اقدار سے جیسا کیسا بندھا تھا اور گونئی جنریشن رشتی چھڑانے کے عمل میں تھی لیکن ماں باپ سے مکمل چھٹکارا ابھی ممکن تھا۔

نودس بجے کا وقت تھا۔ صبح صبح تینی اور ثنیہ گھبرائی ہوئی گھر آئیں۔ خاں صاحب دفتر جا چکے تھے۔ حسب معمول گھر شانت تھا۔ ثنیہ کی سانس برابر نہ تھی۔ حواس باختہ یعنی اپنے آپ کو کنٹرول کرنے میں لگی تھی۔

”بانو! پاپا! علی بھاگ گیا ہے۔“

”ہیں؟“ میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔

”اُس نے پڑھائی چھوڑ دی ہے..... پیر آف مکھڈ کا بیٹا اُس کے ساتھ پڑھتا ہے۔ شاید..... مجھے پتہ چلتا ہے۔“

کہ وہ اُن کے گھر چھپا بیٹھا ہے۔“

”گھر پتہ ہے پیر آف مکھڈ کا؟“

”ہاں جی۔“

”اگر ہم میں سے کوئی گیا تو وہ کبھی نہیں آئے گا۔ آپ سے وہ محبت کرتا ہے۔ اشیر کے ساتھ کھیلتا رہا ہے۔“

گہری دوستی ہے۔ آپ دونوں چلیں تو شاید بات بن جائے۔“

لیجئے جناب میں ان پریشان حال ماں بیٹی کے ساتھ پیر آف مکھڈ کے محل نما گھر کے سامنے پہنچ گئی۔ اس گھر کے

خوبصورت پتھروں سے آراستگی کی گئی تھی۔ گلبرگ کے مین بلیوارڈ پر اس بنگلے میں جب میں پہنچی تو میں بدحواس تھی۔
 ٹرک کے پاس کار میں نینی اور ثنیہ اپنی جگہ تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ اندر جا کر مجھے تھوڑی دیر انتظار کروانے کے بعد علی
 آیا۔ محبت تو اس گھرانے کا خمیر ہے۔ یہ لوگ محبت میں آ کر کچھ بھی کر گزرنے والے ہیں۔

مجھے دیکھ کر اُس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ”آپ مجھے فون کر دیتیں بانو آپ کیوں آئیں؟“
 ”کیوں نہ آتی؟ چلو گھر چلیں..... میری خاطر۔“

وہ چند لمحے متذبذب رہا..... ”علی چلو! شیر کی خاطر.....“ میں نے علی کو بلیک میل کیا۔
 ”پہلے آپ وعدہ کریں کہ..... کوئی مجھے پاکستان میں پڑھنے پر مجبور نہیں کرے گا۔ میں اپنی سن کالج نہیں جانا
 پیتا۔ میں وہاں جواب دے آیا ہوں۔“

”چلو تو سہی۔ یہاں یہ باتیں تھوڑی طے ہو سکتی ہیں۔“

”آپ وعدہ کریں۔“

میں نے وعدے کا تاوان ادا کیا اور علی کو ساتھ لے کر آ گئی۔ اس کے بعد علی گھر پر رہنے لگا۔ کچھ عرصہ فضلی کو
 سمجھانے پر صرف ہوا کہ علی کو امریکہ بھیج کر اسے عالی شان تعلیم سے مزین کیا جاسکتا ہے۔ یہاں کی تعلیم محض تفریح اوقات
 کی ہے۔

ابھی علی لاہور ہی میں تھا کہ ثنیہ بیگم کنیئرڈ کالج سے بی اے کر گئی۔ نینی کو اسے بیانیہ کی جلدی تھی۔ اچھے سے
 جسے رشتے چلے آ رہے تھے۔ ثنیہ خوبصورت باصلاحیت لڑکی تھی۔ اپنی ماں کی طرح گھریلو خانہ داری اور کھانے پکانے کا ہنر
 جانتی تھی۔ ایسی لڑکی کسی گھر کا جھومر بن سکتی تھی۔

نینی ہمیشہ کی طرح خاں صاحب سے مشورہ کرنے آئی..... تشکیل مسعود کا رشتہ آیا ہے خاں صاحب..... مجھے تو
 سمجھ نہیں آ رہی۔“

”بہتر تو یہی ہے کہ ثنیہ سے پوچھ لیں۔“ خاں صاحب بولے۔

”جی وہ حسن پرست ہے۔ بس کہتی ہے مرد کو خوبصورت ہونا چاہئے۔ لڑکا لمبا ہے قبول صورت ہے۔“

”اوہا ہا خوبصورتی کو چاہتا ہے۔ پتہ نہیں ان بچوں کو کیا ہو گیا۔ ظاہری چیزوں پر ان کی جان نکلتی ہے۔ اب اُسے
 حرمیندر کہاں سے لادیں۔“

نینی بددل ہو کر گھر چلی گئی۔ اُسے ہمارے گھر سے کوئی ترکیب استعمال نہ ملی اور اس طرح اُس نے یہاں سے
 شورے لینے چھوڑ دیئے۔ لیکن ملنا جلنا جاری رکھا۔

ایک روز صبح کے وقت تشکیل میرے پاس آیا۔ لمبا، قبول صورت انتہا کا برد باڈی شریف۔ گودی میں ہاتھ رکھ کر بیٹھ
 گیا۔

”جی آپ سے ایک مشورہ لینا تھا۔“

ایک اجنبی سے میں پہلی ملاقات میں مشورہ کیا دیتی؟

”جی فرمائیے..... میں حاضر ہوں۔“

بڑی دیروہ گم سم سا رہا۔ میں بھی پہلو بدلتی رہی۔

پھر وہ بڑی شائستگی سے بولا..... ”آئی جی! شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں شکیل مسعود ہوں..... ثنیہ کا رشتہ

میرے لیے آیا ہے۔“

”تم نے اُسے دیکھا ہے؟“ میں نے سوال کیا۔

”جی..... میں اپنے والدین کے ساتھ گیا تھا۔ لیکن.....“

”لیکن کیا؟“

”میری والدہ کو اعتراض ہے کہ لڑکی ایکٹریس سی لگتی ہے۔ ایسی لڑکیاں گھر مار کے قابل نہیں ہوتیں۔“

”اول تو ساری خوبصورت لڑکیاں ایکٹریس ہی لگا کرتی ہیں۔ دوسرے یقین مانواتی اچھی لڑکی تمہیں کبھی نہیں

ملے گی..... خانہ داری، کھانا پکانا روایات کی پاسبانی اُس سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا..... میری مانو تو فوراً ہاں کر دو۔“

پتہ نہیں میری وجہ سے یا ثنیہ کی وجہ سے بات چلی ہوگی۔

اب نینی کی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا۔

ثنیہ نے اپنے سسرال میں رہنے کی بہت کوشش کی لیکن یہ گھر انہ شکیل کی والدہ کے گرد گھومتا تھا۔ جوائنٹ

سسٹم کے تحت بھائی، بہن اکٹھے رہتے تھے۔ بندھٹی میں طر حدار بہو کے لیے کھلنے کی گنجائش نہ تھی۔ ثنیہ نے کچھ دیر تو اپنے

کوشش کی اور پھر شکیل کو لے کر اپنی والدہ کے گھر آ بسی۔

یہ عہد ہماری نظروں سے روپوش رہا۔ نینی گویا ہم سے کٹ گئی۔ علی امریکہ سدھارا۔ شکیل اور ثنیہ کو اللہ

بیٹیاں اور ایک بیٹا عطا کر دیا۔ ہمیں نینی کے گھر کی خیر اڑتی اڑتی ملتی تھی۔ ہم بھی دوستوں کے تعاقب میں اُن کی آواز

میں مغل ہونے والے لوگ نہ تھے۔ کبھی کبھار وہ ملنے آ جاتی لیکن ادھر ادھر کی باتیں ہوا کرتیں۔ کبھی دکھ سکھ کرنے کی

نت آتی۔

ایک روز پتہ چلا کہ شکیل نے بڑا خوبصورت گھر خرید لیا ہے اور اپنے بیوی بچے لے کر وہاں شفٹ ہو گیا۔

اپنی ذاتی کار لے دی ہے اور وہ بڑے ٹھسے کی زندگی بسر کرتی ہے۔

کچھ عرصہ گزرا تھا کہ شکیل ہمارے گھر آیا۔ وہ باریکی ہائی ٹون ٹیکسٹائل ملز میں جنرل مینجر کی پوسٹ جوائن کر

کی سوچ رہا تھا۔ ان دنوں میرا بیٹا انیس اور ٹویلڈ دوسری منزل پر رہتے تھے۔ شکیل اُن سے مل کر باہروالی سیڑھیوں سے

جار ہا تھا۔ جب وہ مجھے سیڑھیوں پر ملا۔

”آپاجی! برابر ایک اچھا ایماندار جنرل مینجر تلاش کر رہا ہے۔ آپ اشر سے کہیں یہاں جوائن کر لے۔ لکھتے

زیادہ کا پیکیج ہے۔“

”تم کیوں نہیں چلے جاتے ہائی ٹون ٹیکسٹائل میں؟“

”میں ضرور چلا جا سکتا لیکن مجھے ”موان“ اخبار میں نوکری مل گئی ہے جو میرے مطلب کی ہے۔“

یوں تشکیل ”ڈان“ اخبار میں چلا گیا اور شیر نے باہر کی فیکٹری سنبھال لی۔

میرا خیال تھا کہ اب راوی چین ہی چین لکھتا رہے گا لیکن زندگی کچھ جنت کا چھوٹا سا نمونہ نہیں ہے۔ یہاں بیماری، سوگواری، برائی، گمراہی، موت اور پیدائش غرضیکہ ان گنت آزمائشوں کا گھر ہے۔ ہر لحظہ کسی نہ کسی امتحان کا سامنا کرتا ہے۔

ہمیشہ کی طرح نبی خاں صاحب کے پاس پریشان حال بیٹھی تھی اور مسئلہ بیان کر رہی تھی۔ میں نے چلے جانا چاہا تو خاں صاحب نے آواز دے کر بلا لیا..... ”سنو! اس شنیہ نے مصیبت ڈال رکھی ہے۔“

”اب کیا ہوا؟“

نبی نے بتایا کہ شنیہ اب تشکیل کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی اور طلاق چاہتی ہے۔ کچھ دیر سے Separation چل رہی ہے۔ تشکیل اور پرانی منزل پر رہتا ہے۔ شنیہ نیچے بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔

”شنیہ کو بھروسہ کرنے بچوں کے مستقبل سے نہ کھیلے۔“

”آپ چل کر سمجھائیں خاں صاحب! میری کب سنتی ہے؟“

”دیکھو ایسے کرو نبی! تم امجد اور نغمہ کو بلاؤ۔ ہم بھی آجائیں گے۔ پھر شنیہ کو سمجھائیں گے۔“

صبح گیارہ بجے کے قریب ہم تشکیل کے گھر پہنچے۔ نبی اور اُس کے مشیر نیچے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی فلم کا سیٹ لگا ہے۔ شنیہ سب سے الگ تھلگ منہ تھمتھائے گم سم نہایت پریشان لگ رہی تھی۔ تشکیل کو اور پرانی منزل سے بلا لیا گیا۔ وہ بھی پریشان اپنی ذات سے نالاں ڈرگاتا آیا۔

جیسے کسی بم کے پھٹنے سے پہلے فضا چارج ہوتی ہے ایسے ہی ماحول میں خطرہ تھا۔ مشکل سے ساری صورت حال سمجھائی گئی۔

میں نے ہمیشہ کی طرح آگے بڑھ کر شنیہ کا ہاتھ تھاما اور کونھکی سے کہا..... ”پتہ ہے تم کس آگ سے کھیلنے جا رہی ہو؟ یہ تمہارا مجازی خدا ہے۔ چلو پاؤں پڑ جاؤ معافی مانگو، چلو۔“

شنیہ آگے کم چل رہی تھی اور چیخے زیادہ ہلکورے لے رہی تھی۔ تشکیل اُسے دیکھ کر سر دھڑکھڑا ہو گیا۔ اُس کی خاندانی شرافت سر سے پاؤں تک جھلک رہی تھی۔ میں نے بدو بدی شنیہ کو اُس کے قدموں میں اندیل دیا تھا۔ تب تو کیا مجھے اب تک علم نہیں ہو سکا کہ انسان اگر اندر سے نہ مانے تو زبانی کلامی اعتراف کی مدت بہت کم ہوتی ہے۔

ہم یہ سمجھے کہ معاملہ رفع دفع ہو گیا اور تشکیل اور شنیہ میں کچی دوستی ہو گئی۔ لیکن بعد ازاں پتہ لگا کہ تشکیل نے چالیس لاکھ دے کر سچے اپنے پاس رکھ لیے اور شنیہ کو طلاق دے دی۔

لیکن یہ بعد کی کہانی ہے..... اس کے درمیان علی کی داستان بھی سن لیجئے۔ وہ گیا تو پڑھنے تھا لیکن طبعاً پڑھائی کی طرف راغب نہ تھا۔ کچھ دیر بعد اُس نے ہاروے نامی لڑکی سے مسجد میں جا کر نکاح پڑھوا لیا۔ ادھر لڑکی کا گھر ڈانوال ڈول تھا اور نبی پر یہ بچلی گری۔ بیپاری ڈھے گئی۔

علی اپنی پیاری سی دراز قد ہاروے کو لے کر لاہور آ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب ان دونوں کو بڑی شفقت احساس

تحفظ اور Support کی ضرورت تھی۔ یہ محبت اشفاق صاحب نے کھلے دل سے عطا کی۔ دونوں بچے عموماً صبح کے وقت ہمارے پاس آ جاتے تھے۔ ہاروے ظہر کی نماز میرے ساتھ پڑھتی۔ اجنبی دیس میں اجنبی علی کے ساتھ اجنبی کلچر میں اپنے جگہ بنانا آسان نہیں۔ اللہ اُس پر اور اُس کے بچوں پر ہمیشہ رحمت کا سایہ رکھے۔

شکیل مسعود ترقی کرتے کرتے ”ڈان“ اخبار میں جنرل منیجر کے عہدے پر پہنچا اور اب ”ڈان نیوز“ کا کرتا دھرتا ہے اور کراچی میں رہتا ہے۔ جب کبھی شکیل لاہور آتا ہے وہ بچوں کو تثنیہ کی طرف بھیج دیتا ہے۔ یہ وقت بچاری ماں بیٹیوں پر قیامت کا گزرتا ہے۔ بچوں کی آمدان کی روانگی کے خوف میں بھسم ہو جاتی ہے۔

جب سے یہ حالات ہوئے ٹویلد اور انہیں نے نینی کا بہت ساتھ دیا۔ میری بہو ٹویلد کو Underdog سے عشق ہے۔ وہ ٹوٹ کر ایسے لوگوں سے محبت کرتی ہے جن کو زندگی اور زندگی کے فیصلوں نے دعا دیا ہو..... گویا وہ سردھڑ کی بازی لگا کر اللہ کو قرض حسد دینے پر تمل جاتی ہے۔

لیکن زندگی اونچ نیچ کا نام ہے..... جب سے خاں صاحب اس جہاں سے سدھارے اُس سے کچھ دیر پہلے نچے چھٹم چھٹا ہو گئی۔ اب شکیل سے رابطہ ضرور قائم ہے لیکن دوسری پارٹی سے ایسی صورت میں ووٹ کی امید نہیں کیونکہ کوئی بھی ایسے فریقین کا ساتھ نہیں بن سکتا جن میں اینٹ کتے کا میر ہو۔

حالات اتنے مخدوش ہونے کے باوجود علی کے ساتھ رشتہ برقرار ہے۔ اُسے امریکہ میں اہلی بھائی اور غریب بھائی کا سہارا ہے۔ پاکستان آیا تو ہم سے مل کر گیا۔ ہم وہاں گئے تو ایک دن کے لیے اُس کے گھر رہے۔ اُن دونوں نے ہمیں پریت سے رکھا..... اب اتنے سال گزر جانے کے بعد یہ خط شکور عالم لائے ہیں۔ شکور عالم نیویارک میں ایک ٹریڈ ایجنسی چلاتے ہیں اور ہمارے بہت کام آتے ہیں۔ علی کا خط انگریزی میں تھا۔ شکور عالم نے اس کا ترجمہ کر کے مجھے پکڑ لیا ہے۔ نینی کا خاندان محبت کا اسیر ہے۔ خط ملاحظہ کیجئے:

پیاری بانو آنٹی!

یقین کریں مجھے لگتا ہے کہ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ان دو لفظوں ”بانو آنٹی“ نے میری زبان کو چھو لیا۔ میرے دماغ کو وسعت اور دل کو محبت کی گرمی سے روشناس کیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ دل کا تعلق جسمانی قرب، قلم کی بہترین تحریر یا دور حاضر کی موثر ترین برقی ایجاوٹ سے مرہون منت نہیں ہوتا۔

اپنے پیاروں کی یاد خیالات کی جنت کا ایک خوبصورت پھول ہے۔ جتنا اس کی گہرائی میں اتریں اتنی ہی خوشبو اور سرور اُتنا ہی بڑھتا چلا جائے گا۔

اس سے پہلے کہ ہمیں اپنے وجود کا اس کے تعلق کے حوالے سے ادراک ہو یا دوں کی یہ بہشت ایک بہت حسنی پھول میں ڈھل جاتی ہے۔

کل کی بات لگتی ہے کہ پچیس سال پہلے آپ نے مجھ جیسے از خود رفتہ بھنگے ہوئے نوجوان کو ماں کی پُرسکون آنکھوں سے روشناس کرایا۔ آپ کی محبت کسی بھی غرض و عنایت یا میری استطاعت سے مبرا تھی۔ آپ کی کشادہ دلی ابد اور ہمیشہ کے

تو دسے آزاد تھی۔ نہ جانے مجھ ایسے کتنے ہی علی آپ کی چوکھٹ پر پہنچے اور آپ نے سب کو بلا تخصیص اپنی سب سے قیمتی متاع یعنی وقت سے نوازا۔

لیکن آنٹی! آپ مانیں یا نہ مانیں آپ کے عطا کیے ہوئے اُس وقت سے فی الحقیقت ہم سب نے سکونِ دل کی وہ دولت حاصل کی جس کی ہر ایک کو تلاش رہی ہے۔ ہم کہ خود اپنے ہی دشمن بن چکے تھے ہمارے لیے روح و قلب کی بے چینی کا مداوا اگر کہیں تھا تو صرف اور صرف C-121 ماڈل ٹاؤن میں تھا۔

آپ کی توجہ اور محبت نے اس احساس کو جنم دیا کہ اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود دنیا بھر میں ایک اور صرف ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہم جیسے اپنی ذات کی کمیٹیوں سے آلودہ بھٹکے ہوئے لوگوں کو ایک ماں کی محبت بھری آغوش اور ایک باپ کی شفقت ہمہ وقت منتظر ہے۔ جہاں ہمارا دکھ نہ صرف سنا جائے، کوئی تنقید نہ ہو بلکہ گاہے گاہے ہمارے درد کی آگ کو آپ اپنے آنسوؤں کی ٹھنڈ سے سرد کر دیں۔

ہماری بے سرو پا اور بے ٹکی داستانوں کو پوری توجہ سے سنا اور سمجھا جائے۔ اپنی ہی تلاش میں سرگرداں ہم جیسے گم کردہ راہ لوگوں کے لیے آپ کا گھر زندگی کے لوق ووق صحرا میں پُر سکون سائے اور ٹھنڈے پانیوں کا سرچشمہ ثابت ہوتا تھا۔

اس کے علاوہ مجھے ذاتی طور پر جن انعامات سے نوازا گیا اُن میں انکل اشفاق کی شفقت کے علاوہ نانا، نوکی بھائی، کیسی بھائی، سیری، جونی، بہن، ثولید، جانو بھائی، رفیق بھائی، غفار بھائی اور ثار بھائی کی لازوال محبت کی یاد میرے لیے سرمایہ افتخار ہے۔

مجھے یہ سوچ کر حیرت ہوتی ہے کہ میں آپ کے گھر میں کس طرح آزادی سے گھوما کرتا تھا۔ اس سے بھی تعجب کی بات یہ کہ آپ مجھے اس کی بخوشی اجازت دے دیتے تھے۔ انکل اشفاق اور بانو آنٹی کے گھر میں مجھے اپنائیت کا جو احساس ہوا وہ میری زندگی کا سب سے قیمتی اثاثہ بن چکا ہے۔

اگر شعوری طور پر نہیں تو میرے لاشعور میں علم و دانش کا وہ خزانہ ہمہ وقت موجود ہے جو میں نے آپ کے ہاں چاروں طرف بکھری کتابوں اور اُن سے باہر انکل اشفاق، مفتی جی، جناب واصف علی واصف اور ان سب کے سُرخیل مردِ ابرہہ، جناب قدرت اللہ شہاب کی پُر کیف گفتگو اور محبت سے اپنے اندر جذب کیا۔

اس عظیم سرمائے کی بدولت آج گیارہ سال گزرنے کے بعد میں اس قابل ہوں کہ اپنے اندر بھرے ہوئے ذنیابی کچرے کے ڈھیروں کو نکال سکوں۔ بلاشبہ آپ کے گھر کا نام ”داستان سرائے“ کا سب سے خوش رنگ خوبصورت اور خوشبودار پھول ہیں، وہ سب خوش نصیب لوگ جن کو آپ سے ماں کی آغوش اور محبت نصیب ہوئی۔ آج بھی آپ کی لازوال قربت کی مٹھاس اور خوشبو اپنے دلوں میں لیے پھرتے ہیں۔

اُس وقت میں نے متعدد ایسی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی تھی جو فی الحقیقت میرے لیے از حد مفید ثابت ہو سکتی تھیں نہ مجھے اس بات ہی کا ادراک تھا کہ جہاں میں زندگی کی وقتی اور ناپائیدار عیاشیوں میں مبتلا تھا۔ میرا دل ایک دوسرے ہی تجربے سے گزر رہا تھا۔ گویا اس دوران وہ اندر ہی اندر آبِ حیات کے لازوال چشمے سے سیراب ہو رہا تھا جو اُن تمام

عظیم ہستیوں کے فیض سے تھا جو داستانِ سرائے سے منسلک تھیں۔

اس کے بعد میری روح ایک طویل عرصے تک نیم جان سی رہی، لیکن اُس گوشہ عافیت سے دُور ہو کر میری زندگی پھر ایک نئی راہ پر گامزن ہو گئی۔ خدا کا شکر کہ اس طویل عرصے اور دُوری کے باوجود اب حیات کا وہ چشمہ جو آپ کا عطا کردہ تھا، مکمل طور پر خشک نہیں ہوا تھا۔

دراصل اس کا ذریعہ تھا زاویہ، کھیل تماشا، مردِ ابریشم، شہاب نامہ، البیک، تلاش اور میری خوش بختی پیارے نوکی بھائی سے مسلسل قرب اور رابطہ۔ اس فہرست میں اور کتنے ایسے نام بھی ہیں جن سے تعلق محض اس احساس کے ذریعے تھا کہ اُن سے گفتگو، تعلقات اُن کی خاموشی میں بھی مجھے مادرانی کیفیت کی خوشبو محسوس ہوئی۔ اُن کے ذریعے مجھے اُن راستوں کا ادراک ہوا جن پر چلنے کی مجھے خواہش تھی اور اگر قسمت نے ساتھ دیا تو گا مزن بھی ہو سکوں۔

مجھے یقین ہے کہ وہ دُعا کیں جو عرصہ پہلے مجھے داستانِ سرائے سے ملی تھیں میری محافظ بنی رہیں اور بالآخر مجھے اس آبِ حیات سے روشناس کر دیا۔

ان تمام عنایات کے لیے میرادل کی گہرائیوں سے شکر یہ اور پیغامِ محبت قبول کیجئے۔
اپنا دھیان رکھیے گا۔

علی

ڈیر آئی بانو!

میں ہر وقت آپ کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں میرے لیے آپ نے کیا کچھ نہیں کیا۔ میری رہنمائی کی۔ دوپٹا اوڑھے آپ کا دلنشین چہرہ ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے رہتا ہے۔

میرے لیے ماڈل ٹاؤن میں جنت اور دوزخ دونوں ہی موجود تھے۔ جنت صرف وہاں تھی جہاں آپ کا اشفاق انگل میرے رہتے تھے۔

آپ سے جدا ہونے سے پہلے مجھے اس بات کا بالکل علم نہیں تھا کہ علم و ادب کی دنیا خصوصاً پاکستان میں آپ کا کتنا بڑا مقام ہے۔

میں یہ سوچ کر حیران ہوتی ہوں کہ مجھ جیسی ناچیز اور بے علم ہستی کو آپ کیوں کر اپنے سایہ عافیت اور حفاظت میں رکھتی تھیں۔ اس کے لیے میرادل ہمیشہ آپ کا احسان مند رہے گا۔ یہ آپ کے عطا کردہ پند و نصائح ہی تھے کہ آج میں ایک خوش نصیب بیوی اور ماں بن چکی ہوں۔

آپ نے مجھے سادگی کا درس دیا۔ آپ ہی کے طفیل میں اپنے شریک حیات کی حقیقی قربت سے فیضیاب ہوئی۔ یہ آپ ہی تھیں جنہوں نے مجھے محض ایک جمعدارنی سے وہ کچھ بنا دیا جو میں آج ہوں۔ یوں مجھے اپنے خاوند سے تعہدات مضبوط کرنے میں مدد ملی۔

عمیر نے پچھلے دنوں مجھے آپ کی کتاب ”مردِ ابریشم“ سے وہ اقتباس پڑھ کر سنائے جو دراصل میری ہی کہانی

تھی۔ آپ کے قلم نے اُسے جو ندرت عطا کی اُس کا احساس مجھ پر کچی طاری کر دیتا ہے۔
 میں جتنے سال بھی پاکستان میں رہی سو جیتی ہوں کہ نہ میرا کوئی دوست تھا نہ ہمدرد لوگوں میں صرف اس لیے قابل
 قبول تھی کہ میں علی کی بیوی تھی۔ یہ خیال میرے لیے سوہانِ روح سے کم نہ تھا۔ لیکن پھر آپ اور انکل اشفاق میرے والدین
 بن گئے۔ مجھ میں اعتماد پیدا کیا اور قدم قدم پر میری رہنمائی کی۔ آپ میرے خیر خواہ بنے اور یوں میرا سب کچھ بن گئے۔
 میں زندگی بھر آپ دونوں کے لیے نہ تو اپنی محبت کا اظہار کر سکوں گی اور نہ آپ کے ان گنت احسانات کے
 بوجھ ہی سے نکل پاؤں گی۔
 میں دل کی گہرائیوں سے آپ سے پیار کرتی ہوں۔

محبت کے ساتھ

ہاروی

یہ صفحات میں نے رہنمائی کے دو اصولوں کے پیش نظر تحریر کیے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ محبت دو طرح سے
 زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ محبت کرنے والا اگر دکھاوے کی محبت بھی کرتا ہو وہ اپنی شہنی برتری اور انا کی خاطر بھی محبت کا
 ڈھونگ رچاتا ہو تو بھی اس محبت کا اجر اُسے زیادہ ملتا ہے اور یہ سودا بھی جس میں نیت کی خرابی ہوتی ہے نفع کا باعث بنتا
 ہے۔ کبھی واپسی میں گھالے کا امکان نہیں۔

دوسری محبت جو اللہ کی مہربانی سے بابالوک خاص کر اور کوئی کوئی خوش نصیب عام طور پر کرنے کے قابل ہو جاتا
 ہے۔ ایسی محبت کا اجر خود اس انسان کی کیمیاگری میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اُس کی شخصیت میں محبت دینے کی بدولت ایک
 سدا بہار فرحت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ پُر امید زندگی پر بھروسہ کرنے والا مشکلات سے نہ گھبرانے والی روح میں تبدیل
 ہو جاتا ہے۔ اُس کی شخصیت 'توانائی' تقویت اور استقامت کا سرچشمہ بن جاتی ہے۔

ایسی دینے والی محبت عموماً ماں کے رُوپ میں دیکھنے کو ملتی ہے جو ایثارِ قربانی اور خدمت کا مظہر ہوتی ہے۔ لیکن
 کسی پر احسان نہیں دھرتی۔ ایسی محبت کا رُوپ اُس باپ کی صورت میں بھی نظر آتا ہے جو ساری عمر جو تیاں چٹاتا، محنتیں
 کرتا، بچوں کی خواہشات پر قربان ہوتا اور بیوی کی مشکلات کے آگے ڈھال بنا رہتا ہے۔

ایسا مرد بھی شجاعت، روحانیت اور استقامت کی تصویر بن جاتا ہے اور لوگ مدتوں اس مثالی رول ماڈل کو یاد
 رکھتے ہیں اور اپنی اولاد کو اُس کی مثال دے دے کر راستے کا تعین کرتے رہتے ہیں۔ محبت ہی ایک ایسا جذبہ ہے جسے آپ
 آزما کر تو دیکھیں۔ آزمانا شرط ہے۔ میں نے تو نمئی اور اُس کے گھرانے کو یہ نسخہ برتتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے!

نور الحسن

جس شخص کا ٹیلی ویژن سے چھوٹا سا بھی رابطہ ہے، وہ نور الحسن کی شخصیت سے بخوبی نہیں تو سرسری طور پر ضرور
 واقف ہوگا، لیکن میں نے اس نوجوان کو ذرا مختلف انداز میں جانا ہے۔ خاں صاحب سے اُن کی زندگی میں ملنا ہا لیکن میں

نے اُسے نہیں دیکھا۔ جونہی خاں صاحب اپنے گھر سدھارے، نورالحسن گر بہ پائی سے داستان سرائے کی طرف بڑھنے لگا۔ ہمارے برآمدے میں ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلتا ہے، ساتھ ہی اس کمرے کی دیوار کچھ آگے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ دیوار نورالحسن کی ٹیک تھی۔ وہ پتہ نہیں کیسے اور کب آجاتا، اس دیوار سے لگ کر لڑکیوں کی طرح رویا کرتا۔ ویسے بھی نورالحسن میں کم عمر لڑکیوں جیسی لجاجت اور حیا ہے..... مجھے یہ تو کبھی تو مفتی نہ ہوئی کہ میں نورالحسن کے پاس بیٹھتی اور اُس سے رابطہ قائم کر لیتی..... لیکن اشیر احمد جو روز باپ کی قبر پر جاتے اور باپ کو بلاتے رہتے تھے، انہوں نے نور کو پہچان لیا۔ اس دور میں جب باپ کو بھلانا مشکل تھا، نور اور عکسی نے اشیر کے دل لگانے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ عکسی مفتی ہر بیٹے لاکھ آتے اور اشیر کے ساتھ لگ کر اُس کا سراپے بازو پر رکھ کر سوتے..... نورالحسن نیچے قالین پر بیٹھ کر اشیر خاں کے پلنگ کے ساتھ جڑ کر اپنی پشت کو پلنگ سے ٹیک لگا کر بارہ بارہ بیچ تک بغیر ہمدردی جنائے دوستی کا دم بھرے بغیر نکلے رہتے۔ ایسے مہربان زندگی کے زخموں پر پھاہار کھنے کی بڑی اہلیت رکھتے ہیں۔

وہ گھر میں بڑی عاجزی اور انکساری سے داخل ہوتا اور ہاتھ جوڑے کندھے سکڑے رات کے اندھیرے میں غائب ہو جاتا۔ میں ابھی نور کی شناخت سے محروم تھی۔ پھر ایک واقعہ ہو گیا۔ عموماً تبدیلیاں لانے والے چھوٹے بڑے واقعات ہی ہوا کرتے ہیں۔ پی ٹی وی نے اپنی چھیالیسویں سالگرہ کا فنکشن اسلام آباد میں منایا۔ مجھے خاں صاحب کا ایوارڈ لینے جانا تھا۔ فرخ بشیر نے میرے ساتھ میرے قیام و طعام کا بندوبست میریٹ میں کر رکھا تھا۔ چونکہ میں اُن دنوں بیمار تھی اس لیے میرے ساتھ اشیر بیٹے کی ٹکٹ اور رہنے کا انتظام بھی فرخ بشیر نے کیا۔

ہم دونوں ہوائی جہاز سے اسلام آباد پہنچے اور سیدھا عکسی مفتی کے گھر پہنچے۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی بہت ضروری میٹنگ کے سلسلے میں لاہور چلے گئے ہیں۔ ہماری دیکھ رکھ کی ذمہ داری وہ بی بی انیب اور روبینہ کو سونپ گئے تھے لیکن اشیر خاں نے واپس لاہور پہنچنے کو ترجیح دی اور مجھے بھی یہ مشورہ دیا کہ میں ہوٹل جا کر بسرام کروں اور اُن دونوں خواتین کو بلا وجہ پورنہ کروں۔ اس تبدیلی کا پروگرام بنانے کے لیے اشیر خاں نے اپنے نورالحسن کو فون کیا کہ وہ میرے ساتھ ہوٹل کے ڈبیل میں رہے۔ مجھے پروگرام کے وقت conduct کرے اور سارا وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہے۔ اشیر بیٹے نے مجھے ہوٹل میں چھوڑا اور خود ایئر پورٹ سدھارا۔ اب میں ایک اغوا شدہ بیچے کی طرح نورالحسن کی تحویل میں تھی۔ ہوٹل میں پہنچ کر نور نے مجھ سے کہا ”اگر آپ چاہیں تو میں روبینہ یا پھر انیب کو آپ کے پاس چھوڑ سکتا ہوں۔ مجھے بھی پی ٹی وی والوں نے مدعو کر رکھا ہے۔ میں آپ کے آس پاس ہی منڈلاؤں گا۔“

میں نے کچھ لمبے سوچ میں گزارے۔ انیب بیگم عکسی مفتی کی ماتحت ہیں اور لوک ورڈ میں ”دستان شہابیہ“ کی ساری تزئین و آرائش کی انچارج ہیں۔ دو ایک بار وہ عکسی کے ساتھ ہمارے ہاں ٹھہر چکی تھی لیکن میں نے اُسے اس ایکسٹرا ڈیوٹی پر بلانا مناسب نہ سمجھا۔

روبینہ خالد مشہور و معروف رؤف خالد کی اہلیہ ہیں، لیکن اس کے علاوہ اُس کی سب سے بڑی خوبی اُس کی فرسٹ اور سخاوت ہے۔ وہ اپنی ذاتی دولت کو اس خندہ پیشانی سے دوسروں پر لٹاتی ہے کہ حیرت ہوتی ہے..... میں نے سوچا وہ میرے پاس تحفوں سے لدی پھندی آئے گی اور میں اُس کی عنایات کا سوائے زبانی شکر یہ کرنے کے اور کچھ نہ کر سکوں گی اس لیے

نے نور سے کہا..... ”بھائی! تم اُن دونوں کو رہنے دو۔ ہم دونوں ایک رات ایک دوسرے کی کمپنی کوز ہر مار کر لیں گے۔“
 نور اپنی عاجزی اور انکساری کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔ جھٹ میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر
 بولا..... ”ماں جی! میرے لیے تو یہ بہت بڑا اعزاز ہے جس کے متعلق میرے بچے بھی بڑے ہو کر شیخی مارا کریں گے لیکن
 مجھے معلوم ہے آپ کبھی کسی اجنبی کے ساتھ یوں رہی نہیں۔ کہیں آپ کے لیے مشکل نہ ہو
 اب میں نے جھوٹ بولا..... ”ناں بھئی نور! تم میرے لیے اجنبی نہیں ہو..... ایشیر کا کوئی دوست میرے لیے کیسے
 اجنبی ہو سکتا ہے؟“

نور اُلحس اُس کی بیوی صائمہ بیٹی اویس اور خالد ہمارے ہاں آتے جاتے تھے۔ صائمہ نے ایشیر احمد کو اپنا بھائی
 بنا رکھا تھا۔ جب بھی وہ آتی عموماً دوسری منزل پر یہ دونوں چلے جاتے۔ ایشیر بچوں کو پا کر نہال ہو جاتا۔ اُن کے ساتھ کھیلتا۔
 انہیں ٹافیاں لیمن ڈراپ دیتا۔ نور تو میرے قریب اس قدر نہ آ سکا لیکن صائمہ واقعی بیٹی بن گئی..... لیکن پی ٹی وی کے فنکشن
 کے بعد نور بھی گھر کا فرد بن گیا۔

فنکشن ہوٹل کے ہال میں تھا۔ بالکل سامنے مغرب کی طرف پشت کیسے سٹیج تھا۔ اس پر فرخ بشیر اور حج صاحبان
 رونق افروز تھے۔ دائیں بائیں میڑھیاں تھیں جن پر سے انعام لینے والوں کو اوپر جانا تھا۔ سٹیج کے دائیں جانب اُن لوگوں
 کے ڈیسک لگے تھے جن کو انعام حاصل کرنا تھا اور سامنے قطار در قطار ملک کے وی آئی ٹی پریس کے نمائندے صحافی دنیا
 کے جغادری، مقبول اور معروف ایکٹر پروڈیوسر ڈائریکٹرز بیٹھے تھے۔ پھر اسلام آباد کے لوگ جو فنکشن شروع ہونے کے
 بعد تک آتے رہے۔

نور مجھے ہوٹل کے کمرے سے نیچے لایا۔ اُس نے مجھے صاحب لوگوں کی طرح بازو کا سہارا پیش کر رکھا تھا۔ میں
 اُس کا بازو اور ہاتھ تھا مے اپنی سیٹ پر بیٹھی تو وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ جب میں خاں صاحب کا لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ
 لینے گئی تو وہ مجھے سہارا دیے سٹیج تک لے گیا۔
 فنکشن بہت لیٹ ہو گیا۔

جب فنکشن ختم ہوا تو ہم ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں پہنچے۔ پتہ چلا کہ جو کوپن ہمیں دیے گئے تھے وہ تو نوبے تک
 Valid تھے۔ اس کے بعد ہوٹل ہمارے طعام کا ذمہ دار نہ تھا۔ میں تو شاید مارے شرم کے بھوکی سو جاتی۔ یہاں پھر نور اُلحس
 نے کاؤنٹر پر جا کر کھانا آرڈر کیا اور اُس کا بل بھی خود ہی چکا یا۔

مجھے فکر تھی کہ میں شوگر کی وجہ سے بار بار غسٹخانے جاتی ہوں نور تو میری وجہ سے بار بار جاگے گا، لیکن اُس رات
 مجھے پتہ چلا کہ نور اُلحس تو بچوں کی طرح سوتا ہے۔ کوئی کھڑا دھڑکا اُسے نہیں جگاتا۔ فجر کی اذان ہوٹل کے بالکل قریب ہی
 کسی مسجد سے آئی تو میں نے خدا کا شکر کرنے کی غرض سے کمرے میں بیٹھ کر نماز پڑھی۔ کئی بار کھانسی پانی کے استعمال کے
 بعد میرا معمول ہے کہ بہت ساری چھینکیں میرا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ نور گھوڑے بیچ کر سویا رہا۔

پھر دن چڑھے ہمیں پی ٹی وی کی وین ایئرپورٹ چھوڑ گئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ اتنی ساری میڑھیاں کیونکر
 چڑھوں گی۔ اس وقت بھی نور ہی آڑے آیا اور قریباً اٹھا کر اوپر اکونومی کلاس میں لا بٹھایا۔ مجھے کھڑکی والی نشست پر بٹھایا

اور خود درمیان والی سیٹ پر سٹکر کر بیٹھا۔ گھر آ کر اُس نے ہمیشہ کی طرح گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر اجازت چاہی۔ اس کے بعد پھر اشیر کا حلقہ بگوش بن گیا۔

لیکن رات کے قیام اور ساتھ نے نور کو گھر کا ایک فرد بنا دیا..... اب وہ اور صائمہ باقی بچوں کی طرح میری توجہ کے مطلوب بن گئے ہیں۔ صائمہ اچھے اچھے کھانے پکا کر، اشیر خاں کی بیٹی زینب (مونو) کے لیے کپڑے ڈیزائن کرتی اور سونچتی ہے۔ دعوتوں پر باورچی خانے میں ہاتھ بٹاتی اور کام کرتی ہے۔ نور جتنی بار میں کمرے میں داخل ہونے کا اُسے چانس دوں۔ کھڑا ہو جاتا اور اُس وقت تک کھڑا رہتا ہے جب تک میں بیٹھ نہ جاؤں..... ڈیروں پر ایسے لوگ ملا کرتے تھے جن کے لیے ادب آداب کا یہی طریق کار تھا، لیکن ہمارے شرفاء میں یہ مبالغہ آمیز اٹھک بیٹھک خوشامد پر محمول کی جاتی ہے۔

میں ایک نتیجے پر پہنچی ہوں کہ محبت کے اظہار میں اپنی جان کو تکلیف دینا کچھ آسان سا کام نہیں..... لیکن سوچتی ہوں کہ ماسٹر آف Ceremonies بننا بھی تو کوئی عام پروفیشن نہیں..... یہ بھی تو اپنے آپ کو کمتر بنا کر دوسرے انسان کی صلاحیتوں کو تاج پہنانے کا ہی کام ہے..... البتہ کچھ کمپیئر ایسے منہ زورے اور شہ زورے بھی دیکھے ہیں جو اپنے مہمان کو کٹہرے میں کھڑا کر کے اُسے مجرم صورت بھی پیش کر دیتے ہیں۔

(نور الحسن نے ٹیلی ویژن کے لیے ایک پروگرام کیا جس میں چار روولیش محمد بیگی خاں، عکسی مفتی اور میں شامل ہوئے۔ جو کچھ میں نے عرض کیا پیش خدمت ہے)

اشفاق صاحب بڑی تخلیقی قوتوں کے مالک تھے۔ اُن کی رنگا رنگ تخلیق کاری نے عجب گل کھلائے۔ انھیں چھوٹے سے تھے تو انہوں نے ایک رسالہ نکالا۔ اسے وہ خود ہی لکھتے، اس کی کاپیاں بناتے اور مکتبہ کے سکول میں جماعت دوستوں میں بانٹ دیتے۔

پاکستان پہنچ کر جب انہوں نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تو ایم اے اُردو کے دوران ہی اُن کی پہلی کتاب "محبت سوافسانے" آگئی۔ ایم اے کرنے کے بعد وہ روم چلے گئے۔ واپسی پر خاں صاحب نے جلد ہی تلقین شاہ لکھنا شروع کیا جو پورے 39 سال آن ایئر گیا۔ لیکن اُن کی تخلیقی قوتیں تلقین شاہ کی سرحدوں کو پار کر گئیں۔ پہلے خاں صاحب نے ریڈیو ڈرامے لکھے پھر جونہی ٹیلی ویژن 1965ء میں ہماری زندگی کا حصہ بنا، انہوں نے اس میڈیا کو اپنا لیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے بڑی عمدہ کمپیئرنگ کی۔ ٹیلی ویژن کے افتتاحی پروگرام کی کمپیئرنگ کا سہرا اُن ہی کے سر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے موسیقی سے گہری دلچسپی نے "نکھار" جیسے پروگرام دیئے..... "زاویہ" سے تو آپ کی ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خاں صاحب کی ہر دل عزیز کی مختلف طبقتوں میں اتنی ہی رنگارنگ ہے جس قدر ان کی شخصیت..... جو پڑھے لکھے افسانے سے دلچسپی رکھتے ہیں وہ چاہتے تھے کہ خاں صاحب صرف افسانے لکھیں۔ وہ بھی "اُجلے پھول" اور "ایک محبت سوافسانے" جیسے۔ "صحانے افسانے" سے انہیں کوئی سروکار نہ تھا۔

جنہیں تلقین شاہ سے عشق تھا وہ انہیں کسی اور روپ میں دیکھنا نہ چاہتے تھے۔ البتہ "زاویہ" دُور دُور پھیلنے والا ایکٹروٹک میڈیا ہونے کی وجہ سے اس کی پذیرائی بھی زیادہ ہوئی۔ میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ہر چاہنے والا اپنی پسند کا

ہو کر مُصر تھا کہ صرف وہی ٹھیک ہے۔

لیکن آج تین سال گزر جانے کے بعد مجھ پر یہ بھید کھلا کہ خاں صاحب سے اُن کے چاہنے والوں کی وابستگی کم نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ قارئین ناظرین کی محبت ہے۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جو کسی کے عمل سے وابستہ نہیں ہوتا۔ اچھائی، برائی، کمی بیشی، اونچ نیچ محبت کے سامنے بے معنی ہے۔ محبت کو غالباً اسی لیے خدا کا سب سے بڑا رُپ کہا جاتا ہے۔ محبت کرنے والا محبوب کی خرابیاں نہیں دیکھ پاتا بلکہ اُن کو اپنی خرابیوں کی طرح قبول کر لیتا ہے۔

ڈیروں پر اسی محبت کا مظہر نظر آتا ہے اور خاں صاحب غالباً اسی محبت کی تلاش میں بابوں کے پاس آنے جانے لگے تھے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگ محبت نہیں کر سکتے۔ انہیں اپنی ذہانت پر زیادہ مان ہوتا ہے۔ وہ دوسروں میں کیڑے نکال کر کسی اور کا قد چھوٹا کر کے، کسی دوسرے کی خوبیوں میں خرابی کا پہلو نکال کر اپنی کلا جگاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ خاں صاحب فرشتہ تھے۔ اُن میں یقیناً انسان ہونے کے ناتے خوبی اور خرابی دونوں کے دریا ساتھ ساتھ بہتے ہوں گے۔ یقیناً اُن میں حب مال اور حب جاہ کی طلب ہوگی۔ لیکن وہ کسی صوفی کی طرح جہادِ نفس میں مبتلا رہتے تھے حصولِ نفس میں نہیں۔ اُن کی زندگی میں ضروریات کو کچھ بھی جھل کر دہکا نا ضروری نہیں۔ بھڑکی ہوئی آگ کو بجھانا اہم تھا۔

لیکن لوگوں کی محبت کے کیا کہنے۔ آج بھی تین سال گزر جانے کے بعد بھی لوگ اُن کی بشریت پر دھیان نہیں دیتے بلکہ انہیں ایک بہت بڑا آدمی، برگزیدہ صوفی، ایک انمول ادیب سمجھتے ہیں۔ نکتہ چیں لوگ اور محبتی مہربان سب خاں صاحب کی بہتری چاہتے ہیں۔ صرف طریقہ واردات مختلف ہے۔ مہربان لوگوں کا رویہ ماں کی طرح ستر پوشی کا ہے۔ عیب و عیوہ نہ دینے والے سچ کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔

پتہ نہیں خاں صاحب ان دونوں کا احسان کیسے اُتار پائیں گے۔ اتنے فاصلے کیسے طے کریں گے؟

مجیب الرحمن شامی + چودھری سردار محمد + حمید صاحب

ڈرائنگ روم کچھ کچھ زاویے کا رُپ دھارنے کی کوشش میں تھا۔ کچھ لوگ خاں صاحب سے ملنے وقتاً فوقتاً آنے لگے تھے۔ ان میں مجیب الرحمن شامی، چودھری سردار محمد اور حمید صاحب عموماً اکٹھے آتے۔ میں ان کی صورتوں سے بھی واقف نہ تھی، لیکن ان کے آنے پر خاں صاحب خاص طور پر اندر آ کر کہتے:

”قدسیہ گو بھی کے پکوڑے بنا دو..... لیکن کسی اور کو تکلیف نہ دینا۔ یہ تم ہی کو پکانے ہیں۔“

یہ بڑے پُر تکلف دن تھے..... امیری اور غربی ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اسراف سے پرہیز اور فراخ دلی سے

خرچ کرنے کا حوصلہ پیدا ہو رہا تھا۔

کبھی کبھی میں درمیانی دروازے تک پہنچ کر سنتی تو اندر سے تعریف کے ڈونگرے برستے سنائی دیتے۔ ان میں سب سے اُونچی آواز شامی صاحب کی ہوتی۔ سردار صاحب پولی آواز میں ہاں سے ہاں ملا دیتے۔ کبھی کبھی ان کے جانے کے بعد خاں صاحب مجھ سے کہتے:

”قدسیہ! اگر کبھی تمہیں ان پر کچھ لکھنے کی حاجت پیش آئے تو اجتناب کرنا۔ یہ تم سے بڑے لکھاری اور بڑے انسان ہیں۔ میرا ان سے کتنا ہی سیاسی اختلاف کیوں نہ ہو میں ان کی بڑائی سے منکر نہیں ہو سکتا۔“

شاید اسی تنبیہ کی وجہ سے میں نے کبھی سردار صاحب کی کتابوں پر قلم نہیں اٹھایا۔

مجیب الرحمن شامی

اب مجیب صاحب کا اپنا اخبار ہے۔ اُن کا بڑا نام ہے۔ جلد ہی آپ کو یہ اطلاع بھی ملے گی کہ ٹی وی پر ”پاکستان“ چینل کھل گیا ہے۔ اُن کا منجھلا بیٹا عمر شامی اخبار میں اُن کے ساتھ سب ایڈیٹر کے طور پر بڑی شہرت کما رہا ہے۔ بڑا بیٹا علی سافٹ ویئر کا اپنا کام کرتا ہے اور بیٹی کینیڈا کالج میں پڑھانے کے بعد یونیورسٹی میں پروفیسر ہے۔ سب اپنے اپنے مقام پر مضبوطی سے مجیب الرحمن شامی کا کام اور نام روشن کر رہے ہیں۔

چودھری سردار محمد

سردار صاحب کے بیٹے ہارون جو بینک آف پنجاب میں جنرل منیجر ہیں، انہیں بارہا فون کیا کہ سردار صاحب کے کوئی بائیوڈیٹا اُن کا کوئی شناختی مضمون بھجوائے لیکن اُن کی طرف سے چپ رہی۔ پھر میں نے ایڈن ولہ میں سید امجد حسین سے فون کیے کہ سردار صاحب کی بیٹی انجم جو اس وقت اسپتال کی رکن ہیں اور سید امجد حسین کی اہلیہ ہیں، میری رہنمائی کے لیے کچھ لکھ دیں۔ لیکن رفتار کا زمانہ ہے۔ لوگ اپنے اپنے کاموں میں اس طرح مصروف ہیں کہ سر کھجانے کی فرصت نہیں۔

حمید صاحب

ان دونوں کے ہمراہ حمید صاحب تیسرے نمبر پر تھے۔ قد میں سب سے لمبے گفتگو میں آخری نمبر پر اور ان کی تعریف کرنے میں صفر تھے۔ وہ کسی سافٹ ویئر کمپنی کو چلاتے تھے۔ مجھے خاں صاحب نے اُن کے متعلق کم کم ہی بتایا تھا۔ لیے کچھ گوش گزار نہیں کر سکتی۔

مسعود میاں

قریباً 1985ء یا 1986ء کا ذکر ہے کہ ایک لڑکا نما شخص مجھے ملنے آیا۔ میں نے اُسے بار بار پوچھا کہ کہیں خاں صاحب سے تو نہیں ملنا، لیکن اُس نے لجاجت سے کہا..... ”جی نہیں! مجھے آپ ہی سے ملنا ہے۔“

اس مبارک شکل نوجوان سے میں نے بات ختم کرنے کی غرض سے سوال کیا..... ”کوئی کام؟“

”جی نہیں کوئی کام نہیں۔“

مجیب سی بات ہے کہ آج 2008ء آ پہنچا، مسعود سے رابطہ قائم ہے لیکن اُس نے نہ کبھی کوئی فرمائش کی نہ کبھی چیز ہی مانگی..... یہ ضرور اضافہ ہوا کہ اب وہ السر کا مریض ہے۔ ڈپریشن اُس کا ساتھی بن گیا ہے اور اُس کی آنکھیں سب سے اعتماد اور خوشی کے بجائے اُداسی اور حیرانی کی سی کیفیت رہتی ہے جیسے وہ کسی سے پوچھنا چاہے کہ آخر میں نے کیا کیا ہے جس کی یہ سزا ہے۔ میرا قصور کیا ہے؟

آج کے عہد میں یہ سوال بیشتر نوجوان پوچھ رہے ہیں۔ مسئلہ سارا شوق کی بلندی اور ہمتوں کی پستی میں مضمر ہے۔ انہیں دنیاوی ترقی اور کامیابی کا وہ مقام درکار ہے جس کو حاصل کرنے میں ایک عمر لگتی ہے۔ تیز رفتاری کے اس نئے میں اتنا لمبا انتظار ذہنی طور پر تھکا دیتا ہے۔ کبھی وہ بابوں کے ڈیروں پر دنیاوی ترقی کا تعویذ لینے جاتے ہیں۔ کبھی شہیر کے دروازے کھٹکھٹاتے اور بے نیل و مرام واپس لوٹ جاتے ہیں۔

مسعود اُس وقت Disillusioned نہیں تھا۔

میں نے اُس سے اُس کا حدود اور بوجہ پوچھا تو اُس نے لجاجت سے کہا..... ”والد صاحب نیشنل بینک میں چیف ایگزیکٹو ہیں اور کچھ ٹھیکے پر زمینداری ہے۔ اللہ کی بڑی مہربانی ہے۔“
میں نے کہا..... ”مسعود میاں! یہ کیا بات ہے کہ جو بھی بہاول نگر سے آتا ہے ہمیشہ اللہ کا شکر بجالاتا ہے۔ کیا یہ بابوں کے بابوں کا اثر ہے۔ بہاء الدین ذکر کیا وہاں کی مٹی میں قناعت کا بیج بو گئے ہیں کہ وہاں کے حاکم انصاف کو اس طرح نلتے رہے ہیں کہ لوگوں میں شکایت کی گنجائش پیدا نہیں ہوتی؟“

”یہ تو جی آپ کے سوچنے کی باتیں ہیں۔ ہم تو فی الحال فکر و فاقے سے آزاد و موزج میلا منار ہے ہیں۔“
چند دنوں کے بعد مسعود پھر آ گیا۔ اس بار کھلا کہ اُس نے کہیں سے ”راجہ گدھ“ پڑھ لی تھی اور حسن اتفاق سے اس کے سحر میں پھنس گیا۔ اسی روز اُس نے مجھے ایک کاغذ کا پُرزہ سا پکڑا دیا۔ میں سمجھی کہ شاید کوئی فرمائش درج ہوگی۔ کھول کر پڑھا تو ایک نظم صاف ستھری لکھائی میں رقم تھی۔ بہت سال گزر جانے کے بعد ابھی تک مسعود کی لکھائی ویسی ہی صاف ستھری اور خوبصورت ہے۔ نظم کے شاعر کا نام معلوم نہیں بہر حال آپ نظم ملاحظہ کیجئے:

”اک کمال کی خواہش“

کس طرح سجاتے ہو
مصلحت کی شاموں میں
مخفلیں محبت کی اور محبتیں بھی وہ
سال بھر مہک جن کی
دل کی ساری گلیوں میں رقص کرتی پھرتی ہیں
کس طرح جلاتے ہو
آندھیوں کے موسم میں تم دیئے رفاقت کے
تم جو جس موسم میں اک ہوا کا جھونکا ہو
کچھ ہمیں بھی بتلاؤ، کچھ ہمیں بھی سکھلاؤ
ہم تمہارے جذبوں کے نیک سی فضاؤں میں

پھول جیسے گیتوں کی رقص کرتی خوشبو کے
بے قرار شاعر ہیں

اس نظم کا مجھ پر بڑا خاطر خواہ اثر ہوا۔ میں نے فوراً عینک بدل لی اور مسعود کو بڑے شفیق شیشوں سے دیکھنے لگی۔

میں نے پوچھا..... ”تمہاری تحریر سے لگتا ہے کہ تم لکھتے لکھاتے بھی ہو؟“

لڑکیوں کی طرح شرمناک رہ کر وہ بولا..... ”جی کچھ سنجیدگی سے نہیں بس ایسے ہی شوقیہ۔“

کہنے کو تو مسعود نے کہہ دیا..... لیکن یہ سچ نہیں کیوں اس کے چہرے پر وہ آرزو جھلکنے لگی جو تخلیقی قوتوں کے

فنکاروں میں نظر آتی ہے۔ اس کے بعد مسعود میاں میری زندگی سے غائب ہو گیا۔

مجھے یقین تھا کہ وہ اپنی زمینداری پر لوٹ گیا ہے اور مزے میں ہے۔ کافی دیر گزری کہ ایک روز مسعود میاں

وارد ہو گئے۔

میں نے تکفلاً اس تاخیر کی وجہ پوچھی۔ مسعود نے بڑی نا اُمیدی سے کہا ”بانو آ پا! والد صاحب نے ریٹائرمنٹ

کے بعد زمینوں کی ٹھیکیداری کے علاوہ Nesstle والوں کے ساتھ کنٹریکٹ کر لیا ہے دودھ کی سپلائی کا۔ ہم مختلف جگہوں

سے دودھ اکٹھا کر کے Nesstle کمپنی کو سپلائی کرتے ہیں۔“

میں نے کہا..... ”یہ تو بہت اچھا ہے۔ اس میں اتنا مایوس ہونے کی کیا بات ہے؟“

مسعود کہنے لگا..... ”بانو آ پا! مجھے خدشہ ہے کہ یہ کمپنی ہمارے لیے کہیں خدا نخواستہ ایسٹ انڈیا کمپنی ثابت نہ

کیونکہ والد صاحب نے ساری زندگی ملازمت میں گزار دی۔ ملازمت پیشہ لوگوں کو عموماً کسی بھی طرح کے کاروبار کی

پہچان نہیں ہوتی۔ آ پاجی! آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ بے شمار لوگوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد اپنی جمع پونجی تاج کمپنی میں

تھی یہ سوچ کر کہ مقدس کلام چھاپنے والی کمپنی ہے۔ یہاں ان کا سرمایہ بڑا محفوظ رہے گا لیکن ان کے ساتھ کیا ہو گا۔

بیچارے درود کی شکر کریں کھاتے پھر رہے ہیں۔ وہ تو تاج کمپنی تھی ہم نے تو ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے ساتھ کنٹریکٹ کیا ہے

سوچتا ہوں کہ میرے ساتھ کیا ہو گا۔“

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا..... ”دیکھو مسعود! مایوسی کو کفر کہا گیا ہے۔ اللہ سب خیر کرے گا میری دعا ہے

تمہارے ساتھ ہیں اور یاد رکھو ہر ناکامی سے کسی نہ کسی کامیابی کا پہلو ضرور نکلتا ہے اور ہر کامیابی کے ساتھ کوئی نہ کوئی

لگی ہوتی ہے۔ حالات کیسے بھی کیوں نہ ہوں پریشان نہیں ہونا گھبرانا نہیں۔“

ایک مدت مسعود مجھے ملنے نہ آیا۔

پھر ایک روز اس نے تجربے کے پانیوں سے سر نکالا اور مجھے آ کر بتایا..... ”آ پاجی! ایسٹ انڈیا کمپنی نے یہ

طرفہ طور پر کنٹریکٹ منسوخ کر دیا۔ ہم نے جو سرمایہ اس کاروبار میں لگایا تھا اُسے واپس نہیں نکال سکے۔ والد صاحب

صورت حال سے بالکل مایوس نہیں ہیں۔ بقول ترقی پسندوں کا تصوف یا روحانیت صرف ایک نشہ ہے۔ ابوجی اس

کے بعد اس نشہ میں اور بھی زیادہ راسخ ہو چکے ہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے تو میں بہادر شاہ ظفر کی طرح کبکال صحت

آپ کے سامنے موجود ہوں۔“

میں نے دلاسہ دینے کے انداز میں کہا..... ”چلو مسعود! جسے تم نقصان سمجھ رہے ہو وہ بھی ایک طرح کا نفع ہے۔ بڑے ادیب کو ناکامی کا تجربہ کنڈن بنا دیتا ہے۔ تم لکھاری ہو اب تیزی سے منزل کی طرف بڑھو گے۔ اب تم بڑی سنجیدگی سے پڑھنے لکھنے کی طرف مائل ہو جاؤ گے۔“

شاید میری تھکی کا اثر تھا کہ اُس کے اندر کا ادیب جاگ گیا تھا۔ وہ لکھنے لکھانے کی طرف سنجیدگی سے مائل ہو گیا لیکن مسعود نے مجھے کبھی نہ تو کتاب چھپوانے کے لیے کہا نہ کسی افسانے کو لکھنے کے لیے مجھے اُس پر تبصرہ کرنے کے لیے حرا رکھا۔ پھر اُس کی کہانیاں چھپنے لگیں۔ اُس کی جھولی میں کپے بیروں کی طرح خود بخود تعریف کرنے والے fan گرنے لگے۔ نوے کی دہائی میں کہیں مسعود ہمارے ساتھ منسلک ہو گیا۔ خاں صاحب کا تلقین شاہ کتابی صورت میں edit کرنے کے لیے ایک ہمہ وقت ایڈیٹر درکار تھا۔ مسعود حاضر ہو گیا۔ اُس سے پہلے ہمارے پاس عمران موجود تھا۔ عمران وکالت کا امتحان دینا چاہ رہا تھا۔ اُسے کسی پارٹ ٹائم نوکری کی ضرورت تھی۔ وہی آ کر یہ کام کیا کرتا۔ لیکن جونہی عمران کورٹ میں میڈیٹیشن کے قابل ہوا یہ جگہ خالی ہو گئی۔

ہمارے گھر کے علاوہ وہ سنگ میل پبلشرز کے پاس بطور ایڈیٹر کام کرنے لگا۔ چودھری انصاف احمد اُسے میری مدد خاں صاحب کی کتابوں کے علاوہ پروفیسر احمد رفیق اختر کی کتابیں بھی پڑھنے کے لیے دیتے ہیں جس پر وہ بہت خوش اور مطمئن ہے۔

اب مسعود کا راستہ متعین ہو گیا..... داستان ہمارے سنگ میل اور ادب سے گہری شیفٹنگ!



اشفاق احمد کی یاد میں

مسعود میاں

مجھے ساتھ والے گھر سے کسی لڑکی کی اونچی اونچی باتیں کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ہمارے ساتھ والا گھر ایک سٹریٹ کا تھا۔ اُس کا نام تو شمر تھا لیکن اُس کی بیوی کو ساری زندگی کوئی شمر نہیں لگا۔ جب اُن کے ہاں کوئی بچہ ہی نہیں تھا تو پھر کسی لڑکی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

دن کے وقت البتہ ایک لڑکی اکثر اُن کے ہاں آیا جایا کرتی تھی۔ وہ شاید اُن کی کوئی رشتہ دار تھی۔ اُس کے بال بک کنگ میں تھے اور سامنے والے دانتوں میں خلا تھا۔ وہ اُس خلا پر مسلسل اپنی زبان پھیرتی رہتی تھی۔ دیکھنے والے کی نگاہ اُس کے دانتوں کے خلا میں اس طرح پھنس کے رہ جاتی تھی جیسے امرود کھاتے ہوئے آپ کے دانتوں میں اس کا کوئی بیج پھنس جاتا ہے۔ پھر اسے بڑی جدوجہد سے نکالنا پڑتا ہے۔ اکثر کوئی پھانس نہیں بھی نکلتی اور بڑے دنوں تک تکلیف دیتی رہتی ہے۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ یہ 1978ء کی ایک تاریک رات تھی۔ میں اپنے گھر اور پڑوس کی سانجھی دیوار

کے ساتھ کھڑا تھا اور مجھے لڑکی کے مکالموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ لیکن یہ اُس بوب کنگنگ والی لڑکی کی آواز نہیں تھی۔ جب میں نے دیوار کے اوپر سے دوسری جانب دیکھا تو وہاں گھر کے پچھلے برآمدے میں ایک تپائی پر بیٹھ کر بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی پڑا تھا اور اس میں اشفاق صاحب کے ڈرامے کا سین چل رہا تھا جس میں رومی بانو باغ میں پڑھ کر کو اڑاتی پھر رہی تھی اور پھر وہیں باغ میں لگے جھا کے سے مکالمے بولنے لگتی تھی۔

میری عمر اُس وقت آٹھ یا نو برس کی تھی۔ یہ میرا خاں صاحب کی کسی ڈرامائی تحریر سے پہلا تعارف تھا۔ یہ 1992ء کی بات ہے۔ میرے پاس ایک جاپانی ٹیپ ریکارڈر ہوا کرتا تھا۔ ابھی چائے میڈ چیزوں کی بہتات نہیں ہوئی تھی اس لیے جاپانی چیزیں عام دیکھنے کو مل جاتی تھیں۔ اُس ریکارڈر میں پلے کے بٹن کے ساتھ ساتھ ایک سرخ رنگ کا بٹن بھی تھا۔ جب دونوں بٹنوں کو بیک وقت دباتے تو ریکارڈنگ شروع ہو جاتی تھی۔

ہر ہفتے کی رات آٹھ بجے میں اس ریکارڈر کو لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتا اور اپنے پسندیدہ ڈرامے ریکارڈنگ کرتا۔ جب ڈرامہ ختم ہو جاتا تو پھر کاغذ قلم لے کر بیٹھ جاتا اور اُس ڈرامے کے ریکارڈ شدہ مکالمات کو کچھ وقت میں اُن مکالمات کو لکھ کر یاد نہیں کرتا تھا یا پھر اداکاروں کی طرح اُن کو بولنے کی پریکٹس بھی نہیں کرتا تھا اس لیے کچھ اداکاری کا کوئی شوق ہی نہیں تھا۔ اس زمانے میں میرا لکھاری بننے کا بھی کوئی خیال نہیں تھا۔

پھر میں وہ مکالمات آخر کیوں لکھا کرتا تھا۔ یہ وہ اہم سوال تھا جس کا جواب میرے لیے ابھی مستقبل کے پردوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں آپ کو بتاتا چلوں کہ وہ ڈرامہ اشفاق صاحب کا تحریر کردہ تھا اور اُس کا نام تھا ”من ہے سودا“۔

1997ء کو جب میں کراچی کینٹ سٹیشن پر اترتا تو ایک بک سٹال پر ٹرک کر میں نے اخبار میں یہ خبر پڑھی کہ نصرت فتح علی خان کا انتقال ہو گیا ہے۔ جب ہم کسی سفر کے دوران دائم آباد کو جانے والے کسی مسافر کی خبر پڑھتے ہیں تو کتنا عجیب لگتا ہے۔ اچانک دل میں ایک حسرت جاگتی ہے کہ جانے والا ہمارے ساتھ کچھ دیر اور ٹھہرتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ جانے والا تو جا چکا ہوتا ہے اور ہمارے دل میں بس ایک کسک سی چھوڑ جاتا ہے۔

جب میں اپنے کمرے میں پہنچا تو شام کے سائے گہرے ہو کر تاریک رات میں بدل چکے تھے اور ساتھ ساتھ کمرے سے نصرت فتح علی کی آواز آ رہی تھی ”نسن چرنے دی مٹھی مٹھی گھوک ماہیا مینوں یاد آ وندا“ میرا یہ کمرہ ڈرگ روڈ سٹیشن پر بسم اللہ ہوٹل کی اوپر والی منزل پر تھا۔ ہمارے کمرے میں میرے سلطان کاٹی وی کسی خرابی کے باعث بند پڑا رہتا تھا۔ سلطان اور آس پاس کے کمروں کے لوگ رات گئے تک بیٹھ رہتے۔ میں جب اُن کے ساتھ رہائش پذیر ہوا تو تاش کے کھیل سے بالکل نااہل تھا۔

ایک روز چھٹی والے دن سلطان اپنے خراب ٹی وی کو کھول کر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ٹی وی میں تاش فالت ہے جسے وہ خود ہی ٹھیک کر سکتا ہے۔ وہ کہیں سے ایک کاویہ بھی لے آیا اور چھوٹے چھوٹے دو تین پوائنٹ لگانے کے بعد جب ٹی وی آن کیا تو وہ چل پڑا۔

رات ٹھیک ساڑھے دس بجے جب سب لوگ ساتھ والے کمرے میں تاش کی بازی میں مگن تھے میں

کیا تو اُس پر ایک ڈرامہ چل رہا تھا جس میں صرف دو کردار تھے۔ ایک یونیورسٹی کا سٹوڈنٹ اور دوسرا شاہ جی کا کردار تھا۔

سٹوڈنٹ پوچھتا ہے ”شاہ جی! آپ جدی پشتی زمیندار ہیں یا آپ نے انگریزوں سے زمینیں حاصل کی

ہیں؟“

شاہ جی کہتے ہیں ”میں لعنت بھیجتا ہوں انگریزوں سے زمینیں لینے والوں پر۔ ہم تو جدی پشتی زمیندار ہیں۔“

سٹوڈنٹ کہتا ہے ”وہ کیسے جی؟“

شاہ جی بتاتے ہیں ”میرے لکڑ داوا کے دوست اکبر بادشاہ کے دربار میں وزیر تھے۔ انہوں نے میرے لکڑ داوا

سے کہا کہ اگر آپ دین الہی قبول کر لو تو ہم بہت سی زمینیں تمہارے نام کر دیں گے۔ میرے لکڑ داوا کیونکہ بہت پڑھے لکھے

تھے اس لیے انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔“

وہ کیوں جی؟“ سٹوڈنٹ پوچھتا ہے۔

شاہ جی بتاتے ہیں ”وہ اس لیے کہ دین الہی کو قبول کرنے کے لیے ایک ٹسٹ سے گزرنا پڑتا تھا جس میں ایک

کتے کی زبان کو شہد لگا دیا جاتا تھا اور جو بھی اُس کتے کی زبان پر لگا شہد چاٹ لیتا وہ دین الہی میں داخل ہو جاتا۔ میرے داوا

کیونکہ بہت پڑھے لکھے تھے اس لیے انہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔“

”پھر کیا ہوا جی؟“ سٹوڈنٹ نے پوچھا۔

”وہ وزیر کیونکہ میرے داوا کے دوست تھے اس لیے انہوں نے اس شرط میں تبدیلی کر دی وہ یہ کہ انہوں نے

شہد میرے داوا کی زبان کو لگا دیا اور کتے نے میرے داوا کے کندھوں پر اپنی اگلی ناگیں رکھ کر داوا کی زبان پر لگا شہد چاٹ

لیا۔ تو اس طرح ہم تو جدی پشتی زمیندار بن گئے اور ہم انگریزوں سے زمینیں حاصل کرنے والوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔“

یہ تلقین شاہ کا وہ پروگرام تھا جو خاں صاحب نے ٹی وی کے لیے لکھا تھا۔ اس پروگرام کے کچھ اور حصے بھی ٹی وی

پر چلے لیکن ان میں بھارت اور امریکہ کے بجائے اپنے ہی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں پر تنقید بڑی سخت تھی اسی لیے اس

پروگرام کو جلد ہی بند کر دیا گیا۔ اس پروگرام کا لکھنے والا اگر پیسہ کمانا چاہتا تھا یا صرف شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا تو پھر وہ کڑی

تنقید کرنے کے بجائے باسانی ہلکے پھلکے موضوعات کا انتخاب کر سکتا تھا، لیکن اُس نے کبھی کسی مصلحت کو فن کے آڑے نہیں

آنے دیا۔

”تلقین شاہ“ سے لے کر ”من چلے کا سودا“ تک کے مکالمات میں مجھے ایک ہیرو نظر آتا ہے۔ کوئی ہیرو ہمیں

کیوں اچھا لگتا ہے؟ دراصل وہ ڈر اور خوف کی حدیں پھلانگ کر ایسے ایسے کارنامے کر جاتا ہے جس کا عام زندگی میں ہم

تصور تک نہیں کر سکتے۔ اس لیے ہمیں ہیرو اچھا لگتا ہے۔ ”من چلے کا سودا“ میں موجود ہیرو جہاد اکبر کرتا دکھائی دیتا ہے

کیونکہ میں خود اس جہاد میں حصہ لینے کے بارے سوچنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتا اس لیے وہ ہیرو میرا بھی پسندیدہ ہیرو بن

جاتا ہے۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب اشفاق صاحب کا مشہور ٹی وی پروگرام ”زاویہ“ کتابی صورت میں مرتب ہو رہا

تھا اور میں اس کی پروف ریڈنگ کر رہا تھا۔ مجھے اُن کی مکمل رہنمائی حاصل رہی۔ میں جب کتاب ”زاویہ“ کا پہلا پرفٹ لے کر خاں صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ مجھ سے پوچھنے لگے ”کیا ہو رہا ہے آج کل؟“ میں نے عرض کی ”خاں صاحب!“ ”زاویہ“ کی پروف ریڈنگ کر رہا ہوں۔“

بڑے خوشگوار موڈ میں فرمانے لگے ”بھی تم تو ہم پر تھانے دار لگ گئے ہو۔ ہمارا لکھا چیک کیا کرو گے اور اسے غلطیاں پکڑا کرو گے۔“

یہ اُن کی محبت کا ایک خاص انداز تھا اور نہ ہم سب جانتے ہیں کہ غلطیاں دونوں سے ہوتی ہیں۔ کمپوزر سے بھی اور پروف ریڈر سے بھی۔ جہاں تک خاں صاحب کی غلطیوں کا معاملہ ہے تو میں نے اُن کے دستی لکھے ہوئے بہت سارے مسودات دیکھے ہیں۔ پہلے لفظ سے لے کر آخری حرف تک مجھے کبھی ایک کٹنگ بھی نظر نہیں آئی اور میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ خاں صاحب نے کبھی رف مسودہ تحریر نہیں کیا اس لیے بعد میں اُسے نیت کرنے کی کبھی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ بات ہو رہی تھی ”زاویہ“ کے پہلے پروف کی۔ ہر بڑی تخلیق کے پیچھے اس کی ایڈیٹنگ کا بڑا عمل دیکھا کرتا ہے۔ ”ویسٹ لینڈ“ جیسی بڑی نظم بھی ایڈیٹنگ کے بعد ہی منظر عام پر آتی ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہر بڑا ادیب ایڈیٹر بھی ہوتا ہے۔ اگرچہ ”زاویہ“ کی پروف ریڈنگ کا اعزاز مجھے حاصل رہا لیکن اس کی ایڈیٹنگ خاں صاحب نے کی تھی۔ یہ ایک بڑا کام تھا اور اسے ایک بڑا آدمی ہی کر سکتا تھا۔

خاں صاحب کی ایڈیٹنگ کرنے کے بعد کتاب میں شامل ہر عنوان ایک مکمل قصے کی صورت اختیار کر گیا۔ ایسے قصے جو لطف تو افسانے کا دیتے ہیں لیکن Reality Base پر کرتے ہیں۔ ”زاویہ“ میں تصوف کے مسائل پر پیچیدہ اور گہرائی میں بحث نہیں کی گئی بلکہ یہ زندگی کی اُن چھوٹی چھوٹی حقیقتوں کے منظر نامے ہیں جن کو عام آدمی بڑی آسانی سے نظر آتا کر جاتا ہے۔ یہاں تک کہ محسوس بھی نہیں کرتا۔

بڑے فنکار کا یہ کمال ہوا کرتا ہے کہ وہ چھوٹی اور معمولی باتوں کو ہمیشہ بڑے تناظر میں پیش کرتا ہے اور اس قصے سلیقے سے بیان کرتا ہے کہ اُسے پڑھنے کے بعد وہ حقیقت جو بڑی معمولی اور غیر اہم سمجھتی ہے آپ کے اندر سرایت کر جاتی ہے۔ اس کے باوجود اگر کبھی آپ اُس حقیقت سے نظریں چرانے میں کامیاب ہو بھی جائیں تب بھی اُسے احساس کرنے سے پرے دھکیلنا آپ کے لیے مشکل ضرور ہو جائے گا۔

ایک دفعہ جب خاں صاحب کی طرف جانا ہوا تو رکشے والے سے بڑی بحث ہوئی۔ 121۔ سی پہنچ کر جب میں نے کرایہ ادا کیا تو اُس کے پاس چینیج نہیں تھا۔ میں نے اُس سے پانچ روپے بقایا لینے تھے۔ بڑی دیر تکرار ہوتی رہی۔ اُس نے پاس کوئی دکان بھی نہیں تھی جہاں سے چینیج مل سکتا۔ آخر میں اُسے صابری کی دکان پر لے گیا اور یوں بقایا پانچ روپے میں نے اُس کی جان چھوڑی۔

جب واپس خاں صاحب کے پاس حاضر ہوا تو انہیں سارا ماجرا بیان کیا۔ سُن کر فرمانے لگے:

”یار! تم نے اُس سے بقایا کا تقاضا ضرور کرنا تھا۔ وہ پانچ روپے بھی اُسے دے دیتے“ پھر فرمایا ”مگر کسے“

بقایا نہ لیا کرو۔ تم نے کون سا اپنے پلے سے دینا ہوتا ہے۔ دتے میں سے ہی تو دینا ہے۔“

میں خاں صاحب کی اس بات پر ابھی تک عمل پیرا نہیں ہو سکا۔ ایک روپیہ چھوڑ دینا بھی میرے لیے بڑا دشوار سمجھتا ہے لیکن میرے دل کی یہ تمنا ضرور ہے کہ مجھ پر جلد از جلد ایسا وقت آئے کہ اس پر عمل کرنا میرے لیے آسان ہو جائے۔

جب کبھی میں اپنے گھر پر اکیلا ہوتا یا اپنے دوست احباب کے ساتھ! ہم سب ”زاویہ“ دیکھتے اور سنتے تو ایک عجیب و غریب سحر میں مبتلا ہو جایا کرتے۔ ہمیں لگتا جیسے ہم سب ماضی کے قصہ گوئی کے دور میں واپس چلے گئے ہیں۔ ہم سب اپنی اس واپسی پر بڑا آئند محسوس کرتے تھے اور ہمیں یوں لگتا جیسے یہ داستانی طرز گفتگو ہماری جنمزمین پہلے سے کہیں موجود ہے اور خاں صاحب نے اُسے پھر سے دریافت کر لیا ہے۔ اُنہوں نے بڑے منفرد انداز میں ہمارے ماضی کا ورثہ عکس لوٹا دیا ہے۔

آج کل لینڈ مافیا کے ہاتھوں تاریخی عمارتوں کا ورثہ تباہ و برباد ہو رہا ہے۔ پرانی اور تاریخی جگہوں پر پلازے اور ٹراپنگ مال تعمیر ہو رہے ہیں۔ تاریخی ورثے کی اہمیت کو اجاگر کرنے والا کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا۔ ایسے میں خاں صاحب نے کم از کم داستان گوئی کے ورثے کو اس انداز سے اپنی تحریروں میں محفوظ کر لیا ہے کہ اب کوئی مافیا بھی اس پر قبضہ نہیں کر سکے گا۔

بہت سارے لوگ ملازمت یا دوسری مصروفیات کے باعث ”زاویہ“ میں شرکت کرنے کے لیے ٹی وی سٹیشن نہیں جاتے تھے شاید ایسے ہی لوگوں کے لیے خاں صاحب نے اپنے گھر پر بھی ایک نشست کا اہتمام کر رکھا تھا۔ یہ نشست عموماً جمعرات کے روز ہوا کرتی۔ مجھے بھی وہاں حاضری کا شرف حاصل ہوتا رہا ہے۔ ہر طبقہ فکر کے لوگ وہاں آیا کرتے تھے۔ بزنس کلاس، اساتذہ، خواتین، خاص کر نوجوان طبقے کی تعداد زیادہ ہوتی۔ عصر کے وقت ہم وہاں پہنچا کرتے، مغرب کے وقت نماز کا وقفہ ہوتا۔ خاں صاحب نماز کے لیے گھر کے اندر تشریف لے جاتے۔ جب وہ واپس محفل میں آتے تو سوالات کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔

ان محفلوں میں مجھے ایک بات کی بڑی کمی محسوس ہوا کرتی اور میں اکثر سوچا کرتا کہ واصف علی واصف صاحب کتنے خوش نصیب تھے جن کو اشفاق صاحب جیسے سننے والے میسر رہے، لیکن خود اشفاق صاحب کی محفل میں مجھے ایسا کوئی دکھائی نہیں دیتا تھا جو ان کے Calibre کے مطابق ان سے سوال پوچھتا۔ ہم جیسے پوچھنے والوں نے اپنی ذات سے بلند سوچ کر کبھی ان سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔

ایک بار کسی نشست میں کوئی خاتون خاں صاحب کو بتا رہی تھی کہ اُس کا شوہر نماز کے بعد دُعا نہیں مانگتا۔ وہ کہتا ہے کہ اس سے تو یہ ظاہر ہوگا کہ میں نماز اپنے مطلب کے لیے اللہ سے مانگنے کے لیے پڑھتا ہوں۔

خاں صاحب فرمانے لگے ”بھئی آپ اُسے بتاؤ لیکن سختی سے نہیں نہایت نرمی سے بتاؤ کہ جب عام زندگی میں ضرورت پڑنے پر آدمی اپنے بھائی سے مدد مانگتا ہے یا کسی عزیز رشتے دار سے مانگتا ہے تو پھر اللہ پاک سے مانگنے میں کیسی شرمندگی۔ وہ تو خود فرماتا ہے کہ مجھ سے مانگو اور وہی سب سے بہتر مدد کرنے والا ہے۔“

گورنمنٹ کالج کے ایک سٹوڈنٹ نے پوچھا ”سر! میں کالج میں شملوار ٹیم میں شامل ہوں تو لڑکے اور ٹیچر

میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں شلوار قمیض پہننے والا جاہل ہوتا ہے۔“

اشفاق صاحب نے اُس طالب علم سے فرمایا ”یار! تم اپنے موقف پر تو ضرور کاربند رہو لیکن دوسروں کو سختی سے جواب مت دو۔ تم انہیں بڑے دھیرج اور نرمی کے ساتھ بتاؤ کہ سر! میں تو پینٹ شرٹ پہننا چاہتا ہوں لیکن کیا کروں، گھر میں بوڑھے والدین موجود ہیں جنہوں نے بڑی محنت اور محبت سے میری پرورش کی ذمہ داری نبھائی ہے۔ اب مجھے اُن کی خاطر اُن کی خواہش کے احترام کے پیش نظر مجبوراً شلوار قمیض پہننا پڑتی ہے۔ اب آپ ہی مجھے بتائیں میں انہیں گھر سے مت نہیں نکال سکتا ناں؟“

خاں صاحب کی انہی محفلوں کی بات ہے کہ ایک روز دونو جوان آئے۔

ڈرائنگ روم کا باہر والا دروازہ کھلتے ہی سامنے جو ٹیبل لیپ نظر آتا ہے اُس کے ساتھ والے صوفے پر خاں صاحب تشریف رکھتے تھے۔ جب وہ دونوں اندر داخل ہوئے تو خاں صاحب نے انہیں اپنے پاس بیٹھنے کو جگہ دی اور اچھے گفتگو کو جاری رکھا۔ وہ مختلف طرز کے موضوعات پر ایک خاص ربط باہمی کے ساتھ گفتگو کرتے رہے۔ اُن کی باتوں سے یوں لگتا کہ اُن مختلف موضوعات کا آپس میں کوئی بہت گہرا تعلق موجود ہوتا ہے جسے کوئی قادر الکلام ہی دریافت کر سکتا ہے۔ سننے والے تو ندرت کلام کے حصار میں ہوتے تھے۔

اتنے میں مغرب کی نماز کا وقفہ ہو گیا اور اُس کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ جب اُن دونوں کی باری آئی تو اُن میں سے ایک نے دوسرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”سر! یہ میرا دوست ہے۔ بڑا چھا ہے پیچارہ۔ اس کے ساتھ ایک مسئلہ ہے۔ یہ بڑے عرصے سے مجھے کہہ رہا تھا لیکن اس کی بات کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ اس لیے آج میں خاص طور پر اسے اپنے ساتھ آپ کی خدمت میں لایا ہوں۔ سر! میرے اس دوست کو مرشد کی تلاش ہے۔ یہ کسی کا مرید ہونا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں آپ اس کی رہنمائی فرمائیں کہ اس کو کیا کرنا چاہئے؟“

اکثر لوگ خاں صاحب سے بابوں کا پتہ پوچھنے آیا کرتے تھے لیکن اُن کا انداز کچھ ایسا ہوتا تھا جیسے وہ باپے کا پتہ نہیں پوچھ رہے بلکہ پانی کا گلاس مانگ رہے ہوں یا چائے کا کپ یا پھر کچھ اس طرح ”خاں صاحب! فلاں کتاب کسی بک شاپ سے ملے گی۔ ذرا ہمیں اُس کا پتہ تو بتائیں پلیز۔“

کسی بک شاپ کے ایڈریس میں اور کسی باپے کے پتے میں یقیناً بڑا فرق ہوتا ہے اور لوگ اس فرق کو ٹھوٹے نظر نہیں رکھتے۔ دراصل خاں صاحب کسی ایسے باپے کا پتہ جانتے ہی نہیں تھے جس نے اپنی کوئی دکان سجا رکھی ہو۔ اُن کا تعلق فقیریوں سے تھا جن کے ڈیروں پر مخلوق خدا کو سیدھے راستے پر چلنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔

اُن دونو جوانوں کا معاملہ البتہ مختلف تھا۔ انہوں نے تو اپنا مقصد ہی سامنے رکھ دیا تھا کہ وہ صرف پتہ ہی نہیں پوچھ رہے تھے بلکہ مرید ہونے کے بھی آرزو مند تھے۔ اس معاملے میں شہاب صاحب کا موقف قدرے سخت تھا۔ اسے کہتے تھے ”یہ زمانہ بیعت ہونے کا نہیں ہے۔“

اس بارے میں پروفیسر احمد رفیق اختر صاحب کا نقطہ نظر یہ ہے کہ تبع تابعین کے ہاں مرشدین نہیں تھے۔

بھری حبیب عجمی اور بایزید بسطامی کا کوئی مرشد نہیں تھا۔ جنید بغدادی نے براہ راست کچھ درس حضرت سری سقطی سے لیے تو پہلی مرتبہ ہمیں پیر و مرشد کا ایک تعلق نظر آیا۔ تو مرشد کا ہونا لازم نہیں ہے مگر جہاں علم میں کمی ہو اور معاملات نفس پیچیدہ ہوں اور شدت حواس غالب وہاں اُستادوں کی ضرورت اعتدال کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

وہ نوجوان اپنے آنے کا مقصد بیان کر چکے تھے۔ اب جواب کے منتظر تھے۔ اُن کے ساتھ ڈرانگ روم میں بیٹھے باقی سب لوگوں کی تجسس بھری نگاہیں بھی خاں صاحب پر یوں مرکوز تھیں جیسے وہ کوئی بازیگر ہوں اور ابھی وہ کسی جانب اشارہ کریں گے تو مرشد نامی کردار سب کے سامنے حاضر ہو جائے گا۔

تب خاں صاحب نے اپنے بائیں جانب بیٹھے نوجوان سے فرمایا ”بھئی! آپ آج کل کے پڑھے لکھے نوجوان ہو۔ آپ تو اُستاد کا بھی ٹسٹ لینا شروع کر دیتے ہو۔ مرشد بھی ایک طرح کا اُستاد ہی ہوتا ہے جبکہ ٹسٹ لینا تو اُستاد کا کام ہوتا ہے۔ آپ اگر کسی مرشد کے پاس جاؤ گے بھی تو اُس پر تجربات کرنے لگو گے جیسے میڈیکل کے سٹوڈنٹ لیبارٹری میں خرگوش اور مینڈک وغیرہ پر تجربات کرتے ہیں۔“

خاں صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں بات کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا ”میرے خیال میں آپ لوگ پہلے اپنے آپ کو ٹھیک کرو۔ اپنی سمت درست رکھو۔ دوسروں کی نہیں بلکہ اپنے آپ کو کیونکہ جب ہم دوسروں کو ٹھیک کرنے چل پڑتے ہیں تو پھر اپنا آپ بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ جب تمہارے عمل کی درستگی ایک خاص حد تک پہنچ جائے گی تب ایک روز ایسا آئے گا کہ مرشد خود چل کر تمہارے گھر آ جائے گا اور تمہارے دروازے کی کنڈی کھڑکا کر کہے گا کہ میں آ گیا ہوں..... بیعت کرنے کے لیے۔“

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب خاں صاحب نے ڈرانگ روم میں آنا چھوڑ دیا تھا۔ جمعرات کی محفلوں کا سلسلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اب بھی لوگ اُن سے ملنے آتے تو اُن کو کبھی مایوس نہ لوٹنا پڑتا۔ انہیں سیدھا خاں صاحب کے بیڈروم میں لے جایا جاتا تھا جہاں وہ اپنی بیماری کے باوجود لوگوں کو اُمید بانٹنے اور حوصلہ دیتے رہتے۔

دراصل 121-سی میں لوگوں کو ایک ایسا کندھا دستیاب تھا جس پر سر رکھ کر وہ اپنے اپنے ڈکھوں پر رویا کرتے تھے اور وہاں وہ سب اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے آیا کرتے تھے۔ مگر پھر دوسروں کے آنسو سمیٹنے والا کندھا بہت بیمار ہو گیا۔ تب اُس نے اپنے بیڈروم کو ہی ڈرانگ روم بنا لیا تھا۔

ایک روز جب میں اُس ڈرانگ روم میں گیا تو خاں صاحب صوفے پر تشریف فرما تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے پاس ہی بٹھالیا اور پھر میرے اُس افسانے کی تعریف کرنے لگے جو میں نے اُن دنوں لکھا تھا، لیکن میں حیران تھا کہ ایک نئے لکھنے والے کا افسانہ انہوں نے شدید نقاہت کے باوجود پڑھا تھا اور پھر اُس کی حوصلہ افزائی بھی ضروری سمجھی۔ میرے لیے اُن کی شفقت کا یہ ایک انوکھا انداز تھا۔ پتہ نہیں اور کتنوں کے ساتھ وہ اسی طرح پیش آتے تھے یا پھر سب کے سب میری طرح ہی اُن کی محبت کو فقط اپنے لیے ہی مخصوص سمجھتے ہوں گے۔

پھر بات میرے افسانے سے نوروالوں کے ذکر کی طرف چل پڑی تھی۔

میں نے عرض کی ”خاں صاحب! باباجی نوروالے فرماتے ہیں ”نوٹ! دین صراط مستقیم ہے جو لوگ سیدھا

سوچتے ہیں وہ دین پر ہیں اور جو لوگ دائرے میں سوچتے ہیں وہ دین سے خارج ہیں۔“ خاں صاحب! مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری سوچ دائرے میں ہی گھومتی رہتی ہے۔ سوچ کی سمت کو سیدھ میں رکھنا مجھے آتا ہی نہیں ہے۔“

خاں صاحب نے مجھ سے پوچھا ”تم جس طرف رہتے ہو وہاں سے تمہیں نہر کتنی قریب پڑتی ہے؟“ میں نے انہیں بتایا ”وحدت روڈ سے ہوتا ہوا میں فیروز پور روڈ پر آتا ہوں اور ایف سی کالج کے پل سے سر کر اس کر کے ماڈل ٹاؤن کی طرف ہولیتا ہوں۔ پل پر ٹریفک کا اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ نہر کو دیکھنے اور اُس کے پانی کی روانی یا تلاطم کو محسوس کرنے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔ مجھے اس ہجوم میں سے گزرتے ہوئے اشارہ بند ہونے سے پہلے پل کو چلنے کرنے کی جلدی ہوتی ہے۔“

میرے راستے میں نہر تو ہے لیکن میں اس کے ساتھ کوئی خاص گہرا اور مضبوط تعلق استوار نہیں کر سکا۔ اس پر سے روز گزرتا ہوں پر اس سے میرا بندھن بس ایسے ہی لمبائی اور کمزور سا ہے جو میرے احساس پر کوئی دستک نہیں دیتا اور ویسے بھی نہایت معمولی اور غیر محسوس آہٹوں پر بھلا کون سا دروازہ کھلتا ہے۔“

خاں صاحب میرا جواب سن کر خاموش ہو گئے جیسے وہ شاعر جس کے کلام میں نہر ایک علامت ہو اور سنے ہوئے اس علامت نگاری کو سمجھتا نہ ہو۔ تو شاعر پر خاموشی کا طاری ہونا لازمی امر ہوتا ہے۔ کچھ تو وقف کے بعد خاں صاحب نے اس خاموشی کو یوں توڑا۔ اُن کے سامنے ٹی وی ٹرالی کے ساتھ والے میز پر لال رنگ کی مکچر سے بھرا ایک چھوٹا سا گلاس پڑا تھا۔ بالکل اسی رنگ کی مکچر ہمارے شہر کا ڈاکٹر منان بھی اپنے مریضوں کو دیا کرتا تھا۔ خاں صاحب نے مجھے وہ گلاس اُٹھانے کا کہا۔ میں نے وہ مکچر نہیں پیش کیا تو انہوں نے اُس لال رنگ کے پانی کے دو گھونٹ بھرے اور گلاس مجھے واپس پکڑتے ہوئے میرے سوال کو ڈہراتے ہوئے فرمایا ”کبھی تم اپنے ارد گرد دیکھو تو تمہیں بے شمار ایسے لوگ نظر آئیں گے جن کی سیدھی سیدھی نہیں ہوتی لیکن ساری زندگی اس کا احساس نہیں ہوتا۔ تم اللہ کا شکر کیا کرو کہ تمہیں کم از کم احساس تو ہے۔ تم سارے دن میں کسی ایک بات پر اپنی سوچ کو سیدھا رکھنے کی کوشش کیا کرو۔ پھر دیکھو تمہارا ہر کام میں کیسے برکت آتی ہے۔“ پھر فرمانے لگے ”یار! میں اب کچھ دیر لیٹنا چاہتا ہوں“ وہ اپنے مخصوص بیڈ پر لیٹ گئے اور میں کمرے سے باہر آ گیا۔

پھر وہ لطیف میموریل شفٹ ہو گئے۔ ایک روز جب میں شام کے وقت لطیف میموریل گیا تو وہاں بانو آ پا کے علاوہ اُن کے پاس اور کوئی نہیں تھا۔ ہسپتال سے باہر ٹریفک رواں دواں تھی۔ گھروں کو لوٹنے سے پہلے سوار آہستہ رو بوڑھے زگ زگ موٹر سائیکل چلاتے اور اشارہ توڑنے کی کوشش کرتے لڑکے بھری ہوئی بسوں کے ساتھ لٹکے ہوئے مسافر۔ ان میں سے کسی کو خبر نہ تھی کہ اسی فیروز پور روڈ کے کنارے لطیف میموریل میں ایک ایسی نابغہ روزگار ہستی موجود ہے جس نے اردو ادب کو برسوں اعتبار بخشا ہے۔ آنے والے زمانے میں اس سے زیادہ صاحب علم تو آتے رہیں گے لیکن اس جیسی انشا پر دازی اب کون کرے گا۔ اُس جیسی نثر لکھنا کسی کے بس کی بات ہی نہیں ہے۔

اُس روز خاں صاحب ہسپتال کے بیڈ پر بیٹھے کسی خاتون کا ذکر کر رہے تھے کہ اُس کے جسم کے مختلف حصوں میں

بہت ساری پتھریاں تھیں۔ حیرت کی بات ہے کہ اُن پتھریوں کی موجودگی سے اُس خاتون کو کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوتی تھی۔ یہ بات وہ اس طرح سنا رہے تھے جیسے ہماری توجہ خود پر سے ہٹانا چاہتے ہوں یا پھر ہمیں حوصلہ دینا چاہتے ہوں۔ یہ میری خاں صاحب سے آخری ملاقات تھی۔ اُن کے جانے کے بعد اندازہ ہوا کہ کس طرح بڑے لوگ اچانک بھرا میلہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر ہمیں پتہ چلتا ہے کہ وہ تو میلے سے تھے ہی نہیں بلکہ میلہ اُن کے دم قدم سے آباد تھا۔ اُن کے جانے کے کچھ عرصے بعد بانو آپا نے مجھے چند کتابیں دیں اور کہا ان کو محمد خاں ٹرسٹ کو بھجوادو۔ یہ کتابیں اُن بہت سی کتابوں کا حصہ تھیں جو خاں صاحب کی موجودگی میں ہی ٹرسٹ کو بھجوائی جا چکی تھیں۔ اُن باقی رہ جانے والی کتابوں کو پہچانتے ہوئے میں نے بانو آپا سے کہا کہ یہ تو وہی کتابیں ہیں جو خاں صاحب نے ذاتی مطالعے کے لیے منتخب کی تھیں۔

آپا جی کہنے لگیں ”بیٹا! جب ان کو پڑھنے والا ہی چلا گیا تو اب ان کو رکھ کر کیا کریں گے۔ تم انہیں بھی بھجوا دو۔“ اور ان کے ساتھ خاں صاحب کی تمام لائبریری جس میں اُردو اور انگریزی کی ہزاروں نادر و نایاب کتب کا ایک قیمتی خزانہ تھا جو مختلف اداروں کو ڈونٹ کر دیا گیا، یہاں تک کہ ان کتب کی الماریاں بھی دے دی گئیں۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ منتخب لوگ جانے کے بعد بھی کس طرح دوسروں کو فیض یاب کرتے رہتے ہیں۔



اُن دنوں.....

(راجہ گدھ..... ایک تاثر)

مسعود میاں

اُن دنوں بہت سارے کرداروں سے میرا رابطہ رہا کرتا تھا۔ نائیلہ شامیلہ، جمیلہ اور پروین۔ ان سب نے بری طرح مجھے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ان سے تعلق کسی گہرے جذباتی سمندر کی بھری ہوئی موجوں جیسا نہیں تھا بلکہ لوق و وق صحرا کی صورت تھا جس کے طوفانی جھکڑوں میں میں پھنس کر رہ گیا تھا اور مجھے ان سے نجات کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

اُن دنوں میرے پاس دیسا ہوا کرتا تھا۔ جب میں شہر میں نکلتا تو اُن میں سے کوئی نہ کوئی میرے ساتھ ہوتی۔ چھوٹا سا شہر تھا۔ جاننے والوں کی نظروں سے چھپنا بہت مشکل تھا اس لیے میں اکثر و بیشتر ان کے ساتھ دن اور رات کا زیادہ وقت بند کمرے میں بسر کرتا۔ کبھی کبھار بند کمرے کی وحشت سے اکتا کر میں اُن کے ساتھ سٹیج پارک میں چلا جاتا۔ وہ چھوٹا سا پارک تھا جس کی بہت سی زمین اب بھی گھاس کے بغیر نگلی پڑی ہے اور کسی مردہ بیج کی طرح گرد اڑاتی رہتی ہے۔ جب میں پارک کی بے کار صحنوں اور ویران دوپہروں سے گھبرا کر شہر کی سڑکوں پر نکلتا تو جھلسا دینے والے گرم لو کے تھپیلوں سے بچنے کے لیے کسی زلف کا سا بان کام نہ آتا۔

نائیلہ شائیلہ میں سے کسی کو میرے ساتھ دیکھ کر لوگ معنی خیز انداز میں مسکراتے۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید میں کوئی رئیس زادہ ہوں۔ میرے باپ دادا کی بہت بڑی جاگیر ہے جس کا میں وارث ہوں اس لیے مجھے نہ تو ڈگریاں حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور نہ کسی نوکری کی فکر ہے۔

جبکہ میں ایک طرف تو اُن کرداروں کا عادی ہو چکا تھا۔ میرا کوئی دن بھی ان کے بغیر نہ گزرتا اور دوسری طرف میں ان سب سے بہت بور ہو چکا تھا۔ یہ سب ایک جیسی تھیں۔ صرف نام مختلف تھے ورنہ ان سب کے نقش و نگار چال و چلن اُن کا اُلٹنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، ان کا لباس سب ایک جیسے تھے۔ حتیٰ کہ یہ سب کی سب سوچتی بھی ایک ہی طرح تھیں۔ ان سے میری بوریت اس انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ میں نے یہ تک سوچنا شروع کر دیا کہ میں کوئی ایسا سنگین جرم کروں اور مجھے جیل ہو جائے اور جب مجھے وہاں چکی بیٹنی پڑے گی تو شاید اس طرح میں اس یکسانیت سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکوں گا۔

اُن دنوں میں جس لائبریری میں جایا کرتا تھا اُس کا نام تھا ”جاوید لائبریری“۔ یہ اُردو روڈ پر واقع تھی۔ پہلی نظر میں تو یہی لگتا کہ شاید لائبریری کا نام بھی ”جاوید نامہ“ سے متاثر ہو کر ہی رکھا گیا ہوگا لیکن جب میں نے وہاں موجود سب کے ذخیرے پر نظر ڈالی تو وہاں علامہ صاحب پر لکھی گئی کتابوں کا کوئی گوشہ نہ تھا۔

اُس زمانے میں کیبل کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ پٹی وی کی نشریات بھی رات گئے ناظرین کا ساتھ چھوڑ جاتیں۔ اس لیے لوگ لائبریری کا رخ ضرور کیا کرتے تھے۔ اکثر لوگ وہاں آ کر کسی کتاب کو ہاتھ تک نہ لگاتے شاید اس ڈر اور خوف کی وجہ سے کہ کسی کتاب کی کوئی سطر اُن کو غور و فکر میں مبتلا نہ کر دے اس لیے وہ زیادہ تر وہاں سے پاس سٹ ڈائجسٹ پڑھنے کے لیے لے جاتے تھے۔ وہ ان رسائل کو اپنے سر ہانے کے ساتھ رکھ لیتے اور جب رات کے وقت سہل پسندوں کو بڑی دیر تک کروٹیں بدلنے پر بھی نیند نہ آتی تب وہ رسالہ اُلٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتے۔ پڑھتے وقت کھلیوں لگتا جیسے کسی نے اُن کو کولوری سٹاٹا شروع کر دی ہو۔ تھوڑی دیر بعد سامنے موجود عمارت ان کی نظروں میں ڈھنلائی آتی اور وہ رسالہ سائیڈ پر رکھ سو جاتے۔

اُس لائبریری میں خواتین کے لکھے ہوئے ناولوں کا ایک بڑا ذخیرہ موجود تھا اور اُن کے نام عموماً نائیلہ شائیلہ پروین وغیرہ نائپ کے ہوا کرتے۔ اس زمانے میں خواتین بڑی تندہی اور جاں فشانی سے لکھ رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ہر ماہ کوئی نیا ناول لائبریری میں موجود ہوتا۔ میں یہ سارے ناول پڑھ چکا تھا لیکن اس کے باوجود وہاں روز ہی چکر ضرور لگتا کہ شاید کوئی نئی کتاب آئی ہو۔

لائبریری سے باہر آنے کے لیے جب میں دروازے کی طرف بڑھتا تو دروازے کے ساتھ والی بک شیلف پر اور کتابوں کے ساتھ ایک کتاب پڑی ہوتی تھی۔ میں دروازے سے باہر نکلتے وقت اُسے روز دیکھتا۔ تھوڑی دیر کو اُس کے قریب رکتا، اُسے اُلٹاتا، اُس کو کھول کر سرسری طور پر دیکھتا اور پھر بند کر کے اُسے اُسی کی جگہ پر واپس رکھ دیتا۔ اُس پر لکھا تھا ”راجہ گدھ“ اور نیچے لکھنے والی کا نام ”بانو قدسیہ“۔

میں نے آج تک کسی خاتون رائٹر کے ناول کا ایسا نام پڑھا ہی نہیں تھا۔ یہ میرے لیے ایک نئی اور انوکھی بات

تھی اور میں اس انوکھی بات کو جاننے کے لیے ابھی تیار نہیں تھا۔

ایک زمانے میں عصمت چغتائی سے پہلے عورتیں مردوں کے قلمی ناموں سے لکھا کرتی تھیں۔ جس دور کا میں ذکر کر رہا ہوں شاید کچھ کمرشل لکھنے والوں نے خواتین کے نام سے لکھنا شروع کر دیا تھا۔

بہت دن تک جب کوئی نئی کتاب نظر نہیں آئی تو ایک روز لاہوری سے نکلنے ہوئے اُس بک شیلف کے پاس رک کر جس پر ”راج گدھ“ پڑا ہوتا تھا، میں نے فیصلہ کیا کہ اگر یہ کتاب اتنی Interesting ہوئی کہ پڑھنے والے کو مجبور کر دے اور پڑھنے والا اسے مکمل پڑھے بغیر رہ نہ سکے تو میں اسے پڑھوں گا ورنہ اُسے واپس کر دوں گا بغیر پڑھے..... اور مجھ سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوگا کہ یہ کتاب آپ نے کیوں نہیں پڑھی۔ حتیٰ کہ مصنف بھی نہیں کیونکہ لکھنے والے کا تو یہ مسئلہ ہی نہیں ہوتا کہ کون اس کی کتاب کو پڑھتا ہے اور کون نہیں اور یہ اس کتاب کے نام سے بھی صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ مصنف کو پڑھنے والوں کی اتنی فکر ہوتی تو پھر کتاب کا نام بھی..... نا ئیلہ، شامیلہ یا پھر ”بے وفائی کا زخم“ وغیرہ ہوتا۔

جب میں ”راج گدھ“ لے کر لاہوری سے باہر نکلا تو مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میرے اُس پاس موجود بے شمار کتابیں جو مجھے دُھندلی دُھندلی دکھائی دیتی ہیں اُسے پڑھ کر اور زیادہ واضح نظر آنے لگیں گی اور لاہوری میں بسر ہونے والے شب و روز میں جو ایک بہل پسندی ہوتی ہے وہ عنقریب ختم ہو جانے والی ہے۔

جب میں نے ”راج گدھ“ پڑھنا شروع کیا تو اُن دنوں موسم سرما اپنے عروج پر تھا۔ ہم جس خطے میں رہتے ہیں یہاں موسموں میں بڑی شدت پائی جاتی ہے اور یہی شدت پسندی جب ہمارے مزاجوں میں بھی در آتی ہے تو شدید وہیں سے دیوانگی کا سفر شروع ہوتا ہے۔ جب کتاب کے اندر کا موسم اور اُس سے باہر کا موسم ایک جیسا ہو جائے تو پڑھنے والا لازمی طور پر خود کو کتاب کے اور زیادہ قریب محسوس کرتا ہے۔

رات کے وقت لحاف اوڑھے جب میں ”راج گدھ“ پڑھ رہا ہوتا تو گھر کی دوسری منزل کے کمرے میں ہر طرف سناٹا چھایا ہوتا..... رات سردی اور لحاف جب نعیم اور عابدہ کی ملاقاتوں سے میل کھاتے تو مجھے لگتا کہ عابدہ میرے بستر کی پائنتی کی طرف پٹھی ہے اور اُس نے لحاف کو اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا ہے۔ وہ اپنے سامنے موٹنگ پھلیوں سے بھر الفافہ رکھ لیتی اور جس رفتار سے وہ باتیں کر رہی ہوتی اتنی ہی تیزی سے موٹنگ پھلی کھا رہی ہوتی۔ فرش موٹنگ پھلی کے چھلکوں سے اور کمرہ اُس کی باتوں سے بھرتا جا رہا ہوتا۔

اُس کی باتوں کا مرکز زیادہ تر اُس کا شوہر ہی ہوتا۔ وہ اُس کی توجہ نہ ملنے اور وقت نہ دینے کا گلہ کرتی رہتی۔ اُس نے اپنے شوہر کو جس خطاب سے نوازا رکھا تھا وہ تھا ”ماں کا یار۔“ اُس کی باتیں سن کر میں سوچتا جو مرد اپنی عورتوں کو توجہ دینے میں نا انصافی کرتے ہوں گے وہ ساری عورتیں بھی اپنے مردوں کو شاید اسی قسم کے خطاب سے نوازتی ہوں گی۔

جب میں کتاب سے باہر نکل کر دیکھتا تو عابدہ جا چکی ہوتی اور میں پائنتی کی طرف سرک جانے والے لحاف کو جلدی سے اپنے اوپر کھینچ لیتا۔

ہمارے اُس پاس موجود عابدہ جیسی بے شمار عورتیں ایک حوالے سے تو بہت خوش نصیب ہوتی ہیں کہ انہیں اپنے شوہروں کی گلہ گزاری کے لیے کوئی نہ کوئی مرد میسر آ جاتا ہے جبکہ مرد بے چارے اس لحاظ سے بڑے بد قسمت ہوتے ہیں

کہ وہ اپنے گھر کی بیٹھک سے لے کر دفنوں تک اور ہوٹلوں سے لے کر بازاروں تک اپنے ہی جیسے مردوں کے سامنے اپنی عورتوں کا رونا رورہے ہوتے ہیں۔

”راجہ گدھ“ کے تین مرکزی کردار

سیسی، نعیم اور آفتاب

نعیم وہ عام سا کردار ہے جسے تخلیق کار کے قلم نے زیرو سے ہیرو بنا دیا ہے۔ ہماری نوجوان نسل کے تقریباً نوجوان میں اگر نعیم کی سو فیصد خصوصیات نہیں تو ننانوے فیصد ضرور پائی جاتی ہیں۔

سیسی: اُردو ادب کے چند شاہکار کرداروں میں سے ایک ہے۔ جب میں نے ”راجہ گدھ“ میں سیسی کی داستان پڑھی تو میں حیران رہ گیا اور مجھ پر لاجحاصلی کی ایک ایسی کیفیت طاری ہو گئی جس کی مجھے سمجھ نہیں آئی کیونکہ یہ ایک آہستہ آہستہ کردار ہے اور ایسے لوگ ہمیں عام طور پر اپنے آس پاس کہیں دکھائی نہیں دیتے بلکہ ڈورا ڈور تک دکھائی نہیں دیتے۔ اس کیفیت سے فرار حاصل کرنے کا ایک راستہ تو یہ تھا کہ میں اس ناول پر شک کا اظہار کرتا اور اسے پالتا۔ مثلاً یہ میں بانو قدسیہ نے لکھا ہی نہیں۔ اُسے کسی اور نے لکھا ہوگا اور انہوں نے اسے اپنے نام سے چھپوا لیا ہوگا لیکن پھر میں نے دیکھا کہ اس شک کو پالنے سے بھی مجھے لاجحاصلی کی کیفیت سے نجات نہیں ملی اور میں نامعلوم کی سٹی پر بدستور لگا رہا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ جب میں ملتان میں بوسن روڈ کے قریب گلگشت کالونی میں رہا کرتا تھا۔ یہ 1992ء کی بات ہے۔ ایک دفعہ میرے پیٹ میں درد ہونے لگا تو میں نے ہومیو پیتھک سنور سے دوائی لی مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں نے بھی کوئی خاص توجہ نہ دی اور سوچا کہ معمولی سادرد ہے خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن جب رات کے دو بجے کا وقت تو ہوتی معمولی سادرد اتنا بڑھ گیا کہ میں دن پانی کی مچھلی کی طرح ترپنے لگا۔ اُس وقت کوئی رکشہ، ٹیکسی نہ ملا اور مجھے سائیکل پر بٹھا کر ایک قریبی ڈاکٹر کے گھر پر لے جایا گیا جس کا کلینک گھر کے اندر ہی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے چیک اپ کے بعد بتایا کہ یہ پیٹ کا درد نہیں بلکہ گردے کا درد ہے اور پانی کی کمی کی وجہ سے ہوا ہے۔ اُس نے مجھے ڈرپ لگائی اور کچھ انجکشن بھی۔ تب مجھے جا کر کچھ سکون ملا۔

اسی طرح جب ”راجہ گدھ“ پڑھنے کے بعد مجھ پر لاجحاصلی طاری ہو گئی تو میں نے سوچا کہ اس سے پہلے کہ یہ نامعلوم سی کسک مجھے راتوں کو ترپانے لگے اُس کا کچھ علاج ہونا چاہئے۔ تب میں اپنے ایک دیرینہ دوست راؤ ساجد کے پاس گیا۔ اُس جیسے لوگوں سے مل کر لگتا ہے کہ اس سے پہلے کی زندگی ہم نے بے وقوفوں کی سنگت میں بیٹھ کر راز لگائی گزاردی ہے۔

جب میں نے راؤ ساجد کے سامنے ”راجہ گدھ“ کے بارے اپنے شکوک و شبہات کا اظہار کیا تو وہ کہنے لگا: ”تمہارے تمام شکوک بے بنیاد اور غلط ہیں۔ بانو قدسیہ فی الواقع اُردو ادب کی ایک بہت بڑی رائٹر ہیں اور ”راجہ گدھ“ ان کی فن تخلیق کی معراج ہے۔“

راؤ ساجد کیونکہ بہت سمجھدار ہے اور میں اُس کی فہم و فراست کا بہت قائل ہوں اس لیے میرے پاس اُس کی بات کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

پھر جب میں نے اُس سے کہا ”یار! جب سے میں نے یہ ناول پڑھا ہے تب سے ایک بے نام اُداسی ہر طرف چھائی رہتی ہے۔ یہی کے ملنے سے پہلے تک جتنے لوگ بھی مجھے ملے وہ سب عورت کی بے وفائی کے ڈسے ہوئے تھے۔ شاید ہی لیے میں عورت کو ایک بے وفا مخلوق سمجھنے لگا تھا۔ لیکن یار! یہ یہی تو بالکل ہی مختلف قسم کی لڑکی ہے۔ میں نے اس سے پہلے کسی لڑکی کو مرد کی محبت میں اس طرح دیوانہ ہوتے دیکھا نہ سنا۔ کیا مجھ پر چھایا حزن و ملال اس وجہ سے تو نہیں ہے؟ کیا یہ کسی آئیڈیل کو تلاش نہ کر سکنے کا لا حاصل احساس تو نہیں؟“

راؤ ساجد کہنے لگا..... ”تمہاری سب سے بڑی غلطی تو یہ ہے کہ تم نے نائیلہ اور شمائلہ جیسی کہانیاں پڑھتے پڑھتے ”راجہ گدھ“ جیسی بڑی کتاب کو پڑھ لیا۔ تمہیں چاہئے تھا کہ اس طرف آنے سے پہلے ممتاز مفتی جی کی ”علی پور کا بیٹی“ پڑھ لیتے۔ پھر تم میں کم از کم اتنا حوصلہ پیدا ہو جاتا کہ تم اتنی بڑی کتاب کو سہاڑ سکتے۔“

میں نے اُس سے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”یار! میں سمجھتا ہوں کہ کسی کتاب کو پڑھنے کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ اُسے ناقدانہ نظر سے پڑھیں۔ اس طرح دو ہر افائدہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ اس طرح اُس کتاب کی خوبیاں اور خامیاں دونوں آپ کے سامنے آ جاتی ہیں لیکن میں اسے اس طرح نہیں پڑھ سکا۔ مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ ”راجہ گدھ“ کے کردار آپس میں اس طرح ملتے اور پھٹتے ہیں جیسے یہ سب کچھ اُن کی تقدیر میں لکھا ہوا تھا اور ان مختلف کرداروں کو آپس میں ملانے اور جدا کرنے میں مصنف کی اپنی کوئی خاص کوشش کو دخل نہیں تھا۔“

اس ناول کی مخصوص فضا نے مجھے ایک خاص طرح کے تحیر میں مبتلا کر کے رکھ دیا ہے کہ جب میں پونٹو ہار کے علاقے میں موجود ریت کے ٹیلوں کا منظر پڑھتا ہوں تو مجھے اپنے آس پاس موجود تارکول کی کچی سڑکوں پر بھی ریت ہی ریت اُڑتی نظر آتی ہے اور میرے ارد گرد پایا جانے والا سبزہ اور ہریالی ایسی خشک جھاڑیوں میں بدل جاتی ہیں جو برسوں سے بارش کی منتظر ہوں۔“

راؤ ساجد بڑے تھل سے میری باتیں سن رہا تھا۔ یہ اُس کی بڑی خوبی تھی کہ وہ بہت اچھا سننے والا تھا۔ ورنہ اکثر کرم فرما تو سنانے والے ہی ملتے ہیں، سننے والا تو کوئی کوئی ہوتا ہے۔

میں نے اُس سے کہا..... ”یار! ”راجہ گدھ“ میں یہی کئے پاس جو رومال ہے نا! جسے چھپانے کے لیے اُسے کوئی جگہ نہیں ملتی، مجھے لگتا ہے وہ رومال میرے گلے کا پھندا بن گیا ہے اور اب میں زمین پر ہوں نہ آسمان پر۔ بس ہر وقت اس کے ساتھ خلا میں لٹکتا رہتا ہوں۔ پتہ نہیں اب اس پھندے سے میری نجات کب ممکن ہوگی۔“

وہ کہنے لگا..... ”پھندے سے نکلنا تو کوئی مشکل کام نہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ کسی نہ کسی پھندے میں بڑی شکل سے آتا ہے آدمی۔ تمہارا سفر تو شروع ہی اب ہوا ہے۔ بس پڑھتے رہنا۔ نکلنے کا تو نہیں کہہ سکتا کسی نہ کسی طرح پار سرور لگ جاؤ گے۔“

”یار! دُعا کرو کہ یہ پھندا میرے لیے ایسا سبق نہ بن جائے کہ جسے یاد کرنے کے بعد چھٹی نہیں ملتی۔“

اسی طرح جب 1995ء میں ممتاز مفتی صاحب سے خط و کتابت شروع ہوئی تو انہوں نے بھی کچھ ایسے ہی شورے سے نوازا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے..... ”پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھتے رہنا“ پھر آسانی ہو جائے گی۔“

دراصل ابھی مجھے پتہ نہیں تھا کہ سبکی کا رومال جسے میں اپنے لیے پھندا سمجھتا ہوں، ایک دن یہی رومال میرے نجات کا باعث بننے والا ہے۔ یہ بہت بعد کی بات ہے جب میں نے اشفاق صاحب کا ایک مضمون پڑھا جو انہوں نے ”سائیں مرنا“ پر لکھا تھا۔ یہ مضمون اُن کی کتاب ”عرض مصنف“ میں شامل ہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر مجھے لگا کہ وہ رومال میرے گلے میں سے اُتر گیا ہے اور اب اُس نے ایک رستی کی صورت اختیار کر لی ہے۔ بظاہر تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ میں نے اس رستی کو پکڑا ہوا ہے لیکن سچی اور اصلی بات یہ ہے کہ اُس رستی نے مجھے پکڑ رکھا ہے۔ جب میں اس رستی کا خیال کرتا ہوں تو مجھے یاد آتا ہے کہ بے شک اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔

بعد میں اسی رستی کے ذریعے میں ”من چلے کا سودا“ سے گزرتے ہوئے ”زاویہ“ تک پہنچا۔

اُردو ادب میں ”راجہ گدھ“ بالکل مختلف اور منفرد ناول ہے ورنہ انتظار صاحب اور عینی صاحبہ کے ناول تو صرف ہجرت کے مرثیے تک محدود ہیں۔ ”راجہ گدھ“ کے موضوعاتی طور پر منفرد ہونے کی وجہ سے اُس کی کراچی سے لے کر تھمے تک دُھوم مچی ہوئی تھی۔ اس بات کا اندازہ مجھے اُس وقت ہوا جب میں 1997ء میں کراچی گیا۔ وہاں تقریباً سب اجنبی نے ”راجہ گدھ“ پڑھ رکھا تھا۔ نظریاتی اختلاف کے باوجود وہ سب اس سے بے حد متاثر تھے۔ یہ نظریاتی اختلاف صرف بابوں کی وجہ سے ہو سکتا تھا۔ اگرچہ ان سب لوگوں کو بابوں کی باتیں سوچنے اور سمجھنے پر مجبور ضرور کرتی تھیں اور لوگ بابوں کی دانش بھری باتیں مانتے بھی تھے۔ بس ذرا اُن سے اتفاق نہیں کرتے تھے۔ اگر وہ بابوں کی باتوں سے اتفاق کرنے لگتے جاتے تو شاید اُن کی جدیدیت خطرے میں پڑھ جاتی۔ اس جدیدیت کی خاطر وہ مانی جانے والی بات کو بھی رد کر دیتے تھے۔

آج کل تو کراچی بکلی کے بحران میں مبتلا ہے۔ جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اُن دنوں یہ پیارا شہر گولہ کی زد میں تھا اور بوری بند لاشیں ہر طرف بکھری پڑی ہوتی تھیں۔

اُن دنوں میں شارع فیصل پر واقع ڈرگ روڈ سٹیشن پر اُترتا اور طحہ اکیڈمی میری منزل ہوا کرتی جہاں سب کمپوزنگ سیکھنے جایا کرتا تھا۔ اکیڈمی کے ہیڈ سے اس لیے جلد دوستی ہو گئی کہ انہوں نے ”راجہ گدھ“ پڑھ رکھا تھا۔ ایک دن میں ان کے پاس بیٹھا تھا کہ چائے والا لڑکا آیا اور چائے رکھ کے چلا گیا تو وہ مجھ سے کہنے لگے: ”یار! یہ لڑکا ایک دن چائے دینے آیا تو کہنے لگا سر! یہ جو آپ کے رسپشن پر لڑکی بیٹھی ہوئی ہے نہ یہ ساری رات مجھے سونے نہیں دیتی۔ سر! میری تو ساری رات اس کے تصور میں ہی گزر جاتی ہے۔ بھئی اس لڑکے کی بات سے مجھے یاد آیا کہ اکثر نیند تو مجھے بھی ساری رات سن آتی۔“

میں نے پوچھا ”وہ کیوں سر؟“

کہنے لگے ”جب سے ”راجہ گدھ“ پڑھا ہے خاص طور پر اس میں اسلام کا جو تصویر یعنی حرام حلال کا نظریہ جس طرح طریقے سے بیان کیا گیا وہ بہت متاثر کن ہے۔ یارا اگر میں ”راجہ گدھ“ کے نظریے پر عمل کروں گا تو لوگ مجھے پتھر مارنے لگے اور اگر عمل نہیں کرتا تو میرا ضمیر مجھ پر سنگ باری کرتا رہتا ہے۔“

بہت بعد میں میں نے پروفیسر احمد رفیق اختر صاحب کی کتاب میں پڑھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مجھے اس

طرح یاد کرو کو لوگ تمہیں دیوانہ سمجھیں۔

بس سٹاپ پراٹر کرا کیڈمی کو جاتے ہوئے راستے میں پہلے ڈرگ سٹیشن کی بہت سی ریلوے لائنوں کو پار کرنا پڑتا تھا۔ ان لائنوں پر مال گاڑی کے بہت سے ڈبے کھڑے رہا کرتے تھے۔ رات کے وقت جب بھی میرا ان لائنوں پر سے گزر ہوتا تو رات کے اندھیرے میں کسی پٹری پر کھڑے ڈبے کو دیکھ کر مجھے وہ واقعہ ضرور یاد آتا۔ دراصل وہ قصہ اس علاقے میں کسی روایت کی طرح سینہ بہ سینہ چلتا ہوا مجھ تک پہنچا تھا۔

ایک روز رات کے پچھلے پہر جب چوراہہ نمازی اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔

پتہ نہیں وہ ریلوے پولیس کا سپاہی تھا، کوئی رات کی ڈیوٹی کا گارڈ تھا یا کوئی عام پولیس والا تھا۔ اُس نے ایک تالی ٹین کا ڈبے لے کر اُسے رتی سے باندھا اور مال گاڑی کی ایک بوگی کی طرف چل پڑا۔ اُس کا اندازہ تھا وہ بوگی تیل یا آئیل سے بھری ہوئی ہے اور وہ باسانی اس میں سے ایک کنستریٹر بھر لے گا۔ بوگی کے پچھلے حصے کی طرف موجود تیل کے اخراج کا راستہ باوجود کوشش کے اُس سے کھل نہ سکا ہوگا۔ پھر وہ بوگی کے اوپر چڑھا ہوگا اور جہاں سے بوگی میں تیل ڈالا جاتا ہے وہاں لگے ہوئے چوڑے ڈھکن کو کھولنے میں وہ کامیاب ہو گیا ہوگا۔

جب اُس نے کنستریٹر بوگی میں ڈالا تو تیل کی سطح اُس کے اندازے سے کافی نیچے تھی۔ لہذا کنستریٹر تیل تک پہنچانے کے لیے اُسے خود بھی بوگی کے اندر جھکن پڑا ہوگا۔ نجانے رات کا اندھیرا تھا، نیند کا شمار تھا یا تیل کی پھسلن، پتیارو سپاہی رات کی ڈیوٹی کرنے والا گاڑیاں جو کوئی بھی وہ تھا اپنے کنستریٹر کے ساتھ خود بھی..... بوگی کے اندر پھسل گیا۔ یہ اس کی دوسری غلطی تھی۔

اس نے کنستریٹر کو پکڑنے کے لیے تو اس کے ساتھ رتی باندھ رکھی تھی لیکن خود کو کسی رتی سے باندھنا بھول گیا تھا، جس کے سہارے وہ بوگی سے باہر نکل سکتا۔ کئی دن بعد یا جب بھی کسی نے کھلے ڈھکن کا جائزہ لیا ہوگا تب جا کر اس بے یارے کی لاش باہر نکالی جاسکی ہوگی۔ ہمارے ہاں کروڑوں اور اربوں کے گھپلے ہوتے رہتے ہیں اور کوئی نہیں پکڑا جاتا اور سب پکڑ ہونے پر آتی ہے تو پھر ایک تیل کے کنستریٹر پر ایسی پکڑ ہو جاتی ہے۔ تیل کے بجائے لاش ہی واپس گھر جاتی ہے۔

بات صرف اتنی ہے کہ کبھی کبھی کسی روز جب ہم گھر سے نکلتے ہیں تو اُس دن ہم اپنے بہت سارے ڈبے کے ہوئے ضروری کام کامیابی سے نینا لیتے ہیں اور شام کو گھر واپسی پر ہم کہہ رہے ہوتے ہیں کہ آج کا دن تو ہمارا دن تھا۔ بالکل اسی طرح جو پکڑے نہیں جاتے اُن کے لیے وقت کی رتی دراز ہوتی ہے اور پکڑے جانے والے جس دن گرفت میں آ جاتے ہیں وہ دن اُن کا دن نہیں ہوتا۔

میں جب بھی اس واقعہ کو یاد کرتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ یہ دنیا میرے لیے ایک بہت بڑی ساری بوگی ہے اور میں اپنے لیے اور اپنے بچوں کی ضروریات کے لیے ایک کنستریٹر بھرنے کے لیے اس میں اُتر اہوا ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں نے کنستریٹر کو پکڑنے کے لیے جو رتی باندھ رکھی ہے، وہ بڑی کمزور اور پھسلنے والی ہے اس لیے باوجود کوشش کے کبھی پورا کنستریٹر برتا ہی نہیں ہے۔ کبھی آدھا اور اکثر تو آدھے سے بھی کم پر گزارا کرنا پڑتا ہے، لیکن جس ڈور نے مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے وہ بڑی مضبوط ہے۔

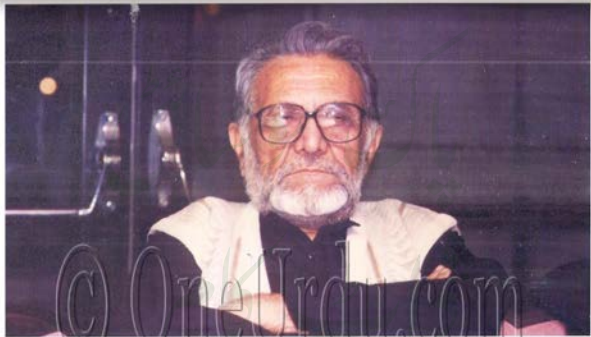
میں اس وقت جہاں کھڑا ہوں یہ دنیاوی ضرورتوں سے بھری ایک بوگی ہے اور ان چھوٹی موٹی ضرورتوں نے میرے چاروں طرف اندھیرا کر رکھا ہے، لیکن جب میں خود سے بندھی اُس مضبوط ڈور کے آخری سرے کی طرف نخرکتا ہوں تو وہاں مجھے روشنی ہی روشنی دکھائی دیتی ہے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ ایک دن میں اس ڈور کے سہارے خود کو دیکھنے کی ضرورتوں سے بھری بوگی کے اندھیروں سے نکالنے میں ضرور کامیاب ہو جاؤں گا۔ یہ مضبوط ڈور ”راجہ گدھ“ سے شروع ہو کر مفتی جی کی ”لبیک“ سے ہوتی ہوئی اشفاق احمد صاحب کے ”زاویہ“ تک جاتی ہے اور اب خاں صاحب کے مجموعیہ سلسلہ موقوف نہیں ہوا بلکہ اور زیادہ روشن ہو گیا ہے۔ اب پروفیسر احمد رفیق اختر کی کتابیں اپنی روشنی سے اس سلسلے کو صاف کر رہی ہیں۔

آخر میں مجھے اُن سب ہستیوں کا شکر یہ ادا کرنا ہے جنہوں نے ایسی بصیرت افروز کتب تخلیق کیں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں سنگ میل پبلشرز کے افضال احمد صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے اُن لائق تحسین کتب کو پڑھنے کا موقع فراہم کیا اور سب سے بڑھ کر میں اللہ کا احسان مند ہوں کہ جس نے مجھے اُن کتب کو سمجھنے کا شعور عطا فرمایا۔



داستانِ وقت

مجموعہ کتب کی پیشکش



اشفاق احمد (2002ء)

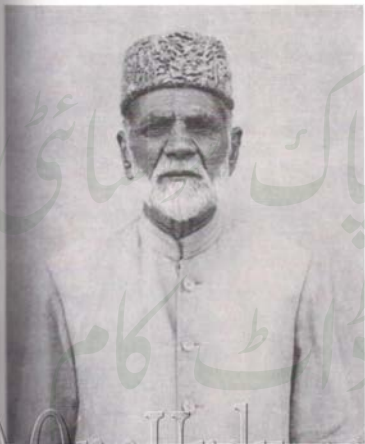


اشفاق احمد (بچپن)

© onelurdu.com



اشفاق احمد



پیدائشی محمد خاں (لوگنڈو اکسز) والدہ اشفاق احمد

OneUIdU.com



اماں جی سردار بیگم۔ والدہ جناب اشفاق احمد





ماسی رشیدہ (اماں جی کی چھوٹی بہن) ممتاز (ماسی رشیدہ کی بہو)
آنزلا (گود میں) ماسی جی کی پوتی



121 سی خاں صاحب کے دوست ماسی رشیدہ کے بیٹے نعیم احمد خاں، ممتاز (عظیم نعیم ماسی رشیدہ کی بہو)



گورنمنٹ کالج فار ویمن ماڈل ٹاؤن - ممتاز زینیم (پرنسپل)، خاں صاحب



ہمدرد (جنگلی کا گھر) عمرہ کا سفر۔ جنگلی کی سب سے چھوٹی بیٹی (سمعیہ)، پانوا آپا پھولپی بیٹی (حنا)، جنگلی (سعیم احمد خان)، شہاب صاحب، رماں صاحب، جنگلی کی بیگم (شیوہ)



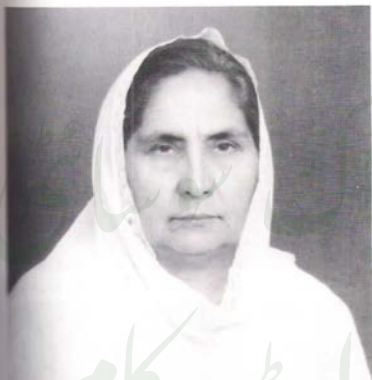
عمرہ کے دوران ہمدرد کا مقام سعیم احمد خان، جنگلی کا گھر، جنگلی کی بیوی (شیوہ)، جنگلی کی بڑی بیٹی (ڈاکٹر ہما جہا تھیہ)



اماں جی، آفتاب (بھائی سب سے بڑے بیٹے)، خالد آفتاب، اشتیاق احمد اور خالد آفتاب



ڈاکٹر ایوب احمد خاں (آپا فرزند کو کے شوہر) ڈاکٹر جواد ساجد ہارٹ سرجن کے والد



ڈاٹ کام

© OnaWorld.com

آپا فرخندہ (پہلوئی کی بیٹی)



ڈاکٹر ایوب اور آپا فرخندہ کا بیٹا ڈاکٹر جواد ساجد (ہارٹ سرجن) — 36 جی۔



آپا فرحت



آپ فرحت کی بیٹی سی



آپ فرحت کے بیٹے جاوید طارق خاں



آپ فرحت کے بیٹے جاوید طارق کی پہلی بیوی جاوید کی بیوی صدیقہ



جاوید طارق کی پہلی بیگم (صدیقہ)



جاوید طارق کی بڑی بیٹی ثویبہ (خاں صاحب کی بہو، بیٹے انیس کی بیگم)



اقبال بھائی سے چھوٹے بھائی امجد خان



ججو بھائی کی پیگم ذکیہ



کیٹنڈا (اخفق بھائی کا گھر) لورڈنو۔ ہانوا پاؤ کیہی جی اخفق بھائی مٹھاں سناہب



— لے — اسحاق بھائی کے بیٹے واصف خاں



— لے — اسحاق بھائی (بچوں کے پیارے) واصف — بیٹی سارا



آئق بھائی کی بی سارا خان



رئیزی اہم عظم، اشتیاق، ساجب، لالو (بیچھے) — 75 بیج کینال پارک



اشتياق، امان جی



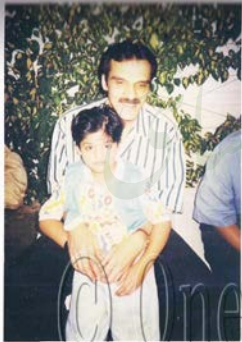
اشتياق احمد خان



آفتو کے بڑے بیٹے سائیکل (سائیکل) احمد خاں



121 سی، نہانے کے بعد آفتو



تقوے سب سے چھوٹے بیٹے واصف احمد خاں



تقوے کے بیٹے نیل احمد خاں



نانا، ریزی، کاکلی (2 ٹیمپل رومز)



اشفاق احمد، تو مہر جی (روم) — 56 این سمن آباد



جمیلہ خضر (نوٹو، پانو) — لیڈی مگلیں کالج



پانو کے بھائی ریزی ناموں



بانو قدسیہ، معظّم، ریزی، خان صاحب — 75 جی کینال پارک



اشفاق احمد، منشی جی — 75 جی ماڈل ٹاؤن



اسے حمید انشاہی، منیر نیازی، اشفاق احمد — 156 این مین آباد



اسے حمید خاں صاحب — 156 این مین آباد



آپا فرحت کی بیٹی، بیٹی ندیم۔۔۔ ایشہ احمد کی ساس



آپا فرحت کی دو سہری بیٹیاں اور ایشہ احمد کی ساس



افتخار احمد خاں (کھاتو ۽ پیڈی)



افتخار احمد خاں کے بیٹے لکھا گوٹہ کمرنگار قریب نامی افکار (غلام صاحب کی تصویر اور تپا جی کی مشق تصویر کھینچے ہوئے)



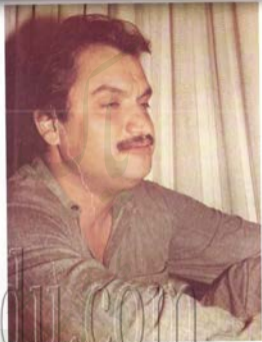
ڈیڑھی جی کی بہو وردا، پوتا ارسلان، پوتا سلطان، پوتلی سویرا



ڈیڑھی جی کے بڑے بیٹے (ڈاٹر طارق بن مختار رگھو) سویرا، پانچویں، اشفاق چچا، وردا (اقبال بھائی کی بیٹی) سلطان



افتخار بھائی کی بیٹی مائیکہ



افتخار بھائی کے بیٹے جنید بن افتخار

© OnUrdu.com



افتخار بھائی کے بیٹے سدھان

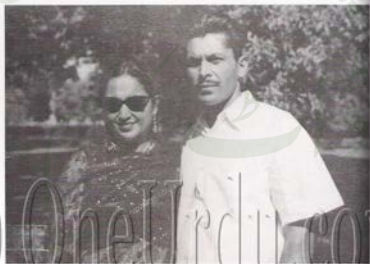


RAVNE & KUNAL RUNDI BYEK Suban havy

خازق (سنگھو کے محل) Cruz کا پرفیکٹ منظر — بانو آپا ایشیا ایشیا



میڈسن (امریکہ) نوکی بیٹے کے گھر مہمان



اہمبال بھائی (سٹیگم) اپنی بیوی



خاں صاحب کے بڑے بھائی آفتاب بھائی (اقبال بی)، اقبال بھائی، اختر بھائی



اقبال بھائی کی بیٹی صولت



اقبال بھائی کے بیٹے رومیہ بیگم عرفات



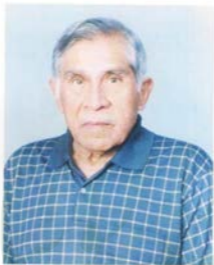
اقبال بھائی کے بیٹے فاروق



میتو، رشیدہ (ماما اکرام کی بیٹی)



اقبال سبحانی کے بیٹے رومیہ، عرفات سے شہر بیچے



آفتخ احمد خان



امرفٹش روٹھانی سے عمارت فٹش صاحبہ 75 کی ماڈل ٹاؤن



اردو سائنس بورڈ



اردو بورڈ خاں صاحب اسلم کولسری

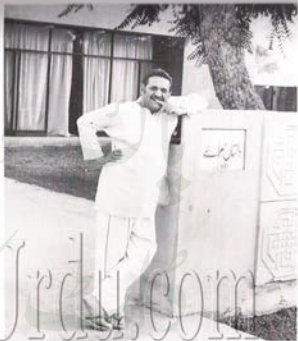


کوئٹہ — ثاقبہ رحیم الدین اشفاق احمد

www.aurul.com



بانو آغا، 121 سی



داستان مرآت، 121 سی



(کھڑے) مودراک، خاں صاحب (بیٹھے) ہانوا پانچویں بی۔ 121 سی۔ سائل ٹاکن



اشجی شہاب صاحب، اشفاق صاحب۔ 121 سی



121 سی (باہرگی لان) انشائی، شہاب صاحب، بانو، خاں صاحب



پرانہا لکھنوی پورٹ، بانو آ پامخاں صاحب



121 سی۔ بیال احمد خان، داوی (داوا کا گروہ)



214 سی، خان صاحب کباب پاریش



121 سی، گھاب پارٹی، خاں صاحب، بانوآپا



121 سی، اشفاق احمد صاحب (گھابہ)، بانوآپا (مددگار) بیوٹی جین (مددگار)



ولپ کمار خاں صاحب



اشفاق احمد و رزہ خان صاحبہ پرچین اور بانو قدسیہ - 21 اسی - ماہ اول ناہون



بانو جمیلہ ہاشمی — 121 سی۔ ماڈل ٹاؤن



ماہد کی بیٹی



21 آری - خان صاحب لائسنس کی بی بی آر ملا



2002 مارسلہ و اہلیق احمد



میڈسن - اہلیق کی بیٹی ارسلہ ماہلیق





اشفاق احمد

بابا صاحب، زاویہ 1، زاویہ 2، زاویہ 3، گذریا، ایک محبت سو افسانے، دوداخ جنگ، ایک ہی بولی،
 صبحانے فسانے، تو جا کہانی، بندگی، طلسم ہوش افزا، اور ڈرامے، ننگے پاؤں، مہمانسراے، من پٹے کا سودا،
 سفر سفر، آپے مُرج لاہور سے، مائلی تھلے، حسرتِ تعمیر، جنگ، جنگ، سفر میں نا، ایک محبت سو ڈرامے، حیرت کدو،
 شاپلا کوٹ، کھیل تماشا، بگدان، کشیا دنیا، دھیرے کا ہشتی، شورا شوری، ادا حنڈورا، عرض و صغف، شہر آرزو



بانوقدیسیہ

راجہ گدھ، شہر بے مثال، توجہ کی طالب، چہار چمن، سدھراں، آ سے پاسے، دوسرا قدم، آدمی پات،
 دست بستہ، جو کا کے نام، سورج کبھی، بیبا نام کا دیا، آتش زیر پا، امر تیل، بازگشت، مردا بر شیم، سامان وجود،
 ایک دن، ہندو، موسم کی گلیاں، لگن اپنی اپنی، تما شیل، ڈسٹ پاتھ کی گھاس، دوسرا اور واڑہ، نا قابل ذکر،
 کچھ اور نہیں، حاصل گھاٹ، پھر ایک بلان ہوا، چھوٹا شہر بڑے لوگ، راہرواں، ہجرتوں کے میدان

Rs. 1200.00

www.sang-e-meel.com



www.sang-e-meel.net